فہرست

صلہ ماتم	03
دنیا کا سب سے انمول رتن	17
شیخ مخمور	28
بے غرض محسن	48
رانی سارندھا	61
بڑے گھر کی بیٹی	87
وکرمادت کا تیغہ	100
آہ بیکس	129
راج ہٹ	148
امرت	160
اماوس کی رات	171
اندھیر	185
صرف ایک آواز	193
بانکا زمیں دار	203
خون سفید	216
خاک پروانہ	231
پچھتاوا	245
نمک کا داروغہ	264
بیٹی کا دھن	277
دو بھائی	292

صلہ ماتم

پہلی بار: کہانیوں کے مختصر مجموعے ''سوز وطن'' میں جون/جولائی 1908 میں شائع ہوا۔

آج تین سال گزر گئے، شام کا وقت تھا۔ میں یونیورسٹی ہال سے خوش خوش چلا آ رہا تھا۔ میرے صدہا دوست مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ فرط مسرت سے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ میری زندگی کی سب سے پیاری آرزو کہ میں ایم اے پاس ہو جاؤں پوری ہو گئی تھی اور ایسی خوبی سے جن کی مجھ کو مطلق امید نہ تھی میرا نمبر اول تھا وائس چانسلر صاحب نے خود مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور مسکرا کر فرمایا تھا کہ خدا تمہیں اعلیٰ کاموں کی توفیق دے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی میں نوجوان تھا شکیل تھا، تندرست تھا، مال و زر کی نہ مجھے خواہش اور نہ کچھ کمی تھی والدین بہت کچھ چھوڑ گئے تھے دنیا میں سچی خوشی میسر ہونے کے لئے جن اسباب کی ضرورت تھی، وہ سب مجھے حاصل تھے اور سب سے بڑھ کر پہلو میں ایک حوصلہ مند دل تھا جو نام و نمود حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔

گھر پر آیا احباب نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ دعوت کی ٹھہری دوستوں کی خاطر و مدارات میں بارہ بج گئے لیٹا تو بے اختیار خیال مس لیلاوتی کی طرف جا پہنچا۔ جو میرے پڑوس میں رہتی تھی اور جس نے میرے ساتھ بی اے کا ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ خوش قسمت ہو گا وہ شخص جو مس لیلا کو بیاہے گا کیسی حسین ہے!

کیسی خوش مزاج میں کبھی کبھی اس کے یہاں پروفیسر صاحب سے فلسفہ میں مدد لینے کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ دن مبارک ہوتا تھا جب پروفیسر صاحب گھر پر نہ ملتے تھے مس لیلا میرے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حضرت مسیح کی پناہ میں آجاؤں تو اسے مجھے اپنی شوہری میں قبول کرنے سے انکار نہ ہوگا۔ وہ شیلی بائرن اور کیٹ کی عاشق تھی اور میرا مذاق بھی بالکل اس کے ہم رنگ تھا ہم جب تنہا ہوتے تو اکثر محبت پر بحث کرنے لگتے۔ اور اس کے منہ سے جذبہ آمیز باتیں سن سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی۔ مگر افسوس! میں اپنا مالک نہ تھا میری شادی ایک معزز گھرانے میں کر دی گئی تھی۔ اور اگر چہ میں ابھی تک اپنی بیوی کی صورت سے بھی آشنا نہ تھا۔ مگر مجھے بجائے شک کے یقین کامل تھا کہ مجھے اس کی صحبت میں وہ لطف نہیں آسکتا جو مس لیلا کی صحبت میں ممکن ہے۔ شادی ہوئے دو سال ہو چکے تھے مگر اس نے میرے پاس ایک خط بھی نہ لکھا تھا۔ میں نے دو تین خط لکھے بھی مگر کسی کا جواب نہ ملا اس سے مجھے یہ شک ہو گیا کہ اس کی تعلیم بھی واجبی ہی واجبی ہے۔

آہ! کیا میں اسی لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گا؟ اس سوال نے میرے ان تمام ہوائی قلعوں کو ڈھا دیا جو میں نے ابھی ابھی بنائے تھے کیا میں مس لیلا سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لوں؟ ناممکن ہے میں کمدنی کو چھوڑ دوں گا میں اپنے یگانوں سے ناتا توڑ لوں گا۔ میں رسوا ہوں گا، خوار ہوں گا، مگر مس لیلا کو ضرور اپنا شریک حال بناؤں گا۔

انہیں خیالات سے موثر ہو کر میں نے اپنی ڈائری لکھی اور اسے میز پر کھلا چھوڑ

کر بستر پر لیٹ رہا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔

سویرے اٹھ کر دیکھتا ہوں تو بابو زنجن داس میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں ان کے ہاتھ میں ڈائری تھی جسے وہ بغور پڑھ رہے تھے انہیں دیکھتے ہی میں فرط شوق سے لپٹ گیا افسوس! اب اس فرشتہ صفت نوجوان کی صورت دیکھنی نہ نصیب ہوگی بے ہنگام موت نے اسے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا وہ کمدنی کے حقیقی بھائی تھے نہایت وجیہ و شکیل اور ہنس مکھ سن مجھ سے دو چار سال ہی زیادہ تھا۔ اچھے عہدہ پر ممتاز تھے کچھ دنوں سے اسی شہر میں تبدیل ہو کر آ گئے تھے میری اور ان کی گاڑھی دوستی ہو گئی تھی میں نے پوچھا "کیا تم نے میری ڈائری پڑھ لی؟"

زنجن: "ہاں"

میں: "مگر کمدنی سے کچھ نہ کہنا"

زنجن: "بہت اچھا نہ کہوں گا"

میں: "اس وقت کس سوچ میں ہو میرا ڈپلوما دیکھا"

زنجن: "گھر سے خط آیا ہے والد بیمار ہیں دو تین دن میں جانے والا ہوں"

میں: "شوق سے جائیے ایشور انہیں جلد صحت بخشے"

زنجن: تم بھی چلو گے؟ نہ معلوم کیسا پڑے کیسا نہ پڑے

میں: "مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھو"

زنجن داس یہ کہہ کر چلے گئے میں نے حجامت درست کر کے کپڑے بدلے اور مدلیلا وتی سے ملنے کے اشتیاق میں چلا۔ وہاں جا کر دیکھا تو قفل پڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ مس صاحبہ کی طبیعت دو تین دن سے خراب تھی تبدیل آب و ہوا کے

لئے نینی تال چلی گئی ہیں۔افسوس! میں ہاتھ مل کر رہ گیا کیا لیلا مجھ سے ناراض تھی؟ اس نے مجھے کیوں اطلاع نہیں دی لیلا! کیا تو بےوفا ہے تجھ سے بیوفائی کی امید نہ تھی فوراً مصمم ارادہ کرلیا کہ آج ڈاک سے نینی تال چل دوں۔مگر گھر آیا تو لیلا کا خط ملا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا لکھا تھا"میں بیمار ہوں میرے جینے کی کوئی امید نہیں ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پلیگ ہے جب تک تم آؤ گے غالباً میرا قصہ تمام ہو جائے گا آخری وقت تم سے نہ ملنے کا سخت صدمہ ہے میری یاد دل میں قائم رکھنا مجھے سخت افسوس ہے کہ تم سے مل کر نہیں آئی۔میرا قصور معاف کرنا اور اپنی بدقسمت لیلا کو بھلا مت دینا" خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی منہ سے ایک سرد آہ نکلی بلا ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے میں نے بستر باندھا اور نینی تال چلنے کے لئے تیار ہوگیا گھر سے نکلا ہی تھا کہ پروفیسر بوس سے ملاقات ہوگئی کالج سے چلے آرہے تھے، چہرہ مغموم تھا۔مجھے دیکھ کر انہوں نے جیب سے ایک تار نکال کر میرے سامنے پھینک دیا میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ آنکھوں سے اندھیرا چھا گیا تار کون اٹھاتا ہے اور ہائے کرکے بیٹھ گیا لیلا تو اتنی جلد مجھ سے جدا ہوگئی!

(2)

میں روتا ہوا گھر آیا اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر خوب رویا نینی تال جانے کا ارادہ منسخ ہوگیا۔دس بارہ دن تک میں وحشت کے عالم میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔

دوستوں کی صلاح ہوئی کہ چند روز کے لئے کہیں گھومنے چلے جاؤ۔ میرے دل میں بھی یہ بات جم گئی نکل کھڑا ہوا اور دو مہینے تک وندھیا چل پارسناتھ وغیرہ پہاڑیوں میں سرگرداں پھرتا رہا۔ بارے نئے نئے مقامات اور مناظر کی سیر سے طبیعت کو ذرا تسکین ہوئی میں آبو میں تھا جب میرے نام تار پہنچا کہ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری پر نامزد کیا گیا ہوں جی تو نہ چاہتا تھا کہ پھر اس شہر میں آؤں مگر پرنسپل کے خط نے مجبور کردیا ناچار لوٹا اور اپنے فرائض انجام دینے لگا زندہ دلی نام کو نہ باقی رہی تھی دوستوں کی صحبت سے بھاگتا اور ہنسی مذاق سے طبیعت نفور ہوتی۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا عالم خیال کی سیر کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان سے گانے کی آواز آئی آہ! کیا آواز تھی تیر کی طرح دل میں چبھی جاتی تھی لہجہ کیسا رقت آمیز تھا اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ نغموں میں کیا اثر ہے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کلیجہ مسوسنے لگا اور دل پر ایک عجیب حسرت ناک کیفیت طاری ہوگئی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہائے! یہ لیلا کا پیارا گیت تھا۔

پیا ملن ہے کٹھن باوری

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں ایک وحشت کے عالم میں اٹھا اور جا کر سامنے والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا مجھے اس وقت یہ تمیز نہ تھی کہ ایک اجنبی آدمی کے مکان پر آ کھڑے ہو جانا اور اس کے خلوت اور مخل ہونا انتہا درجے کی بدتہذیبی ہے۔

(3)

ایک بڑھیا نے دروازہ کھول دیا اور مجھے کھڑے دیکھ کر لپکی ہوئی اندر گئی میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ دہلیز طے کرتے ہی ایک وسیع کمرے میں پہنچا اس پر ایک سفید فرش بچھا ہوا تھا گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے دیواروں پر خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں اور ایک سولہ سترہ سال کا سبزہ آغاز نوجوان مسند کے قریب بیٹھا ہوا ہارمونیم پر گا رہا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ایسا وجیہ نوجوان میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا۔ وضع قطع سے سکھ معلوم ہوتا تھا مجھے دیکھتے ہی چونک پڑا اور ہارمونیم چونک کر کھڑا ہو گیا شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اس نے کہا ''معاف کیجئے گا! میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی آپ اس فن کے استاد معلوم ہوتے ہیں خصوصاً جو چیز ابھی آپ گا رہے تھے وہ مجھے پسند ہے'' نوجوان نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچا کر لیا اور ہونٹوں میں کچھ اپنی بدمشقی کا اظہار کیا میں نے پھر پوچھا ''آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟''

نوجوان: ''تین مہینے کے قریب ہوتا ہے''

میں: ''اسم شریف؟''

نوجوان: ''مجھے مہر سنگھ کہتے ہیں''

میں بیٹھ گیا اور گستاخانہ بے تکلفی سے مہر سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور پھر معذرت مانگی اس وقت کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پنجاب کا باشندہ ہے اور یہاں

پڑھنے کے لئے آیا ہوا ہے شاید ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ پنجاب کی آب و ہوا اس کے لئے موافق نہیں ہے میں دل میں تو جھینپا کہ ایک اسکول کے لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر ایسی بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہوں مگر نغمے کے اشتیاق نے اس خیال کو رہنے نہ دیا رسمی تعارف کے بعد میں نے پھر التجا کی کہ وہی چیز چھیڑیے مہر سنگھ کی آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا کہ میں ابھی بالکل نو مشق ہوں۔

میں: ''یہ تو آپ ہی اپنی زبان کہیے''

مہر سنگھ: ''(جھیپ کر) آپ کچھ فرمائیں ہارمونیم حاضر ہے''

میں: ''میں اس فن سے مطلق بے بہرہ ہوں ورنہ آپ کی فرمائش کی ضرور تعمیل کرتا''

اس کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا مگر مہر سنگھ جھینپتا ہی رہا مجھے خلقتہ تکلف سے نفرت ہے حالانکہ اس وقت مجھے ترش ہونے کا کوئی حق نہ تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہ مانے گا تو ذرا رکھائی سے بولا ''خیر جانے دیجئے مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا معاف کیجئے'' یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا میری رونی صورت دیکھ کر شاید مہر سنگھ کو اس وقت رحم آ گیا اس نے جھینپتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ''آپ تو ناراض ہوئے جاتے ہیں''

میں: ''مجھے آپ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں''

مہر سنگھ: اچھا بیٹھ جائیے میں آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں گا مگر میں ابھی بالکل نو مشق ہوں میں بیٹھ گیا اور مہر سنگھ نے ہارمونیم پر وہی گیت الاپنا شروع کیا۔

پیا ملن ہے کٹھن باوری

کیسی سریلی تان تھی! کیسی دلکش آواز کیسا بے چین کرنے والا جذبہ اس کے گلے میں وہ رس تھا جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ میں نے دیکھا کہ گاتے گاتے خود اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر اس وقت ایک دل پسند خواب کی سی کیفیت طاری تھی ایک نہایت شیریں، نازک، دردناک مگر نا قابل بیان اثر دل پر ہو رہا تھا۔ ایک پر فضا سبزہ زار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور لیلا، پیاری لیلا سبزہ زار پر بیٹھی ہوئی میری طرف حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی تھی میں نے ایک لمبی آہ بھری اور بلا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا اس وقت مہر سنگھ نے میری طرف تاکا اس کی آنکھوں میں موتی کے قطرے ڈبڈبائے ہوئے تھے اور بولا کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے گا

میں نے صرف اتنا جواب دیا میں ''آپ کا بہت مشکور ہوا''

(4)

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہوگئی کہ جب تک مہر سنگھ کے یہاں جا کر دو چار نغمے نہ سن لوں، جی کو چین نہ آتا شام ہوئی اور میں جا پہنچا۔ کچھ دیر تک نغمہ سرائیوں کی بہار لوٹتا اور تب اسے پڑھاتا۔ ایسے ذہین اور سمجھدار لڑکے کو پڑھانے میں مجھے خاص مزہ آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا میری ایک ایک بات اس کے دل پر نقش ہو رہی ہے۔ جب تک میں پڑھاتا وہ ہمہ تن گوش بنا بیٹھا رہتا جب اسے دیکھتا پڑھنے لکھنے میں محو پاتا سال بھر میں اپنے ذہن خداداد کے بدولت اس نے انگریزی میں اچھی

استعداد حاصل کر لی معمولی چٹھیاں لکھنے لگا۔اور دوسرا سال گزرتے گزرتے وہ اپنے اسکول کے کل طلبا سے بازی لے گیا جتنے مدرس تھے سب اس کی ذکاوت پر عش عش کرتے اور سیدھا، نیک چلن ایسا کہ کبھی جھوٹ موٹ بھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی وہ سارے اسکول کی امید اور رونق تھا لیکن باوجود سکھ ہونے کے اسے کھیل کود سے رغبت نہ تھی میں نے اسے کبھی کرکٹ میں نہیں دیکھا شام ہوتے ہی سیدھے گھر چلا آتا اور نوشت وخواند میں مصروف ہو جاتا۔

میں رفتہ رفتہ اس سے ایسا مانوس ہو گیا کہ بجائے شاگرد کے دوست سمجھنے لگا سن کے لحاظ سے اس کی سمجھ حیرت انگیز تھی۔دیکھنے میں سولہ سترہ سال سے زائد نہ معلوم ہوتا مگر جب کبھی میں روانی میں آ کر دقیق شاعرانہ خیالات و نازک جذبات کی اس کے سامنے تشریح کرتا تو مجھے اس کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایک نقطے کو سمجھ رہا ہے ایک دن میں نے اس سے پوچھا

''مہر سنگھ تمہاری شادی ہو گئی ہے؟''

مہر سنگھ نے شرما کر جواب دیا ''ابھی نہیں''

میں: ''تمہیں کیسی عورت پسند ہے؟''

مہر سنگھ: ''میں شادی کروں گا ہی نہیں''

میں: ''کیوں۔۔۔۔؟''

مہر سنگھ: ''مجھ جیسے جاہل مطلق کے ساتھ شادی کرنا کوئی عورت پسند نہ کرے گی''

میں: ''بہت کم ایسے نوجوان ہوں گے جو تم سے زیادہ لائق ہوں یا تم سے زیادہ

سمجھ رکھتے ہوں۔''

مہر سنگھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا ''آپ دل لگی کرتے ہیں''

میں: ''دل لگی نہیں میں سچ کہتا ہوں مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم دنوں میں تم نے اتنی استعداد کیوں پیدا کر لی ابھی تمہیں انگریزی شروع کیے ہوئے تین برس سے زیادہ نہیں ہوئے''

مہر سنگھ: ''کیا میں کسی تعلیم یافتہ لیڈی کو خوش رکھ سکوں گا''

میں: (جوش سے) ''بیشک!''

(5)

گرمی کا موسم تھا میں ہوا کھانے شملہ گیا ہوا تھا مہر سنگھ بھی میرے ساتھ تھا وہاں میں بیمار پڑا چیچک نکل آئی تمام جسم میں آبلے پڑ گئے پشت کے بل چارپائی پر پڑا رہتا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میرے ساتھ جو احسانات کیے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے ڈاکٹر کی سخت ممانعت تھی کہ وہ میرے کمرے میں نہ آوے مگر مہر سنگھ آٹھوں پہر میرے ہی پاس بیٹھا رہتا مجھے کھلاتا پلاتا، اٹھاتا، بٹھاتا، رات رات بھر چارپائی کے قریب بیٹھ کر جاگتے رہتا مہر سنگھ ہی کا کام تھا۔ حقیقی بھائی بھی اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا تھا ایک مہینہ گزر گیا میری حالت روز بروز ردی ہوتی جاتی تھی ایک روز میں نے ڈاکٹر کو مہر سنگھ سے کہتے ہوئے سنا ''ان کی حالت نازک ہے'' مجھے یقین ہو گیا کہ اب نہ بچوں گا مگر مہر سنگھ کچھ ایسی مستقل مزاجی سے میری تیمار

داری میں مصروف تھا گویا وہ مجھے زبردستی موت کے منہ سے بچانے لگا ایک روز شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ کسی کے سسکی لینے کی آواز آئی وہاں بجز مہر سنگھ کے اور کوئی نہ تھا میں نے پوچھا "مہر سنگھ! مہر سنگھ! تم روتے ہو۔"

مہر سنگھ نے ضبط کر کے کہا "نہیں روؤں کیوں" اور میری طرف بڑی دردمندانہ نگاہ سے دیکھا۔

میں: "تمہارے سسکنے کی آواز آئی"

مہر سنگھ: "وہ کچھ بات نہ تھی گھر کی یاد آ گئی تھی"

میں: "سچ بولو"

مہر سنگھ کی آنکھیں پھر پرنم ہو گئیں اس نے میز پر سے آئینہ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا یار ناراضئں میں خود اپنے تئیں پہچان نہ کر سکا چہرہ اس قدر تبدیل ہو گیا تھا رنگت بجائے سرخ کے سیاہ ہو رہی تھی اور چیچک کے بدنما داغوں نے صورت مسخ کر دی تھی اپنی یہ حالت زار دیکھ کر مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں وجاہت جس پر مجھے اس قدر ناز تھا، بالکل رخصت ہو گئی تھی۔

(6)

میں شملہ سے واپس آنے کی تیاری کر رہا تھا مہر سنگھ اسی روز مجھ سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میری طبیعت بہت اچاٹ ہو رہی تھی اسباب سب بندھ چکا تھا کہ ایک گاڑی میرے دروازے پر آ کر رکی اور اس میں سے کون اترا؟ مس

لیلا! میری آنکھوں کو اعتبار نہ ہوا متحیر ہو کر تا کنے لگا مس لیلا وتی نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملانے کو بڑھایا میں نے اضطراری طور پر ہاتھ کو بڑھا دیا مگر ابھی تک یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ آیا خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے لیلا کے رخساروں پر وہ سرخی تو نہ تھی نہ وہ چلبلا پن بلکہ وہ بہت متین اور زردہو رہی تھی آخر میری حیرت کم نہ ہوتے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا ''تم کیسے جنٹل مین ہو کہ ایک شریف لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کرسی بھی نہیں دیتے''

میں نے اندر سے کرسی لا کر اس کے لئے رکھ دی مگر ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔

لیلا وتی نے کہا ''شاید تم مجھے بھول گئے''

میں: ''بھول تو عمر بھر نہیں سکتا مگر آنکھوں کا اعتبار نہیں آتا''

لیلا: ''تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے''

میں: ''تم بھی تو وہ نہیں رہیں مگر آخر یہ راز کیا ہے؟ کیا تم جنت سے لوٹ آئیں؟''

لیلا: ''میں تو نینی تال میں اپنے ماموں کے ہاں تھی''

میں: ''اوہ مجھے چٹھی کس نے لکھی تھی اور تار کس نے دیا تھا؟''

لیلا: ''میں نے ہی''

میں: ''کیوں؟ تم نے مجھے یہ دھوکا کیوں دیا شاید تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں نے تمہارے ماتم میں کتنی تکلیف اٹھائی ہے''

مجھے اس وقت ایک انوکھا غصہ آیا یہ پھر میرے سامنے کیوں آ گئی؟ مر گئی تھی تو

لیلا: ''اس میں مصلحت تھی مگر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی آؤ اس وقت تمہیں اپنے ایک لیڈی فرینڈ سے انٹروڈیوس کراؤں وہ تمہاری ملاقات کی بہت مشتاق ہیں''

میں نے متعجب ہو کر پوچھا ''میری ملاقات کی!'' مگر لیلاوتی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے سامنے لے گئی اس میں ایک نازنین ہندوستانی کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ بڑھا دیا میں نے لیلا کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا۔

لیلا: ''کیا تم نے نہیں پہچانا؟''

میں: ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا اور اگر دیکھا بھی ہو تو گھونگھٹ کی آڑ سے کیونکر پہچان سکتا ہوں''

لیلا: ''یہ تمہاری بیوی کمدنی ہیں''

میں نے استعجاب کے لہجے میں کہا ''کمدنی! یہاں؟''

لیلا: ''کمدنی! منہ کھول دو اور اپنے پیارے شوہر کا خیر مقدم کرو''

کمدنی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ذرا سا گھونگھٹ اٹھایا لیلا نے سارا منہ کھول دیا اور ایسا معلوم ہوا گویا بادل سے چاند نکل آیا مجھے خیال آیا میں نے یہ چہرہ شاید کہیں دیکھا ہے کہاں؟ آہا اس کی ناک پر بھی تو وہی تل ہے انگلی میں وہی انگوٹھی بھی ہے

لیلا: ''کیا سوچتے ہو اب پہچانا''

میں: ''میری کچھ عقل کام نہیں کرتی یہی حلیہ بجنسہ میرے ایک پیارے دوست مہر سنگھ کا ہے۔''

لیلا: (مسکرا کر) ''تم تو ہمیشہ نگاہ کے تیز بنتے تھے اتنا بھی نہیں پہچان سکتے''

میں خوشی سے پھول اٹھا کمدنی مہر سنگھ کے بھیس میں! میں نے اسی وقت گلے سے لگالیا اور خوب دل کھول کر پیار کیا ان چند لمحوں میں مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے مقابلے میں زندگی بھر کی خوشیاں ہیچ ہیں ہم دونوں ہم آغوش تھے کمدنی، پیاری کمدنی کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی ہاں آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

مس لیلا باہر کھڑی ہمدردانہ نگاہوں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا پیاری لیلا تم سچی دیوی ہو ہم جب تک جئیں گے تمہاری ممنون احسان رہیں گے'' لیلا کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم دکھائی دیا'' بولی ''اب تو شاید تمہیں میرے ماتم کا کافی صلہ مل گیا۔''

☆☆☆☆☆

دنیا کا سب سے انمول رتن

پہلی بار: کتابی صورت میں، افسانوی مجموعے ''سوز وطن''
جون/جولائی 1908ء میں شائع ہوا۔
(اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں)

دلفگار ایک پر خار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں، بلکہ ان سیدھے سادے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ اور بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار! ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ دار پر کھنچوا دوں گی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا شکوہ و شکایات اور جمال یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جونہی یہ فیصلہ سنایا اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پر خار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے! ناممکن! اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آب حیات؟ تاج خسرو؟ جام جم؟

تخت طاؤس؟ زر پرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں دنیا میں ضرور ان سے گراں تر، ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں مگر وہ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسے ملیں گی؟ یا خدا! میری مشکل کیونکر آسان ہوگی

دلفگار انہیں خیالات میں چکر کھا رہا تھا اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی منیر شامی کو حاتم سا مددگار مل گیا۔ اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہو جاتا اے کاش مجھے بھی اس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا ہے، نام بتلا دیا جاتا بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جا سکتا ہوں میں سمندر کا نغمہ، پتھر کا دل، قضا کی آواز، اور ان سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی تلاش میں کمر ہمت باندھ سکتا ہوں مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے یہ میرے پر پرواز سے بالاتر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے دلفگار یکا یک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا بھوکا پیاسا برہنہ تن خستہ و زار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جسم میں تار مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں مگر وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے تھی میسر نہ ہوئی اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں نکلا۔ جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریش ایل قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ غرفش کر رہے تھے اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ ناتوانی کے غلبے سے اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے

سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کئی برقنداز ایک دست و پابزنجیر قیدی کو لئے چلے آ رہے ہیں سولی کے قریب پہنچ کر سب سپاہی رک گئے۔ اور قیدی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب اتار لی گئیں اس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو رہا تھا اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا اسے کالا چور کہتے تھے سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کر دیا موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا ''للہ مجھے ایک دم کے لئے پھانسی سے اتار دو تا کہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں'' یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا لوگ حیرت میں آ کر تاکنے لگے قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور بدنصیب سیہ کار کالا چور ذرا دیر کے لئے پھانسی سے اتار لیا گیا۔

اس مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہو کر اپنے پیروں پر اچھل اچھل کر فرضی گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اور اپنے عالم سادگی میں مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے اس کا چہرہ اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لئے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بدقسمت کالا چور پھانسی سے اترا ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا اسے اس وقت وہ زمانہ

یاد آیا جب وہ خود ایسا ہی بھولا بھالا ایسا ہی خوش وخرم اور آلائشات دنیوی سے ایسا ہی پاک وصاف تھا ماں گودیوں میں کھلاتی تھی باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایام گزشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہو کہ اس کی آنکھوں سے جنہوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا۔ اور نہ جھپکی تھیں آنسوں کا ایک قطرہ ٹپک پڑا دلفگار نے لپک کر اس در یکتا کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے دل نے کہا بے شک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے جس پر تخت طاؤس اور جام جم اور آب حیات اور زر پرویز سب تصدق ہیں۔

اسی خیال سے خوش ہوتا، کامیابی کی امید سے سرمست، دلفگار اپنی معشوقہ الفریب کے شہر مینوسواد کو چلا مگر جوں جوں منزلیں طے ہوتی جاتی تھیں اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہیں اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں، دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا۔ اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا پر ہر چہ باد اباد اب تو قسمت آزمائی ہے آخر کو وہ دریا طے کرتے شہر مینوسواد میں آ پہنچا اور دلفریب کے در دولت پر جا کر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضل خدا تعمیل ارشاد کر کے آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا۔ اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید وبیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت ہی موثر لہجے میں بیان کی دلفریب نے کل روداد بغور سنی اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کر کے بولی یہ دلفگار بے شک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈ نکالی تیری ہمت کو آفرین اور تیری فراست کو مرحبا!

مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں۔ اس لئے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر۔ شاید اب کی تیرے ہاتھ درِ مقدر لگے اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو اپنے عہد کے مطابق میں تجھے وار پر کھنچوا سکتی ہوں مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں اس لئے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخ رو ہوگا۔ ناکام و نامراد دلفگار اس عنایت معشوقانہ سے ذرا دلیر ہو کر بولا ''اے محبوب دلنشیں بعد مدتہائے دراز کے تیرے آستان کی جب رسائی نصیب ہوئی پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے کیا تو اپنے عاشق جانباز کے حال زار پر ترس نہ کھائے گی اور اپنے جمال جہاں آرا کا جلوہ دکھا کر اس سوختہ تن دلفگار کو آنے والی سختیوں کے جھیلنے کے لئے مستعد نہ بنائے گی تیری ایک نگاہ مست کے نشہ سے بیخود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔ دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات کو سن کر برافروختہ ہو گئی اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فوراً غریب دلفگار کو دھکے دے کر کوچہ یار سے باہر نکال دیا۔''

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقانہ ستم کیش کی اس تند خوئی پر آنسو بہاتا رہا۔ بعد ازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں مدتوں کی رہ نوردی و بادیہ پیمائی کے بعد یہ قطرہ اشک ملا تھا اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس درِ آبدار سے زائد ہو حضرت خضر! تم نے سکندر کو چاہ ظلمات کا راستہ دکھایا تھا کیا میری دست گیری نہ کرو گے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو اے جبرئیل عالی

مقام! کچھ تمہیں اس عاشق نیم جان و اسیر رنج و محن پر ترس کھاؤ تم مقربان بارگاہ سے ہو کیا میری مشکل آسان نہ کرو گے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی مگر کوئی اس کی دستگیری کے لئے نمودار نہ ہوا آخر مایوس ہو کر وہ مجنوں صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔

دلفگار نے پورب سے پچھم تک اور اتر سے دکھن تک کتنے ہی دریاؤں کی خاک چھانی کبھی برفشانی چوٹیوں پر سویا کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا مگر جس چیز کی دھن تھی وہ نہ ملی یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودہ استخواں ہو گیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا۔ نشہ بے خودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی چتا بنی ہوئی ہے اور اس پر ایک نازنین شہانے جوڑے پہنے، سولہوں سنگار کئے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہے ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں یکا یک چتا میں سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبے سے منور ہو رہا تھا مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودہ خاکستر ہو گیا معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کر دیا۔ اور دو فدائیوں کی سچی، لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہ ظاہر سے پنہاں ہو گیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اٹھا اور اپنے گریبان چاک دامن میں یہ تودہ خاک سمیٹ لیا اور اس مشت خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمود کوچہ یار کی طرف چلا اب کی جوں جوں وہ منزل مقصور کے قریب آتا تھا، اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔

کوئی اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اب کی تیری فتح ہے اور اس خیال نے اس کے دل کو جو خواب دکھائے اس کا ذکر فضول ہے آخر وہ شہر مینو سواد میں داخل ہوا اور دلفریب کے آستان رفعت نشان پر جا کر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضور میں باریاب ہوا چاہتا ہے دلفریب کے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لئے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی، ہاتھ پھیلا دیا۔ دلفگار نے جرأت کر کے اس ساعد سیمیں کا بوسہ لے لیا اور وہ مشت خاک اس میں رکھ کر اس ساری کیفیت نہایت دلسوز انداز میں کہہ سنائی اور معشوقہ دلپذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جانفزا فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشت خاک کو آنکھوں سے لگالیا اور کچھ دیر تک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی ''اے عاشق جاں نثار دلفگار! '' بیشک یہ خاک کیمیائے صفت جو تو لایا ہے دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے اور میں تیری صدق دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیش کش کیا مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گراں قدر کوئی چیز ہے۔ جا اسے تلاش کر اور تب میرے پاس آ میں تہ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے یہ کہہ کر وہ پردہ زرنگار سے باہر آئی ۔۔۔۔اور معشوقانہ ادا سے اپنے جمال جاں سوز کو نظارہ دکھا کر پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی ایک برق تھی کہ کوندی اور پھر پردہ ابر میں چھپ گئی ابھی دلفگار کے حواس بجا نہ ہونے پائے تھے کہ چوبدار نے ملائمت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچہ یار سے نکال دیا۔ اور پھر تیسری بار وہ بندرہ محبت وہ زاویہ نشین کنج ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔

دلفگار کا ہباؤ چھوٹ گیا اسے یقین ہو گیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مر جانے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے تئیں گرا دوں تا کہ معشوق کی جفا کاریوں کے لئے ایک ریزہ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور افتاں وخیزاں ایک سر بفلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیر مرد سبز عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لئے برآمد ہوئے اور ہمت افزا لہجے میں بولے" دلفگار! نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے؟ استقلال راہ عشق کی پہلی منزل ہے باایں ہمہ اودعائے عاشقی تجھے اتنی بھی خبر نہیں مرد بن اور یوں ہمت نہ ہار مشرق کی طرف ایک ملک ہے جس کا نام ہندوستان ہے وہاں جا اور تیری آرزو پوری ہوگی" یہ کہہ کر حضرت خضر غائب ہو گئے دلفگار نے شکریہ کی نماز ادا کی اور تازہ حوصلے، تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پا کر خوش خوش پہاڑ سے اترا اور جانب ہند مراجعت کی۔

مدتوں تک پرخار جنگلوں، شرربار ریگستانوں، دشوار گزار وادیوں اور ناقابل عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبہ ماندگی سے لب جو بار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا جہاں بے شمار نیم کشتہ اور بے جان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم

بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی مرنے والوں کا کراہنا سسکنا اور ایڑیاں رگڑ کر جان دینا درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا یکایک اسے خیال آیا میدان کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرہ ضعف جانکندنی سے زرد ہو گیا ہے زمین پر سرنگوں پڑا ہوا ہے سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر وہاں زخم پر رکھ دیا تا کہ خون رک جائے اور بولا ''ارے جوان مرد تو کون ہے؟'' جوانمرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجہ میں بولا ''کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں'' یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لئے چمک اٹھی دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا تھا ملائمت سے بولا ''اے جونمرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں ایک آواطہ وطن غربت زدہ مسافر ہوں ادھر بھولتا بھٹکتا آ نکلا براہ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر'' یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا ''اگر تو مسافر ہے تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم تیری مہمان نوازی

کرنے کے قابل نہیں ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لئے زندہ ہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا اس سے بہتر موت ممکن نہیں''

جوانمرد کی آواز مدھم ہوگئی اعضا ڈھیلے ہو گئے خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہو گیا رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا آخر کار سارا جسم بیدم ہو گیا قلب کی حرکت بند ہو گئی اور آنکھیں مند گئیں دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا ''بھارت ماتا کی جے'' اور اس کے سینہ سے آخری قطرہ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محب وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرہ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی اس نے فوراً اس رشک لعل رمانی کو ہاتھ میں لے لیا اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازم وطن ہوا۔ وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور در صف محبوبی کے در دولت پر جا پہنچا اور پیغام دیا کہ دلفگار کامگار لوٹا ہے اور دربار گہر بار میں حاضر ہونا چاہتا ہے دلفریب نے اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا خود

حسب معمولی پردہ زرنگار کے پس پشت بیٹھی اور بولی ’’ دلفگار! اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہے لا دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کہاں ہے؟ دلفگار نے پنجہ حنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرہ خون اس پر رکھ دیا۔ اور اس کی مشرح کیفیت پر جوش لہجے میں کہہ سنائی وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکا یک وہ پردہ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دوبار حسن آراستہ نظر آیا جس میں ایک نازنین رشک زلیخا تھی دلفریب بصد شان رعنائی مسند زریں کار پر جلوہ افروز تھی دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا کہ دلفریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی رقاصان دلنواز نے شادیانے گانے شروع کئے حاشیہ نشینان دربار نے دلفگار کو نذریں گزاریں۔ اور ماہ وخورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھا دیا۔ جب نغمہ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہو گئی اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی‘‘ اے عاشق جان نثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب وسرخرو کیا آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز۔

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آب زر سے لکھا ہوا تھا۔

’’وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔‘‘

☆☆☆☆☆☆

شیخ مخمور

پہلی بار: کتابی صورت میں، کہانیوں کے مجموعے'' سوز وطن''
میں1908 میں شائع ہوا۔

اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

ملک جنت نشان کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہ کشور کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور شور کے ساتھ اس پر آیا سارا ملک پامال ہوگیا آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں اور جان ومال کے لالے پڑ گئے۔شاہ بامراد خوب جی کھول کرلڑا خوب داد شجاعت دی، اور اپنے خاندان کے تین لاکھ سورماؤں کو اپنے پر قربان کر دیا مگر فاتح کی شمشیر خارا شگاف کے مقابلے میں اس کی یہ مردانہ جان بازیاں بے اثر ثابت ہوئیں ملک پر شاہ کشور کشا کی حکومت کا سکہ جم گیا اور شاہ بامراد یکہ وتنہا بے یار و مددگار اپنا سب کچھ آزادی کے نام پر قربان کر کے ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے لگا

یہ جھونپڑا کوہستانی مقام پر واقع تھا آس پاس جنگلی قومیں آباد تھیں اور دور دور تک پہاڑوں کے سلسلے نظر آتے تھے اس سنسان جگہ میں شاہ مراد ایام مصیبت کاٹنے لگا۔ دنیا میں اب اس کا کوئی رفیق نہ تھا وہ دن بھر آبادی سے دور ایک چٹان پر اپنے خیال میں مست بیٹھا رہتا تھا۔لوگ سمجھتے کہ یہ کوئی شراب عرفان کا مخمور ہے شاہ بامراد کو یوں گزران کرتے ایک زمانہ گزر گیا اور شباب کی الوداع اور پیری

کے خیر مقدم کے سامان ہونے لگے۔

تب ایک روز شاہ بے مراد بستی کے سردار کے پاس گیا اور اس سے کہا میں اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں اس کی جانب سے یہ پیغام سن کر وہ متعجب ہو گیا مگر چوں کہ دل میں شاہ صاحب کے کمال و فقر کا معتقد تھا۔ رد سوال نہ کر سکا اور اپنی دوشیزہ نوجوان بیٹی ان کے نذر کی تیسرے سال اس نازنین کے گلشن مراد میں ایک نورس پودا اگا شاہ صاحب فرط مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سمائے بچہ کو گود میں اٹھالیا، اور حیرت میں ڈوبی ہوئی ماں کے روبرو پرجوش لہجے میں بولے ''خدا کا شکر ہے ملک جنت نشان کا وارث پیدا ہوا''

بچہ پڑھنے لگا فہم و ذکا میں ہمت و طاقت میں وہ اپنی دوگنی عمر کے بچوں سے بڑھا کرتا تھا صبح ہوتے ہی غریب رندہ بچے کا بناؤ سنگار کر کے اور اسے ناشتہ کھلا کر اپنے کام دھندے میں مصروف ہو جاتی تھی اور شاہ صاحب بچے کی انگلی پکڑ کر اسی آبادی سے دور چٹان پر لے جاتے وہاں کبھی اسے پڑھاتے، کبھی فنون حرب کی مشق کراتے اور کبھی اسے قانون شاہی سمجھاتے، بچہ تھا تو کمسن مگر ان باتوں میں ایسا جی لگاتا اور ایسے شوق سے مصروف رہتا گویا اسے اپنے حسب و نسب کا حال معلوم ہے مزاج بھی اس کا شاہانہ واقع ہوا تھا گاؤں کا ایک ایک لڑکا اس کے حکم کا فرمانبردار تھا ماں اس پر فخر کرتی، باپ پھولا نہ سماتا اور گاؤں کے سارے لوگ سمجھتے کہ یہ شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا اثر ہے۔

بچہ مسعود دیکھتے دیکھتے ایک ہفت سالہ نوجوان شہزادہ ہو گیا اسے دیکھ کر دیکھنے والے کے دل میں سرور پیدا ہوتا تھا۔ ایک روز شام کا وقت تھا شاہ صاحب تنہا سیر

کرنے گئے اور جب لوٹے تو ان کے سر پر ایک تاج مرصع زیب دے رہا تھا۔
رندہ ان کی یہ ہیئت دیکھ کر سہم گئی اور منہ سے کچھ بول نہ سکی تب انہوں نے نوجوان مسعود کو دیکھ کر گلے سے لگایا اسے اسی وقت نہلایا دھلایا اور اپنے چٹان کے تخت پر بٹھا کر رقت آمیز لہجے میں بولے مسعود! میں آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تمہاری امانت تمہیں سونپتا ہوں یہ اسی ملک جنت نشان کا تاج ہے کوئی وہ زمانہ تھا کہ جب یہ تاج تمہارے بدنصیب باپ کے سر پر زیب دیتا تھا اب وہ تمہیں مبارک ہو رندہ پیاری بیوی! تیرا بدقسمت شوہر کسی زمانے میں اس ملک کا فرمانروا تھا اور اب تو اس کی ملکہ ہے میں نے یہ راز تم سے اب تک چھپایا تھا، مگر ہماری فرقت کا زمانہ بہت قریب ہے اب چھپا کر کیا کروں مسعود! تم ابھی بچے ہو مگر دلیری اور ذی فہم ہو، مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بوڑھے باپ کی آخری وصیت پر دھیان دو گے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو گے یہ ملک تمہارا ہے، یہ تاج تمہارا ہے اور یہ رعایا تمہاری ہے تم انہیں اپنے قبضے میں لانے کی مرتے دم تک کوشش کرتے رہنا اور تمہیں بھی یہی بے سرو سامانی کی موت نصیب ہو تو یہی وصیت تم اپنے فرزند دلبند سے کر دینا اور یہ تاج جو اس کی امانت ہو گی، اس کے سپرد کر دینا، مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا خدا تم دونوں کو خوش و خرم رکھے اور تمہیں مراد کو پہنچائے۔
یہ کہتے کہتے شاہ صاحب کی آنکھیں بند ہو گئیں رندہ دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی اور مسعود گریہ و زاری کرنے لگا دوسرے دن صبح کو گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے اور ایک کوہستانی غار کے آغوش میں لاش کو رکھ دیا۔

(2)

شاہ کشور نے نصف صدی تک خوب عدل و انصاف سے سلطنت کی، مگر کشور کشا ثانی نے تخت پر آتے ہی اپنے عقلمند باپ کے مشیروں کو یک قلم برخاست کر دیا اور اپنی مرضی کے موافق نئے نئے وزیر و مشیر مامور کیے۔ کار سلطنت روز بروز بگڑنے لگا۔ سرداروں نے بے انصافی پر کمر باندھی، اور عمال رعایا پر جور و جبر کرنے لگے یہاں تک کہ خاندان مرادیہ کے ایک نمک خوار قدیم نے موقع اچھا دیکھ کر علم بغاوت بلند کر دیا اطراف سے لوگ اس کے زیر علم جمع ہونے لگے اور چند ہفتوں میں ایک فوج کثیر قائم ہو گئی اور مسعود بھی سردار نمک خوار کی فوج میں آ کر معمولی سپاہیوں کا کام انجام دینے لگا۔

مسعود کا اس وقت عنفوان شباب تھا دل میں مردانہ جوش اور بازوؤں میں شیروں کی قوت موجود تھی ایسا وجیہ اور کشیدہ قامت جوان رعنا بہت کم کسی نے دیکھا ہو گا شیروں کے شکار کا اسے عشق تھا دور دور تک کے جنگل درندوں سے خالی ہو گئے سویرے سے شام تک اسے بجز سیر اور شکار کے اور کوئی دھندا نہ تھا لب و لہجہ ایسا دل کش پایا تھا کہ جس وقت سرور میں آ کر کوئی نغمہ چھیڑ دیتا تو راہ چلتے مسافروں اور پہاڑی عورتوں کا ایک اژدحام لگ جاتا تھا کتنے ہی بھولے بھالے دلوں پر اس کی موہنی صورت نقش تھی کتنی ہی آنکھیں اس کے دیدار کو ترستیں اور کتنی ہی جانیں اس کے سوز محبت میں کھلتی تھیں، مگر مسعود پر ابھی تک کسی کا جادو نہ چلا تھا ہاں اگر اسے محبت تھی تو اپنی شمشیر آبدار سے جو اس نے باپ سے ورثہ میں پائی تھی اس تیغ کو وہ

جان سے زیادہ عزیز رکھتا۔ بے چارہ خود برہنہ تن رہتا مگر اس کے لئے انواع و اقسام کے میان بنوائے تھے اسے ایک دم کے لئے اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا سچ ہے ایک دلیر سپاہی کی تلوار اس کی نگاہوں میں دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہے خصوصاً وہ خنجر آبدار جس کا جوہر متعدد موقعوں پر پرکھا جا چکا ہو اسی تیغ سے مسعود نے کتنے ہی وحشی درندوں کو ہلاک کیا تھا کتنے ہی لٹیروں اور رہزنوں کو شربت مرگ چکھایا تھا اور اسے یقین کامل تھا کہ یہی تلوار کسی دن کشور کشا ثانی کے سر پر چمکے گی اور اس کی شہ رگ کے خون سے اپنی زبان تر کرے گی۔

ایک روز ایک شیر کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا دھوپ سخت تھی بھوک اور پیاس سے جی بیتاب ہوا مگر وہاں نہ تو کوئی میوے کا درخت، نہ کوئی رواں چشمہ نظر آیا جس سے بھوک و پیاس کی آگ بجھاتا حیران و پریشان کھڑا تھا کہ سامنے سے ایک مہ وش نازنین ہاتھ میں نیزہ لئے اور اسپ برق رفتار پر سوار آتی ہوئی دکھائی دی پسینے کے موتی سے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار تھے اور گیسوے عنبریں دونوں شانوں پر ایک دلپذیر بے تکلفی سے بکھرے ہوئے تھے دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور مسعود کا دل ہاتھ سے جاتا رہا اس غریب نے آج تک ایسا جمال جہاں سوز نہ دیکھا تھا اس پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا یہ نازنین اس دیار میں ملکہ شیر افگن کے نام سے مشہور تھی۔

ملکہ نے مسعود کو دیکھ کر گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور تند لہجے میں بولی ''کیا تو وہی نوجوان ہے جو میرے علاقے میں شیروں کا شکار کیا کرتا ہے بتلا تیری اس گستاخی کی کیا سزا دوں؟'' یہ سنتے ہی مسعود کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور بے اختیار ہاتھ

دستہ تیغ پر جا پہنچا، مگر ضبط کر کے بولا" اس سوال کا جواب میں خوب دیتا اگر بجائے آپ کے وہ کسی دلیر مرد کی زبان سے نکلتا"

ان الفاظ نے ملکہ کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اس نے گھوڑے کو چمکایا اور نیزہ اچھالتی سر پر آ پہنچی اور وار پر وار کرنے شروع کئے۔ مسعود کے ہاتھ پاؤں شدت تکان سے شل ہو رہے تھے اور ملکہ شیر افگن فن نیزہ بازی میں فرد تھی اس نے پیہم چرکے پر چرکے لگائے یہاں تک کہ مسعود زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ اس نے اب تک بجز ملکہ کے واروں کو کاٹنے کے خود ایک ہاتھ بھی نہ چلایا تھا۔

تب ملکہ گھوڑے سے کودی اور اپنا رومال پھاڑ پھاڑ کر مسعود کے زخم باندھنے لگی ایسا دلیر اور غیور جواں مرد اس کی نظر سے آج تک نہ گزرا تھا وہ اسے با آرام تمام اٹھوا کر اپنے خیمے میں لائی اور دو ہفتے تک اس کی عیادت میں مصروف رہی یہاں تک کہ زخم انگور ہو گئے اور مسعود کا چہرہ پھر بدر کامل کی طرح چمکنے لگا مگر حسرت یہ تھی کہ اب ملکہ نے اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔

ایک روز ملکہ شیر افگن نے مسعود کو دربار میں بلایا اور یوں ہمکلام ہوئی" اے مغرور نوجوان! خدا کا شکر ہے کہ تو میرے نوک سنان کے زخموں سے صحت پا گیا۔ اب میرے علاقے سے جا، تیری گستاخی معاف کرتی ہوں مگر آئندہ میرے علاقے میں شیر کے شکار کے لئے آنے کی جرأت نہ کرنا فی الحال تاکیداً تیری تلوار چھین لی جائے گی تا کہ تو نشہ نخوت سے مخمور ہو کر پھر ادھر قدم بڑھانے کی ہمت نہ کرے۔"

مسعود نے شمشیر برہنہ نیام سے کھینچ لی اور کڑک کر بولا" جب تک میرے دم

میں دم ہے کوئی یہ تلوار مجھ سے نہیں لے سکتا۔ یہ سنتے ہی ایک قوی ہیکل دیو قامت پہلوان للکار کر بڑھا اور مسعود کی کلائی پر تیغ کا تلا ہوا ہاتھ چلایا۔ مسعود نے وار خالی دیا اور سنبھل کر تیغ کا وار کیا تو پہلوان کی گردن کا تسمہ تک باقی نہ رہا۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ملکہ کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ غضب ناک لہجے میں بولی" خبردار، یہ شخص یہاں سے زندہ نہ جانے پائے چوطرفہ سے نبرد آزمائیاں پختہ کار پل پڑے اور مسعود پر تلواروں اور نیزوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

مسعود کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ خون کے فوارے جاری تھے اور خون کی پیاسی تلواریں زبان کھولے بار بار اس کی طرف لپکتی تھیں اور اس کا خون چاٹ کر شادکام ہو جاتی تھیں۔ کتنی ہی تلواریں اس کے سر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں کتنے ہی دلاوران سرفروش زخمی ہو کر تڑپنے لگے اور کتنے ہی راہی عدم ہو گئے مگر مسعود کے ہاتھ میں شمشیر آبدار جوں کی توں برق کی طرح کوندتی اور تھراتی رہی یہاں تک کہ پرفن ملکہ نے خود نعرہ تحسین بلند کیا اور اس کے تیغ کا بوسہ لے کر بولی" مسعود تو بحر بسالت کا نہنگ ہے شیروں کے شکار میں تضیع اوقات مت کر دنیا میں شکار کے علاوہ اور ابھی ایسے مواقع ہیں جہاں تو اپنے تیغ آبدار کا جوہر دکھا سکتا ہے جا اور ملک و قوم کی خدمت کر سیر و شکار ہم جیسی عورتوں کے لئے چھوڑ دے۔"

مسعود کے دل نے گدگدایا کلام شوق زبان تک آیا مگر باہر نہ نکل سکا اور اسی وقت وہ اپنے جگر میں ناوک مژگان کی خلش لئے ہوئے تین ہفتوں کے بعد اپنی بے قرار ماں کے قدموں پر جا گرا۔

(3)

سردار نمک خوار کی فوج روز بروز بڑھنے لگی پہلے تو وہ تاریکی کے پردے میں خزائن شاہی پر ہاتھ بڑھاتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی یہاں تک کہ سردار کو افواج شاہی کے مقابلے میں شمشیر آزمائی کا حوصلہ ہوا اور پہلی ہی لڑائی میں چوبیس قلعے اس نئی فوج کے ہاتھ آ گئے فوج شاہی نے لڑنے میں مطلق دریغ نہ کیا مگر وہ طاقت، وہ جذبہ، وہ جوش جو سردار نمک خوار اور اس کے رفقاء کے دلوں کو میدان ہمت میں آگے بڑھاتا رہتا تھا کشور کشا ثانی کے سپاہیوں میں معدوم تھا فنون جنگ آوری، خوبی اسلحہ اور ظاہری تزک و احتشام کے لحاظ سے دونوں فوجوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا بادشاہ کے سپاہی لحیم و شحیم، توانا و تنومند اور کار آزمودہ تھے ان کے سازو سامان اور طور و طریق سے دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی اور وہ ہم بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ اس زبردست جماعت کے مقابلے میں نیم مسلح، نیم برہنہ اور بے قاعدہ سرداری فوج ایک لمحہ تک بھی قدم جما سکے گی مگر جس وقت ''بزن'' کی دل بڑھانے والی صدا ہوا میں گونجی، ایک عجیب و غریب نظارہ پیش نظر ہو گیا۔ سردار کے سپاہی تو نعرے مار کر آگے دھاوا کرتے تھے اور سپاہ قیصری راہ گریز پر ایک دبی ہوئی نگاہیں ڈالتی تھی دم زدن میں مورچے غبار کی طرح پھٹ گئے اور جب مسقاط کے مضبوط قلعے میں سردار نمک خوار شاہی قلعہ دار کی مسند پر امیرانہ کروفر سے بیٹھا اور اپنی سپاہ کی کارگزاریوں اور جانبازیوں کی داد دینے کے لئے ایک نشست میں طلائی تمغے منگوا کر رکھے تو سب سے پہلے جس سپاہی کا نام پکارا گیا وہ نوجوان مسعود تھا۔

مسعود اس وقت اپنی فوج کا مایہ ناز تھا میدان جنگ میں سب سے پہلے اسی کی

تلوار چمکتی تھی، اور دھاوے کے وقت سب سے پہلے اسی کے قدم اٹھتے تھے۔ غنیم کے مورچوں میں ایسی بے باکی سے گھستا تھا جیسے آسمان میں شہاب ثاقب اس کی تلوار کے وار قیامت تھے اور اس کا نشانہ تیر پیام مرگ۔

مگر چرخ کج رفتار سے اس کا یہ اعزاز و وقار دیکھا نہ گیا چند افسران آزمودہ کار جن کے تیغوں کی چمک مسعود کے تیغ کے سامنے ماند پڑ گئی تھی، اس سے خار کھانے لگے تھے اور اسے مٹا دینے کی تدبیریں سوچنے لگے سو اتفاق سے انہیں موقع بھی جلد ہاتھ آ گیا۔

کشور کشا ثانی نے باغیوں کی سرزنش کے لئے اب کی ایک جرار فوج روانہ کی اور میر شجاع کو اس کا سپہ سالار جو میدان کارزار میں اپنے وقت کا اسفندیار تھا سردار نمک خوار نے یہ خبر پائی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے میر شجاع کے مقابلے میں آنا شکست کی دعوت کرنا تھا بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ اس خطے سے آبادی کا نان مٹا کر ہم لوگ قلعہ بند ہو جائیں اس وقت نوجوان مسعود نے پر جوش لہجے میں کہا۔

''نہیں ہم قلعہ بند نہیں ہوں گے ہم میدان میں رہیں گے اور دست بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے ہمارے سینے کی ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں قلعہ بند ہونا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دو بدو نہیں لڑ سکتے کیا آپ لوگ جو شاہ بامراد کے نام لیوا ہیں، بھول گئے کہ اسی **ملک** پر اس نے اپنے خاندان کے تین لاکھ سپوتوں کو پھول کی طرح نثار کر دیا؟ نہیں! ہم ہرگز قلعہ بند نہیں ہوں گے ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اگر خدا منصف ہے تو ضرور ہماری تلواریں دشمنوں سے گلے ملیں گی اور ہمارے نیزے ان سے ہم

آغوش ہوں گے۔''

صد ہا نگاہیں مسعود کے پر جوش چہرے کی طرف اٹھ گئیں سرداروں کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور سپاہیوں کے سینے جوش سے دھڑکنے لگے سردار نمک خوار نے اسے گلے سے لگالیا اور بولے ''مسعود تیری ہمت اور حوصلے کو آفریں تو ہماری فوج کے لئے باعث فخر ہے تیری صلاح مردانہ صلاح ہے بے شک ہم قلعہ بند نہ ہوں گے ہم دشمن کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشان کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے تو ہمارے لئے مشعل رہبر ہے اور ہم سب آج اسی روشنی میں قدم آگے بڑھائیں گے۔''

مسعود نے چنے ہوئے سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا اور کچھ اس دم خم اور کچھ اس جوش و خروش سے میر شجاع پر ٹوٹا کہ اس کی ساری فوج میں کھلبلی مچ گئی سردار نمک خوار نے جب دیکھا کہ سپاہ قیصری کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو اپنی پوری فوج سے برق و بار کی طرح لپکا اور تیغوں سے تیغے اور نیزوں سے نیزے کھڑکنے لگے۔ تین گھنٹے تک ایک شور محشر بپا تھا یہاں تک کہ سپاہ قیصری کے قدم اکھڑ گئے اور وہ سپاہی جس کی تلوار میر شجاع کے گلو گیر ہوئی، مسعود تھا۔

تب سرداری فوج اور افسر سب کے سب مال غنیمت پر ٹوٹے اور مسعود زخموں سے چور اور خون سے رنگا ہوا اپنے چند جانباز رفیقوں کے ساتھ قلعہ مسقاط کی طرف لوٹا۔ مگر جب ہوش نے آنکھیں کھولیں اور حواس بجا ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ میں ایک آراستہ کمرے میں مخملی گدے پر لیٹا ہوا ہوں۔ پھولوں کی دلآویز مہک اور ماہر دیاں سرو قد کے جمگھٹ سے کمرہ تختہ چمن بنا ہوا تھا۔ نظر استعجاب سے ادھر ادھر

تا کنے لگا کہ اتنے میں ایک پری وش، گل اندام نازنین طشت میں پھولوں کا ہار کئے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی گویا بہار پھولوں کی ڈالی پیش کرنے آ رہی ہے اسے دیکھتے ہی ماہ رویان سرو قد نے آنکھیں فرش راہ کیں اور اس کے دست حنائی کے بوسے لئے مسعود دیکھتے ہی پہچان گیا یہ ملکہ شیر افگن تھی۔

ملکہ نے پھولوں کا ہار مسعود کے گلے میں ڈالا زرو جواہر اس پر نثار کئے اور مسند زرنگار پر جلوہ افروز ہو گئی سازندوں نے بین لے کر فاتح مہمان کے خیر مقدم میں دل کش نغمے الاپنے شروع کئے۔

یہاں تو عیش و طرب کے جلسے تھے، ادھر رشک خانہ بر انداز نے نئے شگوفے کھلائے۔ سردار سے شکایت کی کہ مسعود ضرور حریف سے جا ملا ہے اور مصلحتاً ایک دستہ فوج لے کر لڑنے کو گیا تھا تا کہ اسے خاک و خون میں ملا کر سرداری فوج کو بے چراغ کر دے۔ اس کی شہادت میں چند نقلی خطوط بھی دکھائے اور اس کمینہ کوشش میں ایسی چرب زبانی سے کام لیا کہ آخر سردار کو ان باتوں پر یقین آ گیا جب علی الصباح مسعود ملکہ شیر افگن کے دربار سے فتح کا ہار ڈالے سردار کو مبارک باد دینے گیا تو بجائے اس کے قدر دانی کا خلعت اور تمغہ پائے، وہاں تیر ملامت کا نشانہ بنایا گیا اور اسے حکم ملا کہ تلوار کمر سے کھول کر رکھ دے۔

مسعود دم بخود رہ گیا یہ پدر بزرگوار سے ورثہ میں پایا ہے اور یہ میری گزشتہ عظمت کی آخری یادگار ہے یہ میری قوت بازو اور میرا معین و مددگار ہے۔ اس کے ساتھ کیسی کیسی یادگاریں وابستہ ہیں۔ کیا میں جیتے جی اسے اپنے پہلو سے جدا کر دوں اگر مجھ پر کوئی فرد بشر اس تیغہ کا استعمال میرے مقابلے میں زیادہ کارگزاری

کے ساتھ کرسکتا اگر میرے بازوؤں میں تیغہ پکڑنے کی قوت نہ ہوتی تو بخدا میں خود ہی تیغہ کمر سے کھول کر رکھ دیتا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں ان الزامات سے بری ہوں پھر کیوں میں اسے ہاتھ سے دوں؟ کیا اس لئے کہ چند بدخواہ حاسدوں نے سردار نمک خوار کو میری جانب سے بدظن کر دیا ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔

مگر پھر اسے خیال آیا کہ میری سرکشی پر سردار اور بھی برگشتہ ہو جائیں گے اور یقیناً مجھ سے تلوار بزور شمشیر چھین لی جائے گی ایسی حالت میں میرے اوپر نثار ہونے والے سپاہی کب اپنے تئیں قابو میں رکھ سکیں گے ضرور آپس میں خون کی ندیاں بہیں گی اور بھائی بھائی کا سر کاٹے گا نا خدا نہ کرے کہ میرے سبب سے ایسے روح فرسا سانحے درپیش ہوں یہ سوچ کر اس نے چپکے سے شمشیر سردار نمک خوار کے پہلو میں رکھ دی اور خود سر نیچا کئے ضبط کی انتہائی قوت سے غصہ کو دباتا ہوا خیمہ سے باہر نکل گیا۔

مسعود پر ساری فوج فخر کرتی تھی اور اس پر جانیں وار کرنے کے لئے سربکف رہتی تھی جس وقت اس نے شمشیر آبدار کھولی ہے دو ہزار سورما سپاہی نیام پر ہاتھ رکھے اور شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے کنوتیاں بدل رہے تھے۔

مسعود کے ایک ذرا سے اشارے کی دیر تھی اور دم کے دم میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے مگر مسعود شجاعت ہی میں یگانہ روزگار نہ تھا، ضبط اور استقلال میں بھی اس کا ثانی نہ تھا اس نے یہ ذلت و رسوائی سب گوارا کی تلوار دینا گوارا کیا مگر بغاوت کا الزام لینا گوارا نہ کیا اور ہم چشموں کے روبرو سر جھکانا گوارا کیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ اس ذلت سے فوج میں سرکشی اور نافرماں برداری کا خیال پیدا ہوا ہو اور

ایسے نازک وقت میں جب کہ کتنے ہی دلیران جنگ آزما ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور عالم غیظ وغضب میں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے۔مسعود خاموش اور ثابت قدم رہا اس کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا۔اس کے تیور ذرا بھی نہ بدلے اس نے خوں بار آنکھوں سے رفیقوں کو خیر باد کیا اور با دل حسرت اٹھا اور ایک غار کوہ میں چھپ بیٹھا اور جب آفتاب کے غروب ہو جانے پر وہاں سے اٹھا تو اس کے دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ داغ بدنامی ماتھے سے مٹاؤں گا اور حاسدوں کو ندامت کے غار میں گراؤں گا۔

مسعود نے لباس فقیرانہ اختیار کیا سر پر خود کے بجائے لمبی جٹائیں بنائیں جسم پر بجائے زرہ بکتر کے گیروے رنگ کا بانا سجایا ہاتھ میں تلوار کے بجائے قدح فقیری لیا نعرہ جنگ کی بجائے یا حق کی صدا بلند کی اور اپنا نام شیخ مخمور رکھ دیا۔مگر یہ جوگی دوسرے جوگیوں کی طرح دھونی مار کر نہ بیٹھا اور نہ فقر و ریاضت کی تلقین شروع کی وہ غنیم کی فوج میں جاتا اور سپاہیوں کی فوج میں جاتا کبھی ان کی مورچہ بندیوں کی طرف نگاہ دوڑاتا۔کبھی ان کے دمدموں اور فصیلوں کا معائنہ کرتا تین بار سردار نمک خوار غنیم کے پنجے سے ایسے وقت نکلے جب کہ انہیں جان براری کی کوئی آس نہ رہی تھی اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھیں منقاد کا قلعہ جیتنا کوئی آسان بات نہ تھی پانچ ہزار جنگ آور سپاہی اس کی محافظت میں تیار بیٹھے تھے تیس اژدہان توپیں آگ کے گولے اگلنے کے لئے منہ کھولے ہوئے تھیں اور وہ دو ہزار تیر انداز پرفن ہاتھوں میں موت کا پیغام لئے حکم کے منتظر تھے مگر جس وقت سردار نمک خوار اپنے دو ہزار جانبازوں کے ساتھ اس قلعے پر چڑھا تو پانچوں ہزار

مخالف سپاہی کاٹھ کے پتلے بن گئے توپوں کے منہ بند ہو گئے اور تیر اندازوں کے تیر ہوا میں بلند پروازیاں کرنے لگے اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامت تھی شاہ صاحب وہیں موجود تھے سردار دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑا اور ان کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔

(4)

کشور کشا ثانی کا دربار آراستہ ہے مے ناب کا دور چل رہا ہے اور امراء و روسا درجہ بدرجہ زانوے ادب تہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں یکا یک مخبروں نے خبر دی کہ میر شجاع کو شکست نصیب ہوئی اور جان سے مارے گئے۔ یہ سن کر کشور کشا کے چہرے پر تفکر کے آثار نمودار ہوئے سرداروں سے مخاطب ہو کر بولے آپ لوگ میں ایسا دلیر کون ہے جو اس بد اندیش سردار کا سر قلم کر کے مابدولت کے سامنے پیش کرے اس کی گستاخیاں اب درجہ اعتدال سے گزرتی جاتی ہیں آپ ہی لوگوں کے بزرگوں نے یہ ملک خاندان مرادیہ سے بزور شمشیر چھینا تھا کیا آپ انہیں بزرگوں کی اولاد نہیں ہیں؟ یہ سنتے ہی سرداروں میں ایک سناٹا چھا گیا سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ دعوت شاہ قبول کرے آخر شاہ کشور کشا کے غم بزرگوار اٹھے اور بولے اے شاہ جواں بخت! میں تیری دعوت قبول کرتا ہوں اگرچہ میرے قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں اور بازوؤں میں تلوار پکڑنے کی قوت باقی نہیں رہی مگر میرے خون میں وہی گرمی اور دل میں وہی جوش ہے جن کی بدولت ہم نے یہ ملک شاہ بامراد سے لیا تھا یا تو میں اس سگ ناپاک کی ہستی خاک میں ملا دوں گا، یا اس کوشش میں اپنی جان نثار کر دوں گا تاکہ اپنی نظروں سے

طوائف الموکی کے منظر نہ دیکھو۔ یہ کہہ کر امیر پر تدبیر وہاں سے اٹھا اور مستعدی سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آخری مقابلہ ہے اور اگر اس میں ناکام رہے تو بجز مر جانے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے ادھر سردار نمک خوار آہستہ آہستہ پایہ تخت کی طرف بڑھتا آتا تھا یکایک اسے خبر ملی کہ امیر پرتدبیر بیس ہزار پیدل اور سواروں کے ساتھ مقابلے کے لئے آرہا ہے۔

یہ سنتے ہی سردار نمک خوار کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور پر تدبیر باوجود پیرانہ سالی کے اپنے وقت کا ہی سپہ سالار تھا اس کا نام سن کر دلیران جنگ آزما کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے سردار نمک خوار کا خیال تھا کہ اب امیر گوشہ عبادت میں بیٹھے ہوں گے مگر ان کو اپنے مقابلے میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ مبادا اس شکست سے ہم اپنی ساری فتوحات کھو بیٹھیں اور برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے سب کی یہی صلاح ہوئی کہ واپس چلنا ہی مصلحت ہے اس وقت شیخ مخمور نے فرمایا

''اے سردار نمک خوار تو نے ملک جنت نشان کی نجات کا بیڑا اٹھایا ہے کیا انہی ہمتوں سے تیری آرزوئیں بر آئیں گی تیرے سردار اور سپاہیوں نے کبھی میدان سے قدم نہیں ہٹایا کبھی پیٹھ نہیں دکھائی تیروں کی بوچھاڑ کو تم نے پانی کی بوچھاڑ سمجھا اور بندوقوں کی باڑھ کو پھولوں کی بہار کیا ان مدارات سے تم اس قدر جلد سیر ہو گئے۔''

تم نے یہ جنگ توسیع سلطنت کے کمینہ ارادے سے نہیں چھیڑی ہے تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو کیا تمہارا جوش اتنی جلد ٹھنڈا ہو گیا کیا تمہاری تیغ انصاف اتنی جلد بجھ گئی تم خوب جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہو گی اور

تمہاری ان جانفشانیوں کا صلہ دربار عالی سے ضرور عطا ہو گا پھر ابھی سے کیوں حوصلے چھوڑے دیتے ہو؟ کیا مضائقہ ہے اگر امیر پر تدبیر بڑا دلیر اور اولوالعزم سپاہی ہے اگر وہ شیر ہے تو تم شیر مرد ہو اگر اس کی تلوار لوہے کی ہے تو تمہارا تیغہ فولاد کا ہے اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمہارے سپاہی بھی سرفروش ہیں ہاتھوں میں تیغہ مضبوط پکڑو اور نام خدا لے کر ٹوٹ پڑو۔ تمہارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمہارا ہے۔

اس پرجوش تقریر نے سرداروں کے حوصلے ابھار دیئے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تلواریں پہلو بدلنے لگیں اور قدم بے اختیار عرصہ کارزار کی طرف بڑھے۔ شیخ مخمور نے تب دلق فقیری اتار پھینکا۔ قدح فقیری کو سلام کیا اور ہاتھوں میں وہی تیغہ اور سپر لے کر جو کسی وقت مسعود سے چھینے گئے تھے، سردار نمک خوار کے پہلو بہ پہلو سپاہیوں اور افسروں کا دل بڑھاتے۔ شیرانہ وار بھرتا ہوا چلا آدھی رات کا وقت تھا امیر کے سپاہی ابھی منزلیں مارے چلے آتے تھے بے چارے ابھی دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ یکایک سردار نمک خوار کے آپہنچنے کی خبر پائی ہوش اڑ گئے اور ہمتیں ٹوٹ گئیں مگر امیر شیر کی طرح گرج کر خیمے سے باہر آیا اور دم زدن میں اپنی ساری فوج دشمن کے مقابلے میں صف بستہ کھڑی کر دی گویا ایک باغبان تھا کہ آیا اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک گلدستہ میں سجا گیا۔

دونوں فوجیں کالے کالے پہاڑوں کی طرح آمنے سامنے کھڑی تھیں اور توپوں کی آتش باری کوہ آتش فشاں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ان کی گھن گرج کی صدا سے ایک شور محشر بپا تھا یہ پہاڑ بتدریج آگے بڑھتے گئے۔ یکایک وہ ٹکرائے اور

کچھ اس زور سے ٹکرائے کہ زمین کانپ اٹھی اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی مسعود کا تیغہ اس وقت بلائے بے درمان تھا جدھر پہنچتا، لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے اور سینکڑوں سر اس پر سے نثار ہو جاتے تھے۔

پو چھٹنے تک تیغے یوں کھڑکا کئے اور یوں ہی خون کا دریا بہتا رہا۔ جب روز روشن ہوا تو میدان جنگ بازار مرگ سے مشابہ ہو رہا تھا جدھر نگاہ اٹھتی تھی مقتولین کے سر اور اعضا لہو میں تیرتے دکھائی دیتے تھے یکایک شیخ مخمور کی کمان سے ایک تیر برق بن کر نکلا اور امیر پر تدبیر کے خرمن جان پر گرا اور اس کے گرتے ہی فوج قیصری نے راہ گریز اختیار کی اور سرداری فوج فتح و نصرت کا علم بلند کئے پایہ تخت کی طرف بڑھی۔

(5)

جب یہ فوج ظفر شہر پناہ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کے زن و مرد جو مدت دراز سے غلامی کے جور و ستم جھیل رہے تھے اس کے خیر مقدم کے لئے نکل پڑے سارا شہر اُمڈ آیا لوگ سپاہیوں کو گلے لگاتے تھے اور ان پر پھولوں کی برکھا کرتے تھے۔ گویا بلبلیں تھیں جو پنجہ صیاد سے رہائی پانے پر گلستان چمن میں گلوں کو چوم رہی تھیں۔ لوگ شیخ مخمور کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگاتے تھے اور سردار نمک خوار کے پیروں پر مسرت اور انبساط کے آنسو بہائے تھے۔

اب موقع تھا کہ مسعود اپنا جوگیا بھیس اتار پھینکے اور دعوئے تخت و تاج پیش کرے مگر جب اس نے دیکھا کہ ملکہ شیر افگن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے تو خاموش ہو رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر میں اپنا دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچاؤں تو ملکہ کا

دعویٰ باطل ہو جائے گا مگر تاہم یہ ناممکن تھا کہ بلا سخت کشت وخون کے یہ فیصلہ ہو سکے۔ ایک پر جوش اور آرزو مند دل کے لئے اس حد تک ضبط کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا یہ خیال کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، اس کا رگ وریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ شاہ بامراد کی وصیت اسے ایک دم کو بھی نہ بھولتی تھی دن کو وہ بادشاہت کے منصوبے باندھتا اور رات کو بادشاہت کے خواب دیکھتا۔ یہ یقین کہ میں۔۔۔۔اسے بادشاہ بنائے ہوئے تھا۔ افسوس! آج وہ منصوبے ٹوٹ گئے اور وہ خواب پریشان ہو گیا مگر مسعود کے اوصاف میں مردانہ ضبط کی انتہائی حد کھینچ گئی تھی اس نے اف تک نہ کی ایک ٹھنڈی آہ بھی نہ بھری بلکہ پہلا شخص جس نے ملکہ کے دست مبارک کا بوسہ دیا اور اس کے روبرو سر اطاعت خم کیا وہ فقیر مخمور تھا وہاں عین اس وقت جب کہ وہ بوسہ لے رہا تھا اس کی زندگی بھر کی آرزو میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بن کر ملکہ کے کف حنائی پر گر پڑیں۔ گویا مسعود نے اپنا در آرزو ملکہ کو سونپ دیا ملکہ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فقیر مخمور کے چہرے پر شفقت آمیز نگاہ ڈال جب سب ارا کین سلطنت نذریں گزران چکے، توپوں کی سلامیاں داغنے لگیں۔ شہر میں عیش ونشاط کا بازار گرم ہو گیا اور مسرت اور شادمانی کے جلوے ہر چہار طرف نظر آنے لگے۔

تخت نشینی کے تیسرے دن مسعود گوشہ عبادت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملکہ شیر افگن تنہا اس کے پاس آئی اور بولی ’’مسعود! میں ایک ناچیز تحفہ تمہارے لئے لائی ہوں، اور وہ میرا دل ہے کیا تم اسے میرے ہاتھ سے قبول کرو گے؟‘‘

مسعود ششدر رہ گیا مگر جب ملکہ کی آنکھیں نشہ الفت سے مخمور پائیں تو فرط

شوق سے اٹھا اور اسے سینے سے لگا کر بولا ”میں تو مدت سے تمہاری نوک سنان کا گھائل ہوں زہے نصیب کہ آج تم مرہم رکھنے آئی ہو۔“

(6)

ملک جنت نشان اب آزادی کا مسکن اور خوش حالی کا مرزبوم رہا ملکہ شیر افگن کو ابھی تخت پر بیٹھے سال بھر سے زیادہ نہیں گزرا مگر کاروبار سلطنت بڑی خوبی اور حسن انتظام سے چل رہا ہے اور اس کار اہم میں اس کا پیارا شوہر مسعود جو ابھی تک فقیر مخمور ہی کے نام سے مشہور رہے، اس کا مشیر و معاون ہے۔

رات کا وقت تھا دربار شاہی آراستہ تھا وزراء عالی مقام حسب رتبہ بیٹھے ہوئے تھے، اور خدام زرق برق معرق وردیاں پہنے دست بستہ کھڑے تھے کہ ایک پیش خدمت نے آ کر عرض کی، ملکہ دو جہاں ایک خستہ حال عورت باہر کھڑی ہے اور شرف قدم بوسی چاہتی ہے ارا کین سلطنت چونکے اور ملکہ نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا ”اندر حاضر کرو پیش خدمت باہر چلا گیا اور ذرا دیر میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی اور اپنی پٹاری سے ایک مرصع تاج نکال کر بولی“ تم لوگ اسے لے لو، اب یہ میرے کسی کام کا نہیں رہا میاں نے مرتے وقت اسے مسعود کو دے کر کہا تھا تم اس کے مالک ہو، مگر اپنے جگر کے ٹکڑے مسعود کو کہاں ڈھونڈوں۔ روتے روتے اندھی ہو گئی ساری دنیا کی خاک چھانی مگر اس کا کہیں پتہ نہ لگا اب زندگی سے عاجز آ گئی ہوں جی کر کیا کروں گی یہ امانت میرے پاس ہے جس کا جی چاہے لے لے۔

دربار میں سناٹا چھا گیا لوگ فرط حیرت سے نقش دیوار بنے ہوئے تھے گویا

ایک ساحر تھا کہ انگلی کے اشارے سے سب کا دم بند کیے ہوئے تھا یکا یک مسعود اپنی جگہ سے اٹھا اور روتا ہوا رندہ کے قدموں پر گر پڑا رندہ اپنے لخت جگر کو دیکھتے ہی پہچان گئی اسے چھاتی سے لگالیا اور وہ تاج وصع اس کے زیب سر کر کے بولی۔

''صاحبو! یہی میرا پیارا مسعود اور شاہ بامراد کا لخت جگر ہے تم لوگ اس کی رعایا ہو یہ تاج اس کا ہے یہ ملک اس کا ہے اور ساری خلقت اس کی ہے آج سے وہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے اور اپنی قوم کا خادم۔''

دربار میں ایک شور قیامت برپا ہو گیا ارکین اٹھے اور مسعود کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر تخت پر ملکہ شیر افگن کے پہلو میں بٹھا دیا۔ نذریں گزرنے لگیں فقیروں نے شادمانی کا نغمہ گایا اور جون نے کامرانی کا شور مچایا مگر جب یہ شور مسرت ذرا کم ہوا اور لوگوں نے رندہ کو دیکھا تو وہ مر گئی تھی۔ آرزوؤں کے پورے ہوتے ہی جان نکل گئی گویا آرزوئیں روح بن کر اس کے تن خاکی کو زندہ کیے ہوئے تھیں۔

☆☆☆☆☆

بے غرض محسن

پہلی بار: ''ادیب'' ستمبر 1910ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی اول)

ساون کا مہینہ تھا، ریوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی، مانگ چوٹی سنواری۔ اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جا کر بولی ''اماں جی آج میں میلہ دیکھنے جاؤں گی''

ریوتی پنڈت چنتا من کی بیوی تھی پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھ کر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی لین دین کا کاروبار کرتے تھے مگر اور مہاجنوں کے خلاف خاص خاص حالتوں کے سوا 25 فیصدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچے کو گود میں لئے کھٹولے پر بیٹھی تھیں بہو کی بات سن کر بولیں

''بھیگ جاؤ گی تو بچے کوز کام ہو جائے گا''

ریوتی: ''نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی ابھی چلی آؤں گی''

ریوتی کے دو بچے تھے ایک لڑکا دوسری لڑکی لڑکی ابھی گود میں تھی اور لڑکا ہیرا من ساتویں سال میں تھا ریوتی نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے، نظر بد سے بچانے کے لئے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دیئے گڑیاں پیٹنے کے لئے

ایک خوش رنگ چھڑی دے دی اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ لگا تھا، نیلگوں گھٹائیں چھائی تھیں۔عورتیں سولہ سنگار کیے ساگر کے پرفضا میدان میں ساون کی رم جھم برکھا کی رت لوٹ رہی تھیں۔شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔کوئی جھولا جھولتی ہوگی ملہار گاتی، کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا پانی کی ہلکی پھوار، پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریاول، لہروں کے دلفریب جھکولے موسم کو تو بہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے، گڑیا اپنی سسرال جائیں گی، کنواری لڑکیاں اپنے ہاتھ میں مہندی رچائے گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انہیں بدا کرنے آئی ہیں۔انہیں پانی میں بہاتی ہیں اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہیں مگر دامن عافیت سے نکلتے ہی ان نازونعمت سے پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی دفعتاً اس کا پاؤں پھسلا تو پانی میں جا پڑا، ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔۔۔۔دم کے دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ہجوم ہو گیا مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی کہ پانی میں جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے۔دھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیال آ رہے تھے دس منٹ گزر گئے مگر کوئی کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا غریب ریوتی پچھاڑیں کھا

رہی تھی ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا یہ اژدحام دیکھ کر اتر پڑا اور ایک تماشائی سے پوچھا ''یہ کیسی بھیڑ ہے؟''

تماشائی نے جواب دیا ''ایک لڑکا ڈوب گیا ہے''

مسافر: ''کہاں؟''

تماشائی: ''جہاں وہ عورت رو رہی ہے''

مسافر نے فوراً اپنے گاڑھے کی مرزئی اتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا چاروں طرف سناٹا چھا گیا لوگ متحیر تھے کہ کون شخص ہے اس نے پہلا غوطہ لگایا لڑکے کی ٹوپی ملی دوسرا غوطہ لگایا تو اس کی چھڑی ملی اور تیسرے غوطہ کے بعد جب وہ اوپر آیا تو۔۔۔۔لڑکا اس کی گود میں تھا تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرہ پرشور بلند کیا ماں نے دوڑ کر بچے کو لپٹا لیا اسی اثنا میں پنڈت چنتا من کے اور کئی عزیز آ پہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں لوگوں کی جان میں جان آئی ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب۔۔۔۔لوگ اپنے گم نام محسن کو ڈھونڈنے لگے تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا چاروں طرف آدمی دوڑائے، سارا میلہ چھان مارا، مگر نظر نہ آیا۔

بیس سال گزر گئے پنڈت چنتا من کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا اس دوران میں اس کی ماں نے ساتوں جاترائیں کیں اور مریں تو ان کے نام پر ٹھاکر دوا تیار ہوا ریوتی بہو سے ساس بنی، لین دین اور کھاتہ ہیرا من کے ہاتھ آیا۔ ہیرا من اب ایک وجیہ لحیم و شحیم نوجوان تھا۔ نہایت خلیق، نیک مزاج کبھی کبھی باپ سے چھپا کر

غریب اسامیوں کو قرض حسنہ دیا کرتا تھا۔ چنتامن نے کئی بار اس گناہ کے لئے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرامن نے ایک بار سنسکرت پاٹ شالہ کے لئے پچاس روپے چندہ دیا، پنڈت جی اس پر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھچی رہتی تھی۔ مگر اس کی ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں جب کسی قصبے کی غریب ودھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے اسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگتیں تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دنیا میں نہ ہوگا تب اسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا جب ہیرامن کیرت ساگر میں ڈوب گیا تھا اور اس آدمی کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی جس نے اس کے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا اس کے عمیق دل سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھ پاتی تو اس کے پاؤں پر گر پڑتی، اب اسے کامل یقین ہوگیا تھا کہ انسان نہ تھا بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر اس کی ساس بیٹھتی تھی اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا، آج اس کا دست کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا اور یہی ایک بے جا صرف تھا جس میں پنڈت چنتامن بھی اس کے شریک ہو جاتے تھے آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گم نام محسن

ے لئے اس کے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلاترین جذبات میں رنگی ہوئی ہوتی تھیں۔ اسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سکھ دکھ دیکھنا میسر ہوا ہے۔

ایک دن ہیرامن نے آکر ریوتی سے کہا "اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے، کہو تو میں بھی دم لگاؤں"

ریوتی: سولھوانہ ہے؟

ہیرامن: سولھوانہ اچھا گاؤں ہے نہ بڑا نہ چھوٹا یہاں سے دس کوس ہے بیس ہزار تک بولی بڑھ چکی ہے سو دو سو میں ختم ہو جائے گا۔

دیوتی: اپنے دادا سے تو پوچھو

ہیرامن: ان کے ساتھ دو گھنٹے تک۔۔۔۔ سرمغزن کرنے کی کسے فرصت ہے۔

ہیرامن اب گھر کا مختارکل ہو گیا تھا اور چنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی تھی وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے دن ہیرامن کے نام پر سری پور ختم ہو گیا۔ مہاجن سے زمیندار ہوئے اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گاؤں کی سیر کرنے کو چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی، نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی، گھر گھر نذرانے دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گاؤں میں داخل ہوئے، دہی اور چاول کا

تلک لگایا تھا اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے ان کی خدمت میں کھڑے رہے سویرے مختار عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا جو اسامی زمیندار کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے مطابق ایک دو روپے ان کے پاؤں پر رکھ دیتا دو پہر ہوتے ہوتے وہاں پانچ سو روپے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیر امن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا سب نشوں سے زیادہ تیز قاتل ثروت کا نشہ ہے جب اسامیوں کی فہرست ختم ہوگئی تو مختار سے بولے ''اور کوئی اسامی باقی تو نہیں ہے''

مختار: ہاں مہاراج ابھی ایک اسامی اور ہے، تخت سنگھ

ہیر امن: وہ کیوں نہیں آیا

مختار: ذرا مست ہے

ہیر امن: میں اس کی مستی اتار دوں گا، ذرا اسے کوئی بلا لائے

تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا آیا اور ڈنڈوت کرکے زمین پر بیٹھ گیا نہ نذرانہ نیاز اس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیر امن کو بخار چڑھ آیا کڑک کر بولے'' ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا ہے ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دوں گا''

تخت سنگھ نے ہیر امن کی طرف غور سے دیکھا جواب دیا ''میرے سامنے بیس زمیندار آئے اور چلے گئے مگر ابھی کسی نے اس طرح کی گھڑکی نہیں دی''

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی اٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا دیکھا زمیندار کو کیسے آدمی ہیں؟

تخت سنگھ: اچھے آدمی ہیں میں انہیں پہچان گیا

ٹھکرائن: کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے؟

تخت سنگھ: ''میری ان کی بیس سال کی جان پہچان ہے گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا؟''

اس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سری پور دیکھنے کا شوق ہوا، اور وہ اس کے بہو اور بچے سب سری پور آئے گاؤں کی سب عورتیں ان سے ملنے آئیں ان میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اس کی بات چیت، سلیقہ اور تمیز دیکھ کر ریوتی دنگ رہ گئی جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا ٹھکرائن کبھی کبھی آیا کرو نا تم سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہو گیا یہاں تو یہ کیفیت تھی اور ہیرامن اپنے مختار عام کے مقابلے میں آ کر تخت سنگھ کو بے دخل کرنے کی بندشیں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورن ماشی آئی ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں ریوتی چھلنی میں میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی ریوتی نے مسکرا کر کہا ''ٹھکرائن ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتا ہے۔''

ٹھکرائن: تمہارا نیوتا سر آنکھوں پر، کون سی برس گانٹھ ہے؟

ریوتی: انیسویں

ٹھکرائن: نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سو دن اور تمہیں دیکھنے نصیب ہوں

ریوتی: ٹھکرائن تمہاری زبان مبارک ہو بڑے بڑے جنتر منتر کیے ہیں تب تم

لوگوں کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے یہ ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی ان کی جان انہیں کی دی ہوئی ہے بہت تلاش کرایا ان کا پتہ نہ چلا ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سو روپے نکال رکھتی ہوں۔ دو ہزار سے کچھ اوپر ہو گیا ہے بچے کی نیت ہے کہ ان کے نام سے سری پور میں ایک مندر بنوا دیں سچ ماتو ٹھکرائن ایک بار ان کے درشن ہو جاتے تو زندگی سپھل ہو جاتی، جی کی ہوس نکال لیتے۔

ریوتی جب خاموش ہوئی تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے

دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے۔

ٹھکرائن بولی: میں ریوتی رانی کے پاس جا کر دھائی مچاتی ہوں

تخت سنگھ نے جواب دیا میرے جیتے جی نہیں

اساڑھ کا مہینہ آیا میگھراج نے اپنی جاں بخش فیاضی دکھائی سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزو مند نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ جاتیں یہاں تک زمین انہیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی وہ اب دن کے دن اسے چرایا کرتا تھا اس کی زندگی کا اب بھی ایک سہارا تھا، اس کے اپلے اور دودھ بیچ کر گزران کرتا، کبھی کبھی فاقے کرنے پڑ جاتے یہ سب مصیبتیں اس نے جھیلیں مگر اپنی بےنوائی کا رونا

رونے کے لئے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اسے زیر کرنا چاہا تھا مگر خود زیر ہو گیا، جیتنے پر بھی اسے ہار ہوئی، پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضد کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا ''بیٹا تم نے غریب کو ستایا ہے اچھا نہ کیا''

ہیرامن نے تیز ہو کر جواب دیا ''وہ غریب نہیں ہے اس کا گھمنڈ توڑوں گا''

ثروت کے نشے ہیں زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جس کا وجود ہی نہیں تھا جیسے بے سمجھ بچہ اپنی پوچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کر کے کاٹا۔ پھر برسات آئی اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن تک موسلا دھار مینہ برسا تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی، دب کر مر گئی، تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی۔ اسی دن سے اسے بخار آن شروع ہو گیا دوا دارو کون کرتا، روزی کا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹا، ظالم بے درد مصیبت نے کچل ڈالا سارا مکان پانی سے بھرا ہوا، گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا کہ ریوتی اس کے گھر گئی تخت سنگھ نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا ''کون ہے؟''

ٹھکرائن: ریوتی رانی ہیں

تخت سنگھ: میرے دھن بھاگ مجھ پر بڑی دیا کی

ریوتی نے شرمندہ ہو کر کہا ٹھکرائن ایشور جانتا ہے میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں تمہیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو تمہارے اوپر ایسی آفت پڑ گئی اور ہمیں خبر تک نہ کی۔

یہ کہہ کر ریوتی نے روپوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی روپوں کی جھنکار سن کر رخت سنگھ اٹھ بیٹھا بولا'' رانی ہم اس کے بھوکے۔۔۔۔۔نہیں ہیں مرتے دم گنہگار نہ کرو''

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہواخواہوں کو لئے ہوئے ادھر سے جا نکلا، گرا ہوا مکان دیکھ کر مسکرایا اس کے دل نے کہا آخر میں نے اس کا گھمنڈ توڑ دیا۔

مکان کے اندر جا کر بولا'' ٹھاکر اب کیا حال ہے؟''

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا'' سب ایشور کی دیا ہے، آپ کیسے بھول پڑے''

ہیرامن کی دوسری بار زک ملی اس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پاؤں کو آنکھوں سے چومے، اب بھی پوری نہ ہوئی اسی رات کو غریب آزاد منش ایماندار بے غرض ٹھاکر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بوڑھی ٹھکرائن اب دنیا میں اکیلی تھی، کوئی اس کے غم کا شریک اور اس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بے نوائی اور بے مائیگی نے غم کی آنچ اور بھی تیز کر دی تھی سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں مگر مرہم کا کام ضرور کرتے ہیں۔

فکر معاش بری بلا ہے ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چن لاتی اور اپلے بنا کر بیچتی۔ اسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں اور چراگاہوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک ہیرامن کو بھی اس پر ترس آ گیا ایک روز انہوں نے آٹا، دال، چاول تھالیوں میں رکھ کر اس کے پاس بھیجا ریوتی خود لے کر گئی مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی'' ریوتی جب تک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں مجھے اور

مرنے والے کو گنہگار نہ کرو‘‘

اس دن سے ہیرامن کو پھر اس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اپلے مول لئے گاؤں میں پیسے کے تین اپلے ملتے تھے اس نے چاہا کہ اس سے بیس ہی اپلے لوں اس دن سے ٹھکرائن نے اس کے یہاں اپلے لانا بند کر دیا۔

ایسی دیویاں دنیا میں کتنی ہیں کیا وہ اتنا نہیں جانتی تھی کہ ایک راز سربستہ زبان پر لا کر اپنی جان کاہیوں کا خاتمہ کر سکتی ہوں مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہ ہو جائے گا مثل مشہور ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال شاید اس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضع داران پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی یہ زمانہ اس نے جس تکلیف سے کاٹا اسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے، کبھی گوبر نہ ملتا۔۔۔۔کبھی کوئی اپلے چرا لے جاتا ایشور کی مرضی کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں کوئی یوں رو رو کر زندگی کاٹتا ہے۔

بڑھیا نے یہ سب دکھ جھیلا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا

ہیرامن کی تیسویں سالگرہ آئی ڈھول کی آواز سنائی دینے لگی ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں دوسری طرف تیل کی، گھی کی موٹے مغز برہمنوں کے لئے

تیل کی غریب فاقہ کش بچوں کے لئے۔

یکا یک ایک عورت نے ریوتی سے آ کر کہا" ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں تمہیں بلا رہی ہیں۔"

ریوتی نے دل میں کہا ایشور آج تو خیریت سے کاٹنا کہیں بڑھیا نہ مر رہی ہو۔

یہ سوچ کر بڑھیا کے پاس نہ گئی۔ ہیرامن نے جب دیکھا اماں نہیں جانا چاہتیں تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا مگر ریوتی مکان کے دروازے تک اسے منع کرنے آئی یہ رحم دل نیک مزاج شریف ریوتی تھی۔

ہیرامن ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جانکنی کی حالت طاری تھی ہیرامن نے زور سے کہا" ٹھکرائن میں ہوں ہیرامن" ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا پھر رک رک کر بولی میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہے یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں ہیرامن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بہ حفاظت رکھی ہوئی ہیں ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے ملے یہ شاید جانے والے کا زادراہ تھا۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا

اسی رات کو ریوتی نے خواب میں دیکھا کہ ساون کا میلہ ہے گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں اتنے میں ہیرامن پانی میں پھیل

پڑا۔۔۔۔میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔

دفعتاً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کود پڑا اور ہیرامن کو نکال لایا

ریوتی اس کے پاؤں پر گر پڑی اور بولی

''آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا

سری پور میں رہتا ہوں میرا نام تخت سنگھ ہے

سری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہے مگر اب اس کی رونق دو چند ہو گئی ہے وہاں جاؤ تو دور سے شوالے کا سنہری کلس دکھائی دینے لگتا ہے جس جگہ تخت کا مکان تھا وہاں یہ شوالہ بنا ہوا ہے اس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم شالہ ہے مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں اور تخت سنگھ کا گن گاتے ہیں۔

یہ شوالہ اور دھرم شالہ دونوں اس کے نام سے مشہور ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

رانی سارندھا

پہلی بار: ’’زمانہ‘‘ ستمبر 1910ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی اول)

اندھیری رات کو سناٹے میں وہسان ندھی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکراتی ہوئی سہانی آواز پیدا کرتی تھی گویا چکیاں گھمر گھمر کرتی ہیں۔

ندی کے داہنے کنارے پر ایک ٹیکرا ہے اس پر ایک پرانا قلعہ بنا ہوا ہے۔ جس کی فصیلوں کی گھاس اور کائی نے محاصرہ کر رکھا ہے ٹیکرے سے پورب کی طرف ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہ گاؤں اور قلعہ دونوں ایک بندیل سردار کی یادہیں صدیاں گزر گئیں بندیل کھنڈ میں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں مسلمان آئے اور گئے بندیل راجے اٹھے اور گرے کوئی دیہہ، کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جس پر ان لوک گردیوں کے داغ نہ لگے ہوں مگر قلعے پر کسی غنیم کا پھر ہرانہ لہرایا اور اس گاؤں میں کسی غنیم کے قدم نہ آئے۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی۔

انردھ سنگھ دلیر راجپوت تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب ہر شخص کو ضرورتاً دلیر اور جانباز بننا پڑتا تھا ایک طرف مسلمان فوجیں پیر سے پیر جمائے کھڑی رہتی تھیں دوسری طرف زبردست بندیل راجے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ انردھ سنگھ کے پاس کاروں اور پیادوں کی مختصر مگر آزمودہ کار جماعت تھی اس سے وہ اپنے خاندان کا وقار اپنے بزرگوں کی عزت قائم رکھتا

تھا اسے کبھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ تین سال ہوئے اس کی شادی سیتلا دیوی سے ہوئی تھی مگر ازدھ سنگھ آرزوؤں کے دن اور امیدوں کی راتیں کوہ و بیابان میں کاٹتا تھا۔ اور غریب ستیلا دیوی اس کی جان کی خیر منانے میں، وہ کتنی دفعہ شوہر سے کہہ چکی تھی وہ کئی بار اس کے قدموں پر سر گرا کر روئی تھی کہ تم میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ مجھے ہر دوارے چلو بندرا بن لے چلو مجھے تمہارے ساتھ جنگل میں رہنا منظور ہے مگر یہ بیوگ اب نہیں سہا جاتا اس نے پیار سے کہا ضد سے کہا منت سے کہا مگر ازدھا سنگھ اڑیل تھا ستیلا دیوی اپنے کسی ہتھیار سے اس پر فتح نہ پاسکی۔

اندھیری رات تھی ساری دنیا سوئی ہوئی تھی مگر تارے آسمان پر گھورتے تھے ستیلا دیوی پلنگ پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی اور کی نند سارندھا فرش پر بیٹھی ہوئی دل کش لہجے میں گا رہی تھی۔

بن رگھو بیر کٹت نہیں رین

ستیلا نے کہا: ”جی نہ جلاؤ کیا تمہیں بھی نیند نہیں آتی“

سارندھا: ”نہیں لوری سنا رہی ہوں“

ستیلا: ”میری آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی“

سارندھا: ”کسی کو ڈھونڈنے گئی ہوگی“

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہوا یہ ازدھ تھا اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور بدن پر کوئی ہتھیار نہ تھا ستیلا چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئی سارندھا نے پوچھا۔

''بھیا یہ کپڑے بھیگے کیوں ہیں؟''

انرودھ نے کہا ''ندی تیر کر آیا ہوں''

سارندھا ''ہتھیار کیا ہوئے؟''

انرودھ ''چھن گئے''

سارندھا ''اور ساتھ کے آدمی؟''

انرودھ ''سب کے سب میدان میں کام آئے''

ستیلا نے دبی زبان میں کہا ''ایشور نے بڑی خیر کی''

مگر سارندھا کے تیور پر بل پڑ گیا اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا بولی'' بھیا تم نے خاندان کی رسم کھو دی ایسا کبھی نہ ہوا''

سارندھا بھائی پر جان دیتی تھی اس کے منہ سے جلا ہوا فقرہ سن کر انرودھ شرم سے غرق ہو گیا اور وہ مردانہ جوش جسے محبت نے ذرا دیر کے لئے دبا رکھا تھا آگ کی طرح بھڑ اٹھا۔ وہ الٹے قدم لوٹا اور یہ کہہ کر سارندھا! تم نے مجھے عمر بھر کے لئے خبردار کر دیا یہ باتیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی باہر چلا گیا۔

اندھیری رات تھی آسمان پر تارے گھور رہے تھے انرودھ سنگھ قلعے سے باہر نکلا اور ذرا دیر میں ندی کے اس پار جا پہنچا اور پھر تاریکی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گیا ستیلا اس کے پیچھے پیچھے فصیل تک آئی مگر جب انرودھ جست لگا کر کود پڑا تو وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر رونے لگی۔

'' اتنے میں سارندھا بھی وہیں آ پہنچی۔ ستیلا نے ناگن کی طرح بل کھا کر کہا'' رسم اتنی پیاری ہے۔

سارندھا ''ہاں''

ستیا بولی ''اپنا پتی ہوتا تو کلیجے میں چھپا رکھتی''

سارندھا: ''نہیں کلیجے میں خنجر چبھو دیتی''

ستیا نے طیش کھا کر کہا ''ڈولی میں چھپاتی پھرو گی میری بات گرہ میں باندھ لو''

سارندھا: جس روز یہ نوبت آئے گی میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں گی اس واقعہ کے تین ماہ بعد انرودھ مہرونی کا قلع فتح کر کے لوٹا اور سال بھر کے بعد سارندھا کی شادی اور چھا کے راجہ چمپت رائے سے ہو گئی مگر اس دن کی باتیں دونوں عورتوں کے دل میں کھٹکتی رہیں۔

(2)

راجہ چمپت رائے بڑا ذی حوصلہ اولوالعزم راجپوت تھا ساری بندیلہ قوم اسے مایہ ناز سمجھتی تھی اس کے ابرو کے اشارے پر فوجیں آراستہ اور ریاستیں تباہ ہو جاتی تھیں۔مسند حکومت پر آتے ہی اس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا بند کر دیا۔اور زور شمشیر سے اپنا دائرہ سلطنت وسیع کرنے لگا۔اسلامی فوجیں بار بار حملہ آور ہوتیں اور پسپا ہو جاتیں اس کے نام پر سارا بندیل کھنڈ،فدا ہونے کو تیار تھا۔جب انرودھ سنگھ نے اپنی بہن اس کے آغوش محبت میں دی سارندھا نے منہ مانگی مراد پائی اس کی یہ آرزو تھی کہ میرا شوہر سب بندیلوں کا سرتاج ہو پوری ہو گئی اگرچہ چمپت رائے کے رنواس میں پانچ رانیاں تھیں ایک سے ایک حسین و مہ جبیں،مگر چمپت رائے کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ عورت جو دل میں میری پرستش کرتی ہے

سارندھا ہے۔

مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چمپت رائے کو دلی دربار کا حلقہ بگوہونا پڑا اس نے اپنا ملک و مال اپنے بھائی پہاڑ سنگھ کو سونپا اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ عہد شاہ جہانی کا آخری دور تھا ولی عہد کی آنکھوں میں مروت اور دل میں شرافت تھی۔ انہوں نے چمپت رائے کی معرکہ آرائیوں کی کافی داستانیں سنی تھیں اس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کالپی کی بیش بہا جاگیر اسے عنایت کی جس کے محاصل نولاکھ سالانہ تھے۔

یہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ چمپت رائے کو آئے دن کی صف آرائیوں سے نجات ملی رعب و شان کے ساتھ حکومت کرنے لگا فراغت کے ساتھ امارت کے چونچلے آپہنچے۔ عشرت محفلیں سجاتی اور مسرت کے نغمے الاپتی راجہ نشہ عیش میں متوالے ہوئے رانیاں زیورات مرصع کی چمک دمک پر بچھیں کامرانی کے نشے نے سب کو مدہوش کر دیا مگر سارندھا ان دنوں مغموم پژمردہ خاطر رہتی وہ خوشی کی مجلسوں میں بہت کم بیٹھتی اور مسرت زمزمہ سنجیاں اسے بہت کم پسند آئیں۔

ایک روز چمپت رائے نے سارندھا سے کہا ''سارن! تم اداس کیوں رہتی ہو؟ میں تمہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھتا کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

سارندھا آبدیدہ ہوکر بولی ''سوامی! آپ کیوں ایسا خیال کرتے ہیں آپ کی خوشی میری خوشی ہے جب آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں''

چمپت رائے نے کہا میں جب سے یہاں آیا ہوں میں نے تمہارے چہرے پر وہ دل آویز مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی جو میرا من موہ لیا کرتی تھی تم نے کبھی اپنے

ہاتھوں سے پیڑا نہیں کھلایا کبھی میری باگ نہیں سنواری کبھی میرے بدن پر ہتھیار نہ سجائے سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا میں خیال کروں کہ مجھ میں اب وہ تازگی نہیں رہی۔

سارندھا! ''پران ناتھ! آپ مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہیں جس کا جواب میں نہیں دے سکتی۔ بے شک ان دنوں میری طبیعت شگفتہ نہیں رہتی میں بہت چاہتی ہوں کہ خوش رہوں مگر ایک بوجھ سا دل کو دبائے رہتا ہے۔''

چمپت رائے بولے (تیوری چڑھا کر) مجھے اس دل گرفتگی کا کوئی خاص سبب نظر نہیں آتا۔ ایشور نے تمہیں کیا نہیں دیا آخر اور کیا سکھ چاہئے تمہیں؟ سارندھا کا چہرہ سرخ ہو گیا بولی

''میں کچھ کہوں؟ آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟''

چمپت رائے ''نہیں! شوق سے کہو''

سارندھا: ''اورچھا میں ایک راجہ کی رانی تھی یہاں میں ایک جاگیردار کی لونڈی ہوں اورچھا میں میں وہ تھی جو اودھ میں کوشیلا تھیں۔ مگر یہاں میں ایک شاہی نمک خوار کی کنیز ہوں جس بادشاہ کے روبرو آپ آج سر نیاز خم کرتے ہیں وہ کل آپ کا نام سن کر تھراتا تھا۔ رانی سے باندی ہو کر خوش رہنا میرے بس میں نہیں آپ نے یہ فراغت اور مخفلیں بڑی گراں قیمت دے کر خریدی ہیں۔''

چمپت رائے کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا وہ اب تک سارندھا کی روحانی عظمت سے بے خبر تھے۔ جیسے یتیم بچہ ماں کا تذکرہ سن کر رونے لگتا ہے اسی طرح سے اورچھا کی یاد سے چمپت رائے کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے اس

عقیدت سے جو ایک بچے اپاسک کی دیوی سے ہوتی ہے انہوں نے سارندھا کے قدم چوم لئے آج سے انہیں پھر اسی اجڑے دیار میں بسنے کی فکر دامن گیر ہوئی جہاں سے ہوس پرستیوں کی تمنا کھینچ لائی ہے۔

جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پا کر نہال ہو جاتی ہے اسی طرح چمپت رائے کے آنے سے بندیل کھنڈ نہال ہو گیا۔ وہ بندیل قوم کا طرہ و ستار تھا قلعہ چرچھ کے سوئے ہوئے نصیب جاگ اٹھے نوبتیں چھڑنے لگیں اور ایک بار سارندھا کی نرگسی آنکھوں میں تبسم کی جھلک نظر آنے لگی۔

یہاں رہتے کئی ماہ گزر گئے اسی اثنا میں شاہ جہاں بیمار پڑا شہزادوں میں پہلے ہی سے چشمک تھی اس خبر کے پھیلتے ہی عناد وفساد کا شعلہ بھڑک اٹھا صف آرائیوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مراد اور محی الدین اپنے دل سجا کر دکن سے چلے برسات کے دن تھے ندی نالے امنڈے ہوئے تھے کوہ و بیاباں ہری ہری گھاس سے لہرا رہے تھے۔ نالیر رنگ برنگ روپ بھر کر اپنی اداؤں کے کرشمے دکھا رہی تھی اور مراد اور محی الدین عاشقانہ بے صبری سے قدم بڑھاتے چلے آتے تھے یہاں تک کہ وہ دھول پور کے قریب دریائے چمبل کے کنارے آ پہنچے مگر یہاں پر فوج شاہی اپنے خیر مقدم کے لئے آراستہ پائی۔

شہزادے اب بڑی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ سامنے دریائے ذفار بہتا تھا رانا عرفان کی طرح مستحکم بے بسی کے عالم میں چمپت رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ خدا کے لئے آکر ان کی کشتی شکستگان کا بیڑا پار لگایئے۔

راجہ نے رنواس میں جا کر سارندھا سے پوچھا ''اس پیغام کا جواب دوں''

سارندھا ’’آپ کو مدد کرنی ہوگی‘‘

چمپت رائے ’’ان کی مدد کرنا دارا شکوہ سے بیر مول لینا ہے‘‘

سارندھا: ’’بے شک! مگر ہاتھ پھیلانے والے کی لاج رکھنا بھی ضروری ہے‘‘

چمپت رائے (سوچ کر) ’’سارن! تم نے غور کرکے جواب نہیں دیا‘‘

سارندھا ’’پران ناتھ! میں خوب جانتی ہوں کہ منزل دشوار ہے اور ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا ہوگا مگر ہم اپنا خون بہائیں گے ہم اپنے جانبازوں کے سر کٹوائیں گے اور چمبل پر لاشوں کا گھاٹ تیار کر دیں گے یقین مانیے جب تک چمبل کی دھارا بہتی رہے گی ہمارے سرفروشوں کے خون کے قطرے لعل بن بن کر درخشاں رہیں گے اور جب تک بندیلوں کا ایک نام لیوا بھی زندہ رہے گا یہ خون اس کے ماتھے پر کیسر کا تلک بن کر چمکے گا‘‘

آسمان پر بادلوں کے سمندر موجیں مار رہے تھے چپ چھ کے قلعے سے سرفروش بندیلوں کی ایک گھٹا اٹھی اور دریائے چمبل کی طرف چلی ہر سپاہی بیر رس سے جھوم رہا تھا رانی سارندھا نے دونوں راج کماروں کو گلے سے لگالیا اور چمپت رائے کو پان کا بیڑا دے کر بولی

’’بندیلوں کی لاج تمہارے ہاتھ میں ہے ایشور تمہاری تلوار کو اندر کا بجر بنا دے‘‘

آج خوشی سے اس کا ایک ایک عضو مسکرا رہا تھا اور دل اس کے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح ریگستان کا جاں بہ لب مسافر نخلستان کا سوار دور سے دیکھ کر خوشی

سے دیوانہ ہو جاتا ہے اسی طرح کے بندیلوں کی پرخروش گھٹا دیکھ کر شہزادوں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ راجہ وہاں کی زمین سے واقف تھا اس نے بندیلوں کو تو کمین گاہ میں چھپنے کا اشارہ کیا اور شہزادوں کو منتشر فوج کو آراستہ کر کے دریا کے کنارے مغرب کی طرف چلا گیا۔ داراشکوہ کو گمان ہوا کہ حریف کسی دوسرے گھاٹ پر اتر جانا چاہتے ہیں فوراً مغرب سے مورچے ہٹا لئے کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے بندیلے اسی موقع کے منتظر تھے باہر نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیئے چمپت رائے نے شہزادہ دارشکوہ کو بھلاوا دے کر اپنی فوج گھما دی۔ اور بندیلوں کے نقش قدم پر چلتا ہوا اتار لایا۔ اس نقل و حرکت میں اسے صرف سات گھنٹوں کا توقف ہوا مگر جا کر دیکھا تو سات سو بندیل جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی تھیں۔

راجہ کو دیکھتے ہی بندیلوں کی ہمتیں بندھ گئیں محی الدین کی فوج نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور جس طرح طوفان پرشور سمندر کا زیرو زبر کر دیتا ہے اس طرح ان کے پرزور حملے سے شاہی فوج میں ہل چل پڑ گئی بندیلوں نے پہلے ہی اس کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا اس دھارے نے ان کی صفیں توڑ دیں دست بدست جنگ کی نوبت پہنچی خنجر میانوں سے نکل پڑے اور خون کے فوارے نکل پڑے یہاں تک کہ شام ہوگئی آسمان شفق سے سرخ ہو گیا اور زمین خون سے تر ہوگئی۔

اندھیرا ہو گیا تلواریں دم لینے کے لئے بے قرار ہو رہی تھیں دفعتہً افق مغرب سے سپاہیوں کا ایک دل اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے فوج شاہی کی پشت پر آ پہنچا اور کچھ اس جوش و خروش اور سرگرمی سے حملہ آور ہوا کہ فوج شاہی کے قدم اکھڑ گئے

سارا شیرازہ بکھر گیا لوگ متحیر تھے کہ یہ امداد غیب کہاں سے آئی اکثر عقیدت مندوں کو خیال گزرا کہ شاید یہ فتح کے فرشتے ہیں شہزادوں کی حمایت کے لئے آئے ہیں جب راجہ دریافت حال کے لئے خود گیا تو ان کے سردار نے گھوڑے سے اتر کر اس کے روبرو سر تعظیم خم کر دیا راجہ غرور کے نشے میں متوالا ہو گیا یہ سارندھا تھی۔

میدان جنگ اس وقت مرقع عبرت بنا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے جہاں سپاہیوں کا ایک پہاڑ تھا ہواں بے جان لاشیں پھڑک رہی تھیں انسان نے ابتدائے آفرینش سے کتنی جانیں قربان کر دی ہیں اور کس بے دردی سے؟ اب فتح نصیب فوج کے سپاہی مال غنیمت پر ٹوٹے پہلے زندوں سے جنگ تھی اب زندوں سے مردوں کی جنگ شروع ہوئی وہ شجاعت اور مردانگی کا نظارہ تھا یہ حرص اور سفلہ پن کی دلخراش تصویر اس وقت انسان حیوان بنا دیا گیا تھا۔ جب وہ حیوان سے شیطان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نوچ کھسوٹ میں لوگوں کو فوج شاہی کے سپہ سالار ولی بہادر خان کی لاش نیم جان خاک وخون میں آلود نظر آئی اس کے قریب اس کا گھوڑا دم سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔

راجہ کو گھوڑوں کا شوق تھا اسے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا یہ ایک عراقی نسل اصیل جانور تھا ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا۔

شیر کا سینہ چیتے کی سی کمر، دو آنکھیں جاندار کی دو تصویریں اس کی محبت اور وفاداری دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگے راجہ نے حکم دے ا کہ اس بندہ وفا پر کوئی ہاتھ نہ چلائے اسے زندہ گرفتار کر لو یہ میرے اصطبل کی زینت ہو گا جو شخص اسے

میرے روبرو لائے اس کا دامن مراد زر و جواہرات سے بھر دوں گا۔

سواران آزمودہ کار چاروں طرف سے گھوڑے پر پل پڑے۔مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے قریب جا سکے کوئی پچکارتا کوئی کمند ڈالنے کی فکر کرتا مگر کوئی تدبیر راس نہ آئی، ذرا دیر میں وہابیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا تب سارندھا اپنے خیمے سے باہر نکلی وہ بے خوف گھوڑے کے قریب چلی گئی اس کی آنکھوں میں جادو تھا گھوڑے نے سر جھکا دیا سارندھا نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگی اس وفا شعار نے ایک بیکساں انداز سے اس کے آنچل میں منہ چھپا کر یوں کھڑا ہو گیا گویا بچہ گوسفند ہے اس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی۔ رانی نے مادرانہ شفقت سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی راس پکڑ کر اپنے خیمے کی طرف چلی گھوڑا بالکل خاموش اس کے پیچھے چلا گویا مدتوں کا نمک خوار ہے لوگ تا شف شفقت کا معجزہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مگر بہت بہتر ہوتا کہ گھوڑے نے اس سے بھی بے التفاقی کی ہوتی یہ خوبصورت گھوڑا آگے چل کر اس خاندان کے حق آہوئے زرنگاہ ثابت ہوا۔

(3)

دنیا ایک عرصہ کارزار ہے؟ اس میدان میں اسی سپہ سالار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں جو موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اتنی ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام سے پیچھے ہٹ جاتا ہے مرد میدان سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔

مگراس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آجاتے ہیں جو موقع پر قدم بڑھانا جانتے ہیں مگر خطرے پر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے یہ فتح کو اصولوں پر قائم کردیتا ہے وہ اپنی فوج کا نام ونشان مٹا دے گا مگر جہاں ایک بار پہنچ گیا وہاں سے قدم پیچھے نہ ہٹائے گا اس موقع ناشناس شخص کو دنیاوی فتح شاذ ہی حاصل ہوئی ہے مگر بسا اوقات اس کی شکست فتوحات سے زیادہ اہم اور زیادہ شاندار ہوتی ہے اگر موقع شناس سپہ سالار سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے تو یہ ان پر جان دینے والا قدم نہ پیچھے ہٹانے والا سپاہی قوموں کے اخلاق کو سدھارتا اور ان کے دلوں پر اخلاقی عظمت کا نقش جماتا ہے اسے دنیا سے کبھی فروغ نہیں مگر جب کسی مجلس یا تقریر میں اس کا نام زبان پر آجاتا ہے تو حاضرین ہم آہنگ ہو کر اس پر اعزاز کے نوحے بلند کرتے ہیں اور اس کے نام کے گرد ہمیشہ کے لئے روحانی جلال کا ایک پر نور ہالہ قائم ہو جاتا ہے سارندھا اپنی آن پر جان دینے والے سپاہیوں میں سے تھی۔

شہزادہ محی الدین چمبل کے کنارے سے آگرہ کی طرف چلا گیا تو اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت و کامرانی نقارہ بجاتی تھی جب وہ آگرہ پہنچا تو شوکت نے اس کے لئے تخت شاہی سجا دیا۔

اورنگ زیب میں قدر شناسی کا احساس کم نہ تھا اس نے سرداران شاہی کی خطائیں معاف کردیں اور ان کے تناسب بحال کئے راجہ چمپت رائے کو اس کی جانبازانہ خدمات کے صلے میں دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا۔

اور اورچھا سے بنارس اور بنارس سے جمنا تک جاگیر عطا کی بندیل راجہ نے پھر شاہی اطاعت کا طوق پہنا عشرت کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور ساغر عیش کے

دور چلنے لگے ایک بار پھر نغمہ دل پذیر کی صدا بلند ہوئی اور رانی سارندھا پھر ملال سے گھلنے لگی۔

ولی بہادر خان بڑا چرب زبان شخص تھا۔ اس کی لطافت زبان نے بہت جلد شاہ عالمگیر کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ بارگاہ سلطانی میں اس پر اعزاز کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ خاں صاحب کے دل میں اچھے گھوڑے کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا۔ ایک روز کنور چھتر سال اسی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو گیا تھا خان صاحب کے محل کی طرف جا نکلا۔ ولی بہادر خاں ایسے موقعہ کا منتظر تھا فوراً اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا راج کمار تنہا کیا کر سکتا تھا پیادہ پا اپنے مکان پر آیا اور سارندھا سے اپنی ساری کیفیت بیان کی سارندھا کا چہرہ تمتما گیا بولی مجھے اس بات کا غم نہیں کہ گھوڑا ہاتھ سے گیا بلکہ غم اس بات کا ہے کہ تو اسے کھو کر زندہ کیوں لوٹا۔ کیا تیری رگوں میں بندیلوں کا خون نہیں ہے؟ کوئی پروا نہ تھی اگر تجھے گھوڑا نہ ملتا مگر تجھے ثابت کر دینا چاہئے تھا کہ ایک بندیل لڑکے سے اس کا گھوڑا چھین لینا ہنسی نہیں ہے۔

یہ کہہ کر اس نے پچیس جانبازوں کو تیار ہونے کا حکم دیا خود سپاہیانہ بانا سجایا اور سپاہیوں کو لے کر وہ ولی خان بہادر کے مکان پر جا پہنچی خان صاحب اسی گھوڑے پر سوار ہو کر دربار چلے گئے تھے سارندھا نے فوراً دربار کی طرف رخ کیا اور ہوا کی طرح سنسناتی ہوئی دربار شاہی کے مقابل جا پہنچی۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ارکان دربار میں ہل چل مچ گئی ملازمین شاہی ادھر سے ادھر آ کر جمع ہو گئے شاہ عالمگیر صحن دربار میں نکل آئے امراء اپنے تیغے اور تلواریں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور

چاروں طرف شور، کتنی ہی آنکھوں نے اسی دربار میں امر سنگھ کے آبدار تیغے کی جھلک دیکھی تھی ان کی آنکھوں میں وہی سانحہ کھنچ گیا۔

سارندھا نے بلند آواز میں کہا ''خان صاحب! بڑے شرم کی بات ہے کہ آپ نے وہ مردانگی جو دریائے چمبل کے سامنے دکھانی چاہئے تھی آج ایک شیر خوار کے مقابلے میں دکھائی ہے کیوں کیا یہ مناسب تھا کہ آپ لڑکے سے گھوڑا چھین لیتے''

ولی بہادر خاندان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں تند لہجے میں بولے'' کسی غیر کو کیا حق ہے کہ میری چیز اپنے صرف میں لائے۔''

رانی ''وہ آپ کی چیز نہیں، وہ میری چیز ہے اسے میں نے رن بھومی میں پایا ہے اور اتنی آسانی سے آپ اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے ہیں اس کے پیچھے ایک ہزار جوانوں کا خون بہا دوں گی''

خاں ''وہ گھوڑا میں نہیں دے سکتا، اس کے عوض میں اپنا اصطبل خالی کر سکتا ہوں''

رانی ''میں اپنا گھوڑا لوں گی''

خاں صاحب!'' میں اس کے ہم وزن زرو جواہرات دے سکتا ہوں مگر گھوڑا نہیں دے سکتا''

رانی ''اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی''

بندیل نوجوانوں نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور قریب تھا کہ کشت و خون کا بازار گرم ہو عالمگیر نے بیچ میں آ کر فرمایا ''رانی صاحبہ آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں گھوڑا آپ کو مل جائے گا مگر اس کی قیمت بہت گراں ہو گی''

رانی ’’میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں‘‘

عالمگیر ’’جاگیر اور منصب بھی‘‘

رانی ’’جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں‘‘

عالمگیر ’’اپنا راج بھی‘‘

رانی ’’اس کی بھی میرے نزدیک کوئی ہستی نہیں ہے‘‘

عالمگیر ’’ایک گھوڑے کے مقابلے میں‘‘

رانی ’’جی نہیں! اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے پیاری ہے‘‘

عالمگیر ’’وہ کیا ہے؟‘‘

رانی ’’اپنی آن‘‘

اس طرح رانی سارندھا نے ایک گھوڑے کے لئے اپنی وسیع جاگیر اور اونچا منصب اور شاہی اعزاز سب ہاتھ سے کھودیا اور صرف اتنا ہی نہیں آئندہ کے لئے شاہی خطاب کو بیعانہ دیا اس گھڑی سے دم آخر تک چمپت رائے کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔

(4)

راجہ چمپت رائے نے پھر قلعہ چر چھ میں بودوباش اختیار کی ان کو منصب و جاگیر کے ہاتھ سے نکل جانے کا ملال ضرور ہوا مگر حرف شکایت لبوں پر نہیں لائے وہ سارندھا کے مزاج سے واقف تھے کچھ دنوں تک عافیت سے گزری مگر عالمگیر سارندھا کے سخت الفاظ بھولا نہ تھا جوں ہی بھائیوں کی طرف سے اطمینان ہوا اس نے ایک دن چمپت رائے کی سرزنش کے لئے فوج روانہ کی اور بائیس سپہد اران

آزمودہ کار اس مہم پر مامور ہوئے سبھ کرن بندیلہ شاہی صوبیدار تھا چمپت رائے کے بچپنے کا کھلاڑی اور ہم نوالہ دوست اس نے چمپت رائے کو خاک میں ملانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور بھی کتنے بندیل سردار راجہ سے منحرف ہو کر شاہی صوبیدار سے آ ملے ور ایک خوں ریز معرکہ ہوا الطاف شاہی نے بھائیوں کے خون سے زمینیں رنگین کرا دیں مگر اس مہم میں راجہ کو فتح نصیب ہوئی مگر اس کی طاقت ہمیشہ کے لئے زائل ہو گئی گردوپیش کے بندیل روسا جو اس کی پشت پناہ تھے عنایت خسروی کے دام میں پھنس گئے رفقاء جاں نثار کچھ تو کام آئے اور کچھ دغا کر گئے۔ اعزہ آنکھیں چرانے لگے مگر ان مشکلات کے باوجود چمپت رائے کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اس نے چرچھ کو خیر باد کہی اور تین سال تک بندیل کھنڈ کے کوہ بیابان میں گھومتا رہا۔ شاہی فوجیں شکاری جانوروں کی طرح سارے ملک پر منڈلا رہی تھیں۔ راجہ جو آئے دن کسی نہ کسی سے سابقہ پڑ جاتا تھا ان موقعوں پر اس کی دلیری معجزے دکھاتی تھی سارندھا ہمیشہ اس کے پہلو میں رہتی اور اس کا حوصلہ بڑھایا کرتی بڑے بڑے سخت معرکوں میں صبر رخصت ہو جاتا اور امید ساتھ چھوڑ دیتی خودداری کا فرض اس کے پیش نظر رہتا تین سال تک یہی کیفیت رہی آخر صوبیداران شاہی نے تنگ آ کر شاہ عالمگیر کو عرضداشت بھیجی کہ اس شیر کا شکار حضور کے سوا اور کسی سے نہ ہو گا جواب دیا کہ فوجیں ہٹا لو اور محاصرہ اٹھا لو راجہ نے سمجھا کہ ان بلاؤں سے نجات پائی اور چھا کے قلعے میں آ بسا مگر جس طرح برسات کے دنوں میں آفتاب ذرا دیر کے لئے ابر سیہ فام کے پردے سے نکل کر پھر غائب ہو جاتا ہے اس طرح چند مہینوں کے امن کے بعد راجہ کو پھر آوارہ دشت غربت ہونا پڑا۔

(5)

تین ہفتوں سے شاہی فوج نے اور چھا کا محاصرہ کر رکھا ہے جس طرح کا لیجہ سخت جگر کو چھلنی کر دیتا ہے اسی طرح توپ کے گولوں نے فصیلوں کی حالت کر رکھی ہے قلعے میں بیس ہزار آدمی محصور ہیں۔ مگر ان میں نصف سے زائد عورتیں اور ان سے کچھ کم بچے ہیں مردوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آمدورفت کے راستے چاروں طرف سے بند ہیں ہوا کا بھی گزر نہیں رسد کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے عورتیں اپنے مردوں اور بچوں کو زندہ رکھنے کے لئے خود فاقہ کرتی ہیں اس خوف سے چند دنوں میں ہم آب و دانہ بغیر تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے لوگوں کو نیم جان کر رکھا ہے عورتیں سورج دیوتا کو ہاتھ اٹھا کر کوتی ہیں بچے جھنجھلا جھنجھلا کر فصیلوں کی آڑ سے ان پر پتھر پھینکتے ہیں جو مشکل سے دیوار کے اس پار جاتے ہیں سوئے اتفاق سے راجہ چمپت رائے بھی مرض بخار میں مبتلا ہیں کئی دن ہوئے ضعف نے انہیں پلنگ سے اٹھنے نہیں دیا انہیں دیکھ کر یاس زدہ دلوں کو تسکین ہوتی تھی مگر ان کی بیماری نے سارے قلعے میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔

راجہ نے سارندھا سے کہا" سارن! آج دشمن ضرور قلعے کے اندر گھس آئیں گے"

سارن! "ایشور نہ کرے کہ ان آنکھوں سے وہ دن دیکھنا پڑے"

راجہ نے کہا" مجھے ان غریب عورتوں اور بچوں کی بڑی فکر ہے"

سارندھا: "ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو کیسا رہے؟"

راجہ "ان بے کسوں کو چھوڑ کر"

سارندھا ''ان پر یہ آفت ہماری لائی ہوئی ہے ہم نہ ہوں گے تو شاید دشمن ان کے ساتھ رحم سے پیش آئے''

راجہ ''نہیں! یہ لوگ مجھ سے نہ چھوڑے جائیں گے جن مردوں نے ہمارے اوپر اپنی جان نثار کر دی ہے ان کی عورتوں اور بچوں کو میں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا''

سارندھا ''مگر یہاں ہم ان کی کچھ مدد بھی تو نہیں کر سکتے''

راجہ ''ان کے ساتھ مر تو سکتے ہیں میں ان کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دوں گا میں ان کے ساتھ قید کی مصیبتیں جھیلوں گا مگر اس آفت میں نہیں چھوڑ سکتا''

سارندھا نے ندامت سے گردن جھکا لی اور سوچنے لگی'' بے شک اپنے رفیقوں کو آگ کی آنچ میں چھوڑ اپنی جان بچانا دلیری نہیں میں ایسی خود غرض کیوں ہو گئی مگر اپنے شوہر کو اطاعت کی ذلت سے بچانے کی فکر جذبہ انسانیت پر غالب آ گئی تھی پھر بولی اگر آپ کو یقین آ جائے ان آدمیوں کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا تب آپ کو چلنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔''

راجہ (سوچ کر) شاہی سپہ سالار کی تحریر

راجہ ''ہاں! تب میں چلوں گا مگر ایک شرط پر جب یہ لوگ بھی مجھے بہ خوشی رخصت کر دیں۔''

سارندھا خیالوں میں ڈوب گئی شاہی سپہ سالار سے یہ معاہدہ کس طرح لوں کون پیغام لے جائے گا اور یہ ظالم ایسا معاہدہ کرنے ہی کیوں لگے۔ انہیں تو کامل یقین ہے کہ دو چار روز میں ہمیں فتح مل جائے گی وہ ہماری طرف سے اطاعت کا

پیغام کیوں قبول کریں گے اور جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ساتھ دغا کی گئی ہے تب تو ان غریبوں کے سر پر آفت آ جائے گی میرے یہاں ایسا چرب زبان معاملہ فہم کون ہے جو یہ مشکل آسان کر دے چھتر سال شاید یہ کام پورا کر دکھائے۔

یہ خیال کر کے رانی نے چھتر سال کو بلایا یہ اس کے چاروں بیٹوں میں بس سے زیادہ دلیر فہیم اور شیریں زبان تھا رانی اسے سب لڑکوں سے زیادہ پیار کرتی تھی جس وقت چھتر سال نے آ کر اسے پرنام کیا تو رانی کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور کلیجے سے ایک سرد آہ نکلی

''چھتر سال آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے؟'' رانی نے پوچھا

چھتر سال ''ہمارے پچاس آدمی اب تک مر چکے ہیں''

رانی ''بندیلوں کی لاج اب ایشور کے ہاتھ میں ہے''

چھتر سال ''آج ہم لوگ رات کو شب خون مارنے کی فکر میں ہیں''

رانی نے چند لفظوں میں اپنی تجویز اس سے بیان کی اور پھر پوچھنے لگی

''یہ کام کس کے سپرد کیا جائے''

چھتر ''میرے''

رانی ''تم اسے پورا کر آؤ گے''

چھتر سال ''ہاں! مجھے یقین ہے''

چھتر سال جب یہاں سے چلا تو رانی نے اسے سینے سے لگا لیا اور دعا دے کر بولی ایشور تمہاری صورت جلد دکھائے اور پھر دیر تک روتی رہی اس کے بعد آسمان

کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی

ایشور! میں نے اپنا جوان، دلیر، ہونہار بیٹا بندیلوں کی بھینٹ کر دیا اب اس آن کو نباہنا تیرا کام ہے میں نے بڑی پیاری چیز بھینٹ کی ہے اسے قبول کر۔

(6)

دوسرے روز صبح کے وقت سارندھا اشنان کر کے تھال میں پوجا کا سامان لئے مندر کو چلی اس وقت اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا تھا نیند کا سکون بخش جادو فکر مندوں پر نہیں چلتا۔ وہ مندر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ اس کے تھال میں ایک تیر آ کر گرا۔ اس کی نوک پر ایک کاغذ کے پرزے کو دیکھا تو چہرہ شگفتہ ہو گیا مگر یہ شگفتگی ذرا دیر کی مہمان تھی آہ! اس کاغذ کے ٹکڑے کو اتنی گراں قیمت پر کس نے خریدا ہوگا؟

سارندھا مندر سے لوٹ کر راجہ چمپت رائے کے پاس گئی اور بولی

''جیون ناتھ! آپ نے رات کو جو وعدہ کیا تھا وہ اب پورا کرنا ہوگا''

راجہ نے چونک کر پوچھا ''تم نے اپنا وعدہ پورا کر لیا''

رانی نے وہ تحریری معاہدہ راجہ کو دے دیا چمپت رائے نے اسے بغور دیکھا بعد ازاں بولے۔

''ہاں مجھے اطمینان ہو گیا اب میں چلوں گا اور ایشور نے چاہا تو ایک دفعہ پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا مگر سارن سچ بتانا! اس کاغذ کا کیا مول ہے''

رانی نے آبدیدہ ہو کر کہا ''بہت گراں''

راجہ نے کہا ''آخر''

رانی ''ایک جوان بیٹا''

راجہ شکستہ سا ہو گیا چیخ کر بولے ''کون انگد رائے؟''

رانی ''نہیں''

راجہ ''رتن شاہ''

رانی ''نہیں''

راجہ ''چھتر سال''

رانی ''ہاں''

جس طرح طائر بسمل اوپر اچھلتا ہے اور بے جان ہو کر گر پڑتا ہے اسی طرح چمپت رائے پلنگ سے اچھلے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے چھتر سال انہیں بہت پیارا تھا اور ان کی زندگی کے سارے حوصلے اسی سے ہی وابستہ تھے جب آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو بولے ''سارن! مجھے پہلے معلوم ہوتا تو چھتر سال ہاتھ سے نہ جانے پاتا۔ چھتر سال مارا گیا تو بندیل بنس کا چراغ گل ہو جائے گا۔''

وہ رات قلعہ والوں کے لئے غم کا ماتم تھی عورتیں سارندھا کے پاؤں پر گر کر کہتیں کہ ہمیں بھول مت جانا مرد راجہ سے منتیں کرتے کہ ہم نے سائے کی طرح آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ہم کو بھی لیتے چلئے ایک کہرام سا مچا ہوا تھا سارندھا نے عورتوں کو گلے لگایا چمپت رائے مردوں سے رخصت ہوئے اور ہزاروں مردوں عورتوں کو روتے ہوئے چھوڑ کر پالکی میں بیٹھ گئے سب آدمیوں کے دل کہہ رہے تھے کہ اب تمہاری آنکھیں چمپت کو پھر نہ دیکھیں گی یہ آخری ملاقات ہے اس لئے

خوب جی بھر کر رو لو کسے گمان تھا کہ یہ سکھپال نہیں جنازہ ہے۔

اندھیری رات آسمان نے تاروں کے بے شمار چراغ جلا رکھے تھے اگرچہ شمع مزار کی طرح ان کی روشنی بہت دھندلی تھی قلعے کے در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی آہ و زاری کی دل خراش صدائیں آ رہی تھیں اور رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو پالکی میں بٹھائے قلعے کے زمین دوز راستے سے نکلی جاتی تھی۔

آج سے بہت دن پہلے ایک دن ایسی اندھیری رات اور غمناک رات تھی سارندھا کا دل مزہ الفت سے غیر مانوس تھا۔ستیلا دیوی کی زبان سے اس وقت جو وچن نکلے تھے وہ آج پورے ہوئے کیا سارندھا کا وہ خواب کبھی پورا ہوگا۔

دوپہر کا وقت تھا آفتاب نصف النہار آ کر آگ کے شرارے برسا رہا تھا۔ بدن کے جھلنے والی تند پرشور ہوا شعلہ سوزان کی طرح وادی صحرا میں آگ لگاتی پھرتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اگن دیوی کی طرح ساری فوج گرجتی ہوئی چلی آتی ہے۔زمین سے لے کر آسمان تک غبار آتشیں کا ابر چھایا ہوا تھا۔رانی سارندھا گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو لئے مغرب کی طرف چلی جا رہی تھی اور چھا دس کوس پیچھے چھوٹ چکا تھا اور یہ خیال آیا کہ اب ہم خطرے کے دائرے سے باہر نکل آئے غالب آ جاتا تھا راجہ پالکی میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے اور کہار پسینے سے شرابور تھے پالکی پیچھے پانچ سوار گھوڑے بڑھاتے چلے آتے تھے پیاس کے مارے سارے قافلے کا برا حال تھا کلیجے لبوں پر آ رہے تھے سایہ دار درخت اور کنوئیں کی تلاش میں نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔

دفعتاً سارندھا نے پیچھے کی طرف منہ پھیر کر دیکھا تو اسے سواروں کی ایک جماعت نظر آئی اس کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں یہ لوگ ضرور ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں پھر خیال گزرا شاید میرے راج کمار اپنے آدمیوں کو لے کر میری طرف مدد کو آ رہے ہیں عالم یاس میں بھی امید کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ذرا دیر تک اسی امید وبیم کی حالت میں رہی یہاں تک کہ وہ جماعت قریب آ گئی اور سپاہیوں کا لباس صاف نظر آنے لگا۔ رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر پیٹ لیا یہ لوگ شاہی فوج کے سپاہی تھے۔

سارندھا (کہاروں سے) ڈولی روک لو بندیل سپاہیوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں راجہ ضعف ونقاہت کے مارے نیم جاں ہو رہے تھے مگر جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی مشتعل ہو جاتی ہے اسی طرح یہ کیفیت دیکھتے ہیں ان کے بے جان تن میں جان آ گئی پالکی کا پردہ اٹھا کر باہر نکل آئے تیر وکمان ہاتھ میں لے لی مگر وہ کمان جو ان کے ہاتھ میں پیام مرگ بن جاتی تھی اس وقت شاخ بید کی طرح خم کھا گئی۔ سر میں چکر آیا پاؤں تھرائے اور وہ زمین پر گر پڑے یقین ہو گیا کہ ہمارے اقبال کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس طائر بے پر کی طرح جو سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اوپر کو اچکتا اور پھر زمین پر آ گرتا ہے راجہ چمپت رائے پھر اٹھے اور گر پڑے سارندھا نے انہیں سنبھال کر بٹھایا اور آبدیدہ ہو کر بولی۔

''پران ناتھ! اس کے آگے اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا ایسے موقع پر خموشی فصاحت سے بھی زیادہ فصیح ہو جاتی ہے غریب سارندھا اس وقت عام عورتوں کی طرح کمزور نظر آ رہی تھی لیکن ایک خاص حد تک کمزوری عورتوں کی خصلت کا سنگار

ہے۔''

چمپت رائے'' سارن! دیکھو ہمارا ایک سپاہی اور موت کا شکار ہوا افسوس! جس ذلت سے زندگی بھر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پاک جسم کو ہاتھ لگائیں گے اور میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکوں گا ہائے موت کب آئے گی۔''

یہ کہتے کہتے انہیں ایک خیال آیا تیغے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ بے جان ہو رہے تھے تب سارندھا سے بولے'' سارن! تم نے بہت موقعوں پر میری آن نبھائی ہے''

اتنا سنتے ہی سارندھا کی کمزوری رخصت ہو گئی آنسو خشک ہو گئے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی یہ امید کہ ابھی میں اپنے پران ناتھ کے کچھ کام آسکتی ہوں اسے جوش میں لے آئی راجہ کی طرف دیکھ کر بولی'' ایشور نے چاہا تو مرتے دم تک نباہوں گی''

رانی نے سمجھا شاید راجہ مجھ سے میری جان مانگ رہے ہیں

چمپت رائے'' میں نے جو کچھ کہا ہے اسے تم نے ہمیشہ مانا ہے''

سارندھا'' مرتے دم تک مانوں گی''

چمپت رائے'' شاید یہ میری آخری درخواست ہے اسے رد نہ کرنا''

سارندھا نے تیغہ نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور بولی'' یہ آپ کی درخواست نہیں میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو''

چمپت رائے'' تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا کیا تم مجھے دشمنوں کے ہاتھ میں

چھوڑ جاؤ گی تا کہ میں بیڑیاں پہنے ہوئے دلی کی گلیوں میں نشانہ تضحیک بنوں''

رانی نے متحیر ہو کر راجہ کی طرف دیکھا ان کا مطلب نہ سمجھی

چمپت رائے ''میں تم سے ایک وردان مانگتا ہوں''

رانی ''شوق سے مانگیے''

چمپت رائے ''یہ میری آخری التجا ہے جو کچھ کہوں گا کرو گی؟''

رانی ''سر کے بل کر دوں گی شوق سے فرمائیے''

راجہ ''دیکھو! تم نے زبان دی ہے انکار نہ کرنا''

رانی (کانپ کر) ''فرمائیے''

راجہ ''اپنا تیغہ میرے سینے میں چبھو دو''

رانی کے دل پر بجلی سی گر پڑی بولی ''جیون ناتھ! ایسا بھی ہوا ہے''

راجہ ''میں بیڑیاں پہننے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا''

رانی ''مجھ سے کیسے ہوگا؟''

پانچواں اور آخری سپاہی زخمی ہو کر گرا راجہ نے جھنجھلا کر کہا ''اسی جگہ پر آن نبھانے کا دعویٰ کیا تھا۔''

شاہی سپاہی راجہ کی طرف لپکے اتنے میں رانی نے اپنا تیغہ آبدار نکال کر راجہ کے سینے میں چبھو دیا پریم کی ناؤ ساگر میں غوطہ لگا گئی راجہ کے کلیجے سے خون نکل رہا تھا اور چہرے پر تبسم تھا۔

کیسا عبرتناک نظارہ ہے! عورت جو اپنے شوہر پر قربان ہوتی تھی آج اس کی قاتلہ ہے جس سینے سے لپٹ کر شباب کی بہاریں لوٹیں جو سینہ اس کی امیدوں کا

نشانہ اوراس کی آرزوؤں کا آشیانہ تھاجو سینہ اس کی عزت کا پاسبان تھا اوراس کی محبت کا گنجینہ تھا اس سینے کو آج سارندھا کی تلوار چوم رہی ہے اس بحرالفت میں آج پریم کی ناؤ تیر رہی ہے ہاں یہ تلوار فرض کی کٹار ہے یہ تلوار پریم کی برچھی ہے کس عورت کی تلوار سے اچھا کام ہوا ہے۔

آہ! خودداری کا کیسا حسرت ناک انجام ہے اودے پورا اور مارواڑ کے کارناموں میں بھی خودداری اورعلوہمت کی ایسی مثال نہیں ملتی عورت کے لئے اپنی جان دینا بہت آسان ہے مگر یہ وہ کام ہے جو سارندھا کے سوا کبھی کسی عورت سے نہیں ہوا نفس کے بہکانے سے دل کی جلن سے عورتوں نے اپنے مردوں کی جانیں لی ہیں۔ مگر ادائے فرض، پتی برت اور آن پوری نے ایسی شاندار قربانی بھی نہیں پائی۔

شاہی سپاہی سارندھا کی یہ جرأت اور اوسان دیکھ کر دنگ رہ گئے عداوت نے احترام کی جگہ دی سردار نے آگے بڑھ کر کہا ''رانی صاحبہ! خدا گواہ ہے ہم سب آپ کے بندہ درم ہیں آپ کا جو حکم ہو بسروچشم بجالائیں''

سارندھا نے ہنس کر کہا ''اگر ہمارے بیٹوں میں سے کوئی زندہ ہو تو دونوں لاشیں اسے سونپ دینا یہ کہہ کر وہی خون آلود تیغہ اپنے سینے میں گھونپ لیا جب وہ زمین پر گری تو اس کا سر راجہ چمپت رائے کے سینے پر تھا۔''

☆☆☆☆☆☆

بڑے گھر کی بیٹی

پہلی بار: ماہنامہ ''زمانہ'' دسمبر 1910ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی اول)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبر دار تھے ان کے بزرگ کسی زمانہ میں بڑے صاحب ثروت تھے پختہ تالاب اور مندر انہی کی یادگار تھی کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائیداد وکیلوں کی نذر کی اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے بڑے کا نام سری کنٹھ سنگھ تھا اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دوہرے بدن کا سجیلا جوان تھا بھرا ہوا چہرہ چوڑا سینہ بھینس کا دو سیر تازہ دودھ کا ناشتہ کر جاتا تھا سری کنٹھ اس سے بالکل متضاد تھے ان ظاہری خوبیوں کو انہوں نے دو انگریزی حروف بی اے پر قربان کر دیا تھا انہیں دو حرفوں نے ان کے سینے کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک، سب ہضم کر لی تھی یہ حضرت اب اپنا وقت فرصت طلب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا شام سویرے ان کے

کمرے کے اکثر کھرل کی خوشگوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھی لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اس انگریزی کے باوجود معاشرت کے بہت مداح نہ تھے بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شدومد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے اور خود ہر روز کوئی نہ کوئی روپ بھرتے انہی کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پرجوش وکیل مشکل سے ہوگا۔ خصوصاً مشترک خاندان کے وہ زبردست حامی تھے آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے سات مل جل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اسے وہ ملک اور قوم کے لئے فال بد خیال کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انہیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی، بعض بعض شریف زادیاں تو انہیں اپنا دشمن سمجھتیں خود ان ہی کی بیوی سے اس مسئلہ پر اکثر زور و شور سے بحث کرتی تھی مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس سسر سے دیور جیٹھ سے نفرت تھی بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اور اونچے خاندان کی لڑکی تھی اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے عالیشان محل ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن بہلیاں، شکاری کتے، باز، بحری، شکرے، حرے، فرش فروش شیشہ آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں وہ ان سے

بہرہ ور تھے بھوپ سنگھ نام تھا فراخدل حوصلہ مند آدمی تھے مگر قسمت کی خوبی لڑکا ایک بھی نہ تھا سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا پہلے جوش میں تو انہوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں ہاتھ پیر پیٹ لئے آنندی چوتھی لڑکی تھی مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اسے بہت پیار کرتے تھے حسین بچے کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں ٹھاکر صاحب بڑے پس وپیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ ہی منظور تھا کہ اسے اپنے آپ کو بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس چندے کے لئے روپیہ مانگنے آئے شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا بھوپ سنگھ ان کے طور وطریق پر ریجھ گئے کھینچ تان کر زائچے لائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی تھی ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو ذکر کیا کوئی سجی ہوئی خوبصورت بہلی بھی نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی مگر یہاں باغ کہاں مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(2)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغابیاں لئے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا جلدی سے گوشت پکاؤ مجھے بھوک لگی ہے آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی گوشت پکانے بیٹھی مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا'' دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟''

آنندی نے کہا گوشت میں پڑ گیا

لال بہاری ''ابھی پرسوں گھی آیا ہے اس قدر جلد اٹھ گیا''

آنندی'' آج تو کل پاؤ بھر تھا میں نے گوشت میں ڈال دیا''

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زباں درازی بہت بری معلوم ہوئی تیکھا ہو کر بولا'' میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو''

عورت گالیاں سہتی ہے مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی آنندی منہ پھیر کر بولی ''ہاتھی مرا بھی تو نو لاکھ کا وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں''

لال بہاری جل گیا تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا'' جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے۔''

آنندی کو بھی غصہ آ گیا چہرہ سرخ ہو گیا بولی'' وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا

دیتے''

اب نوجوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف سے زور سے پھینکی اور بولا ''جس کے گمان پر بولی ہو اسے بھی دیکھوں گا اور تمہیں بھی''

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی غصے کے مارے ہوا کے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات سے ہے اسے شوہر ہی کی طاقت اور ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(3)

سر کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے جمعرات کا یہ واقعہ تھا دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا ان کی راہ دیکھتی رہی آخر شنبہ کو حسب معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے اور سلسلہ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے بارے کھانے کا وقت آیا پنچائیت اٹھی جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا 'بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجئے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا''

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی ''بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے منہ لگیں۔''

لال بہاری ''وہ بڑے گھر کی بیٹی تو ہم لوگ بھی کوئی کری کہار نہیں ہیں''

سری کنٹھ ''آخر بات کیا ہوئی؟''

لال بہاری کچھ بھی نہیں ''یوں ہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں''

سری کنٹھ کھا پی کر آنندہ کے پاس گئے وہ بھی بھری بیٹھی تھی اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے

آنندی نے پوچھا ''مزاج تو اچھا ہے؟''

سرکنٹھ بولے ''بہت اچھا ہے یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟''

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آ گیا بولی ''جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اسے پاؤں تو منہ جھلس دوں''

سری کنٹھ ''اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو''

آنندی '' کیا کہوں قسمت کی خوبی ہے ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراسی گری کرنے کی بھی تمیز نہیں مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا بوٹیاں نچوا لیتی اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے''

سری کنٹھ: ''آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں''

آنندی ''پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھے گوشت پکانے کو کہا گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا میں نے سب گوشت میں ڈال دیا جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا دال میں گھی نہیں بس اس پر میرے میکے کو برا بھلا کہنے لگا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا

بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھے کھڑاوں پھینک ماری اگر ہاتھ سے نہ روکتی تو سر پھٹ جاتا اس سے پوچھو کہ میں نے جو کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ؟''

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہوگئیں بولے ''یہاں تک نوبت پہنچ گئی یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔''

آنندی رونے لگی جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر رہتا تھا عورت کے آنسو مرد کے غصے پر روغن کا کام کرتے ہیں سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا انہیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہ تھا مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا رات بھر کروٹیں بدلتے رہے سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے ''دادا اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا''

یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لئے سری کنٹھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا جب ان کو کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ مضحکہ اڑاتے اور کہتے تم بیویوں کے غلام ہو انہیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پرجوش وکیل آج اپنے باپ سے یہ کہہ رہا تھا ''دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا'' ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے آزمائش کے بیچ میں آکر ضبط اور حلم رخصت ہو جاتے ہیں

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے ''کیوں''

سری کنٹھ ''اس لئے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے آپ

کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھار ہوتی ہے کڑی بات تک مضائقہ نہیں کوئی ایک کی دو کہہ لے یہاں تک میں ضبط کرسکتا ہوں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں اور میں دم نہ ماروں۔''

بنی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کرتے تھے ان کے لئے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہوگیا صرف اتنا بولا ''بیٹا تم عقل مند ہو ایسی باتیں کرتے ہو عورتیں اسی طرح گھر تباہ کردیتی ہیں ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔''

سری کنٹھ ''اتنا میں جانتا ہوں آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں ہوں آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علیحدگی کی آفتوں سے بچا دیا ہے مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں سہہ سکتا آپ یقین مانیے میں اپنے اوپر بہت جبر کررہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔''

اب بنی مادھو بھی گرمائے یہ کفر زیادہ نہ سن سکے بولے ''لال بہاری تمہارا بھائی ہے اس سے جب کبھی بھول چوک ہو تم اس کے کان پکڑو مگر۔۔۔۔''

سری کنٹھ ''لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا''

بنی مادھو ''عورت کے پیچھے''

سری کنٹھ ''جی نہیں! اس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث''

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ تمبا کو اڑانے کے لئے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادہ جنگ ہیں تو ان کا دل بہت خوش ہوا اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سننے کے لئے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے سری کنٹھ باپ سے دبتا تھا اس لئے وہ خطاوار ہے اس نے اتنا علم حاصل کیا یہ بھی اس کی خطا ہے بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں یہ بری بات ہے وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے یہ ان کی حماقت ہے ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں بھر آئیں حقہ پینے کے بہانے سے کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلے سے آ کر بیٹھ گئے بینی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہ سماتے اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں جوش نہ ہونے دوں گا خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو یکا یک لہجہ تقریر نرم کر کے بولے ”بیٹا میں تم سے باہر نہیں ہوں تمہارا جو جی چاہے کرو اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی۔“

الہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی مگر عملی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا اس میدان میں وہ بالکل اناڑی تھا باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی بولا ”میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔“

باپ ''بیٹا! تم عقلمند ہو اور عقلمند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے اس سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اسے تم بڑے ہو کر معاف کر دو''

بیٹا ''اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا یا تو وہ گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجئے میں اپنا بوجھ آپ اٹھا لوں گا اگر مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اس سے کہیے جہاں چاہے چلا جائے بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا اسے کبھی اتنی جرات نہ ہوئی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے یا حقہ پی لے یا پان کھا لے اپنے باپ کا بھی اتنا پاس ولحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی اپنے ہوش میں انہوں نے کبھی اسے جھڑکا تک نہ تھا۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مگدر کی جوڑی انہوں نے ہی بنوا کر دی تھی پچھلے سال اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو انہوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جا کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور پانچ روپے کے پیسے لٹائے تھے اسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا وہ پھوٹ کر رونے لگا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں'' ان کے سامنے کیسے جاؤں گا میں ان سے کیسے بولوں گا میری آنکھیں ان کے سامنے کیسے اٹھیں گی اس نے سمجھا تھا کہ

بھیا مجھے بلا کر سمجھا دیں گے اس امید کے خلاف آج وہ انہیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اگر سری کنٹھ اسے اکیلا بلا کر دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اسے اتنا ملال نہ ہوتا مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں لال بہاری سے نہ سہا گیا وہ روتا ہوا گھر میں آیا اور کوٹھری میں جا کر کپڑے پہنے پھر آنکھیں پونچھیں جس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا تب آنندی دیوی کے دروازے پر آ کر بولا بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے وہ اب میرا منہ دیکھنا نہیں چاہتے اس لئے اب میں جاتا ہوں انہیں پھر منہ نہ دکھاؤں گا مجھ سے جو خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا''

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہوگئی

(4)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا اسی وقت سری کنٹھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور کترا کر نکل گئے گویا اس کے سائے سے بھی پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی وہ طبعاً نیک عورت تھی اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی کہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں ۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو پھر میں کیا کروں گا۔ اس کے چہرے کو زرد کئے ہوئے تھے اسی حالت میں جب اس نے

لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے سنا کہ اب میں جاتا ہوں مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے معاف کرنا تو اس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہو گیا وہ رونے لگی دلوں کا میل دھونے کے لئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا ''لالہ باہر کھڑے ہیں بہت رو رہے ہیں''

سری کنٹھ ''تو میں کیا کروں؟''

آنندی ''اندر بلا لو میری زبان کو آگ لگے میں نے کہاں سے وہ جھگڑا اٹھایا''

سری کنٹھ ''میں نہیں بلانے کا''

آنندی ''پچھتاؤ گے انہیں بہت گلان آ گئی ہے ایسا نہ ہو کہیں چل دیں''

سری کنٹھ نہ اٹھے اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا ''بھابی! بھیا سے میرا سلام کہہ دو وہ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے میں بھی اپنا منہ انہیں نہ دکھاؤں گا۔''

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف جانے لگا یکا یک آنندی اپنے کمرے سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ''مجھ کو جانے دو''

آنندی ''کہاں جاتے ہو؟''

لال بہاری ''جہاں کوئی میرا منہ نہ دیکھے''

آنندی ''میں نہ جانے دوں گی''

لال بہاری ''میں لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں''

آنندی ''تمہیں میری قسم اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا''

لال بہاری ''جب تک مجھے نہ معلوم ہو جائے گا کہ بھیا کے دل میں میری

طرف سے کوئی تکلیف نہیں تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا‘‘

آنندی ’’میں ایشور کی سوگندھ کھا کر کہتی ہوں کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے‘‘

اب سری کنٹھ کا دل پگھلا انہوں نے باہر آ کر لال کو گلے لگا لیا اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا ’’بھیا! اب کبھی نہ کہنا کہ تمہارا منہ نہ دیکھوں گا اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔‘‘

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ’’للوان باتوں کو بالکل بھول جاؤ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا‘‘

بینی مادھو سنگھ باہر سے آ رہے تھے دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اٹھے ’’بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں‘‘

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی ’’بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔‘‘

☆☆☆☆☆

وکرمادت کا تیغہ

پہلی بار: ماہنامہ ’’زمانہ‘‘ جنوری 1911ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی، اول)

بہت زمانہ گزرا ایک روز پشاور کے موضع ماہ نگر میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آیا۔ اندھیری رات تھی بستی سے کچھ دور برگد کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک شعلہ آتشیں نمودار ہوا اور ایک جھلملاتی ہوئی شمع کی طرح نظر آنے لگا گاؤں میں بہت جلد یہ خبر پھیل گئی باشندے یہ عجیب وغریب نظارے دیکھنے کے لئے جا بجا اکٹھے ہو گئے عورتیں جو کھانا پکا رہی تھیں ہاتھوں میں گوندھا ہوا آٹا لپیٹے باہر نکل آئیں بوڑھوں نے بچوں کو کندھے پر بٹھا لیا اور کھانستے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔ نویلی بہوئیں حیا سے باہر نہ آسکیں۔ مگر دروازوں کی دراڑوں سے جھانک جھانک کر اپنے بے قرار دلوں کو تسکین دینے لگیں اس گنبد نما درخت کے نیچے تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں روشنی کا یہ دھندلا شعلہ برامعصیت میں گھری ہوئی روح کی متشکل مثال پیش کر رہا تھا۔

ٹیک سنگھ نے عارفانہ انداز سے سر ہلا کر کہا ’’میں سمجھ گیا بھوتوں کی سبھا ہو رہی ہے‘‘

پنڈت چیت رام نے عالمانہ یقین کے ساتھ فرمایا ’’تم کیا جانو؟ میں تہ پر پہنچ گیا سانپ من چھوڑ کر چرنے گیا ہے اس میں جسے شک ہو جا کر دیکھ آئے‘‘

منشی گلاب چند بولے اس وقت جو وہاں جا کر من اٹھا لائے اس کے راجہ ہونے میں شک نہیں مگر جان جوکھوں ہے۔

پریم سنگھ ایک بوڑھا جاٹ تھا وہ ان مہاتماؤں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

(2)

پریم سنگھ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اس کی ساری عمر معرکہ آرائیوں میں صرف ہوئی تھی مگر جب زندگی کی شام آئی اور وہ صبح کی زندگی کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پھر آیا تو اس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی افسوس! دنیا میں میرا کوئی نہیں کاش میرے بھی کوئی بچہ ہوتا جو خواہش شام کے وقت طائروں کو گھونسلوں میں کھینچ لاتی ہے اور جس خواہش سے بے قرار ہو کر جانور شام کو اپنے تھانوں کی طرف چلتے ہیں وہی خواہش پریم سنگھ کے دل میں موجیں مارنے لگی۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ کھانے کے وقت لقمے بنا بنا کر کھلائے ایسا کوئی نہیں جسے وہ رات کے وقت لوریاں سنا کر سلائے یہ آرزوئیں پریم سنگھ کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھیں مگر سارے دن کی تنہائی ایسی غمناک نہیں ہوتی جیسی شام کی۔

ایک روز پریم سنگھ بازار گیا ہوا تھا راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک گھر میں آگ لگی ہوئی ہے آگ کے بلند اور خوفناک شعلے ہوا میں اپنے پھریرے لہرا رہے ہیں اور ایک عورت دروازے پر کھڑی سر پیٹ کر رو رہی ہے یہ غریب بیوہ عورت تھی اس کا بچہ اندر سو رہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی وہ دوڑی تھی کہ گاؤں کے آدمیوں کو آگ بجھانے کے لئے بلائے کہ اتنے میں آگ نے زور پکڑ لیا اور اب

شعلہ ہائے سوزاں کا امنڈا ہوا دریا اسے اس کے پیارے بچے سے الگ کئے ہوئے تھا پریم سنگھ کے دل میں اس عورت کی دردناک آہیں چبھ گئیں وہ بے خوف آگ میں گھس گیا اور سوتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر باہر نکل آیا بیوہ عورت نے بچے کو گود میں لے لیا اور اس کے نازک رخساروں کو بار بار چوم کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی ''مہاراج! تم جو کوئی ہو میں آج اپنا پیارا بچہ تمہیں بھینٹ کرتی ہوں تمہیں ایشور نے اور بھی لڑکے دیئے ہوں گے انہیں کے ساتھ اس یتیم کی بھی خبر لیتے رہنا۔ تمہارے دل میں رحم اور ترس ہے میرا سب کچھ اگنی دیوی نے لے لیا اب اس تن پر کے کپڑے کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لوں گی یہ بچہ اب تمہارا ہے''

پریم سنگھ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں بولا ''بیٹی ایسا نہ کہو تم میرے گھر چلو اور ایشور نے جو کچھ روکھا سوکھا دیا ہے وہ کھاؤ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں کوئی پانی دینے والا نہیں کیا جانے پرماتما نے اسی بہانے سے ہم لوگوں کو ملایا ہو''

شام کے وقت جب پریم سنگھ لوٹا تو اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا گلعذار بچہ تھا اور پیچھے پیچھے ایک زرد اور مرجھائی ہوئی عورت آج پریم سنگھ کا گھر آباد ہوا آج کے بعد اسے کسی نے شام کے وقت ندی کے کنارے خاموش بیٹھے نہیں دیکھا۔

اسی بچے کے لئے سانپ کا من لانے کا مقصد کر کے پریم سنگھ آدھی رات کے وقت کمر سے تلوار لگائے چونک چونک کر قدم رکھتا برگد کے درخت کی طرف روانہ ہوا۔

جب درخت کے نیچے پہنچا تو من کی دمک زیادہ صاف نظر آنے لگی مگر سانپ کا

کہیں پتہ نہ تھا پریم سنگھ بہت خوش ہوا سمجھا شاید سانپ کہیں چرنے لگا ہے مگر جب من کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں صاف زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ دکھائی دی بوڑھے جاٹ کا کلیجہ سن سے ہو گیا اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے یکا یک اسے اپنے سامنے کوئی چیز لٹکتی ہوئی نظر آئی پریم سنگھ نے تیغہ کھینچ لیا اور اس کی طرف لپکا مگر دیکھا تو وہ برگد کی جٹا تھی اب پریم سنگھ کا خوف بالکل دور ہو گیا اس نے اس جگہ کو جہاں سے روشنی کی لو نکل رہی تھی اپنی تلوار سے کھودنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین کھد گئی تو تلوار کسی چیز سے ٹکرائی اور بو بھک اٹھی یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا مگر پریم سنگھ کے ہاتھوں میں آتے ہی اس کی شمع گوں چمک غائب ہو گئی۔

(3)

یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا مگر نہایت آبدار اور اس کے دستے میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے اور دستے کے اوپر ''وکرمادت'' منقوش تھا یہ وکرمادت کا تیغہ تھا اس وکرمادت کا جو بھارت کا آفتاب بن کر چمکا جس کے گن اب تک گھر گھر گائے جاتے ہیں اس تیغے نے بھارت کے زندہ جاوید کالید اس کے صحبتیں دیکھی ہیں جس وقت وکرمادت راتوں کو بھیس بدل کر درد دکھ کی کہانی اپنے کانوں سے سنے اور جور و جبر کے کرشمے اپنی دوررس آنکھوں سے دیکھنے کے لئے نکلتے ہیں تو یہی تیغہ آبدار ان کے پہلو کی زینت ہوا کرتا تھا جس رحم وانصاف نے وکرمادت کا نام اب تک زندہ رکھا ہے اس میں یہ تیغہ بھی ان کا ہمدرد اور شریک تھا یہ ان کے ساتھ اس تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا جس پر راجہ بھوج کو بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔

اس تیغے میں غضب کی چمک تھی مدت دراز تک زمین کے نیچے دفن رہنے پر

بھی اس پر زنگ کا نام نہ تھا اندھیرے گھروں میں اس سے اجالا ہو جاتا تھا رات بھر درخشاں ستارے کی طرح جگمگاتا رہتا جس طرح چاند پردہ ابر میں چھپ جاتا ہے مگر اس کی مدھم روشنی چھن چھن کر آتی ہے اسی طرح غلاف کے اندر سے اس تیغ کی شعاعیں شوخ نگاہیاں کیا کرتی تھیں۔

جب کوئی شخص اسے ہاتھ میں لے لیتا تو اس کی چمک غائب ہو جاتی تھی اس کا یہ وصف دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

ہندوستان میں ان دنوں شیر پنجاب کی للکار گونج رہی تھی رنجیت سنگھ سخاوت و شجاعت اور رحم وانصاف میں اپنے وقت کے وکرمادت تھے اس مغرور کابل کا غرور جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے ماہ نگر کا پر فضا میدان اور درختوں کا دلاویز جمگھٹ دیکھا تو وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ بازار آراستہ ہو گئے خیمے اور شامیانے نصب کر دیئے گئے جب رات ہوئی پچیس ہزار چولہوں کی آگ قندیلیں اور مشعلیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا اندھیری رات میں آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔

(4)

شاہی فرودگاہ سے گانے بجانے کی دشوار اور پرجوش آوازیں آ رہی تھیں سکھ سرداروں نے سرحدی مقامات پر صدہا افغان عورتیں گرفتار کر لی تھیں۔ جیسا ان دنوں لڑائیوں میں عام طور پر ہوا کرتا تھا وہی عورتیں اس وقت سایہ دار درختوں کے نیچے قدرتی فرش سے سجی ہوئی محفل میں اپنی بے سری تانیں الاپ رہی تھیں۔ اور اہل محفل جنہیں نغمہ کا لطف اٹھانے کی اتنی خواہش نہ تھی جتنی ہنسنے اور خوش ہونے کی

خوب زور زور سے قہقہہ لگا لگا کر ہنس رہے تھے کہیں کہیں منچلے سپاہیوں نے سوانگ بھرے تھے وہ چند مشعلیں اور سینکڑوں تماشائیوں کا ہجوم ساتھ لئے ادھر ادھر خوش فعلیاں کرتے پھرتے۔ ساری فوج کے دلوں میں بیٹھ کر فتح کی دیوی اپنے جلوس دکھا رہی تھی۔

رات کے نو بجے ہوں گے کہ ایک آدمی کالا کمبل اوڑھے ایک بانس کا سونٹا لئے شاہی خیمے سے باہر نکلا۔ اور بستی کی طرف آہستہ آہستہ چلا آج ماہ نگر بھی مسرت سے اینڈ رہا تھا دروازوں رکئی کئی بتیوں والے فتیل سوز روشن ہیں دروازوں کے صحن جھاڑ کر صاف کر دیئے گئے ہیں دو ایک جگہ شہنائیاں بج رہی ہیں اور کہیں کہیں لوگ بھجن گا رہے ہیں کالی کملی والا مسافر ادھر ادھر دیکھتا بھالتا گاؤں کی چوپال میں جا پہنچا چوپال خوب سجی ہوئی تھی اور گاؤں کے معززین بیٹھے ہوئے اس اہم مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں کون سا تحفہ پیش کیا جائے آج مہاراج نے اس گاؤں کو اپنے قدموں سے روشن کیا ہے تو کیا اس گاؤں کے بسنے والا مہاراج کے قدموں کو بوسہ نہ دیں گے ایسے مبارک موقعے کہاں آتے ہیں سب لوگ سر جھکائے متفکر تھے کسی کی عقل کچھ کام نہ کرتی تھی وہاں انمول جواہرات کی کشتیاں کہاں؟ کامل گھنٹہ بھر تک کسی نے سر نہ اٹھایا یکا یک بوڑھا پریم سنگھ کھڑا ہو گیا اور بولا ''اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں وکرمادت کی تلوار نذرانہ کے لئے دے سکتا ہوں''

اتنا سنتے ہی سب کے سب آدمی فرط مسرت سے اچھل پڑے اور ایک بلڑ سا مچ گیا اتنے میں ایک مسافر کالی کملی اوڑھے چوپال کے اندر آیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا

''بھائیوں! واہ گوروکی جے'' چیت رام بولے ''تم کون ہو؟''

مسافر ''راہی آدمی ہوں پشاور جانا ہے رات زیادہ آ گئی ہے اس لئے یہیں لیٹ رہوں گا۔''

ٹیک سنگھ ''ہاں، ہاں آرام سے سوؤ چارپائی کی ضرورت ہو تو منگا دوں؟''

مسافر ''نہیں آپ تکلیف نہ فرمائیں میں اسی ٹاٹ پر لیٹ رہوں گا ابھی آپ لوگ وکرمادت کی تلوار کی کچھ باتیں کر رہے تھے یہی سن کر چلا آیا ورنہ باہر ہی پڑا رہتا کیا یہاں کسی کے پاس وکرمادت کی تلوار ہے؟''

مسافر کے لب ولہجہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے اس کی آواز میں وہ کشش تھی جو کانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے سب کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں پنڈت چیت رام بولے'' جی ہاں کچھ عرصہ ہوا مہاراج وکرمادت کا تیغہ زمین سے نکلا ہے۔''

مسافر ''یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ یہ تیغہ انہی کا ہے؟''

چیت رام ''اس کے دستے پر ان کا نام کھدا ہوا ہے''

مسافر ''ان کی تلوار تو بہت بڑی ہو گی؟''

چیت رام ''نہیں وہ تو ایک چھوٹا سا نیچہ ہے''

مسافر ''تو پھر اس میں کوئی خاص وصف ہو گا''

چیت رام ''جی ہاں اس کے گن انمول ہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے جہاں رکھ دو اس میں جلتے چراغ کی سی روشنی پیدا ہو جاتی ہے''

مسافر ''اُفوہ''

چیت رام'' مگر جوں ہی کوئی آدمی اسے ہاتھ میں لے لیتا ہے اس کی ساری چمک دمک غائب ہو جاتی ہے''

یہ عجیب بات سن کر اس مسافر کی وہی کیفیت ہو گئی جو ایک حیرت انگیز کہانی سننے سے بچوں کی ہو جایا کرتی ہے اس کی آنکھ اور انداز سے بے صبری ظاہر ہونے لگی جوش سے بولا ''وکرمادت تمہارے پرتاب پر دھنیہ ہے''

ذرا دیر کے بعد پھر بولا ''وہ کون بزرگ ہیں جن کے پاس یہ انمول چیز ہے''

پریم سنگھ نے فخریہ انداز سے کہا ''میرے پاس ہے''

مسافر ''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

پریم سنگھ ''ہاں میں آپ کو سویرے دکھا دوں گا مگر یہیں ٹھہریئے سویرے تو ہم اسے مہاراج رنجیت سنگھ کو بھینٹ کریں گے آپ کا جی چاہے تو اسی وقت دیکھ لیجیے''

دونوں آدمی چوپال سے چل کھڑے ہوئے پریم سنگھ نے مسافر کو اپنے گھر میں لے جا کر تیغے کے پاس کھڑا کر دیا اس کمرے میں چراغ نہ تھا مگر سارا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مسافر نے پرجوش آواز سے کہا ''وکرمادت! تمہارے پرتاب پر دھنیہ ہے اتنا زمانہ گزرنے پر بھی تمہاری تلوار کا تیج کم نہیں ہوا''

یہ کہہ کر اس نے فرط شوق سے ہاتھ بڑھا کر تیغے کو پکڑ لیا مگر اس کا ہاتھ لگتے ہی تیغے کی چمک جاتی رہی اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

مسافر نے فوراً تیغے کو تخت پر رکھ دیا اس کا چہرہ اب بہت اداس ہو گیا تھا اس نے پریم سنگھ سے کہا ''کیا تم یہ تیغہ رنجیت سنگھ کو بھینٹ دو گے؟ وہ اسے ہاتھ میں

لینے کے لئے قابل نہیں ہے‘‘

یہ کہہ کر مسافر تیزی سے باہر نکل آیا برندا دروازے پر کھڑی تھی مسافر نے اس کے چہرے کی طرف ایک بار غور سے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے مگر فوج میں شوروغل بدستور جاری تھا۔ ہنگامہ مسرت نے نیند کو سپاہیوں کی آنکھوں سے دور بھگا دیا ہے اگر کوئی انگڑائی لیتا یا اونگھتا نظر آجاتا ہے تو اہل مجلس اسے ایک ٹانگ سے کھڑا کر دیتے ہیں یکا یک یہ خبر مشہور ہوئی کہ مہاراج اسی وقت کوچ کریں گے لوگ تعجب میں آگئے کہ مہاراج نے کیوں اس اندھیری رات میں سفر کرنے کی ٹھانی ہے اس خوف سے کہ فوج کو اسی وقت کوچ کرنا پڑے گا چاروں طرف کھلبلی مچ گئی وہ خود چند آزمودہ کار سرداروں کے ساتھ روانہ ہوگئے اس کا سبب کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

جس طرح بند ٹوٹ جانے سے تالاب کا پانی قابو سے باہر ہوکر زورشور کے ساتھ باہر نکلتا ہے اسی طرح مہاراج کے جاتے ہی فوج کے افسر اور سپاہی خرمستیاں کرنے لگے۔

(5)

برندا کو بیوہ ہوئے تین سال گزرے ہیں اس کا شوہر ایک بے فکر اور رنگین مزاج آدمی تھا گانے بجانے کا اسے شوق تھا گھر کی جو کچھ جمع جتھا تھی وہ سرسوتی اور اس کے پجاریوں کو بھینٹ کردی تین لاکھ کی جائیداد تین سال کے لئے بھی کافی نہ ہوسکی مگر اس کا مدعا پورا ہوگیا سرسوتی دیوی نے اسے دعا دی فن ونغمہ میں اس نے ایسا کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے گنی استاد اس کے سامنے زبان کھولتے ڈرتے تھے

گانے کا اسے جس قدر شوق تھا اتنی ہی محبت اسے برندا سے تھی اس کی جان اگر گانے میں بستی تھی تو دل برندا کی محبت میں لبریز تھا پہلے مذاق اور پھر تفریحاً اس نے برندا کو گانا سکھایا۔ یہاں تک کہ اس کو بھی ابن آب حیات کی لذت مل گئی اور اگرچہ اس نے شوہر کو مرے تین سال گذر گئے ہیں اور انے لطائف دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے یہاں تک کہ کسی نے اس کے گلاب کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی، مگر گانے کی طرف ابھی تک اس کی طبیعت مائل تھی اس کی طبیعت جب کبھی ایام رفتہ کی یاد سے اداس ہوتی ہے تو وہ کچھ گا کر جی بہلا لیتی ہے لیکن گانے سے اس کا مقصود حظ نفس نہیں ہوتا بلکہ جب کوئی دل کش راگ الاپنے لگتی ہے تو خیال میں اپنے شوہر کو خوشی سے مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے وہی خیالی تصویر اسے داد دیتی ہوئی نظر آتی ہے گانے سے اس کا مدعا اپنے (جنت نصیب شوہر کی یاد کو تازہ کرنا ہے) گانا اس کے نزدیک پتی دھرم کا نباہ ہے۔

تین پہر رات جا چکی ہے آسمان پر چاند کی روشنی ماند ہو چکی ہے چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے اور اس خیال افزا سناٹے میں برندا زمین پر بیٹھی ہوئی مدھم سروں میں گا رہی ہے۔

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

برندا کی آواز میں لوچ بھی ہے اور درد بھی اس میں بے چین دل کو تسکین دینے والی قوت بھی ہے اور سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کی طاقت بھی صبح کے وقت شفق میں سر اٹھائے ہوئے نخل گل پر بیٹھ کر گانے والی بلبل کی چہک میں بھی یہ ملاحت نہیں ہوتی یہ وہ نغمہ ہے جسے سن کر اہل صفا وجد کرنے لگتے ہیں اس کی تان

کانوں کی چھیدتی ہوئی جگر میں جا پہنچی ہے۔

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

میں بوری پگ پگ پر بھٹکوں کا ہو کی پچھنا ہیں کھبر

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

یکا یک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کوئی آدمی پکارنے لگے ''کس کا مکان ہے؟ دروازہ کھولو'' برندا چپ ہو گئی پریم سنگھ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا دروازے کے صحن میں سپاہیوں کا ایک ہجوم تھا دراز ے کھلتے ہی اس کی دہلیز میں سپاہی گھس آئے اور بولے ''تمہارے گھر میں کوئی گائن رہتی ہے ہم اس کا گانا سنیں گے''

پریم سنگھ نے کڑی آواز میں کہا ''ہمارے یہاں کوئی گائن نہیں ہے''

اس پر کئی سپاہیوں نے پریم سنگھ کو پکڑ لیا اور بولے ''تیرے گھر سے گانے کی آواز آتی تھی۔''

ایک سپاہی ''بتلاتا کیوں نہیں رے کون گا رہا تھا؟''

پریم سنگھ ''میری لڑکی گا رہی تھی مگر وہ گائن نہیں ہے''

سپاہی ''کوئی ہو ہم آج گانا سنیں گے''

غصہ سے پریم سنگھ کانپنے لگا ہونٹ چبا کر بولا ''یارو ہم نے بھی اپنی زندگی فوج میں کاٹی ہے مگر کبھی ۔۔۔۔اس ہنگامے میں پریم سنگھ کی بات کسی نے نہ سنی ایک نوجوان جاٹ نے جس کی آنکھیں نشے میں شرخ ہو رہی تھیں للکار کر کہا'' اس بڈھے کی موچھیں اکھاڑ لو

برندا آنگن میں پتھر کی مورت طرح کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی جب اس نے

دو سپاہیوں کو پریم سنگھ کی مونچھ پکڑ کر کھینچے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا وہ بے خوف سپاہیوں کے بیچ میں گھس آئی اور بلند آواز میں بولی "کون میرا گانا سننا چاہتا ہے"

سپاہیوں نے اسے دیکھتے ہی پریم سنگھ کو چھوڑ دیا اور بولے ہم سب تیرا گانا سنیں گے" "برندا اچھا بیٹھ جاؤ میں گاتی ہوں"

اس پر کئی سپاہیوں نے ضد کی کہ اسے پکڑ کر پڑاؤ لے چلو وہاں خوب رنگ جمے گا جب برندا سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف چلی تو پریم سنگھ نے کہا "برندا ان کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا"

برندا جب پڑاؤ پر پہنچی تو خرمستیوں کا ایک طوفان برپا تھا فتح کی دیوی غنیم کو پامال کر کے اب فاتحوں کی انسانیت اور شرافت کو پاؤں سے کچل رہی تھی حیوانیت کا خونخوار شیر غنیم کے خون سے آسودہ نہ ہو کر اب انسانی جذبات کا خون چوس رہا تھا برندا کو لوگ ایک سجے ہوئے خیمے میں لے گئے۔ یہاں فرشی گلاس روشن تھے اور بادہ آتشیں کے دور چل رہے تھے برندا اس بچہ کو سفند کی طرح جو خونخوار درندوں کے پنجے میں پھنس جاتا ہے فرش کے ایک گوشے پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی نفسانیت کا بھوت جو اس وقت دلوں میں اپنی شیطانی فوج آراستہ کیے بیٹھا تھا کبھی آنکھوں کی کمان سے تیز آبرو ریز تیر چلاتا۔ اور کبھی منہ کی کمان سے جگر دوز تیروں کی بوچھاڑ کرتا زہریلی شراب میں بجھے ہوئے یہ تیر برندا کے نازک اور پاکیزہ دل کو چھیدتے ہوئے پار ہو جاتے وہ سوچ رہی تھی "ارے دروپدی کی لاج رکھنے والے کرشن بھگوان! تم نے دھرم کے بندھن سے بندھے ہوئے پانڈوؤں کے ہوتے ہوئے دروپدی کی لاج رکھی تھی میں دنیا میں بالکل بے کس ہوں کیا میری لاج نہ

رکھو گے؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے میرا کا یہ مشہور بھجن گایا۔"

سیا رگھو بیر بھروسو ایسو

برندا نے یہ گیت بڑے دلکش انداز میں گایا اس کے میٹھے سروں میں میرا کا انداز پیدا ہو گیا تھا ظاہری حیثیت سے وہ بادہ نوش سپاہیوں کے روبرو گا رہی تھی مگر عالم خیال میں وہ مرلی والے شیام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑی اس سے التجا کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے اس پر شور محفل میں عالم سکوت طاری ہو گیا انسان کے دل میں بیٹھے ہوئے حیوان پر بھی پریم کی یہ دلسوز صدا اپنا جادو چلا گئی نغمہ لطیف فیل مست کو بھی رام کر لیتا ہے پورے گھنٹہ بھر تک برندا نے سپاہیوں کو بے حس و حرکت رکھا یکا یک گھڑیال نے پانچ بجائے سپاہی اور سردار سب چونک پڑے سب کا نشہ ہرن ہو گیا چالیس فرسنگ کی منزل طے کرنی ہے پھرتی کے ساتھ روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں خیمے اکھڑنے لگے سواروں نے گھوڑوں کو دانہ کھلانا شروع کیا ایک بھگدڑ سی مچ گئی ادھر آفتاب نکلا ادھر فوج نے نقارہ کو بجا دیا شام کو اس میدان کا ایک ایک گوشہ آباد تھا صبح کو وہاں کچھ بھی نہ تھا صرف ٹوٹے پھوٹے گھڑے چولہوں کی راکھ اور خیموں کی میخوں کے نشان اس خدم و حشم کی یادگار باقی ہے۔

برندا نے جب اہل محفل کی روانگی کی تیاریوں میں مصروف دیکھا تو وہ خیمے سے باہر نکل آئی کوئی مزاحم نہ ہوا مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں آ کر پھر نہ پکڑ لے جب وہ درختوں کے جھرمٹ سے باہر پہنچی تو اس کی جان میں جان آئی بڑا سہانا موسم تھا ہوائے دلنواز مستانہ وار درختوں کے پتوں پر محو خرام تھی اور افق مشرق

میں شہ خورشید کے استقبال کے لئے سرخ مخمل کا فرش بچھایا جا رہا ہے برندا نے آگے قدم بڑھانا چاہا مگر اس کے پاؤں نہ اٹھے پریم سنگھ کی یہ بات کہ سپاہیوں کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا اسے یاد آ گئی اس نے ایک لمبی سانس لی اور زمین پر بیٹھ گئی دنیا میں اب اس کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اس بے کس چڑیا کی حالت کیسی دردناک ہوتی ہے جو دل میں شوق پرواز لئے ہوئے بند صیاد سے نکل آتی ہے مگر آزاد ہو کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ بے رحم صیاد نے اس کے پروں کو کاٹ دیا ہے وہ درختوں کی سایہ فگن ڈالیوں کی طرف بار بار حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہے مگر پر پرواز نہیں کھول سکتی اور ایک بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتی ہے کہ کاش صیاد مجھے پھر اپنے قفس میں قید کر لیتا برندا کی حالت بھی اس وقت ایسی ہی دردناک تھی۔

برندا کچھ دیر تک خیال میں ڈوبی بیٹھی رہی پھر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ پریم سنگھ کے دروازے پر آئی دروازہ کھلا ہوا تھا مگر وہ اندر قدم نہ رکھ سکی اس نے در و دیوار کو آرزومند نگاہوں سے دیکھا اور پھر جنگل کی طرف چلی گئی۔

(6)

شہر لاہور کے ایک ممتاز حصے میں حسین سرراہ ایک خوش قطع صاف ستھرا سا تین منزلہ مکان ہے سرسبز اور خوشنما پھولوں والی مادھوری نے اس کی دیواروں اور محرابوں کو خوب سجا دیا ہے۔ اسی مکان میں ایک امیرانہ انداز سے سجے ہوئے کمرے کے اندر برندا مخملی قالین پر بیٹھی ہوئی ایک خوش رنگ اور خوشنوا مَینا کو پڑھا رہی ہے کمرے کی دیواروں پر ہلکے سبز رنگ کی قلعی ہے خوشنما دیوار گیریاں

خوبصورت تصویریں مناسب موقعوں پر زیب دے رہی ہیں صندل اور خس کی جانفزا خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے مگر اس تکلف اور سامان عیش کے باوجود برندا کا چہرہ اداس ہے اس کا چہرہ اب اور بھی زرد نظر آتا ہے مولسری کا پھول مرجھا گیا ہے۔

برندا اب لاہور کی مشہور گانے والیوں میں ہے اسے شہر میں آئے تین ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے مگر اتنے ہی دنوں میں اس نے عام شہرت حاصل کر لی ہے یہاں اس کا نام شاما مشہور ہے اتنے بڑے شہر میں جس سے شاما بائی کا پتہ پوچھو یقیناً بتا دے گا شاما کی آواز اور انداز میں کوئی موہنی ہے جس نے شہر میں ہر خاص و عام کو اپنا شیدائی بنا رکھا ہے لاہور میں باکمال گانے والیوں کی کمی نہیں ہے، لاہور اس زمانے میں ہر فن و کمال کا مرکز تھا مگر کوئلیں اور بلبلیں بہت تھیں شاما صرف ایک تھی وہ دھرپد زیادہ گاتی تھی اس لئے لوگ اسے دھرپدی شاما کہتے تھے۔

لاہور میں میاں تان سین کے خاندان کے کئی اہل کمال ہیں جو راگ اور راگنیوں میں باتیں کرتے ہیں وہ شاما کا گانا پسند کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ شاما کا گانا اکثر غلط ہوتا ہے اسے راگ راگنیوں کی تمیز نہیں مگر ان کی حرف گیریوں کا کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ شاما غلط گائے یا صحیح گائے جو کچھ گاتی ہے لوگ اسے سن کر مست ہو جاتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ شاما ہمیشہ دل سے گاتی ہے اور جن جذبات کا وہ اظہار کرتی ہے انہیں خود بھی محسوس کرتی ہے وہ کٹھ پتلیوں کی طرح تلی ہوئی اداؤں کی نقل نہیں کرتی اب اس کے بغیر محفلیں سونی رہتی ہیں ہر محفل میں اس کا موجود ہونا لازمی ہو گیا ہے وہ چاہے اشلوک ہی گائے مگر اس کے بغیر ضیافت طبع کا

ساماں پورا نہیں ہوتا تلوار کی باڑھ کی طرح وہ محفلوں کی جان ہے اس نے عوام کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا ہے کہ جب وہ اپنی پالکی پر ہوا کھانے نکلتی ہے تو اس پر چاروں طرف سے پھولوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے مہاراج رنجیت سنگھ کو کابل سے لوٹے ہوئے تین مہینے گذر گئے مگر ابھی تک فتح کی خوشی میں کوئی جلسہ نہیں ہوا واپسی کے بعد کئی دن تک تو مہاراج کسی وجہ سے اداس تھے بعد ازاں ان کے مزاج میں یکا یک ایک تغیر واقع ہوا انہیں کابل کے ذکر سے نفرت سی ہو گئی جو کوئی انہیں اس فتح پر مبارکباد دینے جاتا تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے وہ روحانی مسرت جو موضع ماہ نگر تک ان کے چہرے سے جھلکتی تھی اب وہاں نہ تھی تسخیر کابل ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی وہ مہم جو ایک ہزار سال تک ہندو راجاؤں کے امکان خیال سے بھی بعید تھی ان کے ہاتھوں میں سر ہوئی جس ملک نے ہندوستان کو ایک ہزار برس تک زیر نگیں رکھا وہاں ہندو قوم کا پھریرا رنجیت سنگھ نے اڑایا۔ غزنی اور کابل کی پہاڑیاں انسانی خون سے لال ہو گئیں مگر رنجیت سنگھ خوش نہیں ہے ان کے مزاج کی کایا پلٹ کا راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اگر کچھ سمجھتی ہے تو برندا سمجھتی ہے۔

تین مہینے تک مہاراج کی یہی کیفیت رہی بعد ازاں ان کا مزاج اپنے اصلی رنگ پر آنے لگا ہوا خواہان دربار کے اس موقع کے منتظر تھے ایک روز انہوں نے مہاراج سے ایک شاندار جلسہ کرنے کی استدعا کی پہلے تو وہ برہم ہوئے مگر بالآخر مزاج شناسوں کی گھاتیں اپنا کام کر گئیں۔

جلسے کی تیاریاں وسیع پیمانے پر کی جانے لگیں شاہی رقص گاہ کی سجاوٹ ہونے

لگی ۔پٹنہ، بنارس، لکھنو، گوالیار دہلی اور پونا کی نامور طوائفوں کو پیغام دیئے گئے برندا کو بھی دعوت ملی آج ایک مدت کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

جلسے کی تاریخ مقرر ہو گئی لاہور کی گزرگاہوں پر خوش رنگ جھنڈیاں لہرانے لگیں چاروں طرف سے نواب اور راجے شاہانہ احتشام کے ساتھ سج سج کر آنے لگے ذی شعور فراشوں نے رقص گاہ کو ایسے حسن لیاقت سے آراستہ کیا تھا کہ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ عشرت کا آرام گاہ ہے۔

شام کے وقت دربار شاہی آراستہ ہوا مہاراجہ صاحب تخت زرنگار پر جلوہ افروز ہوئے نواب اور راجے امراء روسا ہاتھی گھوڑوں پر سوار اپنی سج دھج دکھاتے ہوئے ایک جلوس بنا کر مہاراج کی قدم بوسی کو چلے سڑک پر دو رویہ تماشائیاں کا ہجوم تھا خوشی کو رنگوں سے بھی کوئی گہرا تعلق ہے جدھر نظر اٹھتی ہے رنگوں کی کیفیت دکھائی دیتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی امنڈی ہوئی ندی خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں سے بہتی چلی آتی ہے۔

مسرت کے جوش بھی کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کر بیٹھتے تھے ایک پنڈت جی مرزائی پہنے سر پر گول ٹوپی رکھے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے کسی شریر آدمی نے ان کی توند پر چمگادڑ چمٹادی پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے بڑا قہقہہ پڑا ایک اور مولوی صاحب نیچی اچکن پہنے ایک دکان پر کھڑے تھے دکاندار نے کہا مولوی صاحب آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہے یہ کرسی رکھی ہوئی ہے بیٹھ جائیے مولوی صاحب بہت خوش ہوئے سوچنے لگے

کہ شاید میرے بشرے سے رعب جھلک رہا ہے ورنہ دکاندار کرسی کیوں دیتا دکاندار غضب کے مردم شناس ہوتے ہیں ہزاروں آدمی کھڑے ہیں مگر اس نے کسی سے بیٹھنے کی استدعا نہ کی مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھے مگر بیٹھتے ہی پیچھے کی طرف لڑھکے اور نیچے بہتی ہوئی نالی میں گر پڑے۔ سارے کپڑے لت پت ہو گئے دکاندار کو ہزاروں بے نقط سنائیں بڑا قہقہہ پڑا کرسی تین ہی ٹانگ کی تھی۔

ایک جگہ کوئی افیونی صاحب تماشا دیکھنے آئے تھے جھکی ہوئی کمر پوپلا منہ سر کی چھدری زلفیں اور ڈاڑھی کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے آنکھوں میں سرمہ بھی آپ بڑے غور سے مصروف سیر تھے اتنے میں ایک حلوائی سر پر خوانچہ رکھے ہوئے آیا اور بولا خاں صاحب! جمعرات کی گلاب والی ریوڑیاں ہیں آج پیسے کی آدھ پاؤ لگا دیں کھا لیجئے ورنہ پچھتایئے گا افیونی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پیسے نہ تھے کف افسوس مل کر رہ گئے منہ میں پانی بھر آیا گلاب والی ریوڑیاں اور پیسے میں آدھ پاؤ نہ ہوئے پیسے نہیں تو سیروں تلا لیتے حلوائی تاڑ گیا بولا آپ پیسوں کی فکر نہ کریں پیسے پھر بھی مل جائیں گے آپ کوئی غیر معتبر آدمی تھوڑا ہی ہیں افیونی صاحب کی باچھیں کھل گئیں روح بھڑک اٹھی آپ نے پاؤ بھر ریوڑیاں لیں اور جی میں کہا اب پیسے دینے والے پر لعنت ہے گھر سے نکلوں گا ہی نہیں تو پیسے کیا لو گے۔ اپنے رومال میں ریوڑیاں لیں دل عاشق میں صبر کہاں مگر جوں ہی پہلی ریوڑھی زبان پر رکھی تلملا گئے پاگل کتے کی طرح پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا آدھا منہ کھول کر ٹھنڈی ہوا سے زبان کی جلن بجھانے لگے جب ہوش بجا ہوئے تو حلوائی کو ہزاروں صلواتیں سنائیں

اس پر بھی لوگ خوب ہنسے خوشی کے موقعوں پر ایسی بے ضرار شرارتیں اکثر ہوا کرتی ہیں اور انہیں لوگ معاف کر دینے کے قابل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ کھولتی ہوئی ہانڈی کے ابال ہیں۔

رات کے نو بجے سرودگاہ میں جمگھٹ ہوا سارا قصر نیچے سے اوپر تک خوش رنگ ہانڈیاں میں اور فانوسوں میں جگمگا رہا تھا اور جھاڑوں کی بہار تھی ایک باکمال کاریگر نے رنگ شالا کے بیچوں بیچ فضا میں معلق تھما ہوا ایک فوارہ لگایا تھا جس کے سوراخوں نے خس کیوڑہ، گلاب اور صندل کا عرق ہلکی پھواروں میں برس رہا تھا محفل میں عنبر بیز طراوت پھیلی ہوئی تھی خوشی اپنی سکھیوں سمیت خوشیاں منا رہی تھی۔

دس بجے مہاراجہ رنجیت سنگھ تشریف لائے۔ان کے بدن پر تن زیب کی ایک سفید اچکن تھی اور سر پر ترچھی پگڑی بندھی ہوئی تھی جس طرح آفتاب شفق کی خوش رنگ آرائشیوں سے پاک رہ کر اپنی پوری روشنی دکھا سکتا ہے اسی طرح ہیرے اور جواہرات وحریر کی پر تکلف سجاوٹ سے مبرا ہو کر مہاراجہ سنگھ کا جلال پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا چند نامور شعراء نے مہاراج کی شان میں اسی موقع کے لئے قصیدے کہے تھے مگر حاضرین کے چہروں سے ان کے دلوں میں جوش کھاتا ہوا شوق نغمہ دیکھ کر مہاراج نے گانا شروع کرنے کا حکم دیا طبلے پر تھاپ پڑی۔۔۔۔۔سازندوں نے سر ملایا نیند سے جھپکتی ہوئی آنکھیں کھل گئیں اور گانا شروع ہو گیا۔

اس شاہی محفل میں رات بھر نغمہ لطیف کی بارش ہوتی رہی پیلو اور پرچ دیس اور بہاگ کے طرب ناک جھونکے چلتے رہے رقاصان دل نواز نے باری باری اپنا جوہر کمال دکھایا کسی کی پرناز ادائیں دلوں میں کھب گئیں کسی کا تھرکنا قتل عام کر گیا کسی کی رسیلی تانوں پر واہ واہ مچ گئی۔ ایسی طبیعتیں بہت کم تھیں۔ جنہوں نے خلوص کے ساتھ گانے کا پاکیزہ لطف اٹھایا ہو۔

چار بجے ہوں گے جب شاما کی بازی آئی تو حاضرین سنبھل بیٹھے فرط شوق سے لوگ آگے کھسکنے لگے خمار سے بھری ہوئی آنکھیں چونک پڑیں برندا محفل میں آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر لوگ حیرت میں آ گئے۔ اس کے جسم پر آبدار گہنے تھے نہ خوش رنگ بھڑکیلی پشواز وہ صرف ایک گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی جس طرح ورق گلاب پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرن چمکتی ہے اسی طرح اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی تھی اس کا تکلف سے پاک حسن اپنی قدرتی آرائش کی شان دکھا رہا تھا اصلی حسن مشاطہ کی فسوں سازیوں کا محتاج نہیں ہوتا نظارۂ فطرت سے روح کو جو حظ اور سرور حاصل ہوتا ہے وہ پر تکلف باغیچوں کی سیر سے ممکن نہیں برندا نے گایا۔

''سب دن ناہیں برابر جات''

یہ گیت اس سے پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا مگر اس وقت کا سا اثر کبھی دلوں پر بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے یہ کہاوت روز سنتے تھے آج اس کے معنی سمجھ میں آئے کسی رئیس کو وہ دن یاد آیا جب وہ خود تاجدار تھا آج وہ ایک اطاعت گذار ہے کسی کو اپنے بچپن کا آغوش نازیاد آیا کسی کو وہ زمانہ یاد آیا جب وہ

زندگی کے دلفریب خواب دیکھ رہا تھا مگر افسوس اب وہ خود خواب پریشان ہو گیا برندا بھی گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگی ایک دن وہ تھا کہ اس کے دروازے پر عطائیوں اور گانے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور دل میں خوشیوں کا! اور آج! اس کے آگے برندا کچھ نہ سوچ سکی دونوں حالتوں کا مقابلہ نہایت دل شکن نہایت یاس انگیز تھا اس کی آواز بھاری ہو گئی اور رقت سے گلا بیٹھ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ شاما کے طرز و انداز کو غور سے دیکھ رہے تھے ان کی تیز نگاہیں اس کے دل میں پہنچنے کی کوششیں کر رہی تھیں لوگ متحیر تھے کہ کیوں ان کی زبان سے تعریف اور قدر دانی کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا وہ خوش نہ تھے غمگین بھی نہ تھے وہ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے قیافہ انہیں بتا رہا تھا کہ یہ عورت ہرگز ادا فروش نہیں ہے یکا یک وہ اٹھے اور بولے شاما! جمعرات کو میں پھر تمہارا گانا سنوں گا۔

(8)

برندا کے چلے جانے کے بعد اس کا گلعذار بچہ راجا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا ”اماں کہاں ہے؟ پریم سنگھ نے اسے گود میں لے کر کہا ”اماں مٹھائی لینے گئی ہے۔

راجہ خوش ہو گیا باہر جا کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا مگر کچھ دیر کے بعد پھر بولا اماں! مٹھائی پریم سنگھ نے مٹھائی لا کر دی مگر راجہ رو رو کر کہتا رہا اماں مٹھائی، وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ اماں کی مٹھائی اس سے زیادہ میٹھی ہو گی۔

آخر پریم سنگھ نے اسے کندھے پر چڑھالیا اور دوپہر تک کھیتوں میں گھومتا رہا راجہ کچھ دیر تک تو چپکا رہتا اور پھر چونک کر پوچھنے لگتا ”اماں کہاں؟“

بوڑھے سپاہی کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا وہ بچے کے پاس سے ایک دم

کو بھی کہیں نہ جاتا اور اسے باتوں میں لگائے رہتا کہ کہیں وہ پھر نہ پوچھ بیٹھے اماں کہاں ہے؟ بچوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے راجا کئی دن تک بے قرار رہا آخر رفتہ رفتہ ماں کی یاد اس کے دل سے مٹ گئی۔

اس طرح تین مہینے گزر گئے ایک روز شام کے وقت راجا اپنے دروازے پر کھیل رہا تھا کہ برندا آتی ہوئی دکھائی دی۔ راجا نے اس طرف غور سے دیکھا ذرا جھجکا پھر دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بولا ''اماں آئی، اماں آئی''

برندا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اس نے راجا کو گود میں اٹھا لیا اور کلیجے سے لگا کر بولی بیٹا! ابھی میں نہیں آئی پھر کبھی آؤں گی۔

راجا اس کا مطلب نہ سمجھا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر کی طرف چلا ممتا کی کشش برندا کو دروازے تک لے گئی مگر چوکھٹ سے آگے نہ لے جا سکی راجا نے بہت کھینچا مگر وہ آگے نہ بڑھی۔ تب راجا کی بڑی بڑی آنکھیں آب گول ہو گئیں اس کے ہونٹ پھیل گئے اور رونے لگا۔

پریم سنگھ اس کا رونا سن کر باہر نکل آیا یہاں تو برندا کھڑی ہے چونک کر بولا'' مگر برندا کچھ جواب نہ دے سکی''

پریم سنگھ نے پھر کہا ''باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ اب تک کہاں تھیں؟''

برندا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا ''میں اندر نہ آؤں گی''

پریم سنگھ ''آؤ آؤ اپنے بوڑھے باپ کی باتوں کا برا نہ مانو''

برندا ''نہیں دادا میں اندر قدم نہیں رکھ سکتی''

پریم سنگھ ''کیوں؟''

برندا ''پھر کبھی بتاؤں گی میں تمہارے پاس وہ تیغہ لینے آئی ہوں''

پریم سنگھ نے حیرت سے پوچھا ''اسے لے کر کیا کرو گی؟''

برندا ''اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی''

پریم سنگھ ''کس سے؟''

برندا: ''رنجیت سنگھ سے''

پریم سنگھ زمین پر بیٹھ گیا اور برندا کی باتوں پر غور کرنے لگا پھر بولا

''برندا! تمہیں موقع کیوں کر ملے گا؟''

برندا: ''کبھی کبھی خاک کے ساتھ اڑ کر چیونٹی بھی آسمان تک جا پہنچتی ہے''

پریم سنگھ: ''مگر بکری شیر سے کیوں کر لڑے گی؟''

برندا ''اسی تیغے سے''

پریم سنگھ ''اس تیغے نے کبھی چھپ کر خون نہیں کیا''

برندا: ''دادا یہ کرامات کا تیغہ ہے اس نے ہمیشہ دکھیاروں کی مدد کی ہے۔''

پریم سنگھ نے تیغہ لا کر برندا کے ہاتھ میں رکھ دیا برندا اسے پہلو میں چھپا کر جس طرح سے آئی تھی اسی طرف چلی گئی سورج ڈوب گیا مغرب کے افق میں روشنی کا کچھ نشان باقی تھا اور گائیں اپنے بچھڑوں کو دیکھنے کے لئے مرغزار سے دوڑتی پرشوق آواز سے میاتی چلی آتی تھیں اور برندا اپنے بچے کو روتا چھوڑ کر شام کے تاریک خوفناک جنگل کی طرف جا رہی تھی۔

(9)

جمعرات کا دن ہے رات کے دس بج چکے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی عشرت

گاہ میں رونق افروز ہیں ایک سات بتیوں والا جھاڑ روشن ہے گویا عروس شمع اپنی سہیلیوں کے ساتھ شبنم کا نقاب منہ پر ڈالے ہوئے محو ناز ہے مہاراجہ کے سامنے برندا گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے بیٹھی ہے اس کے ہاتھ میں ایک بین ہے اسی پر وہ ایک دلاویز نغمہ الاپ رہی ہے۔

مہاراج بولے ''شاما! میں تمہارا گانا سن کر بہت خوش ہوا تمہیں کیا انعام دوں؟''

شامانے ایک انداز سے سر جھکا کر کہا ''حضور کے اختیار میں سب کچھ ہے''

رنجیت سنگھ ''جاگیر لوگی''

شاما ''ایسی چیز دیجیے جس سے آپ کا نام ہو جائے''

مہاراج نے برندا کی طرف غور سے دیکھا اس کی سادگی کہہ رہی تھی کہ وہ مال و زر کو کچھ نہیں سمجھتی اس کی نگاہ کی پاکیزگی اور انداز کی متانت صاف بتا رہی تھی کہ وہ ناز فرش نہیں ہے پھر پوچھا ''کوہ نور لوگی؟''

شاما ''وہ حضور کے تاج میں زیادہ زیب دیتا ہے''

مہاراج متحیر ہو کر بولے ''تم خود مانگو''

شاما ''ملے گا؟''

رنجیت سنگھ ''ہاں''

شاما ''مجھے خون انصاف عطا ہو''

مہاراج رنجیت سنگھ چونک پڑے برندا کی طرف پھر غور سے دیکھا اور سوچنے لگے اس کا کیا مطلب ہے؟ انصاف تو خون کا پیاسا نہیں ہوتا یہ عورت ضرور کسی

ظالم رئیس راجہ کے دست بیداد سے نالاں ہے کیا عجب ہے کہ اس کا شوہر کہیں کا راجہ ہو ضرور ایسا ہی ہے اسے کسی نے قتل کر دیا ہے انصاف کو خون کی پیاس اسی حالت میں ہوتی ہے اسی وقت انصاف خونخوار جانور ہو جاتا ہے میں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جو کچھ مانگے گی وہ دوں گا اس نے ایک بیش قیمت چیز مانگی ہے خون انصاف وہ اسے ملنا چاہیے مگر کس کا خون؟

راجہ نے پھر پہلو بدل کر سوچا کس کا خون؟ یہ سوال میرے دل میں نہ پیدا ہونا چاہیے انصاف جس کا خون مانگے اس کا خون مجھے دینا چاہیے انصاف کے نزدیک سب کا خون برابر ہے مگر انصاف خون کا مستحق ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کینے کے بخار سے بھرے ہوئے انسان کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ نہیں رہنا چاہیے اکثر ایک کڑی بات ایک دل جلا دینے والا طعنہ انسان کے دل میں خون کی پیاس پیدا کر دیتا ہے اس طعنہ دلسوز کی آگ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک اس پر خون کے چھینٹے نہ دیئے جائیں میں نے زبان دے دی ہے غلطی ہوئی پوری روداد سنے بغیر میں ہرگز اس امر کا مجاز نہیں کہ خون انصاف کا وعدہ کروں ان خیالات نے راجہ کو کئی منٹ تک محو رکھا آخر وہ بولے ''شام تم کون ہو؟''

برندا ''ایک بے کس عورت''

راجہ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

برندا ''ماہ نگر میں''

رنجیت سنگھ نے برندا کو پھر غور سے دیکھا کئی مہینے پہلے رات کے وقت ماہ نگر میں ایک بھولی بھالی عورت کی جو تصویر دل میں کھنچی تھی وہ اس عورت سے بہت کچھ

ماتی تھی اس وقت نگاہیں اتنی بے باک نہ تھیں اس وقت آنکھوں میں شرم کی آب تھی اب شوخی کی جھلک ہے تب سچا موتی اب جھوٹا ہو گیا ہے۔

مہاراج بولے ''شاما! انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟''

برندا ''جسے آپ قصوروار ٹھہرائیں جس دن حضور نے ماہ نگر میں پڑاؤ کیا تھا اسی رات کو آپ کے سپاہی مجھے بزور کھینچ کر پڑاؤ پر لائے اور مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں مجھے ان کی ناپاک نگاہوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کی بے باک زبانوں نے ان سے شرمناک اشاروں نے میری عزت خاک میں ملا دی آپ وہاں موجود تھے اور آپ کی بے کس رعیت پر یہ ظلم کیا جا رہا تھا کون مجرم ہے؟ انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں''

رنجیت سنگھ زمین پر آنکھیں گاڑے سنتے رہے برندا نے ذرا دم لے کر پھر کہنا شروع کیا میں بیوہ عورت ہوں میری عزت کے پاسباں میری آبرو کے محافظ آپ ہیں پتی بیوگ کے ساڑھے تین سال میں نے تپسوئی بن کر کاٹے ہیں مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی میں اس قابل نہیں کہ گھر لوٹ کر جا سکوں اپنے بچے کے لئے میری گرداب نہیں کھلتی اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اٹھتی میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چراتی ہوں میری عزت لٹ گئی عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے اسے کون نہیں جانتا ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا ایک ہی عورت کی عزت کے لئے کوربنس کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کے لئے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں اور راج الٹ گئے ہیں میری عزت آپ کے آدمیوں نے لی ہے اس کا جواب دہ کون

ہے انصاف کس کا خون چاہتا ہے اس کا فیصلہ آپ کریں۔

برندا کا چہرہ سرخ ہو گیا مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ یہ خیال اور یہ جوش تقریر دیکھ کر سکتے میں آ گئے کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

آخر مہاراج نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور حسرت تک لہجے میں بولے شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وہ میں ہوں

اتنا کہنے کے ساتھ مہاراج رنجیت سنگھ کا چہرہ بھبک اٹھا ایک جذبہ کا عالم طاری ہو گیا فوری جذبات سے مخمور ہو کر انسان کا دل عرش کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے کانٹے کے چبھنے سے کراہنے والا انسان اسی نشے سے مست ہو کر خنجر کی نوک کلیجے میں چبھو لیتا ہے پانی کی بوچھار سے ڈرنے والا انسان گلے گلے پانی میں اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے اس عالم میں انسان کا دل ایک غیر معمولی قوت اور بے انتہا جوش محسوس کرنے لگتا ہے اسی عالم انسان سے ادنٰی ترین حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور اسی عالم میں انسان اپنے قول و فعل کی بلندی سے دیوتاؤں کو بھی شرمندہ کر دیتا ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ بےتاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے بولے شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وہ میں ہوں! تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا جواب دہ میں ہوں بزرگوں نے کہا ہے کہ ایشور کے نزدیک راجہ اپنے ملازموں کی سختی و زبردستی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر راجہ نے تیزی کے ساتھ اچکن کے بند کھول دیئے اور برندا کے سامنے گھٹنوں کے بل سینہ پھیلا کر بیٹھے ہوئے بولے

''شاما! تمہارے پہلو میں تلوار چھپی ہوئی ہے وہ وکرمادت کی تلوار ہے اس نے کتنی ہی بار انصاف کی حمایت کی ہے آج ایک بدقسمت راجا کے خون سے اس کی پیاس بجھا بے شک وہ راجہ بدنصیب ہے جس کے راج میں بے کسوں پر ظلم ہوتا ہے۔''

برندا کے دل میں اب ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی جوش انتقام نے محبت اور احترام کو جگہ دی۔۔۔۔رنجیت سنگھ نے اپنی ذمہ داری تسلیم کر لی وہ اس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت میں تیغ انصاف کا نشانہ بننے کے لیے کھڑے ہیں ان کی جان اب اس کی مٹھی میں ہے انہیں مارنا یا جلانا اب ان کے اختیار ہے۔

یہ خیالات اس کا جوش انتقام ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھے ثروت اور حشمت جب اپنے تخت زرنگاہ سے اتر کر دست ترحم کی خواستگاہ ہوتی ہے تو کون سا ایسا دل ہے جو پسیج نہ جائے گا؟ برندا نے دل پر جبر کر کے پہلو سے خنجر نکالا مگر وار نہ کر سکی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر ی۔

مہاراج رنجیت سنگھ سمجھ گئے کہ عورت کی ہمت دغا دے گئی وہ بڑی تیزی سے لپکے اور تیغے کو ہاتھ میں اٹھا لیا یکا یک داہنا ہاتھ مجذوبانہ جوش کے ساتھ اوپر کو اٹھا وہ ایک بار زور سے بولے ''واہ گرو کی جے'' اور قریب تھا کہ سینہ تلوار کے ہم آغوش ہو بجلی کوند کر سینہ ابر میں گھسنے ہی والی تھی کہ برندا ایک چیخ مار کر اٹھی اور راجا کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ رنجیت سنگھ نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانا چاہا مگر کمزور عورت نے ان کے ہاتھ کو اس طرح جکڑا تھا جیسے دل کو جکڑ لیتی ہے بے بس ہو کر بولے ''شاما! انصاف کو اپنی پیاس بجھانے دو''

شاما نے کہا ’’مہاراج پیاس بجھ گئی یہ تلوار اس کی گواہ ہے‘‘

مہاراج نے تیغہ کو دیکھا اس وقت اس میں دوج کے چاند کی چمک تھی حق اور انصاف کے چمکتے ہوئے سورج نے اس چاند کو منور کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آہ بیکس

پہلی بار: ''زمانہ'' اکتوبر 1911ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی اول)

منشی رام سیوک بھوئیں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے اور بولے ایسی زندگی سے تو موت بہتر۔

موت کی دست درازیوں کا سارا زمانہ شاکی ہے اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا، مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتی ہیں انہیں قبول کرنے کی فرصت ہی نہیں اگر اسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاند پور کے ایک ممتاز رئیس تھے اور روسا کے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور وسیلہ معاش اتنا ہی وسیع تھا جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں یہی ان کی املاک اور موروثی جائیداد تھی وہ روز عدالت منصفی کے احاطے میں نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظر آتے تھے اور گو انہیں کسی نے اجلاس میں قانونی بحث یا مقدمے کی پیروی کرتے نہیں دیکھا مگر عرف عام میں وہ مختار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے، پانی برسے، اولے گریں مگر مختار صاحب کسی نامرد دل کی طرح وہیں جمے رہتے تھے وہ کچہری چلتے تھے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا چاروں طرف سے ان پر عقیدت و احترام کی نگاہیں پڑتیں، اور اطراف میں مشہور تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختار کاری مگر یہ صرف خاندانی یا اعزازی پیشہ تھا آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں نقرئی سکوں کا تو ذکر ہی کیا کبھی کبھی مسی سکے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں بھی کوئی شک نہیں مگر ''پاس'' کی منحوس قید نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ بہر حال جو کچھ ہو یہ محض اعزاز کے لئے تھا ورنہ ان کی گذران کی خاص صورت قرب و جوار کی بے کس مگر فارغ البال بیواؤں اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ ان کی امانت میں رکھتیں، بوڑھے اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں سونپتے، اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی میں جا کر نکلنا نہیں جانتا تھا۔ وہ حسب ضرورت کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے بلا قرض لئے کس کا کام چل سکتا ہے صبح کو شام کے وعدے پر لیتے مگر وہ شام کبھی نہیں آتی تھی خلاصہ یہ کہ منشی جی قرض لے کر دینا نہیں جانتے تھے اور ان کا خاندانی وصف تھا، اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔

یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے تھے۔ قانون اور عدالت کا تو انہیں کوئی خوف نہ تھا۔ اس میدان میں ان کا سامنا کرنا پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا تھا لیکن جب بعض شریر النفس لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہو جاتے ان کی خوش نیتی پر شک کرتے اور ان کے روبرو اعلانیہ بدزبانیوں پر اتر آتے تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا۔ اس قسم کے ناخوش گوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر جگہ ایسے تنگ ظرف حضرات موجود رہتے ہیں جنہیں دوسروں کی تحقیر میں مزہ آتا ہے انہیں بدخواہوں کی شہ پا کر بعض اوقات چھوٹے آدمی منشی جی کے منہ آ

جاتے۔ ورنہ ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے گھر میں جا کر انہیں کی شان میں نازیبا کلمات منہ سے نکالے۔ منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے برسوں تک اس سے سبزی لی تھی اگر دام نہ دیے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہیے تھا جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بد زبان عورت دو سال ہی میں گھبرا گئی اور چند آنے پیسوں کے لئے ایک معزز آدمی کی جان ریزی کی ایسی حالت میں آ کر جھنجھلا کر موت کی دعوت دی تو ان کی کوئی خطا نہیں۔

اسی موضع میں مونگا نام کی ایک بیوی برہمنی تھی اس کا شوہر برما کی کالی پلٹن میں حوالدار تھا وہ وہیں مارا گیا اس کے حسن خدمات کے صلے میں مونگا کو پانی سو روپے ملے تھے۔ بیوہ عورت تھی زمانہ نازک اس نے یہ روپے منشی رام سیوک کو سونپ دیے اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر گذر کرتی رہی منشی جی نے یہ فرض کئی سال تک نیک نیتی سے پورا کیا مگر جب پیرانہ سالی کے باوجود مونگا نے مرنے میں تامل کیا اور منشی جی کو اندیشہ ہوا، شاید وہ توشہ آخرت۔۔۔۔کے لئے نصف رقم بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تو ایک روز انہوں نے کہا ''مونگا تمہیں مرنا ہے یا نہیں صاف صاف کہہ دو تا کہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں''

اس دن مونگا کی آنکھیں کھلیں خواب سے بیدار ہوئی بولی میرا حساب کر دو فرد حساب تیار تھی امانت میں اب ایک۔۔۔۔کوڑی بھی نہ تھی اس سخت گیری سے جو بڑھاپے کے ساتھ مخصوص ہے اس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا میرے سو روپے تم نے دبائے ہیں میں ایک ایک کوڑی لے لوں گی مگر بے کسوں کا غصہ پٹاخے کی آواز ہے جس سے بچے ڈر جاتے ہیں اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔

عدالت میں اس کا کچھ زور نہ تھا نہ کوئی لکھا پڑھی نہ حساب نہ کتاب البتہ پنچایت سے کچھ امید تھی اور پنچایت بیٹھی گاؤں کے آدمی جمع ہوئے منشی جی نیت اور معاملے کے صاف تھے انہیں پنچوں کا کیا خوف سبھا میں کھڑے ہو کر پنچوں سے کہا۔

''بھائیو! آپ سب لوگ ایماندار اور شریف ہیں میں آپ صاحبوں کا خاک پا اور پروردہ ہوں آپ سبھوں کی عنایات و الطاف سے فیض و کرم سے، محبت و شفقت سے میرا ہر ایک رونگٹا گراں بار ہے کیا آپ سب نیک اور شریف حضرات خیال کرتے ہیں کہ میں نے ایک بے کس اور بیوہ عورت کے روپے ہضم کر لیے''

پنچوں نے ایک زبان کہا ''نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا''

اگر آپ سب نیک اور شریف صاحبان کا خیال ہے کہ میں نے روپے دبا لئے تو میرے ڈوب جانے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں میں امیر نہیں ہوں، نہ مجھے فیاضی کا دعویٰ ہے مگر اپنے قلم کی بدولت کسی کا محتاج نہیں کیا میں ایسا کمینہ ہو جاؤں گا کہ ایک بے کس عورت کے روپے ہضم کر لوں۔

پنچوں نے یک زبان ہو کر پھر کہا

''نہیں نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا''

پگڑی کی نگری ہے پنچوں نے منشی جی کو رہا کر دیا پنچایت ختم ہو گئی اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھا کہ یہاں نہ دیا، نہ سہی، وہاں کہاں جائے گا

مونگا کا اب کوئی غم خوار و مددگار نہ تھا ناداری سے جو کچھ تکلیفیں ہو سکتی ہیں وہ

سب اسے جھینلی پڑیں اس کے قویٰ درست تھے وہ چاہتی تو محنت کر سکتی تھی مگر جس دن پنچایت ختم ہوئی اسی دن سے اس نے کام کرنے کی قسم کھائی اب اسے رات دن روپوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔

اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسے صرف ایک کام تھا اور وہ منشی رام سیوک کا ذکر خیر تھا اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی وہ رات دن انہیں صدق دل سے دعائیں دیا کرتی اور اکثر دعاؤں میں اسے شاعرانہ تلازمے ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی جسے سن کر حیرت ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ مونگا کے حواس پر وحشت کا غلبہ ہوا ننگے سر، ننگے بدن، ہاتھ میں ایک کلہاڑہ لئے وہ سنسان جگہوں میں جا بیٹھتی۔ جھونپڑے کے بجائے اب وہ مرگھٹ پر ندی کے کنارے کھنڈروں میں گھومتی دکھائی دیتی بکھری ہوئی پریشان لٹیں۔۔۔۔۔۔سرخ آنکھیں۔۔۔۔۔وحشت ناک چہرہ۔۔۔۔سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں اس کی۔۔۔۔۔یہ ہیبت کذائی دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے اسے کوئی مزاح کے طور پر نہ چھیڑتا تھا۔ اگر وہ کبھی گاؤں میں نکل آتی تو عورتیں گھروں کے کیواڑ بند کر لیتیں۔ مرد کترا کر نکل جاتے اور بچے چیخ چیخ کر بھاگ جاتے اگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ اور رام غلام تھا باپ میں جو کچھ کور کسر رہ گئی تھی وہ ان کی ذات میں پوری وہ گئی تھی لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا گاؤں کے کانے اور لنگڑے آدمی اس کی صورت سے بیزار تھے اور گالیاں کھانے میں تو شاید سسرال میں آنے والے داماد کو بھی اتنا مزہ نہ آتا ہوگا۔ وہ مونگا کے پیچھے تالیاں بجاتا کتوں کو ساتھ لئے اس وقت تک رہتا، جب تک وہ غریب تنگ آ کر

نکل نہیں جاتی۔ روپیہ پیسہ ہوش و حواس کھو کر اسے پگلی کا لقب ملا اور وہ سچ مچ پگلی تھی، اکیلے بیٹھے ہوئے آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کیا کرتی جس میں رام سیوک کے گوشت ہڈی، پوست آنکھیں، کلیجہ وغیرہ کو کھانے مسلنے نوچنے کھسوٹنے کی پر جوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا اور جب یہ خواہش بے تابی کی حد تک پہنچ جاتی تو رام سیوک کے مکان کی طرف منہ کر کے بلند آواز اور ڈراؤنی آواز سے ہانک لگاتی۔

''تیرا لہو پیوں گی''

اکثر راتوں کے سناٹے میں یہ گرجتی ہوئی آواز سن کر عورتیں چونک پڑی تھیں، مگر اس آواز سے زیادہ ہیبت ناک اس کا قہقہہ تھا منشی جی کے خیالی لہو پینے کی خوشی میں وہ زور زور سے ہنسا کرتی تھی، اس قہقہے سے ایسی شیطانی مسرت ایسی سفا کی، ایسی خونخواری ٹپکتی تھی کہ رات کو لوگوں کے خون سرد ہو جاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سینکڑوں الو ایک ساتھ ہنس رہے ہیں۔

منشی رام سیوک بڑے حوصلہ جگر کے آدمی تھے نہ انہیں دیوانی کا خوف تھا، نہ فوجداری کا، مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سن کر وہ بھی سہم جاتے تھے ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو اور بسا اوقات نہیں ہوتا مگر خدائی انصاف کا خوف ہر انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود رہتا ہے اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات پیش آ جاتے ہیں جب نفس کے نیچے دبا ہو۔۔۔ یہ خیال اوپر آ جاتا ہے مونگا کی وحشت ناک شب گردی رام سیوک کے لئے یہی مبارک اتفاق تھی اور ان سے زیادہ ان کی بیوی کے لئے جو ایک وفادار عورت کی طرح ہر معاملے میں نہ صرف عورت کا ساتھ دیتی تھی بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ

نمایاں حصہ لیا کرتی تھی۔فرقہ اناث میں ان کے زور بیان کا عام شہرہ تھا۔زبانی معاملات ہمیشہ وہی طے کیا کرتی تھیں ان لوگوں کی بھول تھی جو کہتے تھے کہ منشی جی کی زبان پر سرسوتی ہے یہ فیض ان کی بیوی کو حاصل تھا زور بیان میں انہیں وہی ملکہ تھا جو منشی جی کو زور تحریر میں اور یہ دونوں پاک روحیں اکثر عالم مجبوری میں۔۔۔۔۔مشورہ کرتیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

آدھی رات کا وقت تھا

منشی جی حسب معمول غم غلط کرنے کے لئے آب آتشیں کے دو چار گھونٹ پی کر سو گئے تھے۔

یکا یک مونگا نے ان کے دروازے پر آکر زور سے ہانک لگائی

''تیرا لہو پیوں گی''

اور خوب کھلکھلا کر ہنسی

منشی جی یہ خوفناک قہقہہ سن کر چونک پڑے،خوف سے پاؤں تھرتھرا رہے تھے اور کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔دل پر بہت جبر کر کے دروازہ کھولا اور جا کر ناگن کو جگایا۔

ناگن نے جھلا کر کہا

کیا ہے؟ کیا کہتے ہو؟

منشی جی نے آواز دبا کر کہا

وہ دروازہ پر آکر کھڑی ہے

ناگن اٹھ بیٹھی کیا کہتی ہے؟

تمہارا سر

کیا دروازے پر آ گئی؟

''ہاں آواز ! نہیں سنتی ہو''

ناگن مونگا سے نہیں ڈرتی تھی مگر اس کی وحشت سے ڈرتی تھی تاہم اسے یقین تھا کہ میں تقریر میں ضرور اسے نیچا دکھا سکتی ہوں

سنبھل کر بولی ''تو میں اس سے دو باتیں کر لوں''

مگر منشی جی نے منع کیا

دونوں آدمی دہلیز پر آ گئے اور دروازے سے جھانک کر دیکھا مونگا کی دھندلی مورت زمین پر پڑی تھی۔ اور اس کی سانس تیزی سے چلتی سنائی دیتی تھی۔ رام سیوک کے خون اور گوشت کی آرزو میں وہ اپنا گوشت اور خون خشک کر چکی تھی ایک بچہ بھی اسے گرا سکتا تھا مگر اس سے سارا گاؤں ڈرتا تھا۔

ہم زندہ انسانوں سے نہیں ڈرتے ہیں مردوں سے ڈرتے ہیں

اگرچہ اندر سے دروازہ بند تھا مگر منشی جی اور ناگن نے بیٹھ کر رات کاٹی مونگا اندر نہیں آ سکتی تھی مگر اس کی آواز کو کون روک سکتا تھا۔

مونگا سے زیادہ ڈراونی اس کی آواز تھی

صبح کے وقت منشی جی باہر نکلے اور مونگا سے بولے

''یہاں کیوں پڑی ہے؟''

مونگا بولی

''تیرا خون پیوں گی''

ناگن نے بل کھا کر کہا

''تیرا منہ جھلس دوں گی''

مگر ناگن کے زہر نے مونگا پر کچھ اثر نہ کیا اس نے زور سے قہقہہ لگایا ناگن کھسیانی ہوگئی۔ قہقہے کے مقابلے میں زبان بند ہو جاتی ہے۔

منشی جی پھر بولے

''یہاں سے اٹھ جاؤ''

''نہ اٹھوں گی''

''کب تک پڑی رہے گی؟''

''تیرا لہو پی کر جاؤں گی''

منشی جی کی زورِ تحریر کا یہاں کچھ زور نہ چلا اور ناگن کی آتشیں تقریر یہاں سرد ہو گئی۔

دونوں گھر میں جا کر مشورہ کرنے لگے۔ یہ بلا کیوں کر ٹلے گی اس آفت سے کیوں کر نجات ہوگی۔

دیوی آتی ہیں تو بکرے کا خون پی کر چلی جاتی ہیں مگر یہ ڈائن انسان کا خون پینے آئی ہے۔ وہ خون جس کے اگر قلم بنانے میں چند قطرے نکل پڑے تھے۔ تو ہفتوں اور مہینوں سارے کنبے کو افسوس رہتا تھا اور یہ واقعہ گاؤں میں مرکزِ گفتگو بن جاتا تھا کیا یہ خون پی کر مونگا کا سوکھا ہوا جسم ہرا ہو جائے گا۔

گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ مونگا منشی جی کے دروازے پر دھرنا دیے بیٹھی ہے منشی جی کی رسوائی میں گاؤں والوں کو خواہ مخواہ لطف آتا تھا۔ سینکڑوں آدمی جمع

ہو گئے اس دروازے پر وقتاً فوقتاً میلے لگے رہتے تھے۔ مگر وہ زوروشور پر جوش میلے ہوتے تھے آج کا مجمع خاموش اور متین تھا۔ یہ رکاؤ اور حبس رام غلام کو مرغوب نہ تھا مونگا پر اسے ایسا غصہ آرہا تھا کہ اس کا بس چلتا تو ضرور کنویں میں دھکیل دیتا کہتا چل کنویں پر تجھے پانی پلالاؤں جب وہ کنویں پر پہنچتی تو پیچھے سے ایسا دھکا دیتا کہ اڑااڑا دھم کنویں میں جا گرتی اور پیٹے ہوئے کتے کی طرف چیخنے لگتی۔ دھماکے کی آواز آتی۔

اس خیال سے رام غلام کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی اور وہ مشکل سے اپنی روک سکا کیسے مزے کی بات ہوتی مگر یہ چڑیل یہاں سے اٹھتی ہی نہیں کیا کروں۔

منشی جی کے گھر میں استخوانی نسل کی ایک گائے تھی کھلی دانہ اور بھوسا تو اسے کثرت سے کھلایا جاتا تھا مگر وہ سب اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جاتا تھا اور اس کا ڈھانچہ روز بروز نمایاں ہوجاتا تھا رام غلام نے ایک ہانڈی میں اس کا گوبر گھولا اور وہ ساری غلاظت مونگا پر لا کر انڈیل دی۔ اور پھر اس کے چھینٹے تماشائیوں پر ڈال دیے غریب مونگا لت پت ہوگئی اور اٹھ کر رام غلام کی طرف دوڑی۔ صدہا تماشائیوں کے کپڑے خراب ہو گئے۔۔۔۔لوگ بھاگ کھڑے ہوئے یہ منشی رام سیوک کا دروازہ ہے یہاں اس طرح کی مدارات کی جاتی ہے جلد بھاگ چلو ورنہ کوئی اس سے اچھی خاطر کی جائے گی۔

ادھر مطلع صاف ہوا ادھر رام غلام گھر میں جا کر خوب ہنسا اور خوب تالیاں بجائیں منشی جی نے اس مجمع ناجائز کو ایسی آسانی اور خوبصورتی سے ہٹا دینے کی

تدبیر پر اپنے سعادت مند لڑکے کی پیٹھ ٹھونکی۔۔۔۔۔۔ مگر سب بھاگے مونگا جوں کی توں بیٹھی رہی۔

دوپہر ہوئی مونگا نے کھانا نہیں کھایا تھا شام ہزاروں اصرار کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گاؤں کے چودھری نے خوشامدیں کیں حتیٰ کہ منشی جی نے ہاتھ تک جوڑے مگر دیوی راضی نہ ہوئیں آخر منشی جی اٹھ کر اندر چلے گئے ان کا قول تھا روٹھنے والے کو بھوک آپ منالیا کرتی ہے مونگا نے یہ رات بھی بے آب و دانہ کاٹ دی۔ اور لالہ صاحب اور ان کی غم گسار نے آج بھی پھر جاگ جاگ کر صبح کی۔

آج مونگا کے نعرے اور قہقہے بہت کم سنائی دیئے گھر والوں نے سمجھا بلا ٹل گئی سویرا ہوتے ہی جو دروازہ پر دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اس کی جان نکل چکی تھی وہ اس دروازے پر جان دینے آئی تھی۔ جس نے اس کی جمع جتھا لی تھی اس کو اپنی جان بھی سونپ دی۔۔۔۔ اپنی مٹی تک اس کی نذر کر دی۔

یہ ذکر کہ گاؤں میں کیسی ہلچل مچی اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے، فضول ہے۔۔۔۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنی ہلچل مچ سکتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی مچی منشی جی کی جتنی ذلت ہونی چاہیے تھی اس سے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔۔۔ گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے یا انہیں چھونے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر کا کوئی گائے بندھی مر جاتی ہے تو وہ شخص مہینوں در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔۔۔۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے۔۔۔۔ نہ کہار

اس کا پانی بھرے نہ کوئیا سے چھوئے۔۔۔۔یہ گئو بتیا کا پرایشچت ہے۔۔۔۔برہم بتیا کی سزائیں اس سے بدر جہا سخت اور ذلتیں بدر جہا زیادہ ہیں۔۔۔موٹگا یہ جانتی تھی اور اسی لئے اس دروازے پر آ کر مری تھی۔۔۔۔۔۔۔۔کہ میں جو زندہ رہ کر نہیں کر سکتی مر کر بہت کچھ کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔۔گوبر کا ایک اپلا جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو سادھولوگ اسے ماتھے پر چڑھاتے ہیں پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کر آگ سے بھی زیادہ قال ہو جاتا ہے۔

منشی رام سیوک قانون داں آدمی تھے۔قانون نے ان پر کوئی جرم نہیں لگایا تھا۔موٹگا کسی قانونی دفعہ کے منشا کے مطابق نہیں مری تھی تعزیرات ہند میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی اس لئے جو لوگ ان سے پرایشچت کرانا چاہتے تھے ان کی سخت غلطی تھی کوئی مضائقہ نہیں کہار پانی نہ بھرے وہ خود اپنا پانی آپ بھر سکتے تھے، اپنا کام کرنے میں کوئی شرم نہیں بلا سے حجام بال نہ بنائے گا۔حجامت کی ضرورت ہی کیا ہے ڈاڑھی بہت خوبصورت چیز ہے، ڈاڑھی مرد کا زیور اور سنگار ہے اور پھر بالوں سے ایسی ہی نفرت ہو گئی تو ایک ایک آنے میں استرے آتے ہیں دھوبی کپڑے نہ دھوئے گا اس کی بھی کچھ پروا نہیں صابن کوڑیوں کے مول آتا ہے ایک بٹی میں درجنوں کپڑے ایسے صاف ہو جائیں جیسے بگلے کے پر، دھوبی کیا کھا کے ایسے صاف کپڑے دھوئے گا کم بخت پتھر پر پٹک پٹک کپڑوں کا لتا نکال لیتا ہے خود پہنے، دوسروں کو پہنائے بھٹی میں چڑھائے، ریہہ میں بھگوئے، کپڑوں کی درگت کر ڈالتا ہے جب ہی تو کرتے دو تین سال سے زیادہ نہیں چلتے ورنہ دادا ہر

پانچویں سال دوا اچکن اور دو کرتے بنوایا کرتے تھے۔ منشی رام سیوک اور ان کی زوجہ غم گسار نے دن بھر یوں ہی دلوں کو سمجھا کر ٹالا۔

مگر شام ہوتے ہی ان کو قوت استدلال نے جواب دیا ان کے دلوں پر ایک بے معنی، بے بنیاد، مہمل خوف کا غلبہ ہوا۔ اور رات کے ساتھ ساتھ خوف کا یہ احساس مشکل ہوتا گیا یہاں تک کہ ناگن کھانا پکانے کے لئے رسوئی کے کمرے میں تنہا نہ جاسکی باہر کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا تھا مگر کسی ایک کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ جا کر دروازہ بند کر آئے آخر ناگن نے ہاتھ میں چراغ لیا، منشی جی نے کلہاڑا لیا اور رام غلام نے گنڈاسا اس قطع سے تینوں آدمی چونکتے ہچکچاتے دروازے تک آئے یہاں منشی جی نے بڑی جرأت سے کام لیا انہوں نے بے دھڑک دروازے سے نکلنے کی کوشش کی اور کانپتی ہوئی مگر بلند آواز میں ناگن سے بولے تم ناحق ڈرتی ہو کیا یہاں وہ بیٹھی ہے مگر وفادار ناگن نے انہیں اندر کھینچ لیا۔ اور خفا ہو کر بولیں تمہارا یہی لڑکپن تو اچھا نہیں۔

یہ مہم فتح کرنے کے بعد تینوں آدمی تینوں آدمی رسوئی کے کمرے میں آئے اور کھانا پکانا شروع ہوا۔

مگر مونگا ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھی اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر مونگا کا گمان ہوتا تھا، اندھیرے کونوں میں مونگا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ، وہی جھنڈولے بال، وہی وحشت، وہی ڈراؤنی آنکھیں مونگا کا مکھ سکھ دکھائی دیا تھا۔ اسی کمرے میں آٹے دال کے کئی مٹکے رکھے ہوئے تھے وہیں کچھ پرانے چیتھڑے بھی رکھے ہوئے تھے، ایک چوہے کو بھوک نے بے چین کیا مٹکوں نے کبھی اناج

کی صورت نہیں دیکھی تھی مگر سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ گھر کے چوہے غضب کے ڈاکو ہیں وہ ان دانوں کی تلاش میں جو مٹکوں سے کبھی نہیں گرے تھے رینگتا ہوا اس چیتھڑے کے نیچے آ نکلا۔۔۔۔۔۔۔کپڑے میں حرکت ہوئی۔۔۔۔۔پھیلے ہوئے چیتھڑے مونگا کی ٹانگیں بن گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ناگن دیکھتے ہی جھجکی اور چیخ اٹھی، منشی جی بدحواس ہو کر دروازے کی طرف لپکے رام غلام دوڑ کر ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بارے چوہا باہر نکل گیا اسے دیکھ کر ان لوگوں کے ہوش بجا ہوئے اب منشی جی مردانہ قدم اٹھائے مٹکے کی طرف چلے۔

ناگن نے طنز سے کہا "رہنے بھی دو دیکھ لی تمہاری مردی"

منشی جی وفادار ناگن کی اس ناقدری پر بہت بگڑے کیا تم سمجھتی ہو میں ڈر گیا بھلا ڈر کی کیا بات تھی مونگا مر گئی اب کیا وہ بیٹھی ہے کل میں دروازے کے باہر نکل گیا تھا تم روکتی رہیں اور میں نہ مانا۔

منشی جی کی اس زبردست دلیل نے ناگن کو لاجواب کر دیا کل دروازے کے باہر نکل جانا یا نکلنے کی کوشش کرنا معمولی کام نہ تھا جس کی جرأت کا ایسا ثبوت مل چکا ہو اسے بزدل کون کہہ سکتا ہے یہ ناگن کی ہٹ دھرمی تھی۔

کھانا کھا کر تینوں آدمی سونے کے مکان میں آئے لیکن مونگا نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ باتیں کرتے تھے، دل کو بہلاتے تھے، ناگن نے راجا ہر دول اور رانی سارندھا کی کہانیاں کہیں منشی جی نے چند مقدمات کی تفصیل بیان کی مگر تدبیروں کے باوجود مونگا کی تصویر آنکھوں کے سامنے سے دور نہ ہوتی تھی۔ ذرا کواڑ کھڑکا اور دونوں چونک پڑے، پتوں میں سنسناہٹ ہوئی اور دونوں کے

رونگٹے کھڑے ہو گئے اور رہ رہ کر ایک مدھم آواز نہ جانے کہاں سے، شاید آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے سے ان کے کانوں میں آتی تھی۔

"میں تیرا خون پیوں گی"

آدھی رات کو ناگن عالم غنودی سے چونکی وہ غریب ان دنوں حاملہ تھی سرخ آتشیں آنکھوں والی، تیز نکیلے دانتوں والی مونگا اس کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناگن چیخ مار کر اٹھی ایک عالم وحشت میں بھاگ کر آنگن میں آئی اور فرط ہراس سے زمین پر گر پڑی۔ سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ منشی جی نے بھی اس کی چیخ سنی مگر خوف کے مارے آنکھیں نہ کھولیں اندھوں کی طرح دروازہ ٹٹولتے رہے۔ بہت دیر کے بعد انہیں دروازہ ملا آنگن میں آئے ناگن زمین پر پڑی ہاتھ پاؤں پٹک رہی تھی۔ اسے اٹھا کر اندر لائے مگر رات بھر اس نے آنکھیں نہ کھولیں صبح کو ہڈیاں پکنے لگیں تھوڑی دیر میں بخار ہو آیا جسم سرخ تو ہو گیا شام ہوتے ہوتے سرسام ہوا اور آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا ہوا تھا ناگن اس دنیا سے چل بسی۔

رات گذر گئی دن چڑھتا آتا تھا مگر گاؤں کا کوئی آدمی لاش اٹھانے کے لئے دروازے پر نہ آتا تھا۔ منشی جی گھر گھر گھومے مگر کوئی نہ نکلا ہتیارے کے دروازے پر کون آئے ہتیارے کی لاش کون اٹھائے منشی جی کا رعب ان کے خونخوار قلم کا خوف اور قانونی مصلحت آمیزیاں کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ چاروں طرف سے ہار کر منشی جی پھر اپنے خانہ تاریک میں آئے مگر اندر قدم نہیں رکھا جاتا تھا نہ باہر کھڑے رہ سکتے تھے باہر مونگا اندر ناگن دل پر بہت جبر کر کے ہنومان چالیسا کا ورد کرتے ہوئے وہ

مکان میں گئے اس وقت ان کے دل پر جو گذر رہی تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے گھر میں لاش پڑی ہوئی نہ کوئی آگے نہ پیچھے دوسری شادی تو ہو سکتی ہے ابھی اس پھاگن میں تو پچاسواں سال ہے مگر ایسی زبان دراز خوش بیان عورت کہاں ملے گی۔ افسوس کہ اب تقاضا کرنے والوں سے بحث کون کرے گا کون انہیں لا جواب کرے گا لین دین کا حساب کون اتنی خوبی سے کرے گا کس کی آواز بلند تیر کی طرح اہل تقاضا کے سینوں میں چبھے گی اس نقصان کی تلافی اب ممکن نہیں۔

دوسرے دن منشی جی لاش کو ایک ٹھیلے پر لا کر گنگا جی کی طرف چلے عزاداروں کی تعداد بہت مختصر تھی ایک منشی جی اور دوسرا رام غلام اس ہیبت کذائی سے مونگا کی لاش بھی نہیں اٹھی تھی۔

مگر مونگا نے ناگن کی جان لے کر بھی منشی جی کا پنڈ نہ چھوڑا۔ لیلیٰ کی تصویر مجنوں کے پردہ دماغ پر ایسے شوخ رنگوں میں شاید ہی کھنچی ہو آٹھوں پہر ان کا خیال اسی طرف لگا رہتا تھا اگر دل بہلانے کا کوئی ذریعہ ہوتا تو شاید انہیں اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر گاؤں کا کوئی ذی روح ان کے دروازے کی طرف جھانکتا بھی نہ تھا غریب اپنے ہاتھوں پانی بھرتے، خود برتن دھوتے۔ غم وغصہ فکر اور خوف دنیا کے مقابلے میں ایک دماغ کب تک ٹھہر سکتا تھا خصوصاً وہ دماغ جو روزانہ قانونی مباحثوں میں صرف تخیر ہو جاتا ہو۔

گنج تنہائی کے دس بارہ دن جوں توں کر کے کٹے۔ چودھویں دن منشی جی نے کپڑے بدلے اور بستہ لئے ہوئے کچہری چلے، آج ان کا چہرہ کچھ روشن تھا جاتے ہی میرے موکل مجھے گھیر لیں گے ماتم پرسی کریں گے میں آنسوؤں کے دو

چار قطرے گرا دوں گا پھر بیع ناموں، صلح ناموں وغیرہ کا ایک طوفان بلکہ سیلاب سامنے آجائے گا یہ خیال انہیں خوش کئے ہوئے تھا مٹھیاں گرم ہوں گی روپے کی صورت نظر آئے گی شام کو ذرا شغل ہو جائے گا اس کے چھوٹنے سے تو جی اور بھی اچاٹ تھا انہیں خیالوں میں سرخوش منشی جی کچہری پہنچے۔

مگر وہاں رہن ناموں کے طوفان، بیع ناموں کے سیلاب اور موکلوں کی چہل پہل کے بدلے مایوسی کا ایک کف دست حوصلہ شکن ریگستان نظر آیا۔ بستہ کھولے گھنٹوں بیٹھے رہے مگر کوئی مخاطب نہ ہوا کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ مزاج کیسا ہے نئے موکل تو خیر بڑے بڑے پرانے موکل جن کا منشی جی کے ساتھ پشتوں سے تعلق چلا آتا تھا آج ان سے گریز کرنے لگے۔ وہ نالائق اور بدتمیز رمضان خاں کیسا بے شعور آدمی تھا، املا تک غلط لکھتا تھا منشی جی ہر روز اس کا مضحکہ اڑاتے تھے مگر آج سینکڑوں آدمی اسے گھیرے ہوئے تھے بے تمیز گوپیوں میں کنہیا بنا ہوا تھا واہ ری قسمت موکل کمبخت یوں منہ پھیرتے چلے جاتے ہیں، گویا کبھی کی جان پہچان نہیں۔

دن بھر موکلوں کا انتظار کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر کی طرف چلے پژمردہ مایوس متفکر اور جوں جوں گھر نزدیک آتا تھا مونگا کی تصویر سامنے آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب شام کو گھر پہنچ کر دروازہ کھولا اور دو کتے جنہیں رام غلام نے شرارتاً بند کر رکھا تھا جھپٹ کر باہر نکلے تو منشی جی کے اوسان ختم ہو گئے۔ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔

انسان کا دل اور دماغ خوف سے جس قدر متاثر ہوتا ہے اتنا اور کسی طاقت

سے نہیں محبت افسوس، مایوسی، جدائی، نقصان یہ سب دل پر کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں۔

مگر یہ اثرات ہلکے ہلکے جھونکے میں اور خوف کا اثر طوفان ہے منشی رام سیوک پر بعد کو کیا گذری یہ معلوم نہیں کئی دن تک لوگوں نے انہیں روزانہ کچہری جاتے اور وہاں سے افسردہ و پژمردہ لوٹتے دیکھا کچہری جانا ان کا فرض تھا اور گو وہاں موکلوں کا قحط تھا مگر تقاضے والوں سے گلا چھڑانے اور انہیں اطمینان دلانے کے لئے اب یہی ایک لٹکا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد وہ کئی ماہ تک نظر نہ آئے بدری ناتھ چلے گئے۔

ایک دن گاؤں میں ایک سادھو آیا بھبھوت رمائے، لمبی لمبی جٹائیں ہاتھ میں کمنڈل۔۔۔۔اس کی صورت منشی رام سیوک سے ملتی جلتی تھی۔۔۔۔آواز اور رفتار میں بھی زیادہ فرق نہ تھا وہ ایک پیڑ کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا رہا اسی رات کو منشی رام سیوک کے گھر سے دھواں اٹھا پھر شعلے نظر آئے اور آگ بھڑک اٹھی۔ ناگن کی آتش تقریر کبھی اس گھر میں بھڑکتی تھی۔۔۔۔گاؤں کے سینکڑوں آدمی دوڑے گئے آگ بجھانے کے لئے نہیں۔۔۔۔تماشہ دیکھنے کے لئے۔۔۔۔ایک بے کس کی آہ میں کتنا اثر ہے۔

صاحب زادہ رام غلام منشی جی کے غائب ہو جانے پر اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے۔۔۔۔۔۔اور وہاں کچھ دن رہے مگر وہاں ان کی خوش فعلیاں ناپسند کی گئیں۔۔۔۔ایک روز آپ نے کسی کے کھیت سے ہولے نوچے اور اس نے دو چار دھول لگائے اس پر آپ اس قدر برہم ہوئے کہ جب اس کے چنے کھلیان میں

آئے تو جا کر آگ لگا دی۔۔۔۔۔۔۔ایک کے پیچھے سارا کھلیان جل کر را کھ ہو گیا۔ ہزاروں روپے کا نقصان ہوا پولیس نے تحقیقات کی۔۔۔۔حضرت گرفتار ہوئے۔۔۔۔اپنے قصور کا اقبال کیا۔۔۔۔۔۔اور اب چنار کے رفار میٹری اسکول میں موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

راج ہٹ

پہلی بار: ''زمانہ'' دسمبر 1912ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی، اول)

دسہرے کے دن تھے اچل گڑھ میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دربار عام میں مشیران سلطنت کے بجائے اپسرائیں جلوہ افروز تھیں۔ دھرم شالاؤں اور سراؤں میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ریاست کے ملازم کیا چھوٹے بڑے رسد پہنچانے کے حیلے سے دربار عام میں جمع رہتے۔ کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ دربار خاص میں پنڈت اور پجاری اور مہنت لوگ آسن جمائے پوجا پاٹھ کرتے ہوئے نظر آتے تھے وہاں کسی ملازم سرکار کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی گھی اور پوجا کی سامگری نہ ہونے کے باعث صبح کی پوجا شام کو ہوتی تھی رسد نہ ملنے کی وجہ سے پنڈت لوگ ہون کے گھی اور میوہ جات کو بھوگ کے اگن کنڈ میں ڈالتے۔ دربار عام میں انگریزی انتظام تھا اور دربار خاص میں ریاست کا۔

راجہ دیومل بڑے صاحب حوصلہ رئیس تھے۔ اس سالانہ جشن میں وہ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے۔ جن دنوں قحط پڑا ریاست کے آدھے سے زیادہ آدمی بھوک سے تڑپ کر مر گئے۔ بخار، ہیضہ اور پلیگ میں ہزاروں آدمی ہر سال لقمہ مرگ بن جاتے تھے ریاست مفلس تھی اس لئے نہ وہاں مدرسے تھے نہ شفا خانے نہ سڑکیں برسات میں تو اس میں دلدل ہو جاتا اور اندھیری راتوں سر شام سے گھروں کے

دروازے بند ہو جاتے اندھیری سڑکوں پر چلنا جان جوکھم تھا یہ سب اور ان سے بھی زیادہ تکلیف وہ باتیں گوارا تھیں مگر یہ غیر ممکن دشوار محال تھا کہ درگا دیوی کا سالانہ جشن نہ ہو اس سے شان ریاست میں بٹہ لگنے کا خوف تھا۔ ریاست مٹ جائے محلوں کی اینٹیں بک جائیں مگر یہ جشن ضرور ہو قرب و جوار کے راجہ رئیس مدعو کیے جاتے ان کے شامیانوں سے میلوں تک سنگ مرمر کا ایک شہر بس جاتا۔ ہفتوں تک خوب چہل پہل دھوم دھام رہتی۔ اسی کی بدولت اچل گڑھ کا نام اٹل ہو گیا تھا۔

(2)

مگر کنور اندرمل کو راجا صاحب کی ان سرگرمیوں سے بالکل عقیدت نہ تھی وہ خلقتہ، بہت متین اور سادہ منش نوجوان تھا۔ یوں غضب کا دلیر، موت کے سامنے بھی خم ٹھونک کر اتر پڑے۔ مگر اس کی شجاعت خون کی پیاس سے پاک تھی، اس کے وار بے پر کے طائروں یا بے زباں جانوروں پر نہیں ہوتے تھے۔ اس کی تلوار کمزوروں پر نہیں اٹھتی تھی درماندوں کی حمایت بیکسوں کی سفارشیں، غربا کی دست گیری اور فلک زدوں کی زخم شوئی ان کاموں سے اسے روحانی مناسبت تھی دو سال ہوئے وہ اندور کالج سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر لوٹا تھا۔ اور تب سے اس کا یہ جوش راہ اعتدال اور مصلحت کی حدود سے متجاوز ہو گیا تھا چوبیس سال کا قوی ہیکل جوان ناز و نعمت میں پلا ہوا جسے فکر کی کبھی ہوا تک نہ لگی۔ اگر کبھی رلایا تو ہنسی وہ ایسا نیک شعار ہو اس کے مردانہ چہرے سے غور و خوض کی زردی اور تصور کی جھریاں نظر آئیں یہ غیر معمولی بات تھی جشن مبارک کا دن قریب آ پہنچا تھا صرف چار دن باقی

تھے جشن کا انتظام مکمل ہو چکا تھا صرف اگر کسر تھی تو کہیں کہیں نظر ثانی کی سہ پہر کا وقت تھا راجا صاحب رنواس میں بیٹھے ہوئے چند منتخب اپسراؤں کا گانا سن رہے تھے ان کی سریلی تانوں سے جو خوشی ہو رہی تھی اس سے بدرجہا حظ اس خیال سے ہوتا تھا کہ یہ ترانہ ریزیاں پولیٹکل ایجنٹ کو پھڑکا دیں گی وہ آنکھیں بند کر کے سنے گا اور فرط مسرت سے اچھل اچھل پڑے گا۔

اس خیال سے جو لطف اور نشہ تھا وہ تان سین کی تانوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا آہ! اس کی زبان سے بیساختہ داد نکل پڑے گی عجب نہیں اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے اور میرے انتخاب کی داد دے۔ اتنے میں کنور اندرمل بہت سادہ کپڑے پہنے خدمت میں باریاب ہوئے اور سر نیاز خم کیا راجا صاحب کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں مگر کنور صاحب کی بے موقع مداخلت ناگوار خاطر ہوئی ارباب نشاط کو وہاں سے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنور اندرمل بولے ''مہاراج کیا میری منت سماجت پر بالکل دھیان نہ دیا جائے گا'' راجہ صاحب ولیعہد کی عزت کرتے تھے اور محبت تو قدرتی بات تھی تاہم انہیں یہ بے موقع ہٹ ناگوار تھی وہ اتنے کم نظر نہ تھے کہ کنور صاحب کے نیک مشوروں کی قدر نہ کریں ضرور ریاست زیر بار ہوئی جاتی تھی اور رعایا پر بہت ظلم کرنا پڑتا تھا میں اندھا نہیں ہوں کہ ایسی موٹی موٹی باتیں نہ سمجھ سکوں۔ مگر اچھی باتیں بھی مواقع اور محل دیکھ کر کی جاتی ہیں۔ آخر نام و نمود عزت و آبرو بھی تو کوئی چیز ہے۔ ریاست میں سنگ مرمر کی سڑکیں بنوا دوں۔ گلی گلی مدرسے کھول دوں گھر گھر کنوئیں کھدوا دوں۔ دواؤں کی نہریں جاری کر دوں مگر وسہرے کی دھوم دھام

سے ریاست کی جو عزت اور شہرت ہے وہ ان باتوں سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بتدریج یہ خرچ گھٹا دوں مگر یکبار ایسا کرنا نا مناسب ہے اور ناممکن جواب دیا'' آخر تم کیا چاہتے ہو کیا دسہرہ بالکل بند کر دوں''

اندرمل نے راجا صاحب کے تیور بدلے ہوئے دیکھے مودبانہ انداز سے بولے'' میں نے کبھی دسہرے کے جشن کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا یہ ہمارا قومی نشان ہے یہ فتح و نصرت کا مبارک دن ہے رقص و سرود سے اس دن کی متانت اور عظمت ڈوب جاتی ہے''

راجہ صاحب نے طنزیہ لہجے میں فرمایا'' تمہارا مطلب ہے کہ رو رو کر جشن منائیں ماتم کریں۔''

اندرمل نے تیکھے ہو کر کہا'' یہ آئین انصاف کے خلاف ہے کہ ہم تو جشن منائیں اور ہزاروں آدمی اس کی بدولت ماتم کریں۔ بیس ہزار مزدور ایک مہینے سے مفت میں کام کر رہے ہیں کیا ان کے گھروں میں جشن ہو رہا ہے۔ جو پسینہ بہائیں وہ روٹیوں کو ترسیں اور جنہوں نے حرامکاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں میں اپنی آنکھوں سے جور و ستم نہیں دیکھ سکتا میں اس عذاب میں شریک نہیں ہو سکتا اس سے تو یہی بہتر ہے کہ منہ چھپا کر کہیں نکل جاؤں ایسے راج میں رہنا اپنے اصول کے خلاف اور شرمناک سمجھتا ہوں''

اندرمل نے طیش میں یہ گستاخانہ باتیں کیں مگر الفت پدری کو جگانے کی کوشش نے راج ہٹ کے سوئے ہوئے سیاہ دیو کو جگا دیا۔ راجا صاحب پر غضب نگاہوں سے دیکھ کر بولے'' ہاں میں بھی یہی بہتر سمجھتا ہوں تم اپنے اصول کے پکے ہو تو میں

بھی اپنی دھن کا پورا ہوں"

اندرمل نے مسکرا کر راجا صاحب کو سلام کیا اس کا مسکرانا زخم پر نمک ہو گیا راجکمار کی آنکھوں میں چند بوندیں شاید مرہم کا کام دیتیں۔

راج کمار نے ادھر پیٹھ پھیری ادھر راجا صاحب نے پھر پسراؤں کو بلایا اور پھر نغمہ جاں نواز کی صدائیں بلند ہو گئیں ان کا دریائے نغمہ سنجی کبھی اتنے زور وشور سے نہیں امنڈا تھا وہ واہ کی رو آئی ہوئی تھی تالیوں کا تلاطم برپا تھا اور سر کی کشتی اس دریائے پرشور میں ہنڈولے کی طرح جھول رہی تھی۔

یہاں تو عیش وطرب کا ہنگامہ گرم تھا۔ اور نواس میں نالہ، دلگیر تھا۔ رانی بھان کنور درگا کی پوجا کر کے لوٹ رہی تھی۔ کہ ایک لونڈی نے آ کر اس سانحہ دلخراش کی اطلاع دی رانی نے ارتی کا تھال زمین پر پٹک دیا وہ ایک ہفتہ سے درگا کا برت رکھتی تھی مرگ چھالے پر سوتی اور دودھ کا اہار کرتی تھیں پاؤں تھرائے زمین پر گر پڑیں مرجھایا ہوا پھول ہوا کے جھونکے کو نہ سہہ سکا چیریاں سنبھل گئیں اور رانی کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر چھاتی اور سر پیٹنے لگیں بین اور بکا کی پر جوش صدائیں بلند ہوئیں۔ آنکھوں میں آنسو نہ سہی آنچلوں سے ان کا پردہ چھپایا ہوا تھا۔ مگر گلے میں آواز تو تھی اس وقت اس کی ضرورت تھی اس کی بلندی اور گرج میں اس وقت بخت رسا کی جھلک نمودار تھی۔

لونڈیاں تو یوں محو وفا تھیں اور بھان کنور اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کنور سے ایسی بے ادبی کیونکر ہوئی؟ یہ خیال میں نہیں آتا اس نے کبھی میری باتوں کا جواب نہیں دیا ضرور راجا صاحب کی زیادتی ہو گی۔

اس نے ناچ رنگ کی مخالفت کی ہو گی کیا یہی چاہیے انہیں کیا جو کچھ بنے بگڑے گی اس کے ذمے لگے گی یہ غصہ ورد ہیں ہی جھلا گئے ہوں گے اسے سخت سست کہا ہو گا بات کی اسے برداشت کہاں؟ درگا! تم میرے لال کی رکشا کرنا میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں افسوس یہ غضب ہو گیا میرا راج سونا ہو گیا اور انہیں اپنے راگ رنگ کی سوجھی ہوئی ہے یہ سوچتے سوچتے رانی کے بدن میں رعشہ آ گیا اٹھ کر غصے سے کانپتی ہوئی وہ بے محابا عیش محفل کی طرف چلی قریب پہنچی تو سریلی تانیں سنائی دیں ایک برچھی سی جگر میں چبھ گئی آگ پر تیل پڑ گیا۔

رانی کو دیکھتے ہی مطربوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی کوئی کسی گوشے میں جا چھپی کوئی گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی راجا صاحب نے رانی کی طرف گھور کر دیکھا غیظ و غضب کا شعلہ سامنے دہک رہا تھا ان کے تیوروں پر بھی بل پڑ گئے خونبار نگاہیں باہم ملیں موم نے لوہے کا سامنا کیا۔

رانی تھرائی ہوئی آواز میں بولی "میرا اندرمل کہاں گیا؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز رک گئی اور ہونٹ کانپ کر رہ گئے

راجا نے بے رخی سے جواب دیا "میں نہیں جانتا"

رانی سسکیاں بھر کر بولی آپ نہیں جانتے کہ وہ کل سہ پہر سے غائب ہے اور اس کا کہیں پتہ نہیں آپ کی ان زہریلی ناگنوں نے یہ بس بویا ہے اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

راجہ نے ترشی سے کہا "وہ خود سر کش خود سر اور مغرور ہو گیا ہے میں اس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رانی کچلے ہوئے سانپ کی طرح اینٹھ کر بولی ’’راجہ تمہاری زبان سے یہ باتیں نکل رہی ہیں ہائے میرا لال میری آنکھوں کی پتلی میرے جگر کا ٹکڑا میرا سب کچھ یوں الوپ ہو جائے اور اس بے رحم کا دل ذرا بھی نہ پسیجے میرے گھر میں آگ لگ جائے اور یہاں اندرا کھاڑہ سجا رہے۔ میں خون کے آنسوؤں اور یہاں خوشی کے راگ الاپے جائیں‘‘ راجہ کے نتھنے پھڑکنے لگے کڑک کر بولے ’’رانی بھان کنور اب زبان بند کرو میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا بہتر ہوگا کہ تم محل میں چلی جاؤ‘‘

رانی نے بھری شیرنی کی طرح گردن اٹھا کر یہ کہا ’’ہاں میں خود جاتی ہوں میں حضور کے عیش میں مخل نہیں ہونا چاہتی مگر آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا اچل گڑھ میں یا تو بھان کنور رہے گی یا آپ کی زہریلی سیلی پریاں‘‘

راجہ پر اس کی دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوا گینڈے کی ڈھال پر کچھ لوہے کا اثر کیا ہو سکتا ہے جی میں تو آیا صاف صاف کہہ دیں بھان کنور چاہے رہے نہ رہے یہ پریاں ضرور رہیں گی لیکن ضبط کر کے بولے ’’تم کو اختیار ہے جو مناسب سمجھو وہ کرو‘‘

رانی چند قدم چل کر پھر لوٹی اور بولی ’’تریا ہٹ رہے گی یا راج ہٹ؟‘‘

راجہ نے مستقل لہجے میں جواب دیا ’’اس وقت تو راج ہٹ ہی رہے گی‘‘

(4)

رانی بھان کنور کے چلے جانے کے بعد راجہ دیومل پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھے مگر پژمردہ اور دل گرفتہ رانی کی سخت باتوں سے دل کے نازک ترین حصوں میں جنبش ہو رہی تھی پہلے تو وہ اپنے اوپر جھنجھلائے کہ میں نے اس کی باتوں کو کیوں اس

قدر تحمل سے سنا۔ مگر جب ذرا غصے کی آگ دھیمی ہوئی اور دماغی توازن پھر اصلی حالت پر آیا تو ان واقعات پر اپنے دل میں غور کرنے لگے انصاف پسند طبیعتوں کے لئے غصہ ایک چیتاؤنی ہے جس سے انہیں اپنے قول و فعل کے حسن و قبح کو جانچنے اور آئندہ کے لئے مزید احتیاط کرنے کا موقع ملتا ہے اس داروئے تلخ سے اکثر تجربے کو تقویت نگاہ کو وسعت اور فکر کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔ راجا سوچنے لگے بے شک ریاست کے اندرونی حالات کے لحاظ سے یہ بزم آرائیاں بے موقع ہیں بے شک وہ رعایا کے ساتھ اپنا فرض نہیں ادا کر رہے تھے۔ وہ ان مصارف اور اس اخلاقی دھبے کو ہٹانے پر آمادہ تھے۔ مگر اس طرح کہ نکتہ چین نگاہیں اس میں کچھ اور معنی نہ نکال سکیں شان ریاست قائم رہے اتنا اندر مل سے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا اگر اتنے پر بھی وہ اپنی سخت گیریوں سے باز نہیں آتا تو یہ اس کی خودسری ہے ہر ایک ممکن پہلو سے غور کرنے پر راجا صاحب کے اس فیصلے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی کنور کا یوں غائب ہو جانا ضرور تشویشناک ہے اور ریاست کے لئے خطرناک نتائج سے مملو مگر وہ اپنے آپ کو ان نتائج کی ذمہ داریوں سے بالکل بری سمجھتے تھے وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اندر مل کے چلے جانے کے بعد ان کا بزم نشاط آراستہ کرنا بے موقع اور شعلہ انگیز تھا مگر اس کا کنور کے آخری فیصلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے کنور ایسا نادان خام کار اور بزدل تو نہیں ہے کہ خودکشی پر آمادہ ہو جائے ہاں دو چار دن ادھر ادھر آوارہ گھومے گا اور اگر ایشور نے کچھ بھی انصاف عطا کیا ہے تو وہ پشیمان اور متاسف ہو کر ضرور چلا آئے گا میں خود اسے ڈھونڈ نکالوں گا وہ ایسا نا سعادت مند نہیں ہے کہ اپنے بوڑھے باپ کی معذرت پر دھیان نہ دے۔

اندرمل سے فارغ ہوکر راجا صاحب کا دھیان رانی کی طرف پہنچا اور جب اس کے کلمات آتشیں یاد آئے تو غصے سے بدن میں پسینہ آ گیا اور وہ ایک عالم بیتابی میں اٹھ کر ٹہلنے لگے بے شک میں اس کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا ماں کو اپنی اولاد ایمان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی خفگی بجا تھی مگر ان دھمکیوں کیا کیا معنی اس کے سوا کہ وہ روٹھ کر میکے چلی جائے اور مجھے بدنام کرے وہ میرا اور کیا کرسکتی ہے؟ عقل مندوں نے کہا ہے کہ عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے وہ میٹھے پانی کی چنچل چلبلی چمکیلی دھارا ہے جس کے آغوش ناز میں چھکتی اور چمٹتی ہے اسے تو وہ ریگ بنا کر چھوڑتی ہے یہی بھان کنور ہے جس کی نازبرداریاں عشق کا درجہ رکھتی ہیں آہ! کیا وہ پچھلی باتیں فراموش کر جاؤں کیا انہیں قصہ سمجھ کر دل کو تسکین دوں اس اثنا میں ایک لونڈی نے آ کر کہا کہ مہارانی نے ہاتھی منگوایا ہے اور نہ جانے کہاں جا رہی ہیں کچھ بتاتی نہیں راجہ نے سنا اور منہ پھیر لیا۔

(5)

شہر اندور سے تین میل شمال کی طرف درختوں کے بیچ میں ایک تالاب ہے جس کے رخ سیمیں سے کائی کا سبز مخملی گھونگھٹ کبھی نہیں اٹھتا کہتے ہیں کسی زمانے میں اس کے چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے مگر اس وقت تو صرف یہ روایت باقی ہے اور عالم اسباب میں یہ اکثر سنگ وخشت کی یادگاروں سے زیادہ دیرپا ہوا کرتی ہے۔

تالاب کی پوربی جانب ایک پرانا مندر ہے اس میں شوجی راکھ کی دھونی رمائے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ابابیلیں اور جنگلی کبوتر انہیں اپنی میٹھی بولیاں سنایا

کرتے۔ مگر اس ویرانے میں بھی ان کے بھگتوں کی کمی نہ تھی مندر کے اندر بھرا ہوا پانی اور باہر غنونت انگیز کیچڑ اس عقیدت مندی کے شاہد تھے وہ مسافر جو اس تالاب میں نہاتا اس کے ایک لوٹے پانی سے اپنے معبور کی پیاس بجھاتا تھا۔ شوجی کھاتے کچھ نہ تھے مگر پانی بہت پیتے تھے ان کی نہ بجھنے والی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کوار کی دھوپ تیز تھی کنور اندرمل اپنے بادر رفتار گھوڑے پر سوار اندور کی طرف سے آئے۔ اور ایک درخت کے سائے میں ٹھہر گئے وہ بہت اداس تھے انہوں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور خود زین پوش بچھا کر لیٹ گئے انہیں اچل گڑھ سے نکلے آج تیسرا دن ہے مگر تفکرات نے پلک تک نہیں جھپکنے دی رانی بھان کنور اس کے دل سے ایک لمحے کے لئے بھی دور نہ تھیں۔ اس وقت ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھنے لگا گویا رانی آئی ہیں اور اسے گلے لگا کر رو رہی ہیں چونک کر آنکھیں کھولیں تو سچ مچ رانی سامنے کھڑی اس کی طرف آبگوں آنکھوں سے تاک رہی تھیں وہ اٹھ بیٹھا اور وہاں کے قدموں کو بوسہ دیا مگر رانی نے فرط شفقت سے اسے اٹھا کر گلے لگا لینے کی بجائے اپنے پاؤں ہٹا لئے اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

اندرمل نے کہا ''ماں جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

رانی نے رکھائی سے جواب دیا ''میں تمہاری کون ہوتی ہوں''

کنور '' آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں جب سے اچل گڑھ سے چلا ہوں ایک لمحہ بھی آپ کا خیال دل سے دور نہیں ہوا ابھی آپ ہی کو خواب میں دیکھ رہا تھا''

ان الفاظ نے رانی کا غصہ ٹھنڈا کیا کنور کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ راجہ کا دھیان کر رہی تھی۔

رانی نے کنور سے پوچھا ''تم تین دن کہاں رہے''

کنور نے جواب دیا'' کیا بتاؤں کہاں رہا اندور چلا گیا تھا وہاں پولیٹکل ایجنٹ سے ساری داستان بیان کی''

رانی نے یہ کیفیت سنی تو ماتھا پیٹ کر بولی ''تم نے غضب کر دیا آگ لگا دی''

اندرمل ''کیا کروں خود پچھتاتا ہوں اس وقت یہی دھن سوار تھی''

رانی ''مجھے جن باتوں کا ڈر تھا وہ سب ہو گئیں اب کون منہ لے کر اچل گڑھ جائیں گے؟''

اندرمل ''میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں''

رانی ''غصہ بری بلا ہے تمہارے آنے کے بعد میں نے راڑ مچائی اور کچھ یہی ارادہ کر کے اندر جا رہی تھی راستے میں مل گئے۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے بہلیوں اور سانڈنیوں کی لمبی قطار آتی ہوئی دکھائی دی سانڈنیوں پر مرد سوار تھے سرگیں آنکھوں والے پیچ دار زلفوں والے بہلیوں میں حسن کے جلوے تھے شوخ نگاہیں بے باک چتونیں یہ ارباب نشاط کا قافلہ تھا جو اچل گڑھ سے ناشاد و نامراد چلا آتا تھا۔

انہوں نے رانی کی سواری دیکھی اور کنور کا گھوڑا پہچان لیا متکبرانہ انداز سے سلام کیے مگر بولے نہیں جب وہ دور نکل گئے تو کنور نے زور سے قہقہہ مارا یہ فتح کا نعرہ تھا۔

رانی نے استصواب کیا ''یہ کایا پلٹ ہوگئی یہ سب اچل گڑھ سے لوٹے آئے ہیں اور عین دسہرے کے دن؟''

اندرمل پرغرور انداز سے بولے ''یہ پولیٹیکل ایجنٹ کے انکاری تار کے کرشمے ہیں میری چال بالکل ٹھیک پڑی ہے''

رانی کا شبہ دور ہوگیا ضرور یہی بات ہے یہ انکاری تار کی کرامات ہے وہ بہت دیر تک ایک محویت کے عالم میں زمین کی طرف تاکتی رہی اور اس کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔

''کیا اسی کا نام راج ہٹ ہے؟''

آخر اندرمل نے مہر سکوت توڑ دی ''کیا آج چلنے کا ارادہ ہے کہ کل؟''

رانی ''کل شام تک ہم کو اچل گڑھ پہنچنا ہے مہاراج گھبراتے ہوں گے''

☆☆☆☆☆☆

امرت

پہلی بار: ''زمانہ'' مارچ 1913ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1918ء (پریم پچیسی، دوم)

میرا عنفوان شباب ہے جب میرا دل لذت ورد سے مانوس ہوا کچھ دنوں تک مشق سخن کرتا رہا رفتہ رفتہ اس نے محویت کی صورت اختیار کر لی سارے دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ کر اپنے حسن فکر کی پناہ میں آ بیٹھا تین ہی سال کی مشق نے میری فکر کے جوہر کھول دیئے۔ کبھی کبھی میرا کلام، اساتذہ کے مشہور کلام سے ٹکر کھا جاتا تھا میرے قلم نے کسی استاد کے سامنے سر نہیں جھکایا میرا خیال ایک خود رو پودے کی طرح قطع و برید کی قیدوں سے آزاد نشوونما پاتا رہا میرے کلام کا انداز بالکل نرالا تھا میں نے اپنی شاعری کو فارسی سے باہر نکال کر یورپ تک پہنچا دیا یہ میرا اپنا رنگ تھا اس میدان میں نہ کوئی رقیب تھا نہ ہمعصر باوجود اس شاعرانہ محویت کے مجھے مشاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے نفرت تھی ہاں اہل ذوق سے بلا بتائے ہوئے اکثر اپنے کلام کے حسن و قبح پر بحث کیا کرتا۔ گو مجھے دعویٰ شاعری نہ تھا مگر رفتہ رفتہ مجھے شہرت سے نیاز ہونے لگا جب میری مثنوی دنیا و حسن شائع ہوئی تو دنیائے ادب میں ہل چل سی مچ گئی۔ شعراء سلف نے سخن فہموں کی بخل داد میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے ہیں مگر میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا مجھے کبھی کبھی یہ خیال ستایا کرتا کہ میرے قدر دانوں کی یہ فیاضی دیگر شعرا کے پستی فکر کی دلیل

ہے یہ خیال حوصلہ شکن تھا بہر حال جو کچھ ہوا دنیائے حسن مجھے قلمرو سخن کا بادشاہ بنا دیا میرا نام ہر ایک زبان پر تھا میرا چرچا ہر ایک اخبار میں تھا شہرت اپنے ساتھ دولت بھی لائی مجھے شب و روز بجز فکر سخن کے اور کوئی شغل نہ تھا بسا اوقات بیٹھے بیٹھے راتیں گزر جاتیں اور جب کوئی چبھتا ہوا شعر قلم سے نکل جاتا تو میں فرط مسرت سے اچھل پڑتا میں اب تک تاہل کے قیود سے آزاد تھا یا یوں کہیے کہ میں اس کے ان مزوں سے غیر مانوس تھا جن میں رنج کی تلخی بھی ہے اور نشاط کی نمکینی بھی اکثر مغربی ادیبوں کی طرح میرا خیال تھا کہ سودا سخن اور سودا حسن میں پرانا بیر ہے مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے نادم ہونا پڑتا ہے مجھے اپنی طبیعت پر بھروسہ نہ تھا جب کبھی میری آنکھوں میں کوئی دلفریب صورت میرے دل و دماغ پر ایک جنوں سا طاری ہو جاتا ہفتوں تک ایک خود فراموشی کا سا عالم رہتا فکر سخن کی طرف طبیعت کسی طرح مائل نہ ہوتی ایسے کمزوروں میں صرف ایک عشق کی جگہ تھی اسی خوف سے میں اپنی رنگین طبیعت کے خلاف ثقہ بننے پر مجبور تھا کنول کی ایک پنکھڑی، شیاما کے ایک نغمہ، لہلہاتے ہوئے ایک مرغزار میں میرے لئے جادو کی سی کشش تھی مگر کسی نازنین کے دلفریب حسن کو میں مصور یا پیکر تراش کی بے لوث نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا حسین عورت میرے لئے ایک خوش رنگ قاتل ناگن تھی جسے دیکھ کر آنکھیں خوش ہوتی ہیں مگر دل خوف سے سمٹ جاتا ہے۔

خیر دنیا حسن کو شائع ہوئے دو سال گزر چکے تھے میری شہرت برسات کی امنڈی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی چلی جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں نے دنیا ادب پر کوئی عمل تسخیر کر دیا ہے اس دوران میں میں نے متفرق اشعار تو بہت کہے مگر

دعوتوں اور ایڈریسوں کے ہجوم نے جذبات لطیف کو ابھرنے نہ دیا۔ نمود اور شہرت ایک مدبر کے سمند ناز کے لئے تازیانہ کا کام دے سکتے ہیں مگر شاعر کی طبیعت کچھ گوشہ عافیت ہی میں جوان پذیر ہوتی ہے چنانچہ میں ان روزافزوں مکروہات سے گلا چھڑا کر بھاگا اور کوہستان کے ایک گوشہ میں جا چھپا نیرنگ نے وہیں جنم لیا۔

(2)

نیرنگ کے شروع کرتے ہی مجھے ایک حیرت انگیز اور خاطر شکن تجربہ ہوا اللہ معلوم کیوں میرے ذہن اور فکر پر ایک پردہ پڑ گیا گھنٹوں طبیعت پر زور ڈالتا مگر ایک شعر بھی ایسا نہ نکلتا کہ دل پھڑک اٹھے سوجھتے بھی تو پامال یا درافتادہ مضامین جن سے میری روح بھاگتی تھی میں اکثر جھنجھلا کر اٹھ بیٹھتا۔ کاغذ پھاڑ ڈالتا اور نہایت بے دلی کے عالم میں سوچنے لگتا کہ میری شاعرانہ قوتوں کا خاتمہ ہو گیا کیا میں نے وہ خزانہ جو قدرت نے مجھے مدت العمر کے لئے عطا کیا تھا اتنی جلدی لٹا دیا کجا وہ عالم تھا کہ مضامین کی بہتات اور نازک خیالات کی فراوانی نے قلم کو دم نہیں لینے دیا تھا۔ طائر فکر اڑتا تو آسمان میں تارا بن جاتا تھا اور کہاں اب یہ پستی یہ افسوسناک بے مائیگی مگر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کس قصور کی سزا ہے؟ اسباب اور نتائج کا دوسرا نام دنیا ہے۔ جب تک ہم کو کیوں کا جواب نہ ملے دل کو کسی طرح صبر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ موت کو بھی کیوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ آخر میں ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا اس نے عام ڈاکٹر کی طرح تبدیل آب و ہوا کی صلاح دی۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی ممکن ہے نینی تال کی مرطوب آب و ہوا سے شعلہ فکر ٹھنڈا پڑ گیا ہو چھ مہینے تک مسلسل سیر و سیاحت کرتا رہتا دلکش مناظر بہت دیکھے مگر روح پر

وہ شاعرانہ کیفیت طاری نہ ہوتی کہ پیانہ چھلک پڑے اور فکر خاموش خود بخود چمکنے لگے۔

مجھے اپنا کھویا ہوا لال نہ ملا اب میں زندگی سے بے زار تھا زندگی خشک ریگستان سی معلوم ہوتی تھی جہاں کوئی جان نہیں تازگی نہیں ہر دم دل پر مایوسانہ دل گرفتگی مسلط رہتی تھی دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیا وہ چار دن کی چاندنی ختم ہوگئی اور اندھیرا پاکھ آ گیا انسان کی صحبت سے بیزار ہم جنس کی صورت میں نفور میں ایک گوشہ گمنام میں پڑا ہوا حیات کے دن پورے کر رہا تھا درختوں کی بلندیوں پر بیٹھنے والی میٹھے راگ گانے والی چڑیا کیا قفس میں زندہ رہ سکتی ہے ممکن ہے کہ وہ دانہ کھائے پانی پئے مگر اس کی اس زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آخر جب مجھے اپنے بازیافت کی کوئی امید نہ رہی تو میرے دل میں یہ ارادہ مصمم ہو گیا کہ اب میرے لئے دبا ءسخن سے مر جانا ہی بہتر ہوگا اس حالت میں اپنے تئیں زندہ سمجھنا حماقت ہے آخر میں نے ایک روز چند روزانہ اخبارات کو اپنے مرنے کی خبر دی اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں کہرام مچ گیا ایک تہلکہ پڑ گیا شور و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں اس وقت مجھے اپنی عام حسن قبول کا کچھ اندازہ ہوا یہ عام صدا تھی کہ دنیا سخن کی کشتی منجدھار میں ڈوب گئی۔ بزم سخن درہم برہم ہوگئی اخبارات میں میرے سوانحات شائع ہوئے جن کو پڑھ کر مجھے ان ایڈیٹروں کے مادہ ایجاد کا قائل ہونا پڑا نہ تو میں کسی رئیس کا فرزند اکبر تھا اور نہ میں نے مسند ریاست چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی ان کا حسن ظن حقیقت حال پر غالب آ گیا۔ میرے احباب میں ایک صاحب جنہیں مجھ سے مراسم یگانگت کا دعویٰ تھا مجھے

شیشہ وساغر کا شیدائی بنا دیا تھا وہ جب کبھی مجھ سے ملتے انہیں میری آنکھیں نشہ سے سرخ نظر آتیں اگر چہ اسی مضمون میں آگے چل کر انہوں نے میری اس مکروہ عادت کی بہت کشادہ دلی سے توجیہ کی تھی کیونکہ زاہد خشک ایسے رندانہ اور ممتاز اشعار نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم یہ حیرت ہے کہ انہیں صریح غلط بیانی کی کیونکر جرأت ہوئی۔

خیر ان غلط بیانیوں کی تو مجھے پروا نہ تھی۔ البتہ یہ بڑی فکر تھی فکر نہیں ایک پر زور تمنا کہ میرے کلام پر زبان خلق سے کیا فتوی صادر ہوتا ہے ہمارے کارنامہ زندگی کی سچی داد مرنے کے بعد ہی ملتی ہے کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور خباثت کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کون پروا کرتا ہے اس لیے میرے کلام پر جتنی تنقیدیں نکلیں میں نے ان کا بہت ہی ٹھنڈے دل سے مطالعہ شروع کیا مگر شاعرانہ نگاہ کی وسعت اور مذاق کی لطافت کا ہر چہار طرف قحط سا معلوم ہوتا تھا زیادہ تر جوہریوں نے اشعار سے فرداً فرداً بحث کی تھی شک نہیں کہ وہ قاری کی حیثیت سے اس شعر کے پہلوؤں کو خوب سمجھتے تھے مگر نقاد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نظر عمیق غائب تھی کلام پر مجموعی حیثیت سے نگاہ کرنے والا شاعر کے اندرونی جذبات تک پہنچنے والا کوئی مبصر نہ دکھائی دیا۔

(3)

ایک روز میں عالم ارواح سے نکل کر گھومتا ہوا جمیر کی پبلک لائبریری میں جا پہنچا دوپہر کا وقت تھا میں نے میز پر جھک کر دیکھا کہ کوئی تازہ تصنیف ہاتھ آ جائے تو دل بہلاؤں دفعتہً میری نگاہ ایک دیدہ زیب رسالے کی طرف گئی جس کا عنوان

تھا ’’کلام اختر‘‘ جیسے بھولا بچہ کھلونے کی طرف لپکتا ہے اسی طرح جھپٹ کر میں نے اس کتاب کو اٹھالیا اس کی مصنفہ مس عائشہ عارف تھیں دلچسپی اور بھی زیادہ ہوئی میں اطمینان سے بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھنے لگا ایک ہی صفحہ پڑھنے کے بعد دلچسپی نے بے تابی کی صورت اختیار کی پھر تو میں ایک عالم استغراق میں تھا۔ میرے سامنے گویا معنی اور نکات کا ایک دریا لہریں مار رہا تھا۔ خیالات کی نوعیت مذاق کی پاکیزگی، زبان کی لطافت، شاعرانہ نگاہ کی وسعت کس کی تعریف کروں۔ اس کا ایک ایک خیال آفرین تھا میں ایک پیراگراف پڑھتا پھر تازگی خیال سے متاثر ہو کر ایک لمبی سانس لیتا تب سوچنے لگتا اس کتاب کو سرسری طور پر پڑھنا غیر ممکن تھا یہ عورت تھی یا حسن مذاق کی دیوی اس کی تعریض سے میرا کلام بہت کم بچا تھا مگر جہاں اس نے مجھے داد دی تھی وہاں رموز اور حقیقت کے موتی برسا دیے تھے اس کے اعتراضات میں ہمدردی اور داد میں عقیدت تھی۔ شاعر کے کلام کو عیوب کے اعتبار سے نہیں خوبیوں کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے۔ اس نے کیا نہیں کیا یہ صحیح معیار نہیں اس نے کیا کیا کہ یہ صحیح معیار ہے بس یہی جی چاہتا تھا کہ مصنفہ کے ہاتھ اور قلم کو چوم لے ’’سفیر‘‘ بھوپال کے دفتر سے یہ رسالہ شائع ہوا تھا میرا ارادہ مصمم ہو گیا تیسرے دن شام کے وقت میں مس عائشہ کے خوبصورت بنگلے کے سامنے ہری ہری گھاس پر ٹہلتا تھا۔

میں خادمہ کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا اس کی سجاوٹ بہت سادہ تھی پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میری تصویر تھی جو دیوار سے لٹک رہی تھی سامنے ایک آئینہ رکھا ہوا تھا میں نے خدا کو معلوم کیوں اس میں اپنی صورت دیکھی

میرا چہرہ زرد اور افسردہ تھا بال الجھے ہوئے کپڑوں پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی پریشانی کی زندہ تصویر کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی ہیئت کذائی پر سخت ندامت ہوئی میں وجیہ نہ سہی مگر اس وقت تو سچ مچ چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی اپنے لباس کی موزونیت کا یقین ہمیں بشاش اور شگفتہ بنا دیتا ہے اپنے پھوہڑپن کا جسم پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا دل پر ہم بزدل اور بے حوصلہ ہو جاتے ہیں۔

مجھے مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ مس عائشہ تشریف لائیں سانولا رنگ تھا چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی قد میانہ سے کچھ کا اعضا سبک ایسی ہلکی پھلکی گویا قدرت نے اس مادی دنیا کے لئے نہیں کسی ہوئی کمرہ کے لئے اسے خلق کیا ہے کوئی مصور فطانت کی اس سے بہتر تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھا مگر دیکھتے ہی اس کی گردن جھک گئی اس کے رخساروں پر شرم کی ایک ہلکی سی پرچھائیں ناچتی ہوئی معلوم ہوئی زمین سے اٹھ کر اس کی آنکھیں میری تصویر کی طرف گئیں اور پھر سامنے پردے کی طرف جا پہنچیں شاید اس کی آڑ میں چھپنا چاہتی تھی۔

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا ''آپ اختر مرحوم کے عزیزوں میں ہیں؟''

میں نے سر نیچا کیے ہوئے جواب دیا ''میں ہی بدنصیب اختر ہوں''

عائشہ ایک بے خودی کے عالم میں کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور میری طرف انداز تحیر سے دیکھ کر بولی ''دنیا حسن کے مصنف''

اعتقادِ ضعیف کے سوا رفتگانِ عدم کو کس نے دیکھا ہے عائشہ نے میری طرف کئی بار مشکوک نگاہوں سے دیکھا ان میں اب شرم و حیا کے بجائے حیرت سمائی ہوئی تھی میرے قبل سے نکل بھاگنے کا تو اسے یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھ رہی تھی اس نے دل میں یہ فیصلہ کیا یہ شخص مرحوم شاعر کا کوئی قریبی عزیز ہے خاندانی مشابہت اس کی شاہد تھی ممکن ہے کہ بھائی ہو اس ناگہانی صدمہ سے از خود رفتہ ہو گیا ہے شاید اس نے میری کتاب دیکھی ہو گی اور دریافت حال کے لئے چلا آیا ہے دفعتاً اسے خیال گزرا کہ کسی نے اخباروں کو میرے مرنے کی جھوٹی خبر دے دی اور مجھے اس کی تردید کا موقع نہ ملا ہو اس خیال سے اس کی الجھن دور ہوئی بولی ''اخباروں میں آپ کے متعلق ایک نہایت منحوس خبر شائع ہو گئی تھی؟ میں نے جواب دیا وہ خبر صحیح تھی''

اگر پہلے عائشہ کو میرے دیوانہ پن میں کچھ شک تھا تو وہ رفع ہو گیا اس کے بعد تب ان سے مجھے حظ حاصل ہوتا تھا آخر میں نے مختصر الفاظ میں اپنی داستان سنائی اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ دنیا حسن کا مصنف اختر اپنے انسانی قالب میں ہے تو اس کے چہرے پر مسرت اور انبساط قلب کی ایک ہلکی سرخی دکھائی دی اور یہ ہلکا رنگ بہت جلد خودداری اور غرور حسن کے شوخ رنگ سے متغیر ہو گیا غالباً وہ نادم تھی کہ کیوں اس نے اپنی قدردانی کو دائرہ و اعتدال سے باہر جانے دیا کچھ دیر کی شرمیلی خاموشی کے بعد اس نے کہا مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایسی نامبارک خبر شائع کرنے کی ضرورت ہوئی۔

میں نے پرجوش انداز سے جواب دیا ''آپ کے زبان قلم سے داد پانے کی

دوسری صورت نہ تھی اسی تنقید کے لئے میں ایسی ایسی کئی موتیں مر سکتا تھا‘‘

میرے اس دلیرانہ انداز نے عائشہ کی زبان کو بھی تکلیف اور کھچاؤ کی سے آزاد کیا مسکرا کر بولی مجھے تصنع مرغوب نہیں ہے ڈاکٹروں نے کچھ تشخیص نہیں کی اس کے اس تبسم نے مجھے بذلہ سنجی پر آمادہ کیا بولا ’’اب مسیح کے سوا اس مرض کی شفا اور کسی کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی۔‘‘

عائشہ کنایہ سمجھ گئی ہنس کر بولی ’’مسیح چوتھے آسمان پر رہتے ہیں‘‘

میری ہمت نے اب اور قدم بڑھائے عالم ارواح سے چوتھا آسمان بہت دور نہیں ہے۔

عائشہ کے شگفتہ چہرے سے متانت اور اجنبیت کا ہلکا رنگ اڑ گیا تاہم میرے ان دلیرانہ کنایوں کو اخلاق کی حد سے بڑھتے دیکھ کر اسے میری زبان کو محتاط بنانے کے لئے کس قدر خودداری برتنا پڑی جب میں کوئی گھنٹہ بھر کے بعد اس کمرے سے نکلا تو بجائے اس کے کہ وہ میری طرف اپنی انگریزی تہذیب کے مطابق ہاتھ بڑھائے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھیلا ہوا اپنی جب سمٹ کر کسی گذر گاہ سے نکلتا ہے تو اس کا بہاؤ بہت تیز اور طاقت بدرجہا زیادہ ہو جاتی ہے عائشہ کی ان نگاہوں میں عصمت کی تاثیر تھی ان میں دل مسکراتا تھا اور جذبہ ناچتا تھا آہ! ان میں میرے لئے دعوت کا ایک پر جوش پیغام بھرا ہوا تھا جب میں مسلم ہوٹل میں پہنچ کر ان واقعات پر غور کرنے لگا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ گو میں بصورت ظاہر یہاں اب تک غیر مانوس تھا لیکن معنوی حیثیت سے شاید مجھے گوشہ دل تک رسائی حاصل ہو چکی تھی۔

(4)

جب میں کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹا تو باوجود دو دن کی شب بیداری کے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، جذبات کی کشمکش میں نیند کہاں! عائشہ کی صورت اس کی خاطر داریاں اور اس کی وہ دزدیدہ نگاہ دل میں احساسات اور واردات کا طوفان سا برپا کر رہی تھی اس آخری نگاہ نے دل میں تمناؤں کی دھوم مچا دی وہ آرزوئیں جو عرصہ ہوا مر مٹی تھیں پھر بیدار ہوئیں اور آرزوؤں کے ساتھ فکر نے بھی مندی ہوئی آنکھیں کھول دیں دل میں جذبات اور کیفیت کا ایک نیا بے چین کرنے والا جوش محسوس ہوا یہی آرزوئیں اور یہی بے چینیاں اور یہی شورشیں شمع فکر کے لئے روغن ہیں جذبات کی حرارت نے فکر کو گرمایا میں قلم لے کر بیٹھ گیا اور ایک ایسی نظم لکھی جسے میں اپنا سرمایہ ناز سمجھتا ہوں۔

میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا مگر کسی نہ کسی حیلہ سے دن میں کم سے کم ایک بار ضرور لطف دیدار اٹھاتا تو عائشہ نے کبھی میرے قیام گاہ تک آنے کی تکلیف نہیں کی تاہم مجھے یہ یقین کرنے کے لئے شہادتوں کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہاں کس طرح سرگرمی سے میرا انتظار کیا جاتا ہے میرے قدموں کی مانوس آہٹ پاتے ہی اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا اور آنکھوں سے تمنا خیز شعاعیں نکلنے لگتی تھیں یہاں چھ مہینے گزر گئے اس زمانہ کو میری زندگی کی بہار سمجھنی چاہیے مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں آرزوؤں اور حسرتوں کے غم سے آزاد تھا مگر دریا کی پر سکوں روانی تھرکتی ہوئی لہروں کی بہار کہاں اب اگر محبت کا درد تھا تو اس کا جان بخش مزہ بھی تھا۔ اگر آرزوؤں کی جانگدازیاں تھیں تو ان کے ولولے بھی تھے آہ!

میری یہ پیاسی آنکھیں اس چشمہ حسن سے کس طرح سیر نہ ہوتیں جب میں اپنی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھتا تو مجھے ایک جان نواز روحانی طراوت کا احساس ہوتا میں سرور دیدار سے بے کیف و بے خود ہو جاتا اور گرمیٔ فکر کا تو کچھ حد و حساب نہ تھا گویا دل میں جذبات شیریں کا سوتا کھل گیا تھا اپنی شاعرانہ قدرت اور مضمون آفرینی پر خود حیرت ہوتی تھی قلم ہاتھ میں لی اور مضامین کا سر چشمہ سا بہہ نکلا ''نیرنگ'' میں بلند خیالیاں نہ ہوں عمق نہ ہو مگر اس کا ایک ایک شعر روانی اور لطافت گرمی و گدازی کی داد دے رہا ہے۔ یہ اس شمع کی برکت تھی جو اب میرے دل میں روشن ہو گئی تھی۔

یہ اس پھول کی مہک تھی جو میرے دل میں کھلا ہوا تھا محبت روح کی غذا ہے یہ وہ امرت بوند ہے جو کہ مرے ہوئے جذبات کو زندہ کر دیتی ہے محبت روحانی نعمت ہے یہ زندگی کی سب سے پاک سب سے اعلیٰ سب سے مبارک، برکت ہے یہی اکسیر تھا جس کی مجھے ناوابستہ تلاش تھی وہ رات کبھی نہیں بھولے گی جب عائشہ دلہن بنی ہوئی میرے گھر آئے ''نیرنگ'' اسی مبارک زندگی کی یادگار ہے ''دنیا حسن ایک غنچہ تھی'' نیرنگ شگفتہ و شاداب اب پھول ہے اور اس غنچہ کو کھلانیوالی کون سی چیز ہے؟ وہی جس کی مجھے ناوابستہ تلاش تھی اور جسے میں اب پا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

اماوس کی رات

پہلی بار: ماہنامہ ''زمانہ'' اپریل 1913ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1918ء (پریم پچیسی دوم)

دیوالی کی شام تھی سرینگر کے گھوروں اور کھنڈروں کے نصیب جاگ گئے تھے گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے چمکتی ہوئی تھالیوں میں چراغ لئے ہوئے مندروں کو جاتے تھے۔ چراغوں سے زیادہ ان کے چہرے روشن تھے۔ ہر درو دیوار روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ صرف پنڈت دیودت کا فلک منزلہ محل تاریکی میں کالی گھٹا کی طرح خاموش اور خوفناک کھڑا تھا۔ خاموش اس لئے کہ ایام رفتہ کی یاد سے دل بھرا ہوا تھا اور خوفناک اس لئے کہ جگمگاہٹ گویا اسے چڑھا رہی تھی ایک زمانہ وہ تھا کہ حسد بھی اسے دیکھ کر ہاتھ ملتا تھا دروازے پر وردی پوش دربانوں کے بجائے اب مدار اور رارنڈ کے درخت کھڑے تھے دیوان خانہ میں اب ایک عاشق تن سانڈ اانڈا کرتا تھا۔ بالاخانوں میں اب جنگلی کبوتروں کی مستانہ آوازیں سنائی دیتی تھیں کسی انگریزی مدرسے کے طالب علم کے اخلاق کی طرح اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور اس کی دیواریں کسی بیوہ کے جگر کی طرح چاک تھیں بیداد زمانہ کا شکوہ کرنا فضول ہے یہ کج فہمی اور کم اندیشی کی عبرت ناک داستان تھی۔

اماوس کی رات تھی روشنی کے مقابلے کی تاب نہ لا کر تاریکی نے اس عالیشان محل میں پناہ لی تھی پنڈت دیودت اپنے نیم تاریک کمرے میں خاموش اور متفکر

بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ایک مہینے سے ان کی بیوی گرجا کی زندگی بے رحم موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی وہ غربت اور افلاس کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار تھے فلسفہ تقدیر انہیں تشفی دیتا تھا لیکن یہ نئی مصیبت قوت برداشت سے باہر تھی بیچارے دن کے دن گرجا کے سرہانے بیٹھے اس کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر کڑھتے اور روتے تھے گرجا جب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روتی تو وہ اسے سمجھاتے ''گرجا نہ رو تم تو بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی''

پنڈت دیودت کے بزرگوں کا کاروبار بہت فروغ پر تھا وہ لین دین کیا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کے بیوپار بڑے بڑے تعلقہ داروں اور راجاؤں کے ساتھ تھے اس زمانہ میں ایمان اتنا ارزاں نہیں بکتا تھا۔ سادے رقعوں اور پرزوں پر لاکھوں کی باتیں ہو جائیں۔ مگر 1857ء کی شورش نے کتنے ہی علاقوں اور ریاستوں کو مٹا دیا۔ اور ان کے ساتھ تیواریوں کا یہ متمول گھرانہ بھی خاک میں مل گیا۔ یہی کھاتے پنساریوں کے کام آئے جب ذرا امن وامان ہوا ریاستیں پھر سنبھلیں تو زمانہ پلٹ چکا تھا قول تحریر کا محتاج ہو چکا تھا۔ اور تحریر میں سادہ اور رنگین کی تمیز پیدا ہو گئی تھی جب دیودت نے ہوش سنبھالا تو اس کے پاس ایک کھنڈر کے سوا اور کوئی جائیداد نہ تھی اب گزران کی صورت مفقود تھی کاشتکاری میں محنت اور پریشانی تھی تجارت کے لئے نہ سرمایہ تھا، نہ دماغ علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ کوئی ملازمت کرتے خاندانی وقار خیرات لینے میں ہارج تھا۔ بس سال میں دو تین بار اپنے بیوپاریوں کے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح جاتے اور جو کچھ رخصتانہ اور زاد راہ ملتا اسی پر گذران کرتے خاندانی حشمت کی یادگار کچھ باقی تھی تو وہ ان رقعوں اور ہنڈیوں کا

ایک پلندہ تھا جن کی سیاہی بھی حرف باطل کی طرح مٹ چکی تھی۔ پنڈت دیودت انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے دوج کے دن جب گھر گھر لکشمی کی پوجا ہوتی ہے پنڈت جی اس پلندے کی بہت اہتمام کے ساتھ پرستش کرتے۔ لکشمی نہ سہی لکشمی کی یادگار تو تھی دوج کا دن ان کی ثروت کے شرادھ کا دن تھا اسے چاہے بوالہوسی کہو چاہے کمزوری مگر پنڈت ممدوح کو ان پرزوں پر بڑا ناز تھا آئے دن کی مناقشات میں اس بوسیدہ کاغذی فوج کی حمایت بڑا کام کرتی اور فریق مخالف کو اپنی ہار ماننی پڑتی اگر ستر پشتوں سے ہتھیار کی صورت نہ دیکھنے پر لوگ چھتری ہونے کا فخر کر سکتے ہیں تو پنڈت دیودت کا ان نوشتوں پر فخر کرنا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا جن میں ستر لاکھ کی رقم چھپی ہوئی تھی۔

(2)

وہی اماوس کی رات تھی مگر چراغ اپنی مختصر زندگیاں ختم کر چکے تھے اور رات کی تاریکی سے زیادہ اخلاقی تاریکی کا غلبہ تھا چوروں اور جواریوں کے لئے یہ شگون کی رات تھی کیونکہ آج کی ہار سال بھر کی ہار ہوتی ہے لکشمی کی آمد آمد تھی اس لئے ان کا پیش خیمہ آ گیا تھا جا بجا کوڑیوں پر اشرفیاں لٹ رہی تھیں پیر مغاں بھی آج نخرے کر رہا تھا میخانے میں شراب کے بدلے پانی بک رہا تھا پنڈت دیودت کے سوا قصبہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو دوسروں کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں نہ ہو آج صبح ہی سے گرجا کی حالت خراب تھی اور سر شام سے اس پر غشی طاری تھی یکا یک اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بہت مدھم آواز سے بولی ”آج تو دیوالی ہے“

دیودت ایسا بیدل اور نراش ہو رہا تھا کہ گرجا کو ہوش میں بھی دیکھ کر اسے خوشی

نہ ہوئی ''ہاں آج دیوالی ہے'' گر جانے آرزومند نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا ہمارے گھر میں کیا دیے نہ جلیں گے؟

دیودت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا گر جانے پھر اسی لہجہ میں کہا ''دیکھو آج برس برس کے دن گھر اندھیرا رہ گیا مجھے اٹھا دو میں بھی اپنے گھر میں دیے جلاؤں گی''

یہ باتیں دیودت کے دل میں چبھی جاتی تھیں انسان کے آخری لمحے خوشیوں اور آرزوؤں کے خیال میں کٹتے ہیں گر جا موت کے منہ میں تھی مگر آرزوؤں کے خواب دیکھ رہی تھی۔

اس قصبہ میں لال شنکر داس مشہور وید تھے ضلع کی آیورویدک سوسائٹی کی روح رواں او شدھالے میں ادویہ کے بجائے چھاپنے کے پریس رکھے ہوئے تھے دوائیں کم بنتی تھیں مگر اشتہار زیادہ چھپتے تھے چرک اور سشرت پر قانع نہ ہو کر انھوں نے نئی طبی اصولوں کی تلقین شروع کی تھی تندرستی انسان کا طبعی حق ہے بیماری صرف ایک رئیسانہ تکلف ہے اور پولیٹکل اکانوی کے مسئلہ کے مطابق تکلفات سے جس قدر زیادہ ممکن ہو ٹیکس لینا چاہیے اسی اصول پر وہ مریضوں کے ساتھ مطلق رورعایت نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی غریب ہو تو ہو اگر کوئی مرتا ہے تو مرے اسے کیا حق ہے کہ وہ بیمار پڑے اور مفت میں علاج کرائے ہندوستان کی یہ حالت بہت کچھ مفت علاج کے ہاتھوں ہوئی ہے اس نے آدمیوں کو بے احتیاط اور کمزور بنا دیا ہے دیودت مہینہ بھر سے روز ان کے یہاں دوا لینے آیا کرتا تھا لیکن وید جی کبھی ایسی ہمدردی سے مخاطب نہ ہوئے کہ اسے عرض حال کا حوصلہ ہوتا ان کے

دل کمزور حصے تک پہنچنے کے لئے اس نے بہت ہاتھ پیر چلائے آنکھوں میں آنسو بھرے مگر ویدجی کا دل مضبوط تھا اس میں کمزور حصہ تھا ہی نہیں۔

وہی اماوس کی ڈراؤنی رات تھی آسانی رات گذرنے پر اب اور بھی زیادہ روشن وہ گئی تھیں گویا وہ سری نگر کے بجھے ہوئے چراغوں پر فاتحانہ مسرت کے ساتھ مسکرا رہی تھی دیودت ایک عالم اضطراب میں گرجا کے سرہانے سے اٹھے اور ویدجی کے مکان کی طرف چلے وہ جانتے تھے کہ لالہ اتنی رات گئے بلا اپنا حق خدمت لئے ہر گز نہ آئیں گے بلا اپنا حق خدمت لئے ہرگز نہ آئیں گے لیکن مایوسی میں بھی امید پیچھا نہیں چھوڑتی دیودت قدم آگے بڑھاتا چلا جاتا تھا۔

(3)

حکیم جی اس وقت اپنی مجرب وتیر بہدف ''امرت بندو'' کا اشتہار لکھنے میں محو تھے اور اس اشتہار کی پر تاثیر عبارت، مصورانہ رنگینی اور پر زور کشش کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ حکیم حاذق تھے یا ناشر جادو طراز۔

ناظرین! آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ کا زرد چہرہ آپ کا تن لاغر آپ کا ذرا سی محنت میں بیدم ہو جانا آپ کا لذات دنیا سے بے فیض رہنا آپ کی خانہ تاریکی یہ سب اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔۔۔۔۔سنیے میں کون ہوں میں وہ شخص ہوں جس نے امراض انسانی کو پردہ دنیا سے معدوم کر دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے جس نے اشتہار باز جوفروش گندم نما نام نہاد حکیموں کو بیخ و بن سے کھود کر دنیا کو پاک کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے میں وہ حیرت انگیز انسانی ضعیف البنیان ہوں جو ناشاد کو دلشاد نامراد کو بامراد بھگوڑے کو دلیر گیدڑ کو شیر بناتا

ہوں اور یہ کسی جادو سے نہیں منتر سے نہیں یہ میری ایجاد کردہ ''امرت بندو'' کے ادنی کرشمے ہیں امرت بندو کیا ہے۔۔۔اسے کچھ میں ہی جانتا ہوں مہرشی اگست نے دھنونتری کے کان میں اس کا نسخہ بتایا تھا جس وقت آپ وی پی پارسل کھولیں گے آپ پر اس کی حقیقت روشن ہو جائے گی وہ آب حیات ہے وہ مردانگی کا جوہر فرزانگی کی اکسیر عقل کا منبع اور ذہن کا صقیل ہے اگر برسوں کی شعر بازی نے بھی آپ کو شاعر نہیں بنایا اگر شبانہ روز کی رٹنت پر بھی آپ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے اگر دلالوں کی خوشامد اور موکلوں کی ناز برداری کے باوجود آپ احاطہ عدالت میں بھوکے کتے کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں اگر آپ گلا پھاڑ کر اور میز پر ہاتھ پیر پٹکنے پر بھی اپنی تقریر میں کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتے تو آپ امرت بندو کا استعمال کیجئے اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہلے ہی دن معلوم ہو جائے گا یہ ہو گا کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ پھر کبھی اشتہار باز حکیموں کے دام فریب میں نہ پھنسیں گے۔

وید جی اس اشتہار کو ختم کر کے اسے با آواز بلند پڑھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں غرور جائز اور آنے والی کامیابی کی امید جھلک رہی تھی کہ اتنے میں دیودت نے باہر سے آواز دی وید جی بہت خوش ہوئے رات کے وقت ان کی فیس دگنی تھی لالٹین لئے باہر نکلے تو ویدت روتا ہوا ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا وید جی! اس وقت مجھ پر رحم کیجئے گرجا اب کوئی دم کی مہمان ہے اب آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں یوں تو میرے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا مگر اس وقت آپ چل کر ذرا اسے دیکھ لیں تو میرے آنسو پچھ جائیں گے مجھے تسکین ہو جائے گی کہ اس

کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا ایشور جانتا ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں لیکن جب تک جیوؤں گا آپ کا جس گاؤں گا اور آپ کے اشاروں کی غلام بنا رہوں گا۔

حکیم جی کو پہلے تو ترس آیا مگر یہ جگنو کی چمک تھی جو بہت جلد خود غرضی کی تاریک وسعت میں غائب ہو گئی۔

(4)

وہی اماوس کی رات تھی پھڑوں پر بھی سناٹا چھا گیا جیتنے والے اپنے بچوں کو نیند سے جگا جگا کر انعام دے رہے تھے ہارنے والے اپنی نا ہمدرد اور پر غضب بیویوں سے عذر گناہ کرتے تھے کہ اتنے میں گھنٹوں کی گونجتی ہوئی پیہم آوازیں، ہوا اور تاریکی کو چیرتی ہوئی کان میں آنے لگیں ان کا مسانہ انداز اس عالم خاموشی میں بہت سہانا معلوم ہوتا تھا یہ آوازیں قریب ہوتی گئیں اور بالآخر پنڈت دیودت کے مکان کے پاس آ کر اس کی وسعت پریشان میں غائب ہو گئیں پنڈت جی اس وقت یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے کھا رہے تھے افسوس! میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی جان سے عزیز گرجا کی دوا اور پن کر سکوں کیا کروں! اس بے درد حکیم کو یہاں کیسے لاؤں ظالم مین ساری عمر تیری غلامی کرتا تیرے اشتہار چھاپتا تیری دوائیں کوٹتا آج پنڈت جی کو یہ ناگوار اور ہمت شکن تجربہ ہوا کہ ستر لاکھ کے رقعے اور کاغذ اتنی کوڑیوں کے مول بھی نہیں خاندانی وقار کا سراب آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گیا انہوں نے مخملی جزدان کو صندوق سے باہر نکالا اور ان رقعات کو جو خاندانی ثروت کے باقیات صالح تھے اور جن کی عزت کی طرح نگہداشت کی جاتی

تھی ایک ایک کر کے چراغ کی نذر کرنے لگے جس طرح ناز و نعمت میں پلا ہوا جسم چتا کی بھینٹ ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کاغذی ہستیاں اس شمع کے دہن آتشیں کا لقمہ ہوتی جاتی تھیں اتنے میں کسی نے باہر سے پنڈت جی کو پکارا انہوں نے چونک کر سر اٹھایا خوب سے بیدار ہوئے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دروازے پر آئے تو دیکھا کہ کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے کھڑے ہیں اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ سے ان ارنڈ کے درختوں کو اکھاڑ رہا ہے جو درختوں پر دربانوں کی طرح کھڑے تھے ہاتھی پر ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر زعفرانی رنگ کی ریشمی پاگ ہے ماتھے پر چندن کا ہلال ٹیکہ بھالے کی طرح تنی ہوئی نوکدار مونچھیں چہرہ سے رعب اور جلال نمایاں کوئی سردار معلوم ہوتا ہے اس کا کلی دار انگرکھا اور چناؤدار پائجامہ کمر میں لٹکتی ہوئی تلوار اور گردن میں چلائی کنٹھے اور زنجیر اس کے مردانہ جسم پر بہت زیب دے رہے تھے پنڈت جی کو دیکھتے ہی اس نے رکاب پر پاؤں رکھا اور نیچے اتر کر تعظیم کی اس کے مودبانہ اخلاق سے کچھ نادم ہو کر پنڈت جی بولے "آپ کا آنا کہاں سے ہوا۔"

نوجوان نے بہت منت آمیز لہجہ میں جواب دیا اس کے بشرہ سے شرافت برستی تھی "میں آپ کا پرانا خادم ہوں غریب خانہ راج نگر میں ہے وہاں کا جاگیردار ہوں میرے بزرگوں پر آپ کے خاندان نے بہت احسان کیے ہیں میری اس وقت جو کچھ عزت اور جاہ ہے وہ سب آپ کے بزرگوں کی شفقت اور کرم کا طفیل ہے میں نے اپنے چند رشتہ داروں سے آپ کا نام سنا تھا اور مجھے عرصہ سے آپ کے درشنوں کی آرزو تھی آج وہ مبارک موقع مل گیا اور میرا جنم سپھل ہوا۔"

پنڈت دیودت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے خاندانی حشمت کا غرور ان کے دل کا نازک ترین حصہ تھا وہ بے بسی جوان کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی ذرا دیر کے لئے رخصت ہوگئی فاخرانہ انداز سے بولے "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے جو ایسا فرماتے ہیں ورنہ میں تو ننگ خاندان ہوں اس قابل بھی نہیں کہ اپنے آپ کو ان بزرگوں کی اولاد کہہ سکوں" اتنے میں خادموں نے صحن میں فرش بچھا دیا دونوں آدمی اس پر بیٹھے اور باتیں ہونے لگیں وہ باتیں جن کا ہر جملہ پنڈت دیودت کے چہرے کو اس طرح شگفتہ کر رہا تھا جس طرح نسیم سحر پھولوں کو کھلا دیتی ہے پنڈت جی کے جد بزرگوار نے نوجوان ٹھاکر کے دادا کو پچیس ہزار روپے قرض دیے تھے ٹھاکر اب گیا میں جا کر اپنے بزرگوں کا شرادھ کرنا چاہتا ہوں اس لئے ضروری تھا کہ ان کے ذمہ جو کچھ قرض ہو اس کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے ٹھاکر کو پرانے کاغذات میں یہ واجب الادا رقم نظر آئی پچیس کے اب پچھتر ہزار ہو چکے تھے وہی قرض چکانے کے لئے ٹھاکر دو سو میل کی منزل طے کر کے آیا تھا مذہب ہی وہ قوت ہے جو دل میں ارادت کا جوش پیدا کر سکتی ہے ہاں اس میں جوش سے متاثر ہونے کے لئے ایک پاکیزہ بے لوث دل کی ضرورت ہے ورنہ وہی ارادت سیہ کاری اور شقاوت پر اتر آتی ہے آخر ٹھاکر نے پوچھا " آپ کے یہاں تو وہ رقعہ ہو گا؟"

دیودت کا دل بیٹھ گیا سنبھل کر بولے "غالباً ہو گا کچھ کہہ نہیں سکتا"

ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا " اسے تلاش کیجئے اگر مل جائے تو میں اسے لیتا جاؤں گا۔"

پنڈت دیودت اٹھے مگر بادل سرد کیا یہ تقدیر کی ستم ظریفیاں ہیں جو یوں سبز باغ دکھا رہی ہیں کون جانے وہ پرزہ جل کر خاک ہو گیا یا ہے یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہ پہلے بھی تھا یا نہیں لیکن نہ ملا تو روپے کون دیتا ہے افسوس! دودھ کا پیالہ سامنے آ کر ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے اے ایشور! وہ پرزہ مل جائے میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں اب مجھ پر دیا کرو اس طرح امید و بیم کی حالت میں دیودت اندر گئے اور چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بجھے ہوئے نوشتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے دفعتاً وہ اچھل پڑے اور ایک اضطراری جوش بلکہ دیوانگی مسرت کے عالم میں دو تین بار کودے تب دوڑ کر گرجا کو گلے سے لگایا اور بولے پیاری ایشور نے چاہا تو اب تم بچ جاؤ گی اس مدہوشی میں انہیں مطلق نہ معلوم ہوا کہ گرجا اب وہاں نہیں ہے صرف اس کی لاش ہے اس نے رقعے کو اٹھالیا اور دہلیز تک ایسی تیزی سے آیا گویا پاؤں میں پر لگ گئے ہوں مگر یہاں اس نے اپنے آپ کو روکا اور مسرت قلب کی امنڈتی ہوئی لہروں کو روکتے ہوئے ٹھاکر سے بولا ''یہ لیجئے وہ رقعہ مل گیا اتفاق کی بات ہے ورنہ ستر لاکھ کے کاغذ دیمکوں کی خوراک بن گئے''

غیر متوقع کامیابی اکثر بدگمانی کا باعث بنتی ہے جب ٹھاکر نے اس رقعے کو لینے کو ہاتھ بڑھایا تو دیودت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اسے چاک نہ کر ڈالے حالانکہ یہ اندیشہ بالکل بے معنی تھا مگر انسان کمزوریوں کا پتلا ہے ٹھاکر نے اس کے سوئِ ظن کو تاڑ لیا ایک ترحم آمیز تبسم کے ساتھ اس نے رقعہ کو لیا اور مشعل کی روشنی میں دیکھ کر بولا ''اب مجھے کامل اطمینان ہو گیا یہ لیجئے آپ کی امانت کی آپ کی نذد ہے دعا کیجئے کہ میرے بزرگوں کی مکتی ہو جائے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر سے ایک خریطہ نکالا اور اس میں سے ایک ایک ہزار کے پچھتر نوٹ نکال کر دیودت کو دے دیے پنڈت جی کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا اور نبض اچھلی پڑتی تھی انہوں نے ادھر چوکنی نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں غیر تو کوئی نہیں کھڑا ہے اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو لے لیا اظہار عالی ظرفی کی بے سود کوشش میں ان کاغذوں وگنا بھی نہیں صرف اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر انہیں سمیٹا اور جیب میں ڈال لیا۔

(5)

وہی اماوس کی رات تھی آسمانی شمعیں بھی دھندلی ہو چلی تھیں ان کی فنا حرارت و حیات کے بعد دیوتا کے آمد کی خبر دے رہی تھی ستارہ صبح سفیدہ نور کے ساتھ یہ بشارت دینے کے لئے نمودار ہو چکا تھا مسلط نیلگوں سیاہی نئے رنگوں اور اثروں کے مقابلہ میں سرحدی افقوں سے وسط آسماں میں ہٹی جاتی تھی۔ افق مشرق فیروزہ بانا پہن چکا تھا۔ اور افق مغرب ہلکے اودے رنگ کی طرف مائل تھا پنڈت دیودت ٹھاکر رخصت کر کے گھر میں چلے اس وقت ان کا دل فیاضی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا خوش اعتقادی کی لہر اٹھی ہوئی تھی کوئی سائل اس وقت ان کے دروازے سے بے فیض نہ جا سکتا تا ست نارائن کی کتھا دھوم دھام کے ساتھ سننے کا فیصلہ ہو چکا گرجا کے لئے گہنے اور کپڑے کے منصوبے بندھ چکے اندر پہنچتے ہی انہوں نے سالگ رام کے سامنے سچے دل سے سر جھکایا اور تب باقیماندہ رقعوں کو سمیٹ کر بحفاظت تمام اسی مخملی جملہ دان میں رکھ دیا اس لئے نہیں کہ شاید ان مردوں میں سے پھر کوئی زندہ ہو بلکہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ

خاندانی شوکت وثروت پر فخر کر سکتے تھے وہ صابرانہ قناعت کے جوش میں مست تھے بس اب مجھے زندگی میں مال و دولت کی ضرورت نہیں ایشور نے مجھے اتنا دے دیا ہے اس میں میری اور گرجا کی زندگی آسانی سے کٹ جائے گی ان کے دل میں یہ خیال گدگدا رہا تھا کہ جس وقت گرجا یہ خوشخبری سنے گی اس وقت ضرور اٹھ بیٹھے گی فکر اور تکلیف نے اس کی یہ گت بنا دی ہے جسے کبھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوئی جو بے کسانہ قناعت اور مایوسانہ صبر کی زلفگاریوں سے کبھی آزاد نہ ہوئی اس کی حالت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے یہ سوچتے ہوئے وہ گرجا کے پاس گئے اور اسے آہستہ سے ہلا کر کہا ''گرجا آنکھیں کھولو'' دیکھو ایشور نے تمہارے من کی سن لی ہے اور ہمارے اوپر دیا کی کیسی طبیعت ہے؟

مگر جب گرجا ذرا بھی نہ ہلی تو انہوں نے چادر ہٹا دی اور اس کے منہ کی طرف دیکھا سینہ سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئے آنکھوں سے خون کے قطرے نکل آئے آہ! کیا یہ دولت اتنی گراں قیمت پر ملی ہے کیا ایشور کے دربار سے مجھے اس پیاری جان کی قیمت دی گئی ہے ایشور تم خوب انصاف کرتے ہو مجھے گرجا کی ضرورت ہے روپوں کی ضرورت نہیں یہ سودا بہت گراں ہے۔

(6)

اماوس کی اندھیری رات گرجا کی تاریک زندگی کی طرح ختم ہو چکی تھی کھیتوں میں ہل چلانے والے کسانوں کے گانے کی بلند اور سہانی آوازیں آ رہی تھیں سردی سے کانپتے ہوئے بچے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہو گئی تھیں پانی بھرنے کے لئے نہیں ہنسنے کے لئے کوئی

گھڑے کو کنویں میں ڈالے اپنی پویلی ساس کی نقل کر رہی تھی کوئی ستون سے چمٹی ہوئی اپنی سہیلی سے مسکرا مسکرا کر راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی بوڑھی عورتیں روتے ہوئے پوتوں کو گود میں لئے اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں جو گھنٹہ بھر ہوا اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹی تھیں مگر راج وید لالہ شنکر داس ابھی تک میٹھی نیند سو رہے تھے کھانستے ہوئے بچے اور کراہتے ہوئے بوڑھے ان کے دواخانے کے دروازے پر جمع ہو چکے تھے اس مجمع بے تمیزی سے کچھ دور ہٹ کر دو تین خوش وضع مگر زرد رو نوجوان سر جھکائے ٹہلتے نظر آتے تھے اور وید جی سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنے کی فکر میں تھے اتنے میں پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے بدن سرخ آنکھیں، چہرے سے وحشت برستی ہوئی، دواخانہ کے دروازے پر اتنی زور سے ہانک لگائی کہ وید جی چونک پڑے اور کہار کو آواز دی کہ جا کر دروازہ کھول دے۔ یہ حضرت کسی برادری کی پنچائت لے لوٹے تھے انہیں گراں خوابی کا مرض تھا جو باوجود حکیم جی کے مسلسل زبانی اور طبی نسخوں کے کم نہ ہوتا تھا دروازہ کھول کر اپنے منقہ چلم کی فکر میں آگ ڈھونڈنے چلے گئے حکیم جی چلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یکایک دیودت ان کے روبرو جا کر کھڑے ہو گئے اور نوٹوں کا پلندہ ان کے آگے پٹک کر بولے وید جی! یہ پچھتر ہزار کے نوٹ ہیں آپ کا شکرانہ اور آپ کی فیس ہے آپ چل کر گرجا کو دیکھ لیجئے اور ایسا کچھ کیجئے وہ صرف ایک بار آنکھیں کھول دے یہ اس کی نگاہ کو صدقہ ہے صرف ایک نگاہ آپ کو روپے انسان کی جان سے پیارے ہیں وہ آپ کی نذر ہیں مجھے گرجا کی ایک نگاہ ان روپوں سے کئی گنی پیاری ہے۔

وید جی نے ندامت آمیز ہمدردی سے دیودت کی طرف دیکھا اور صرف اتنا

کہا ’’مجھے افسوس ہے میں ہمیشہ کے لئے تمہارا گنہگار ہوں مگر تم نے مجھے سبق دیا ایشور نے چاہا تو اب ایسی غلطی نہ ہوگی مجھے افسوس ہے واقعی سخت افسوس ہے‘‘ یہ باتیں وید جی کے دل سے نکلی تھیں۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اندھیر

پہلی بار ''زمانہ'' جولائی 1913 میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1918ء (پریم پچیسی دوم)

ناگ پنچمی آئی، ساٹھے کے زندہ دل نوجوان نے خوش رنگ جانگھیے بنوائے اکھاڑے میں ڈھول کی مردانہ صدائیں بلند ہوئیں قرب و جوار کے زور آزما اکٹھے ہوئے اور اکھاڑے پر تمبولیوں نے اپنی دکانیں سجائیں کیوں کہ آج زور آزمائی اور دوستانہ مقابلے کا دن ہے عورتوں نے گوبر سے اپنے آنگن لیپے اور گاتی بجاتی کٹوروں میں دودھ چاول لیے ناگ پوجنے چلیں۔

ساٹھے اور پاٹھے دو ملحق موضع تھے دونوں گنگا کے کنارے زراعت میں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی اس لئے آپ میں فوج داریوں کی گرم بازاری تھی ازل سے ان کے درمیان رقابت چلی آتی تھی ساٹھے والوں کو یہ زعم تھا کہ انہوں نے پاٹھے والوں کی کبھی سر نہ اٹھانے دیا علی ہذا پاٹھے والے اپنے رقیبوں کو زک دینا ہی زندگی کا مقدم کام سمجھتے تھے ان کی تاریخ فتوحات کی روایتوں سے بھری ہوئی تھی پاٹھے کے چرواہے یہ گیت گاتے ہوئے چلتے تھے۔

ساٹھے	والے	کایر	سگرے
پاٹھے	والے	ہیں	سردار

اور ساٹھے کے دھوبی گاتے

ساٹھے والے ساٹھ ہاتھ کے جن کے ہاتھ سدا تروار
ان لوگن کے جنم نسائے جن پاٹھے مان لیں اوتار

غرض رقابت کا یہ جوش بچوں میں ماں کے ساتھ داخل ہوتا تھا اور ان کے اظہار کا سب سے موزوں اور تاریخی موقع یہی ناگ پنچمی کا دن تھا اس دن کے لئے سال بھر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں آج ان میں معرکے کی کشتی ہونے والی تھی ساٹھے کو گوپال پر ناز تھا پاٹھے کو بلدیو کا غرہ دونوں سورما اپنے اپنے فریق کی دعائیں اور آرزوئیں لئے ہوئے اکھاڑے میں اترے۔

تماشائیوں پر مرکزی کشش کا اثر ہوا موضع کے چوکیداروں نے لٹھ اور ڈنڈوں کا یہ جمگھٹ دیکھا اور مردوں کی انگارے کی طرح لال آنکھیں تو تجربہ سابقہ کی بنا پر بے پتہ ہو گئے ادھر اکھاڑے میں داؤں پیچ ہوتے رہے بلدیو الجھتا تھا پال پینترے بدلتا تھا اسے اپنی طاقت کا زعم تھا اسے اپنے کرتب کا بھروسہ کچھ دیر تک اکھاڑے سے خم ٹھوکنے کی آوازیں آتی رہیں تب یکا یک بہت سے آدمی خوشی سے نعرے مار مار کر اچھلنے لگے کپڑے اور برتن اور پیسے اور بتاشے لٹائے جانے لگے کسی نے اپنا پرانا صافہ پھینکا کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اڑا دی ساٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے اور گوپال کو گود میں اٹھالائے بلدیو اور اس کے رقیبوں نے گوپال کو لہو کی آنکھوں سے دیکھا اور دانت پیس کر رہ گئے۔ دس بجے رات کا وقت اور ساون کا مہینہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں تاریکی کا یہ عالم تھا گویا روشنی کا وجود ہی نہیں رہا کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی مگر تاریکی کو اور زیادہ دیر تک کرنے کے لئے مینڈکوں کی آواز زندگی کا پتہ دیتی تھی ورنہ چاروں طرف

موت تھی خاموش خوفناک اور متین ساٹھے کے جھونپڑے اور مکانات اس اندھیرے میں بہت غور سے دیکھنے پر کالی بھیڑوں کی طرح نظر آتے تھے نہ بچے روتے تھے نہ عورتیں گاتی تھیں پیران پارسارام نام بھی نہ جپتے تھے۔

مگر آبادی سے بہت دور کہیں شور نالوں اور ڈھاک کے جنگلوں سے گذر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے اور ان کی مینڈوں پر ساٹھے کے کسان جابجا منڈیا ڈالے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کر رہے تھے تلے زمین اوپر تاریکی میلوں تک سناٹا چھایا ہوا کہیں جنگلی سوروں کے غول، کہیں نیل گایوں کے ریوڑ چلم کے سوا کوئی ساتھی نہیں آگ کے سوا کوئی مددگار نہیں ذرا کھٹکا ہوا اور چونک پڑے تاریکی خوف کا دوسرا نام ہے۔

جب ایک مٹی کا ڈھیر، ایک ٹھونٹھا درخت اور ایک تودہ کاہ بھی متحرک اور حساس بن جاتے ہیں تاریکی ان میں جان ڈال دیتی ہے لیکن یہ مضبوط ارادے والے کسان ہیں کہ یہ سب سختیاں جھیلتے ہیں تاکہ اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کے عیش اور تکلف کے سامان بہم پہنچائیں انہیں رکھوالوں میں آج کا ہیرو ساٹھے کا مایہ ناز گوپال بھی ہے جو اپنی منڈیا میں بیٹھا ہوا ہے اور نیند کو بھگانے کے لئے دھیرے سروں میں یہ نغمہ گا رہا ہے۔

میں تو تو سے نینا لگائے پچھتائی رے

دفعتاً اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی جیسے ہرن کتوں کی آوازوں کو کان لگا کر سنتا ہے اسی طرح گوپال نے بھی کان لگا کر سنا۔

نیند کی غنودگی دور ہو گئی لٹھ کندھے پر رکھا اور منڈیا سے باہر نکل آیا چاروں

طرف سیاہی چھائی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ پڑا وہ تیورا کر گرا۔ اور رات بھر وہیں بے سدھ پڑا رہا معلوم نہیں اس پر کتنی چوٹیں پڑیں۔ حملہ آوروں نے تو اپنی دانست میں اس کا کام تمام کر ڈالا لیکن حیات باقی تھی یہ پاٹھے کے غیرت مند لوگ تھے جنہوں نے اندھیرے کی آڑ اپنی ہار کا بدلہ لینا تھا۔

گوپال ذات کا اہیر تھا نہ پڑھا نہ لکھا بالکل اکھڑ دماغ روشن ہی نہیں ہوا تو شمع جسم کیوں کھلتی پورے چھ فٹ کا قد گٹھا بدن للکار کر گاتا تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔

گانے بجانے کا عاشق ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتا ساون میں ملہار، اور بھجن تو روزمرہ کا شغل تھا نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ کے وجود پر اسے عالمانہ شکوک تھے لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح سرخ صافے سے اس کی روح لرزاں ہو جاتی تھی۔

اگرچہ ساٹھے جیسے جوان ہمت ور سورما کے لئے یہ بے معنی خوف غیر معمولی بات تھی لیکن اس کا کچھ بس نہ تھا سپاہی کی وہ خوفناک تصویر جو بچپن میں اس کے دل پر کھنچی گئی تھی نقش کالحجر بن گئی تھی شرارتیں گئیں، بچپن گیا، مٹھائی کی بھوک گئی لیکن سپاہی کی تصویر ابھی تک قائم تھی آج اس کے دروازے پر سرخ صافے والوں کی ایک فوج جمع تھی لیکن گوپال زخموں سے چور، درد سے چور، درد سے بے تاب ہونے پر بھی اپنے مکان کے ایک تاریک گوشے میں چھپا ہوا بیٹھا تھا نمبردار اور مکھیا، پٹواری اور چوکیدار مرعوب انداز سے کھڑے داروغہ کی خوشامد کر رہے

تھے ۔کہیں اہیر کی دادفریاد سنائی دیتی تھی کہیں مودی کی گریہ وزاری کہیں تیلی کی چیخ پکار کہیں قصاب کی آنکھوں سے لہو جاری، کلار کھڑا اپنی قسمتوں کو رو رہا تھا فحش اور مغلظات کی گرم بازاری تھی داروغہ جی نہایت کارگذار افسر تھے گالیوں سے بات چیت کرتے تھے صبح کو چارپائی سے اٹھتے ہی گالیوں کا گذر پڑھتے مہتر نے آکر فریاد کی ہجور! انڈے نہیں ہیں داروغہ جی ہنٹر لے کر دوڑے اور اس غریب کا بھرکس نکال دیا سارے گاؤں میں ہل چل پڑی ہوئی تھی کانسٹیبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں جب گاؤں کے سارے آدمی آگئے تو داروغہ جی نے افسرانہ انداز تحکم سے فرمایا موضع میں ایسی سنگین واردات ہوئی اور اس بدقسمت گوپال نے رپٹ تک نہ کی ۔

مکھیا صاحب بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے بولے ’’ہجور! اب ماپھی دی جائے‘‘

داروغہ جی نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا یہ اس کی شرارت ہے دنیا جانتی ہے کہ اخفاء جرم ارتکاب جرم کے برابر ہے میں اس بدمعاش کو اس کا مزہ چکھادوں گا وہ اپنی طاقت کے زعم میں پھولا ہوا ہے اور کوئی بات نہیں لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ۔

مکھیا صاحب سربسجود ہو کر بولے ’’ہجور! اب ماپھی دی جائے‘‘

داروغہ جی چیں بہ جبیں ہو گئے اور جھنجھلا کر بولے ’’ارے ہجور کے بچے کچھ سٹھیا تو نہیں گیا ہے اگر کسی طرح معافی دینی ہوتی تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ یہاں تک دوڑ آتا؟ یہ کوئی معاملہ نہ معاملے کی بات بس معافی کی رٹ لگا رکھی ہے

مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے میں نماز پڑھتا ہوں جب تک تم صلاح مشورہ کر لو اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کر دو ورنہ غوث خاں کو جانتے ہو اس کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

داروغہ تقویٰ وطہارت کے بڑے پابند تھے پانچوں وقت کی نماز پڑھتے اور تیسوں روزے رکھتے عیدوں میں دھوم دھام سے قربانیاں ہوتیں اس سے زیادہ حسن ارادت کسی انسان میں اور کیا ہو سکتا ہے۔

مکھیا صاحب دبے پاؤں رازدارانہ انداز سے گورا کے پاس آئے اور بولے" یہ دروگا بڑا اکا پھر ہے پچاس سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتا درجہ اول کا تھانیدار ہے میں نے بہت کہا حجور غریب آدمی ہے گھر میں کچھ بھیتا نہیں مگر وہ ایک نہیں سنتا"

گورا نے گھونگھٹ میں منہ چھپا کر کہا دادا کی جان بچ جائے کوئی طرح کی آنچ نہ آنے پائے روپے پیسے کی کون بات ہے اسی دن کے لئے تو کمایا جاتا ہے

گوپال کھاٹ پر پڑا یہ سب باتیں سن رہا تھا اب سے ضبط نہ ہو سکا لڑکی گانٹھ پر ٹوٹتی ہے نا کردہ گناہ دبتا ہے مگر کچلا نہیں جا سکتا وہ جوش سے اٹھ بیٹھا اور بولا پچاس روپے کی کون کہے میں پچاس کوڑیاں بھی نہ دوں گا کوئی گدر (غدر) ہے میں نے کسور (قصور) کیا کیا ہے؟ مکھیا کا چہرہ فق ہو گیا بزرگانہ لہجے میں بولے رسان رسان (آہستہ آہستہ) بولو کہیں سن لے تو گجب ہو جائے گا۔

لیکن گوپا بھرا ہوا تھا اکڑ کر بولا" میں ایک کوڑی نہ دوں گا دیکھیں کون میرے پھانسی لگا دیتا ہے۔"

گورا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا اچھا جب میں تم سے روپے مانگوں تو مت

دینا یہ کہہ کر گوار نے جو اس وقت لونڈی کی بجائے رانی بنی ہوئی تھی چھپر کے ایک کونے میں سے روپیوں کی ایک پوٹلی نکالی اور مکھیا کے ہاتھ میں رکھ دی گوپال دانت پیس کر اٹھا لیکن مکھیا صاحب فوراً سب سے پہلے سرک گئے۔ داروغہ جی نے گوپال کی باتیں سن لی تھیں اور دعا کر رہے تھے کہ اے خدا اس مردود شقی کی تالیف قلب کر اتنے میں مکھیا نے باہر آ کر پچیس روپے کی پوٹلی دکھائی پچیس راستے ہی میں غائب ہو گئے تھے۔

داروغہ جی نے خدا کا شکر ادا کیا دعا مستجاب ہوئی روپیہ جیب میں رکھا اور رسد پہنچانے والوں کے انبوہ کثیر کو روتے اور بلبلاتے چھوڑ کر ہوا ہو گئے موذی کا گلا گھٹ گیا قصاب کے گلے پر چھری پھر گئی تیلی پس گیا مکھیا صاحب نے گوپال کی گردن پر احسان رکھا گویا رسد کے دام گرہ سے دیے گاؤں میں سرخ رو ہو گئے وقار بڑھ گیا ادھر گوپال نے گورا کی خوب خبر لی گاؤں میں رات بھر یہی چرچا ہو رہا گوپال بہت بچا اور اس کا سہرا مکھیا کے سر تھا بلائے عظیم آئی تھی وہ ٹل گئی پتروں نے دیوان ہردول نے نیم تلے والی دیبی نے تالاب کے کنارے والی ستی نے گوپال کی رکھشا لی یہ انہی کا پرتاپ تھا دیوی کی پوجا ہونی ضروری تھی ستیہ نارائن کی کتھا بھی لازمی ہو گی۔

پھر صبح ہوئی لیکن گوپال کے دروازے پر آج سرخ پگڑیوں کے بجائے لال ساڑیوں کا جمگھٹ تھا گورا آج دیوی کی پوجا کرنے جاتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اس کا ساتھ دینے آئی تھیں اس کا گھر سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا جو خس اور گلاب سے کم دل آویز نہ تھی عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں بچے خوش ہو ہو کر

دوڑتے تھے دیوی کے چبوترے پر اس نے مٹی کا ہاتھی چڑھایا ستی کی مانگ میں سیندور ڈالا دیوان صاحب کو بتاشے اور حلوا کھلایا ہنومان جی کو لڈو سے زیادہ رغبت ہے انہیں لڈو چڑھائے تب گاتی بجاتی گھر کو آئی اور سیتہ نارائن کی کتھا کی تیاریاں ہونے لگیں مالن پھول کے ہار کیلے کی شاخیں اور بندھن واریں لائی کمہار نئے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گیا۔ باری ہرے ڈھاک کے پتل اور دونے رکھ گیا۔ کمہار نے آکر مٹکوں میں پانی بھرا بڑھئی نے آکر گوپال اور گورا کے لئے دو نئی نئی پیڑھیاں بنائیں نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی دروازے پر بندھن واریں بندھ گئیں آنگن میں کیلے کی شاخیں گڑ گئیں پنڈت جی کے لئے سنگھاسن بچ گیا فرائض باہمی کا نظام خود بخود اپنے مقررہ دائرے پر چلنے لگا یہی نظام تمدن ہے جس نے دیہات کی زندگی کو تکلفات سے بے نیاز بنا رکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ ادنی اور اعلیٰ کے بے معنی اور بیہودہ قیود نے ان باہمی فرائض کو امداد حسنہ کے رتبے سے ہٹا کر ان پر ذلت اور نیچے پن کا داغ لگا دیا ہے شام ہوئی پنڈت موٹے رام جی نے کندھے پر جھولی ڈالی ہاتھ میں سنکھ لیا اور کھڑاؤں کھٹ پٹ کرتے گوپال کے گھر آ پہنچے آنگن میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا گاؤں کے معززین کتھا سننے کے لئے آ بیٹھے گھنٹی بجی سنکھ پھوکا گیا اور کتھا شروع ہوئی گوپال بھی گاڑھے کی چادر اوڑھے ایک کونے میں دیوار کے آسرے بیٹھا ہوا تھا مکھیا نمبردار اور پٹواری نے از راہ ہمدردی اس سے کہا

''سیتہ نارائن کی مہما تھی کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئی''

گوپال نے انگڑائی لے کر کہا سیتہ نارائن کی مہما نہیں یہ اندھیر ہے۔

صرف ایک آواز

پہلی بار: زمانہ اگست، ستمبر 1913ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1918ء (پریم پچیسی دوم)

صبح کا وقت تھا ٹھاکر درشن سنگھ کے گھر ایک ہنگامہ برپا تھا آج رات کو چندر گرہن ہونے والا تھا ٹھاکر صاحب اپنی بوڑھی ٹھکرائن کے ساتھ گنگا جی جاتے تھے اس لیے سارا گھر ان کی پرشور تیاری میں مصروف تھا ایک بہو ان کا پھٹا ہوا کرتا ٹانک رہی تھی دوسری بہو ان کی پگڑی لیے سوچتی تھی کہ کیوں کر اس کی مرمت کروں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تیار کرنے میں محو تھیں جو زیادہ دلچسپ کام تھا اور بچوں نے پانی عادت کے موافق ایک کہرام مچا رکھا تھا کیوں کہ ہر ایک آنے جانے کے موقع پر ان کا جوش گریہ امنگ پر ہوتا تھا جانے کے وقت ساتھ جانے کے لئے روتے آنے کے وقت اس لیے روتے کہ شیرینی کی تقسیم خاطر خواہ نہیں ہوئی بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں اور بیچ بیچ میں اپنی بہوؤں کو سمجھاتی تھیں، دیکھو خبردار جب تک آگرہ نہ ہو جائے گھر سے باہر نہ نکلنا ہنسیا چھری کلہاڑی ہاتھ سے مت چھونا سمجھائے دیتی ہوں ماننا چاہے نہ ماننا تمہیں میری بات کون پروا ہے منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے جو سادھو بھکاری دروازہ پر آ جائے اسے پھیرنا مت بہوؤں نے سنا اور نہیں سنا وہ منا رہی تھیں کہ کسی طرح یہاں سے ٹلیں پھاگن کا مہینہ ہے گانے کو ترس گئے آج خوب گانا بجانا ہوگا۔

ٹھا کر صاحب تھے تو بوڑھے لیکن ضعف کا اثر دل تک نہیں پہنچا تھا انہیں اس بات کا گھمنڈ تھا کہ کوئی گہن بغیر گنگا اشنان کے نہیں چھوٹا ان کی علمی قابلیت حیرت انگیز تھی صرف پتروں کو دیکھ کر مہینوں پہلے سورج گرہن اور دوسری تقریبوں کے دن بتا دیتے تھے اس لیے گاؤں والوں کی نگاہ میں ان کی عزت اگر پنڈتوں سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی جوانی میں کچھ دنوں فوجی ملازمت بھی کی تھی اس کی گرمی اب تک باقی تھی مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی طرف تیکھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ایک مذکوری چپراسی کو ایسی عملی تنبیہ کی تھی جس کی نظیر قرب و جوار سے دس پانچ گاؤں میں بھی نہیں مل سکتی ہمت اور حوصلہ کے کاموں میں اب بھی پیش قدمی کر جاتے تھے کسی کام کو مشکل بنا دینا ان کی ہمت کو تحریک دیتا تھا جہاں سب کی زبانیں بند ہو جاتیں وہاں وہ شیروں کی طرح گرجتے تھے جب کبھی گاؤں میں داروغہ جی تشریف لاتے تو ٹھا کر صاحب ہی دل کا گردہ تھا کہ ان سے آنکھیں ملا کر دو بدو بات کرسکیں۔ عالمانہ مباحثہ کے میدان میں بھی ان کے کارنامے کچھ کم نہ تھے جھگڑالو پنڈت ہمیشہ ان سے منہ چھپایا کرتے تھے۔ غرض ٹھا کر صاحب کی جبلی رعونت اور اعتماد و نفس انہیں ہر برات میں دولہا بننے پر مجبور کر دیتی تھی ہاں کمزوری اتنی تھی کہ اپنی آلھا بھی آپ ہی گا لیتے اور مزے لے لے کر کیوں کہ تصنیف کو مصنف ہی خوب بیان کرتا ہے۔

جب دوپہر ہوتے ہوتے ٹھا کر اور ٹھکرائن گاؤں سے چلے تو سینکڑوں آدمی ان کے ساتھ تھے اور پختہ سڑک پر پہنچے تو جاتریوں کا ایسا تانتا لگا ہوا تھا گویا کوئی بازار ہے ایسے ایسے بوڑھے لاٹھیاں ٹیکتے یا ڈولیوں پر سوار چلے جاتے تھے جنہیں

تکلیف دینے کی ملک الموت نے بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی اندھے دوسروں کی لکڑی کے سہارے قدم بڑھائے آتے تھے بعض آدمیوں نے اپنی بوڑھی ماتاؤں کو پیٹھ پر لادلیا تھا کسی کے سر پر کپڑوں کا بقچہ، کسی کے کندھے پر لوٹا، ڈور کسی کے کندھے پر، اور کتنے ہی آدمیوں نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے تھے جوتے کہاں سے لائیں مگر مذہبی جوش کی یہ برکت تھی کہ من کسی کا میلا نہ تھا سب کے چہرے شگفتہ ہنستے باتیں کرتے سرگرم رفتار سے کچھ عورتیں گا رہی تھیں۔

چاند سورج دونوں کے مالک

ایک دنا انہوں پر بنتی

ہم جانی ہم ہی پر بنتی

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمیوں کی ایک ندی تھی جو سینکڑوں چھوٹے نالوں اور دھاروں کو لیتی ہوئی سمندر سے ملنے کے لیے جا رہی تھی۔

جب یہ لوگ گنگا کے کنارے پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا لیکن میلوں تک کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اس شاندار نظارہ سے دلوں پر عقیدت اور احترام کا ایسا رعب ہوتا تھا کہ بے اختیار ''گنگا ماتا جی کی جے'' کی صدائیں بلند ہو جاتی تھیں لوگوں کے اعتقاد اسی ندی کی طرح امنڈے ہوئے تھے اور وہ ندی وہ لہراتا ہوا نیل زار، وہ تشنہ کاموں کی پیاس بجھانے والی وہ نامرادوں کی آس وہ برکتوں کی دیوی، وہ پاکیزگی کا سرچشمہ وہ مشت خاک کو پناہ دینے والی گنگا ہنستی تھی مسکراتی تھی اور اچھلتی تھی کیا اس لیے کہ آج وہ اپنی عام عزت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ یا اس لئے کہ وہ اچھل اچھل کر اپنے پریمیوں سے گلے ملنا چاہتی تھی۔ جو اس کے درشنوں کے

لئے منزلیں طے کر کے آئے تھے اور اس کے لباس کی تعریف کس زبان سے ہو جس پر آفتاب نے درخشاں تارے ٹانکے تھے۔ اور جس کے کناروں کو اس کی کرنوں نے رنگ برنگ خوشنما اور متحرک پھولوں سے سجایا تھا۔

ابھی گہن لگنے میں گھنٹوں کی دیر تھی لوگ ادھر ادھر ٹہل رہے تھے کہیں مداریوں کے شعبدے تھے کہیں چورن والوں کی شیوہ بیانیوں کے معجزے، کچھ لوگ مینڈھوں کی کشتی دیکھنے کے لئے جمع تھے ٹھاکر صاحب بھی اپنے چند معتقدوں کے ساتھ سیر کو نکلے ان کی علو ہمتی نے گوارہ نہ کیا کہ ان عالمانہ دلچسپیوں میں شریک ہوں یکا یک انہیں ایک وسیع شامیانہ تنا ہوا نظر آیا جہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ آدمیوں کا مجمع تھا ٹھاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کو ایک کنارے کھڑا کر دیا اور خود ایک مغرورانہ انداز سے تاکتے ہوئے فرش پر جا بیٹھے کیونکہ انہیں یقین تھا یہاں ان پر دہقانیوں کی نگاہ رشک پڑے گی اور ممکن ہو ایسے نکتے بھی معلوم ہو جائیں جو معتقدین کو ہمہ دانی کا یقین دلانے میں کام دے سکیں۔

یہ اخلاقی جلسہ تھا دو ڈھائی ہزار آدمی بیٹھے ہوئے ایک شیریں بیاں مقرر کی تقریر سن رہے تھے فیشن ایبل لوگ زیادہ تر اگلی صفوں میں جلوہ افروز تھے جنہیں سرگوشیوں کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا کتنے ہی خوش پوش حضرات اس لئے مکدر نظر آتے تھے کہ ان کی بغل میں کمتر درجہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے تقریر بظاہر دلچسپ تھی وزن زیادہ تھا اور چٹخارے کم اس لئے تالیاں نہیں بجتی تھیں۔

حضرت واعظ نے دوران تقریر میں فرمایا

"میرے پیارے دوستو! یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے اس سے زیادہ اہم"

زیادہ نتیجہ خیز اور قوم کے لئے زیادہ مبارک کوئی فرض نہیں ہے ہم مانتے ہیں کہ ان کے عادات و اخلاق کی حالت نہایت افسوس ناک ہے مگر یقین مانیے یہ سب ہماری کرنی ہے ان کی اس شرمناک تمدنی حالت کا ذمہ دار ہمارے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اب اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ ہم ان نفرت اور حقارت کو جو ان کی طرف سے ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے دھوئیں اور خوب مل کر دھوئیں یہ آسان کام نہیں ہے جو سیاہی کئی ہزار برسوں سے جمی ہوئی ہے وہ آسانی سے نہیں مٹ سکتی جن لوگوں کے سایے سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں جنہیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے ان سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار، ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا اس ایثار سے جو کرشن میں تھا اس ہمت سے جو رام میں تھی اس بے نفسی سے جو چیتن اور گووند میں تھی میں یہ نہیں کہتا کہ آپ آج ہی ان سے شادی کے رشتے جوڑیں یا ان کے نوالہ و پیالہ شریک ہوں مگر کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے ساتھ عدم ہمدردی، عام انسانیت، عام اخلاق سے پیش آئیں؟ کیا یہ واقعی غیر ممکن امر ہے آپ نے کبھی عیسائی مشنریوں کو دیکھا ہے؟ آہ! جب میں ایک اعلیٰ درجہ کی حسین، نازک، اندام سیم تن لیڈی کو اپنی گود میں ایک سیاہ فام بچہ لیے ہوئے دیکھتا ہوں جس کے بدن پر پھوڑے ہیں خون ہے اور غلاظت ہے وہ نازنین اس بچے کو چومتی ہے پیار کرتی ہے چھاتی سے لگاتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں اپنا نیچا پن اپنی فرومائیگی اپنی جھوٹی بڑائی اپنی تنگ ظرفی مجھے کبھی اتنی صفائی سے نظر نہیں آتی ان دیویوں کے لیے زندگی میں کیا کیا نعمتیں نہیں تھیں خوشیاں آغوش کھولے ہوئے ان کی منتظر

کھڑی تھیں ان کے لیے دولت کی تن آسانیاں تھیں محبت کی پر لطف دل آویزیاں تھیں اپنے بیگانوں اور عزیزوں کی ہمدردیاں تھیں اور اپنے پیارے وطن کی کشش تھی لیکن ان دیویوں نے ان تمام نعمتوں ان تمام دنیوی برکتوں کو سچی بے غرض خدمت پر قربان کر دیا ہے وہ یہ ملکوتی قربانیاں کر سکتی ہیں کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے اچھوت بھائیوں سے ہمدردی کا سلوک کر سکیں؟ کیا ہم واقعی ایسے پست ہمت، ایسے بودے، ایسے بے رحم ہیں؟ اسے خوب سمجھ لیجئے کہ آپ ان کے ساتھ کوئی رعایت، کوئی مہربانی نہیں کر رہے ہیں یہ ان پر کوئی احسان نہیں ہے یہ آپ ہی کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے اس لئے میرے بھائیو اور دوستو! آیئے اس موقع پر شام کے وقت پوتر گنگا ندی کے کنارے، کاشی کے پوتر استھان میں ہم مضبوط دل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کریں گے ان کی تقریبوں میں شریک ہوں گے اور اپنی تقریبوں میں انہیں بلائیں گے ان سے گلے ملیں گے اور انہیں اپنے گلے لگائیں گے ان کی خوشیوں میں خوش اور ان کے دردوں میں دردمند ہوں گے اور چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے چاہے طعنہ و تضحیک اور تحقیر کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے ہم اس عہد پر قائم رہیں گے آپ میں صدہا پرجوش نوجوان ہیں جو بات کے دھنی اور ارادے کے مضبوط ہیں کون یہ عہد کرتا ہے کون اپنی اخلاقی دلیری کا ثبوت دیتا ہے؟ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور للکار کر کہے کہ ''میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اس پر قائم اور ثابت قدم رہوں گا''

آفتاب گنگا کی گود میں جا بیٹھا تھا اور ماں محبت اور غرور سے متوالی جوش سے

امنڈی ہوئی رنگ میں کیسر کو شرماتی اور چمک میں سونے کو لجاتی تھی چاروں طرف ایک رعب افزا خاموشی چھائی تھی سناٹے میں سنیاسی کی گرمی اور حرارت سے بھری باتیں گنگا کی لہروں اور آسمان سے سر ٹکرانے والے مندروں میں سما گئیں۔ گنگا ایک متین اور مادرانہ مایوسی کے ساتھ ہنسی اور دیوتاؤں نے افسوس سے سر جھکا لیا مگر منہ سے کچھ نہ بولے

سنیاسی کی صدائے بلند فضا میں جا کر غائب ہو گئی مگر مجمع میں کسی شخص کے دل تک نہ پہنچی وہاں قومی فدائیوں کی کمی نہ تھی اسٹیجوں پر قومی تماشے کھیلنے والے کالجوں کے ہونہار نوجوان قوم کے نام پر مٹنے والے اخبار نویس، قومی جماعتوں کے ممبر، سیکرٹری اور پریسیڈنٹ، رام اور کرشن کے سامنے سر جھکانے والے سیٹھ اور ساہوکار، قومی کالجوں کے عالی حوصلہ پروفیسر اور اخباروں اور قومی ترقیوں کی خبریں پڑھ کر خوش ہونے والے دفتروں کے کارکن ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے آنکھوں پر سنہری عینکیں لگائے فربہ اندام کے کارکن وضع وکیلوں کی ایک فوج آراستہ تھی مگر سنیاسی کی اس آتشیں تقریر پر ایک دل بھی نہ پگھلا کیوں کہ وہ پتھر کے دل تھے جن میں درد و گداز نہ تھا جن میں خواہش تھی مگر عمل نہ تھا جن میں بچوں کی سی خواہش تھی مگر مردوں کا ارادہ نہ تھا۔

ساری مجلس پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص سر جھکائے فکر میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ ندامت کسی کو سر اٹھانے نہ دیتی تھی اور آنکھیں خفت سے زمین پر گڑی ہوئی تھیں یہ وہی سر ہیں جو قومی چرچوں پر اچھل پڑتے ہیں یہ وہی آنکھیں ہیں جو کسی وقت قومی غرور کی سرخی سے لبریز ہو جاتی تھیں مگر قول و فعل میں آغاز اور انجام کا

فرق ہے ایک فرد کو بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی مقراض کی طرح چلنے والی زبانیں بھی ایسی عظیم الشان ذمہ داری کے خوف سے بند ہو گئیں۔

ٹھاکر درشن سنگھ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے اس نظارہ کو بہت غور او ردلچپی سے دیکھ رہے تھے وہ اپنے مذہبی عقائد میں چاہے راسخ ہوں یا نہ ہوں لیکن تمدنی معاملات میں وہ کبھی پیش قدمی کے خطاوار نہیں ہوئے تھے۔ اس پیچیدہ اور وحشت ناک راستے میں انہیں اپنی عقل و تمیز اور ادراک پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا یہاں منطق اور استدلال کو بھی ان سے ہار ماننی پڑتی تھی اس میدان میں وہ اپنے گھر کی مستورات کے حکم کی تعمیل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے تھے اور چاہے انہیں بذاتہ کسی معاملے میں کوئی اعتراض بھی ہو لیکن یہ نسوانی معاملہ تھا اور اس میں وہ مداخلت نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ اس سے خاندانی نظام میں شورش اور تلاطم پیدا ہو جانے کا زبردست احتمال رہتا تھا اگر اس وقت ان کے بعض سرگرم نوجوان دوست اس کمزوری پر انہیں آڑے ہاتھوں لیتے تو وہ بہت دانشمندی سے کہا کرتے تھے بھئی یہ عورتوں کے معاملے ہیں ان کا جیسا دل چاہتا ہے کرتی ہیں میں بولنے والا کون ہوں غرض یہاں ان کی فوجی گرم مزاجی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی یہ ان کے لئے وادی طلسم تھی جہاں ہوش و حواس مسخ ہو جاتے تھے اور کورانہ تقلید کا پیر تسمہ پا گردن پر سوار ہو جاتا تھا۔

لیکن یہ للکار سن کر وہ اپنے تئیں قابو میں نہ رکھ سکے یہی وہ موقع تھا جب ان کی ہمتیں آسمان پر جا پہنچتی تھیں جس بیڑے کو کوئی نہ اٹھائے اسے اٹھانا ان کا کام تھا۔ امتناع سے انہیں روحانی مناسبت تھی ایسے موقعہ پر وہ نتیجہ اور مصلحت سے

بغاوت کر جاتے تھے اور ان کے اس حوصلہ میں حرص شہرت کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا اپنی فطری میلان کو، ورنہ یہ غیر ممکن تھا کہ ایسے جلسے میں جہاں علم وتہذیب کی نمود تھی اور جہاں طلائی عینکوں سے روشنی اور گوناگوں لباسوں سے فکر تابوں کی شعاعیں نکل رہی تھیں جہاں وضع کی نفاست سے رعب اور فربہی و دبازت سے وقار کی جھلک آتی تھی وہاں ایک دہقانی کسان کو زبان کھولنے کا حوصلہ ہوتا ٹھاکر نے اس نظارے کو غور اور دلچسپی سے دیکھا اس کے پہلو میں گدگدی سی ہوئی زندہ دلی کا جوش رگوں میں دوڑا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مردانہ لہجہ میں للکار کر بولا ''میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اس پر قائم رہوں گا۔''

اتنا سننا تھا کہ دو ہزار آنکھیں انداز تحیر سے اس کی طرف تاکنے لگیں سبحان اللہ کیا وضع تھی گاڑھے کی ڈھیلی مرزائی گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی، سر پر ایک گرانبار الجھا ہوا صافہ، کندھے پر چنوٹی اور تمباکو کا وزنی بٹوا، مگر بشرے سے متانت اور استقلال نمایاں تھا غرور آنکھوں کے تنگ ظرف سے باہر نکلا پڑتا تھا اس کے دل میں اب اس شاندار مجمع کی عزت باقی نہ رہی تھی۔ وہ اپنے پرانے وقتوں کا آدمی تھا جو اگر پتھر کو پوجتا تھا تو اسی پتھر سے ڈرتا بھی تھا جس کے لئے اکادشی برت محض حفظ صحت کی ایک تدبیر اور گنگا محض صحت بخش پانی کا ذخیرہ نہ تھی اس کے عقیدے میں بیدار مغزی نہ ہو لیکن شکوک نہیں تھے غرض اس کا اخلاق پابند عمل تھا اور اس کی بنیاد کچھ تقلید اور معاوضے پر تھی مگر زیادہ تر خوف پر جو نور عرفاں کے بعد تہذیب نفس کی سب سے بڑی طاقت ہے گیروے بانے کی عزت و احترام کرنا اس کے مذہب اور ایمان کا ایک جزو تھا سنیاس میں اس کی روح کو اپنا

فرمان گذار بنانے کی ایک زندہ طاقت چھپی ہوئی تھی اور اس طاقت نے اپنا اثر دکھایا لیکن مجمع کی اس حیرت نے بہت جلد تمسخر کی صورت اختیار کی پر معنی نگاہیں آپس میں کہنے لگیں آخر گنوار ہی تو ٹھہرا دہقانی ہے کبھی ایسی تقریریں کاہے کو سنی ہونگی بس ابل پڑا اور اتھلے گڈھے میں اتنا پانی بھی نہ سا سکا کون نہیں جانتا کہ ایسی تقریروں کا منشا تفریح ہوتا ہے دس آدمی آئے، اکٹھے بیٹھے کچھ سنا، کچھ سنا، کچھ گپ شپ ماری اور اپنے اپنے گھر لوٹے نہ یہ کہ قول وقرار کرنے بیٹھیں عمل کرنے کے لیے قسمیں کھائیں۔

مگر مایوس اور دل گرفتہ سنیا سی سوچ رہا تھا، افسوس! جس ملک کی روشنی میں اتنا اندھیرا ہے وہاں کبھی روشنی کا ظہور ہونا مشکل نظر آتا ہے اسی روشنی پر، اس اندھیری، مردہ اور بے جان روشنی پر میں جہالت کو ترجیح دیتا ہوں جہالت میں صفائی ہے ہمت ہے اس کے دل اور زبان میں پردہ نہیں ہوتا نہ قول اور فعل میں اختلاف کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ علم جہالت کے سامنے سر جھکائے اس سارے مجمع میں صرف ایک شخص ہے جس کے پہلو میں مردوں کا دل ہے اور گو اسے بیدار مغزی کا دعویٰ نہیں لیکن اس کی جہالت پر ایسی ہزاروں بیدار مغزیوں کو قربان کرسکتا ہوں تب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اترے اور درشن سنگھ کو گلے سے لگا کر کہا "ایشور تمہیں پرتگیا پر قائم رکھے۔"

☆☆☆☆☆☆

بانکا زمیں دار

پہلی بار: ''زمانہ'' اکتوبر 1913ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1939ء (دیہات کے افسانے)

ٹھاکر درشن سنگھ ایک ممتاز وکیل تھے اور اپنے حوصلہ و ہمت کے لئے سارے شہر میں مشہور تھے ان کے اکثر احباب کہا کرتے کہ اجلاس عدالت میں ان کے مردانہ کمالات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتے ہیں اسی کی برکت تھی کہ باوجود اس کے انہیں شاذ ہی کسی معاملے میں سرخروئی حاصل ہوئی تھی، ان کے موکلوں کے حسن عقیدت میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ صدر انصاف پر جلوہ فرما ہونے والے بزرگوں کی بے خوف آزادی پر کسی قسم کا شبہ کرنا کفر ہی کیوں نہ ہو مگر شہر کے واقف کار لوگ علانیہ کہتے تھے کہ ٹھاکر صاحب جب کسی معاملے میں ضد پکڑ لیتے ہیں تو ان کا بدلا ہوا تیور اور تمتمایا ہوا چہرہ انصاف کو بھی اپنا تابع فرماں بنا لیتے ہیں ایک سے زیادہ موقعوں پر ان کے جیوٹ اور جگر نے وہ معجزے کر دکھائے تھے جہاں انصاف اور قانون نے جواب دے دیا تھا اس کے ساتھ ہی ٹھاکر صاحب مردانہ اوصاف کے سچے جوہر شناس تھے اگر موکل کو فن زور آزمائی میں کچھ دسترس ہو تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مال و زر کا منت کش بنے اسی لیے ان کے ہاں شہر کے پہلوانوں اور پھکیتوں کا ہمیشہ جمگھٹ رہتا تھا اور یہی وہ زبردست پر تاثیر اور عملی نکتہ قانون تھا جس کی تردید کرنے میں

انصاف کو بھی تامل ہوتا تھا وہ غرور اور بے غرور کی دل سے قدرت کرتے تھے ان کے خانہ بے تکلف کے آستانے بہت اونچے تھے وہاں جھکنے کی ضرورت نہ تھی انسان خوب سر اٹھا کر جا سکتا تھا یہ معتبر روایت ہے کہ ایک بار انہوں نے کسی مقدمہ کو باوجود بہت منت و اصرار کے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا موکل اکھڑ دہقانی تھا اس نے جب منت سے کام نکلتے نہ دیکھا تو ہمت سے کام لیا وکیل صاحب کرسی سے نیچے گر پڑے اور بپھرے ہوئے دہقانی کو سینے سے لگا لیا۔

(2)

دولت کو زمین سے ازلی مناسبت ہے زمین میں عام کشش کے سوا ایک خاص طاقت ہوتی ہے جو ہمیشہ دولت کو اپنی طرف کھینچتی ہے سود اور تمسک اور تجارت یہ دولت کی درمیانی منزلیں ہیں زمین اس کی منزل مقصود ہے ٹھاکر ریودمن سنگھ کی نگاہیں بہت عرصے سے ایک بہت زرخیز موضع پر لگی ہوئی تھیں لیکن بینک کا اکاؤنٹ کبھی حوصلہ کو قدم نہیں بڑھانے دیتا تھا یہاں تک کہ ایک دفعہ اسی موضع کا زمیندار ایک قتل کے معاملے میں ماخوذ ہوا۔ اس نے صرف رسم و رواج کے موافق ایک اسامی کو دن بھر دھوپ اور جیٹھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رکھا تھا۔ لیکن اگر آفتاب کی تمازت یا جسمانی کمزوری یا پیاس کی شدت اس کی جان لیوا بن جائے تو اس میں زمیندار کی کیا خطا تھی یہ وکلا شہر کی زیادتی تھی کہ کوئی اس کی حمایت پر آمادہ نہ ہوا۔ یا ممکن ہے زمیندار کی تہیدستی کو بھی اس میں کچھ دخل ہو بہرحال اس نے چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر صاحب کی پناہ لی مقدمہ نہایت کمزور تھا پولیس نے پوری طاقت سے دھاوا کیا تھا اور اس کی کمک کے لئے حکومت اور

اختیار کے تازہ دم رسالے تیار تھے ٹھاکر صاحب آزمودہ کار سپیروں کی طرح سانپ کی ماند میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے لیکن اس موقع پر انہیں خشک مصلحت کے مقابلے میں اپنی مدعاؤں کا پلہ جھکتا ہوا نظر آیا زمیندار کی تشفی کی اور وکالت نامہ داخل کر دیا اور پھر ایسی جانفشانی سے مقدمہ کی پیروی کی کچھ اس طرح جان لڑائی کہ میدان سے فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے نکلے زبان خلق اس فتح کا سہرا ان کی قانونی دسترس کے سر نہیں ان کے مردانہ اوصاف کے سر رکھتی ہے کہ ان دنوں وکیل صاحب نظائر و دفعات کی ہمت شکن پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے دنگل کی حوصلہ بخش دلچسپیوں میں زیادہ منہمک رہتے تھے لیکن یہ مطلق قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا زیادہ واقف کار لوگ کہتے ہیں کہ انار کے بم گولوں اور سیب و انگور کی گولیوں نے پولیس کے اس حملہ پر شور کو منتشر کر دیا الغرض میدان ہمارے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ رہا زمیندار کی جان بچی، موت کے منہ سے نکل آیا۔ پیروں پر گر پڑا بولا ٹھاکر صاحب! میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کی خدمت کر سکوں ایشور نے بہت کچھ دیا ہے لیکن کرشن بھگوان نے غریب سداما کے سوکھے چاول خوشی سے قبول کئے تھے میرے پاس بزرگوں کی یادگار ایک چھوٹا ویران موضع ہے اسے آپ کی نظر کرتا ہوں آپ کے لائق تو نہیں لیکن میری خاطر اسے قبول کیجئے میں آپ کا جس کبھی نہ بھولوں گا وکیل صاحب پھڑک اٹھے دو چار بار عارفانہ انکار کے بعد اس نذر کو قبول کر لیا منہ مانگی مراد بر آئی۔

(3)

اس موضع کے لوگ نہایت سرکش اور فتنہ پرواز تھے جنہیں اس بات کا فخر تھا کہ

کبھی کوئی زمیندار نہیں پابند عنان نہیں کر سکا لیکن جب انہوں نے اپنی باگ ڈور رپودمن سنگھ کے ہاتھوں میں جاتے دیکھی تو چوکڑیاں بھول گئے ایک بے لگام گھوڑے کی طرح سوار کو آنکھوں سے دیکھا۔ کنوتیاں کھڑی کیں کچھ ہنہنائے اور تب گردنیں جھکا دیں سمجھ گئے کہ یہ جگر کا مضبوط اور آسن کا پکا شہسوار ہے۔

اساڑھ کا مہینہ تھا کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں در بدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولہا مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کی نگاہ کرم کی منتظر گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے جسے چاہتے اجاڑتے تھے آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج گھومتے نظر آتے ہیں جو باوجود پیرانہ سالی کے جھجھن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پرمزہ شغل تھا۔ نالے پرشور اور ندیاں اتھاہ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ نزہت کا حسن بسیط انہیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے ایک سجی ہوئی بارات تھی ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کروفر دیکھا تو رہے سہے ہوش اڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور گنڈے گلیوں میں شام کے وقت ٹھاکر صاحب نے اپنے اسامیوں کو بلایا اور تب یہ آواز بلند بولے ”میں نے سنا ہے کہ تم لوگ بڑے سرکش ہو اور میری سرکشی کا حال تم کو معلوم نہیں ہے اب اینٹ اور پتھر کا سامنا ہے بولو کیا منظور ہے۔“

ایک بوڑھے کسان نے بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے جواب دیا ’’سرکار آپ ہمارے راجہ ہیں ہم آپ سے اینٹھ کر کہاں جائیں گے‘‘

ٹھاکر صاحب تیور بدل کر بولے ’’تو تم لوگ سب کے سب کل صبح تک تین سال کا پیشگی لگان داخل کر دو اور خوب دھیان دے کر سن لو کہ حکم کو دہرانا نہیں جانتا ورنہ میں گاؤں میں ہل چلوا دوں گا اور گھروں کو کھیت بنا دوں گا‘‘ سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا تین سال کا پیشگی لگان اور اتنی جلدی فراہم ہونا غیر ممکن تھا رات اسی حیض بیض میں کٹی ابھی تک منت ساجت کی برقی تاثیر کی امید باقی تھی صبح بہت انتظار کے بعد آئی تو قیامت بن کر آئی ایک طرف تو جبر و تشدد اور ظلم و تحکم کے ہنگامے گرما گرم تھے دوسری طرف دیدہ گریاں اور آہ سرد اور نالہ بیداد کے غریب کسان اپنے اپنے بقچے لادے بیکسانہ انداز سے تاکتے آنکھوں میں التجا بیوی بچوں کو ساتھ لینے روتے بلکتے کسی نامعلوم دیارِ غربت کو چلے جاتے تھے شام ہوئی تو گاؤں شہرِ خموشاں بنا ہوا تھا۔

یہ خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے انسان ہونے پر شکوک ہونے لگے گاؤں ویران پڑا ہوا تھا کون اسے آباد کرے کس کے بچے اس کی گلیوں میں کھیلیں کس کی عورتیں کنویں پر پانی بھریں راہ چلتے مسافر تباہی کا یہ نظارہ آنکھوں سے دیکھتے اور افسوس کرتے۔ نہیں معلوم بیچارے غربت زدوں پر کیا گزری آہ! جو محنت کی کمائی کھاتے اور سر اٹھا کر چلتے تھے اب دوسروں کی غلامی کر رہے ہیں۔

اس طرح ایک پورا سال گذر گیا تب گاؤں کے نصیب جاگے زمین زرخیز تھی

مکانات موجود رفتہ رفتہ ظلم کی یہ داستان پھیکی پڑ گئی۔ منچلے کسانوں کی ہولناک نگاہیں اس پر پڑنے لگیں بلا سے زمیندار ظالم ہے، جابر ہے، بے رحم ہے، ہم اسے منالیں گے تین سال کی پیشگی لگان کا کیا ذکر وہ جیسے خوش ہوگا خوش کریں گے وہ راجہ ہیں ہم ان کے چاکر ہیں زندگی کی کشمکش اور جنگ میں خودداری اور غربت کو نبھانا کیسا مشکل کام ہے دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا بچے اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیئے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گذرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اگل دیا تھا عورتیں خوش تھیں کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے اور داروغہ جی کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آئند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے وہی تزک و احتشام وہی لٹھیتوں کا رسالہ وہی گنڈوں کی فوج گاؤں والوں نے ان کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں شروع کیں موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا لکڑی کے انبار لگا دیے۔ اور دودھ کے حوض بھر دیے ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے ایک سو آدمی ان کی پیشوائی کے لئے دست بستہ کھڑے تھے۔ لیکن پہلی چیز کی فرمائش جو ہوئی وہ لیمو اینڈ برف اسامیوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ پانی کی بوتل اس وقت وہاں آب حیات کے

داموں بک سکتا تھا۔ مگر بے چارے دہقان امیروں کے چونچلے کیا جانیں۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے دم بخود کھڑے تھے چہرے پر خفت اور ندامت تھی ایشور، بات بگڑ گئی ہے اب تم ہی سنبھالو برف کی ٹھنڈک نہ ملی تو ٹھاکر صاحب کے پیاس کی آگ اور بھی تیز ہوئی کڑک کر بولے ''میں شیطان نہیں ہوں کہ بکروں کے خون سے پیاس بجھاؤں۔ مجھے ٹھنڈا برف چاہیے اور یہ پیاس تمہارے اور تمہاری عورتوں کے آنسوؤں سے ہی بجھے گی احسان فراموش کم ظرف میں نے تمہیں زمین دی مکان دیے حیثیت دی اور اس کا صلہ یہ ہے کہ میں کھڑا پانی کو ترستا رہوں۔ تم اس قابل نہیں کہ تمہارے ساتھ رعایت کی جائے کل شام تک میں تم سے کسی آدمی کی شکل اس گاؤں میں نہ دیکھوں۔ ورنہ قہر ہو جائے گا تم جانتے ہو کہ مجھے اپنا حکم دہرانے کی عادت نہیں ہے۔ رات تمہاری ہے جو کچھ لے جا سکو لے جاؤ لیکن شام کو میں کسی کی منحوس صورت نہ دیکھوں۔ رونا چیخنا فضول ہے میرا دل پتھر ہے اور کلیجہ لوہے کا آنسوؤں سے نہیں پسیجتا۔''

اور ایسا ہی ہوا دوسری رات کو سارے گاؤں میں کوئی دیا جلانے والا تک نہ رہا پھولتا پھلتا ہوا گاؤں بھوت کا ڈیرا بن گیا۔

(4)

عرصہ دراز تک یہ واقعہ قرب و جوار کے منچلے قصہ گویوں کے لئے دلچسپیوں کا ماخذ بنا رہا ایک صاحب نے اس پر اپنی طبع موزوں کو جولانیاں بھی دکھائیں۔ بے چارے ٹھاکر صاحب ایسے بدنام ہوئے کہ گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا بہت کوشش کی کہ گاؤں آباد ہو جائے کس کی جان بھاری تھی کہ اس اندھیر نگری میں قدم رکھتا۔

جہاں فریبی کی سزا پھانسی تھی کچھ مزدور پیشہ لوگ قسمت کا جوا کھیلنے آئے مگر چند مہینوں سے زیادہ نہ جم سکے اجڑا ہوا گاؤں کھویا ہوا اعتبار ہے جو بہت مشکل سے جمتا ہے جب کوئی بس نہ چلا تو ٹھاکر صاحب نے مجبور ہو کر اراضی معاف کا عام اعلان کر دیا لیکن اس رعایت نے رہی سہی ساکھ بھی کھو دی تین سال گذر جانے کے بعد ایک روز وہاں بنجاروں کا قافلہ آیا۔ اور پورب طرف سے تاریکی کی لہر بڑھتی چلی آئی تھی۔ بنجاروں نے دیکھا کہ سارا گاؤں ویران پڑا ہوا ہے۔ جہاں آدمیوں کے گھروں کی گدھ اور گیدڑ رہتے تھے اس طلسم کا راز سمجھ میں نہیں آیا۔ مکانات موجود زمین زرخیز سبزہ سے لہراتے ہوئے کھیت اور انسان کا نام نہیں کوئی اور گاؤں قریب نہ تھا۔ وہیں فروکش ہو گئے جب صبح ہوئی بیلوں کے گلوں کی گھنٹیوں نے پھر اپنا نغمہ بیلمیں الاپنا شروع کیا اور قافلہ گاؤں سے کچھ دور نکل گیا تو ایک چرواہے نے جور و جبر کی یہ داستان طویل انہیں سنائی سیر و سیاحت نے انہیں مشکلات کا عادی بنا دیا تھا۔ آپس میں کچھ مشورہ کیا اور فیصلہ ہو گیا ٹھاکر صاحب کے در دولت پر جا پہنچے اور نذرانے داخل کر دیے۔ گاؤں پھر آباد ہو گیا۔

یہ بنجارے بلا کے جفاکش، آہنی ہمت اور ارادے کے لوگ تھے جن کے آتے ہی گاؤں میں لکشمی کا راج ہو گیا پھر گھروں میں سے دھوئیں کے بادل اٹھے کولہواڑوں نے پھر دخانی چادریں زیب تن کیں تلسی کے چبوترے پر پھر چراغ جلے رات کو رنگین طبع نوجوانوں کی الاپیں سنائی دینے لگیں سبزہ زاروں میں پھر مویشیوں کے گلے دکھائی دیے۔ کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے چرواہے کی بانسری کی مدھم اور رسیلی صدا درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی اس قدرتی منظر میں جادو کی

کشش پیدا کرنے لگی۔

بھادوں کا مہینہ تھا کپاس کے پھولوں کی سرخ و سفید ملاحت تل کی اودی بہار اورسن کی شوخ زردی کھیتوں میں اپنے بوقلموں حسن کے جلوے دکھاتی تھی کسانوں کی منڈھیوں اور چھپروں پر بھی گل وثمر کی رنگ آمیزیاں نظر آتی تھیں اس پر پانی کی ہلکی ہلکی پھواریں حسن قدرت کے لئے مشاط کا کام دے رہی تھیں۔ جس طرح عارفوں کے دل نور حقیقت سے لبریز ہوتے ہیں اس طرح ساگر اور تالاب شفاف پانی سے لبریز تھے شاید راجہ اندر کیلاش کی طروات بیز بلندیوں سے اتر کر اب میدانوں میں آنے والے تھے۔ اسی لئے سیر چشم قدرت نے حسن اور برکت اور امید کے توشے خانے کھول دیئے تھے وکیل صاحب کو بھی تمنائے سیر نے گدگدایا۔ جب معمول اپنے رئیسانہ کروفر کے ساتھ گاؤں میں آ پہنچے دیکھا تو قناعت اور فراغت کی برکتیں چاروں طرف نمودار تھیں۔

(5)

گاؤں والوں نے ان کی تشریف آوری کی خبر سنی سلام کو حاضر ہوئے وکیل صاحب نے انہیں اچھے کپڑے پہنے خودداری کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا ان سے بہت خندہ پیشانی سے ملے فصل کی کیفیت پوچھی۔ بوڑھے ہرداس نے ایک ایسے لہجے میں جس سے کامل ذمہ داری اور امامت کی شان ٹپکتی تھی جواب دیا حضور کے قدموں کی برکت سے سب چین ہے کوئی تکلیف نہیں آپ کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہیں آپ کا جس گاتے ہیں ہمارے راجہ اور سرکار جو کچھ ہیں آپ ہیں اور آپ کے لئے جان تک حاضر ہے۔

ٹھاکر صاحب نے تیور بدل کر کہا ''میں اپنی خوشامد سننے کا عادی نہیں ہوں'' بوڑھے ہرداس کی پیشانی پر بل پڑے غرور کو چوٹ لگی بولا ''مجھے بھی خوشامد کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

ٹھاکر صاحب نے اینٹھ کر جواب دیا ''تمہیں رئیسوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں طاقت کی طرح تمہاری عقل بھی بڑھاپے کی نذر ہوگئی''

ہرداس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا غصہ کی حرارت سے سب کی آنکھیں پھیلی اور استقلال کی سردی سے ماتھے سکڑے ہوئے تھے بولا ''ہم آپ کی رعیت ہیں لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دے دیں آبرو نہیں دے سکتے''

ہرداس کے کئی منچلے ساتھیوں نے بلند آواز میں تائید کی ''آبرو جان کے پیچھے ہے'' ٹھاکر صاحب کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی چہرہ سرخ ہوگیا زور سے بولے '' تم لوگ زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ جس طرح گلے میں جھولیاں لٹکائے آئے تھے اسی طرح نکال دیے جاؤ گے میں رپودمن سنگھ ہوں جس نے تم جیسے کتنے ہی ہیکڑوں کو اسی جگہ پیروں سے کچلوا ڈالا ہے یہ کہہ کر انہوں نے رسالے کے سردار ارجن سنگھ کو بلا کر کہا'' ٹھاکر! اب ان چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں کل شام تک ان حشرات سے میرا گاؤں پاک و صاف ہو جائے۔

ہرداس کھڑا ہو گیا غصہ اب چنگاری بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا بولا ''ہم نے اس گاؤں کو چھوڑنے کے لئے نہیں بسایا ہے جب تک جئیں گے اسی گاؤں میں رہیں گے یہیں پیدا ہوں گے اور یہیں مریں گے آپ بڑے آدمی ہیں اور بڑی کی

سمجھ بھی بڑی ہوتی ہے ہم لوگ اکھڑ گنوار ہیں ناحق غریبوں کی جان کے پیچھے نہ پڑیے۔ خون خرابہ ہو جائے گا لیکن آپ کو یہی منظور ہے تو ہماری طرف سے بھی آپ کے سپاہیوں کو چنوتی ہے جب چاہیں دل کے ارمان نکال لیں''

اتنا کہہ کر ٹھاکر صاحب کو سلام کیا اور چل دیا اس کے پیچھے اس کے ساتھی انداز پرغرور کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلے ارجن سنگھ نے ان کے تیور دیکھے سمجھ گیا کہ یہ لوہے کے چنے ہیں لیکن شہدوں کا سرغنہ تھا کچھ اپنے نام کی لاج تھی دوسرے دن شام کے وقت جب رات اور دن میں مڈھ بھیڑ ہو رہی تھی ان دونوں جماعتوں کا سامنا ہوا پھر وہ دھول دھپا ہوا کہ زمین تھرا گئی زبانوں نے منہ کے اندر وہ معر کے دکھائے کہ آفتاب مارے خوف کے پچھم میں جا چھپا تب لاٹھیوں نے سر اٹھایا لیکن قبل اس کے کہ وہ ٹھاکر صاحب کی دعا اور شکریہ کی مستحق ہوں ارجن سنگھ نے دانشمندی سے کام لیا تاہم ان کے چند آدمیوں کے لئے گڑ اور ہلدی پینے کے سامان ہو چکے ہیں۔

وکیل صاحب نے اپنی فوج کی یہ حالت زار دیکھی کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے کسی کے جسم پر گرد جمی ہوئی کوئی ہانپتے ہانپتے بیدم خون بہت کم نظر آیا کیونکہ یہ ایک بے بہا جنس ہے اور اسے ڈنڈوں کی زد سے بچا لیا گیا تھا تو انہوں نے ارجن سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی اور ان کی شجاعت و جانبازی کی خوب داد دی رات کو ان کے سامنے لڈو اور امرتیوں کی ایسی بارش ہوئی کہ یہ سب گرد و غبار دھل گیا صبح کو اس رسالے نے ٹھنڈے گھر کی راہ لی اور قسم کھا گئے کہ اب بھول کر بھی اس گاؤں کا رخ نہ کریں گے۔

تب ٹھاکر صاحب نے گاؤں کے آدمیوں کو چوپال میں طلب کیا ان کے اشارے کی دیر تھی سب لوگ اکٹھے ہو گئے اختیار اور حکومت اگر مسند غرور سے اتر آئے تو دشمنوں کو بھی دوست بنا سکتی ہے جب سب آدمی آ گئے تو ٹھاکر صاحب ایک ایک کر کے ان سے بغل گیر ہوئے اور کہا ’’میں ایشور کا بہت مشکور ہوں کہ مجھے اس گاؤں کے لئے جن آدمیوں کی تلاش تھی وہ لوگ مل گئے آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ یہ گاؤں کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا ہے اس کا سبب یہی تھا وہ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اترتے تھے میں ان کا دشمن نہیں تھا لیکن میری دلی آرزو یہ تھی کہ اس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں جو ظلم و ستم کا مردوں کی طرح سامنا کریں جو اپنے حقوق اور رعائتیوں کی مردوں کی طرح حفاظت کریں جو حکومت کے غلام نہ ہوں جو رعب اور اختیار کی نگاہ تیز دیکھ کر بچوں کی طرح خوف سے سہم نہ جائیں مجھے اطمینان ہے کہ آپ ناموافق ہواؤں اور متلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے میں آج اس گاؤں سے دست بردار ہوتا ہوں آج سے یہ آپ کی ملکیت ہے آپ ہی اس کے زمیندار اور مختار ہیں ایشور سے میری دعا ہے کہ آپ پھولیں پھلیں اور سرسبز ہوں‘‘

ان الفاظ نے دلوں پر تسخیر کا کام کیا لوگ آقا پرستی کے جوش سے مست ہو ہو کر ٹھاکر صاحب کے پیروں سے لپٹ گئے اور کہنے لگے ہم آپ کے قدموں سے جیتے جی جدا نہ ہوں گے آپ سا مربی قدردان اور رعایا پرور بزرگ ہم کہاں پائیں گے جانبازانہ عقیدت اور ہمدردی، وفاداری اور احسان کا ایک بڑا دردناک اور موثر نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو گیا لیکن ٹھاکر صاحب اپنے فیاضانہ ارادہ پر ثابت

قدم رہے اور گو پچاس سال سے زیادہ گزر گئے ہیں لیکن انہیں بنجاروں کے ورثاء ابھی تک موضع صاحب گنج کے معافی دار ہیں عورتیں ابھی تک ٹھاکر رپودمن سنگھ کی پوجا اور منتیں کرتی ہیں اور گو اب اس موقع کے کئی نوجوان دولت اور حکومت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بوڑھے اورا کھڑ ہری داس کے نام پر اب بھی فخر کرتے ہیں اور بھادوں سدی ایکاوشی کے دن اب بھی اس مبارک فتح کی یادگار میں جشن منائے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

خون سفید

پہلی بار: ''زمانہ'' جولائی 1914ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1920ء (پریم بتیسی، دوم)

چیت کا مہینہ تھا لیکن وہ کھلیان جہاں اناج کے سنہرے انبار لگتے تھے جاں بلب مویشیوں کے آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ جن گھروں سے پھاگ اور بسنت کی الاپیں سنائی دیتی تھیں۔ وہاں آج تقدیر کا رونا تھا سارا چوماسہ گزر گیا پانی کی ایک بوند نہ گری جیٹھ میں ایک بار موسلا دھار مہینہ برسا تھا کسان پھولے نہ سمائے خریف کی فصل بو دی لیکن فیاض اندر نے اپنا سارا خزانہ شاید ایک ہی بار لٹا دیا پودے اگے بڑھے پھر سوکھ گئے مرغزاروں میں گھاس نہ جمی بادل آتے گھٹائیں امنڈتیں ایسا معلوم ہوتا کہ جل تھل ایک ہو جائے گا مگر وہ نحوست کی نہیں آرزوؤں کی گھٹائیں تھیں کسانوں نے بہت جپ تپ کیے اینٹ اور پتھر دیویوں کے نام سے پج گئے پانی کی امید میں خون کے پرنالے بہ گئے لیکن اندر کسی طرح نہ پسیجے نہ کھیتوں میں پودے تھے نہ چراگاہوں میں گھاس نہ تالابوں میں پانی عجیب مصیبت کا سامنا تھا جدھر دیکھئے خستہ حالی، افلاس اور فاقہ کشی کے دلخراش نظارے دکھائی دیتے تھے لوگوں نے پہلے گہنے اور برتن گروی رکھے اور تب بیچ ڈالے پھر مویشیوں کی باری آئی اور جب روزی کا کوئی سہارا نہ رہا تب اپنے وطن پر جان دینے والے کسان بیوی بچوں کو لے کر مزدوری کرنے کو نکلے جابجا محتاجوں

اور مزدوروں کی پرورش کے لئے سرکار کی جانب سے امدادی تعمیرات جاری ہوگئی تھیں جسے جہاں سجھتا ہوا ادھر جا نکلا۔

(2)

شام کا وقت تھا جادو رائے تھکا ماندہ خستہ حال آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور بیوی سے مایوسانہ لہجے میں بولا ''درکھاس نامنظور ہوگئی''

یہ کہہ کر آنگن میں زمین پر لیٹ گیا اس کا چہرہ زرد تھا اور آنتیں سکڑی ہوئی تھیں آج دو دن سے اس نے دانے کی صورت نہیں دیکھی گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا گہنے کپڑے برتن بھانڈے سب پیٹ میں سما گئے گاؤں کا ساہوکار نگاہ عصمت کی طرح آنکھیں چرانے لگا صرف تقاوی کا سہارا تھا اس کی درخواست دی تھی لیکن افسوس وہ بھی نامنظور ہوگئی امید کا جھلملاتا ہوا چراغ گل ہوگیا۔

دیوکی نے شوہر کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آیا ہے اسے کیا کھلائے شرم کے مارے وہ ہاتھ پاؤں دھونے کے لئے پانی بھی نہیں لائی جب ہاتھ پاؤں دھو کر وہ منتظر اور گرسنہ انداز سے اس کی طرف دیکھے گا تو وہ اسے کیا کھانے کو دے گی اس نے خود کئی دن سے دانے کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت اسے جو صدمہ ہوا وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے بدرجہا زیادہ سخت تھا عورت گھر کی لکشمی ہے گھر کے آدمیوں کو کھانا پلانا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے اور خواجہ یہ اس کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو لیکن ناداری اور بینوائی سے جو روحانی صدمہ اس کو ہوتا ہے وہ مردوں کو نہیں ہوسکتا۔

یکا یک اس کا بچہ سادھو نیند سے چونکا اور مٹھائیوں کی صبر آزما خواہش سے بھرا

ہوا آ کر باپ سے لپٹ گیا اس بچے نے آج صبح کو چنے کی روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا تھا اور تب سے کئی بار اٹھا اور کئی بار روتے روتے سو گیا چار برس کا نادان بچہ اسے مٹھائیوں اور بارش میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا جادو رائے نے اسے گود میں اٹھالیا اس کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھا اس کی گردن جھک گئی اور بیکسی آنکھوں میں نہ سما سکی۔

(3)

دوسرے دن یہ کنبہ بھی گھر سے نکلا جس طرح مرد کے دل سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا نہیں نکلتی اسی طرح اپنی محنت سے روٹی کمانے والا کسان بھی مزدوری کی کھوج میں گھر سے باہر نہیں نکلتا لیکن فاقہ کشی! آہ تو یہ سب کچھ کر سکتی ہے عزت، غیرت، شرم اور حیا یہ سب چمکتے ہوئے تارے تیری سیاہ گھٹاؤں کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔

صبح کا وقت تھا یہ دونوں غم نصیب گھر سے نکلے جادو رائے نے لڑکے کو پیٹھ پر لیا دیوکی نے وہ جیوائی کی گٹھری سر پر رکھی جس پر افلاس کو بھی ترس آتا دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں دیوکی روتی تھی جادو خاموش تھا گاؤں کے دو چار آدمیوں سے رستے میں مڈبھیڑ ہوئی مگر کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں جاتے ہو کسی کے دل میں ہمدردی باقی نہ تھی۔

سورج ٹھیک سر پر تھا جب یہ لوگ لال گنج پہنچے دیکھا تو میلوں تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے لیکن ہر اک چہرے پر فاقہ کشی اور مصیبت کا ایک دفتر تھا بیساکھ کی وہ جلتی ہوئی دھوپ آگ کے جھونکے زور زور سے ہرہراتے ہوئے چلتے تھے

اور وہاں ہڈیوں کے بے شمار ڈھانچے جن کے بدن پر جامہ عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا وہ مٹی کھودنے میں مصروف تھے گویا مرگھٹ تھا جہاں مردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھودرہے تھے۔

بوڑھے اور جوان مرد اور بچے سب کچھ اس بیکسانہ ہمت اور یاس سے کام میں لگے ہوئے تھے گویا موت اور فاقہ کشی ان کے سامنے بیٹھی ہوئی گھور رہی ہے اس آفت میں نہ کوئی کسی کا دوست تھا نہ ہمدرد۔ رحم، شرافت اور اخلاق یہ سب انسانی جذبات ہیں جن کا خالق انسان ہے قدرت نے جانداروں کو صرف ایک خاصیت عطا کی ہے اور وہ خود غرضی ہے انسانی جذبات جو فارغ البالی کے سنگار ہیں اکثر بیوفا دوستوں کی طرح ہم سے دغا کر جاتے ہیں لیکن یہ فطری خاصیت دم آخر تک ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔

(4)

آٹھ دن گزر گئے شام کا وقت تھا کیمپ کا کام ختم ہو چکا تھا کیمپ سے کچھ دور آم کا ایک گھنا باغ تھا وہیں ایک پیڑ کے نیچے جادو رائے اور دیوکی بیٹھے ہوئے تھے دونوں ایسے خستہ حال تھے کہ ان کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی وہ آزاد کاشتکار نہیں رہے وہ اب فاقہ کش مزدور ہو گئے ہیں۔

جادو رائے نے بچے کو زمین پر سلا دیا اسے کئی دن سے بخار آرہا ہے کنول سا چہرہ مرجھا گیا ہے دیوکی نے اسے آہستہ سے ہلا کر کہا ''بیٹا آنکھیں کھولو دیکھو سانجھ ہو گئی ہے''

سادھو نے آنکھیں کھول دیں بخار اتر گیا تھا بولا ''کیا ہم گھر آ گئے ماں؟''

''گھر کی یاد آ گئی دیوکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے کہا نہیں بیٹا! تم اچھے ہو جاؤ گے تو گھر چلیں گے اٹھ کر دیکھو یہ کیسا اچھا باغ ہے''

سادھو ماں کے ہاتھوں کے سہارے اٹھا اور بولا ''اماں مجھے بڑی بھوک لگی ہے لیکن تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے مجھے کیا کھانے کو دو گی؟''

دیوکی کے کلیجے میں چوٹ لگی ضبط کر کے بولی ''نہیں بیٹا! تمہارے کھانے کو مرے پاس سب کچھ ہے دادا پانی لاتے ہیں تو میں نرم نرم روٹیاں بنائے دیتی ہوں''

سادھو نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور بولا ''اماں میں نہ ہوتا تو تمہیں اتنا دکھ نہ ہوتا''

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگا یہ وہی بے سمجھ بچہ ہے جو ہفتہ دو ہفتہ پہلے مٹھائیوں کے لئے دنیا سر پر اٹھا لیتا تھا افلاس اور فکر نے کیسا تغیر کر دیا ہے یہ مصیبت کے احساس کا اثر ہے کتنا دردناک، کتنا دل شکن۔

اسی اثنا میں کئی آدمی لالٹینیں لئے ہوئے وہاں آئے پھر گاڑیاں آئیں ان پر ڈیرے اور خیمے لدے ہوئے تھے دم کے دم میں وہاں خیمے کھڑے ہو گئے سارے باغ میں چہل پہل نظر آنے لگی دیوکی روٹیاں سینک رہی تھی۔۔۔۔سادھو دھیرے دھیرے اٹھا اور حیرت سے تاکتا ہوا ایک ڈیرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔

(5)

پادری موہن داس خیمے سے باہر نکلے تو سادھو انہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی

صورت پر انہیں ترس آ گیا۔محبت کا دریا امنڈ آیا۔ بچے کو گود میں اٹھایا اور خیمے میں لا کر ایک گدے دار کوچ پر بٹھا دیا تب اسے بسکٹ اور کیلے کھانے کو دیے لڑکے نے اپنے بہترین زمانے یں ان نعمتوں کی صورت نہ دیکھی تھی بخار کی بے چین کرنے والی بھوک لگی ہوئی تھی۔۔۔اس نے خوب سیر ہو کر کھایا اور تب احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پادری صاحب کے پاس جا کر بولا ''تم ہم کو روز ایسی چیز کھلاؤ گے؟''

پادری صاحب اس بھولے پن پر مسکرا کر بولے میرے پاس اس سے بھی اچھی چیزیں ہیں اس پر سادھو رائے نے کہا اب میں روز تمہارے ساتھ رہوں گا اماں کے پاس ایسی چیزیں کہاں وہ تو مجھے چنے کی روٹیاں کھلاتی ہے۔

ادھر دیوکی نے روٹیاں بنائیں اور سادھو کو پکارنے لگی سادھو نے ماں کے پاس جا کر کہا مجھے صاحب نے اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دی ہیں صاحب بڑے اچھے ہیں۔

دیوکی نے کہا ''میں نے تمہارے لئے نرم نرم روٹیاں پکائی ہیں آؤ تمہیں کھلا دوں''

سادھو بولا اب میں نہ کھاؤں گا صاحب کہتے تھے کہ میں روز اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گا میں اب ان کے ساتھ رہوں گا

ماں نے سمجھا لڑکا ہنسی کر رہا ہے اسے چھاتی سے لگا کر بولی ''کیوں بیٹا! ہم کو بھول جاؤ گے میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں؟''

سادھو طفلانہ متانت سے بولا تم تو مجھے روز چنے کی روٹیاں دیتی ہو تمہارے

پاس تو کچھ نہیں ہے صاحب مجھے کیلے اور آم کھلائیں گے یہ کہہ کر وہ پھر خیمے کی طرف بھاگا اور رات کو وہیں سو رہا۔

پادری موہن داس کا وہاں تین دن قیام رہا۔ سادھو دن بھر انہیں کے ساتھ رہتا صاحب نے اسے میٹھی میٹھی دوائیں دیں اس کا بخار بھی جاتا رہا وہ بھولے بھالے کسان صاحب کو دعائیں دیتے بچہ چنگا ہے اور آرام سے ہے۔۔۔۔صاحب کو پرماتما سدا سکھی رکھے۔ انہوں نے بچے کی جان رکھ لی۔

چوتھے دن رات ہی کو پادری صاحب نے وہاں سے کوچ کیا اور صبح کو دیوکی اٹھی تو سادھو کا بھی وہاں پتہ نہ تھا دیوکی نے سمجھا کہیں ٹپکے ڈھونڈھنے گیا ہوگا اس نے جادو سے کہا یہاں للو نہیں ہے اس نے بھی یہی کہا کہیں ٹپکے ڈھونڈنے گیا ہو گا۔

لیکن جب سورج نکل آیا اور کام پر چلنے کا وقت آ پہنچا تب جادو رائے کو کچھ اندیشہ ہوا اس نے کہا "تم یہیں بیٹھی رہنا میں ابھی اسے لیے آتا ہوں"

اس نے قرب و جوار کے سب باغ چھان ڈالے اور دس بجتے بجتے ناکام لوٹ آیا سادھو نہ ملا دیوکی نے زار زار رونا شروع کیا۔

پھر دونوں اپنے لال کی تلاش میں نکلے طرح طرح کے وسواس دل میں آتے تھے۔ دیوکی کو پورا یقین تھا کہ صاحب نے اس پر کوئی منتر ڈال دیا۔ لیکن جادو کو اس منطق کے تسلیم کرنے میں کچھ خفیف سا شک تھا۔ بچہ اتنی دور انجان راستے پر اکیلا نہیں جا سکتا تاہم دونوں گاڑی کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان دیکھتے چلے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سڑک پر آ پہنچے وہاں گاڑی کے بہت سے نشان

تھے خاص لیک کی تمیز نہ ہوسکی گھوڑے کی ٹاپ بھی ایک جھاڑی کی طرف جا کر غائب ہوگئی امید کا سہارا ٹوٹ گیا دوپہر ہوگئی تھی دونوں بے چین، مایوسی سے نیم جاں ہوگئے وہیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے دیوی کی بلاپ کرنے لگی جادو نے غمگساری کا قرض ادا کرنا شروع کیا۔

جب دھوپ کی تیزی ذرا کم ہوئی تو دونوں پھر آگے چلے لیکن امید کی بجائے مایوسی ساتھ تھی گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ امید کا دھندلا نشان غائب ہوگیا تھا۔

شام ہوگئی جا بجا مویشی موت کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے یہ دونوں مصیبت کے مارے ہمت ہار کر درخت کے نیچے بیٹھ گے۔ درخت پر فاختہ کا ایک جوڑا بسیرا کئے ہوئے تھا ان کا ننھا سا بچہ آج ایک شکرے کے چنگل میں پھنس گیا تھا دونوں دن بھر بے چین اڑتے رہے ہمت ہار کر بیٹھ رہے امید میں اضطرات اور بے کلی ہے مایوسی میں تشفی و تسکین دیوی کی اور جادو کی مایوسی میں بھی امید کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لئے وہ بے چین تھے۔

تین دن تک یہ دونوں اپنے کھوئے ہوئے لال کی تلاش کرتے رہے دانہ سے بھینٹ نہیں پیاس سے بے چین ہوتے تو پانی کے دو چار گھونٹ حلق کے نیچے اتار لیتے امید کے بجائے مایوسی کا سہارا تھا ہمت کے بجائے بے ہمتی کا ساتھ اشک اور غم کے سوا کوئی زادراہ نہیں کسی بچے کے پاؤں کے نشان دیکھتے تو ان کے دلوں میں امید و بیم کا ایک طوفان سا اٹھ جاتا۔ لیکن ہر قدم انہیں منزل مقصود سے دور لئے جاتا تھا۔

اس واقعہ کو چودہ سال گزر گئے اور متواتر چودہ سال ملک میں رام کا راج رہا نہ کبھی اندر نے شکایت کا موقع دیا امنڈی ہوئی ندی کی طرح انبار خانے غلے سے لبریز تھے اجڑے گاؤں آباد ہو گئے مزدور کسان ہو بیٹھے کسان جائیداد کی تلاش میں دوڑتے۔

وہی چیت کے دن تھے کھلیانوں میں اناج کے پہاڑ کھڑے تھے بھاٹ اور بھکاری کسانوں پر دنیا کی نعمتوں کی بارش کرتے نظر آتے تھے سناروں کے دروازے پر سارے دن اور آدھی رات تک گاہکوں کا جمگھٹ رہتا تھا درزی کی سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی اکثر دروازوں پر گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔

زمانے نے جادو رائے کے ساتھ بھی مساعدت کی اس کے گھر پر اب بجائے کھپریل کے پکی چھت ہے دروازے پر خوش قامت بیلوں کی جوڑی بندھی ہوئی ہے وہ اب اپنی بہل میں سوار ہو کر بازار جایا کرتا ہے اس کا جسم اب اتنا سڈول نہیں ہے پیٹ پر فارغ البالی کا خاص اثر نظر آتا ہے بال بھی سفید ہو چلے ہیں دیوکی کا شمار بھی گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں میں ہوتا ہے اور نسوانی مناقشات میں اکثر اس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں جب وہ کسی پڑوسن کے گھر جاتی ہے تو وہاں کی بہوئیں خوف سے تھرتھرانے لگتی ہیں اس کی نگاہ تیز اور زبان شعلہ ریز کی سارے گاؤں میں دھاک بندھی ہوئی ہے مہین کپڑے اب اسے نہیں بھاتے لیکن گہنوں کے بارے میں وہ اتنی کفایت شعار نہیں ہے۔

ان کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے کم روشن نہیں ہے ان کے دو اولادیں ہیں لڑکا مادھو سنگھ اب کھیتی باڑی کے کام میں باپ کی مدد کرتا ہے لڑکی کا نام شوگوری ہے وہ

اب ماں کے ساتھ چکی پیستی ہے اور خوب گاتی ہے برتن دھونا اسے پسند نہیں ہے لیکن چوگا لگانے میں مشاق ہے۔ اس کی گڑیوں کا کبھی بیاہ سے جی نہیں بھرتا آئے دن شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔

گم گشتہ سادھو کی یاد تازہ ہے اور کبھی رلائے بغیر نہیں رہتا۔ دیوکی دن بھر اس لاڈلے بیٹے کی سدھ میں بے قرار رہتی ہے۔

شام ہوگئی تھی بیل دن بھر کے تھکے سر جھکائے آتے تھے پجاریوں نے ٹھاکر دوارے میں گھنٹہ بجانا شروع کیا آج کل فصل کے دن ہیں روز پوجا ہوتی ہے جادو رائے ناریل پی رہے تھے شوگوری راستے میں کھڑی ان بیلوں کو کوس رہی تھی جو اس کے عالیشان محل کی ذرا بھی عزت نہ کرکے اسے روندتے چلے جاتے تھے۔

ناقوس اور گھنٹے کی آواز سنتے ہی جادو رائے چرنا مرت لینے کے لئے اٹھے کہ یکا یک ایک شریف نوجوان، بھونکتے ہوئے کتوں کو دھتکارتا۔ بائیسکل کو ہاتھوں سے دھکیلتا ہوا ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ جھک کر قدموں پر سر رکھ دیا جادو رائے نے غور سے دیکھا اور تب دونوں لپٹ گئے مادھو بھوچکا ہو کر بائیسکل کو دیکھنے لگا شوگوری روتی گھر میں بھاگ گئی دیوکی سے بولی دادا کو صاحب نے پکڑ لیا ہے دیوکی گھبرائی ہوئی باہر آئی سادھو اس دیکھتے ہی پاؤں پر گر پڑا دیوکی لڑکے کو چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگی گاؤں کے مرد اور عورتیں بچے جمع ہو گئے میلہ سا لگ گیا۔

(7)

سادھو نے کہا ''ماتا جی اور پتا جی! مجھ بدنصیب سے جو کچھ قصور ہوا ہوا سے

معاف کیجئے میں نے اپنی نادانی سے خود بہت تکلیفیں اٹھائیں اور اب آپ کو بہت دکھ دیا لیکن اب مجھے اپنی گود میں لیجئے''

دیوکی نے رو کر کہا جب تم ہم کو چھوڑ کر بھاگے تھے ہم لوگ تمہیں تین دن تک بے دانہ بے پانی ڈھونڈتے رہے جب نراش ہو گئے تو اپنے نصیبوں کو رو رو کر بیٹھ گئے روتے روتے ایک یگ بیت گیا بتاؤ بیٹا! تم کیسے بھاگے اور کہاں رہے۔

سادھو نے ندامت آمیز محبت سے جواب دیا ماتا جی حال کیا کہوں میں پہر رات رہے اٹھ کر بھاگا۔ پادری صاحب کے پڑاؤ کا پتہ شام ہی کو پوچھ لیا تھا بس پوچھتا ہوا دوپہر کو ان کے پاس پہنچ گیا صاحب نے مجھے سمجھایا کہ گھر لوٹ جاؤ لیکن میں راضی نہ ہوا تب انہوں نے مجھے پونا بھیج دیا میری طرح سینکڑوں لڑکے تھے وہاں بسکٹ اور نارنگیوں کا کیا ذکر اب مجھے آپ لوگوں کی یاد آئی اور میں اکثر روتا مگر بچپن کی عمر تھی دھیرے دھیرے انہی لڑکوں میں ہل مل گیا جب سے ہوش آیا اپنا پرایا سمجھنے لگا ہوں تب سے اپنی نادانی پر ہاتھ ملتا رہا ہوں رات دن آپ لوگوں کی رٹ لگی ہوئی تھی آج آپ لوگوں کی دعا سے وہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا بہت دن تک اناتھ رہا اب مجھے اپنی سیوا میں رکھیے میں محبت اور پیار کا بھوکا ہوں مدتوں سے مجھے یہ نعمت میسر نہیں ہوئی وہ نعمت مجھے دیجئے۔

گاؤں کے بزرگ جمع تھے بوڑھے جگن سنگھ بولے ''تو کیوں بیٹا! تم اتنے دنوں پادریوں کے ساتھ رہے انہوں نے تم کو بھی پادری بنا لیا ہوگا؟''

سادھو نے سر جھکا کر کہا ''جی ہاں یہ تو ان کا دستور ہی ہے''

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف دیکھ کر کہا ''یہ بڑی کٹھن بات ہے''

ساد ھو بولا برادری جو پرائشچت کرائے گی میں شوق سے پورا کروں گا مجھ سے جو کچھ برادری کا اپرادھ ہوا ہے نادانی میں ہوا ہے پھر بھی سزا کے لئے تیار ہوں

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور دوراندیشانہ انداز سے بولے "ہندو دھرم میں ایسا کبھی نہیں ہوا یوں تمہارے ماں باپ چاہے تمہیں اپنے گھر میں رکھ لیں تم ان کے لڑکے ہو مگر برادری اس کام میں شریک نہ ہوگی بولو جادو رائے کیا کہتے ہو تمہارے من کی بات بھی تو معلوم ہو۔"

جادو رائے بڑے دبدھے میں پڑا ہوا تھا ایک طرف بیٹے کی محبت کھینچتی تھی دوسری طرف برادری کا خوف دامن گیر تھا جس لڑکے کے لئے روتے مدتیں گزر گئیں آج وہی کھڑا سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے کہتا ہے پتا جی! مجھے اپنی گود میں لے لیجئے اور میں پتھر کے دیوتا کی طرح خاموش ہوں افسوس ان بے رحم بھائیوں کو کیا کروں کیسے سمجھاؤں۔

لیکن ماں کی مامتا نے جوش مارا دیوکی سے ضبط نہ ہوا اس نے بے باکی سے کہا "میں اپنے لال کو گھر میں رکھوں گی کلیجے سے لگاؤں گی اتنے دنوں کے بعد ہم نے پایا ہے اسے نہیں چھوڑ سکتی۔"

جگن سنگھ تیز ہو کر بولے "چاہے برادری چھوٹ جائے"

دیوکی نے بھی تیز ہو کر جواب دیا "ہاں چاہے برادری چھوٹ جائے لڑکے بالوں ہی کے لئے آدمی برادری کی آڑ پکڑتا ہے جب لڑکا ہی نہ رہا تو برداری ہمارے کس کام آئے گی۔"

اس پر کئی ٹھاکر لال لال آنکھیں نکال کر بولے "ٹھکرائن! برادری کی خوب

مرجاد کرتی ہو لڑکا چاہے کسی راستے پر جائے برادری چوں نہ کرے ایسی برادری کہیں اور ہو گی ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر یہ لڑکا تمہارے گھر میں رہا تو برادری بھی بتادے گی کہ وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔"

جگن سنگھ کبھی کبھی جادو رائے سے قرض لیا کرتے تھے۔ مصلحت آمیز لہجے میں بولے بھائی! برادری یہ تھوڑا کہتی ہے کہ لڑکے کو گھر سے نکال دو لڑکا اتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے ہماری سر آنکھوں پر رہے بس ذرا کھانے پینے اور چھوت چھات کا بچاؤ رہنا چاہئے بولا جادو بھائی اب برادری کو کہاں تک دبانا چاہتے ہو۔

جادو رائے نے سادھو کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کر کہا "بیٹا، جہاں تم نے ہمارے ساتھ اتنا سلوک کیا ہے وہاں جگن بھائی کی بات مان لو"

سادھو نے کسی قدر ناملائم لہجے میں کہا "کیا مان لوں یہی کہ اپنوں میں غیر بن کر رہوں ذلت اٹھاؤں مٹی کا گھڑا بھی میرے چھونے سے ناپاک ہو جائے نہ! یہ میری ہمت سے باہر ہے میں اتنا بے حیا نہیں ہو"

جادو رائے کو لڑکے کی یہ سخت گیری ناگوار گزری وہ چاہتے تھے کہ اس وقت برادری کے لوگ جمع ہیں ان کے سامنے اس طرح سمجھوتہ ہو جائے پھر کون دیکھتا ہے کہ ہم اسے کس طرح رکھتے ہیں چڑھ کر بولے اتنی بات ماننی پڑے گی۔

سادھو رائے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے باپ کی اس بات میں انہیں بے دردی کا رنگ نظر آیا بولے میں آپ کا لڑکا رہوں گا آپ کی محبت اور شفقت کی آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے میں اپنے گھر میں رہنے آیا ہوں اگر یہ ممکن نہیں ہے تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے بھاگ جاؤں

جن کے خون سفید ہو گئے ہیں ان کے درمیان رہنا فضول ہے۔

دیوکی نے رو کر کہا ”للو! میں تمہیں اب نہ جانے دوں گی“

سادھو کی آنکھیں بھر آئیں لیکن مسکرا کر بولا ”میں تو تیری تھالی میں کھاؤں گا

دیوکی نے اس کی طرف مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور بولی میں نے تو تجھے چھاتی سے دودھ پلایا ہے تو میری تھالی میں ہی کھائے گا تو کیا میرا بیٹا ہی تو ہے کوئی اور تو نہیں ہو گیا۔“

سادھو ان باتوں کو سن کر متوالا ہو گیا ان میں کتنا پیار کتنا اپنا پن تھا بولا آیا تو اسی ارادے سے تھا کہ اب کہیں نہ جاؤں گا لیکن برادری نے میرے سبب سے تمہیں ہٹیا کر دیا تو مجھ سے نہ سہا جائے گا مجھ سے ان گنوار جاہلوں کا غرور برداشت نہ ہو گا اس وقت مجھے جانے دو جب موقع ملے گا درشن کرنے آیا کروں گا تمہاری محبت دل سے نہیں مٹ سکتی لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ میں اس گھر میں رہوں الگ کھانا کھاؤں الگ بیٹھ کر اس لئے مجھے معاف کرنا۔

دیوکی گھر میں سے پانی لائی سادھو منہ ہاتھ دھونے لگا شو گوری نے ماں کا اشارہ پایا تو ڈرتے ڈرتے سادھو کے پاس گئی سادھو نے ادب سے ڈنڈوت کی سادھو نے پہلے ان دونوں کو تعجب سے دیکھا پھر اپنی ماں کو مسکراتے دیکھ کر سمجھ گیا دونوں لڑکوں کو چھاتی سے لگایا اور تینوں بھائی بہن پریم سے ہنسنے کھیلنے لگے ماں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھتی تھی اور امنگ سے پھولی نہ ساتی تھی۔

جل پان کر کے سادھو نے بائیسکل سنبھال لی اور ماں باپ کے سامنے سر جھکا کر چل کھڑا ہوا وہیں جہاں سے وہ بیزار ہو کر آیا تھا اسی دائرے میں جہاں سب

بیگانے تھے کوئی اپنا نہ تھا۔

دیوکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور جادو رائے آنکھوں میں آنسو بھرے جگر میں ایک اینٹھن سی محسوس کرتا ہوا سوچتا تھا ہائے! میرا لال یوں مجھ سے الگ ہوا جاتا ہے ایسا لائق اور ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور صرف اس لئے کہ ہمارے خون اب سفید ہو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

خاک پروانہ

پہلی بار: زمانہ ستمبر / اکتوبر 1914ء میں ''شامت اعمال'' کے عنوان سے شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1928ء (خاک پروانہ)

آہ! بدقسمت میں! میرے شامت اعمال نے آج یہ دن دکھائے کہ ذلت بھی میرے اوپر ہنستی ہے اور یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں کیا شیطان کے سر الزام کیوں دوں؟ قسمت کو صلواتیں کیوں سناؤں شدنی کو کیوں روؤں؟ جو کچھ میں نے دیدہ دانستہ کیا ابھی ایک سال گزرا، جب میں خوش نصیب تھا اقبال میرا خادم اور ثروت میری کنیز تھی دنیا کی نعمتیں میرے روبرو دست بستہ حاضر تھیں لیکن آج رسوائی اور نکبت میرے حال زار پر افسوس کرتی ہے میں عالی خاندان تھا اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ، فارسی کا ملا، سنسکرت کا پنڈت، انگریزی کا گریجویٹ اپنے منہ میاں مٹھو کیا بنوں، لیکن حسن ظاہر سے مجھے قابل رشک حصہ ملا تھا غرض ایک انسان کو خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے برکات کی ضرورت ہوسکتی ہے، وہ سب مجھے حاصل تھیں صحت کا یہ حال کہ مجھے کبھی سر درد کی بھی شکایت نہیں ہوئی فطن کی سیر، دریا کی دل فریبیاں، کہسار کے نظارے ان شادمانیوں کا ذکر ہی تکلیف دہ ہے کیا عیش اور مسرت کی زندگی تھی۔

آہ! یہاں تک تو اپنا درد دل سنا سکتا ہوں لیکن اس کے آگے پھر مہر خاموشی لگی

ہوئی ہے ایک عصمت مآب وفا شعار اور شوہر پرست بیوی اور وہ خوب صورت
گلاب کے پھول سے بچے انسان کے لئے جن خوشبوؤں، آرزوؤں، حوصلوں اور
دلفریبیوں کے مخزن ہو سکتے ہیں ان کا ذکر تحصیل ہے میں اس قابل نہیں کہ اس
پاکیزہ صفت خاتون کا نام زبان پر لاؤں میں اس قابل نہیں کہ اپنے تئیں ان لڑکوں
کا باپ کہہ سکوں مگر وائے نصیب، میں نے ان بہشتی نعمتوں کی قدر نہ کی جس
عورت نے میرے حکم اور اپنی خواہش میں کبھی امتیاز نہ کیا، جو باوجود میری لا
ابالیوں کے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی جس کا غصہ کبھی آنکھوں سے آگے
نہ بڑھنے پایا۔ غصہ کیا تھا، کنوار کی برکھا تھی وہ چار ہلکی ہلکی بوندیں گریں اور پھر
آسمان صاف ہو گیا اپنے نشہ، دیوانگی میں میں نے اس دیوی کی قدر نہ کی میں نے
اسے جلایا، رلایا، تڑپایا، میں نے اس کے ساتھ دغا کی آہ! جب میں دو دو بجے
رات کو گھر لوٹا کرتا تھا تو مجھے کیسے کیسے بہانے سوجھتے تھے نت نئے حیلے گھڑتا تھا
شاید طالب علمی کے زمانے میں جب نیند کی دلفریبیاں مدرسہ جانے کی اجازت نہ
دیتی تھیں، اس وقت بھی ذہن رسا نہ تھا اور کیا اس عفت کی دیوی کو میری باتوں پر
یقین نہ آتا تھا وہ بھولی تھی مگر ایسی سادہ لوح نہ تھی میری پر خمار آنکھیں اور میرے
سطحی جذبات اور میرے مصنوعی اظہار محبت کا راز کیا اس سے پوشیدہ رہ سکتا تھا
لیکن اس کے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی تھی کوئی کمینہ خیال اس کی زبان پر
نہیں آ سکتا تھا وہ ان باتوں کا ذکر کر کے یا اپنے شکوک کا علانیہ اظہار کر کے
ہمارے پاکیزہ تعلقات میں کشیدگی یا بدمزگی پیدا کرنا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی
مجھے اس کے خیالات اس کی پیشانی پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے ان بدمزگیوں

کے مقابلے میں اسے جلنا اور رونا زیادہ پسند تھا شاید وہ سمجھتی تھی کہ میرا نشہ خود بخود اتر جائے گا کاش اس شرافت کے بدلے اسے کچھ کم ظرفی اور اوچھے پن میں دخل ہوتا کاش وہ اپنے حقوق کو اپنے ہاتھ میں رکھنا جانتی کاش وہ اتنی غریب اور بے عذر نہ ہوتی کاش وہ اپنے اندرونی جذبات کو چھپانے میں اتنی مشاق نہ ہوتی کاش وہ اتنی مکار نہ ہوتی لیکن میری مکاری اور اس کی مکاری میں کتنا تفاوت تھا میری مکاری حرام کاری تھی اس کی مکاری نفس کشی اور قربانی تھی۔

ایک روز میں اپنے کام سے فرصت پا کر شام کے وقت تفریح کے لئے آنند باڑیکا میں جا پہنچا اور سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ کر مچھلیوں کی خوش فعلیوں کا تماشا دیکھنے لگا دفعتہً نگاہ اٹھی تو میں نے ایک عورت کو بیلے کی جھاڑیوں میں پھول چنتے دیکھا اس کے کپڑے میلے تھے اور بہ جز عالم شباب کی تازگی اور غرور کے اس کے چہرے میں کوئی خاص صفت نہ تھی اس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور پھر اپنے پھول چننے میں مصروف ہوگئی گویا اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں اس کے اس انداز نے خواہ وہ سادگی ہی کیوں نہ ہو میری آتش شوق کو تیز کیا میرے لیے یہ ایک نئی بات تھی کہ کوئی عورت یوں دیکھے گویا اس نے دیکھا ہی نہیں میں اٹھا اور آہستہ آہستہ کبھی زمین اور کبھی آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بیلے کی جھاڑیاں کے پاس جا کر خود بھی پھول چننے لگا اس جسارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالن کی لڑکی وہاں سے تیزی کے ساتھ باغ کے دوسرے حصہ میں چلی گئی۔

اس دن سے معلوم نہیں وہ کونسی کشش تھی جو مجھے روز شام کے وقت آنند باڑیکا کی طرف لے جاتی۔ یہ محبت ہرگز نہیں تھی اگر مجھے اس وقت خدانخواستہ اس دو

ثیزہ کی بابت کوئی الم ناک خبر ملتی تو شاید میری آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلتے جوگیا بھیس لینے کا تو ذکر ہی فضول ہے میں روز جاتا اور نئے نئے روپ بھر کر جاتا، لیکن جس قدرت نے مجھے اچھے خط وخال دیے تھے اسی نے مجھے چرب زبانی سے محروم رکھا تھا۔ میں روز جاتا اور روز لوٹ آتا۔ منزل عشق میں ایک قدم بھی طے نہ ہوتا تھا، ہاں اتنا ضرور ہو گیا کہ اسے پہلی سی جھجک نہ رہی۔

آخر اس خاموشانہ پالیسی کو سرسبز نہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ ایک روز میں نے اپنے ساتھ اپنے شریر بلڈاگ ٹامی کو بھی لیتا گیا۔ جب شام ہوگئی اور وہ غارت گر صبر وشکیب پھولوں سے دامن بھر کر اپنے مکان کی طرف چلی تو میں نے اپنے بلڈاگ کو آہستہ سے اشارہ کر دیا بل ڈاگ اس کی طرف بال کی طرح جھپٹا۔ پھول متی نے ایک چیخ ماری۔ دو چار قدم دوڑی اور تب زمین پر گر پڑی۔ اب میں چھڑی ہاتھوں میں ہلاتا بل ڈاک کی طرف خشم ناک نگاہوں سے دیکھتا اور ہائیں ہائیں چلاتا ہوا دوڑا اور اسے زور سے دو تین ڈنڈے لگائے پھر میں نے بکھرے ہوئے پھولوں کو سمیٹا سہمی ہوئی عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا اور بہت ندامت آمیز اور افسوس ناک انداز سے بولا۔

”یہ کتا بڑا بدمعاش ہے اب اسے اپنے ساتھ کبھی نہ لاؤں گا تمہیں اس نے کاٹ تو نہیں لیا۔“

پھول متی نے چادر سے سر کو ڈھانکتے ہوئے کہا تم نہ آجاتے تو وہ مجھے نوچ ڈالتا میرے تو جیسے من من بھر کے پیر ہو گئے تھے میرا کلیجہ دھڑک رہا ہے۔

یہ نشانہ تیر بہدف ثابت ہوا خموشی کی مہر ٹوٹ گئی حرف وشکایت کا سلسلہ قائم

ہوا باندھ میں ایک شگاف ہو جانے کی دیر تھی پھر تو نفس کی لہروں نے خود بخود عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے جیسے جیسے جال پھیلائے جیسے جیسے سوانگ رچے وہ رنگین طبع اصحاب خوب جانتے ہیں اور یہ سب کیوں؟ محبت سے نہیں صرف ذرا دیر دل کو خوش کرنے کے لئے صرف اس کے گداز جسم اور بھولے پن پر رتجھ کر یوں میں بہت ادنے مذاق کا انسان نہیں ہوں شکل و شباہت میں پھول متی کا اندو سے مقابلہ نہ تھا وہ حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی شعرا نے حسن کے جو معیار قائم کر رکھے ہیں، وہ سب وہاں نظر آتے تھے، لیکن نہ معلوم کیوں میں نے پھول متی کی گھسی ہوتی آنکھوں اور پھولے ہوئے رخساروں اور موٹے موٹے ہونٹوں کی طرف اپنے دل کا زیادہ کھچاؤ دیکھا۔ آمد ورفت زیادہ ہوئی اور مہینہ بھر بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ میں اس کا بندہ محبت بن بیٹھا۔ مجھے اب گھر کی سادہ زندگی میں کوئی لطف نہ آتا تھا لیکن جوں جوں گھر سے بیزار ہوتا تھا توں توں بیوی کی ظاہر داری اور خاطر داری زیادہ کرتا تھا۔ میں اس کی فرمائشوں کا منتظر رہتا اور کبھی اس کا دل دکھانے والا کلمہ میری زبان پر نہ آتا۔ شاید میں اپنی اندرونی بے التفاتی کو ظاہر داری کے پردہ میں چھپانا چاہتا تھا۔

رفتہ رفتہ دل کی یہ کیفیت متغیر ہوئی اور بیوی کی طرف سے افسردگی اور بے تعلقی کا اظہار ہونے لگا گھر میں کپڑے نہیں ہیں لیکن مجھے دریافت حال کی توفیق نہ ہوتی حق یہ ہے کہ مجھے اب اس کی خاطر داری کرتے ہوئے ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اس کی خاموشی کی دیوار منہدم نہ ہو جائے اور اس کے اندرونی جذبات زبان پر نہ آ جائیں۔ یہاں تک کہ میں نے صرف خانگی ضروریات کی

طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

اب میرا دل اور جان اور مال و زر سب پھول متی کے لئے وقف تھا۔ میں خود کبھی زرگر کی دکان پر نہ گیا تھا، لیکن آج کل کوئی مجھے پہر رات گئے ایک مشہور سنار کے مکان پر بیٹھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ بزاز کی دکان بھی میرے لئے دل چسپی کا باعث بن گئی۔

(2)

ایک روز شام کے وقت اپنے حسب معمول میں آنند باٹیکا میں محو سیر تھا اور پھول متی سولہوں سنگار کیے میرے سنہرے اور روپہلے تحائف دے لدی ہوئی ایک ریشمی ساری زیب تن کیے باغ کے روشوں میں پھول توڑ رہی تھی بلکہ یوں کہو اپنی چٹکیوں میں میرے دل کو مسل رہی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس وقت نشہ حسن سے پھیل گئی تھیں اور ان میں شوخی و تبسم کی جھلک نظر آتی تھی۔

دفعتہً مہاراجہ صاحب بھی اپنے چند احباب کے ساتھ موٹر پر سوار آ پہنچے میں انہیں دیکھتے ہی پیشوائی کے لئے دوڑا اور آداب بجالایا۔ غریب پھول متی مہاراجہ صاحب کو پہچانتی تھی، لیکن اسے بجز ایک گھنے کنج کے اور کوئی چھپنے کی جگہ نہ مل سکی مہاراجہ صاحب چلے تو حوض کی طرف لیکن میری نحوست اور شومی تقدیر انہیں اسی روش پر لے چلی جدھر پھول متی چھپی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مہاراجہ صاحب نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا اور بولے ''یہ کون عورت ہے؟''

سب لوگ میری طرف پر سوال نگاہوں سے تاکنے لگے اور مجھے بھی اس وقت

یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس سوال کا جواب میں ہی دوں ورنہ پھول متی نہ جانے کیا آفت ڈھائے ایک انداز لاپروائی سے بولا ''اسی باغ کے مالی کی لڑکی ہے، یہاں پھول توڑنے آئی ہوگی۔''

پھول متی شرم اور خوف کے مارے زمین میں دھنسی جاتی تھی مہاراجہ صاحب نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا، اور تب شبہ آمیز انداز سے میری طرف دیکھ کر بولے ''یہ مالی کی لڑکی ہے؟''

میں اس کا کیا جواب دیتا اسی اثنا میں کم بخت مالی بھی اپنی پھٹی ہوئی پاگ سنبھالتا، ہاتھ میں کدال لئے دوڑتا ہوا آیا اور سر کو گھٹنوں سے ملا کر تعظیم بجا لایا مہاراج نے ذرا تیز لہجہ میں پوچھا ''یہ تیری لڑکی ہے''

مالی کے ہوش اڑ گئے کانپتا ہوا بولا ''ہجور''

مہاراج ''تیری تنخواہ کیا ہے؟''

درجن ؟؟ہجور پانچ روپے

مہاراج ''یہ لڑکی کنواری ہے یا بیاہی ؟''

درجن ''ہجور ابھی کنواری ہے''

مہاراج نے خشم ناک ہو کر کہا ''یا تو چوری کرتا ہے، یا ڈاکہ مارتا ہے، ورنہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ تیری لڑکی امیر زادی بن کر رہ سکے تجھے اسی وقت اس کا جواب دینا ہوگا، ورنہ میں تجھے پولیس کے حوالے کردوں گا ایسے چال چلن کے آدمی کو میں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا''

مالی کی تو سٹی بندھ گئی اور میری یہ حالت ہوگئی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں دنیا

نظروں میں تاریک معلوم ہوتی تھی میں سمجھ گیا کہ آج میری شامت سر پر سوار ہے وہ مجھے بیج دبن سے اکھاڑ کرتب دم لے گی مہاراجہ صاحب نے مالی کو زور سے ڈانت کر پوچھا ''تو خاموش کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟''

درجن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جب ذرا آواز سنبھلی تو بولا ''ہجور! باپ دادا سے سرکار کا نمک کھاتا ہوں اب میرے بڑھاپے پر دیا کیجئے یہ سب میرے پھوٹے نصیبوں کا کھیل ہے دھرماؤمار! اس چھوکری نے میری ناک کٹوا دی کل کا نام مٹا دیا اب میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں اس کو سب طرح سمجھا بجھا کر ہار گئے لیکن میری باتوں کو سنتی ہی نہیں تو کیا کروں۔ ہجور ماں باپ ہیں، آپ سے کیا پردہ ہے اسے اب امیروں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے اور آج کل کے رئیسوں اور امیروں کا کیا کروں دین بندھو سب جانتے ہیں''

مہاراجہ صاحب نے ذرا دیر غور کر کے پوچھا کیا اس کا کسی سرکاری ملازم سے تعلق ہے؟

درجن نے سر جھکا کر کہا ''ہجور''

مہاراجہ صاحب ''وہ کون آدمی ہے تمہیں اسے بتلانا ہوگا''

درجن ''مہاراج جب پوچھیں گے، بتلا دوں گا سانچ کو آنچ نہیں''

میں نے سمجھا تھا کہ شاید اسی وقت سارا راز طشت از بام ہوا جاتا ہے، لیکن مہاراجہ صاحب نے اپنے دربار کے کسی ملازم کی عزت کو اس طرح مٹی میں ملانا مناسب نہیں سمجھا وہ وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے حوض کے پاس آئے اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے ساتھ لیے ہوئے موٹر پر بیٹھ کر محل کی طرف چلے۔

(3)

اسی منحوس واقعے کے ایک ہفتہ کے بعد ایک روز میں دربار سے لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی اسے دیکھ کر میں کھٹکا اس کے چہرے پر وہ بناوٹی بھولا پن تھا جو کٹنیوں کے چہرے کی نمایاں صفت ہے میں نے اسے ڈانٹ کر پوچھا ''تو کون ہے؟ یہاں کیوں آئی ہے؟''

بڑھیا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر میری بلائیں لیں اور بولی ''بیٹا! ناراض نہ ہو غریب بھکارنی ہوں مالکن کا سہاگ بھرپور رہے، اسے جیسا سنتی تھی ویسا ہی پایا''

یہ کہہ کر اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور باہر چلی گئی میرے غصے کی حرارت بڑھی میں نے گھر جا کر پوچھا ''یہ کون عورت آئی تھی؟''

میری بیوی نے سر جھکائے ہوئے آہستہ سے جواب دیا ''کیا جانوں، کوئی بھکارنی تھی''

میں نے کہا ''بھکارنیوں کی صورت ایسی نہیں ہوتی یہ تو مجھے کٹنی سی نظر آتی ہے صاف صاف بتاؤ اس کے یہاں آنے کا مطلب کیا تھا؟''

لیکن بجائے اس کے کہ ان شبہ آمیز باتوں کو سن کر میری بیوی غرور سے سر اٹھائے اور میری طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر اپنی صاف دلی کا ثبوت دے اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا میں اس کے پیٹ میں تھوڑے ہی بیٹھی تھی بھیک مانگنے آئی تھی، بھیک دی کسی کے دل کا حال کوئی کیا جانے؟

اس کے لہجہ اور انداز سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ جتنا زبان سے کہتی ہے، اس سے بہت زیادہ اس کے دل میں ہے افترا پردازی میں وہ ابھی نو مشق تھی ورنہ تریا چلتر کی

تھاہ کسے ملتی ہے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں تھر تھرا رہے تھے میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ اا ور اس کے سر کو اوپر اٹھا کر نہایت متین غصہ سے بولا اندو، تم جانتی ہو کہ مجھے تمہارا کتنا اعتبار ہے، لیکن اگر تم نے اسی وقت سارا واقعہ بے کم و کاست نہ بیان کیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ تمہارا انداز بتاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے یہ خوب سمجھ رکھو کہ میں اپنی عزت کو تمہاری اور اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں میرے لئے یہ ڈوب مرنے کی جگہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے اس قسم کی باتیں کروں اس کی جانب سے میرے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔ مجھے اب زیادہ صبر کی گنجائش نہیں ہے، بولو، کیا بات تھی۔

اندومتی میرے پاؤں پر گر پڑی اور رو کر بولی ''میرا قصور معاف کرو''

میں نے گرج کر کہا ''وہ کونسا قصور ہے؟''

اندومتی نے سنبھل کر جواب دیا ''تم اپنے دل میں اس وقت جو خیال کر رہے ہو، اسے ایک لمحے کے لئے بھی وہاں مت رہنے دو، ورنہ سمجھ لو کہ آج ہی اس زندگی کا خاتمہ ہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری طرف سے ایسے خیال رکھتے ہو میرا پرماتما جانتا ہے کہ تم نے میرے اوپر جو ظلم کئے ہیں، انہیں میں نے کس طرح برداشت کیا ہے اور اب بھی سب کچھ جھیلنے کے لئے تیار ہوں میرا سر تمہارے پیروں پر ہے جس طرح رکھو گے رہوں گی، لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ تم جیسے خود ہو ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہو مجھ سے خطا ضرور ہوئی ہے، لیکن اس خطا کی یہ سزا نہیں کہ تم مجھ پر ایسے شک کرو۔ میں نے اس عورت کی باتوں میں آ کر اس سے اپنے گھر کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا میں سمجھتی تھی کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے، لیکن کچھ تو

اس عورت کی ہمدردی اور کچھ میرے اندر سلگتی ہوئی آگ نے مجھ سے یہ حماقت کروائی اور اس کے لئے تم جو سزا دو، وہ میرے سر اور آنکھوں پر ہے۔''

میرا غصہ دھیما ہوا بولا ''تم نے اس سے کیا کہا؟''

اندومتی نے جواب دیا'' گھر کا جو کچھ حال ہے تمہاری بے وفائی، لاپروائی، تمہارا گھر کی ضروریات کی فکر نہ رکھنا اپنی بے وفائی کو کیا کہوں میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ ادھر تین مہینہ سے انہوں نے گھر کے لئے کچھ خرچ بھی نہیں دیا اور اس کا وبال میرے زیوروں پر پڑا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ان تینوں مہینوں میں میرے ساڑھے چار سو روپے کے زیور بک گئے نہ معلوم کیوں میں یہ سب کچھ کہہ گئی جب انسان کا دل جلتا ہے تو زبان تک آنچ آ ہی جاتی ہے مگر مجھ سے ہی کچھ خطا ہوئی اس سے کئی گنا سخت سزا تم نے مجھے دی میرا بیان لینے کا بھی صبر نہ ہوا خیر تمہارے دل کی کیفیت معلوم ہو گئی تمہارا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے تمہیں مجھ پر وشواس نہیں رہا ورنہ ایک بھکاری عورت کے گھر سے نکلنے پر تمہیں ایسے شبے کیوں ہوتے۔''

میں سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا معلوم ہو گیا کہ تباہی کے سامان پورے ہوئے جاتے ہیں۔

(4)

دوسرے دن میں جوں ہی دفتر پہنچا چوب دار نے آ کر کہا'' مہاراجہ صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

میں تو اپنی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی سے کیے بیٹھا تھا۔ میں خوب سمجھا گیا تھا۔ کہ

وہ بڑھیا خفیہ پولیس کی کوئی مخبر ہے جو میرے خانگی حالات کی تحقیقات کے لئے تعینات ہوئی ہوگی۔ کل ہی اس کی رپورٹ آئی ہوگی اور آج میری طلبی ہے خوف سے سہا ہوا لیکن دل کو بزور سنبھالے ہوئے کہ جو کچھ سر پر پڑے گی دیکھا جائے گا ابھی سے کیوں جان دوں میں راجہ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا وہ اس وقت اپنے پوجا کے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کاغذوں کا ایک دفتر ادھر ادھر پھیلا ہوا تھا، اور وہ خود کسی خیال میں محو تھے مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف مخاطب ہوئے ان کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آئے بولے ''کنور شیام سنگھ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہاری بابت مجھے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ مجھے اس امر پر مجبور کرتی ہیں کہ تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے تم میرے پرانے وثیقہ دار ہو، اور تمہیں یہ اعزاز کئی پشتوں سے حاصل ہے تمہارے بزرگوں نے ہمارے خاندان کی جانبازانہ خدمات کی ہیں اور انہی کے صلہ میں یہ وثیقہ عطا ہوا تھا کہ تم اپنے خاندان کی پرورش کرو اپنے لڑکوں کو اس قابل بناؤ کہ وہ راج کی کچھ خدمت کر سکیں انہیں اخلاقی اور جسمانی تعلیم دو تا کہ تمہارے وجود سے ریاست کی بھلائی ہو، نہ کہ اس لئے کہ تم اس روپے کو بے ہودہ عیش پرستی اور حرام کاری میں صرف کر دو۔ مجھے یہ بہت شاق گزرتا ہے کہ تم نے اب اپنے اہل وعیال کی پرورش سے بھی اپنے آپ کو سبکدوش کر لیا ہے اگر تمہارا یہی وتیرہ رہا تو یقیناً وثیقہ داروں کا ایک پرانا خاندان مٹ جائیگا اس لئے آج سے ہم نے تمہارا نام وثیقہ داروں کی فہرست سے خارج کر دیا، اور تمہارے بجائے تمہاری بیوی کا نام درج کیا گیا وہ اپنے لڑکوں کی پرورش و پرداخت کی ذمہ دار ہے تمہارا نام ریاست کے مالیوں کی

فہرست میں لکھا جائے تم نے اپنے کو اسی نوازش کا اہل ثابت کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ تبادلہ تمہیں ناگوار نہ ہوگا۔ بس جاؤ، اور ممکن ہو تو اپنے فعلوں پر پچھتاؤ۔''

(5)

مجھے کچھ عرض معروض کرنے کی جرأت نہ ہوئی میں نے بہت استقلال کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ سنا اور گھر کی طرف چلا، لیکن دو چار قدم ہی چلا تھا کہ معاً خیال آیا کس کے گھر جا رہے ہو۔ تمہارا گھر اب کہاں ہے میں الٹے قدم لوٹا جس گھر میں بادشاہ تھا، وہاں دوسروں کا دست نگر بن کر مجھ سے نہیں رہا جائے گا اور رہا بھی جائے تو مجھے نہیں رہنا چاہئے میرے اعمال ناشائستہ ضرور تھے، لیکن میرا اخلاقی احساس اس قدر زائل نہیں ہوا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس وقت اس شہر سے بھاگ جانا مناسب ہے ورنہ بات پھیلتے ہی ہمدردوں اور بدخواہوں کا ایک جمگھٹ اظہار حال کے لئے آ جائے گا۔

دوسروں کی خشک ہمدردیاں سہنی پڑیں گی جن کے پردے میں خوشی جھلکتی ہوگی ایک بار صرف ایک بار مجھے پھول متی کا خیال آیا اس کے کارن یہ درگت ہو رہی ہے، اس سے تو مل ہی لوں مگر دل نے روکا، کیا ایک صاحب ثروت رئیس کی جو عزت ہوتی تھی وہ مجھے اب حاصل ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں بازار حسن میں وفا اور محبت سے مال وزر زیادہ گراں بہا جنس ہے ممکن ہے اس وقت مجھ پر ترس کھا کر یا ایک عارضی جوش میں پھول متی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائے، لیکن اسے لے کر کہاں جاؤں گا پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر چلنا تو اور بھی مشکل ہے اس طرح سوچ کر میں نے بمبئی کی راہ لی، اور اب دو سال سے ایک مل میں ملازم ہوں تنخواہ

صرف اتنی ہے کہ قالب اور روح میں مفارقت نہ ہونے پائے لیکن ایشور کا شکر کرتا ہوں اور اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں میں ایک دفعہ پوشیدہ طور پر وطن گیا تھا۔ پھول متی نے ایک دوسرے رئیس سے حسن کا سودا کر لیا ہے۔ لیکن میری بیوی نے اپنے حسن انتظام سے گھر کی حالت خوب سنبھال لی ہے میں نے اپنے مکان کو رات کے وقت مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ دروازہ پر دو لالٹینیں روشن تھیں اور بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ صفائی اور سلیقہ کا جلوہ نظر آتا تھا مجھے اخباروں کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مہینوں تک میرے پتہ نشان کے متعلق اخباروں میں اشتہار شائع ہوتے رہے لیکن اب یہ صورت لے کر میں پھر وہاں کیا جاؤں گا اور یہ روئے سیاہ کس کو دکھاؤں گا اب تو مجھے اسی خستہ حالی میں زندگی کے دن کاٹنے ہیں، رو کر یا ہنس کر یہ اختیار ہے میں اپنی حرکات پر اب بہت نادم ہوں افسوس! میں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی انہیں لات سے ٹھوکر ماری یہ اسی کی سزا ہے کہ آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے میں وہ پروانہ ہوں، جس کی خاک بھی بادصبا کے جھونکوں سے نہ بچی۔

☆☆☆☆☆☆

پچھتاوا

پہلی بار: ''زمانہ'' نومبر 1914ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1920ء (پریم بتیسی اول)

(1)

پنڈت درگا ناتھ جب کالج سے نکلے تو کسب معاش کی فکر دامن گیر ہوئی رحم دل اور با اصول آدمی تھے ارادہ تھا کہ کام ایسا کرنا چاہیے، جس میں اپنی گزران بھی ہو اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور دل سوزی کا موقع بھی ملے۔ سوچنے لگے اگر کسی دفتر میں کلرک بن جاؤں تو اپنی گزر تو ہو سکتی ہے لیکن عوام سے کوئی تعلق نہ رہے گا وکالت میں شریک ہو جاؤں تو دونوں باتیں ممکن ہیں مگر ہزار احتیاط کرنے پر بھی دامن کو صاف رکھنا مشکل ہو گا پولیس کے محکمہ میں غربا پروری کے بے انتہا موقعے ہیں، مگر وہاں کی آب و ہوا آزاد منش اور نیک نیت آدمی کے لئے ناموافق ہے مال کے صیغہ میں قاعدہ اور قانون کی گرم بازاری ہے بے لوث رہنے پر بھی سختی اور میر سے مختز زرہنا غیر ممکن ہے اس طرح بہت غور و فکر کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی زمیندار کے یہاں مختار عام بن جانا چاہیے تنخواہ تو ضرور کم ملے گی مگر غریب کاشتکاروں سے رات دن کا تعلق رہے گا حسن سلوک کے موقعے ملیں گے سادگی کی زندگی بسر ہو گی ارادہ مضبوط ہو گیا۔

کنول بشال سنگھ ایک صاحب ثروت زمیندار تھے ان کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور عرض کی کہ مجھے اپنے نمک خواروں کے زمرہ میں شامل کر لیجئے کنور صاحب نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولے۔

''پنڈت جی! مجھے آپ کو یہاں رکھنے سے بڑی خوشی ہوئی مگر آپ کے لائق میرے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

درگاناتھ نے کہا ''میرے لئے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہے میں ہر ایک کام کرنے کو تیار ہوں تنخواہ جو کچھ آپ بخوشی دیں گے، وہ مجھے منظور ہے میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ سوا کسی رئیس کے اور کسی کی نوکری نہ کروں گا''

کنول بشال سنگھ نے مغرورانہ انداز سے فرمایا ''رئیس کی نوکری نوکری نہیں ریاست ہے، میں اپنے چپراسیوں کو دو روپیہ مہینہ دیتا ہوں اور وہ تن زیب کی چکن پہن کر نکلتے ہیں دروازوں پر گھوڑے بندھے ہوئے ہیں میرے کارندے پانچ روپے سے زیادہ نہیں پاتے۔لیکن شدی بیاہ وکیلوں کے خاندان میں کرتے ہیں معلوم نہیں ان کی کمائی میں کیا برکت ہوتی ہے برسوں تنخواہ کا حساب نہیں کرتے، کتنے ہی ایسے ہیں جو بلا تنخواہ کے کارندگی یا چپراسی گری کرنے کو تیار بیٹھے ہیں مگر اپنا یہ اصول نہیں سمجھ لیجئے مختار عام اپنے علاقے میں زمیندار سے کم حیثیت نہیں رکھتا وہی رعب، وہی حکومت، وہی شان، جسے اس نوکری کا چسکا لگ چکا ہے اس کے سامنے تحصیلدار کی کیا حقیقت ہے۔''

پنڈت درگاناتھ نے کنور صاحب کی تائید نہیں کی، جیسا کہ ان کا فرض بنتا تھا دنیا داری میں ابھی کچے تھے، بولے

''مجھے اب تک کسی رئیس کی نوکری کا چسکا نہیں لگا ہے میں تو ابھی کالج سے نکلا

آتا ہوں اور نہ میں ان وجوہ سے یہ نوکری کرنا چاہتا ہوں، جو آپ نے فرمائے مگر اتنے قلیل مشاہرہ میں میرا گزر نہ ہوگا آپ کے اور ملازم اسامیوں کا گلا دباتے ہوں گے مجھ سے مرتے دم تک یہ فعل نہ ہوں گے اگر ایمان دار نوکر کی قدر ہوتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد مجھ سے خوش ہو جائیں گے۔"

کنور صاحب نے بڑی متانت سے کہا

"بے شک ایمان دار آدمی کی قدر ہوتی ہے، لیکن میرے یہاں زیادہ تنخواہ دینے کی گنجائش نہیں ہے۔"

زمیندار کی اس ناقدری پر کسی قدر ترش رو ہو کر پنڈت جی نے جواب دیا

تو پھر مجبوری ہے اس تکلیف دہی کے لئے معاف فرمائیے گا مگر یہ میں آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ ایماندار آدمی اتنا سستا نہ ملے گا۔

کنور صاحب نے دل میں سوچا کہ آخر کچہری عدالت روز ہوتی ہی رہتی ہے سینکڑوں روپے تجویزوں اور فیصلوں کے ترجمے میں صرف ہو جاتے ہیں ایک انگریزی داں آدمی ملتا ہے، بالکل سادہ لوح، کچھ زیادہ تنخواہ دینی پڑے گی تو کوئی مضائقہ نہیں مگر پنڈت جی کی بات کا جواب دینا ضروری تھا بولے

"مہاراج! ایمان دار آدمی ایمان دار ہی رہے گا چاہے اسے تنخواہ کتنی ہی کم دیجئے اور نہ زیادہ تنخواہ دینے سے بے ایمان ایماندار بن سکتا ہے ایماندار کا روپے سے کوئی تعلق نہیں میں نے ایمان دار چپراسی دیکھے ہیں اور بے ایمان ہائی کورٹ کے جج لیکن خیر آپ ہونہار آدمی ہیں میرے یہاں شوق سے رہیے میں آپ کو ایک علاقے کا مختار بنا دوں گا، آپ کا کام دیکھ کر ترقی بھی کر دوں گا۔"

درگا ناتھ بیس روپے ماہوار پر راضی ہو گئے۔ وہاں سے ڈھائی میل پر کنور صاحب کے کئی موضعے چاند پار کے علاقے کے نام سے مشہور تھے پنڈت جی اس علاقہ کے مختار عام مقرر ہوئے۔

(2)

درگا ناتھ چاند پار کے علاقے میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ واقعی جیسا کنور صاحب کہتے تھے ریاست کی نوکری بجائے خود ریاست ہے رہنے کے لئے خوب صورت بنگلہ، فرش فروش سے سجا ہوا۔ سینکڑوں بیگلہ کی سیر، کئی نوکر، کئی چپراسی، سواری کے لئے ایک خوب صورت تانگا، آسائش اور تکلف کے سارے سامان موجود، مگر انہیں یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہ ہوئی، کیونکہ اسی سجے ہوئے بنگلہ کے چاروں طرف کاشتکاروں کے جھونپڑے تھے، پھونس کے بنے ہوئے جن میں مٹی کے برتنوں کے سوا اور کوئی اثاثہ نہ تھا۔ بنگلہ وہاں کے عرف عام میں کورٹ مشہور تھا لڑکے سہمی ہوئی آنکھوں سے برآمدے کو دیکھتے مگر اوپر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی اس افلاس کے درمیان ثروت اور تمول کا یہ نظارہ ان کے لئے نہایت دل شکن تھا۔ کاشتکاروں کی یہ حالت کہ سامنے آتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے۔ چپراسی لوگ ان سے بلا تو تکا کے بات نہ کرتے تھے۔

پہلے ہی دن کئی کاشتکاروں نے پنڈت جی کی خدمت میں نذرانے پیش کیے، مگر انہیں کتنا تعجب ہوا، جب ان کے نذرانے واپس کر دیے گئے، کاشتکار خوش تو ہوئے مگر چپراسیوں کا خون ابلنے لگا۔ نائی اور کہار خدمت کے لئے آئے، وہ لوٹا دیے گئے۔ گوالوں کے گھروں سے دودھ کا ایک مٹکا آیا وہ بھی واپس ہوا تمبولی

ایک تھیلی پان لے کر آیا مگر اس کی نذر بھی قبول نہ ہوئی۔ اسامیوں نے آپس میں کہا۔

''یہ کوئی دھرماتما آدمی معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بے ضابطگیاں کیونکر برداشت ہوتیں انہوں نے کہا''

''حضور! اگر آپ کو یہ چیزیں پسند نہ ہوں تو نہ لیں، مگر رسم تو نہ مٹائیں اگر کوئی دوسرا آدمی یہاں آئے گا، تو اسے نئے سرے سے یہ رسول باندھنے میں کتنی دقت ہوگی۔''

پنڈت جی نے اس نیک صلاح کا صرف اتنا جواب دیا ''جس کے سر جیسی پڑے گی ویسی بھگت لے گا۔ مجھے ابھی سے اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

ایک چپراسی نے جرأت کرکے کہا

''ان اسامیوں کو آپ جتنا غریب سمجھتے ہیں اتنے غریب نہیں ہیں ان کا ڈھنگ ہی ایسا ہے بھیس بنائے رہتے ہیں دیکھنے میں ایسے سیدھے سادے گویا بے سینگ کی گائے ہیں مگر سچ مانیے ان میں ایک ایک ہائی کورٹ کا وکیل ہے۔''

مگر چپراسیوں کی اس بحث کا پنڈت جی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے ہر ایک کاشتکار سے ہمدردانہ اور بردرانہ برتاؤ شروع کیا۔ صبح نو بجے تک غریبوں کو مفت دوائی دیتے پھر حساب کتاب کا کام دیکھتے ان کے اخلاق نے اسامیوں کو موہ لیا مالگذاری کا روپیہ جس کے ہر سال قرقی اور نیلام کی ضرورت ہوتی ہے۔ امسال ایک اشارے پر وصول ہوگیا۔ کسانوں نے اپنے بھاگ سراہے اور منانے لگے کہ ہمارے سرکار کی بدلی کبھی نہ ہو۔

(3)

کنور بشال سنگھ اپنی رعایا کی پرورش کا بہت خیال رکھتے تھے بیج کے لیے اناج دیتے مزدوری اور بیل کے لیے روپے فصل کٹنے پر ایک کا ڈیڑھ وصول کر لیتے جیسا کہ مناسب تھا چاند اپار کے علاقے میں کتنے ہی اسامی ان کے مقروض تھے چیت کا مہینہ تھا فصل کچھ کھلیان میں تھی، کچھ گھر میں آ چکی تھی کنور صاحب نے چاند اپار والوں کو بلایا اور کہا کہ ''ہمارا اناج اور روپیہ بے باق کر دو چیت آ گیا، جب تک سختی نہ کی جائے تم لوگ ڈکار تک نہیں لیتے اس طرح کام نہیں چل سکتا۔''

بوڑھے ملوکا نے کہا

''سرکار! اسامی کبھی اپنے مالک سے بے باق ہو سکتا ہے؟ کچھ ابھی لے لیا جائے، کچھ پھر دے دیں گے ہماری گردن تو سرکار کی مٹھی میں ہے۔''

کنور صاحب نے فرمایا

''آج کوڑی کوڑی چکا کر تب یہاں سے اٹھنے پاؤ گے تم لوگ ہمیشہ اسی طرح حیلہ حوالہ کرتے رہتے ہو۔''

ملوکا نے منت کر کے کہا

''ہمارا پیٹ ہے، سرکار کی روٹیاں ہیں ہم کو اور کیا چاہیے جو کچھ اپج ہے وہ سرکار ہی کی تو ہے۔''

کنور صاحب کو ملوکا کی اس زبان درازی پر غصہ آ گیا راجہ رئیس ٹھہرے اسے سخت سست کہا اور بولے ''کوئی ہے، ذرا اس بڈھے کی گوشمالی تو کر دے۔ یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔''

انھوں نے تو شاید دھمکانے کی نیت سے کہا، مگر چپراسیوں کی نگاہوں میں چاند اپار کھٹک رہا تھا۔ ایک تیز دم چپراسی قادر خاں نے لپک کر بوڑھے کسان کی گردن پکڑ لی اور ایسا دھکا دیا کہ وہ بے چارا تیورا کر زمین پر گر پڑا۔

ملوکا کے دو جوان بیٹے چپ چاپ کھڑے تھے باپ کی یہ حالت دیکھی تو خون نے جوش مارا دونوں جھپٹے اور قادر خاں پر ٹوٹ پڑے۔ دھماکے کی آوازیں آنے لگیں صافہ گرا اچکن تار تار ہوئی اور قادر خاں زمین دوز ہو گئے۔ ہاں زبان کی تیزی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

ملوکا نے دیکھا کہ بات بگڑ گئی، اٹھا اور قادر خان کو اٹھا کر اپنے لڑکوں کو گالیاں دینے لگا جب لڑکوں نے الٹے اسی کو ڈانٹا تو دوڑ کر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ مگر بات سچ مچ بگڑ چکی تھی اس کی مصلحت آمیزیاں بے اثر ہوئیں کنور صاحب کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، بولے۔

’’بے ایمان، آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا ورنہ تیرا خون پی جاؤں گا‘‘

بوڑھے کے جسم میں خون تو نہ تھا، مگر کچھ گرمی ضروری تھی سمجھا تھا کہ کچھ انصاف کریں گے یہ پھٹکار سن کر بولا

’’سرکار! بڑھاپے میں اپ کے دروارجے پر پانی اتر گیا اور اس پر سرکار ہمیں کو ڈانٹتے ہیں۔‘‘

کنور صاحب نے کہا

’’تمہاری عزت ابھی کیا اتری ہے، اب اترے گی‘‘

دونوں لڑکے طیش میں آ کر بولے

''سرکار اپنا روپیہ لیں گے کہ کسی کی عزت لیں گے؟''

کنور صاحب نے اینٹھ کر کہا

''روپیہ پیچھے لیں گے پہلے دیکھیں گے، تمہاری عزت کیسی ہے''

(4)

چاندراپار کے کسان اپنے گاؤں میں پہنچ کر پنڈت درگاناتھ سے یہ رام کہانی کہہ رہے تھے کہ اتنے میں کنور صاحب کا آدمی آ پہنچا اور خبر دی کہ سرکار نے اسی دم آپ کو بلایا ہے۔

درگاناتھ نے اسامیوں کو تشفی دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر دربار میں حاضر ہوئے۔

کنور صاحب کی آنکھیں غصہ سے لال تھیں چہرہ تمتمایا ہوا تھا کئی مختار اور چپراسی بیٹھے ہوئے آگ پر تیل ڈال رہے تھے۔

پنڈت جی کو دیکھتے ہی کنور صاحب بولے'' چاندا پار والوں کی حرکت آپ نے دیکھی؟''

پنڈت جی نے سر جھکا کر کہا''جی ہاں، نہایت رنج ہوا یہ تو ایسے سرکش نہ تھے''

کنور صاحب بولے''یہ سب کچھ آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے آپ ابھی اسکول کے لڑکے ہیں آپ کیا جانیں دنیا میں کیسے رہنا چاہیے اگر آپ کا اسامیوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا تو پھر زمینداری کر چکا یہ سب آپ کی کرنی ہے میں نے اسی دروازے پر اسامیوں کو رسی سے باندھ باندھ کر الٹا لٹکا دیا ہے اور کسی نے چوں تک نہیں کی ان کی یہ جرأت کہ میرے سامنے میرے ہی آدمی پر ہاتھ چلائیں''

درگاناتھ نے معذرت آمیز انداز سے کہا ''حضور! اس میں میری کیا خطا ہے میں نے جب سے سنا ہے خود افسوس کر رہا ہوں''

کنور صاحب نے فرمایا ''آپ کی خطا نہیں ہے تو اور کس کی ہے آپ ہی انہیں سر چڑھایا ہے بیگار بند کر دی آپ ہی ان کے ساتھ بھائی چارہ رکھتے ہیں ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں یہ چھوٹے آدمی اس برتاؤ کی قدر نہیں کرتے کتابیں اخلاق مدرسوں کے لئے ہیں۔ دنیاوی اخلاق کا قانون دوسرا ہے خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان بدمعاشوں کو اس گستاخی کا مزا چکھاؤں۔ اسامیوں کو آپ نے مال گزاری کی رسید تو نہیں دی ہے؟''

درگاناتھ نے ڈرتے ڈرتے کہا

''جی نہیں رسیدیں تیار ہیں ،صرف آپ کے دستخط کی دیر ہے''

کنور صاحب کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی بولے

''یہ بہت اچھا ہوا شگون اچھے ہیں اب آپ ان رسیدوں کو چراغ کے سپرد کر دیجئے ان لوگوں پر بقایا لگان کی نالش کی جائے گی فصل نیلام کرا دوں گا بھوکوں مریں گے ،تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا جو روپیہ وصول ہو چکا ہے وہ بیج اور کھاتے میں چڑھا لیجئے آپ کو شہادت صرف یہ دینی چاہیے کہ مالگذاری کی مد میں نہیں قرضہ کی مد میں روپیہ وصول ہوا ہے بس۔''

درگاناتھ سکتے میں آ گئے کیا یہاں بھی انہی آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا ،جن سے بچنے کے لئے یہ گوشئہ قناعت اختیار کیا تھا۔ جان بوجھ کر اتنے غریبوں کی گردن پر چھری پھیروں اس لئے کہ میری نوکری قائم رہے نہ! یہ مجھ سے نہ ہوگا

بولے:

''کیا میری شہادت کے بغیر کام نہ چلے گا؟''

کنور صاحب نے غصے سے کہا

''کیا اتنا کہنے میں آپ کو کوئی عذر ہے؟''

درگاناتھ نے دبدھے کے لہجہ میں کہا ''جی! میں یوں تو آپ کا نمک خوار ہوں ہر ایک حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں مگر میں نے شہادت کبھی نہیں دی ہے، اور شاید یہ کام مجھ سے انجام نہ ہو سکے مجھے تو معاف ہی رکھا جائے''

کنور صاحب نے تحکمانہ انداز سے فرمایا

''یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا اس میں حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں ہے آگ آپ نے لگائی ہے، بجھائے گا کون؟''

درگاناتھ نے زور دے کر کہا ''میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں ہوں اور اس طرح کی شہادت نہیں دے سکتا۔''

کنور صاحب مصلحت آمیز لہجے میں بولے، جس میں طنز کا پہلو غالب تھا

مہربان یہ جھوٹ نہیں ہے میں نے جھوٹ کا بیوپار نہیں کیا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ آپ روپے کی وصولی سے انکار کیجئے جب اسامی میرے مقروض ہیں تو مجھے اختیار ہے کہ چاہے روپیہ قرضہ کی مد میں وصول کروں چاہے مالگذاری کی مد میں اگر اتنی سی بات کو آپ جھوٹ سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی زیادتی ہے ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی ایسی صاف گوئی کے لئے دنیا میں جگہ نہیں ہے آپ میرے ملازم ہیں آخر حق نمک بھی تو کوئی چیز ہے آپ تعلیم یافتہ ہونہار آدمی ہیں ابھی آپ کو دنیا میں بہت

دن رہنا ہے، اور بہت کام کرنا ہے ابھی سے آپ یہ روش اختیار کریں گے تو آپ کو زندگی میں بجز مایوسی اور پریشانی کے کچھ ہاتھ نہ آوے گا۔ ایمان داری بے شک اچھی چیز ہے مگر اعتدال کا خیال بھی رہنا چاہئے انتہا ہر چیز کی بری ہوتی ہے اب زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں یہ موقع ایسا ہی ہے۔

کنور صاحب پرانے پھکیت تھے نوجوان کھلاڑی ہار گیا وہ پس و پیش کے جال میں پھنس گیا۔ جو نیک ارادوں کے لئے سم قاتل ہے۔

(5)

اس واقعے کے تیسرے دن چاند پار کی آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش ہوئی سمن آئے گھر گھر کہرام مچ گیا سمن کیا تھے موت کے پروانے تھے دیوی دیوتاؤں کی مناون ہونے لگی عورتیں زمیندار کو کوسنے لگیں اور مرد اپنی تقدیروں کو۔

مقررہ تاریخ کے دن گاؤں کے گنوار کندھے پر لٹیا ڈور اور انگوچھے میں چبینہ باندھے کچہری کو چلے۔ سینکڑوں عورتیں اور بچے روتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے گویا وہ ان سے اب پھر نہ ملیں گے۔

پنڈت درگاناتھ کے لیے یہ تین دن سخت آزمائش کے دن تھے ایک طرف کنور صاحب کی دل جوئیاں تھیں دوسری طرف کسانوں کی آہ و زاریاں مگر پس و پیش کے بھنور میں تین دن تک غوطے کھانے کے بعد انہیں زمین کا سہارا مل گیا۔ دل نے کہا ''یہ پہلی آزمائش ہے اگر اس میں ناکام رہے تو پھر ان کا سامنا کرنا غیر ممکن ہو جائے گا فیصلہ ہو گیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے اتنے بیکسوں کو نقصان نہ پہنچاؤں گا۔''

دس بجے دن کا وقت تھا عدالت کے احاطہ میں میلہ سا لگا ہوا تھا جا بجا چھوٹے بوڑے سیہ پوش دیوتاؤں کی پوجا ہو رہی تھی چاند پار کے کسان غول کے غول ایک درخت کے نیچے آ کر بیٹھے۔ ان سے کچھ دور پر کنور صاحب کے مختار عام اور سپاہیوں اور گواہوں کا ہجوم تھا یہ لوگ بہت خوش تھے، جس طرح مچھلی پانی میں کلیلیں کرتی ہے اسی طرح یہ لوگ خوش فعلیاں کر رہے تھے کوئی پان کھا رہا تھا، کوئی حلوائی کی دکان سے پوریوں کے پتل لئے چلا آتا تھا۔

اھر بے چارے کسان درخت کے نیچے خاموش، اداس بیٹھے ہوئے سوچتے تھے، کہ آج نہ جانے کیا ہوگا معلوم کیا آفت آئے گی، رام کا بھروسہ ہے۔

مقدمہ پیش ہوا استغاثہ کی شہادتیں گزرنے لگیں یہ اسامی بڑے سرکش ہیں لگان مانگا جاتا ہے تو جنگ پر آزمادہ ہوتے ہیں اب کے انہوں نے ایک حبہ تک نہیں دیا قادر خاں نے رو کر اپنے سر کی چوٹ دکھائی سب کے پیچھے پنڈت درگا ناتھ کی پکار ہوئی انہی کے بیان پر استغاثہ کا فیصلہ تھا وکیل صاحب نے انہیں خوب طوطے کی طرح پڑھا رکھا تھا مگر ان کی زبان سے پہلا ہی جملہ نکلا تھا کہ مجسٹریٹ نے ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا وکیل صاحب بغلیں جھانکنے لگے مختار عام نے ان کی طرف گھور کر دیکھا اہلمد اور پیشکار سب کے سب ان کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

عدالت نے سخت لہجہ میں کہا کہ تم جانتے ہو کہ مجسٹریٹ کے روبرو کھڑے ہو؟

درگا ناتھ نے مودبانہ مگر مستقل انداز سے جواب دیا ’’جی ہاں، خوب جانتا ہوں‘‘

عدالت ''تمہارے اوپر دروغ بیانی کا مقدمہ عائد ہو سکتا ہے''

درگاناتھ ''بے شک! اگر میرا بیان غلط ہو''

وکیل نے ان سے طنزیہ لہجے میں کہا معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے دودھ، گھی اور نذرو نیاز نے یہ کایا پلٹ کر دی ہے اور مجسٹریٹ کی طرف پر معنی انداز سے دیکھا۔

درگاناتھ بولے'' آپ کو ان نعمتوں کا زیادہ تجربہ ہو گا مجھے اپنی روکھی سوکھی روٹیاں زیادہ پیاری ہیں۔''

عدالت نے پوچھا'' تم از روئے حلف کہتے ہو کہ ان اسامیوں نے بالکل معاملہ بیباق کر دیا ہے؟''

درگاناتھ نے جواب دیا'' جی ہاں، از روئے حلف کہتا ہوں کہ ان کے ذمہ لگان کی ایک کوڑی باقی نہیں ہے''

عدالت ''رسیدیں کیوں نہیں دیں؟''

درگاناتھ ''میرے آقا کا حکم''

(6)

مجسٹریٹ نے نالشیں خارج کر دیں کنور صاحب کو جونہی اس شکست کی خبر ملی ان کے غیض و غضب کی کوئی حد نہ رہی۔ پنڈت درگاناتھ کو ہزاروں ہی بے نقط سنائیں۔ نمک حرام، دغاباز، بیوفا، مکار، میں نے اس شخص کی کتنی خاطر کی مگر کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی ہوتی۔ آخر دغا کر ہی گیا۔ خیرت یہ ہوئی کہ پنڈت درگاناتھ مجسٹریٹ کا فیصلہ سنتے ہی مختار عام کو کنجیاں اور کاغذات سپرد کر کے رخصت ہو

گئے تھے، ورنہ اس نمک حرامی کے صلہ میں کچھ دنوں تک ہلدی اور گڑ پینے کی ضرورت ہوتی۔

کنور صاحب کا لین دین وسیع پیانہ پر تھا چاندا پار بڑا علاقہ تھا۔ وہاں کے اسامیوں سے کئی ہزار کی رقم آنے کو تھی انہیں یقین ہو گیا کہ اب یہ روپیہ ڈوب جائے گا وصول ہونے کی کوئی امید نہیں اس پنڈت نے اسامیوں کو سر چڑھا دیا۔ اب انہیں میرا کیا خوف اپنے کارندوں اور مشیروں سے صلاح لی انہوں نے بھی یہی کہا کہ اب وصولی کی کوئی صورت نہیں کاغذات عدالت میں پیش کیے جائیں گے تو آمدنی کا ٹیکس لگ جائے گا مگر روپیہ وصول ہونا مشکل عذرداریاں ہوں گی کہیں حساب میں کوئی غلطی نکل آئی تو رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے گی اور دوسرے علاقوں کا روپیہ بھی مارا جائے گا۔

مگر دوسرے دن جب ٹھاکر صاحب پوجا پاٹھ سے فارغ ہو کر اپنی چوپال میں بیٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاندا پار کے اسامی غول کے غول چلے آرہے ہیں۔ انہیں خوف ہوا کہ کہیں یہ سب کوئی فساد کرنے تو نہیں آئے؟ مگر کسی کے ہاتھ میں لکڑی تک نہ تھی ملو کا آگے آگے آتا تھا اس نے دور ہی سے جھک کر سلام کیا ٹھاکر صاحب کو ایسی حیرت ہوئی گویا کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

ملوکا نے سامنے آکر عرض کیا ''سرکار ہم لوگوں سے جو بھول چوک ہوئی اسے معاف کیا جائے ہم سب لوگ حضور کے چاکر ہیں سرکار نے ہم کو پالا ہے اب بھی ہمارے اوپر وہی نگاہ رہے۔''

کنور صاحب کا حوصلہ بڑھا سمجھے کہ پنڈت کے چلے جانے کے بعد ان

سبھوں کے ہوش ٹھکانے ہو گئے ہیں اب کس کا سہارا لیں گے اسی بدمعاش نے ان سب کو بھڑکایا تھا کڑک کر بولے ''وہ تمہارے حمایتی پنڈت کہاں گئے وہ آ جاتے تو ذرا مزاج پرسی کی تھی۔''

بوڑھے ملوکا نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا ''سرکار! ان کو کچھ نہ کہیں وہ آدمی نہیں دیوتا تھا جوانی کی سوگند ہے جو انہوں نے آپ کی کوئی شکایت کی ہو۔ وہ بے چارے تو ہم لوگوں کو بار بار سمجھاتے رہتے تھے کہ دیکھو مالک سے بگاڑ کرنا اچھی بات نہیں ہے ہم سے کبھی ایک لوٹا پانی کے روادار نہیں ہوئے چلتے چلتے ہم لوگوں سے کہا کہ مالک کا جو کچھ تمہارے جمے نکلے چکا دینا آپ ہمارے مالک ہیں ہم نے آپ کا بہت کھایا پیا آپ ہی کے نمک سے ہمارے تن پلے ہیں اب ہماری سرکار سے یہی بنتی ہے کہ ہمارا حساب کتاب دیکھ کر جو کچھ ہمارے اوپر نکلے ہم کو بتا دیا جائے۔ ہم ایک ایک کوڑی چکا کر تب پانی پئیں گے۔''

کنور صاحب کو سکتہ ہو گیا انہیں روپوں کے لیے کتنی بار زبردستی کھیت کٹوائے گئے کتنی بار گھروں میں آگ لگوائی گئی کتنی بار مار پیٹ کی کیسی کیسی سختیاں کیں کیسے کیسے ستم ڈھائے اور آج یہ سب خود بہ خود سارا حساب صاف کرنے آئے ہیں یہ کیا جادو ہے؟

مختار عام صاحب نے کاغذات کھولے اور اسامیوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں کھولیں جس کے ذمہ جتنا نکلتا تھا اس نے بے چون و چرا وہ رقم سامنے رکھ دی دیکھتے دیکھتے سامنے روپوں کا ڈھیر لگ گیا چھ ہزار روپیہ دم کے دم میں وصول ہو گیا۔ کسی کے ذمے کچھ باقی نہیں یہ سچائی اور انصاف کی فتح تھی زبردستی اور ظلم سے

جو کام کبھی نہ ہوا وہ انسانیت نے پورا کر دکھایا۔

کل جب سے یہ لوگ مقدمہ جیت کر گھر آئے اسی وقت سے انہیں روپیہ ادا کرنے کی دھن سوار تھی پنڈت جی کو وہ سچ مچ دیوتا سمجھنے لگے تھے اور یہ ان کی سخت تاکید تھی کسی نے غلہ بیچا، کسی نے گہنے گروی رکھے، کسی نے بیل فروخت کئے۔ یہ سب کچھ سہا مگر پنڈت جی کی بات نہ ٹالی۔

کنور صاحب کے دل میں پنڈت جی کی طرف سے جو بدگمانی اور کدورت تھی وہ بہت کچھ مٹ گئی، مگر انہوں نے ہمیشہ سختی اور ظلم سے کام لینا سیکھا تھا انہی اصولوں کے وہ قائل تھے۔ انصاف اور سچائی اور ملائمیت کی انہوں نے کبھی آزمائش نہیں کی اور ان پر ان کا بالکل اعتقاد نہ تھا مگر آج انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ سچائی اور نرمی میں بڑی طاقت ہے۔ یہ اسامی میرے قابو سے نکل گئے تھے میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا یہ خوف کا کرشمہ نہیں حق اور انصاف کی تاثیر ہے۔ ضرور وہ پنڈت سچا اور دھرماتما آدمی تھا اس میں مصلحت اندیشی نہ ہو، موقع شناسی نہ ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سچا اور بے لوث تھا۔

(7)

جب تک کہ ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو اس کی ہماری نگاہوں میں قدر نہیں ہوتی ہری دوب بھی کسی وقت اشرفیوں کے مول بک جاتی ہے کنور صاحب کا کام ایک بے لوث آدمی کے بغیر رکا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے پنڈت جی کے اس مردانہ فعل کی قدر ایک شاعر کے فکر سخن سے زیادہ نہ ہوئی چاندا پار کے آدمیوں نے تو اس کے بعد اپنے زمیندار کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی ہاں ریاست کے دوسرے حصوں

میں وہی سابق دستور رگڑ جھگڑ مچی رہتی تھی۔ روزانہ عدالت، روزانہ فوجداری، روزانہ ڈانٹ پھٹکار، مگر یہ سب زمینداری کے سنگار ہیں۔ ان کے بغیر زمینداری کیا؟ آخر وہ دن بھر بیٹھے بیٹھے کیا مکھیاں مارتے کنور صاحب اسی طرح شان قدیم کے ساتھ اپنا انتظام سنبھالتے جاتے تھے۔

کئی سال گزر گئے کنور صاحب کا کاروبار روز بروز چمکتا گیا اور باوجود اس کے کہ پانچ لڑکیوں کی شادیاں بڑے حوصلے اور دھوم کے ساتھ کیں ان کے عروج میں زوال نہ آیا ہاں قوی، البتہ کچھ کچھ ڈھیلے ہونے لگے افسوس نہ تھا کہ اب تک اس مال وزر اور جاہ وحشم کا کوئی وارث نہیں تھا بھانجے، بھتیجے اور نواسے ریاست پر دانت لگائے ہوئے تھے۔

کنور صاحب کا دل ان دنیاوی جھگڑوں سے پھرتا جاتا تھا۔ آخر یہ رونا دھونا کس لئے؟ اب ان کی طرز زندگی میں ایک انقلاب ہوا کبھی کبھی سادھوسنت ان کے دروازے پر دھونی رمائے نظر آتے وہ خود اب بھگوت گیتا اور وشنوپران زیادہ پڑھتے تیرتی گھاٹ سے اترنے کے سامان ہونے لگے لیکن پر ماتما کی مرضی! لیکن سادھوسنتوں کی دعا کی بدولت خواہ دھرم اور پن کے اثر سے بڑھاپے میں ان کا لڑکا پیدا ہوا سوکھا پیڑ ہرا ہوا زندگی کی امیدیں بر آئیں۔ خوب دل کھول کر مال وزر لٹایا۔

مگر جس طرح بانس کی جڑ میں نکلی ہوئی کونپل جوں جوں بڑھتی ہے، بانس سوکھتا ہے اسی طرح کنور صاحب بھی جسمانی عارضوں میں مبتلا ہوتے گئے ہمیشہ ویدوں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگا رہتا مگر معلوم ہوتا تھا کہ دواؤں کا الٹا اثر ہو رہا ہے

قابض مسہل اور مسہل قابض کا کام کرتی جوں توں کر کے انہوں نے دو ڈھائی سال کاٹے یہاں تک کہ طاقتوں نے جواب دے دیا زندگی کی آس ٹوٹ گئی معلوم ہو گیا کہ اب میرے دن قریب ہیں۔

مگر یہ ساری جائیداد اور سارا کاروبار کس پر چھوڑ جاؤں افسوس! سارا ارمان دل ہی میں رہ گیا بچے کا بیاہ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی توتلی باتیں سننے کی بھی نوبت نہ آئی۔ اس جگر کے ٹکڑے کو کسے سونپوں جو اسے اپنا بیٹا سمجھے، جو پودے کو سینچے، پالے اور اس کی پونجی اسے سونپ دے۔ لڑکے کی ماں عورت ذات نہ کچھ جانے نہ سنے۔ اس سے کاروبار سنبھلنا مشکل مختار عام اور گماشتے اور کارندے درجنوں ہیں مگر سب کے سب دغا باز، ایمان فروش، خود غرض ایک بھی تو ایسا آدمی نہیں، جس پر میری طبیعت جمے کورٹ آف وارڈس کے سپرد کر دوں تو وہاں بھی سب آفتیں کوئی ادھر دبالے گا کوئی ادھر کھینچے گا یتیم بچے کا کون پرسان حال ہو گا۔ ہائے میں نے آدمی کی قدر نہ کی مجھے آدمی نہیں ہیرا مل گیا تھا، میں نے اسے ٹھیکرا سمجھا کیسا سچا، کیسا دلیر، اپنے ایمان پر قائم رہنے والا آدمی تھا وہ اگر کہیں مجھے مل جائے تو میرے سب بگڑے کام بن جائیں۔ اس بدنصیب لڑکے کے دن پھر جائیں میں اس کے پیروں پر سر رکھ دوں گا، اسے مناؤں گا اور اپنے لال کو اس کے قدموں میں ڈال دوں گا میں اپنے جنم کی کمائی اس کے سپرد کر دوں گا اس کے دل میں درد ہے رحم ہے وہ ایک یتیم پر ترس کھائے گا آہ! کاش مجھے اس کے درشن مل جاتے میں اس دیوتا کے پیر دھو دھو کر ماتھے پر چڑھاتا آنسوؤں سے اس کے پیر دھوتا اس سے دیا کا دان مانگتا! وہی اگر ہاتھ لگ پائے تو یہ ڈوبتی ڈونگی پار لگ سکتی ہے۔

(8)

ٹھاکر صاحب کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی وقت آخر آپہنچا انہیں پنڈت درگا ناتھ کی رٹ لگی ہوئی تھی بچے کی صورت دیکھتے اور کلیجہ سے آنکلتی بار بار پچھتاتے اور کف افسوس ملتے ہائے اس دیوتا کو کہاں پاؤں جو شخص اس وقت ان کے درشن کرادے آدمی جائیداد اس کے نچھاور کردوں پیارے پنڈت! میری خطا معاف کرو میں اندھا تھا اب میری بانہہ پکڑو مجھے ڈوبنے سے بچاؤ اس معصوم بچے پر ترس کھاؤ۔

عزیز واقارب کا جمگھٹ سامنے کھڑا تھا۔ کنور صاحب نے ان کے چہروں کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھا سچی غمخواری کہیں نظر نہ آئی ہر ایک چہرے پر خودغرضی جھلک رہی تھی۔ عالم یاس میں انہوں نے آنکھیں موندلیں۔

ان کی بیوی زار زار رو رہی تھی آخر اس سے ضبط نہ ہوسکا اس نے روتے ہوئے قریب جا کر کہا "پتی جی! ہم کو اور اس اناتھ بالک کو کس پر چھوڑے جاتے ہو"

کنور صاحب نے آہستہ سے کہا "پنڈت درگا ناتھ پر وہ جلد آئیں گے ان سے کہہ دینا کہ میں نے اپنا سب کچھ اس کے بھینٹ کردیا یہی میری آخری وصیت ہے۔"

☆☆☆☆☆

نمک کا داروغہ

پہلی بار: کتابی صورت میں 1915ء میں شائع ہوا (پریم پچیسی اول)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خدا داد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازہ صدر بند پا کر روزن اور شگاف کی فکر کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت، غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا پٹوار گری کا معزز اور پر منفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغہ نمک کی برقندازی کرتے تھے۔ اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے، منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں اور فرہاد کے قصہ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے بیٹا گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی آ رہی ہیں، میں کگارے کا درخت ہوں نہ معلوم کب گر پڑوں تم ہی گھر کے مالک و مختار ہو مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا، یہ تو پیر کا مزار ہے، نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے ایسا کام ڈھونڈو جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو ماہوار

مشاہراہ پورنمائش کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے اس میں برکت نہیں ہوتی، بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لیے اس میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو تمہیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے، انسان کو دیکھو، اس کی ضرورت کو دیکھو، موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے ان باتوں کو گرہ باندھ لو، یہ میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے لیکن اچھے شگون سے چلے تھے خوبی قسمت ساتھ تھی صیغہ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے مشاہرہ معقول بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے کلوار کی تسکین و تشفی کی سند لی، پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

جاڑے کے دن تھے رات کا وقت نمک کے برقنداز چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے منشی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن اس عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔

نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کیے میٹھی نیند سوتے تھے یکا یک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شوروغل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں اٹھ بیٹھے اتنی رات گئے کیوں گاڑیاں دریا کے پار جاتی ہیں اگر کچھ دغا نہیں تو اس پردہ تاریک کی ضرورت کیوں؟ شبہ کو استدلال نے ترقی دی وردی پہنی، طمنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلف محبوب سے بھی زیادہ طوالانی پل سے اتر رہی ہے، حاکمانہ انداز سے بولے۔

''کس کی گاڑیاں ہیں؟''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا ''پنڈت الوپی دین کی''

''کون پنڈت الوپی دین''

''داتا گنج کے''

منشی بنسی دھر چونکے الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں، غلے کا کاروبار الگ بڑا صاحب اثر، بڑا حکم رس، بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا کہاں جائیں گی جواب ملا کہ کان پور لیکن اس سوال پر کہ ان میں ہے کیا؟ ایک خاموشی کا عالم طوری ہو گیا اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجہ تک پہنچ گیا جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور

سے بولے ''کیا تم سب گونگے ہو گئے ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے؟''

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا شبہ یقین سے ہم آغوش تھا یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آ کر جگایا اور بولے ''مہاراج دروگا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں۔''

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ اسلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے اچھا چلو ہم آتے ہیں یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آ کر بے انداز سے بولے، بابو جی اشیرباد ہم سے۔۔۔۔ کیا ایسی خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیے۔

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا بے اعتنائی سے بولے ''سرکاری حکم'' الوپی دین نے ہنس کر کہا ''ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں، آپ نے ناحق تکلیف کی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔''

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا دیانت داری کا تازہ جوش تھا، کڑک کر بولے ''ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں، جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں آپ اس وقت حراست میں ہیں صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہو گا بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ تم انہیں حراست میں لے لو، میں حکم دیتا ہوں''

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہلچل مچ گئی شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا بدلو سنگھ آگے بڑھا، لیکن فرط رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے، الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا۔ سکتے میں آ گئے خیال کیا کہ یہ ابھی طفل مکتب ہے دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا الھڑ ہے جھجکتا ہے، زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے بہت مسکرانہ انداز سے بولے ''بابو صاحب ایسا ظلم نہ کیجیے ہم مٹ جائیں گے۔ عزت خاک میں مل جائے گی، آخر آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟ بہت ہوا تھوڑا سا انعام و اکرام مل جائے گا ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں۔''

بنسی دھر نے سخت لہجہ میں کہا ''ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے''

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا اعتماد نفس اور غرور دولت کو صدمہ پہنچا، لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے لالہ جی ایک ہزار کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو، آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا

دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکہ کی کش مکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ وتاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کیے، ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ سے دس ہزار تک دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یکہ وتنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے ''اس سے زیادہ میری ہمت نہیں آئندہ آپ کو اختیار ہے'' بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا، پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہو گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے ''بابو صاحب ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔''

''غیر ممکن''

''تیس ہزار''

''غیر ممکن''

''کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں؟''

''چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ بھی غیر ممکن بدلو سنگھ اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو میں اب ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا''

قرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لیے ہوئے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر یک صدائیں آتی تھیں گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والے حکام سرکار، ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غصہ وغم تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میاون میں شاید شوق نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو، کثرت ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنارے کے نہنگ تھے حکام ان کے قدر شناس، عملے ان کے نیازمند، وکیل اور مختاران کے ناز بردار اور اردلی، چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے، ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پا جدو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کا شکار بنے حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار

ہونے لگے۔

فوراً اس حملے کو روکنے کیلئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یک وتنہا سچائی کے سوا کچھ پاس نہیں صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں، لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم وزر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں دعوت و تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا مقدمہ بہت جلد فیصل ہو جائے گا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی پنڈت الوپی دین کے لاف شہادت نہایت کمزور اور مہم ہے وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہیں یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہیں لیکن صیغہ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز ادراک کو مغلوب کر دیتا ہے اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہئے۔

وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے، پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے، حوالیوں نے روپے برسائے سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آ گیا اور

اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے نگاہیں غرور سے لبریز، تو طعن اور تمسخر کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کیے لیکن ایک اشارہ اس وقت اس نشتہ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا، شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دے دیا تھا انصاف علم اور پیچ حرفی خطابات اور لمبی ڈاڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقت عزت کے مستحق نہیں۔

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا اس کی قیمت دینی واجبی تھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آ پہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے، بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانتدار بننے چلے ہیں گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے تف ایسی سمجھ پر، پڑھانا لکھنا سب اکارت گیا اسی اثناء میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے روداد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے ”جی چاہتا ہے اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں“ بہت دیر تک پچھتاتے اور کف افسوس ملتے رہے غصے میں کچھ سخت وسست بھی کہا اور بنسی دھر وہاں سے ٹل نہ جاتے تو عجب نہ تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا، بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا۔

جگن ناتھ اور امیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے کئی دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دل دوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا شام کا وقت تھا بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آ کر رکا سبز اور گلابی رنگ کے پردے پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے منشی جی پیشوائی کو دوڑے دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں جھک کر سلام کیا اور مدبرانہ فشانی شروع کی آپ وک کون سا منہ دکھائے منہ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے نا خلف ہے، ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے، ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا لیکن شان خودداری لئے ہوئے فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے بلانے آئے ہیں زبان شرمندہ معذرت نہیں ہوئی اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گزرا یکا یک پنڈت جی نے قطع کلام کیا "نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمائیے۔"

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے فوراً جواب دے دیا انداز حیرت سے بولے "ایسی اولاد کو اور کیا کہو"

الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا "فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پا کر پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہئے، دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں داروغہ جی اسے زمانہ سازی نہ سمجھیے، زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ

تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کو زور سے حراست میں لے لیا، آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے، ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے میں نے سب کو اپنا اور قیمتی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟''

بنسی دھر کو ان باتوں سے کچھ خلوص کی بو آئی پنڈت جی کے چہرے کی طرف اڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھے صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی غرور نے ندامت کو راہ دی شرماتے ہوئے بولی

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ہفرض نے مجھے آپ کی بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں، جو آپ کا ارشاد ہوگا بحد امکان اس کی تعمیل میں عذر نہ کروں گا۔''

الوپی دین کی التجا آمیز نگاہوں نے اسے دیکھ کر کہا ''دریا کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا، لیکن یہ سوال پورا کرنا پڑے گا''

بنسی دھر نے جواب دیا ''میں کس قابل ہوں، لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی اس میں دریغ نہ ہوگا''

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے اس مختار نامہ کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجئے میں ہریجن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا دروازے سے نہ ٹلوں گا۔

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔

پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دے دیا تھا چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لیے، روزانہ خرچ الگ، سواری کے لئے گھوڑے، اختیارات غیر محدود۔

کانپتی ہوئی آواز سے بولے

''پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے آپ نے عنایات کے بیکران کے قابل سمجھا، لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔''

الوپی دین بولے

''اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے''

بنسی دھر نے متین آواز سے کہا یوں۔۔۔۔ ''میں آپ کا غلام ہوں، آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لیے فخر کی بات ہے، لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے۔''

الوپی دین نے قلم دان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے'' مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار پرکھ چکا ہوں اب حسن تقدیر اور حسن اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آپ کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں یہ قلم حاضر ہے، زیادہ تامل نہ کیجئے اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت، سخت زبان،

تندمزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔"

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگا آئے۔ دل کے تنگ ظروف میں اتنا احساس نہ سما سکا پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیے الوپی دین فرط مسرت سے اچھل پڑے اور انہیں گلے لگا لیا۔

☆☆☆☆☆☆

بیٹی کا دھن

پہلی بار: ''زمانہ'' 1915ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1920ء (پریم بتیسی اول)

بیتوا ندی دو اونچے کراڑوں کے بیچ میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھی جیسے بعض دلوں میں ارادہ کمزور اور تن پروری کے اندر ہمت کی مدھم لہریں چھپی رہتی ہیں۔ ایک کراڑے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس کے شاندار کھنڈروں نے اسے ایک خاص شہرت دے رکھی ہے قومی کارناموں پر مٹنے والے لوگ کبھی کبھی یہاں در و دیوار شکستہ کے سامنے ایک پر خواب مایوسی کی حالت میں بیٹھے نظر آ جاتے ہیں اور گاؤں کا بوڑھا کیوٹ چودھری جب محققانہ درد و سوز کے ساتھ رانی کے محل اور راجہ کے دربار اور کنور کی بیٹھک کے مٹے ہوئے نشانات دکھاتا ہے تو اس کی آنکھیں آبگوں ہو جاتی ہیں، جس کا سننے والوں پر ان تاریخی انکشافات سے کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے۔ کیا زمانہ تھا کہ کیوٹوں کو مچھلیوں کے صلے میں اشرفیاں ملتی تھیں کہار لوگ محل میں جھاڑ دیتے ہوئے اشرفیاں بٹور لے جاتے تھے بیتوا ندی روز بروز بڑھ کر مہاراجہ صاحب کی قدم بوسی کے لئے آتی تھی یہ اقبال تھا مہاراجہ صاحب دو مست ہاتھیوں کو ایک ایک ہاتھ سے ہٹا دیتے تھے یہ سب واقعات مورخانہ انداز سے بیان کئے جاتے تھے اور ان کی نسبت اپنی رائے قائم کرنے کی ہر شخص کو اپنی خوش اعتقادی کی نسبت سے کامل آزادی تھی۔ ہاں زور بیان اور

متانت اور لب و لہجہ کسی تذکرہ کو واقعیت کا رنگ دے سکتے ہیں، تو بوڑھے چودھری کو ان کے صرف کرنے میں دریغ نہ ہوتا تھا۔

سکھو چودھری صاحب خاندان تھے، مگر جتنا بڑا منہ تھا اتنے بڑے نوالے نہ تھے۔ تین لڑکے تھے، تین بہوئیں۔ کئی پوتیاں، لڑکی صرف ایک تھی، گنگا جلی جس کا ابھی تک گونا نہیں ہوا تھا۔ یہ چودھری کی آخری اولاد تھی بیوی کے مر جانے پر اس نے اسے بکریوں کا دودھ پلا پلا کر پالا تھا۔ خاندان تو اتنا بڑا اور کھیتی صرف ایک ہل کی فراغت اور تنگی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا، مگر اس کی محققانہ اور امور خانہ قابلیت نے اسے وہ امتیاز دے رکھا تھا جس پر گاؤں کے معزز ساہوکار جھگڑ شاہ کو بھی رشک ہوتا تھا۔

جب سکھو گاؤں کے مجمع میں ضلع کے نووارد افسروں سے تاریخی یادگاروں کا ذکر کرنے لگتا تھا تو جھگڑ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انہیں بھی ایسے موقعے کی تلاش رہتی تھی، جب وہ سکھو کو نیچا دکھا سکیں۔

اس موضع کے زمیندار ایک ٹھاکر جتن سنگھ تھے جن کی بیگار کے مارے گاؤں کے مزدور اور کسان جان سے تنگ تھے امسال جب ضلع کے مجسٹریٹ کا دورہ ہوا اور وہ ان آثار قدیمہ کی سیر کے لئے تشریف لائے تو سکھو چودھری نے دبی زبان سے اپنے گاؤں والوں کی تکلیفیں بیان کیں۔ حکام سے ہمکلام ہونے میں اسے مطلق تامل نہ ہوتا تھا، اگر چہ وہ جانتا تھا کہ جتن سنگھ سے راڑ کرنا اچھا نہیں، مگر جب گاؤں والے کہتے کہ چودھری تمہارے ایسے حاکموں سے متائی ہے اور ہم لوگوں کی رات دن روتے کٹتی ہے، آخر یہ تمہاری دوستی کس دن کام آئے گی تو سکھو کا

مزاج آسان پر جا پہنچتا۔ مجسٹریٹ نے جتن سنگھ سے اس معاملے میں تحریری جواب طلب کیا ادھر جھکڑ شاہ نے چودھری کی ان مغویانہ اور سرکشانہ زبان درازیوں کی رپورٹ جتن سنگھ کو دی۔

ٹھاکر جل کر خاک ہو گیا اپنے کارندے سے بقایا کی فہرست طلب کی سوئے اتفاق سے چودھری کے ذمہ امسال کا لگان باقی تھا کچھ تو پیداوار کم ہوئی اور پھر گنگا جلی کا بیاہ کرنا پڑا۔ چھوٹی بہو نتھ کے لئے رٹ لگائے ہوئے تھی، وہ بنوانا پڑی۔ ان مصارف نے ہاتھ بالکل خالی کر دیا لگان کے بارے میں کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا جس زبان میں حکام کو خوش کرنے کی طاقت ہے کیا اس کی شیریں بیانی ٹھاکر پر کچھ اثر نہ کرے گی۔

بوڑھے چودھری تو اس اعتماد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ان پر بقایا لگان کی نالش ہو گئی سمن آ پہنچا دوسرے ہی دن پیشی کی تاریخ پڑ گئی زبان کو اپنا جادو چلانے کا موقع نہ ملا۔

جن لوگوں کے بڑھاوے سے سکھو چودھری نے ٹھاکر سے چھیڑ چھاڑ کی تھی، ان میں سے اب کسی کی صورت بھی دکھائی نہ دیتی تھی ٹھاکر کے شحنے اور پیادے گاؤں گاؤں میں پھیرے لگا رہے تھے۔ ان کا خوف غالب تھا۔ کچہری یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ کنوار کے دن، راستے میں جا بجا نالے اور ندیاں حائل کچا راستہ، بیل گاڑی کا گزر نہیں۔ پیروں میں سکت نہیں۔ آخر عدم پیروی میں یک طرفہ فیصلہ ہو گیا بودے دلوں کی وکالت کرنا دلدل میں پیر رکھنے سے کم نہیں۔

قرقی کا نوٹس پہنچا، تو چودھری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنی کمزوری کا علم اوسان کا دشمن ہے۔ شیریں بیان سکھو، جن کی روشنی طبع اس کے سر پر یہ آفتیں لائی تھی، اس وقت بچہ، بے زبان بنا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا ندی کی طرف تاکتا اور دل میں سوچتا تھا کہ کیا میرے جیتے جی گھر مٹی میں مل جائے گا۔ یہ میرے بیلوں کی خوبصورت گوئیں کیا ان کی گردن میں دوسروں کا جوا پڑے گا یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بیلوں سے لپٹ کر رونے لگتا مگر بیلوں کی آنکھوں سے کیوں آنسو جاری تھے، وہ کیوں ناند میں منہ نہیں ڈالتے تھے کیا جذبہ درد میں وہ بھی اپنے آقا کے شریک تھے؟

پھر وہ اپنے جھونپڑے کو مایوس نگاہوں سے دیکھتا کیا ہم کو اس گھر سے نکلنا پڑے گا یہ بزرگوں کی نشانی میرے جیتے جی مٹ جائے گی؟

بعض طبیعتیں آزمائش میں مضبوط رہتی ہیں بعض اس کا ایک جھونکا بھی نہیں سہہ سکتیں چودھری کی طبع ذہانت نے اب موزونی طبع کی صورت اختیار کی، جو تک بندی سے بہت مشابہ تھی اپنی کھاٹ پر پڑے وہ گھنٹوں دیوتاؤں کو یاد کرتا اور رمہابیر اور دیو کے گن گاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تینوں بہوؤں کے پاس زیور تھے، مگر عورت کا زیور اکیھ کارس ہے جو چلنے سے ہی نکلتا ہے۔ چودھری ذات کا ہٹیلا ہو، مگر طبیعت کا شریف تھا۔ ناموران سلف کا ذکر خیر کرتے کرتے اس کی طبیعت بھی غیور ہو گئی تھی وہ اپنی طرف سے کبھی بہوؤں سے اس قسم کا تقاضا نہیں کر سکتا تھا شاید یہ صورت اس کے خیال ہی میں نہ آئی تھی ہاں تینوں بیٹے اگر معاملہ فہمی سے کام لیتے تو

بوڑھے چودھری کو دیوتاؤں کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر بڑے صاحبزادے کو گھاٹ سے فرصت نہ تھی اور باقی دولڑکے اس عقدہ کو مردانہ اور دلیرانہ طریق پر حل کرنے کی فکر میں مدہوش تھے کاش! جتن سنگھ اس وقت انہیں کہیں اکیلے مل جاتے۔

منجھلے جھینگر نے کہا۔

''اونہہ، اس گاؤں میں کیا رکھا ہے، جہاں کمائیں گے وہاں کھائیں گے۔ مگر جتن سنگھ کی مونچھیں ایک ایک کر کے چن لوں گا''

چھوٹے پھکو اینڈ اکر بولے۔

''مونچھیں تم چن لینا ناک میں اڑادوں گا نکٹا بنا پھرے گا''

اس پر دونوں نے قہقہہ لگایا اور مچھلی مارنے کے لئے ندی کی طرف چل دیے۔

(3)

اس گاؤں میں ایک بوڑھے برہمن بھی رہتے تھے مندر میں پوجا کرتے تھے روزانہ اپنے ججمانوں کو درشن دینے کے لئے ندی پار جاتے، مگر کھیوے کے پیسے نہ دیتے تیسرے دن وہ زمیندار کے گویندوں کی نظر بچا کر سکھو کے پاس آئے اور رازدارانہ انداز سے بولے۔

''چودھری کل ہی تک میعاد ہے اور تم ابھی تک پڑے سو رہے ہو کیوں نہیں گھر کی چیز بستو، ڈھور ڈنگر کہیں اور ہانک دیتے ہو سمدھیانے بھیج دو جو کچھ بچ رہے وہی سہی۔ گھر کی مٹی کھود کر تھوڑے ہی لے جائے گا۔''

چودھری اٹھ بیٹھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر تقدس کی شان سے بولا

”جو کچھ اس کا حکم ہے وہ ہو گا، مجھ سے یہ حال نہ کیا جائے گا“

کئی دن کی متواتر شب و روز کی عقیدت مندانہ درد بھری دعا خوانی نے جن میں نمائش کا شائبہ نہ تھا۔ اسے مدافعت کی اس عملی اور عام تجویز پر کار پیرا نہ ہونے دیا پنڈت جی جو اس فن کے استاد تھے، نادم ہو گئے۔

مگر چودھری کے گھر کے دوسرے ممبر خدا کی مرضی پر اس حد تک شاکر نہ تھے گھر کے برتن بھانڈے چپکے چپکے کھسکائے جاتے تھے اناج کا ایک دانہ بھی گھر میں نہ رہنے پایا رات کو کشتی لدی ہوئی جاتی اور خالی واپس آتی تین دن گھر میں چولہا نہ جلا بوڑھے چودھری کے منہ میں دانہ کا کیا ذکر پانی کی ایک بوند بھی نہ پڑی تھی عورتیں بھاڑے چنے بھنا بھنا کر کھاتیں۔ لڑکے ندی سے مچھلیاں لاتے اور بھون بھون کر کھاتے اگر اس فاقہ کشی میں کوئی اس کا شریک تھا تو وہ اس کی لڑکی گنگا جلی تھی وہ غریب اپنے باپ کو چارپائی پر بے آب و دانہ پڑے کراہتے دیکھتی اور بلک بلک کر روتی۔

قدرت نے دیگر جذبات کی طرح عورتوں کو محبت بھی زیادہ دی ہے لڑکوں کو والدین سے وہ محبت نہیں ہوتی جو لڑکیوں کو ہوتی ہے اور گنگا جلی کے آنسوؤں میں الفت کا خاص جذبہ تھا مادری آل اندیشیوں سے پاک!

گنگا جلی اس فکر میں غوطے کھایا کرتی کہ کیسے دادا کی مدد کی جائے اگر ہم سب بھائی مل کر جتن سنگھ کے پاس جائیں اور ان کے پیروں پر سر رکھ دیں تو کیا وہ نہ پسیجیں گے، مگر دادا سے یہ کب دیکھا جائے گا ارے وہ ایک دن بڑے صاحب کے پاس چلے جاتے تو سب کچھ بن جاتا مگر ان کی تو جیسے بدھ ہی کیا ہو گئی اسی

ادھیڑ بن میں اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک جھلک نظر آئی۔

(4)

پجاری جی سکھو چودھری کے پاس سے چلے گئے تھے، اور چودھری بلند آواز سے اپنے سوتے ہوئے مہابیر اور بھگوان ہنومان کو بلاتے تھے کہ گنگا جلی ان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ چودھری نے دیکھا اور بولے

’’کیا ہے بیٹی رات کو کیوں باہر آئیں؟‘‘

گنگا جلی نے کہا ’’باہر رہنا تو بھاگ ہی میں لکھا ہے، گھر میں کیسے رہوں؟‘‘

سکھو نے زور سے ہانک لگائی ’’کہاں گئے تم کرشن مراری۔۔۔۔۔۔میرا دکھ ہرو۔۔۔‘‘

گنگا جلی بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی

بھجن گاتے تو تین دن ہو گئے گھر بار بچانے کی بھی کوئی اپائے سوچی کہ یہ سب مٹی میں ملا دو گے کیا ہم لوگوں کو پیڑ تلے رکھو گے؟

چودھری نے پرغم انداز سے کہا

بیٹی! مجھے تو کوئی اپائے نہیں سوجھتی بھگوان جو چاہے گا ہو گا بیگ چلو گردھر گوپالا کا ہے بلمب کرو۔

گنگا جلی بولی ’’میں نے ایک اپائے سوچی ہے، کہو تو بتاؤں‘‘

چودھری اٹھ کر بیٹھ گیا قالب بے جان میں جان سی آ گئی پوچھا

''کون سی اپائے ہے بیٹی؟''

گنگا جلی نے کہا

میرے گہنے، جھگڑ ساہو کے یہاں گروی رکھ دو۔ میں نے سمجھ لیا ہے دیئے بھر کے روپے ہو جائیں گے۔

چودھری نے آہ سرد بھری اور بولے

''بیٹی! تم کو مجھ سے یہ کہتے لاج نہیں آتی بید شاستر میں مجھے تمہارے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینا بھی نہیں لکھا ہے۔ تمہاری ڈیوڑھی میں پیر رکھنا بھی منع ہے کے امجھے نرک میں ڈھکیلنا چاہتی ہو؟''

گنگا جلی اس جواب کے لئے پہلے سے ہی تیار تھی بولی

''میں تمہیں اپنے گہنے دیے تھوڑے ہی دیتی ہوں اس وقت لے کر کام چلاؤ چیت میں چھڑا دینا''

چودھری نے زور دے کر کہا

''یہ مجھ سے نہ ہو گا''

گنگا جلی نے بھی پر جوش انداز سے جواب دیا

''تم سے نہ ہو گا تو میں آپ جاؤں گی''

مجھ سے یہ گھر کی دشا دیکھی نہیں جاتی

چودھری جھنجلا کر بولے ''برادری میں کس طرح منہ دکھاؤں گا''

گنگا جلی نے چڑ کر کہا برادری میں کون ڈھنڈورا پیٹنے جائے گا

چودھری نے فیصلہ کیا

’’جگ ہنسائی کے لئے میں اپنا دھرم نہ بگاڑوں گا‘‘

گنگا جلی نے دھمکایا

’’میری بات نہ مانو گے تو تمہارے اوپر ہتیا پڑے گی میں آج ہی اس بیتو اندی میں کود پڑوں گی گھر میں آگ لگتے نہ دیکھا جائے گا‘‘

چودھری نے پھر ایک گہری سانس لی اور یکسانہ انداز سے بولے

’’بیٹی! میرا دھرم ستیا ناس کرو اگر ایسا ہی ہے تو اپنی کسی بھاوج کے گہنے مانگ لاؤ۔گنگا جلی نے طنز کے ساتھ کہا‘‘

’’بھاوجوں سے اپنا منہ کون نچوائے ان کو فکر ہوتی تو کیا منہ میں دہی جما تھا، کہتیں نا؟‘‘

چودھری لاجواب ہو گیا گنگا جلی کی دلیلوں کے مقابلے میں اس کے انداز کی سرگرمی نے زیادہ اثر کیا اور یہی تدبیر اس وقت چودھری کی دماغی حالت کے لئے موزوں تھی جس کے عملی اوصاف زائل ہو چکے تھے وہ اپنی نہ منوا سکتا تھا صرف دوسرے کی مان سکتا تھا آگے آگے نہیں صرف پیچھے پیچھے چل سکتا تھا۔

گنگا جلی گھر میں گئی اور گہنوں کی پٹاری لے آئی اور انہیں نکال کر چودھری کے انگوچھے میں باندھ دیا چودھری نے کہا’’ہائے رام اس مٹی کی کیا گت کرو گے‘‘ یہ کہہ کر اٹھے مگر پوٹلی ہاتھ میں لیتے ہی باوجود بہت ضبط کرنے کے ان کے آنسو امنڈ آئے اور دبی ہوئی سسکیاں ایک بار زور سے پھوٹ نکلیں۔

رات کا وقت بیتوا ندی کے کراڑے پر سکھو چودھری گہنوں کی پوٹلی بغل میں دبائے اس طرح سب کی نظریں بچاتے چلے جاتے تھے گویا یہ پاپ کی گٹھری ہے۔ جب وہ جھگڑ شاہ کے مکان کے قریب پہنچے تو ذرا رک گئے۔ آنکھیں خوب اچھی طرح صاف کیں اور بشاشت کا روپ بھرا کسی کو اپنے حاسد اور بد خواہ کے سامنے بے کسی کا اظہار کرنے کی نوبت نہ آئے۔ زندگی میں اس سے زیادہ المناک اور کوئی حادثہ نہیں ہے، لیکن جب ایسی ضرورت آ ہی پڑے تو پھر جذبات پر خوب موٹا پردہ ڈالنا چاہیے۔

جھگڑ شاہ دھاگے کی کمانیوں والی ایک عینک لگائے، کچھ بہی کھاتے سامنے پھیلائے ناریل پیتے تھے اور چراغ کی دھندلی روشنی میں ان حروف کو پڑھنے کی کوشش بے سود کرتے تھے، جن میں سیاہی کا بہت کفایت شعارانہ استعمال کیا گیا تھا۔ بار بار عینک کو صاف کرتے اور آنکھیں ملتے تھے، مگر چراغ کی بتی کو اکسانا یا دوہرانا مناسب نہ خیال کرتے تھے۔ اتنے میں سکھو چودھری نے کہا۔

"جے رام جی کی"

جھگڑ نے عینکوں کی آڑ سے دیکھا آواز پہچانی بولے "جے رام جی کی چودھری کہو اس معاملے میں کیا ہوا یہ لیکن دین بڑا پاجی کام ہے دن بھر سر اٹھانے کی چھٹی نہیں ملتی"

چودھری نے پوٹلی کو زانو تلے چھپا کر لاپروائی کے ساتھ کہا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا کل اجرائے ڈگری ہونے والی ہے ٹھاکر صاحب نے جانے کب کی باہر نکالی اگر ہم کو دو تین دن کو بھی مہلت ملتی تو ڈگری نہ جاری ہونے پاتی جنٹ صاحب اور

بڑے صاحب دونوں ہم کو اچھی طرح جانتے ہیں ابھی اسی سال میں نے ان سے ندی کنارے گھنٹوں باتیں کیں۔ مگر ایک تو برسات کے دن دوسرے ایک دن کی بھی مہلت نہیں کیا کرتا، مجھے اس وقت روپیوں کی فکر ہے۔''

جھکڑ نے تعجب انگیز لہجہ میں کہا ''تم کو روپیوں کی فکر؟ گھر میں بھرا ہوا ہے، وہ کس دن کام آئے گا۔''

جھکڑ شاہ نے یہ بات طنزاً نہیں کہی تھی انہیں اور سارے گاؤں کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ ہمارے پڑوسیوں کو دنیا میں کسی اور بات کا اتنی جلدی یقین نہیں ہوتا جتنا ہماری خوش حالی کا۔

چودھری کا بہروپ کھلنے لگا بولے

''شاہ جی، روپے ہوتے تو چنتا کس بات کی تھی تم سے پردہ کون سا ہے۔ تین دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا سارے گاؤں میں رونا پیٹنا پڑا ہے اب تو تمہارے بسائے بسوں گا، ٹھاکر نے تو اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی''

جھکڑ شاہ جتن سنگھ کو خوش ضرور رکھنا چاہتے تھے، مگر چودھری کی حکام رسی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اگر اصل مع سود مرکب آسانی سے وصول ہو جائے تو انہیں چودھری کو زیر بار احسان کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ کیا عجب ہے اسی شخص کی چرب زبانیوں کی بدولت انکم ٹیکس سے نجات ہو جائے، باوجود اخفائے آمدنی کی متعدد کوششوں کے ان کی توند کی طرح روز بروز مائل بہ فراوانی تھی، بولے:

''کیا کہیں چودھری خرچ سے ہم بھی آج کل تنگ ہیں گہنے وصول نہیں ہوئے، ٹیکس کا روپیہ دینا پڑا تمہیں کتنا روپیہ درکار ہوگا؟''

چودھری نے کہا ''ڈیڑھ سو کی ڈگری ہے خرچ برچ ملا کر دو سو روپے کے لگ بھگ سمجھو۔''

جھکڑ اب اپنے داؤں کھیلنے لگا پوچھا:

تمہارے لڑکوں نے کچھ بھی مدد نہ کی وہ سب بھی تو کچھ نہ کچھ کماتے ہی ہیں۔

ساہوکار کا یہ نشانہ ٹھیک پڑا لڑکوں کی لاپروائی سے چودھری کے دل میں جو بخارات جمع تھے وہ ابل پڑے، بولے:

''بھائی! اگر لڑکے کسی لائق ہوتے تو یہ دن ہی کیوں آتا، انہیں تو اپنے چین آرام سے مطلب ہے۔ گرہستی کا بوجھ میرے سر ہے میں اسے جیسے چاہوں سنبھالوں ان سے کچھ سروکار نہیں مرتے دم بھی گلا نہیں چھوٹتا مروں گا تو سب کھال میں بھس بھروا کے رکھ چھوڑیں گے۔ یہ گرہستی نہیں جنجال ہے۔''

جھکڑ نے دوسرا تیر مارا اور وہ بھی کاری پڑا۔

''کیا بہوؤں سے بھی کچھ نہ بن پڑا؟''

چودھری نے جواب دیا:

''بہو بیٹے سب اپنی اپنی فکر میں مست ہیں میں تین دوارے پر بے دانہ پانی پڑا رہا۔ کسی نے بات نہ پوچھی، کہاں کی صلاح، کہاں کی بات چیت، بہوؤں کے پاس روپے نہ ہوں، مگر گہنے تو ہیں، اور میرے ہی بنوائے ہوئے، اس آڑے وقت پر دو دو تھان اتار دیتیں تو کیا میں چھڑا نہ دیتا۔ دن سدا یوں ہی تھوڑے ہی رہیں گے۔''

جھکڑ سمجھ گئے کہ یہ صرف زبان کا سودا ہے، اور زبان کے سودے وہ بھول کر بھی

نہ کرتے تھے، بولے:

تمہارے گھر کے آدمی بھی انوکھے ہیں کیا اتنی بھی نہیں جانتے کہ بڈھا روپے کہاں سے لائے گا زمانہ اور طرح کا ہے، یا تو کچھ جائیداد لکھو، یا پھر گہنے پاتے ہوں۔ اس کے بغیر روپیہ کہاں؟ اس میں بھی جائیداد میں سینکڑوں بکھیڑے ہیں۔ سبھیتا اسی گرو رکھنے میں ہوتا ہے ہاں جب گھر والوں کی یہی مت ہے، تو تم کیوں حیران ہو۔ یہی ہوگا نہ بدنامی ہوگی لوگ ہنسیں گے، مگر اس لاج کو کہاں تک بنا ہو گے؟

چودھری نے بیکسانہ انداز سے کہا

''جھکڑ! یہی لاج ہی تو ہے جو مارے ڈالتی ہے تم سے کیا چھپا ہے ہمارے دادا، بابا مہراج کی سواری کے ساتھ چلتے تھے اور اب آج یہ دن آ گیا ہے کہ گھر کی دیواریں تک بکی جاتی ہیں کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ یہ دیکھو، گہنوں کی پوٹلی ہے، یہ لاج نہ ہوتی تو میں اسے لے کر کبھی نہ آتا مگر یہ ادھرم اسی لاج نباہنے کے لیے سر پر لیا ہے۔''

جھکڑ نے تعجب سے پوچھا:

''یہہ گہنے کس کے ہیں؟''

چودھری نے سر جھکا کر بڑی مشکل سے کہا:

''میری بیٹی، گنگا جلی کے''

جھکڑ نے دل سوزی کے ساتھ کہا:

''ارے رام رام!''

چودھری بولے:

''ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے''

جھکڑ نے کہا:

''شاستروں میں بیٹی کے گاؤں کا روکھ تک دیکھنا منع ہے''

چودھری نے اپنی معذوری جتائی:

نہ جانے نارائن کب موت دیں گے، تین لڑکیاں بیاہیں کبھی ان کے دروازے کی صورت نہیں دیکھی پرماتما نے اب تک تو یہ ٹیک بناہی ہے، مگر اب نہ جانے مٹی کی کیا دردشا ہونے والی ہے۔

جھکڑ شاہ لیکھا جوجو اور نہ غشیش سوسو کے زریں اصول کے پابند تھے۔ سود کی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتے تھے اگر مہینے کا ایک دن بھی لگ جائے تو پورے مہینے کا سود وصول کر لیتے، مگر نوراتر کے دنوں میں روزانہ برہمنوں کو سیدھے بانٹتے۔ مذہبی عقیدت اور مذہبی فیاضی ہمارے ساہوکاروں کا زیور ہے۔ جھکڑ کے دروازے پر سال میں ایک بار بھاگوت ضروری ہوتی۔ کوئی غریب براہمن لڑکی کے بیاہ کے لئے ان کے سامنے دست سوال دراز کرے، اسے مایوسی نہ ہوتی تھی، براہمن کتنا ہی موٹا تازہ کیوں نہ ہو اسے ان کے دروازے پر مہذب نفرین اور پھٹکار نہیں سننا پڑتی تھی۔ ان کے مذہب میں بیٹی کے گاؤں کے کنوئیں کا پانی پینے کے مقابلے میں پیاس سے مر جانا بدرجہا بہتر تھا اور وہ خود اس اصول کے سختی سے پابند تھے اور اس پابندی کی قدر کرتے تھے انہیں اس وقت چودھری کی حالت پر رحم آیا یہ شخص جس نے کبھی اوچھے خیالوں کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اس وقت زمانہ کی کشمکش سے

مجبور ہو کر ادھرم پر اتر آیا۔اس کے دھرم کی رکشا کرنی چاہئے۔

یہ خیال آتے ہی جھکڑ شاہ گدی سے اٹھ بیٹھے اور تسکین بخش انداز سے بولے ’’وہی پرماتما جس نے اب تک یہ ٹیک نباہی ہے،اب بھی تمہارا پرن نبھائے گا۔لڑکی کے گہنے لڑکی کو دے۔لڑکی جیسی تمہاری ہے ویسی میری میں ڈگری کے کل روپے تمہیں دے دوں گا،جب ہاتھ میں روپے آئیں تو دے دینا مجھے لوگ جتنا برا کہتے ہیں اتنا بُرا نہیں ہوں۔ہاں اپنا پیسہ پانی میں نہیں بہاتا۔‘‘

چودھری پر اس فیاضانہ ہمدردی کا نہایت گہرا اثر ہوا وہ با آواز بلند رونے لگے انہیں اپنی بھگتی کی دھن میں اس وقت کرشن بھگوان کی موہنی مورت سامنے کھڑی نظر آئی۔وہ جھکڑ جو تمام گاؤں میں بدنام تھا۔جس کی اس نے بارہا حاکموں سے شکایت کی تھی،اس وقت چودھری کو ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا بولے:

’’جھکڑ! اس وقت تم نے میری بات۔۔۔۔میری لاج۔۔۔۔۔میرا دھرم سب کچھ رکھ لیا تم نے میری ڈوبتی ہوئی ناؤ پار لگا دی کرشن مراری تم کو اس کا پھل دیں گے اور میں تو جب تک جیوں گا تمہارے گن گاتا رہوں گا۔‘‘

دو بھائی

پہلی بار: ''زمانہ'' جنوری 1912ء

صبح کے وقت آفتاب کی سہانی سنہری دھوپ میں جسودا اپنے دونوں بیٹوں کو زانوؤں پر بٹھائے دودھ اور روٹی کھلاتی تھی۔ کرشن بڑا تھا، بلرام چھوٹا دونوں منہ میں لقمہ لیتے کسی قدم اچھل کر پھر زانوؤں پر آ بیٹھے اور اپنی توتلی بولی میں ان موزوں فقروں کی رٹ لگاتے تھے جو ایک پرانے زندہ دل شاعر نے کسی جاڑے کے ستائے ہوئے لڑکے کی زبان سے ادا کیے ہیں۔

دیو دیو گھام کرو تمہارے بالک کو لگتا جاڑ

ماں انہیں چمکار کر بلا لیتی اور بڑے بڑے کور کھلاتی اس کے دل میں محبت کا سرور تھا آنکھوں میں غرور کی جھلک ہوتی تہہ آب میں تھا، حباب لہروں کے اوپر

دونوں بھائی بڑے، ساتھ ساتھ گلے میں بانہیں ڈالے کھیلتے تھے، کرشن ذہین تھا بلرام توانا دونوں میں اتنی محبت تھی کہ ساتھ ساتھ مکتب جاتے، مگرا کیلے مٹھائی نہ کھاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی شادیاں ہوئیں۔ کرشن کی رادھا چرب زبان اور چنچل تھی۔ ہرن کی سی آنکھوں والی بلرام کی شیاما سانولی سلونی، خوش قامت، لحیم شحیم عورت تھی۔ بہت شیریں زبان، بہت متین، بہت کم سخن۔

کرشن رادھا پر موہے بلرام شیاما پر ریجھے مگر جسودا کا من کسی سے نہ ملا وہ دونوں

سے خوش اور دونوں سے ناراض تھی اس کی قوت تقریر وتضحیک وتمثیل بہت کچھ اس بیکار کوشش میں صرف ہوتی کہ رادھا اپنے شعور کا ایک حصہ شیاما کے خلق سے بدل لے۔

دونو بھائی صاحب اولاد ہوئے تناور درخت خوب پھیلا اور پھلوں سے لد گیا۔ چھریرے درخت میں صرف ایک پھل نظر آیا وہ بھی کچھ زرد سا مرجھایا ہوا۔ مگر دونوں تقدیر کے شاکی تھے بلرام کو زر و مال کی ہوس تھی، کرشن کو اولاد کی تمنا۔

اس شکوہ تقدیر نے رفتہ رفتہ رشک کی صورت اختیار کی جو حسد کا پیش خیمہ تھی، شیاما اپنے بچوں کے ساز و پرداخت (میں) مصروف رہتی۔ سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ غریب رادھا کو چولہے میں جلنا اور چکی میں پسنا پڑتا۔ یہ کوفت اور جلن کبھی کبھی ناخوش گوار الفاظ میں ظاہر ہوتی۔ شیاما سنتی، کڑھتی اور ضبط کرتی مگر اس کا یہ ضبط وہ خموشی تھی جو ساہوکار کے تقاضوں کو روز بروز سختی کی جانب مائل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہرن راہ فرار نہ پا کر شکاری کی طرف لپکا غضب ناک پیکار کے لئے سینگین جھکائے ہوئے۔ رادھا اور شیاما زاویہ بنانے والے خطوں کی طرح علیحدہ ہو گئیں۔ اس دن ایک ہی گھر میں دو چولہے جلے مگر بھائیوں نے دانہ کی صورت نہ دیکھی اور جسودا سارے دن روتی رہی۔

کئی سال گزر گئے دونوں بھائی جو کسی زمانہ میں ایک ہی زانو پر بیٹھتے تھے، ایک ہی تھالی میں کھاتے تھے اور ایک ہی چھاتیں سے دودھ پیتے تھے۔ انہیں اب ایک گھر میں، ایک گاؤں میں رہنا شاق تھا مگر خاندان کی ساکھ قائم رہے اس لئے اس رشک اور عناد کی دہکتی ہوئی آگ کو راکھ کے نیچے چھپانے کی کوشش ہوتی تھی۔

ان کے درمیان اب برادرانہ محبت اور خلوص کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف بھائی کے نام کی عزت تھی جو انہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی بھائیوں کے ارتباط اور یگانگت کا معیار ہماری نگاہوں میں کتنا اونچا ہے ماں اب بھی زندہ تھی دونوں بیٹوں کی لاگ کو دیکھتی تھی اور کڑھتی تھی دل میں محبت وہی تھی مگر آنکھوں میں غرور تھا پھول وہی تھا مگر اس کی شگفتگی رخصت ہوگئی تھی۔

دونوں بھائی جب بچے تھے تو ایک کو روتے ہوئے دیکھ کر دوسرا بھی رونے لگتا تھا۔ وہ تب بے سمجھ، ناداں اور بھولے تھے آج ایک کو روتے ہوئے دیکھ کر دوسرا ہنستا تھا اور تالیاں بجاتا تھا اب وہ سمجھ دار، دانش مند اور ہوشیار ہو گئے تھے۔

جب انہیں اپنی رائے کی تمیز نہ تھی، اس وقت اگر کوئی آدمی محض چھیڑنے کے لیے ایک کو اپنے ساتھ لے جانے کی دھمکی دیتا تو دوسرا زمین پر لوٹ جاتا اور اس آدمی کا دامن پکڑ لیتا اب اگر ایک بھائی کو موت بھی دھمکاتی تو دوسرے کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے اب انہیں اپنے پرائے کی تمیز ہوگئی تھی۔

بیچارے بلرام کا حال تباہ تھا۔ عیال کثیر، آمدنی قلیل، اس پر وضع داری کا نباہ، دل چاہے روئے، مگر ہونٹ ہنستے رہیں۔ سینہ تمام داغ داغ ہو مگر کپڑے نہ میلے ہوں۔ چار لڑکے، چار لڑکیاں، ضروریات زندگی موتیوں کے مول، چند پائیوں کی زمینداری کہاں تک سنبھالتی۔ لڑکوں کی شادی خیر اختیاری تھی مگر لڑکیوں کی شادی کیسے ٹلتی۔ دو پائی زمین لڑکی کی شادی کی نذر ہوگئی اس پر بھی باراتی لوگ آنگن سے بھات کھائے بغیر اٹھ گئے۔ دوسری لڑکی کا بیاہ کچے دھاگے کی گانٹھ تھی۔ شیاما نے دولہے کو دیکھا اور بھرتے آنگن میں پھوٹ پھوٹ روئی سال بھر بعد تیسری لڑکی کی

شادی در پیش ہوئی پیڑ پتے بھی نہ بچے ہاں ڈال بھر پور تھی مگر تنگ دستی اور امانت میں سگ واستخواں کا تعلق ہے دو سال کی لگان باقی تھی لڑکی کے زیور گروی رکھے گئے گلا چھوٹا رادھا اسی موقع کی منتظر تھی نئے رشتہ داروں کے یہاں خبر بھیج دی تم لوگ غافل بیٹھے ہو یہاں زیوروں کا صفایا ہو جاتا ہے تیسرے دن ایک نائی اور دو برہمن بلرام کے دروازہ پر آکر بیٹھ گئے۔ غریب کی گردن میں پھانسی پڑی۔ روپے کہاں سے آئیں نہ زمین نہ جائیداد، نہ باغ نہ بغیچہ، اعتبار کب کا اٹھ چکا تھا۔ اب اگر کوئی جائداد تھی تو صرف وہی دو کوٹھریاں جن میں اس نے اتنی عمر گزاری تھی اور ان کا کوئی گاہک نہیں ادھر تاخیر وتامل میں ناک کٹی جاتی تھی مجبور ولاچار ہو کر کرشن کے پاس آیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے بولا ''بھیا میں اس وقت بڑی آفت میں ہوں، میری مدد کرو''

کرشن نے جواب دیا ''بلو! آج کل میں بھی سخت تنگ ہو رہا ہوں تم سے سچ کہتا ہوں''

رادھا نے مالکانہ انداز سے مداخلت کی ''ارے تو کیا اب ان کے لئے بھی تنگ ہو رہے ہیں الگ کھانا کھانے سے کیا عزت الگ ہو جائے گی''

کرشن نے بیوی کی طرف خفیف نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''نہیں نہیں یہ مطلب نہیں تھا۔ ہاتھ تنگ ہے تو کیا کوئی نہ کوئی فکر کرنا ہی پڑے گی''

رادھا نے بلرام سے کہا ''پانچ بیس سے کچھ اوپر ہی پر گہنے رکھے تھے نا؟''

بلرام نے جواب دیا ''وہاں سود ملا کر کوئی سوا سو روپے ہوتے ہیں''

کرشن بھاگوت پڑھ رہے تھے پھر پڑھنے میں غرق ہو گئے رادھا نے معاملہ کی

بات چیت شروع کی ''روپیہ تو بہت ہے ہمارے پاس ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ہم کو بھی دوسرے سے دلانا پڑے گا اور مہاجن بنا کچھ لکھائے پڑھائے روپیہ دیتے نہیں''

بلرام نے سوچا اگر کچھ لکھانے پڑھانے کو ہوتا تو کیا اور مہاجن مر گئے تھے۔ تمہارے دروازے آتے ہی کیوں؟

بولا'' لکھنے پڑھنے کو میرے پاس ہے کیا جو کچھ جگہ جائیداد ہے وہ یہی گھر ہے۔''

رادھا اور کرشن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کیا آج سچ مچ زندگی کے ارمان نکلیں گے اور یہ مایہ شر خانہ بدر ہوگا مگر اس روحانی سرور نے چہرہ تک آتے آتے فکر آمیز غور کی صورت اختیار کر لی رادھا بولیں ''گھر پر کوئی مہاجن شاید ہی روپیہ دے شہر ہو تو کچھ کرایہ ہی آئے۔ دیہات میں تو کوئی سینت میں رہنے والا بھی نہیں۔ پھر ساجھے کی چیز ٹھہری۔''

کرشن نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ کہیں کوئی لفظ مصلحت کے خلاف نہ زبان سے نکل جائے ''ایک مہاجن سے میری راہ و رسم ہے وہ شاید کہنے سننے سے راضی ہو جائے۔''

رادھا نے گردن ہلا کر اس بار موقع مداخلت کی داد دی اور فرمایا ''ہاں بس آپس ہی میں معاملہ ہو سکتا ہے اور پھر دو تین بیس سے زیادہ ملنا بھی کٹھن ہے۔''

کرشن نے جان پر کھیل کر کہا کہ کہیں رادھا کی سخت گیری سے شکار نہ نکل بھاگے ''ارے بہت دبانے سے چار بیس ہو جائیں گے اور کیا؟''

رادھا نے اب کی پر ملامت انداز سے دیکھا اور آنکھوں سے اس عجلت کی سرزنش کرنے کے بعد بولی "چار بیس دلادو تو میں آج ہی لکھ پڑھ دوں مہاجن ایسے اندھے نہیں ہوتے"

بلرام اپنے بھائی اور بھاوج کے رمو کنایہ کو کچھ کچھ سمجھتا تھا اور حیران تھا کہ انہیں اتنی عقل کہاں سے آ گئی بولا "اور روپیہ کہاں سے آئیں گے؟"

رادھا نے چڑھ کر کہا "اور روپیہ کے لئے اور فکر کرو سوا سو روپے ان دو کوٹھریوں کے اس جنم میں کوئی نہ دے گا چار بیس چاہو تو ایک مہاجن سے دلا دوں لکھا پڑھی کر لو"

بلرام اب ایک احمقانہ ضد کے ساتھ اڑ گیا بولا "اور کون سی فکر کروں گہنے زیور ہوتے تو کہتا لاؤ گروی رکھ دوں۔ یہاں تو کچا دھاگا بھی نہیں ہے۔ جب بدنام ہی ہوئے تو کیا دس کے لئے، کیا پچاس کے لئے، دونوں ایک ہی ہے اگر گھر بیچ کر میری ناک بچ جائے یہاں تک تو غنیمت ہے لیکن گھر بھی بیچوں اس پر بھی آبرو کے لالے پڑے رہیں، ایسا میں نہ کروں گا صرف نام کا خیال ہے نہیں ایک بار انکار کر جاؤں تو کوئی میرا کیا بنا لے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا اور سچ پوچھو تو مجھے اپنے نام کی فکر نہیں ہے مجھے کون جانتا ہے سنسار تو بھیا ہی کو ہنسے گا۔"

کرشن کا چہرہ زرد ہو گیا رادھا بھی گھبرائی معاملہ فہم عورت تھی اور خوش فہمی کی قدر کرتی تھی، مگر بلرام جیسے کندہ ناتراش سے اسے ایسی گرفت کی امید نہ تھی۔ قدر دانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ کر بولی "لالہ! کبھی کبھی تم بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔ بھلا اس جھونپڑی پر کون سوا سو روپے نکال کر دے دے گا۔ تم سوا

سو کے بدلے سو ہی دلوا دو، میں آج ہی اپنا حصہ بیچتی ہوں۔ اتنا ہی میرا بھی تو ہے گھر پر تو تم کو وہی چار بیس ملیں گے۔ ہاں اور روپے کی فکر ہم خود کر دیں گے۔ عزت ہماری تمہاری ایک ہے وہ نہ جانے پائے گی یہ روپیہ الگ کھاتے میں چڑھا دیا جائے گا۔''

بلرام کی باچھیں کھل گئیں۔اس نے میدان مار لیا سوچنے لگا مجھے تو روپیہ سے کام ہے چاہے ایک نہیں دس کھاتوں میں چڑھالو۔ رہا مکان، وہ جیتے جی چھوڑتا نہیں، خوشی خوشی چلا، اس کے جانے کے بعد رادھا کرشن نے بہروپ کھول دیا اور بتہ دیر تک اس معاملے کے حسن و قبح پر مباحثہ کرنے اور ایک دوسرے وک اس کڑے سودے کا قصوروار ٹھہرانے کے بعد اس طرح دل کو سمجھایا کہ لقمہ شیریں قدح پر نہ ہوتو مضائقہ نہیں ہاں اب دیکھیں شیاما رانی اس گھر میں کیسے راج کرتی ہے۔

دنیا میں نیک اوصاف اس قدر معدوم کیوں یں۔اس کا خالق وہ پاک ہستی ہے جو فیض و رحمت کا بحر بیکراں اور جود وکرم کا سر چشمہ ہے۔ کیا اس نے یہ بہشتی نعمتیں دنیا کو نہیں دیں۔

جس قدرت کاملہ نے دنیا کا نظام قائم کیا اور بڑے بڑے سماوی اجرام، حتیٰ کہ عناصر اور ہیولیٰ کو بھی مقررہ قوانین کا مطیع فرمان بنایا۔ اس نے انسان جیسی ضعیف ہستی کو کیوں اس قدر آزاد کر دیا جب کہ وہ اس آزادی کا ہمیشہ بیجا استعمال کرتا ہے۔

وہ دونوں بیل جو کرشن کے دروازے پر بندھے ہوئے ہیں ان میں کتنی دوستی

ہے دونوں ایک ہی جوئے میں چلتے ہیں۔بس اتنا ہی ناتا ہے،مگر ابھی چند روز ہوئے جب ان میں سے ایک رادھا کے میکہ میں مانگے گیا تھا تو دوسرے نے یہاں تین دن تک ناند میں منہ نہیں ڈالا۔

مگر ایک گود کے کھیلے ہوئے بھائی، ایک چھاتی سے دودھ پینے والے آج اتنے بیگانہ ہو گئے ہیں کہ ایک گھر میں رہنے کے روادار نہیں کرشن کی بنسی اس دن بجے گی جب غریب بلرام اپنے بال بچوں کو لئے خانہ تباہ آوارہ وطن بننے پر مجبور ہو گا۔

صبح کا وقت تھا کرشن کے دروازے پر گاؤں کے مکھیا اور نمبردار جمع تھے اور منشی داتا دیال منشیانہ شکوہ و تجمل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے رہن نامہ کا مسودہ مرتب کرنے میں غرق تھے۔بار بار قلم بناتے، بار بار قطر رکھتے مگر خط کی شان نہ سدھرتی تھی۔کرشن کا چہرہ اسی منظر صبح کی طرح شگفتہ تھا اور رادھا خوشی سے اچھلی پڑتی تھی۔مگر غریب بلرام ان غمناک خیالوں میں جو تاریکی کے رفیق ہیں اور روشنی میں پاس نہیں آتے۔

مکھیا نے کہا ’’بھائی ایسا ہت نہ بھائی ایسا دشمن، کرشن مہاراج نے چھوٹے بھائی کو سنبھال لیا۔‘‘

نمبردار نے عالمانہ انداز سے فرمایا ’’کرشن مہاراج نے تو سارے گوکل کو بچا لیا تھا چھوٹا بھائی تو پھر بھائی ہے۔‘‘

مختار نے فرمایا ’’بھائی سپوتوں کے یہی کام ہیں‘‘

داتا دیال نے پوچھا ’’راہن کا نام؟‘‘

بڑے بھائی بولے ’’بلرام ولد باسدیو‘‘

''اور مرتہن؟''

''کرشن ولد باسدیو''

بلرام نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا حیرت آ گے تھی، آنسو کی قطار پیچھے کرشن نے بھی اس کی طرف دیکھا نگاہ سامنے نہ ہو سکی۔ یہ انسان پر قدرت کی فتح ہے۔

نمبر دار اور مختار اور مکھیا سب چونکے کیا کرشن خود ہی روپیہ دے رہا ہے بات چیت تو کسی ساہوکار کی تھی جب گھر ہی میں روپیہ موجود تھا تو اس رہن نامہ کی کیا ضرورت تھی کیا بھائی بھائی میں اتنا اعتبار نہیں ارے رام رام!

آنکھیں محو اشارہ ہوئیں گویا کشتیاں حیرت کی اتھاہ ندی میں ڈگمگانے لگیں۔

شیاما دروازہ پر کھڑی تھی وہ کرشن کی ہمیشہ عزت کرتی تھی مگر آج محض رواج کی پابندی نے اس موقع پر اسے اپنے خیال کے اظہار سے باز رکھا۔

بوڑھی اماں نے سنا سوکھی ندی امنڈ آئی اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور ماتھا ٹھونک لیا نوشتہ تقدیر سے ہار گئی۔

تب اسے اس دن کی یاد آئی جب ایسی ہی سہانی، سنہری صبح تھی اور دو پیارے پیارے گلعذار بچے اس کی گود میں بیٹھے ہوئے اچھل اچھل کر دودھ اور روٹی کھاتے تھے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کتنا غرور تھا دل میں کتنا حوصلہ، کتنی امنگ!

مگر آج! آہ آج آنکھوں میں ندامت کے آنسو ہیں اور دل پر حسرت و حزن کا ایک بار گراں اس نے ایک بار پھر زمین کی طرف دیکھا اور لہجہ یاس میں بولی

''نارائن! کیا ایسے لڑکوں کو میرے ہی کوکھ سے جنم لینا تھا؟''

اختتام ----------- حصہ اول

فہرست

پنچایت	03
عالم بے عمل	18
حج اکبر	31
سوجان بھگت	48
خنجر وفا	65
عبرت	82
آتمارام	92
بوڑھی کاکی	106
نوک جھونک	119
عجیب ہولی	132
دستِ غیب	141
فلسفی کی محبت	159
ستیہ گرہ	184
راہِ نجات	206
عفو	221
بھوت	233
سوا سیر گیہوں	252
شطرنج کی بازی	263
ڈگری کے روپے	281
بھاڑے کا ٹٹو	302

IqbalCyberLibrary
All rights reserved.
©2002-2006

پنچایت

پہلی بار: ''زمانہ'' مئی جون 1912ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1920ء (پریم بتیسی اول)
بعد میں ہندی میں یہی افسانہ ''پنچ پرمیشور'' کے عنوان سے شائع ہوا

جمن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی لین دین میں بھی سب کچھ ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد تھا جمن جب حج کرنے گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے وہ نہ ہم نوالہ تھے نہ ہم مشرب صرف ہم خیال تھے اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا جب دونوں لڑکے جمن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبرو نوے ابدتہ کرتے تھے۔ الگو نے استاد کی بہت خدمت کی خوب رکابیاں مانجھیں خوب پیالے دھوئے ان کا حقہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا جسے الگو خوب جانتا تھا ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے تعلیم کے مقابلے میں انہیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا وہ کہا کرتے تھے استاد کی دعا چاہئے جو کچھ ہوتا ہے فیض سے ہوتا ہے اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیل علم کا کوئی دقیقہ اس نے فروگزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر ہی میں نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود

دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانے کے زیادہ قائل تھے اور جمن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمن کی قرب و جوار کے مواضعات میں پرشش ہوتی تھی۔ بیع نامہ یا رہن نامہ کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین، کانسٹیبل اور تحصیل کا مذکورہ یہ سب ان کے دست کرم کے محتاج تھے اس لئے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا۔ تو شیخ جمن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

شیخ جمن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں ان کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی مگر غریب کا وارث کوئی نہ تھا جمن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرالی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہ ہوئی تھی خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں خوب میٹھے لقمے چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے، مگر پگڑی کی مہر ہوتے ہی ان کی خاطر داریوں پر بھی مہر ہو گئی وہ وعدے وصال کے دمورے ثابت ہوئے جمن کی اہلیہ بی فہیمن نے روٹیوں کے ساتھ چیز بھی بدل دیں اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے کم کر دی۔ بڑھیا وقت کے بورئیے بٹورے گی کیا اور تین بیگھے اوسر کیا دے دیا ہے۔ اک دن دال بغیر روٹی نہیں اترتی۔ جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں گیا، اگر ہوتا تو اب تک کئی گاؤں مول لے لیتے کچھ دنوں تک خالہ جان نے اور دیکھا مگر جب برداشت نہ ہوئی تو جمن سے شکایت کی جمن صلح پسند آدمی تھا اب اس معاملے میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا کچھ دن تو رو دھو کر کام چلا آخر ایک روز خالہ جان نے جمن سے کہا۔

”بیٹا تمہارے ساتھ میرا نباہ نہ ہو گا تم مجھے روپے دے دیا کرو میں اپنا الگ پکا لوں گی۔“

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا ”روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے؟“

خالہ جان نے بگڑ کر کہا ”تو مجھے کچھ نان نمک چاہیے یا نہیں؟“

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا ”چاہیے کیوں نہیں میرا خون چوس لو! کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھتا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کر آئی ہو“

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں جامہ سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی جمن ہنسے وہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے کہا ہاں ضرور پنچایت کرو فیصلہ ہو جائے مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں۔

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔قرب و جوار میں ایسا کون تھا جو ان کا شرمندہ منت نہ ہو؟ کون تھا جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے آسمان کے فرشتے تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لئے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہیں کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی ایک قدم چلنا مشکل تھا مگر بات آپڑی تھی اس کا تصفیہ ضروری تھا شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

”بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ درازی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا

رکھی مگر خوبی تقدیر کوئی اس طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا ذرا اس ہوس کو دیکھو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں آج مریں کل دوسرا دن ہوا، مگر صبر نہیں ہوتا پوچھو اب تمہیں گھر بار جگہ زمین سے کیا سروکار ایک لقمہ کھاؤ ٹھنڈا پانی پیو اور مالک کی یاد کرو سب سے بڑی تعداد ستم ظریفوں کی تھی خمیدہ کمر پوپلا منہ سن کے سے بال اور ثقل ساعت جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی کا آنا قدرتی امر ہے غرض ایسے درد رس انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو، اور اسکی تشفی ہو، چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی لاٹھی پٹک دی اور دم لے کر کہا''

''بیٹا تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا''

الگو بے رخی سے بولے

''مجھے بلا کر کیا کرو گی کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں گے ہی''

خالہ نے ہانپ کر کہا ''اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے؟ ہمارے سید سالار گہار سن کر پیڑ سے اٹھ آئے تھے کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا۔''

الگو نے جواب دیا ''یوں آنے کو میں آ جاؤں گا، مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا''

''خالہ نے حیرت سے پوچھا کیوں بیٹا''

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا ''اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت

جمن میرے پرانے دوست ہیں اس سے بگاڑ نہیں کرسکتا‘‘

خالہ نے تاک کر نشانہ مارا’’بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟‘‘

ہمارے سوئے ایمان کی ساری جتھا چوری سے لٹ جائے اسے خبر نہیں ہوتی مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے اور ہشیار ہو جاتا ہے الگو رچودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے کیا وہ ’’نہیں‘‘ کہنے کی جرأت کر سکتے تھے؟

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی ٹاٹ بچھا ہوا تھا حقہ پان کا بھی انتظام تھا یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ بااثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے جنہیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پروا نہیں ہوسکتی تھی کتنے مجلس کو دعوت احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی بی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:

’’پنچو آج تین سال ہوئے میں نے اپنی سب جائیداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھ دی تھی اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے جمن نے مجھے تاحین حیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے، مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں بیکس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں تم لوگ جو راہ نکال دو اس راہ پر چلوں اگر میری برائی دیکھو میرے منہ پر تھپڑ مارو جمن کی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ کیوں ایک بیکس کی آہ لیتا ہے‘‘

رام دھن مصر بولے ''(ان کے کئی اسامیوں کو جمن نے توڑ لیا تھا) جمن میاں پنچ کسے بدتے ہو ابھی سے طے کر لو''

جمن نے حاضرین پر ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی اپنے تئیں مخالفوں کے نرغے میں پایا دلیرانہ انداز سے کہا:

''خالہ جان جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے عذر نہیں ہے''

خالہ نے چلا کر کہا ''ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟''

جمن نے بڑھیا کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا

''اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ جسے چاہو پنچ بنا دو''

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا بولیں ''بیٹا خدا سے ڈر، میرے لئے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہیں اور سب کو جانے دو الگو چودھری کو تو مانے گا؟''

جمن فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے مگر ضبط کر کے بولے

''الگو چودھری ہی سہی میرے لئے جیسے رام دھن مصر، ویسے الگو کوئی میرا دشمن نہیں ہے''

''الگو بغلیں جھانکنے لگے اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے معترضانہ انداز سے کہا''

''بوڑھی ماں تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے''

خالہ نے جواب دیا

''بیٹا دوستی کے لئے کوئی اپنا ایمان نہیں بیچتا پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے''

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا سرپنچ بنے رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے

الگو چودھری نے فرمایا

''شیخ جمن ہم اور تم پرانے دوست ہیں جب ضرورت پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے، تمہاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو، نہ ہم تمہارے دوست، یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو کہو''

جمن ایک شان فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

پنچو میں خالہ جان کو اپنی ماں کی بجائے سمجھتا ہوں اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا ان بن رہتی ہے اس میں میں مجبور ہوں عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔

الگو کو آئے دن عدالت سے واسطہ رہتا تھا قانونی آدمی تھے جمن سے جرح کرنے لگے ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے جمن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے اچھی دوستی نباہی اس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے وہ یہ تو نہ جانتے کہ کون کون سے کھیت کتنے

پر اٹھتے ہیں اور کیا نکاسی ہوتی ہے ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا لہجہ نہایت سنگین اور تحکمانہ تھا

"شیخ جمن پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے تمہیں چاہئے کہ خالہ جان کے ماہوار گزارے کا بندوبست کر دو اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا"

جمن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آ گیا احباب سے کہنے لگا

"بھئی اس زمانہ میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے اس کی گردن پر چھری پھیری جائے اسی کو نیرنگی روزگار کہتے ہیں، اگر لوگ ایسے دغاباز جو فروش گندم نما نہ ہوتے تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں یہ ہیضہ اور پلیگ انہی مکاریوں کی سزا ہے۔"

مگر رام دھن مصر اور فتح اور جگو سنگھ اس بے لاگ فیصلہ کی تعریف میں رطب اللسان تھے اس کا نام پنچایت ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی دوستی دوستی کی جگہ ہے مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے ایسے ہی ستیہ بادیوں سے دنیا قائم ہے ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔

اس فیصلہ نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں لا دیں تناور درخت حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا وہ اب بھی ملتے تھے مگر وہ تیر وسپر کی طرح جمن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا پچھلے سال مصر و بٹیسر کے میلے سے بیلوں

کی ایک اچھی گوتیاں مول لائے تھے پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے مہینوں تک قرب وجوار کے لوگ انہیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینہ بعد ایک بیل مر گیا جمن نے اپنے دوستوں سے کہا

''یہ دغابازی کی سزا ہے انسان صبر کر جائے، مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمن نے اسے زہر دلوایا ہے اس کے برعکس چودھرائین کا خیال تھا کہ اس پر کچھ کرایا گیا ہے۔ چودھرائین اور فہمن میں ایک دن زور شور سے ٹھنی دونوں خواتین نے روانی بیان کی ندی بہا دی تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں بارے جمن میں آگ بجھا دی بیوی کو ڈانٹا اور رزم گاہ سے ہٹا لے گیا ادھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں بیانی کی داد دی۔''

ایک بیل کس کام کا اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا نا چار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھے وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے اور گاؤں میں بیچتے تھے اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی سوچا اسے لے لوں، تو دن میں بلا کسی منت کے تین کھیوے ہوں نہیں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا گاڑی میں دوڑایا۔ دام کے لئے ایک مہینہ کا وعدہ ہوا چودھری بھی غرض مند تھے گھاٹے کی کچھ پروا نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا تو پاؤں پھیلائے دن میں، تین تین چار چار کھیوے کرتے نہ چارے کی فکر تھی نہ پانی کی بس کھیوؤں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے وہاں کچھ سوکھا بھس ڈال دیا اور غریب جانور ابھی دم نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا

الگو چودھری کے یہاں تھے تو چین کی بنسی بجتی تھی راتب پاتے، صاف پانی، دلی ہوئی ارہر، بھوسے کے ساتھ کھلی، کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرے کرتا بدن کھجلاتا، جھاڑتا، پونچھتا، سہلاتا، کہاں وہ ناز و نعمت کہاں یہ آٹھوں پہر کی رپٹ مہینہ بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں، لیکن اصیل جانور، مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا دن بھر کا تھکا جانور، پیر مشکل سے اٹھتے تھے اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا کچھ دور دوڑا چاہا کہ ذرا دم لے ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر، کئی کوڑے بے دردی سے لگائے بیل نے ایک بار پھر زور لگایا مگر طاقت نے جواب دے دیا زمین پر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا سیٹھ نے بہت مارا پیٹا، ٹانگ پکڑ کر کھینچی، نتھنوں میں لکڑی ٹھونس دی، مگر لاش نہ اٹھی تب کچھ اندیشہ ہوا غور سے دیکھا بیل کو کھول کر الگ کیا اور سوچنے لگے کہ گاڑی کیوں کر گھر پہنچے، بہت چیخے اور چلائے مگر دیہات کا راستہ بچوں کی آنکھ ہے سرِشام سے بند، کوئی نظر نہ آیا قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا مارے غصہ کے موئے بیل پر اور درے لگائے سسرے تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا تو نے آدھے راستہ میں دانت نکال دیے۔ اب گاڑی کون کھینچے؟ اس طرح خوب جلے بھنے کئی بورے گڑ اور کوئی کنستر گھی کے بیچے تھے دو چار سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے، گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے چھوڑ کر جا بھی نہ سکتے گاڑی پر لیٹ گئے، وہیں رت جگا کرنے کی ٹھان لی اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے حقہ پیا، گایا، پھر حقہ پیا، آگ جلائی، تا پا اپنی دانست میں

وہ تو جاگتے ہی رہے مگر جب پو پھٹی چونکے اور کمر پر ہاتھ رکھا، تو تھیلی ندارد کلیجہ سن سا ہو گیا، کمر ٹٹولی، تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا، پچھاڑیں کھانے لگے صبح کو بہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثہ الم ناک سنا تو چھاتی پیٹ لی، پہلے تو خوب روئیں تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں حفظ ماتقدم کی سوجھی نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی، فقیر ہو گئے۔ انہیں دام کی پڑی ہے مردہ منحوس بیل دیا تھا، اس پر دام مانگتے ہیں آنکھ میں دھول جھونک دی مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے کسی گڈھے میں منہ دھو آؤ تب دام لینا صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو اور کیا لوگے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدر دان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آتے مگر ڈیڑھ سو روپے سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔

ایک بار وہ بھی بگڑے سیٹھ جی گرم ہو پڑے۔ سیٹھانی جی جذبہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا مجادلہ کی نوبت آ پہنچی سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کر لیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا۔ اور صلاح دی کہ آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلے گا۔ اس سے کیا فائدہ پنچایت کر لو جو کچھ طے ہو

جائے اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے الگو نے بھی ہامی بھری فیصلہ ہو گیا پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت تھا کھیتوں میں کووں کی پنچایت لگی ہوئی تھی امر متنازعہ یہ تھا مٹر پھلیوں پر اس کا جائز استحقاق ہے، یا نہیں، اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے دار پر اپنی بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں زبردست مباحثہ ہو رہا تھا بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انہیں من حیث القوم بے وفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

پنچایت پوری آ بیٹھی، تو رام دھن مصر نے کہا:

''اب کیوں دیر کی جائے بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟''

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا:

سمجھ سیٹھ ہی چن لیں

سمجھ سیٹھ کھڑے ہو گئے اور کڑک کر بولے:

میری طرف سے شیخ جمن کا نام رکھ لو

الگو نے پہلا نام جمن کا سنا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا، گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہ پر پہنچ گئے بولے ''چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟''

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا ''نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے''

اس کے بعد چار نام اور تجویز کیئے گئے الگو پہلا چرکا کھا کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا الگو اس فکر میں تھے، کہ اس مرحلہ کو کیوں کر طے کروں کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوڈر شاہ بولے:

''سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟''

سمجھو کھڑے ہو گئے، اور اکڑ کر بولے شیخ جمن کو

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا ''الگو تمہیں کوئی عذر ہو تو بولو''

الگو نے قسمت ٹھونک لی، حسرت ناک لہجے میں بولے ''نہیں مجھے عذر کوئی نہیں ہے۔''

اپنی ذمہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما

ایک اخبار نویس اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلس وزرا کو کتنی بے باکی اور آزادی سے اپنے تازیانہ قلم کا نشانہ بناتا ہے مگر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب وہ خود مجلس وزراء میں شریک ہوتا ہے اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالم شباب میں کتنا بےفکر ہوتا ہے والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اسے ننگ خاندان سمجھتے ہیں مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد وہی وارفتہ مزاج، ننگ خاندان کتنا سلامت رو، کتنا محتاط ہو جاتا ہے یہ ذمہ داری کا احساس ہے یہ احساس ہماری نگاہوں کو اور وسیع کر

دیتا ہے مگر زبان کو محدود۔

شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمہ داری کا احساس ہوا اس نے سوچا میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں میری آواز اس وقت حکم خدا ہے اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے حق اور راستی سے جو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں سیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی فریقین نے اپنے حالات بیان کیے جرح ہوئی شہادتیں گزریں فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی جمن نے بہت غور سے سنا اور تب فیصلہ سنایا۔

''الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ پنچوں نے تمہارے معاملہ پر غور کیا سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے جس وقت بیل ان کے گھر آیا اس کو کوئی بیماری نہ تھی اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضہ نہ کرتے''

رام دھن مصر نے کہا ''قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا''

جمن نے کہا ''اس کا اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے گودڑ شاہ نے کہا'' سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہئے ان کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔

جمن بولا ''اس کا بھی اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری پھولے نہ سمائے اٹھ کھڑے ہوئے اور زور زور سے ہانک لگائی''

"پنچ پرمیشری کی جے۔۔۔"

آسمان پر تارے نکل آئے تھے اس نعرہ کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی بہت مدہم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمن کے انصاف کی داد دے رہا تھا "انصاف اس کو کہتے ہیں آدمی کا یہ کام نہیں پنچ میں پرماتما بستے ہیں یہ ان کی مایا ہے پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا بنانا مشکل ہے"

ایک گھنٹہ کے بعد جمن شیخ الگو کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے "بھیا جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے میں دل سے تمہارا دشمن تھا مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا یہ بھی خدا کی شان ہے آج مجھے یقین آ گیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔"

الگو رونے لگے دل صاف ہو گئے دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر سے ہرا ہو گیا اب وہ بالو کی زمین پر نہیں حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

عالم بے عمل

پہلی بار: ماہنامہ ’’زمانہ‘‘ مئی / جون 1918ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1915ء (پریم پچیسی اول)

بابو اکھے کمار پٹنہ کے ایک وکیل تھے اور بڑے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے یعنی رائے بہادری کے قریب پہنچ چکے تھے جیسا کہ اکثر بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہے ان بابو صاحب کا لڑکپن بھی بہت افلاس میں بسر ہوا تھا۔ والدین جب اپنے ناہموار لڑکوں کو تنبیہہ کرتے تو بابو اکھے کمار کا نام تمثیلاً پیش کیا جاتا تھا ’’اکھے بابو کو دیکھو آج دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے کل پڑھنے کو تیل نہیں میسر ہوتا تھا۔ پیال جلا کر اس کی آنچ میں پڑھتے۔ سڑک کی لالٹینوں کی روشنی میں سبق یاد کرتے، علم اس طرح آتا ہے۔‘‘ بعض بلند پرواز حضرات اس امر کے شاہد تھے کہ انہوں نے اکھے بابو کو جگنو کی روشنی میں پڑھتے دیکھا ہے آیا جگنو کی دمک یا پیال کی آنچ میں مستقل روشنی ہوسکتی ہے؟ اس کا فیصلہ سننے والوں کے فہم اور فراست پر تھا حاصل کلام یہ کہ اکھے کمار کی صفولیت کا زمانہ رشک کے قابل نہ تھا اور نہ وکالت کا گاؤں کام دھینو ثابت ہو گا اور دنیا کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہیں گی باطل نکلی سیاہ گاؤں بخت سیاہ کو روشن نہ کر سکا اچھے دنوں کے انتظار میں بہت دن گزر گئے اور بالآخر جب اچھے دن آئے۔ جب گارڈن پارٹیوں میں شریک ہونے کی دعوتیں آنے لگیں۔ جب وہ عام جلسوں میں کرسی صدارت پر جلوہ افروز

ہونے لگے تو شباب رخصت ہو چکا تھا۔ اور بالوں کو خضاب کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ حسین اور ہنس مکھ ہیموتی کی خاطر داری لازمی تھی جس کی مبارک آمد نے بابوا کھے کمار کی زندگی کی آخری آرزو پوری کردی تھی۔

(2)

جس طرح سخاوت انسان کے عیبوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح بخل اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے بخیل کے دشمن سب ہوتے ہیں دوست کوئی نہیں ہوتا۔ ہر کس و ناکس کو اس سے بغض للہ ہوتا ہے۔ وہ غریب کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ بالعموم بہت ہی صلح پسند، سلامت رو، متین اور خوددار شریف آدمی ہوتا ہے۔ مگر بخل کالا رنگ ہے جس پر کوئی رنگ خواہ کیسا ہی شوخ ہو نہیں چڑھ سکتا بابو اکھے کمار بھی بخیل مشہور تھے حالانکہ جیسا قاعدہ ہے یہ لقب انہیں حسد کے دربار سے عطا ہوا تھا جو شخص بخیل کہا جاتا ہو اسے سمجھ لو کہ وہ بہت خوش نصیب ہے اور اس کے حاسد بہت ہیں اگر بابوا کھے کمار کوڑیوں کو دانت سے پکڑتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا اگر ان کا مکان بہت اعلیٰ پیانے پر نہیں سجا ہوا تھا۔ اگر ان کے یہاں مفت خور، اونگھنے والے نوکروں کی فوج نہیں تھی اگر وہ دو گھوڑوں کی فٹن پر کچہری نہیں جاتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا ان کی زندگی کا اصول تھا کہ کوڑیوں کی تم فکر رکھو روپے اپنی فکر آپ کرلیں گے۔ اور اس زریں اصول پر سختی سے کاربند ہونے میں وہ بالکل حق بجانب تھے انہی کوڑیوں پر شباب کی بہاریں اور دل کی امنگیں نثار

کی تھیں آنکھوں کی بینائی اور صحت جیسی نعمت عظمےٰ انہی کوڑیوں پر صدقے کی تھی انہیں دانتوں سے پکڑتے تھے تو بہت اچھا کرتے تھے۔ پلکوں سے اٹھانا چاہیے تھا۔

مگر حسین ہنس مکھ، ہیموتی کا مزاج بالکل اس کے متضاد تھا۔ اپنی دوسری بہنوں کی طرح وہ بھی تکلف اور آرائش پر جان دیتی تھی اور گویا اکھے کمار ایسے نادان اور ایسے خشک نہیں تھے کہ اس کی قابل قدر کمزوریوں کی قدر نہ کرتے نہیں وہ شنگار اور سجاوٹ کی چیزوں کو دیکھ کر کبھی کبھی خوش ہونے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔ مگر بعض اوقات جب ہیموتی ان کے نیک مشوروں کی پروا نہ کرکے دائرہ اعتدال سے بڑھ جاتی تھی تو اس دن بابو صاحب کو اس کی خاطر اپنی قوت استدلال وتنظیر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صرف کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز جب اکھے کمار کچہری سے آئے تو حسین اور ہنس مکھ ہیموتی نے ایک رنگین لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا انہوں نے دیکھا تو اندر ایک بہت نفیس گلابی رنگ کی نوید تھی ہیموتی بولے ”ان لوگون کو ایک نہ ایک خبط سوجھتا ہی رہتا ہے میرے خیال میں اس ڈرامیٹیک پرفارمنس کی ضرورت نہ تھی۔“

ہیموتی ان باتوں کے سننے کی عادی تھی مسکرا کر بولی ”کیوں اس سے بہتر اور کیا خوشی کی تقریب ہوسکتی ہے؟“

اکھے کمار سمجھ گئے کہ اب بحث مباحثہ کی ضرورت آ گئی۔ سنبھل کر بیٹھے اور بولے ”جان من! بی اے کے امتحان میں پاس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ہزاروں نوجوان ہر سال پاس ہوتے رہتے ہیں اگر میرا بھائی ہوتا تو صرف اس کی

پیٹھ ٹھونک کر کہتا کہ شاباش! خوب محنت کی مجھے ڈرامہ کھیلنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب تو سمجھدار آدمی ہیں انہیں کیا سوجھی۔"

ہیموتی "مجھے تو جانا ہی پڑے گا"

اکھے کمار "کیوں کیا وعدہ کرلیا ہے؟"

ہیموتی "ڈاکٹر صاحب کی بیوی خود آئی تھیں"

اکھے کمار "تو جان من! تم بھی کبھی ان کے گھر چلی جانا پرسوں جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہیموتی "اب بتا ہی دوں مجھے نائکہ کا پارٹ دیا ہے۔ اور میں نے اسے منظور کرلیا ہے۔"

یہ کہہ کر ہیموتی نے ناز سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر اکھے کمار کو اس خبر سے بہت خوشی نہیں ہوئی اس سے قبل دوبار ہیموتی شکنتلا بن چکی تھی۔ ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب کو مصارف کثیر برداشت کرنے پڑے تھے انہیں خوف ہوا کہ اب کے ہفتے میں گھوش کمپنی دو سو کا بل پیش کرے گی اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ابھی سے روک تھام کی جائے۔ انہوں نے بہت ملائمت سے ہیموتی کا ہاتھ پکڑ کر نہایت شیریں اور محبت آمیز لہجے میں بولے۔ پیاری! یہ بلا پھر تم نے اپنے سر لے لی ہے۔ اپنی تکلیف اور پریشانی کا بالکل خیال نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری پریشانی تمہارے اس عاشق زار کو کتنا پریشان کرتی ہے۔ جان من! یہ جلسے اخلاقی وجود کے اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہیں۔ انہی موقعوں پر دلوں میں رشک کے بیج بوئے جاتے ہیں یہیں غیبت کی عادت پڑتی ہے اور یہیں طعنی بازی

اور نوک جھوک کی مشق ہوتی ہے فلاں لیڈی حسین ہے اس لیے اس کی دوسری بہنوں کا فرض ہے کہ اس سے جلیں جان من! ایشور نہ کرے کہ کوئی حاسد بنے مگر محسود بننا تو اپنے اختیار کی بات نہیں مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا حسن جان سوز کتنے ہی دلوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ الغرض پیاری ہیمو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ دعوت منظور کر لی مجھے یقین ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ میں اسے پسند نہ کروں گا تو تم ہرگز منظور نہ کرتیں۔

حسین اور ہنس مکھ ہیموتی اس محبت آمیز تقریر کو بظاہر بہت غور سے سنتی رہی۔ بعد ازاں تجاہل سے بولی ”میں نے تو یہ سوچ کر منظور کر لیا تھا کہ کپڑے سب پہلے ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ سامان کی ضرورت نہ ہوگی صرف چند گھنٹوں کی تکلیف ہے اور احسان مفت۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں ہے مگر اب نہ جاؤں گی میں ابھی معذرت لکھے دیتی ہوں سچ مچ کیا فائدہ خواہ مخواہ کی الجھن“

یہ سن کر کہ کپڑے سب پہلے کے رکھے ہوئے ہیں کچھ زیادہ خرچ نہ ہوگا اکھے کمار کے دل پر سے ایک بڑا بوجھ اٹھ گیا۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں۔ یہ جملہ بھی معنوں سے خالی نہ تھا۔ بابو صاحب پچھتائے کہ اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کا ہے کو واعظ خشک بننا پڑتا۔ گردن ہلا کر بولے ”نہیں۔۔۔۔۔نہیں جان من! میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ تم جاؤ ہی مت جب تم دعوت منظور کر چکی ہو تو اب معذرت کرنا انسانیت سے بعید معلوم ہوتا ہے میرا صرف منشا یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے جلسوں سے دور رہنا چاہیے۔“

مگر ہیموتی نے اپنا فیصلہ بحال رکھا ’’اب میں نہ جاؤں گی تمہاری باتیں گرہ میں باندھ لیں۔‘‘

(3)

دوسرے دن اکھے کمار ہوا خوری کو نکلے۔ آنند باغ اس وقت جوبن پر تھا خوش قامت سرو اور اشوک کی دو رویہ قطاروں کے بیچ میں سرخ سنگریزوں سے بچی ہوئی سڑک ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ گویا کنول کے پتوں میں پھول کھلا ہوا ہے یا نوک دار پلکوں کے بیچ میں لال متوالی آنکھیں زیب دے رہی ہیں۔ بابو اکھے کمار اس روش پر ہوا کے ہلکے ہلکے فرحت بخش جھنکوں کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک سایہ دار کنج میں جا بیٹھے۔ یہ ان کی مخصوص جگہ تھی اس عنایتوں کی بستی میں آ کر تھوڑی دیر کے لئے ان کے دل پر پھول کی سی شگفتگی اور پتوں کی شادابی کا بہت ہی پر سرور اثر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کا دل بھی پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ یہاں بیٹھے انہیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ انہیں ایک بوڑھا آدمی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا اس نے سامنے آ کر سلام کیا اور ایک سر بمہر لفافہ دے کر غائب ہو گیا اکھے کمار نے لفافہ کھولا اور اس کی عنبر ریز مہک سے روح پھڑک اٹھی خط کا مضمون یہ تھا۔

’’میرے پیارے اکھے بابو! آپ اس ناچیز کے خط کو پڑھ کر بہت حیرت میں آئیں گے مگر مجھے امید ہے کہ آپ میری اس دلیری کو معاف کریں گے۔ آپ

کے حسن اخلاق، حسن مذاق اور حسن معاشرت کی تعریفیں سن سن کر میرے دل میں آپ کے لئے ایک محبت آمیز عقیدت پیدا ہوگئی ہے آپ کی سادہ روش نے مجھے فریفتہ کرلیا ہے اگر شرم وحیا دامن گیر نہ ہوتی تو میں اپنے جذبات کا زیادہ پر جوش الفاظ میں اظہار کرتی۔ سال بھر ہوا کہ میں نے عام مردوں کی کمزوریوں سے مایوس ہوکر یہ ارادہ قائم کرلیا تھا کہ بقیہ زندگی مسرتوں کا خواب دیکھنے میں کاٹوں گی۔ میں نے ڈھونڈا مگر جس دل کی تلاش تھی نہ ملا۔ لیکن جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے مدتوں کی سوئی آرزوئیں پیدا ہوگئی ہیں آپ کے چہرے پر حسن اور شباب کی نہ سہی مگر تصور کی جھلک موجود ہے جس کی میری نگاہ میں زیادہ عزت ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کو اپنے اوصاف ظاہری کی فکری ہوتی تو غالباً میرے وجود کا کمزور حصہ زیادہ خوش ہوتا۔ مگر میں حسن وصورت کی بھوکی نہیں ہوں مجھے ایک سچے اور نمائش سے پاک سینے میں دل رکھنے والے انسان کی چاہ ہے اور میں نے اسے پالیا ہے میں نے ایک ہشیار غواص کی طرح سمندر میں اس کی تہہ میں اس رتن کو ڈھونڈ نکالا ہے میری آپ سے صرف یہ التجا ہے کہ آپ کل رات کو ڈاکٹر کچلو کے مکان پر تشریف لائیں میں آپ کا بہت احسان مانوں گی وہاں ایک سبز پوش عورت اشوکوں کے کنج میں آپ کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے بیٹھی نظر آئے گی۔"

اس خط کو اکھے کمار نے دوبارہ پڑھا اس کا دن کے دل پر کیا اثر ہوا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ رشی نہیں تھے حالانکہ ایسے نازک موقعوں پر رشیوں کا پھسل جانا بھی بعید از قیاس نہیں انہیں ایک نشہ سا محسوس ہونے لگا ضرور اس

غیرت حور نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھا ہوگا۔ میں نے آج کئی دن سے آئینہ بھی نہیں دیکھا۔ جانے چہرے کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ اس خیال سے بے قرار ہو کر وہ دوڑے ہوئے ایک حوض پر گئے اور شفاف پانی میں اپنی صورت دیکھی مگر تسکین نہ ہوئی بہت تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان کی طرف چلے۔ اور جاتے ہی آئینے پر نگاہ ڈالی۔ خط صاف نہیں ہے اور صافا کم بخت خوبصورتی سے نہیں بندھا۔ تاہم مجھے کوئی بدصورت نہیں کہہ سکتا یہ ضرور کوئی اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ بلند خیال عورت ہے۔ ورنہ معمولی عورتوں کی نگاہ میں تو دولت اور حسن کے سوا اور کوئی چیز جچتی ہی نہیں۔ تاہم میرا یہ پھوہڑپن کسی خوش مذاق عورت کو اچھا نہیں معلوم ہو سکتا۔ مجھے اب اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ آج میرے نصیب جاگے ہیں بہت مدت کے بعد میرا ایک قدردان سچا جوہری نظر آیا ہے۔ ہندوستانی عورتیں شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہی تاوقتیکہ اپنے دل کی اضطراب سے مجبور نہ ہو جائیں وہ ایسا خط لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔

انہیں خیالوں میں بابو اکھے کمار نے رات کاٹی پلک تک نہیں جھپکی۔

(4)

دوسرے دن صبح سے دس بجے تک بابو اکھے کمار نے شہر کی ساری فیشن ایبل دکانوں کی سیر کی دکاندار حیرت میں تھے کہ آج بابو صاحب یہاں کیسے بھول پڑے کبھی بھول کر بھی نہ جھانکتے تھے یہ کایا پلٹ کیونکر ہوئی۔ غرض آج انہوں نے بڑی

بے دردی سے روپیہ صرف کیا اور جب گھر چلے تو فٹن پر بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہیموتی نے ان کے ماتھے پر سے پسینہ صاف کر کے پوچھا "آج سویرے سے کہاں غائب ہو گئے؟" اکھے مار نے چہرے کو ذرا متین بنا کر جواب دیا "آج جگر میں کچھ درد تھا۔ڈاکٹر چڈھا کے پاس چلا گیا تھا۔"

ہیموتی کے حسین ہنستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی بولی "تم نے مجھ سے بالکل ذکر نہیں کیا درد جگر ایک خوفناک مرض ہے"

اکھے مار "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے"

ہیموتی "اس کی دوا ڈاکٹر کچلو کے یہاں بہت مجرب ہے معلوم نہیں ڈاکٹر چڈھا مرض کی تہہ تک بھی پہنچے کہ نہیں۔۔۔۔۔"

اکھے مار نے ہیموتی کی طرف ایک بار جھپتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور کھانا کھانے لگے بعد ازاں اپنے کمرے میں جا کر لیٹے شام کو جب وہ پارک، گھنٹہ گھر آنند باغ کی سیر کرتے ہوئے فٹن پر جا رہے تھے تو ان کے ہونٹوں پر سرخی اور گالوں پر شباب کی گلابی جھلک موجود تھی تاہم قدرت ک بے انصافی جس پر انہیں دولت حسن سے محروم رکھا تھا انہیں آج جتنا غصہ آیا شاید اور کبھی نہ آیا ہو آج وہ پتلی سی ناک کے بدلے اپنا گاؤں اور ڈپلومہ سب کچھ دینے پر آمادہ تھے۔

(5)

ڈاکٹر کچلو کا خوش وضع لتاؤں سے سجا ہوا بنگلہ رات کے وقت دن کا سماں دکھا رہا

تھا۔ پھاٹک کے ستون ۔۔۔۔۔برآمدے کی محرابیں، سروؤں کی قطاریں، سب برقی شمعوں سے جگمگا رہی تھیں انسان کی برقی صنعت اپنی بوقلموں کرشمہ دکھا رہی تھی۔ دروازے پر خیر مقدم کا مژدہ، درختوں پر طائر خوش رنگ لتاؤں میں شگفتہ پھول یہ سب اسی برقی روشنی کے جلدے ہیں اس سہانی روشنی میں روسا شہر محو خرام ہیں۔ ابھی ناٹک شروع ہونے میں کچھ دیر ہے مگر اشتیاق نے بے قرار طبیعتوں کو کھینچنا شروع کر دیا ہے ڈاکٹر کچلو دروازے پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں آٹھ بجے ہوں گے کہ بابو اکھے کمار ایک شان رعنائی کے ساتھ اپنی فٹن سے اترے ڈاکٹر صاحب چونک پڑے یہ آج گولر میں کیسے پھول لگ گئے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے بابو صاحب سے مصافحہ کیا اور سر سے پاؤں تک انہیں غور سے دیکھا انہیں کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ بابو اکھے کمار ایسے خوش وضع جامہ زیب گبرو نوجوان بن سکتے ہیں۔ مسلہ تناسخ کی بدیہی مثال آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اکھے بابو کو دیکھ کر ادھر ادھر سے لوگ آ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر شخص حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ ہونٹ رومال کی آڑ ڈھونڈنے لگے۔ آنکھیں سرگوشیاں کرنے لگیں ہر شخص نے غیر معمولی تپاک سے ان کی مزاج پرسی کی میکشوں کی مجلس اور حضرت واعظ کی تشریف آوری کا نظارہ پیش ہو گیا۔

اکھے بابو بہت جھینپ رہے تھے ان کی آنکھیں اوپر کو نہ اٹھتی تھیں اس لیے جب مزاج پرسیوں کا طوفان دور ہوا تو انہوں نے اپنی سبز پوش نازنین کی تلاش میں چاروں طرف ایک وسیع نگاہ دوڑائی اور دل میں کہا یہ شہدے ہیں مسخرے مگر

ابھی ابھی ان کی آنکھیں کھلی جاتی ہیں میں دکھا دوں گا کہ مجھ پر بھی حسینوں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ ایسے حسین بھی ہیں جو صدق دل سے میرے مزاج کی کیفیت پوچھتے ہیں اور جن سے اپنا درد دل کہنے میں بھی رنگین بیاں ہو سکتا ہوں۔ مگر معشوق سبز پوش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نگاہیں چاروں طرف سے گھوم گھام کر ناکام واپس آئیں۔

آدھ گھنٹہ کے بعد ناٹک شروع ہوا بابو صاحب مایوسانہ انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے تھیٹر ہال میں گئے اور کرسی پر بیٹھ گئے بیٹھ کیا گئے گر پڑے، پردہ اٹھا شکنتلا اپنی دونوں سکھیوں کے ساتھ سر پر گھڑا رکھے پودوں کو سینچتی ہوئی دکھائی دی ناظرین باغ باغ ہو گئے نعرہ مرحبا بلند ہوا شکنتلا کی جو خیالی تصویر کھینچ سکتی ہے وہ نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی وہی معشوقانہ شگفتگی وہی دلفریب متانت وہی متوالی چال وہی شرمیلی آنکھیں، اکھے بابو پہچان گئے یہ حسین ہنس مکھ ہیموتی تھی۔

بابو اکھے کمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں ناٹک میں نہ جاؤں گی میں نے گھنٹوں اسے سمجھایا معذرت لکھنے پر تیار تھی مگر محض دوسروں کو رجھانے اور لبھانے کے لیے محض دوسروں کے دلوں میں اپنے حسن اور ادا کا جادو پھونکنے کے لئے محض دوسری عورتوں کو جلانے کے لیے اس نے میری نصیحتوں کا اور اپنے وعدے کا حتیٰ کہ میری ناراضی کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ہیموتی نے بھی اڑتی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا ان کے بانکپن پر اسے ذرا بھی تعجب نہ ہوا کم از کم وہ مسکرائی نہیں۔

ساری محفل پر محویت کا عالم طاری تھا۔ مگر اکھے بابو کی طبیعت وہاں نہ جمتی تھی

وہ بار بار اٹھ کر باہر جاتے ادھر ادھر اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور ہر بار جھنجھلا کر واپس آتے یہاں تک کہ بارہ بج گئے اور اب مایوس ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کے امیں بھی کیسا احمق ہوں ایک شوخ عورت کے چکمے میں آ گیا۔ ضرور انہی بدمعاشوں میں سے کسی نے شرارت کی ہو گی یہ لوگ مجھے دیکھ کر کیسا ہنستے تھے انہی میں سے کسی مسخرے نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ افسوس! سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ خفیف ہوا وہ الگ کئی مقدمے ہاتھ سے گئے ہیموتی کی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا۔ اور یہ سب محض حاسدوں کی خاطر مجھ سے بڑا احمق اور کون ہو گا۔

اس طرح اپنے اوپر لعنت بھیجتے غصے میں بھرے ہوئے وہ پھر محفل کی طرف چلے کہ یکایک ایک سرد کے درخت کے نیچے وہ سبز پوش انہیں اشارے سے اپنی طرف بلاتی نکل گئی فرط مسرت سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ مستانہ وار قدم اٹھاتے جھومتے اور اینڈتے اس نازنین کے قریب آئے اور عاشقانہ جوش کے ساتھ اس سے بولے" اے ملکہ حسن میں اس ذرہ نوازی کے لئے تمہارا تہہ دل سے ممنون ہوں اشتیاق دیدار میں اس عاشق نیم جان کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اگر تمہیں کچھ دیر اور یہ آنکھیں دیکھ نہ پائیں تو تمہیں اپنے گشتہ ناز کی لاش پر حسرت کے آنسو بہانے پڑتے کل شام ہی سے میرے دل کی جو کیفیت ہو رہی ہے اس کا ذکر قوت بیان سے باہر ہے۔ جان من! میں کل کچہری نہ گیا اور کئی مقدمے ہاتھ سے کھوئے۔ مگر تمہارے دیدار سے جو روحانی سرور حاصل ہو رہا ہے۔ اس پر میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں مجھے اب تاب

صبر نہیں ہے آتش اشتیاق نے صبر اور ضبط کو جلا کر خاک کر دیا ہے تمہیں اپنے دیوانہ حسن سے یہ پردہ زیبا نہیں پروانہ اور شمع میں پردہ کیسا اسے کان زیبائی اور اے روح رعنائی! تیرے مہر انگیز کلمات نے میرے دل میں آرزوؤں کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ اب یہ دل تمہارے اوپر صدقے اور جان تمہارے قدموں پر نثار ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بابو اکھے کمار نے عاشقانہ جسارت سے آگے بڑھ کر اس سبز پوش نازنین کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اور ہیموتی کو مسکراتے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا" ارے! اور بس سکتہ ہو گیا ایسا معلوم ہوا گویا آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا بولے" یہ سب تمہاری شرارت تھی۔

حسین ہنس مکھ ہیموتی مسکرائی اور کچھ جواب دینا چاہتی تھی مگر بابو اکھے کمار نے اس وقت زیادہ سوال و جواب کا موقع نہ دیکھا۔ بہت ندامت کے ساتھ بولے" ہیموتی اب منہ سے کچھ نہ کہو تم جیتیں اور میں ہار گیا۔ یہ ہار کبھی نہ بھولے گی۔"

☆☆☆☆☆

حج اکبر

پہلی بار: ''زمانہ'' ستمبر 1918ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1920ء (پریم بتیسی دوم)

(1)

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ اپنے بچہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کھچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لئے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی۔ پچھتاتی، بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بد گمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو

جاتیں، تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

(2)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہوگئی وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا ان کا مصور طرز ادا ان کا اشتعال انگیز استدلال ان کی متشکل تضحیک ان کی روشن شہادتیں اور منور روائتیں ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امنڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے۔ جو رشک نہ کرتا، صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلازاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینان

قلب حیرت انگیز تھا ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی الغرض یہ خالص دماغی، ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی۔ ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض باعث تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہوگئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے پر تماشا اتنا دلاویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا یکا یک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا تو وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی کیا بازار میں کھوگئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکالیا اور بولی ''بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہوگئی اور باتیں کرنے لگی۔''

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی یہاں دفتر جانے کو دیر ہورہی ہے تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھتی بچہ کو گود میں لینے چلی، پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا '' رہنے دو تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔''

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی بیگم صاحب کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف

بلایا وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا اور دروازہ کی طرف چلی۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی ''تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں یہ تماشے کسی اور کو دکھائیے یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔''

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولی بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔

شاکرہ تو یہاں تمہاری کون پروا کرتا ہے تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے مامائیں دائیاں بہت ملیں گی جو کچھ خطا ہوئی ہو معاف کیجئے گا میں جاتی ہوں۔

شاکرہ جاکر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔

دایہ میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجئے گا

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آ گئے پوچھا کیا ہے؟

دایہ "کچھ نہیں بیوی نے جواب دے دیا ہے گھر جاتی ہوں"

صابر حسین خانگی تر ددات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے "بات کیا ہوئی؟"

شاکرہ کچھ نہیں اپنی طبیعت نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔

شاکرہ ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے کیا کروں خصلت ہی ایسی ہے تمہیں یہ بہت پیار ہے تو لے جا کر گلے باندھو! میرے یہاں ضرورت نہیں۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کر لوں پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

(3)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازے تک آیا۔ لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا اور انا انا کہہ کر رونے لگا شاکرہ نے چمکارا پیار کیا، گود میں لینے کی کوشش کی مٹھائی کا لالچ دیا میلہ دکھانے کا وعدہ کیا اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوا کی دھمکی دی مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا یہاں

تک کہ شاکرہ کو غصہ آ گیا اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور آ کر گھر کے دھندوں میں مصروف ہو گئی نصیر کا منہ اور گال لال ہو گئے آنکھیں سوج گئیں آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا پر نصیر نے جاتے ہی پھر انا کی رٹ لگائی تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور بہلانے لگے آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی ہے تو اسے تسکین ہوئی مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا انا مٹھائی لائی؟

اس طرح دو تین دن گزر گئے نصیر کو انا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لئے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا۔ اور انا انا پکار کر رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور انا انا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا گویا اسے بلا رہا ہے انا کی خالی کوٹھڑی میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے امید ہوتی تھی کہ انا یہاں آتی ہو گی اس کوٹھڑی کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا کہ شاید انا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا تو انا انا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انا آ گئی۔ اس کا

گدرایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لئے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے۔ نہ میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے۔ نہ تازی امرتیوں سے، ان میں مزہ تھا۔ جب انا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا دو سال کا ہونہار لہلہاتا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی گرمی اور زبان کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخواں کا ایک پتلا وہ گیا تھا۔ شاکرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے نت نئے کھلونے لائے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزی کی بہار کیونکر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیر اسناٹا نظر آتا تھا دوسری انا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھتنی ہے۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت، وہی پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار وہی دل کش لیل و نہارا کیلے بیٹھے انا سے باتیں کرتا۔ انا کتا بھونکے انا گائے دودھ دیتی۔ انا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھڑی میں جاتا،

اور کہتا ''انا پانی پی'' دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھڑی میں رکھ آتا اور کہتا ''انا دودھ پلا'' اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا اور کہتا ''انا سوتی'' شاکرہ کھانا کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انا کی کوٹھڑی میں لے جاتا اور کہتا ''انا کھانا کھائے گی'' انا اس کے لیے اب ایک آسانی وجود تھی جس کی واپسی کی اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دل کش یادگار تھی۔ جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بے تابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکل ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا کبھی شدت کی گرمی کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا نصیر کی نجافت ان موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی شاکرہ، احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

(4)

صبح کا وقت تھا نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے انہیں اس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم

ظرف سفلہ مزاج بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا یہ آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے شاید انہی کی سوا سے فائدہ ہو صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا'' بڑے حکیم نہیں لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

شاکرہ ''تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہو گی؟''

صابر بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے

شاکرہ تمہیں تو وہی دھن سوار ہے کیا عباسی امرت پلا دے گی؟

صابر ہاں وہ تمہارے لئے چاہے زہر ہو لیکن بچے کے لئے امرت ہی ہو گی

شاکرہ میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے

صابر اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ چپ بھی رہو کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر ہاں تو میں جاتا ہوں مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہو گا اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عباسی کے پاس جاؤ اس کی منت کرو التجا کرو تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے

صابر حسین نے پوچھا کیا مرضی ہے جاؤں اسے تلاش کروں؟

شاکرہ تم کیوں جاؤ گے میں خود چلی جاؤ گی

صابر نہیں معاف کرو مجھ تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے نہ جانے تمہارے منہ

سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا "ہاں اور کیا مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منالائی ہوتی، وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو۔ لیکن نصیر سے اسے محبت تھی میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی اور وہ جس طرح راضی ہوگی اسے راضی رکوں گی۔"

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں مگر امنڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔

(5)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرا دیں بادحوادث نے درخت کو پامال کر دیا۔ اور اب یہی ایک سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جواب تک خشک اور پامال تھی اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے اندھیرے بیابان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک

نظر آنے لگی تھی اس اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لئے تعویز اور گنڈے لاتی رہتی یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیٹر میں یکا یک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا اس کال کوٹھڑی میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی یکا یک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی معاً یاد آ گیا آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا؟ وہ نغمہ مسرت سننے کے لئے جو حلوا کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا عباسی کی روح تڑپ اٹھی وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں

نصیر کو دیکھ آؤں پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتا تھا وہ سوتے سوتے چونک پڑتی معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی اس کے لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی گھر سے چلتی لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لیکر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منہ دکھاؤں کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو بچوں کی محبت کا اعتبار؟ نئی دایہ سے پرچ گیا ہو یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی بدنی ضروریات بھی خلاءِ دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے محلّہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا آمادہ سفر ہو گئی۔

(6)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامنے پکڑے ہوئے تھی کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور باغ کے پاس گیہوں کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا اسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا۔ ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جایئے گا اور چلتو مال لیجئے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محو تسبیح خوانی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی یا اللہ کسی طرح گاڑی چلے گرمی کے مارے کلیجہ بھنا جاتا ہے اتنی گھٹا امنڈی ہوئی ہے برسنے کا نام ہی نہیں لیتی معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں یہ نہیں کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں مسافروں کی جان میں جان آئے یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا

ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جارہی ہوں گاڑی سے باہر نکل آئی صابر حسینا سے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے ''کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں؟''

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا ''ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟''

صابر اب تو تم جارہی ہو نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی اس کے لئے دعا کرتی رہنا عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا گھبرا کر بولی ''کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟''

صابر اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں کوئی دو ہفتہ تک تو شب و روز انانا کی رٹ لگا تا رہا اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے ساری دوائیں کر کے ہار گیا کوئی نفع ہی نہیں ہوتا میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جارہی ہو اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کرسکوں اور پھر کار ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی۔ ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم

ہوئیں دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا دل سے دعا نکلی ''اللہ میری جان کے صدقے میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو'' رقت سے گلا بھر آیا میں کیسی سنگ دل ہوں پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور اسے دیکھنے تک نہ گئی شاکرہ بدمزاج سہی بدزبان سہی نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لئے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتیں اور گھر سے قدم نہ نکالتی آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے؟ انداز وحشت بولی ''دودھ تو پیتے ہیں نا؟''

صابر تم دودھ پینے کو کہتی ہو اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولیں نہیں

عباسی یا میرے اللہ! ارے او قلی قلی! بیٹا!! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی ہاں بیٹا! جلدی کر میاں دیکھیے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کر لیجئے!

یکہ روانہ ہوا سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی بیٹا جلدی کر! میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ جاتے لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا تو عباسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا بار بار دل سے دعا نکلنے لگی خدا کرے سب خیر و عافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا دفعتہً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی

آواز آئی اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا سر تیورا گیا معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں جی چاہا یکہ سے کود پڑوں مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تا کا جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھا کا پیا سا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا باورچی بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے کلیجہ مضبوط ہوا شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا شاکرہ نصیر کو گود میں لئے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا ''بیٹا! نصیر آنکھیں کھولو''

نصیر نے آنکھیں کھولیں ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا تب یکا یک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا ''انا آئی، انا آئی''

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل جائے ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا صبح کا وقت تھا نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا صابر حسین نے آ کر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے ''تمہاری انا کو مار کر بھگا دیں؟''

نصیر نے منہ بنا کر کہا ''نہیں روئے گی''

عباسی بولی ”کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا میرے حج کا ثواب کون دے گا؟“

صابر حسین نے مسکرا کر کہا ”تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا اس حج کا نام حج اکبر ہے۔“

☆☆☆☆☆☆

سوجان بھگت

پہلی بار: ہندی میں "مادھوری" مئی 1918ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، (میرے بہترین افسانے)

سیدھے سادے کسان روپیہ ہاتھ میں آتے ہی دھرم اور شہرت کی طرف جھکتے ہیں امیر لوگوں کی طرح پہلے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی طرف نہیں دوڑتے۔

سوجان کی کھیتی میں کئی برس سے ہن برس رہا تھا محنت تو گاؤں کے کسان بھی کرتے تھے لیکن اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ بنجر زمین میں دانا بوتا تو بھی کچھ نہ کچھ پیدا ہو ہی جاتا۔ تین برس تک لگاتار ایکھ لگتی گئی ادھر گڑ کا بھاؤ تیز تھا کوئی دو ڈھائی ہزار ہاتھ میں آ گئے تھے بس ذہن کا جھکاؤ دھرم کی طرف ہوتا گیا۔ سادھو سنتوں کا خیر مقدم اور تعظیم ہونے لگی۔ دروازے پر دھونی جمنے لگی قانون گو علاقے میں آگئے تو سوجان بھگت مہتو کے ہاں ٹھہرتے۔ حلقے کے کانسٹیبل، تھانیدار، محکمہ تعلیم کے افسر ایک نہ ایک ان کی چوپال میں پڑا ہی رہتا۔ مہتو مارے خوشی کے پھولے نہ ساتے۔ خوش بختی ان کے ہاں اتنے بڑے آدمی ٹھہرتے تھے۔ جن حاکموں کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی تھی ان کی ہی زبان اب مہتو مہتو کہتے سوکھتی ہے۔

ایک مہاتما نے فضا اچھی دیکھی تو وہیں آسن جما دیا۔ گانجا اور چرس کی بہار اڑنے لگی۔ ایک ڈھولک آئی مجیرے منگوائے گئے اور ست سنگ ہونے لگے۔ یہ

سب سوجان کے دم ہی سے تھا گھر میں سیروں دودھ ہوتا لیکن سوجان کے منہ میں ایک بوند بھی جانا حرام تھا کبھی حاکم لوگ چکھتے اور کبھی سادھو کسان کو دودھ، گھی سے مطلب کیا۔ اسے تو ساگ روٹی چاہیے۔ سوجان کی عاجزی کی انتہا نہ رہی۔ سب کے سامنے سر جھکائے رہتا ایسا نہ ہو لوگ کہنے لگیں کہ دولت پا کر مغرور ہو گیا ہے گاؤں میں کل تین ہی کنوئیں تھے بھی کھیتوں میں پانی نہ پہنچتا تھا کھیتی ماری جاتی تھی سوجان نے ایک پختہ کنواں اور بنوایا کنویں کے بیاہ، برہم بھوج اور یگیہ ہوا جس دن کنواں چلا اس روز جیسے سوجان کو دنیا بھر کی نعمتیں مل گئیں۔ جو کام گاؤں بھر میں کسی سے نہ ہوا تھا وہ باپ دادا کی عنایت سے سوجان نے کر دکھایا۔

ایک روز گاؤں میں گیا کے یاتری آ کر ٹھہرتے۔ سوجان ہی کے یہاں ان کا بھوجن ہوا۔ سوجان کے دل میں بھی گیا جانے کی بہت زور سے خواہش تھی۔ یہ اچھا موقع پا کر وہ بھی چلنے کے لئے تیار ہو گے۔

اس کی بیوی بلاقی نے کہا ابھی رہنے دو اگلے سال چلیں گے کون جانتا ہے دھرم کے کام میں میکھ نکالنی اچھی بات نہیں زندگی کا کیا بھروسہ؟

''ہاتھ خالی ہو جائے گا''

''بھگوان کی اچھا ہو گی تو روپیہ پھر آ جائے گا ان کے ہاں کسی بات کی کمی ہے''

بلاقی اس کا جواب کیا دیتی مذہبی فریضہ میں مداخلت کر کے اپنی عاقبت کیوں بگاڑتی؟ صبح ہی خاوند اور بیوی گیا کے لیے روانہ ہو گئے وہاں سے لوٹا تو یگیہ اور برہم بھوج کی ٹھہری ساری برادری کو مدعو کیا گیا گیارہ گاؤں میں سپاریاں بٹیں۔ اس کروفر سے کام ہوا کہ چاروں طرف دھوم مچ گئی سب یہی کہتے تھے بھگوان

دولت دے تو دل بھی ایسا ہی دے۔ گھمنڈ تو چھو بھی نہیں گیا اپنے ہاتھ سے تیلی اٹھاتا پھرتا ہے خاندان کا نام روشن کر رہا ہے بیٹا ہو تو ایسا ہو باپ مرا تو گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اب کاشی ٹیک کر آ بیٹھی ہے۔

ایک حاسد نے کہا ''کہیں گڑی ہوئی دولت مل گئی ہو گی تو چاروں طرف سے یہ لعنتیں برسنے لگیں۔ ہاں! تمہارے باپ دادا جو خزانہ چھوڑ گئے ہیں وہی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے ارے بھیا! یہ دھرم کی کمائی ہے تم بھی تو سینہ پھاڑ کر محنت کرتے ہو ایسی اکیھ کیوں نہیں ہوئی۔ بھگوان آدمی کا دل دیکھتے ہیں جو خرچ کرتا ہے اسی کو دیتے ہیں''

(2)

سوجان مہتو سوجان بھگت ہو گئے بھگتوں کے طور اطوار کچھ اور ہی ہوتے ہیں بھگت بنا اشنان کئے کچھ نہیں کھاتے گنگا اگر گھر سے دور ہو اور وہ دوپہر تک نہا کر لوٹ نہ سکتا ہو تو تہوار کے دن تو ضرور ہی وہاں جاتا ہے۔ بھجن اور پوجا تو یقیناً ہونا چاہیے پوجا پاٹ اس کے لیے بس ضروری ہے کھانے پینے میں اسے خاص توجہ دینی پڑتی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے جھوٹ ترک کرنا پڑتا ہے۔ بھگت غلط نہیں کہہ سکتا ہے عام آدمیوں کو اگر جھوٹ کی سزا ایک ملتی ہے تو بھگت کو ایک لاکھ سے کم نہیں ملتی۔ انجان کے لیے کتنے ہی قصور قابل معافی ہیں سیانے کے لیے نہ معافی ہے نہ کنارہ، اگر ہے بھی تو بہت مشکل۔ سوجان کو اب بھگت کا وقار قائم

رکھنا پڑا۔ اب تک اس کی زندگی مزدوروں کی تھی زندگی کا کوئی معیار کوئی اصول ان کے سامنے نہ تھا اب اس کی زندگی میں خیالات آگئے راستہ کانٹوں سے بھرپور تھا اپنی خدمت ہی پہلے اس کی زندگی کا مقصد تھا اسی ترازو سے وہ ہر چیز کو تولتا تھا۔ وہ اب انہیں مناسب نامناسب کے کانٹوں پر تولنے لگا یوں کہو کہ جہل کی دنیا سے نکل کر اب وہ علم کی دنیا میں آ گیا اس نے کچھ لین دین شروع کیا تھا اب اسے بیاج لیتے ہوئے خجالت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ گئوؤں کے دوہتے اسے بچھڑوں کا خیال لگا رہتا کہیں بچھڑا بھوکا تو نہیں رہتا۔ ورنہ اس کا دل دکھے گا وہ گاؤں کا مکھیا تھا کتنے ہی مقدموں میں اس نے جھوٹی شہادتیں دیں کتنوں سے رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ اب ان کاموں سے اسے نفرت ہوتی تھی۔ جھوٹ اور ڈھونگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ پہلے اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مزدوروں سے جس طرح کام لیا جا سکتا ہے لے اور مزدوری جس قدر کم دی جا سکتی ہے دے۔ لیکن اب اسے زیادہ اس کی مزدوری کی فکر ہوتی تھی کہیں بے چارے مزدور دل پر جبر نہ کریں یہ اس کی واحد فکر ہوتی تھی کہیں کسی کا دل نہ دکھے اس کے دو نوجوان بیٹے بات بات پر اس پر پھبتیاں کستے یہاں تک کہ بلاتی بھی اب اسے کورا بھگت سمجھنے لگی۔ جسے گھر کے برے بھلے سے کوئی سروکار نہ ہو گیان کی دنیا میں آ کر سوجان مہتو کورے بھگت ہو گئے۔

سوجان کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تمام حقوق چھینے جانے لگے۔ کس کھیت میں کیا بونا ہے کس کا کیا دینا ہے کیا لینا ہے کس بھاؤ کیا چیز بکی ایسی اہم باتوں میں بھی بھگت جی کی صلاح نہ لی جاتی۔ بھگت کے پاس کوئی نہ جانے پاتا۔ دونوں

لڑکے یا خود بلاقی دور سے ہی معاملہ طے کر لیا۔ گاؤں بھر میں سوجان کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور خود اس کے گھر میں کم ہو رہی تھی اور خود لڑکے اس کی عزت اب بہت کرتے اسے خود چارپائی اٹھاتے دیکھ کر دور سے ہی لپک کر تھام لیتے اسے چلم نہ بھرنے دیتے یہاں تک کہ خود دھوتی تک نہ جھٹکنے دیتے لیکن اثر اس کے ہاتھ میں نہ تھا وہ اب گھر کا مالک نہیں مند رکا دیوتا تھا۔

(3)

ایک دن بلاقی اوکھلی میں دھان چھانٹ رہی تھی کہ ایک بھیک منگا دروازے پر آ کر چلانے لگا بلاقی نے سوچا کہ دال بنا لوں تو اسے دوں گی اتنے میں بڑا لڑکا بھولا آ کر بولا۔ ''اماں! ایک مہاتما دروازے پر کھڑا گلا پھاڑ رہا ہے کچھ دے دو ورنہ اس کا دل روئے گا''

بلاقی نے طنز سے کہا ''بھگت کے پاؤں میں مہندی لگی ہے کیوں کچھ لے جا کر نہیں دے دیتے کیا میرے چار ہاتھ ہیں اور میں کس کس کا دل سکھی رکھوں دن بھر تو تانتا بندھا رہتا ہے۔''

''چوپٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اور کیا؟ ابھی مہنگو بینگن دینے آیا تھا حساب سے سات من ہوتے تھے تو تولا پو نے سات من ہی نکلے میں نے کہا دس سیر اور لا تو آپ بیٹھے بیٹھے کہا تھے اب اتنی دور کہاں جائے گا وصولی لکھ لو ورنہ اس کا دل دکھے گا میں نے حساب بے باق نہیں لکھا۔ دس سیر باقی درج کر لیے۔''

''بہت اچھا کیا تم نے، بکنے دیا کرو انہیں، دس پانچ مرتبہ کی کھائیں گے تو خود بخود بولنا چھوڑ دیں گے۔''

''دن بھر ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے رہتے ہیں۔سو مرتبہ کہہ دیا کہ تم گھر گرہستی کے معاملے میں مت بولا کرو لیکن اس سے بنا بولے رہا ہی نہیں جاتا''

''میں جانتی ان کا یہ حال ہو گا تو گورو منتر نہ لینے دیتی''

''بھگت کیا ہوئے دین دنیا سے گئے تمام دن پوجا پاٹھ میں ہی اڑ جاتا ہے ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہو گئے کہ کوئی کام ہی نہ کر سکیں۔''

بلاقی نے بات بدلی اور کہا''یہ تو تمہاری زیادتی ہے بھولا اب بھلا ان سے پھاوڑا، کدال کہاں پکڑا جاتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہیں بیلوں کو دانہ پانی دیتے ہیں گائے دوہتے ہیں اور بھی جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔''

فقیر اب بھی کھڑا چلا رہا تھا سوجان نے جب گھر سے کسی کو کچھ لاتے نہ دیکھا تو اٹھ کر اندر گئے اور کڑے لہجے میں بولے''تم لوگوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا کہ دروازے پر کون کھڑا چلا رہا ہے گھنٹہ بھر سے بھیک کے لیے اپنا کام تو دن بھر کرتا ہی ہے ایک ساعت بھگوان کا کام بھی کیا کرو۔''

بلاقی بولی''تم تو بھگوان کا کام کرنے کے لیے بیٹھے ہی ہو کیا گھر بھر یہی کام کرے گا۔''

''کہاں آٹا رکھا ہے بتاؤ میں ہی نکال کر دے آؤں، تم رانی بنی بیٹھی رہو''

''آٹا میں نے مر مر کر پیسا ہے اناج دے دو ایسے مسٹنڈوں کے لیے پہر رات سے اٹھ کر چکی نہیں چلاتی ہوں۔''

سوجان گودام میں گئے اور ایک چھوٹی ٹوکری بھر کر جو لیے باہر نکلے جو سیر بھر سے کیا کم ہوگا۔ سوجان نے جان بوجھ کر محض بلاتی اور بھولا کو چڑھانے کے لیے بھیک کی موزوں مقدار سے تجاوز کیا تھا۔ اس پر بھی یہ دکھانے کے لیے کہ ٹوکری میں زیادہ جو نہیں ہے وہ اسے چنگی سے تھامے ہوئے تھے چنگی اس قدر بوجھ نہ سنبھال سکتی تھی ہاتھ کانپ رہا تھا ایک لمحہ کی تاخیر ہونے سے ہی اس کے گر پڑنے کا خدشہ تھا اس لیے وہ جلدی باہر نکل جانا چاہتا تھا اچانک بھولا نے ٹوکری ان کے ہاتھ سے چھین لی اور تیورا کر کہا۔

''مال غنیمت نہیں ہے جو لٹانے چلے ہو، چھاتی پھاڑ پھاڑ کر کام کرتے ہیں تب گھر میں دانہ آتا ہے۔''

سوجان نے کھسیانہ ہو کر کہا ''میں بھی تو بیٹھا نہیں رہتا''

''بھیک، بھیک سمجھ کر دی جاتی ہے لٹائی نہیں جاتی ہم تو ایک وقت کھا کر گزر کرتے ہیں کہ عزت بنی رہے اور تمہیں لٹانے کی سوجھتی ہے تمہیں کیا معلوم گھر میں کیا ہو رہا ہے۔''

سوجان نے اس کا کوئی جواب نہ دیا باہر آ کر بھکاری سے بولا ''بابا! اس وقت جاؤ گھر میں کسی کا ہاتھ خالی نہیں اور خود پیڑ تلے جا کر خیالات میں ڈوب گیا۔ اپنے ہی گھر میں اس کی یہ قدر ابھی وہ اپاہج نہیں ہے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں گھر کا کچھ نہ کچھ کام کرتا ہی رہتا ہے اس پر یہ توہین؟ اس نے گھر بنایا یہ ساری رونق اسی کے دم خم سے ہے لیکن اب اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں اب وہ دروازے کا کتا ہے گھر والے جو روکھا سوکھا دیں وہی کھا کر پیٹ بھرے ایسی زندگی پر لعنت ہے سوجان

ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔''

شام ہوگئی بھولا کا چھوٹا بھائی شنکر چلم بھر کر لایا سوجان نے دیوار سے لگا کر رکھ دی دھیرے دھیرے تمباکو جل گیا ذرا دیر بعد بھولا نے دروازے پر چارپائی ڈال دی سوجان پیڑ تلے سے نہ اٹھا۔

کچھ دیر اور گزری کھانا تیار ہوا بھولا بلانے آیا سوجان نے کہا ''بھوک نہیں ہے''

بہت منانے پر بھی نہ اٹھا تب بلاتی نے آکر کہا'' کھانا کھاتے کیوں نہیں چلیے جی تو اچھا ہے۔''

سوجان کو سب سے زیادہ غصہ بلاتی پر ہی تھا۔ یہ بھی لڑکوں کے ساتھ ہے یہ بیٹھی دیکھتی رہی اور بھولا نے اناج میرے ہاتھ سے چھین لیا اس کے منہ سے اتنا بھی نہ نکلا کہ رہنے دے لے جاتے ہیں تو لے جانے دے۔ لڑکوں کو نہ معلوم ہو کہ میں نے کتنی محنت سے یہ گرہستی بنائی ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ دن کو دن رات کو رات نہ سمجھا بھادوں کی اندھیری راتوں میں لاٹھی تھامے جوار کی حفاظت کی ہے جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں بھی دم نہیں اور اب گھر پر میرا اتنا بھی حق نہیں کہ کسی کو بھیک دے سکوں مانا کہ بھیک اتنی نہیں دی جاتی لیکن انہیں تو چپ رہنا چاہیے تھا خواہ گھر میں آگ لگا دوں قانون سے بھی تو میرا کچھ حق ہے میں اپنا حصہ خود نہیں لیتا دوسروں کو کھلا دیتا ہوں اس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے اب اس وقت منانے آتی ہے۔ اسے میں نے آج تک کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا اور نہ ایسی کون سی عورت ہے گاؤں میں جس نے شوہر کی لاتیں نہ سہی ہوں۔ کبھی کڑی نگاہ سے دیکھا تک نہیں روپے پیسے لینا دینا سب اسی کے ہاتھوں میں رکھا تھا اب

روپے جمع کر لیے ہیں تو مجھ سے ہی اکڑتی ہے اب اسے لڑکے عزیز ہیں میں تو گھر لٹاؤ، نکھٹو اور بھونڈوں ہوں میری اسے کیا پروا جب لڑکے نہ تھے تب میں گود میں اٹھا کر وید کے پاس لئے پھرتا تھا آج اس کے بیٹے ہیں اور یہ ان کی ماں ہے میں تو باہر کا آدمی ہوں مجھے گھر سے کیا مطلب؟ بولا:

''میں اب کھا پی کر کیا کروں گا؟ ہل جوتنے سے رہا پھاوڑا چلا نہیں سکتا، مجھے کھلا کر اناج کو کیوں ضائع کرو گی رکھ دو بیٹیا دوسری بار کھاؤں گا''

''تم ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو سچ کہا ہے بڑھاپے میں آدمی کی عقل ماری جاتی ہے بھولا نے اتنا تو کہا تھا کہ اتنی بھیک مت لے جاؤ اور کچھ۔''

''ہاں بے چارہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا تمہیں تو تب مزہ آتا اگر وہ اوپر سے دو چار ڈنڈے جما دیتا۔ کیوں! اگر یہی خواہش ہے تو لو اب پوری کر لو بھولا کھا چکا تھا اسے بلا لاؤ نہیں، بھولا کو کیوں بلاتی ہو تمہی جما دو نہ دو چار ہاتھ اتنی کسر ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔''

''ہاں اور کیا یہی تو عورت کا فرض ہے اپنے بھاگ سراہو کہ مجھ جیسی سیدھی عورت مل گئی جس بل چاہتے ہو بٹھاتے ہو ایسی منہ زور ہوتی تو گھر میں کیوں اب تک نباہ ہوتا''

''ہاں بھئی وہ تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم دیوی تمہیں اور رہو میں تب بھی راکشس تھا اور اب تو شیطان ہوں بیٹے کماؤ ہیں ان کی سی نہ کہے گی تو اور کس کی کہے گی مجھ سے اب کیا لینا دینا۔''

''تم جھگڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو اور میں بچانا چاہتی ہوں کہ چار آدمی ہنسیں

گے چل کر کھانا کھالو سید ھے سے نہیں تو میں بھی جا کر سو رہوں گی ۔''

''تم بھوکی کیوں سو رہو گی تمہارے بیٹوں کی تو کمائی ہے ہاں! میں تو بھلا اجنبی ہوں ہی ۔''

''بیٹے تمہارے بھی تو ہیں''

''نہیں! میں ایسے بیٹوں سے باز رہا کسی اور کے بیٹے ہوں گے میرے بیٹے ہوتے تو کیا میری یہ درگت ہوتی''

'' گالیاں دو گے تو میں کچھ اور کہہ بیٹھوں گی سنتی تھی مرد بڑے سمجھدار ہوتے ہیں لیکن تم تو سب سے نرالے ہو آدمی کو چاہیے کہ جیسا وقت دیکھے اسی کے مطابق کام کرے اب ہمارا اور تمہارا گزارہ اسی میں ہے نام کے مالک بنے رہیں اور جو کچھ لڑکے چاہیں کریں میں یہ بات سمجھ گئی تو تم کیوں نہیں سمجھتے؟ جو کماتا ہے اسی کا گھر میں راج ہوتا ہے یہی نیا دستور ہے میں لڑکوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی ۔تم کیوں اپنے من کی کرو! اتنے دن تو مہاراج کر لیا اب کیوں اس مایہ میں چرو؟ چلو کھانا کھالو''

''تو کیا میں دروازے کا کتا ہوں''

''بات جو تھی میں نے کہہ دی اب خود کو جو چاہو سمجھو''

سو جان نہ اٹھے بلاقی تھک ہار کر چلی گئی۔

سوجان کے سامنے اب ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا وہ بہت دنوں سے گھر کا مالک تھا اور اب بھی یہی تصور کرتا تھا حالات میں کتنا الٹ پھیر ہو گیا اس کی اسے خبر نہ تھی لڑکے اس کی عزت کرتے ہیں اور خدمت کرتے ہیں اس سے مغالطے میں پڑ گیا تھا لڑکے اس کے سامنے چلم نہیں پیتے کھاٹ پر نہیں بیٹھتے۔ کیا یہ سب اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں کیا عقیدت کے عوض وہ اپنا آقا پن کا حق چھوڑ سکتا ہے! ہرگز نہیں۔ اب تک جس گھر میں راجہ تھا اسی میں غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس گھر میں اب دوسروں کا غلبہ نہیں رہ سکتا مندر کا پجاری ہو کر رہنا اسے قطعاً ناپسند تھا۔

نہ جانے کتنی رات باقی تھی سوجان نے اٹھ کر گنڈاسے سے بیلوں کا چارہ کاٹنا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں سوتا تھا لیکن سوجان رات میں چارہ کاٹ رہے تھے۔ اتنی محنت اپنی زندگی میں کبھی نہ کی تھی جب سے انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا تب ہی سے چارے کے لیے ہائے ہائے مچی رہتی تھی۔ شنکر میں کاٹتا اور بھولا بھی لیکن چارا پورا ہی نہیں پڑتا تھا۔ آج وہ لڑکوں کو دکھا دے گا کہ چارہ کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جلد ہی ان کے سامنے کاٹے ہوئے چارے کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ ٹکڑے کس قدر مہین اور صاف ہیں جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔

منہ اندھیرے بلاقی اٹھی تو کٹے ہوئے چارے کا ڈھیر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بولی یہ بھولا آج رات بھر چارہ ہی کاٹتا رہا۔ کتنا کہا کہ بیٹا جی سے لیکن مانتا ہی نہیں رات کو سویا ہی نہیں۔

سوجان بھگت نے طنز سے کہا ”وہ سوتا ہی کب ہے؟ جب دیکھتا ہوں کام کرتا

رہتا ہے ایسا کماؤ دنیا میں اور کون ہوگا؟''

اتنے میں بھولا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا اسے بھی یہ ڈھیر دیکھ کر تعجب ہوا اماں سے بولا کیا شنکر آج بڑی رات گئے اٹھا تھا اماں؟

''وہ تو پڑا سو رہا ہے میں نے سمجھا تم نے کاٹا ہے''

''میں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکتا دن بھر چاہے جتنا کام کرلوں لیکن رات کو مجھ سے نہیں اٹھا جاتا تو کیا تمہارے دادا نے کاٹا ہے؟''

''ہاں یہی معلوم ہوتا ہے''

''ہاں یہی معلوم ہوتا ہے رات بھر سوئے نہیں مجھ سے کل رات بڑی بھول ہوئی ارے وہ تو ہل لے کر جا رہے ہیں۔ جان دینے پر تل گئے ہیں کیا؟''

''غصیلے تو کبھی کے ہیں اب کسی کی سنیں گے تھوڑی ہی''

''شنکر کو جگا دو میں بھی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہل لے جاؤں''

جب اور کسانوں کے ساتھ ہل لے کر بھولا کھیت میں پہنچا تو سوجان آدھا کھیت جوت چکے تھے۔ بھولا نے چپکے سے کام کرنا شروع کیا سوجان سے کچھ بولنے کی کسی کو بھی ہمت نہ پڑی۔

دوپہر ہوئی سب کسانوں نے بیل چھوڑ دیے لیکن سوجان اپنے کام میں مگن رہے بھولا تھک گیا اس کی بار بار یہی خواہش ہوتی کہ بیلوں کو کھول دے مگر مارے خوف کے کچھ نہ کہہ سکا اس کو حیرت ہوتی تھی کہ دادا کیسے اتنا کام کرتے ہیں آخر ڈرتے ڈرتے بولا۔

''دادا! اب تو دوپہر ہوگئی ہل کھول دیں ذرا''

''ہاں کھول دو! تم بیلوں کو لے کر چلو میں ڈنڈا اچھینک کر ابھی آیا''

''میں شام کو پھینک دوں گا''

''تم کیا پھینک دو گے دیکھتے نہیں کہ کھیت کٹورے کی مانند گہرا ہو گیا ہے تبھی تو بیج پانی میں جم جاتا ہے اس طرح کے کھیت میں بیس من کا بیگھہ ہوتا تھا تم لوگوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔''

بیل کھول دیے گئے۔ بیلوں کو لے کر بھولا گھر چلا لیکن سوجان ڈنڈا اچھینکتے رہے آدھ گھنٹے کے بعد وہ ڈنڈا پھینک کر گھر آئے لیکن تھکن کا نام بھی نہ تھا نہا دھو کر کھانا کھا کر آرام کرنے کی بجائے انہوں نے بیلوں کو سہلانا شروع کیا ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پاؤں ملے اور دم سہلائی۔ بیلوں کی دم کھڑی تھی سوجان کی گود میں سر رکھے ناقابل بیان مسرت مل رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج انہیں یہ راحت میسر آئی تھی ان کی آنکھوں میں تشکر کے جذبے ابل رہے تھے جیسے کہہ رہے تھے کہ تمہارے ساتھ رات دن ایک کرنے کو تیار ہیں۔

دوسرے کسانوں کی طرف بھولا ابھی کمر ہی سیدھی کر رہا تھا کہ سوجان ہل اٹھا کر کھیت کی طرف چل دیا دونوں بیل امنگ سے بھرے بھاگے چلے جا رہے تھے جیسے انہیں خود کھیت میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

بھولا نے غنودگی میں ہی باپ کو ہل لے جاتے دیکھا لیکن اٹھ نہ سکا اس کی ہمت چھوٹ گئی اس نے اتنی محنت کبھی نہ کی تھی اسے بنی بنائی گرہستی مل گئی تھی اس کو کسی نہ کسی طرح چلا رہا تھا اس قیمت پر وہ گھر کا مالک بننے کے لیے تیار نہ تھا جوان آدمی کے بیس دھندے ہوتے ہیں ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کے لیے اس کو

وقت چاہیے پڑوس کے گاؤں میں دنگل ہو رہا ہے جوان آدمی خود کو کیسے وہاں جانے سے روک سکے گا کسی گاؤں میں بارات آئی ہے محفل رقص سرور گرم ہے، گبرو کیسے اس لطف سے محروم ہو سکتا ہے؟

بوڑھوں کے لیے یہ رکاوٹیں نہیں انہیں نہ ناچ گانے سے مطلب نہ کھیل تماشے سے غرض، محض اپنے کام سے سروکار ہے۔

بلاقی نے کہا ''بھولا تمہارے داداہل لے کر گئے''

''جانے دو اماں مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا''

(5)

سوجان کے اس نئے حوصلے پر گاؤں بھر میں تبصرے ہوئے نکل گئی ساری بھگتی بنا ہوا تھا۔ مایہ میں پھنسا ہوا آدمی، کاہے، بھوت ہے، مگر بھگت جی کے دروازے پر اب سادھو سنت دیکھے جاتے ہیں ان کی آؤ بھگت ہوتی۔ اب کے اس کی دھرتی نے سونا اگل دیا گھر میں اناج رکھنے کی جگہ نہیں ملتی جس کھیت میں مشکل سے پانچ من ہوتا تھا اب اس میں دس من اناج پیدا ہوا۔

چیت کا مہینہ تھا کھلیانوں میں ست یگ کی حکومت تھی جگہ جگہ اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے یہی وقت ہے جب کسانوں کو ایک لمحہ کے لیے اپنی زندگی کامیاب معلوم ہوتی ہے جب فخر سے ان کا دل اچھلنے لگتا ہے سوجان بھگت ٹوکروں میں اناج بھر بھر کر دیتے اور لڑکے انہیں تھام کر گھر پہنچانے جاتے کتنے ہی بھاٹ اور

فقیر بھگت جی کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں وہ سادھو بھی تھا جو آج سے آٹھ مہینے قبل ان کے در سے مایوس لوٹا تھا۔

اچانک بھگت نے اس فقیر سے پوچھا'' کیوں بابا! آج کہاں کہاں چکر لگا آئے''

''ابھی تو کہیں نہیں گیا بھگت! پہلے تمہارے ہی پاس آیا ہوں''

''اچھا تمہارے سامنے یہ انبار ہے جتنا اناج اٹھا سکتے ہو اٹھا لو''

فقیر کی حریص نگاہوں نے ڈھیر کو دیکھ کر کہا''جتنا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دے دو گے اتنا ہی لے لوں گا''

''نہیں۔۔۔۔تم سے جتنا اٹھایا جا سکے اٹھا لو''

فقیر کے پاس ایک چادر تھی اس نے کوئی دس سیر اناج اس میں بھرا اور اٹھانے لگا جھجک کے مارے اور زیادہ بھرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔

بھگت اس کے دل کا مطلب بھانپ کر حوصلہ دلاتے ہوئے بولے

''بس! اتنا تو ایک بچہ بھی اٹھا لے جا سکتا ہے''

فقیر نے بھولا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا''میرے لئے اتنا ہی بہت ہے''

''نہیں تم جھجکتے ہو اتنا اور بھرو''

فقیر نے پانچ سیر اناج اور بھرا اور بھولا کی طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگا

''اس کی طرف کیا دیکھتے ہو بابا جی! میں جو کہتا ہوں وہی کرو تم سے جتنا اٹھایا جا سکے اٹھا لو۔''

فقیر ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے اناج بھر لیا اور بھولا نے گٹھری نہ اٹھانے دی تو کتنی خفت ہو گی دوسرے فقیروں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا سب یہی کہیں گے کہ فقیر کتنا لالچی ہے اسے اور اناج بھرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تب سوجان بھگت نے چادر میں اور اناج بھرا اس کی گٹھری باندھ کر بولا

''اسے اٹھالے جاؤ''

''بابا! اتنا تو مجھ سے نہ اٹھ سکے گا''

''ارے اتنا بھی نہ اٹھ سکے گا بہت ہو گا تو من بھر بھلا زور تو لگاؤ دیکھوں اٹھا سکتے ہو یا نہیں۔''

فقیر نے گٹھری کو پہلے آزمایا بھاری تھی اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

بولا ''بھگت جی! یہ مجھ سے نہ اٹھے گی''

''اچھا بتاؤ کس گاؤں میں رہتے ہو؟''

''بڑی دور ہے بھگت جی! مولا کا نام تو سنا ہو گا''

''اچھا آگے آگے چلو میں پہنچا دوں گا''

یہ کہہ کر بھگت جی نے زور لگا کر گٹھری اٹھائی اور فقیر کے پیچھے ہو لیے دیکھنے والے بھگت کا جذبہ دیکھ کر ششدرہ رہ گئے انہیں کیا معلوم تھا کہ بھگت جی پر اس وقت کونسا نشہ سوار ہے آٹھ مہینوں کی مسلسل اور ان تھک محنت کا انہیں آج پھل ملا ہے آج انہوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا تھا۔ وہی تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی۔ دھار پر چڑھ کر لوہے کو بھی کاٹ دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز ہے جس میں لاگ ہے، وہ بوڑھا بھی جوان ہے جن میں لاگ

نہیں عزت نہیں، وہ جوان بھی ہو کر مردہ ہے سو جان میں حمیت تھی اس نے اسے غیر معمولی قوت دی چلتے وقت انہوں نے بھولا کو پر غرور نظروں سے دیکھا اور کہا یہ بھاٹ اور فقیر کھڑے ہیں ان میں سے کوئی خالی ہاتھ نہ جانے پائے۔

بھولا سر جھکائے کھڑا رہا اسے کچھ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا بوڑھے باپ نے اسے ہرا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

خنجر وفا

پہلی بار: ''زمانہ'' نومبر 1918ء

جے گڑھ اور بجے گڑھ دو نہایت سرسبز مہذب وسیع اور مستحکم سلطنتیں تھیں دونوں ہی میں علم و ہنر کی گرم بازاری تھی دونوں کا مذہب ایک، معاشرت ایک، رسم و رواج ایک، فلسفہ ایک اصول ترقی ایک معیار زندگی ایک اور زبان میں بھی برائے نام فرق تھا۔ جے گڑھی شعرا کے کلام پر بجے گڑھ والے سر دھنتے اور بجے گڑھی فلسفیوں کے مسائل جے گڑھ کا ایمان تھے جے گڑھی حسینوں سے بجے گڑھ کے خانوادے روشن ہوتے اور بجے گڑھ کی دیویاں جے گڑھ میں پجتی تھیں۔ تاہم دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔ چشمک ہی نہیں بلکہ مغائرت، کدورت، سوظن اور حسد، دونوں ہی ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف خنجر بکف رہتی تھیں۔ جے گڑھ میں اگر کوئی ملکی اصلاح عمل میں آتی تو بجے گڑھ میں واویلا مچ جاتا کہ ہماری زندگی معرض خطر میں ہے۔ علی ہذا بجے گڑھ میں کوئی تجارتی ترقی صورت پذیر ہوتی تو جے گڑھ میں شور محشر برپا ہو جاتا تھا جے گڑھ اگر ریلوے کی کوئی نئی شاخ نکالتا تو بجے گڑھ اسے پانے کے لئے مار سیاہ سمجھتا اور بجے گڑھ میں کوئی نیا جہاز تیار ہوتا تو جے گڑھ کو وہ نہنگ خون آشام نظر آتا تھا۔ اگر وہ بد گمانیاں جہلا یا عوام میں پیدا ہوتیں تو ایک بات تھی لطف یہ تھا کہ یہ کدورتیں علم او ربیداری، ثروت او روقار کی سرزمین ہی میں نشوونما پاتی تھیں۔ جہالت اور جمود کی

سرزمین ان کے لیے موافق نہ تھی۔ بالخصوص تدبر اور آئین کے زرخیز علاقے میں تو اس تخم کی بالیدگی خیال کی سبک روی کو بھی مات کر دیتی تھی۔ ننھا سا بیج چشم زدن میں تناور درخت ہو جاتا۔ دار العلوموں میں آہ و زاری کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ ملکی انجمنوں میں ایک زلزلہ سا آ جاتا جرائد اور اخبارات کے فغان دلسوز قلمرو کو زیر کر دیتے کہیں سے آواز ”جے گڑھ، پیارے جے گڑھ، مقدس جے گڑھ کے لیے یہ سخت آزمائش کا موقع ہے رقیب نے جو نصاب تعلیم تیار کیا ہے وہ ہمارے لئے پیام مرگ ہے اب ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ ہم کمر ہمت چست باندھیں اور ثابت کر دیں کہ جے گھڑ لافانی تھے جے گڑھ ان حملوں سے جانبر ہو سکتا ہے نہیں اس کا دندان شکن جواب دے سکتا ہے۔ اگر ہم اس وقت بیدار نہ ہوئے تو جے گڑھ پیارا جے گڑھ پردہ ہستی سے محو ہو جائے گا اور روایتیں بھی اسے فراموش کر دیں گی“ دوسری جانب سے صدا آتی ”جے گڑھ کے بے خبر سونے والو! ہمارے مہربان پڑوسیوں نے اپنے اخباروں کی زبان بند کرنے کے لیے جو نئے قواعد نافذ کیے ہیں ان پر ناراضگی کا اظہار کرنا ہمارا فرض ہے۔ ان کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہمیں وہاں کے معاملات سے بے خبر رکھا جائے اور اس تاریکی کے پردہ میں ہمارے اوپر دھاوے کیے جائیں ہمارے گلوں پر پھیرنے کے لیے ناراضگی کے لیے نئے نئے اسلحہ تیار کئے جائیں اور بالآخر ہمارا نام ونشان مٹا دیا جائے لیکن ہم اپنے دوستوں کو جتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ انہیں آلہ شر کی ایجاد میں ید طولےٰ ہے تو ہمیں بھی دفعیہ بلیات میں کمال ہے اگر شیطان ان کا مددگار تو ہم کو بھی تائید ربانی حاصل ہے اور اگر اب تک ہمارے دوستوں کو

معلوم نہیں ہے تو اب ہونا چاہیے کہ تائیدِ ایزدی ہمیشہ شیطان پر غالب آتی ہے۔‘‘

(2)

بجے گڑھ باکمال کلاونتوں کا اکھاڑا تھا شیریں بائی اس اکھاڑے کی سبز پری تھی اس کے کمال کا دور دور شہرہ تھا۔ تلمر و نغمہ کی ملکہ تھی، جس کے آستانے پر بڑے بڑے نامور آ کر سر جھکاتے تھے چاروں طرف فتح کا نقارہ بجا کر اس نے بجے گڑھ کا رخ کیا۔ جس سے اب تک اسے خراجِ تحسین نہ حاصل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بجے گڑھ میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا تعصب اور تکبر اور تفاخر بیجا ہوا اسے اڑانے والی سوکھی پتیوں کی طرح منتشر ہو گئے بازارِ حسن ونشاط میں خاک اڑنے لگی تھیٹروں اور رقص گاہوں میں ایک ویرانی کا عالم نظر آنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری خلقت مسحور ہو گئی ہے شام ہوتے ہی بجے گڑھ کے صغیر و کبیر برنا و پیر شیریں بائی کی مجلس عام طرف دوڑتے تھے۔ سارا ملک شیریں کے نشۂ عبودیت میں مخمور ہو گیا۔

بجے گڑھ کے باخبر حلقے میں اہل وطن کے اس جنون سے ایک اضطراب کی حالت پیدا ہوئی۔ محض یہی نہیں کہ ان کے ملک کی دولت زائل ہو رہی تھی۔ بلکہ ان کا قومی وقار اور غرور خاک میں ملا جاتا تھا۔ بجے گڑھ کی ایک رقاصہ ایک معمولی فنیا گر خواہ کتنی ہی شیریں ادا کیوں نہ ہو، بجے گڑھ کی دلچسپیوں کا مرکز بن جائے، یہ ستم تھا۔ باہم مشورے ہوئے اور قاضیانِ وطن کی جانب سے وزراءِ ملک کی

خدمت میں اس خاص امر کے متعلق ایک وفد حاضر ہوا۔ بجے گڑھ کے اراکین نشاط کی جانب سے بھی محضر نامے پیش ہونے لگے۔ اخباروں نے قومی ذلت اور نکبت کے ترانے چھیڑے۔ دارالعلوم میں سوالات کی یورش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وزراء مجبور ہوگئے۔ شیریں بائی کے نام شاہی فرمان پہنچا "چونکہ تمہارے قیام سے ملک میں ایک شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے تم فی الفور بجے گڑھ سے رخصت ہو جاؤ" مگر یہ حکم سراسر آئین بین الاقوامی، باہمی عہد نامے سے اور اصول تمدن کے خلاف تھا۔ بجے گڑھ کے سفیر نے جو بجے گڑھ میں متعین تھا، اس حکم سے تعریض کی اور شیریں بائی نے بالآخر اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ کیونکہ اس سے اس کی آزادی اور اس کے وطن کے حقوق اور وقار پر حرف آتا تھا۔

(3)

بجے گڑھ کو چہ و بازار خاموش تھے سیرگاہیں خالی تفریح و تماشے در بستہ قصر شاہی کے وسیع صحن اور دارالعوام کے پر فضا سبزہ زار میں آدمیوں کا ہجوم تھا مگر ان کی زبانیں بند تھیں اور آنکھیں سرخ بشرے تند اور سخت، تیوریاں چڑھی ہوئی ماتھے پر شکن، امنڈی ہوئی کالی گھٹا تھی۔ ہیبت ناک خاموش اور سیلاب کو دامن میں چھپائے ہوئے۔

مگر دارالعلوم میں ایک ہنگامہ عظیم برپا تھا کوئی صلح کا حامی تھا، کوئی جنگ کا طالب، کوئی مصالحت کا معین، کوئی تحقیقاتی کمیشن کا محرک معاملہ نازک تھا، موقع

تنگ تاہم باہمی ردو کدہ وتعریض وتر دید ذاتی حملوں اور بدگمانیوں کا بازار گرم تھا آدھی رات گزر گئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا سرمایہ کی متفق طاقت اس کا رسوخ اور وقار اور رعب فیصلہ کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔

تین پہر رات جا چکی تھی ہوا نیند سے متوالی ہو کر انگڑائیاں لے رہی تھی اور درختوں کی آنکھیں جھپکی جاتی تھیں آسمان کی شمعیں بھی جھلملانے لگی تھیں اراکین دربار کبھی دیواروں کی طرف تاکتے تھے کبھی سقف کی طرف لیکن مفر نہ سوجھتا تھا۔

دفعتاً باہر سے آواز آئی جنگ! جنگ! دار العلوم اس صداء بلند سے گونج اٹھا دیواروں نے زبان خاموش سے جواب دیا "جنگ! جنگ"!

یہ نعرہ غیب تھا جس نے جامد میں حرکت پیدا کر دی۔ اب ساکن میں تموج پیدا ہو گیا اراکین گویا خواب غفلت سے چونک پڑے۔ جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتے ہی اچھل پڑے۔ وزیر جنگ سید عسکری نے فرمایا "کیا اب بھی آپ لوگوں کو اعلان جنگ میں تامل ہے؟ زبان خلق حکم خدا ہے اور اس کی صدا ابھی آپ کے کانوں میں آئی اس کی تعمیل ہمارا فرض ہے ہم نے آج طولانی نشست میں ثابت کیا ہے کہ ہم زبان کے دھنی ہیں پر زبان تلوار ہے سپر نہیں ہمیں اس وقت سپر کی ضرورت ہے آیئے ہم اپنے سینوں کو سپر بنا لیں اور ثابت کر دیں کہ ہم میں ابھی جوہر باقی ہے جس نے ہمارے بزرگوں کا نام روشن کیا غیرت قومی زندگی کی روح ہے وہ نفع ونقصان سے بالاتر ہے وہ ہنڈی اور روکڑ ھ وصول اور باقی تیزی ومندی کی پابندیوں سے آزاد ہے ساری کانوں کی چھپی ہوئی دولت، ساری دنیا کی منڈیاں، ساری دنیا کی صنعتیں، اس کے پاسنگ ہیں۔ اس بچایئے ورنہ آپ کا یہ

سارا نظام منتشر ہو جائے گا۔ شیرازہ بکھر جائے گا آپ فنا ہو جائیں گے۔ ہمارا اہل زر سے سوال ہے کی اب بھی آپ کو اعلان جنگ میں تامل ہے۔"

باہر سے صداہا آوازیں آئیں جنگ! جنگ!

ایک سیٹھ صاحب نے فرمایا "آپ جنگ کے لیے تیار ہیں؟"

عسکری "ہمیشہ سے زیادہ"

خواجہ صاحب "آپ کو فتح کا یقین ہے؟"

عسکری "کامل یقین ہے"

دور و قریب سے جنگ جنگ! کی گرجتی ہوئی پیہم صدائیں آنے لگیں گویا ہمالہ کے کسی اتھاہ غار سے ہتھوڑوں کی جھنکار آ رہی ہو دار العلوم کانپ اٹھا زمین تھرتھرانے لگی راؤں کی تقسیم شروع ہوئی۔ اراکین نے بالا اتفاق جنگ کا فیصلہ کیا۔ غیرت جو کچھ نہ کرسکتی تھی وہ نعرہ خلق نے کر دیا۔

(4)

آج سے تین سال پہلے ایک زبردست انقلاب نے جے گڑھ کو ہلا ڈالا تھا۔ برسوں تک خانہ جنگیوں کا دور رہا۔ ہزاروں خاندان مٹ گئے سینکڑوں قصبے ویران ہو گئے۔ باپ بیٹے کے خون کا پیاسا تھا بھائی بھائی کی جان کا گاہک جب بالآخر حریت کی فتح ہوئی تو اس نے فدائیاں تاج کو چن چن کر مارا۔ **ملک** کے زندان خانے سیاسی فدائیوں سے پڑ ہو گئے۔ انھی جانبازوں میں ایک مرزا منصوری تھا۔

اسے قنوج کے قلعہ میں قید کیا گیا۔ جس کے تین طرف اونچی دیواریں تھیں اور ایک طرف گنگا ندی منصور کو سارے دن ہتھوڑے چلانا پڑتے۔ صرف شام کو آدھ گھنٹہ کے لئے نماز کی رخصت ملتی تھی۔ اس وقت منصور گنگا کے کنارے آ بیٹھتا اور ابناء وطن کی حالت پر روتا۔ وہ سارا ملکی اور معاشرتی نظام جو اس کے خیال میں قومی نشوونما کا جزو اعظم تھا۔ اس شورش کے سیلاب میں غارت ہو رہا تھا۔ وہ ایک آہ سرد بھر کے کہتا ہے گڑھ اب تیرا خدا ہی حافظ ہے تو نے خاک کو اکسیر بنایا اور اکسیر کو خاک تو نے نسب و جوہر کو آداب و اخلاق کو علم و کمال کو مٹا دیا۔ پامال کر دیا اب ہم تیرے عناندار ہیں چرواہے تیرے پاسبان اور بنیے تیرے اراکین دربار مگر دیکھ لینا یہ ہوا ہے اور چرواہے اور ساہوکار ایک دن تجھے خون کے آنسو رلائیں گے۔ ثروت اپنی رفتار نہ چھوڑے گی حکومت اپنا رنگ نہ بدلے گی۔ اشخاص چاہے بدل جائیں۔ لیکن نظام وہی رہے گا یہ تیرے نئے چارہ گر جو اس وقت مجسم انکسار اور حق و انصاف کے پتلے بنے ہوئے ہیں ایک دن نشہ ثروت میں متوالے ہوں گے ان کی سختیاں تاج کی سختیوں سے کہیں زیادہ سخت ہوں گی اور ان کے مظالم اس سے کہیں زیادہ شدید۔

انہیں خیالوں میں ڈوبے ہوئے منصور کو اپنے وطن کی یاد آ جاتی گھر کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا معصوم بچے عسکری کی پیاری پیاری صورت آنکھوں میں پھر جاتی جسے تقدیر نے ماں کے ناز و پیار سے محروم کر دیا تھا تب منصور ایک آہ سرد کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور وحشت اشتیاق میں اس کا جی چاہتا کہ گنگا میں کود کر پار نکل جاؤں۔

رفتہ رفتہ اس خواہش نے ارادہ کی صورت اختیار کی گنگا امنڈی ہوئی تھی اور چھور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تند اور گرجتی ہوئی لہریں، دوڑتے ہوئے پہاڑوں کے مشابہ تھیں۔ پاٹ دیکھ کر سر میں چکر سا آ جاتا تھا۔ منصور نے سوچا، ندی اتر نے دوں لیکن ندی کے اترنے کی جگہ ہولناک مرض کی طرح بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ منصور کو اور صبر نہ رہا ایک دن وہ رات کو اٹھا اور پر شور متموج تاریکی میں کود پڑا۔

منصور ساری رات لہروں کے ساتھ زیرو زبر ہوتا رہا جیسے کوئی ننھا سا طائر طوفانی تھپیڑے کھا رہا تھا۔ کبھی ان کی گود میں چھپا ہوا کبھی ایک ریلے میں دس قدم آگے کبھی ایک دھکے میں دس قدم پیچھے زندگی نقش بر آب کی زندہ مثال ہے جب وہ ندی کے پار ہوا تو ریشہ بے جان تھا صرف بانس باقی تھا اور سانس کے شوق دیدار۔

اس کے تیسرے دن منصور بجے گڑھ جا پہنچا ایک گود میں عسکری تھا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بینوائی کا بقچہ وہاں اس کے اپنا نام مرزا جلال بتایا وضع قطع بھی تبدیل کر لی تھی تناور اور سجیلا جوان تھا۔ چہرہ پر شرافت اور بخابت کا نور جھلکتا تھا ملازمت کے لیے کسی مزید سفارش کی ضرورت نہ تھی سپاہیوں میں داخل ہو گیا اور پانچ ہی سال میں اپنے حسن خدمت اور اعتماد کی بدولت مندور کے سرحدی کوہستانی قلعہ کا قلعہ دار بنا دیا گیا۔

لیکن مرزا جلال کو وطن کی یاد ہمیشہ ستایا کرتی۔ وہ عسکری کو گود میں لے لیتا۔ اور فصیلوں پر چڑھا سے بجے گڑھ کے وہ مسکراتے ہوئے سبزہ زار اور متوالے چشمے

اور حلیم بستیاں دکھاتا جن کے سواد قلعہ سے نظر آتے اس وقت بے اختیار اس کے جگر سے ایک آہ سرد نکل جاتی اور آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ وہ عسکری کو گلے لگالیتا اور کہتا ''بیٹا وہ تمہارا دیس ہے وہی تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا آشیانہ ہے تم سے ہو سکے تو اس کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنی عمر ختم کر دینا۔ مگر کبھی اس کی آن میں بٹہ نہ لگانا کبھی اس سے دغا مت کرنا کیونکہ تم اسی کے آب وگل سے پیدا ہوئے اور تمہارے بزرگوں کی پاک روحیں اب بھی وہاں منڈلا رہی ہیں اسی طرح بچپنے ہی سے عسکری کے دل پر وطن کی خدمت اور محبت کا نقش ہو گیا تھا۔ وہ جوان ہوا تو جے گڑھ پر جان دیتا تھا اس کے وقار کا دلدادہ اور وہ اس کی ہیبت وشان کا چلہ کش اس کی سرسبزی کا عامل اس کے پھریرے کوئی اچھوتی سرزمینوں میں نصب کرنے کا فدائی بیس سال کا جوان رعنا تھا ارادہ مضبوط، حوصلے بلند، ہمت وسیع، قوا آہنی آ کر جے گڑھ کی فوج میں داخل ہو گیا اور اس وقت جے گڑھی سپاہ کا مہر درخشاں بنا ہوا تھا۔''

(5)

جے گڑھ نے الٹی میٹم دے دیا اگر 24 گھنٹوں کے اندر شیریں بائی جے گڑھ نہ پہنچی تو اس کے استقبال کے لیے جے گڑھ کی فوج روانہ ہو گی بجے گڑھ نے جواب دیا جے گڑھ کی فوج آئے ہم اس کی پیشوائی کے لئے حاضر ہیں شیریں بائی جب تک یہاں کی عدالت سے حکم عدولی کی سزا نہ پالے وہ رہا نہیں ہو سکتی اور جے

گڑھ کو ہمارے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں۔

عسکری نے منہ مانگی مراد پائی خفیہ طور پر ایک قاصد مرزا جلال کی خدمت میں روانہ کیا اور خط میں لکھا۔

''آج بجے گڑھ سے ہماری جنگ چھڑ گئی اب خدا نے چاہا تو دنیا جے گڑھ کی تلوار کا لوہا مان جائے گی۔ عسکری ابن منصور بزم فاتحاں کا حاشیہ نشین بن سکے گا۔ اور شاید میری وہ دلی تمنا بھی بر آئے جو ہمیشہ میری روح کو تڑپایا کرتی ہے شاید میں مرزا منصور کو پھر جے گڑھ کے دارالعلوم میں ایک ممتاز درجے پر بیٹھے ہوئے دیکھ سکوں ہم مندور سے نہ بولیں گے اور آپ بھی ہمیں نہ چھیڑئیے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ کوئی افتاد آ ہی پڑے۔ تو آپ میری یہ مہر جس سپاہی یا افسر کو دکھا دیں گے وہ آپ کی تعظیم کرے گا اور آپ کو میرے کیمپ میں پہنچا دے گا مجھے یقین ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو اس جے گڑھ کے لیے جو آپ کو اتنا پیارا ہے اور اس عسکری کی خاطر جو آپ جو لخت جگر ہے، آپ تھوڑی سی تکلیف سے (ممکن ہے وہ روحانی تکلیف ہو) دریغ نہ فرمائیں گے۔''

اس کے تیسرے دن جے گڑھ کی فوج نے بجے گڑھ پر حملہ کیا اور مندور سے پانچ میل کے فاصلے پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا بجے گڑھ کو اپنے ہوائی جہازوں، زہریلے غاروں اور دور انداز توپوں کا غرہ تھا۔ جے گڑھ کو اپنے سپاہ کی شجاعت اور جفاکشی، فہم اور ادراک کا بھروسہ بجے گڑھ کی سپاہ حکم اور ضبط کی غلامی تھی جے گڑھ والے ذمہ داری اور تمیز کے قائل۔

ایک مہینہ تک شب و روز کشت و خون کے معرکے ہوتے رہے ہمیشہ آگ اور

فلزات اور زہریلی ہواؤں کا طوفان سا اٹھا رہتا۔ انسان تھک جاتا تھا پر کلیں اتھک تھیں جے گڑھیوں کے حوصلے پست ہو گئے متواتر زکیں کھائیں عسکری کو معلوم ہوا کہ ذمہ داری فتح میں چاہے معجزے کر دکھائے پر شکست میں میدان حکم ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔

جے گڑھ کے اخباروں نے ارباب حل وعقد پر حملے کرنے شروع کئے عسکری ساری قوم کا تودہ ملامت بن گیا۔ وہی عسکری جس پر جے گڑھ فدا ہوتا تھا سب کی نظروں میں خار ہو گیا۔ یتیموں کے آنسو بیواؤں کی آہیں، مجروحوں کی جانکاہیاں، تاجروں کی تباہی، قوم کی ذلت ان سب کا سبب وہی ایک فرد واحد عسکری تھا۔ قوم کی امامت تخت زرنگار ہو تو پر پھولوں کی سیج ہرگز نہیں۔

اب جے گڑھ کی جانبری کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ کسی طرح مخالف سپاہ کا تعلق مندور کے قلعہ سے قطع کر دیا جائے جو سامان جنگ و رسد اور وسائل نقل و حرکت کا مرکز تھا مہم دشوار تھی نہایت خطرناک، کامیابی کی امید موہوم ناکامی کا اندیشہ غالب کامیابی اگر سوکھے دھان کا پانی تھی تو ناکامی اس کی آگ۔ مگر نجات کی اور کوئی دوسری تدبیر نہ تھی عسکری نے مرزا جلال کو لکھا۔

''پیارے ابا جان! اپنے سابق کے نیاز نامے میں میں نے جس ضرورت کا شارہ کیا تھا، بدقسمتی سے وہ ضرورت آپڑی آ کا پیارا جے گڑھ پنجہ گرگ میں پھنسا ہوا ہے اور آپ کا پیارا عسکری ورطہ یاس میں دونوں آپ کی طرف نگاہ التجا سے تک رہے ہیں۔''

آج ہماری آخری کوشش ہے ہم مخالف سپاہ کو مندور کے قلعہ سے علیحدہ کرنا

چاہتے ہیں نصف شب کے بعد یہ معرکہ شروع ہوگا آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اگر ہم سر بکف ہو کر قلعہ کے مقابل تک پہنچ سکیں ،تو ہمیں آہنی دروازہ سے سر ٹکرا کر واپس نہ ہونا پڑے ورنہ آپ اپنی قوم کی عزت اور اپنے بیٹے کی لاش کو اسی مقام پر تڑپتے دیکھے گے اور بے گڑھ آپ کو کبھی معاف نہ کرے گا۔اس سے آپ کو کتنی ہی ایذا پہنچی ہو مگر آپ اس کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

شام ہو چکی تھی۔میدان جنگ ایسا نظر آتا تھا گویا جنگل آگ سے جل گیا ہو۔ بجے گڑھی سپاہ ایک خونریز معرکہ کے بعد خندقوں میں آ رہی تھی۔مجروحین قلعہ مندور کے شفاخانے میں پہنچائے جا رہے تھے۔توپیں تھک کر چپ ہو گئی تھی اور بندقیں ذرا دم لے رہی تھیں۔ اسی وقت بے گڑھی سپاہ کا ایک افسر بجے گڑھی وردی پہنے ہوئے عسکری کے خیمہ سے نکلا۔شکستہ توپیں ہرنگوں طیارے گھوڑوں کی لاشیں ، اوندھی پڑی ہوئی ہوا گاڑیاں اور متحرک اعضا شکستہ قلعے اس کے لیے پردے کا کام کرنے لگے۔ان کی آڑ میں چھپتا ہوا ، وہ بجے گڑھی مجروحوں کی صف میں جا پہنچا اور چپ چاپ زمین پر لیٹ گیا۔

(6)

نصف شب گزر چکی تھی مندود کا قلعہ وار مزرا جلال قلعہ کی فصیل پر بیٹھا ہوا میدان جنگ کا تماشا دیکھ رہا تھا۔اور سوچتا تھا کہ عسکری کو مجھے ایسا خط لکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے اپنے اصول وعقائد پر

اپنی زندگی نثار کر دی، جلاوطن ہوا، اور غلامی کا طوق گردن میں ڈالا۔ وہ اب اپنی حیات کے دور آخر میں جادہ مقیم سے منحرف نہ ہوگا۔ اپنے اصولوں کو نہ توڑے گا اللہ کے دربار میں وطن اور فرزند اور اہل وطن ایک بھی ساتھ نہ دیں گے اپنے اعمال کی سزا و جزا آپ ہی بھگتنی پڑے گی روز حساب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

توبہ! بے گڑھیوں سے پھر وہی حماقت ہوئی خواہ مخواہ گولہ باری سے دشمن کو خبردار کر دینے کی کیا ضرورت تھی اب ادھر سے بھی جواب دیا جائے گا اور ہزاروں جانیں ضائع ہونگی شبخوں کے معنی تو یہ ہیں کہ غنیم سر پر آ جائے اور کانوں کان خبر نہ ہو، چوطرفہ کھلبلی پڑ جائے۔ مانا کہ موجودہ حالات میں اپنی حرکات کو پوشیدہ رکھنا دشوار ہے اس کا علاج غار تاریک سے کرنا چاہیے تھا۔ مگر آج شاید ان کو گولہ باری معمول سے زیادہ شدید ہے۔ بجے گڑھ کی صفوں کو اور متعدد استحکامات کو چیر کر بظاہر ان کا یہاں تک آنا تو محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بفرض محال آ ہی جائیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ کو طے کیوں نہ کر لوں۔ خوب اس میں طے کرنے کی بات ہی کیا ہے میرا راستہ صرف ہے میں بجے گڑھ کا نمک خوار ہوں میں جب خانماں برباد خستہ حال آوارہ وطن تھا، تو بجے گڑھ نے مجھے اپنے دامن میں پناہ دی اور میری خدمات کا مناسب اعتراف کیا اس کی بدولت تیس سال تک میری زندگی نیک نامی اور عزت سے گزری۔ اس سے دغا کرنا حد درجہ کی نمک فراموشی ہے ایسا گناہ جس کی کوئی سزا نہیں۔ وہ اوپر شور ہو رہا ہے۔ ہوائی جہاز ہوں گے وہ گولہ گرا مگر خیریت ہوئی نیچے کوئی نہیں تھا۔

۔۔۔۔ مگر کیا دغا ہر ایک حالت میں گناہ ہے؟ ایسی حالتیں بھی تو ہیں، جب

دغا وفا سے بھی زیادہ مستحسن ہو جاتا ہے اپنے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے۔ اپنی قوم کے دشمن سے دغا کرنا کیا گناہ ہے؟ کتنے ہی فعل جو ذاتی حیثیت سے سخت ترین سزا کا مستوجب ہے مذہبی حیثیت سے شہادت کا درجہ پاتا ہے اور قومی حیثیت سے فدایت کا کتنی بیرحمیاں اور سفاکیاں، کتنی دغائیں اور روباہ بازیاں قومی اور مذہبی نقطہ نگاہ سے محض روا نہیں ہفرائض میں داخل ہو جاتی ہیں۔ حال کے یورپی معرکہ میں اس کی کتنی ہی مثالیں مل سکتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی دغا کاریوں سے پر ہے۔ اس نئے دور میں ذاتی احساس نیک و بد قومی مصلحت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ قومیت نے ذات کو مٹا دیا ہے ممکن ہے یہی منشاء ایزدی ہو اور خدا کے دربار میں ہمارے افعال قومی معیار ہی پر پرکھے جائیں یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا میں سمجھتا ہوں۔

پھر عالم بال میں شور ہوا مگر شاید یہ ادھر ہی کے طیارے ہیں آج کے جے گڑھ والے بڑے دم خم سے لڑ رہے ہیں۔ ادھر والے دبتے نظر آتے ہیں آج یقیناً میدان انہی کے ہاتھ رہے گا جان پر کھیلے ہوئے ہیں جے گڑھی دلاروں کے جوہر مایوسی ہی میں خوب کھلتے ہیں ان کی شکست فتح سے بھی شاندار ہوتی ہے۔ بلاشک عسکری نقل و حرکت کا استاد ہے کس خوبصورتی سے اپنی فوج کا رخ باپ قلعہ کی طرف پھیر دیا۔ مگر سخت غلطی کر رہے ہیں اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہے ہیں۔ سامنے کا میدان دشمن کے لیے خالی کیے دیتے ہیں۔ وہ چاہے تو بلا روک ٹوک آگے بڑھ سکتا ہے اور صبح تک بجے گڑھ کی سرزمین میں داخل ہو سکتا ہے جے گڑھیوں کے لیے واپسی یا تو غیر ممکن ہے یا نہایت خطرناک قلعہ کا دروازہ نہایت

مستحکم ہے فصیلوں کی شگافوں سے ان پر بے شمار بندوقوں کے نشانہ پڑیں گے۔ ان کا اس آگ میں ایک گھنٹہ بھی ٹھہرنا ممکن نہیں ہے کیا اتنے ہموطنوں کی جانیں محض ایک اصول پر۔ محض روز حساب کے خوف سے محض اپنے اخلاقی احساس پر قربان کر دوں اور محض جانیں ہی کیوں؟ اس سپاہ کی تباہی سے جے گڑھ کی تباہی ہے کل جے گڑھ کی پاک سرزمین غنیم کے نقارہ فتح کی صداؤں سے گونج اٹھے گی میری مائیں اور بہنیں اور بیٹیاں اس کی حیا سوز بدعتوں کا شکار ہوں گی۔ سارے ملک میں قتل و غارت کے ہنگامے برپا ہوں گے پرانی عداوت اور کدورت کے شعلے بھڑکیں گے کنج مرقد میں سوتی ہوئی روحیں دشمن کے قدموں سے پامال ہوں گی وہ تعمیرات جو ہماری گزشتہ عظمت کی زندہ رایتیں ہیں، وہ یادگاریں جو ہمارے بزرگوں کے تبرکات ہیں، جو ہمارے کارناموں کا دفتر، ہمارے کمالات کا خزانہ اور ہمارے اکتسابات کی روشن شہادتیں ہیں۔ جن کی آرائش اور ترتیب اور جامعیت کو دنیا کی قومیں رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے وہ نیم وحشی، کندہ ناتراش لشکریوں کی فرد گاہیں بنیں گی اور ان کے جوش انہدام کا شکار کیا اپنی قوم کو ان ستم شعاریوں کا تختۂ مشق بننے دوں محض اس لیے کہ میرا پیمان وفا نہ ٹوٹے۔

اف! یہ قلعے میں زہریلے گیس کہاں سے آ گئے کسی جے گڑھی طیارے کی حرکت ہوگی۔ سر میں چکر آ رہا ہے، یہاں سے کمک بھیجی جا رہی ہے فصیل کی روزنوں میں بھی توپیں چڑھائی جا رہی ہیں جے گڑھ والے قلعہ کے سامنے آ گئے ایک دھاوے میں وہ باب ہمایوں تک آ پہنچیں گے بجے گڑھ والے اس سیلاب کو اب نہیں روک سکتے جے گڑھ والوں کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا تھا؟ یا اللہ کسی طرح

دروازہ خود بخود کھل جاتا۔کوئی بے گڑھی ہوا باز مجھ سے بزور کنجی چھین لیتا۔ مجھے ہلاک کر ڈالتا آہ میرے اتنے عزیز ہم وطن پیارے بھائی ایک ان میں تو وہ خاک ہو جائیں گے اور میں بے بس ہوں ہاتھوں میں زنجیر ہے پیروں میں بیڑیاں ایک ایک رویاں رسیوں سے جکڑا ہوا ہے کیوں نہ اس زنجیر کو توڑ دوں ان بیڑیوں کے ریزے ریزے کر دوں اور دروازے کے دونوں بازو اپنے عزیز فاتحوں کے خیر مقدم کے لیے کھول دوں بالفرض یہ گناہ سہی پر یہ موقع گناہ سے ڈرنے کا نہیں جہنم کے مار آتشیں اور خون آشام بہائم اور لپکتے ہوئے شعلے میری روح کو جلائیں، تڑپائیں، کوئی مضائقہ نہیں اگر محض میری روح کی تباہی میری قوم اور وطن کی قعر ہلاکت سے بچا سکتے ہیں تو وہ مبارک ہے۔ بے گڑھ نے زیادتی کی ہے اس نے محض بے گڑھ کو ذلیل کرنے کے لیے، محض اس کے اشتعال کے لیے شیریں بائی کے شہر بدر ہونے کا حکم جاری کیا۔ جو سراسر ناروا تھا۔ہائے افسوس! میں نے اسی وقت استعفا کیوں نہ دے دیا۔اور اس قفس اطاعت سے کیوں نہ نکل گیا۔

''ہائے غضب بے گڑھی سپاہ خندقوں تک پہنچ گئی خدایا! ان جانبازوں پر رحم کر، ان کی مدد کر کلدار توپوں کے کیسے گولے برس رہے ہیں گویا آسمان کے بے شمار تارے ٹوٹے پڑتے ہیں الامان باب ہمایوں پر لوگوں کی کیسی ضربیں پڑ رہی ہیں۔ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں کاش دروازہ ٹوٹ جاتا۔ہارے میر اعسکری میرا لخت جگر وہ گھوڑے پر سوار آ رہا ہے کیسا شجاع، کیسا جانباز کیسا قومی ہمت! آہ مجھ روسیاہ کو موت کیوں نہیں آ جاتی میرے سر پر کوئی گولہ کیوں نہیں آ گرتا جس پودے کو اپنے خون جگر سے پالا جو میری خزاں نصیب زندگی کا سدا بہار پھول تھا۔ہائے جو

میری شب تار کا چراغ میری زندگی کی امید، میرے وجود کی کائنات، میری آرزو کی انتہا تھا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے آگ کے بھنور میں پڑا ہوا ہے اور میں حرکت نہیں کر سکتا اس قاتل زنجیر کو کیونکر توڑ دوں؟ اس دل سرکش کو کیونکر سمجھاؤں مجھے رو سیاہ بننا منظور ہے مجھے دوزخ کی صعوبتیں آہی منظور ہیں میں ساری دنیا کے گناہوں کا بار سر پر لینے کو تیار ہوں صرف اس وقت مجھے گناہ کرنے کے پیان وفا توڑنے کی نمک حرام بننے کی توفیق عطا کر ایک لمحہ کے لیے مجھے شیطان کے حوالے کر دے میں نمک حرام بنوں گا۔ دغاباز بنوں گا پر قوم فروش نہیں بن سکتا۔"

آہ! ظالم سرنگیں اڑانے کی تیاری کر رہے ہیں سپہ سالار نے حکم دے دیا وہ تین آدمی تہہ خانے کی طرف چلے جگر کانپ رہا ہے جسم میں رعشہ آ رہا ہے یہ آخری موقع ہے ایک لمحہ اور بس! پھر تاریکی ہے اور تباہی ہائے! ان منحرف اعضا میں اب بھی حرکت نہیں ہوتی یہ خون اب بھی گرم نہیں ہوتا آہ! وہ دھماکے کی آواز آئی اللہ کی پناہ زمین میں لرزہ آ گیا ہائے عسکری عسکری! رخصت میرے پیارے بیٹے رخصت! اس ظالم بے رحم باپ نے تجھے اپنی وفا پر قربان کر دیا میں تیرا باپ نہ تھا تیرا دشمن تھا میں نے تیرے گلے پر چھری چلائی اب دھواں صاف ہو گیا آہ! وہ فوج کہاں ہے جو سیلاب کی طرح بڑھتی آئی تھی اور ان دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ خندقیں لاشوں سے بھری ہوئی ہیں اور وہ جس کا میں دشمن تھا، جس کا قاتل، وہ بیٹا، وہ میرا دلارا عسکری کہاں ہے؟ کہیں نظر نہیں آتا۔۔۔آہ آہ!

☆☆☆☆☆☆

عبرت

پہلی بار: ہندی میں ’’بودھ‘‘ کے عنوان سے ’’پریم پورنما‘‘ میں 1920ء سے قبل شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں 1928ء (خواب وخیال)

پنڈت چندر دھر نے ایک اپر پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی، مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے نیند بسر ہوتی، یہاں تو مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ بھی ادھر آئے ادھر غائب، نہ کھانے کا سکھ، نہ پہننے کا آرام، ان کے پڑوس میں دو آدمی اور رہتے تھے ایک ٹھاکراتی بل سنگھ ہیڈ کانسٹیبل دوسرے منشی بیج ناتھ سیاہ نویس ان دونوں آدمیوں کی تنخواہ منشی جی سے زیادہ نہ تھی تب بھی ان کی آرام سے کٹتی تھی شام کو کچہری سے آتے، اپنے بچوں کے لیے مٹھائیاں لاتے۔ دونوں صاحبوں کے پاس خدمت گار تھے۔ گھر میں کرسیاں، میز، فرش سب ہی سامان موجود تھا۔ ٹھاکر صاحب شام کو آرام سے کرسی پر لیٹ کر خوشبودار تمباکو پیتے منشی جی اپنے کمرہ میں بیٹھ کر شیشہ و ساغر سے شوق کرتے جب کچھ سرور آتا تو ہارمونیم بجاتے سارے محلّہ میں ان کا رعب غالب تھا انہیں آتے جاتے دیکھ کر بنیے اٹھ کر سلام کرتے۔ ان کے لیے بازار میں خاص نرخ تھے آنے سیر کی چیز ٹکے سیر میں لاتے لکڑی ایندھن مفت

شام سویرے ان کے یہاں آدمیوں کا مجمع رہتا۔ پنڈت جی ان کے یہ ٹھاٹھ دیکھ کر کڑھتے، اور اپنی تقدیر کو کوستے۔ علم ولیاقت میں وہ لوگ ان کے پاسنگ بھی نہیں تھے انہیں اتنا علم بھی نہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا آفتاب زمین کے گرد تاہم وہ چین کرتے تھے وہ لوگ کبھی کبھی ازراہ ترحم پنڈت جی کے ساتھ ہمسائیگی کے حق ادا کیا کرتے۔ کبھی سیر آدھ سیر دودھ بھجوادیتے کبھی ترکاریاں۔ مگر اس کے عوض پنڈت جی ٹھاکر صاحب کے دو اور منشی جی کے تین لڑکیوں کی نگرانی کرنی پڑتی۔ ٹھاکر صاحب فرماتے ''پنڈت جی یہ لڑکے ہر دم کھیلا کرتے ہیں۔ ذرا ان کی نگرانی کیا کیجئے منشی جی کہتے یہ لونڈے آوارہ ہوئے جاتے تھے۔ ذرا ان کی نگرانی کیجئے یہ فرمائشیں ایسے مربیانہ لہجہ میں کی جاتی تھیں گویا پنڈت جی ان کے زرخرید غلام ہیں پنڈت جی دل کو مسوس کر رہ جاتے مگر انہیں ناراض نہ کر سکتے تھے ان کی بدولت کبھی کبھی دودھ کے درشن تو ہو جاتے تھے محض اتنا ہی نہیں ان کی بدولت وہ بازار سے خاص نرخ پر جنس لاتے۔ اس لیے بیچارے اس تحکم کو زہر کے گھونٹ کی طرح پیتے تھے انہوں نے اس صیغہ سے نکلنے کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھی تھی۔ درخواستیں دیں افسروں کی خوشامدیں کیں مگر مراد پوری نہ ہوئی ہاں اتنا تھا کہ اس بددلی کا اثر اپنے منصبی کاموں پر نہ ہونے دیتے۔ تعلیم میں غفلت نہ کرتے۔ دل لگا کر پڑھاتے اس سے ان کے افسر خوش ہوتے۔ سال میں کچھ انعام دیتے تھے اور ترقی کا جب کبھی موقع ملتا ان کا خاص خیال رکھتے۔ لیکن اس صیغہ کی ترقی اوسر کی کھیتی ہے۔ بڑے بھاگ سے ہاتھ لگتی ہے وہاں قصبہ کے لوگ ان سے خوش تھے اور مدرسہ کے لڑکے تو ان پر جان دیتے تھے کوئی ان کے آکر پانی بھر دیتا کوئی ان

کی بکری کے لئے پتیاں توڑلاتا۔ پنڈت جی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔''

(2)

ایک بار ساون کے مہینہ میں منشی جی اور ٹھاکر صاحب نے اوجودھیا کے جاترا کی صلاح کی دور کا سفر تھا مع عیال کے جانا چاہتے تھے دونوں اصحاب نے ایک ایک ہفتہ کی رخصت لی اور پنڈت جی کو ساتھ لے کر چلنے پر مجبور کیا یہ پکھ دبدھے میں تھے لیکن جب ان لوگوں نے سفرخرچ کا ذمہ لیا، تب انکار کی گنجائش نہ رہی اجودھیا کی جاترا کا ایسا اچھا موقع پا کر کیوں کرر کتے۔ بلھور سے ایک بجے رات کو گاڑھی چھوٹتی تھی آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی، اسی لیے سرِشام ہی سے اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں آج میلہ کے سبب سے بڑی بھیڑتھی۔ جب گاڑی آئی تو دھکم دھکا شروع ہوا، کوئی آگے گیا کوئی پیچھے پنڈت جی اور ٹھاکر صاحب آگے نکل گئے۔ منشی پیچھے رہ گئے۔ اس آفت میں کون کس کا راستہ دیکھتا ہے الگ الگ گاڑیوں میں جا بیٹھے۔

جس کمرہ میں ٹھاکر صاحب اور پنڈت جی گھسے اس میں صرف چار آدمی تھے، ان میں دو بیٹھے تھے، دو لیٹے ہوئے تھے، ٹھاکر صاحب نے ایک آدمی سے کرخت لہجہ میں کہا ''اٹھ بیٹھو جی! دیکھتے نہیں ہو ہم لوگ کھڑے ہیں۔''

مسافر لیٹے لیٹے بولا ''کیوں اٹھ بیٹھیں جی، کچھ تمہارے بیٹھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔''

ٹھاکر صاحب: ''کیا ہم نے کرایہ نہیں دیا۔''

مسافر: ''جسے کرایہ دیا ہو اس سے جاؤ جگہ مانگو۔''

ٹھاکر: ''ذرا ہوش سے باتیں کرو۔ اس ڈبے میں دس آدمیوں کا بیٹھنے کا حکم ہے۔''

مسافر: ''ہم وہی ہیں جس پر آپ نے خفیہ فروشی کا الزام لگایا تھا اور جس کے دروازے سے آپ پچیس روپے لے کر ٹلے تھے۔''

دوسرا لیٹا ہوا مسافر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ ''کیوں جناب داروغہ جی؟ مجھے کیوں نہیں اٹھاتے۔''

ٹھاکر صاحب غصہ سے لال ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت برے پھنسے تھے حالانکہ وہ مضبوط آدمی تھے لیکن وہ دونوں بھی قوی ہیکل تھے۔ سختی سے کام نہ نکلتے دیکھ کر ملائمیت سے بولے ''تم ہی اٹھ جاؤ۔ صندوق بنچ پر رکھا ہے اسے نیچے رکھ دو۔ بس جگہ ہو جائے۔''

مسافر ''اور آپ ہی کیوں نہ نیچے بیٹھ جائیں اس میں کون سی شخصیت ماری جاتی ہے۔ یہ تھانہ تھوڑا ہے کہ رعب میں فرق آ جائے گا۔''

ٹھاکر ''کیا تمہیں بھی مجھ سے کوئی عداوت ہے۔ میں نے تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی۔''

مسافر ''آپ نے میری صورت نہ دیکھی ہو گی۔ لیکن آپ کے ڈنڈے نے دیکھی ہے۔ اسی میلے میں آپ نے مجھے کئی ڈنڈے رسید کیے۔ اس وقت آپ کے ساتھ کانسٹیبلوں کی ایک فوج تھی۔ میں مار کھا کر ضبط کر گیا۔ لیکن زخم ابھی دل پر تازہ ہے، اس کی دوا کی تلاش اسی دن سے کر رہا ہوں۔ بارے آج موقع ملا ہے میں بھی ٹھاکر ہوں۔ آپ سے عزت میں حیثیت میں، خاندان میں ہیٹا نہیں۔

خاموش بیٹھا جایے ورنہ شاید میرے سر پر شیطان سوار ہو جائے۔‘‘

پنڈت جی اب تک خاموش تھے۔ دل میں کانپ رہے تھے کہ کہیں مار پیٹ نہ ہو جائے تو گیہوں کے ساتھ گن بھی پس جائے۔ موقع پا کر ٹھا کر صاحب کو سمجھایا۔ ٹھاکر نے طرح دینے ہی میں خیریت سمجھی جونہی تیسرا اسٹیشن آیا انہوں نے اس کمرہ سے بیوی بچوں کو نکالا۔ ان دونوں شیطانوں نے ان کے اسباب اٹھا اٹھا کر پھینک دیے۔ جب ٹھا کر صاحب گاڑی سے اترنے لگے تو ایک نے انہیں ایسا دھکہ دیا کہ بچارے اوندھے منہ پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ گارڈ سے فریاد کرنے دوڑے تھے کہ اتنے میں انجن نے سیٹی بجا دی جا کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

(۳)

ادھر منشی بیج جی ناتھ کی اس سے بھی بری حالت تھی۔ ساری رات جاگتے گزر گی۔ ذرا پیر پھیلانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ جب میں شراب کی بوتل رکھ لی تھی۔ ہر اسٹیشن پر اسٹیم تیز کر لیتے تھے۔ معمول سے زیادہ پی گئے۔ ایک تو شراب کا نشہ، اس پر جگہ کی تنگی۔ ہاضمہ میں فتور پڑ گیا۔ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ بچارے بڑی مشکل میں پھنسے۔ کہیں ملنے کی جگہ نہ تھی۔ اسہال کے آثار نظر آنے لگے۔ لکھنؤ تک انہوں نے کسی طرح ضبط کیا، مگر اور آگے چل کر یارائے ضبط نہ رہا۔ ایک اسٹیشن پر اتر پڑے۔ کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ پلیٹ فارم پر لیٹ گئے۔ بیوی بھی گھبرا کر اتر پڑی۔ کھینچ کھانچ کر اسباب اتارا۔ جلدی میں ٹرنک اتارنا بھی بھول گئی۔ دراونہ

جی نے زمین پر لیٹے دیکھا تو سمجھ گئے۔ حضرت زیادتی کر گئے۔ مروت نے اترنے پر مجبور کیا۔ سب سے یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ دیکھا تو منشی جی حالت ابتر تھی۔ بخار، تشنج، پیٹ میں مروڑ، قے اور دست۔ بڑی تشویش ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے سمجھا ہیضہ ہو گیا ہے۔ حکم دیا مریض کو ابھی باہر لے جاؤ داروغہ جی نے ہر چند منت سماجت کی۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ مجبوراً لوگ منشی جی کو اسٹیشن کے احاطہ سے باہر ایک درخت کے نیچے لائے۔ منشیائن رونے لگیں۔ اب حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش ہوئی۔ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک شفا خانہ تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کام کمپونڈر سے لیا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بھی بلہور ہی کے رہنے والے ہیں۔ لوگوں کو تسکین ہوئی۔ داروغہ جی شفا خانے کی طرف دوڑے۔ کمپونڈر سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا کہ آپ ذرا چل کر انہیں دیکھ لیجیے۔ ان کا نام تھا چوکھے لال۔ رکھائی سے بولے۔ ’’صبح کے وقت باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔‘‘

داروغہ جی ’’تو کیا منشی کو یہاں لائیں۔‘‘

چوکھے لال ’’آپ کا جی چاہے لایئے۔‘‘

ٹھاکر صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے ایک ڈولی کا بندوبست کیا۔ منشی جی کو لاد کر شفا خانہ لائے۔ جوں ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ چوکھے لال نے ڈانٹ کر کہا۔ ڈولی نیچے رکھو۔ ہیضے کے مریض کو اوپر لانے کا حکم نہیں ہے۔ بیج ناتھ بے ہوش تو تھے نہیں۔ آواز سنی ’’پہچانا، ارے یہ تو چوکھے لال ہیں۔ کیوں بھئی مجھے پہچانتے ہو۔‘‘

چوکھے لال: ''جی ہاں۔ خوب پہچانتا ہوں۔''

بیج ناتھ: ''پہچان کراتی بے مروتی۔ میری جان نکل رہی ہے۔ دیکھیے تو مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

چوکھے لال: دیکھ لوں گا۔ میرا کام ہی کیا ہے۔ فیس نکالیے۔

دراوغہ جی غصہ سے بولے ''شفاخانہ میں کیسی فیس جناب من؟''

چوکھے لال: ''ویسی ہی جیسی ان منشی صاحب نے مجھ سے وصول کی تھی جناب من۔''

داروغہ: ''آپ کیا فرماتے ہیں؟ یہ غریب یہاں کیا کرنے آئے؟''

چوکھے لال: ''جی آپ نہیں سمجھے۔ میرا وطن بلہور ہے۔ وہاں میری تھوڑی سی زمین ہے۔ اس کا لگان داخل کرنے جب تحصیل میں جاتا ہوں تو منشی جی ڈانٹ کر اپنا حق وصول کر لیتے ہیں تو جناب کبھی ناؤ گاڑی پر کبھی گاڑی ناؤ پر۔ اس وقت میری باری ہے۔ میری فیس کے دس روپے نکالیے ورنہ اپنی راہ لیجیے۔''

داروغہ جی نے منشائن سے روپے مانگے، تب اسے اپنے بکس کی یاد آئی۔ چھاتی پیٹ لی۔ روپے اسی میں رکھے تھے۔ داروغہ جی بھی واجبی خرچ لے کر چلے تھے۔ کسی طرح دس روپے نکال چوکھے لال کی نذر کیے۔ انہوں نے دوا دی۔ دن بھر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مگر رات کو کچھ طبیعت سنبھلی۔ دوسرے دن پھر دوا کی ضرورت ہوئی۔ داروغہ نے بہت منت کی۔ لیکن چوکھے لال نے ایک نہ سنی۔ آخر منشائن کا ایک زیور جو چوبیس روپے سے کم نہ تھا، بازار میں بیچا گیا تب چوکھے لال نے دوا دی۔ شام تک منشی جی چنگے ہو گئے۔

(۴)

اجودھیا میں پہنچ کر لوگ قیام گاہ کی تلاش کرنے لگے۔ پنڈوں کے یہاں مطلق جگہ نہ تھی۔ ساری بستی میں گھومے، مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ کسی درخت کے نیچے ڈیرہ جمانا چاہیے۔ لیکن درختوں کے نیچے بھی جہاں جاتے تھے جاتری لوگ پڑے ملتے تھے۔ مجبور ہو کر کھلے میدان میں ریت پر بستر وغیرہ لگائے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن لیٹنے بھی نہ پائے تھے کہ بادل گھر آئے۔ موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ بجلی کوندنے لگی۔ گرج سن کر لڑکے چیخنے لگے۔ عورتوں کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کسی جائے پناہ کی تلاش ہوئی۔ تینوں آدمی ادھر ادھر مجبور نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ تاریکی میں کچھ نہ سوجھتا تھا پچھتا رہے تھے کہ ناحق آئے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

دفعتاً ایک آدمی لالٹین لیے ندی کی طرف سے آتا نظر آیا۔ وہ قریب پہنچا تو پنڈت جی اس کے پاس جا کر بولے، کیوں بھائی صاحب، یہاں کہیں مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے گی؟

وہ آدمی رک گیا۔ غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ پنڈت چندر دھر تو نہیں؟''

پنڈت جی خوش ہو کر بولے ''جی ہاں! مگر آپ مجھے کیونکر جانتے ہیں؟''

اس آدمی نے ادب سے پنڈت جی کے پیروں پر سر جھکایا۔ اور بولا ''میں آپ کا پرانا شاگرد ہوں۔ میرا نام کرپا شنکر ہے۔ میرے والد کچھ دنوں بلہور میں

ڈاک منشی رہے تھے۔ انہیں دنوں میں آپ کی خدمت میں تھا۔"

پنڈت جی کو بھی فوراً یاد آ گئی بولے "اوہو! تم کرپا شنکر۔ اس وقت تو تم دبلے پتلے لڑکے تھے۔ کوئی آٹھ نو سال کے ہو نگے؟"

کرپا سنکر "جی ہاں! نواں سال ہے۔ میں نے وہاں سے آ کر انگریزی پڑھی۔ اس وقت یہاں میونسپلٹی میں نوکر ہوں کہیے۔ آپ تو اچھی طرح رہے۔ بڑی خوش نصیبی ہے آپ کے درشن ہو گئے۔ کیا آپ کے بال بچے ساتھ ہیں؟"

پنڈت جی "نہیں میں تو اکیلا ہی ہوں۔ لیکن میرے ساتھ داروغہ جی اور سیاہ نویس صاحب بال بچوں سمیت ہیں۔"

کرپا شنکر "کل کتنے آدمی ہوں گے؟"

پنڈت جی "دس آدمی ہیں۔ اگر تھوڑی سی جگہ مل جائے تو گزر کر لیں گے۔"

کرپا شنکر "نہیں۔ جناب بہت سی جگہ لیجیے۔ میرا بڑا سا مکان خالی پڑا ہے۔ چلیے آرام سے رہیے۔ یہ تو میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ چھتریاں تو کافی ہیں نا؟ چلیے میرے ساتھ۔"

لوگ پانی میں لت پت چھتریاں لگائے، بستر سروں سر اٹھائے چلیے۔ کرپا شنکر کا مکان قریب تھا۔ وسیع، صاف ستھرا۔ اس نے جاتے ہی آگ جلوا دی۔ پلنگ بچھوا دیے۔ لوگ آرام سے بیٹھے۔ گھر میں پوریاں پکنے لگیں۔ کرپا شنکر ہاتھ باندھے ہوئے چاکروں کی طرح پنڈت جی کے ذرا سے اشارے پر دوڑتا تھا ایک گھنٹہ میں کھانا تیار ہو گیا۔ کھا پی کر لوگ لیٹے۔ اللہ کا شکر کر رہے تھے کہ کرپا شنکر مل گیا ورنہ آج جان بچنی مشکل تھی۔

(۵)

اور سب لوگ تو نیند میں غافل ہو گئے۔ مگر پنڈت چندر دھر کو نیند نہ آئی اس سفر کے واقعات کا ایک نقشہ ان کے سامنے کھینچا ہوا تھا۔ اور قوت امتیاز ان کا موازنہ کر رہی تھی۔ گاری کی رگڑ جھگڑا اور شفا خانہ کی نوچ کھسوٹ کے مقابلہ میں کرپا شنکر کی شرافت اور مہمان نوازی کا دل پر خاص اثر ہو رہا تھا۔ وہ آج اپنے پیشے کی عظمت کو سمجھے۔ آج اس کی اہمیت کے قائل ہوئے۔

یہ لوگ تین دن اجودھیا میں رہے۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوئی۔ کرپا شنکر نے خاطر مدارات میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ تیسرے دن یہ لوگ چلنے لگے تو وہ اسٹیشن تک پہنچانے آیا۔ جب گاڑی نے سیٹی دی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوئے اور کہا۔ ''کبھی کبھی مجھے یاد کیجیے گا۔''

پنڈت جی گھر پہنچے تو ان کے مزاج میں تغیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے پھر کسی دوسرے صیغے میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ پھر اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔

آتمارام

پہلی بار: ماہنامہ ’’زمانہ‘‘ جنوری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں ۱۹۲۰ء (پریم بتیسی، دوم)

موضع بیندو میں مہادیو سنا ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کھپریل کے بوسیدہ سائبان میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا صبح سے پہر رات ہتھوڑا لئے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اس صدائے پیہم کے لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہو جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی چیز غائب ہو گئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے طوطے کا پنجرہ لیے کوئی بھجن گاتا ہوا تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں اس کی جھکی ہوئی کمر اور اس کا جسم نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہو سکتا تھا اس کے یہ بھجن تعین وقت کے اعتبار سے صدائے مرغ کا کام دیتے تھے۔ جوں ہی کانوں میں آواز آئی۔ ست گردت شیودت داتا۔ لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہو گیا۔ اس کی یہی حرکت اس کے تکمیل اعضاء کا ثبوت تھی۔ ورنہ طلوع سحر کے بعد پھر اسے ایک متحرک بت خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا، تو یہ وہی ست گردت کا کلمہ وحدت تھا جس سے وہ اپنے طوطے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع مہادیو بے کار ہستی کا ایک نادر مجسمہ تھا۔ جو شکستوں اور ناکامیوں سے بے خبر، زخموں اور چرکوں سے بے پروا، ابھی تک شمشیر بکف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا۔ جو اس کا میسرہ منتشرہ دانتوں کا دستہ

پامال کمر کا میمنہ متزلزل، خون قلب پریشان ہو چکا تھا۔ مگر ہمت وہی تھی۔ استقلال وہی، استحکام وہی جس شباب کو رشک ہو سکتا تھا۔

مہادیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں اور بہوؤں کے لڑکے کہتے اجی جب تک دادا جیتے ہیں، تب تک تو زندگی کا لطف اٹھالیں۔ پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے گی ہی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ مہادیو اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا، اس لیے لڑکے اس کی ذمہ داریوں میں مخل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے۔ اور اس لازم وملزوم کی چکی میں پڑا ہوا وہ نیم جان، خستہ حال بڈھا بسا جاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ انقضاء عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی۔ دائرہ کفالت روز بروز وسیع اور وسائل معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے تھے۔ پہلے کوزہ کا ذوق مہادیو کی ذات تک محدود تھا۔ پر اب سعادت مند بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے لگے تھے۔ مہادیو کی ساقی اور بسا اوقات ساقی کا ناکام کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت جذبات حریت اور مساوات کے ایسے پرشور مناظرے کرتے کہ کبھی کبھی یہ جوش فرزندانہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا۔ اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا تھا، جب تک کہ ماکولات کی مساوی مقدار ان کی تسکین قلب کے لیے نہ پہنچ جاتی۔ بے چارہ مہادیو کبھی کبھی اس شور قیامت سے تنگ آ کر بھوکا اٹھ آتا۔ اور اپنے غمگسار حقے کا نغمۂ شیریں سنتا سو جاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اسے ان باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں یگانہ روزگار تھا۔ اس کی گھٹا اوروں سے کہیں زیادہ دیرا ثر

تھی۔اس کی صفائی کہیں زیادہ وقت طلب اور اس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ قوی التاثیر۔تاہم اسے بے صبر اور وہی اشخاص کی بدزبانیوں کا آئے دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر مہادیو عابدانہ توکل کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چاروں طرف کی بوچھاریں سہا کرتا۔اس کے کان روزانہ نفریں اور وشنام طعن وتشنیع سے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اسے اب ان کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔جوں ہی یہ طوفان فرد ہوتا،وہ اپنے طوطے کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتا ''ست گردت شیودت داتا''۔اس اسم اعظم کا ورداس کی تشفی کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔یہ جھونکے اس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ان سے اس کے سکون میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔طوطا اڑ گیا۔ مہادیو نے سر اٹھا کر پنجرے کی طرف دیکھا،اور اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ایں! طوطا کہاں گیا؟ اس نے پھر پنجرے کی طرف دیکھا۔طوطا غائب تھا۔وہ گھبرا کر اٹھا۔اور ادھر ادھر کھپریلوں پر نظر دوڑانے لگا۔اسے دنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی، تو طوطا تھا۔لڑکے بالوں، ناتی پوتوں سے اس کی طبیعت آسودہ ہو گئی تھی۔وہ کبھی کسی بچے کو گود میں نہ لیتا۔بچوں کی شرارت سے اس کا کام میں ہرج ہوتا تھا۔کوئی ہتھوڑا چھین لیتا تو کوئی سنسی اٹھا لیتا۔نہ اس لیے وہ اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا۔بیٹوں سے اسے مطلق انس نہ تھا۔نہ اس لیے کہ وہ کاہل وجود تھے بلکہ اس لیے

کہ وہ اس کے شریک کوزہ ہو جاتے تھے۔ محلّہ کے آدمیوں سے اسے چڑ تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کی بھٹی سے آگ نکال لے جاتے تھے۔ اس متام مجمع شر سے اس کے لیے کوئی پناہ تھی، تو وہ یہی طوطا تھا۔ جس کی ذات سے اسے کوئی تکلیف، کوئی الجھن، کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا، جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی گوشۂ امن کی وقعت دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

طوطا ایک کھپریل پر بیٹھا تھا۔ مہادیو نے پنجرا اتار لیا۔ اور اسے دکھا کر کہنے لگا۔ "آ۔ آ ست گردت، شیبودت داتا، آ، آ۔" لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہو کر چلانے اور تالیاں بجانے لگے۔ اوپر سے کووں نے کائیں کائیں شروع کی۔ طوطا، اڑا، اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ مہادیو بھی خالی پنجرا لیے اس کی طرف دوڑا۔ ہاں دوڑا! لوگ اس کی تیز گامی پر عش عش کرتے تھے۔ عوس کی اس سے بہتر، اس سے جامع اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصور کے خیال مین نہیں آ سکتی پشت دوتا اور سرعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے، اس کی تصدیق ہو گی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کسان پر چھوڑ چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ اس موقع تفریح کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے؟ مہادیو کی دل آزادی میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا۔ بالخصوص اس کی تگاپوئے پرخم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا۔ لوگوں نے کنکر پھینکے۔ تالیا بجائیں۔ طوطا پھر اڑا، اور اس درخت سے دو آم کے گھنے باغ میں ایک درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ مہادیو پھر خالی پنجرا لیے آ۔ آ کرتا طوطے کی کی

ٹکٹکی لگائے مینڈک کی طرح اچھلتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی ہو حق مچاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اس کی سرگرمی طلب ان کے شوق تفریح پر غالب آئی جب وہ اس گھنے باغ میں پہنچا تو اکیلا تھا۔ اس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔ پیر کے تلووں سے آگ نکل رہی تھی جب ہوش بجا ہوئے تو اس نے پھر پنجرا اٹھایا۔ اور پھر کہنے لگا۔

ست گرودت شیودت داتا۔ آ۔ آ!

طوطا پھنگی سے اتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔ مگر مہا دیو کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا۔ مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑ کر آپ ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ طوطے نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اترا اور آ کر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہا دیو کا کلیجہ اچھلنے لگا۔ ست گرو شیودت کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ طوطے کے قریب آیا اور تب ایک جست مار کر لپکا کہ طوطے کو پکڑ لے۔ مگر طوطا ہاتھ نہ آیا۔ پھر اڑ کر درخت پر جا بیٹھا۔

شام تک یہی کیفیت رہی۔ طوطا کبھی اس شاخ پر جاتا کبھی اس شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا۔ کبھی پنجرے کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا۔ مگر جونہی مہا دیو اس کی طرف آتا، وہ پھر اڑ جاتا۔ بڈھا اگر پیکرِ ہوس تھا تو طوطا دامِ آرزو۔ یہاں تک کہ شام سیاہ نے ہوش اور آرزو کی اس کش مکش پر پردہ ڈال دیا۔

(۳)

رات ہو گئی ۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ طوطا معلوم نہیں ۔ پتوں میں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ مہادیو خوب جانتا تھا کہ رات طوطا کہیں اڑ کر نہیں جا سکتا اور نہ پنجرے میں آ سکتا ہے۔تاہم وہ اس درخت کے نیچے سر جھکائے پنجرے کو پہلے میں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ایک بوند پانی بھی اس کے حلق میں نہیں گی ۔لیکن اسے نہ بھوک تھی نہ پیاس ۔طوطے کے بغیر اسے اپنی زندگی ویران۔ خشک دشوار معلوم ہوتی تھی ۔وہ شب و روز مشقت کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ اس کی تحریک طبعی تھی۔ زندگی کے اور سب کام اس لیے کرتا تھا، کہ اس کی عادت تھی۔ ان کاموں میں اسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔طوطا ہی ایک ایسی چیز تھا، جو اسے اس کی حیات کی یاد دلاتا تھا۔ عملاً وہ ایک مردہ جود تھا۔کوئی شوق نہیں،کوئی آرزو نہیں،کوئی فکر نہیں،کوئی ہوس نہیں ۔اس حیات مطلق میں یہی طائر خوش رنگ وخوش نوا اسے علائق زیست کی خبر دیتا تھا۔اس تاریکی میں یہی ایک روشنی تھی ۔اس سناٹے میں یہی ایک صدا۔اس کا ہاتھ سے جانا اپنے وجود سے بے خبر ہونا تھا۔

مہادیو دن بھر کا بھوکا پیاسا تھکا ماندہ رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا تھا۔مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر پھر آنکھیں کھول دیتا۔اور اس فضاء تاریک میں اس کی آواز سنائی دیتی ۔''ست گردت شیودت داتا۔''

آدھی رات گزر گئی تھی ۔ یک بارگی وہ کوئی آہٹ پا کر چونکا تو دیکھا کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔وہ سب شاید چلم پی رہے

تھے۔تمبا کو کی مہک نے مہادیو کو بے تاب کر دیا۔ بلند آواز سے بولا ''ست گرو دت شیو دت داتا'' اور ان آدمیوں کی طرف چلا۔ مگر جس طرح بندوق کی آواز سنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے سب اٹھ کر بھاگے۔ کوئی ادھر گیا، کوئی ادھر گیا، کوہی ادھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا، ٹھہرو! ٹھہرو۔ دفعتاً اسے خیال آ گیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلانے لگا ''چور چور! پکڑو!'' چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا۔ تو اسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ زنگ سے سیاہ وہ رہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اچھلنے لگا۔ اس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اس نے ایک اشرفی باہر نکالی اور چراغ کے اجالے میں غور سے دیکھا، ہاں اشرفی تھی۔ اس نے کلسا اٹھالیا۔ چراغ بجھا دیا۔ اور درخت کے نیچے جھک کر بیٹھا رہا۔ مال حرام نے شاہ سے چور بنا دیا۔

اسے پھر اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو چور واپس آ جائیں اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھین لیں۔ اس نے کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھیں۔ پھر ایک سوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹا کر کئی جگہ گڈھے بنائے اور انہیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا۔ اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد کلسے ہی میں تھی۔ اس کی کمر اور گڈھوں میں دو سو سے کم نہ تھیں۔

مہا دیو کی نظروں کے سامنے اب دوسری دنیا تھی، نامی روشن، ذی حیات، فکریں، تمنائیں اور ارادے اگے بڑھے اور لہرانے لگے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا ہٹتے ہی بزم انجم آراستہ نظر آئی۔ حالانکہ ابھی خزانے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پرنا میہ کو متراض گلچیں کی کیا پروا؟ ایک پختہ مکان بن گیا صرافہ کی ایک شان دار دکان کھل گئی۔ عزیز و بیگانہ گلو گیر ہو گئے۔ بادہ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہو گئے۔ پھر تیرتھ جاترا کو چلے۔ اور واپسی پر فیاضانہ دعوت عام ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک شوالہ اور پختہ کنواں تعمیر ہو گیا۔ اور وہ روز شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پران سننے لگا۔ سادھو سنتوں کی محفل سج گئی۔ دورہ زندگی کا نقشہ مکمل ہو گیا۔ آئندہ۔ کا ساز نغمہ ریز ہو گیا۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ کہیں چور نہ آ جائیں۔ تو میں کلسا لے کر بھاگوں گا کیونکر؟ اس نے امتحاناً کلسے کو بغل میں دبا لیا، اور ایک دو سو قدم تک بے تحاشا دوڑا ہوا چلا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے پیروں میں پر لگے ہیں۔ اطمینان ہو گیا۔

انہی منصوبوں میں رات ختم ہو گئی۔ سفیدہ صبح نمودار ہو گیا۔ ہوا جاگی۔ سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے۔ چڑیاں گانے لگیں۔ ناگاہ مہا دیو کے کانوں میں آواز آئی۔

''ست گر دت شیو دت داتا۔ رام کے چرن میں چت لاگا۔''

یہ بول ہمیشہ مہا دیو کے ورد زبان رہتا تھا۔ دن میں ہزاروں بار یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ پر ان کی باطنی کیفیت نے اس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا۔ جیسے کسی باجے سے آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح یہ پد اس کی زبان سے نکلتا تھا۔ بے معنی

اور بے اثر۔ اس کا دل بے برگ و بار اس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا۔ لیکن اب اس میں پتیاں اور کونپلیں نکل آئی تھیں۔ اس ہوا سے جھوم اٹھا۔ مخمور ترنم ہو گیا۔

ایک طرف طلوع سحر کی معرفت تنویر تھی۔ دوسری طرف دریا کا روحانی نغمہ اور سطح آب کا عارفانہ سکون۔ فضائے محیط ایک نورانی راگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت طوطا شاخ بلند سے پروں کو جوڑے ہوئے اترا۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور آ کر پنجرے میں بیٹھ گیا۔ مہادیو فرطِ مسرت سے دوڑا اور پنجرے کو اٹھا کر بولا۔ ''آؤ آتما رام! اب تمہیں زندگی کے پنجرے میں رکھوں گا اور سونے سے مڑ دونگا۔'' احسان اور تشکر سے اس کا سینہ لبریز ہو گیا۔ پرماتما کتنا دیا دان ہے۔ کتنا بے کس نواز۔ یہ اس کی عین رحمت ہے۔ ورنہ مجھ جیسا عاصی، سرتا پا گناہوں میں ڈوبا ہو، کب اس عطاء بے کراں کے قابل تھا؟ ہاں یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ ان خیالات سے اس کا دل امنڈ آیا۔ اس پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ ایک خود مستی کے عالم میں بول اٹھا۔

دست گرُدت شیودت داتا رام کے چرن میں چت لاگا

اس نے ایک ہاتھ میں پنجرہ لٹکایا۔ بغل میں کلسا دبایا گھر چلا۔

(۵)

مہادیو اپنے مکان پر پہنچا تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ خوب سحر کا لطف

اٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کتے کے اور کسی سے اس کی مڈھ بھیڑ نہ ہوئی۔ اور کتے کو اشرفیوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کلسے کو ایک مٹی کی ناند میں چھپا دیا۔ اور اسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اس کوٹھڑی میں رکھ دیا جس میں اس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے۔ جب ذرا دن نکل آیا تو وہ سیدھا پروہت جی کے مکان پر جا پہنچا۔ پروہت جی پوجا پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کل ہی مقدمہ کی پیشی ہے اور ابھی تک روپیہ کی کوئی سبیل نہ کر سکا۔ کیوں کر کام چلے گا۔ ججمانوں میں کوئی سانس ہی نہیں لیتا کہ اتنے میں مہادیو نے پہنچ کر پالاگن کیا۔ پروہت جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ اپنی منحوس صورت لے کر کہاں کیونکر آ کھڑا ہوا؟ معلوم نہیں آج دانہ بھی میسر ہوگا یا نہیں۔ کچھ ترش ہو کر پوچھا ''کیا ہے جی! کیا کہتے ہو۔ کیا جانتے نہیں کہ ہم اس بکھت پوجا پر رہتے ہیں؟'' مہادیو نے کہا ''مہاراج آج میرے یہاں ستیہ نارائن کی کتھا ہے۔''

پروہت جی متحیر ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مہادیو کے گھر کتھا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی۔ جتنی اپنے گھر سے کسی بھکاری کے لیے بھیک کا نکلنا۔ پوچھا ''آج کیا ہے؟''

مہادیو بولا۔ ''کچھ نہیں، ایسا ہی جی میں آیا کہ آج بھگوان کی کتھا سن لوں۔''

صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بیندو اور قرب و جوار کے دوسرے موضعوں پر نوید پھری۔ ہر کس و ناکس خاص و عام کی دعوت تھی۔ جو سنتا تھا، تعجب کرتا تھا۔ لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیانہ پر ہو رہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ

تھی۔ شام کو جب سب لوگ جمع ہو گئے اور پنڈت جی آ کر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے، تو مہادیو کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا۔ ''بھائیو! میری ساری عمر چھل کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دغا دی۔ کتنا کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ منہ کے کالک کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر کہتا ہوں کہ جس کا میرے جمے کچھ نکلتا ہو، جس کی جمع میں نے مار لی ہو۔ جس کے گہنے دبا لیے ہوں۔ جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ایمان دھرم سے آ کر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی چکا لے۔ اگر کوئی یہاں نہ آ سکا ہو۔ تو آپ لوگ اس سے کہہ دیجیے کہ وہ کل سے ایک مہینے تک جب جی چاہے آوے اور اپنا حساب چلتا کر لے۔ کوئی گواہی ساکھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ کہہ دیں گے وہ میں نکال کر دے دونگا۔''

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کر دی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی پر معنی انداز سے سر ہلا کر کہتا تھا، ہم کہتے نہ تھے؟ ''کوئی حاسدانہ انداز سے کہتا تھا'' کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا۔ کوئی بدگمانی سے کہتا تھا ''کیا کھا کے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہو جائے گا۔''

ایک زندہ دل ٹھاکر نے مسکرا کر مہادیو سے پوچھا؟ اور جو لوگ مر گئے؟

مہادیو نے جواب دیا۔ ''ان کے گھر والے تو ہوں گے۔ وہ آ کر ایمان دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں۔''

مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی۔ جتنی یہ جاننے کی اسے اتنے روپے

مل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم سکوت رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تاکتے تھے۔ ہر کسی کو مہادیو کے پاس آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے۔ جس نقصان کو ایک بار صبر کر چکے۔ اس کی یاد تازہ کرنا انکا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ ان کا کتنا نقصان ہوا۔ اور ایسے مقدس موقع پر غلط بیان کا خوف ان کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مہادیو کی علو ہمتی اور نیک نیتی نے انہیں مرغوب کرایا تھا۔ بحر سکوت میں ایک موج بھی نہ اٹھی۔ دفعتاً پروہت جی بولے "تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں ایک کنٹھا بنانے کے لیے سونا دیا تھا اور تم نے کئی ماشے تول میں اڑا دیے تھے۔ سونا بھی خراب کر دیا تھا۔"

مہادیو "ہاں یاد ہے۔ آپ کا کتنا نقصان ہوا ہوگا؟"

پروہت جی "پچاس روپیہ سے کم نہ ہوگا۔"

مہادیو نے کمر سے دو اشرفیاں نکالیں۔ اور جا کر پروہت جی کے سامنے رکھ دیں۔

پنڈت جی کو سخت گیری پر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ ظلم ہے، زیادتی ہے، زیادہ سے زیادہ چار روپیہ کا نقصان ہوگا۔ اس کے پچاس روپے اینٹھ لیے پچھنا رائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو پنڈت پر نیت ایسی خراب! رام! رام!!

ہر ایک دل میں مہادیو سے وہ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جو عقیدت سے مشابہ ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی خوش آئندہ آواز نے بعض کمزور دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہمدردی اور خوف پشیمانی نے اس گدا گدی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی نہ کھڑا ہوا۔ تب مہادیو نے پھر کھڑے ہو کر کہا ''معلوم ہوتا ہے آپ لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لیے آج کتھا ہونے دیجیے میں ایک مہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ کرنے چلا جاؤنگا۔ آپ سب بھائیوں سے بنتی ہے کہ میرا اودھار کریں۔''

مہادیو کے چہرے پر ایک غیر معمولی جلال تھا اور انداز گفتگو میں ایک شان توقیر۔ کتھا شروع ہوئی اور ختم ہوئی۔ مہادیو کی دادو دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام کی حد تک پہنچا دیا۔

مہادیو صبح سے شام تک اہل تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کوئی کام نہ کرتا۔ شراب کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہاں سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے ان کی خاطر خواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اس کے بذل و ایثار کا شہرہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ اور ایک داد خواہ بھی نظر نہ آیا۔ اب مہادیو کو اندازہ ہو گیا کہ دنیا میں کتنا تحمل، کتنی پاک ہمتی ہے، اب اسے معلوم ہوا کہ دنیا بڑوں کے لیے بری ہے پر اچھوں کے لیے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو گئے۔ بیندو میں آپ جائیے تو

دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاکر دوارہ کا کلس ہے۔ اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے۔ جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں اس کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالی شان مقبرہ ہے۔ یہی آتمارام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے نقرئی پنجرے میں بیٹھے ہوئے محوِ خواب ہیں۔ ان کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے غائب ہو گئے۔ پر حقیقت یہ ہے کہ مہادیو تیرتھ سے واپس آیا تو ایک دن کسی گربۂ مسکین نے آتمارام کو لقمۂ دہن بنالیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے۔

ست گُردت شیودت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

مہادیو کی نسبت بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔ جن میں سب سے قرین قیاس یہ ہے کہ ہو آتمارام کے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیاسیوں کے ساتھ ہمالیہ کی طرف چلے گئے اور وہاں سے واپس نہ آئے ان کا نام آتمارام مشہور ہو گیا۔

ابھی گاؤں میں وہ بڈھے موجود ہیں جنھوں نے مہادیو کو آخری ایام میں دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا چہرہ پر جلال تھا اور ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا، وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کی صدہا داستانیں زبان زد خاص عام ہیں۔

اللہ کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صداء غیب کی بدولت محض ایک اتفاقی وجد کے اثر سے محض ایک الہامی تحریم سے درجہ کمال کو پہنچ گئے ہیں۔

بوڑھی کاکی

پہلی بار: ''کہکشاں'' جولائی: ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: دسمبر ۱۹۲۰ء (پریم بتیسی، دوم)

بڑھاپا اکثر بچپن کا دورِ ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا کوئی حس باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا، رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ آنکھیں ہاتھ، پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کی کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے۔ کھانے کا وقت ٹل جاتا یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انہیں نہ ملتی تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ بہ آواز بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے کو مرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے اور اب ایک بھتیجے کے سوا دنیا میں ان کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انہوں نے ساری جائیداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کیے لیکن وہ وعدے صرف قلبی ڈپو کے دلالوں کے سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائیداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ سو روپے سے کم نہ تھی لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے۔ لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے، روپا طبیعت کی تیز تھی لیکن ایشور سے ڈرتی تھی، اس لیے بوڑھی کاکی پر اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اس جائیداد کی

بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں اور اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہو سکتی تو انہیں مطلق دریغ نہ ہوتا لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنی نغمہ بے ہنگام شروع کر دیتیں تو وہ آگ ہو جاتے تھے اور گھر میں انہیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنہیں بڈھوں سے ایک بغض اللہ ہوتا ہے، والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دق کرتے۔ کوئی چٹکی لے کر بھاگتا۔ کوئی ان پر پانی کی کلی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ تو مشہور ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لیے روتی ہیں۔ اس لیے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصہ میں آ کر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقع واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبانی کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی یہی اس کا ملجا تھا اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی معاندانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی لیکن بھائیوں کے دست تطاول سے بدرجہا قابل ترجیح تھی اس مناسب اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا چارپائیوں پر مہمان لیٹے

ہوئے نائیوں سے نکیاں لگوا رہے تھے قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سنا رہا تھا اور بعض سخن فہم مہمان کی واہ واہ سے ایسا خوش ہوتا تھا گویا وہی اس داد کا مستحق ہے دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بیہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دہقانی مجلس میں بولنا یا شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں اور روپا مہمانوں کی دعوت کا سامان کرنے میں مصروف تھی بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں دوسرے میں سموسے اور پیڑا کین بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے مین مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھری میں خیال غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذت آمیز خوشبو انہیں بے تاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی۔ اتنی دیر ہوگئی کوہی کھانا لے کرنہیں آیا معلوم ہوتا ہے لوگ سب کھا گئے ہیں۔ میرے لیے کچھ نہ بچا یہ سوچ کر انہیں بے اختیار رونا آیا لیکن شگون کے خوف سے رو نہ سکیں۔ آہا۔ کیسی خوشبو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔ یہ سوچ کر انہیں پھر بے اختیار رونا آیا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی۔ لیکن روپا کے خوف سے انہوں نے پھر ضبط کیا۔

بوڑھی کاکی دیر تک انہی افسوس ناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوشبو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا

تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔ کسے پکاروں۔ آج لاڈلی بھی نہیں آئی دونوں لونڈے روز دق کیا کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا کہ کیا بن رہا ہے۔

بوڑھی کاکی کی چشم خیالی میں پوریوں کی تو یرنا چنے لگی۔ خوب لال لال پھولی پھولی نرم نرم ہوں گی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں۔

پوریاں چھن چھن کر کڑاہ میں تیرتی ہوں گی۔ کڑاہ سے گرما گرم نکل کر کٹھوتے میں رکھی جاتی ہوں۔ گی۔ پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن سیر باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے۔

اس طرح فیصلہ کر کے بوڑھی کاکی آکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑھاؤ کے پاس جا بیٹھی۔ روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت مین تھی اس کمرے میں جاتی کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کڑاہ کے پاس کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آ کر کہا ''مہراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں۔'' ٹھنڈائی دینے لگی۔

اتنے مین پھر کسی نے آ کر کہا۔ بھاٹ آیا ہے۔ اسے کچھ دے دو۔ بھاٹ کے لیے سدھا نکال رہی تھی کہ ایک تیسرے آدمی نے آ کر پوچھا کہ ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو۔ بچاری اکیلی عورت چاروں طرف دوڑتے دوڑتے حیران ہو رہی تھی۔ جھنجلاتی تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف رہتا تھا کہ کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے ہی ابل

پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا۔ گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی۔ لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ذرا پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ذرا نگاہ پلٹی اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کشمکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا یہ خیال نہ رہا کہ پڑوسنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ مردانے میں لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی اور انہیں دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ کر بولی۔ ’’ایسے پیٹ ہے کہ آگ کا کنڈ ہے۔ کوٹھری مین بیٹھے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ اگر چھاتی پر سوار ہو گئی۔ نوج ایسے جیبھ دن بھر کھاتی نہ رہتیں تو نہ جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب ہی تو اس طرح بوکھلائے پھرتی ہے۔ اس خیال سے اس کا غصہ اور پھر تیز ہو گیا۔ ڈائین مرنے نہ ماںجھا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوں کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ لے بھلا چاہتی ہو تو جا کر کوٹھری میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ لگیں گے تو تمہیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے لیکن پہلے تمہاری پوجا کر دے۔‘‘

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں نہ بولیں چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا کہ دل و دماغ کی ساری قوتیں سارے جذبات ساری حسیات اس طرف رجوع ہو گئی تھیں۔ جیسے ندی میں جب کراڑ کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر

اس خلا کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

کھانا تیار ہو گیا۔ آنگن میں پتّل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع کیا۔ مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اس جماعت کے ساتھ پر ذراہٹ کر کھانے بیٹھے ہوئے تھے لیکن آدام مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھانہ چکیں کوئی اٹھ نہ سکتا تھا۔ وہ ایک مہمان جو ذرا تعلیم یافتہ تھے خدمت گاروں کی پر خوری پر جھنجھلا رہے تھے۔ وہ اس قید کو بے معنی و مہمل سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھری میں جا کر پچھتا رہی تھی کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انہیں روپا پر غصہ نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ تو یہ ہے جب تک مہمان لوگ کھانہ چکیں گے گھر والے کیسے کھائیں گے مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا اب جب تک کہ کوئی نہ بلانے آئے گا نہ جاؤں گی۔

دل میں یہ فیصلہ کر کے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما ثابت ہو رہی تھی۔ انہیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا اب پتّل بجھ گئے ہوں گے۔ اب مہمان آ گئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے، نائی پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کھانے پر بیٹھ گئے ہیں۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر بہانے کے لیے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ مجھے گاتے بہت دیر ہو گئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہوں گے۔ کسی کی بول چال سنائی نہیں دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے کیا جانے کہ نہ بلائے۔ سوچتی ہو کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں کہ بلا کر لاؤں۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی اور ان کے حسن ذائقہ کو گدگدانے لگا۔ انہوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ ''پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزادار معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا میں تو مانگ مانگ کر کھاؤں گی۔ یہی نہ لوگ کہیں گے انہیں لحاظ نہیں ہے کیا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں۔ تو منہ جھوٹا کر کے تھوڑے ہی اٹھ آؤں گی۔''

وہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا اور کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ بھی کھا رہے یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا کہ پتل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انہیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کر زبان چٹخارتا تھا لیکن دوسرا اشکورا مانگتے ہوئے شرماتا تھا۔ کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں کئی آدمی چونکر اٹھ کھڑے ہوئے آوازیں آئیں۔ ''ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ دیکھ کسی کو چھومت لے۔''

پنڈت بدھ رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کے تھال لیے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر ٹپک دیا اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مغرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا دبا لیتا ہے اسی طرح لپک کر انہوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انہیں اس

اندھیری کوٹھری میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لو کے ایک جھونکے میں ویران ہو گیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھایا۔ باجے والے دھوبی چمار بھی کھا چکے لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھ رام اور روپا دونوں ہی انہیں ان کے بے حیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر، بے کسی پر، فتور عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لیے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت انس تھا۔ بے چاری بھولی، سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دنوں بار جب اس کی ماں اور باپ نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا تو لاڈلی کا کلیجہ بیٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائیں گے اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے ہی کھا لیا تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انہیں تشفی دینا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی جب اسے یقین ہو گیا کہ اماں

غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھی اور سوچنے لگی کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولھوں میں آگ چمک رہی تھی اور چولھوں کے پاس ایک کتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازہ والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دم ان کی گدل سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے میں کتا اٹھ بیٹھا لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی بہ نسبت ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لیے زیادہ تقویت کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی اور بوڑھی کاکی کی کوٹھری کی طرف چلی۔

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے پھر انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لئے جاتا ہے۔ ان کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے۔ تب کسی نے انہیں پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہوگئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں کہ سب لوگ کھا پی کر سو گئے۔ اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سوگئی۔ رات کیسے کٹے گی۔ رام کیا کھاؤں۔ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا۔ کسی نے میری سدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا بھی نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا دیاں کیوں دکھائیں۔ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سوجھے بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں پھر آنا، مجھے گھسیٹا پٹکا۔ انہی پوریوں کے لیے روپا نے

سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انہی پوریوں کے لئے اور اتنی درگت کر کے بھی ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دے گی۔ یہ سوچ کر مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقت سے گلا بھر بھر آتا تھا۔ لیکن مہمانوں کے سامنے لحاظ سے روتی نہ تھی۔

یکا یک ان کے کان میں آواز آئی۔ ''کاکی اٹھو پوریاں لائی ہوں۔'' کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا اور اسے گود میں بٹھالیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں۔ کاکی نے پوچھا۔

''کیا تمہاری اماں نے دی ہیں۔''

لاڈلی نے فخر سے کہا۔ ''نہیں یہ میرے حصے کی ہیں۔''

کاکی پوریاں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا کاکی پیٹ بھر گیا؟

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی حبس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں ''نہیں بیٹی جا کے اماں سے اور مانگ لاؤ۔''

لاڈلی۔ ''اماں سوتی ہیں جگاؤں گی تو اماں ماریں گی۔''

کاکی نے پٹاری کو پھو ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انہیں نکال کر کھا گئیں بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس ہو رہا تھا کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے مستوں کو سرور کی یاد دلانا انہیں دیوانہ بناتا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل

خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکا یک لاڈلی سے بولیں۔ ''میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔''

لاڈلی ان کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لا کر جھوٹے پتلن کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ماری فاتر العقل بڑھیا پتلن سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی۔ دہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزہ دار، کچوریاں کتنی سلونی، سموسے کتنے خستہ اور نرم؟

کاکی فتورِ عقل کے باوجود جانتی تھیں کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہیے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے۔ جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آ کر جمع ہو جاتے ہیں بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حس ذائقہ تھا۔

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے۔ چونکی چارپائی کے ادھر ادھر تاکنے لگی کہ لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اسے وہاں نہ پاکر وہ اٹھ بیٹھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی چھوٹے پتلن کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے۔ اور بوڑھی کاکی پتلن پر سے پوریاں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گائے کے گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل جو حالت ہوتی وہی اس وقت ہوئی۔ ایک برہمنی دوسروں کا جھوٹا پتل ٹٹولے اس سے عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لیے اس کی پچیری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے۔ یہ نظارہ تھا جس کے دیکھنے والوں کے

دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین رک گئی ہے۔ آسمان چکر کھا رہا ہے دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ روپا کو غصہ نہ آیا عبرت کے سامنے غصہ کا ذکر کیا؟ ڈر اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس دھرم اور پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدق دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پرماتما۔ میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔

روپا کو اپنی خودغرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائیداد سے مجھے دو سو روپے سال کی آمدنی ہو رہی ہے اس کی یہ درگت اور میرے کارن۔ اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لیے اپنی بڑائی کے لئے سیکڑوں روپے خرچ کر دیے۔ لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں دے سکی۔ محض اس لیے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے، بے زبان ہے۔

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھلا اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لیے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہو سکتی تھی جو بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔

"کاکی اٹھو کھانا کھالو۔ مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی۔ اس کا برا نہ ماننا پرماتما

سے دعا کرو کہ وہ میری خطا معاف کر دے۔"

بھولے بھالے بچے کی طرح جو مٹھائیاں پا کر مار اور جھڑکیاں سب بھول جاتا ہے۔ بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں انکے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

نوک جھونک

ذ پہلی بار: ''زمانہ'' دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: ۱۹۲۸ء (خواب وخیال)

بیوی

میں درحقیقت بدنصیب ہوں۔ ورنہ کیوں مجھے روز ایسے نفرت انگیز مناظر دیکھنے پڑتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ مجھے دیکھنے ہی نہیں پڑتے بلکہ بدنصیبی کو میری زندگی کا جزو خالص بنا دیا ہے۔ میں اس عالی ظرف برہمن کی لڑکی ہوں جس کا احترام بڑی بڑی ہندو مذہبی سوسائٹیوں میں کیا جاتا ہے۔ جو آج مذہب کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے گھر پر کبھی بغیر نہائے اور پوجا کیے منہ میں پانی کی ایک بوند تک بھی ڈالی ہو۔ مجھے ایک بار بخار کی حالت میں بغیر نہائے ہوئے مجبوراً دوا پینا پڑی تھی۔ اس کا مجھے مہینوں رنج رہا۔ ہمارے گھر میں دھوبی قدم نہیں رکھنے پاتا تھا۔ چماریاں تو دالان میں بھی نہ بیٹھ سکتی تھیں، اور جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتے ہوئے مجھے سخت نفرت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یہاں آ کر گویا میں ایک ظلمت کدہ میں پہنچ گئی۔ میرے شوہر بڑے رحیم، خوش اخلاق، قابل شخص ہیں، ان کے یہ اوصاف دیکھ کر میرے باپ ان پر محو وہ گئے۔ لیکن افسوس! وہ کیا جانتے تھے کہ یہ لوگ ایسے لامذہب ہیں۔ سندھیا اور عبادت تو درکنار، کوئی یہاں روزانہ نہاتا بھی نہیں۔ ہمیشہ کمرے میں مسلمان، عیسائی آیا

کرتے ہیں اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی، چائے، دودھ پی لیتے ہیں اور صرف اس قدر نہیں بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے مٹھائیاں بھی کھا لیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے انہیں لیمنڈ پیتے دیکھا تھا۔ سائیں جو چمار ہے بغیر روک ٹوک گھر میں آتا ہے اور بورے سے چنے نکال لے جاتا ہے۔ سنتی ہوں وہ اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے بھی جایا کرتے ہیں۔ یہ بے عنوانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔ میری طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آ جاتے ہیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اپنی اس ذلت پر اپنے نامعقول طرز زندگی پر میرے چشم دل سے لہو کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ آف! ہندو قوم! تو نے ہم عورتوں کو ایسا کمزور بنا دیا۔ کیا اپنے خاوند کی لونڈی بننا ہی ہماری زندگی کا فرض اولی ہے۔ کیا ہمارے خیال، ہمارے ارادے اور ہمارے فرائض کی کچھ قیمت نہیں ہے۔

اب مجھے صبر نہیں آتا۔ آج میں ان حالات کا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس بلا سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ شرمناک زندگی اب مجھ سے ایک ساعت بھی نہیں برداشت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے والدین کے دامن میں پناہ لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آج یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ میرے شوہر صرف اس میں شامل ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے خاص محرکوں میں ہیں۔ انہی کی کوشش اور ایماء سے اس نامہذبانہ بدعت کا ظہور رہوا ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں۔ سنتی ہوں مسلمان بھی اس قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آسمان کیوں نہیں

گر پڑتا۔ کیا بھگوان مذہب کی حفاظت کے لیے اب اوتار نہ لیں گے۔ اسے بھی زیادہ کسی مذہبی کجروی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ برہمن ذات اپنے خاص بھائیوں کے علاوہ دوسرے برہمن تک کا چھوا ہوا کھانا گوارا نہیں کرتی۔ وہی ذی وقعت قوم آج اس پستی کو پہنچ گئی ہے کہ کائستوں، جینیوں، مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں دریغ نہیں کرتی۔ بلکہ اسے قومی عروج قومی اتحاد کا باعث سمجھتی ہے۔

شوہر

وہ کون سا مبارک وقت ہو گا جب کہ اس ملک کی عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں گی قومی شیرازہ بندی میں مردوں کا ساتھ دیں گی؟ یہ مذہبی جنگ خیالیاں کب مٹیں گی۔ ہم کب تک برہمن، غیر برہمن کی قید میں پھنسے رہیں گے۔ ہمارے شادی بیاہ کے طریقے کب تک خاندانی قید کی رسی سے بندھے رہیں گے۔ ہم کو کب معلوم ہو گا کہ عورت اور مرد کے خیالات کی موافقت نسبتی پابندیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برندا میری زوجہ نہ ہوتی اور نہ میں اس کا شوہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگر چہ وہ ظاہراً نہیں کہتی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے آزاد خیالات کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھونا نہیں چاہتی۔ یہ اس کا قصور نہیں، یہ ماں باپ کا قصور ہے جنہوں نے ہم دونوں پر ایسا ظلم کیا تاہم مجھے خوشی ہے کہ برندا اتنی خودار ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مشکلات میں بھی اپنے خیالات پر خواہ وہ

صحیح ہوں یا غیر صحیح نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔

کل برندا کھل پڑی۔ میرے کئی دوستوں نے عام دعوت کی تجویز کی تھی۔ میں نے بخوشی اس کی تائید کی تھی۔ کئی دن کی بحث وتکرار کے بعد آخر کل میرے گنے گنائے دوستوں نے دعوت کا سامان کر ہی ڈالا۔ ماسوا میرے صرف چار برہمن تھے باقی بقال کائستھ اور چند اور مذہب کے لوگ تھے۔ یہ آزادروی برندا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا تو وہ ایسی بے چین تھی گویا اس کے دل پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

''اب تو بہشت کا دروازہ ضرور کھل گیا ہوگا؟''

یہ ناملائم الفاظ میرے دل پر تیر کی طرح لگے۔ کرخت آواز سے بولا۔

''بہشت اور دوزخ کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں، مردہ ہیں۔ ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دار عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔''

برندا۔ آفرین ہے آپ کی ہمت اور مردانگی کو اب دنیا میں آرام وچین کا راج ہو جائے گا۔ دنیا کو آپ نے بچالیا۔ اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟

میں نے جھلا کر کہا ''جب ایشور نے تمہیں ان باتوں کے سمجھنے کی قوت ہی نہیں دی تو میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ اس باہمی تفریق اور تمیز سے ہمارے ملک میں جو نقصان پہنچ رہا ہے اسے موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس تفرقہ

کے مٹنے سے قوم کو جو نفع ہو گا وہ اظہر من الشمس ہے۔ البتہ جو لوگ جان کر بھی انجان نہیں، ان کی دوسری بات ہے۔''

برندا۔ ''کیا بغیر ایک ساتھ بیٹھ کر کھائے ہوئے آپس میں محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔ میں نے اس بحث میں پڑنا فضول تصور کر کے ایسے اصول کی آڑ لینا مناسب خیال کیا جس میں مباحثہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ برندا اپنی عقائد پر جان دیتی ہے۔ میں نے اسی منتر سے اسے تسخیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگ مذہبی عقائد کا بھی احترام نہیں کرتے۔'' بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ذرا غور تو کرو یہ کتنی بڑی نا انصافی ہے کہ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کی تخصیص کریں۔ یہ ساری دنیا اسی معبود کا حقیقی جلوہ ہے۔ ہر ایک ذی روح اسی نور حقیقی سے منور ہے۔ صرف اسی نفسانیت کے پردہ نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی خود پروری نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے۔ ورنہ دراصل ہم سب ایک ہیں۔ جس طرح سوج کی روشنی مختلف مکانوں میں جا کر اخلاقی صورت اختیار نہیں کرتی۔ اسی طرح پروردگار عالم کی روشنی میں بھی مختلف اجسام میں جاگزیں ہو کر علیحدہ نہیں ہو جاتی۔ کیا سورج کی روشنی جھونپڑیوں پر نہیں پڑتی۔ میں تو کہوں گا کہ جھونپڑیوں پر محلوں سے کہیں زیادہ پڑتی ہے۔ علیٰ ہذا میرے اس عارفانہ سیلاب نے برندا کے سوکھے ہوئے دل کو شاداب کر دیا۔ ہم تن گوش ہو کر میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہو گیا تو اس نے میری طرف ارادت مندانہ نگاہوں سے دیکھا اور رونے لگی۔''

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے، مگر اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ برندا کے دل سے خاندانی عظمت اور قومی غرور کے حروف مٹ گئے۔ ان کی جگہ عالم گیر روحانی ارتباط کے حروف منقوش ہو گئے۔

بیوی

سوامی جی کے گیان اپدیش نے مجھے بیدار کر دیا۔ اف! میں اندھے کنوئیں میں پڑی تھی۔ اس نے اٹھا کر مجھے ایک روشن قلعہ کوہ پر پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اعلیٰ خاندان کے غرور میں اپنی اونچی ذات کے ناجائز فخر میں کتنے ہی نفوس کی بے عزتی کی۔ اے پرماتما تو مجھے معاف کر، میں نااہل تھی، ناسمجھ تھی۔ مجھ غریب کی اس دعا کو قبول کر۔ اس خیال کے باعث میرے دل میں اپنے قابل احترام شوہر سے جو کدورت پیدا ہو گئی تھی اور جو محبت کی کمی میری طرف سے ظاہر ہوئی، اسے معاف کر۔

جب سے میں نے وہ نورانی الفاظ سنے ہیں۔ میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔ طرح طرح کے نیک ارادے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

کل دھوبن کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس کے سر میں بڑا درد تھا۔ کراہ رہی تھی۔ پہلے میں اس حالت میں دیکھ کر شاید زبانی ہمدردی کرتی یا مہری سے تھوڑا سا تیل لا دیتی۔ پر کل میرا دل بے چین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ میری بہن ہے۔

میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کامل ایک گھنٹہ تک اس کے سر پر تیل ملتی رہی۔ میں نہیں کر سکتی کہ اس وقت مجھے کتنا روحانی لطف آ رہا تھا۔ میرا دل خود بخود کسی زبردست کشش کے تابع ہو کر اس کی طرف کھینچا جاتا تھا۔ میری نند نے آ کر میرے اس فعل پر کسی قدر ناک بھوں چڑھائی۔ تیور بدلے مگر میں نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ آج علی الصبح سخت سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں گلے جاتے تھے۔ مہری کام کرنے اٹھی تو کھڑی کانپ رہی تھی۔ میں لحاف اوڑھے انگیٹھی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس پر بھی منہ کھولنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ مہری کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھے اپنی خود غرضی پر شرم آئی۔ میں نے خیال کیا جو یہ ہے وہی میں ہوں۔ اس کی روح میں بھی وہی روشنی ہے لیکن میں آرام سے آگ کے پاس بیٹھی ہوں اور یہ میری خدمت میں مصروف، یہ ناانصافی کیوں؟ کیا اس وجہ سے کہ خودی نے ہماری نگاہوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ مجھے کچھ سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فوراً اٹھی اور اپنا شال لا کر مہری کو اڑھا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا۔ اس نے متعجب ہو کر کہا ''بہوجی چھوڑیئے میں کام کروں۔ سرکار کو کچہری جانے میں دیر ہو جائے گی؟''

میں نے اپنا لحاف اتار دیا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر برتن دھونے لگی۔ غریب عورت مجھے بار بار ہٹانا چاہتی تھی۔ میری نند نے آ کر مجھے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس طرح منہ بنا کر چلی گئی گویا میں کوئی سوانگ بھر رہی ہوں۔ تمام گھر میں ہل چل مچ گئی۔ گویا کوئی تعجب خیز واقعہ ہو گیا۔ ہم کتنے خود پرست ہیں ہم پرماتما کی توہین کرتے ہیں۔ نفانیت کے دام میں پھنس کر اپنے ہی اوپر انواع و

اقسام کے ظلم کرتے ہیں۔افسوس!

شوہر

شاید میانہ روی عورت کی سرشت میں داخل نہیں۔وہ حدود پر رہ سکتی ہیں۔ برندا کہاں تو اپنی عالی نسبی پر جان دیتی تھی قومی وقار کا راگ الاپتی تھی۔کہاں اب مساوات اور ہمہ وقت کی مورت بنی بیٹھی ہے میری ذرا سی تعلیم کا یہ اثر ہے۔اب میں بھی اپنی قوت تالیف پر ناز کروں گا۔واقعی یہ جنس تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اس میں مجھے اعتراض نہیں ہے کہ وہ نیچی ذاتوں کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے، ہنسے بولے انہیں پڑھ کر کچھ سنائے۔لیکن ان کے پیچھے اپنے آپ کو بالکل کھو دینا میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

تین دن ہوئے میرے پاس ایک چمار اپنے زمیندار کے مظالم کا رونا رونے آیا۔ بے شک زمیندار نے اس ک ساتھ سختی برتی تھی لیکن وکیل مفت میں تو مقدمہ نہیں کیا کرتا اور پھر ایک چمار کے پیچھے ایک بڑے زمیندار سے دشمنی کروں۔ایسا کروں تو پھر وکالت کر چکا۔اس کی فریاد کی آواز برندا کے کان میں بھی پڑ گی۔وہ میرے درپے ہوئی کہ اس مقدمے کی پیروی کروں۔اور لگی بحث ومباحثہ کرنے۔ میں نے حیلہ وحوالہ کرکے اسے کسی طرح ٹالنا چاہا لیکن اس نے مجھ سے وکالت نامہ پر دستخط بنوا ہی لیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تین دنوں میں میرے پاس کئی مقدمے ایسے ہی مفت خوروں کے آئے اور مجھے کئی بار برندا کو سخت الفاظ میں

فہمائش کرنی پڑی۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے عورتوں کو مذہبی مسائل کی تلقین کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہر ایک اصول کی عملی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ اللہ عادل ہے پر اس کی عدالت کے پیچھے اپنے ماحول کو نہیں بھولتا۔ اگر وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر عمل کیا جائے تو تمام دنیا میں آج امن و عافیت کی دہائی پھر جائے۔ لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کا ایک اصول ہی رہے گا و ار انسانی اخوت ہمارے نظام معاشری کی ایک محال تمنا۔

ہم ان دنوں مسائل کی زبان سے تعریف کرتے ہیں، ان پر مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتے ہیں عوام کی نظروں میں وقار حاصل کرنے کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ برندا اتنی ذرا سی معمولی اور موٹی بات بھی نہیں سمجھتی۔

برندا کا انہماک روزانہ ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے۔ آج سب کے کھانے کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنا ہے۔ اب تک گھر کے خاص آدمیوں کے لیے باریک چاول پکتے تھے۔ ترکاریاں گھی میں بنائی جاتی تھیں۔ دودھ مکھن اور میوہ جات وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ نوکروں کے لیے موٹا چاول، تیل کی ترکاری مٹر کی دال رہتی تھی دودھ وغیرہ انہیں نہیں دیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں بھی یہی دستور زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے اور نہ نوکروں نے اس کے متعلق کبھی شکایت کی۔ لیکن آج دیکھتا ہوں تو برندا نے سب کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنوایا ہے۔ آج ملازموں نے بھی وہی کھانے کھائے ہیں، جو گھر کے لوگوں نے کھائے۔ میں کچھ بول نہ سکا۔ متحیر سا ہو گیا۔

برندا خیال کرتی ہے کہ کھانے میں فرق کرنا نوکروں پر ظلم ہے۔ کیسا بچوں کا سا خیال ہے! یہ اپنی مساوات کی دھن میں شریف رذیل چھوٹے بڑے کا فرق مٹانا چاہتی ہے۔ ارے بیوقوف! یہ تفریق ہمیشہ قائم رہی ہے اور رہے گی۔ میں بھی ملکی اتحاد کا حامی ہوں اور تمام تعلیم یافتہ ابنائے وطن اس اتحاد پر جان دیتے ہیں۔ لیکن کوئی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ ان مزدوروں خدمت گاروں کو برابری کا حق دیا جائے۔ ہم ان میں تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کو حالت افلاس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ ہوا تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ پر اس کی اصلیت کیا ہے یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ خواہ اس کا اظہار نہ کیا جائے اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ ملکی وقار قائم ہو۔ ہمارا دائرہ اثر وسیع ہو۔ ہم اپنے حقوق کے لیے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کر سکیں۔ ہمیں یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ ہماری آواز صرف تعلیم یافتوں کی آواز نہیں ہے بلکہ تمام قوم کی متحدہ آواز ہے۔ لیکن یہ برندا اتنا بھی نہیں سمجھتی۔

بیوی

کل میرے شوہر کا منشا ظاہر ہوا۔ اس وقت میری طبیعت سخت مغموم ہوئی۔ اے خدا دنیا میں اتنی نمائش ہے۔ لوگ اتنے خودغرض ہیں۔ اتنے ظالم ہیں مجھے کل یہ دردناک تجربہ ہوا۔ میں اس نصیحت کو سن کر اپنے شوہر کو دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا فخر تھا کہ ایسے نفس مطمئنہ کی خدمت گزاری کا موقع حاصل ہے۔ یہ

میرے مقدور کی خوبی ہے لیکن یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ جو لوگ ایک ساتھ دو ناؤں پر بیٹھنے کی مشتاق ہیں زیادہ تر وہی قومی خیر اندیش کہلاتے ہیں۔

کل میری نند کی رخصتی تھی۔ وہ سسرال جا رہی تھی۔ شہر کی بہتیری عورتیں آئی تھیں وہ سب عمدہ لباس اور مرصع زیورات سے آراستہ ہو کر قالینوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں انکی مہمان داری میں مصروف تھی کہ یکایک مجھے دروازے پر چند عورتیں اس جگہ زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں جہاں ان عورتوں کی سلیپریں اور جوتیاں رکھی تھیں۔ یہ بیچاریاں بھی رخصتی دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے ان کا وہاں بیٹھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لیے میں نے ان کو بھی لا کر قالین پر بٹھا دیا۔ اس پر ان خاتونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور تھوڑے عرصے میں سب کی سب کسی نہ کسی حیلہ سے ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ اتنے میں میرے شوہر تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ باہر سے نہایت مغلوب الغضب ہو کر آئے اور بھری سبھا میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

آج علی الصبح تو میں عجیب واقعہ دیکھا۔ شب میں مہانوں کی دعوت و مدارت کے بعد جوٹھے پتل، شکورے، دونے وغیرہ باہر میدان میں پھینک دیے گئے تھے۔ اس وقت پچاسیوں آدمی انہی پتلوں پر گرے ہوئے ان کو چاٹ رہے تھے۔ ہاں انسان تھے اور انسان وہی جن پر پرماتما کا جلوہ ہے۔ روشنی ہے۔ بہتیرے کتے بھی ان پتلوں پر جھپٹ رہے تھے پر یہ کنگلے کتوں کو بار کر ہٹا دیتے تھے۔ ان کی حالت کتوں سے بھی گئی گزری تھی یہ نظارہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ ایشور! یہ بھی ہمارے بھائی

بہن ہیں ۔ ہماری ہی روحیں ہیں ۔ان کی ایسی قابل رحم حالت! میں نے اسی وقت مہری کو بھیج کر ان آدمیوں کو بلایا اور میوے مٹھائیاں وغیرہ جو مہمانوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں سب کی سب پتلوں میں رکھ کر انہیں دے دیں۔مہری تھرانے لگی کہ مالک سنیں گے تو میرے سر کا ایک بال نہ چھوڑیں گے۔لیکن میں نے اسے ڈھارس دی تب اس کی جان میں جان آئی ۔

ابھی یہ بیچارے مٹھائیاں کھا ہی رہے تھے کہ میرے شوہر صاحب بھی غصہ میں بھرے ہوئے آئے اور نہایت سخت آواز میں بولے ''تمہاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گیا ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک آفت مچائے رہتی ہو۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔مٹھائیاں ڈومڑوں کے لیے نہیں بنوائی گئی تھیں۔مہمانوں کے لئے بنوائی گئی تھیں۔اب مہمانوں کو کیا دیا جائے گا۔کیا تم نے میری عزت کو خاک میں ملانے کا مصمم اراہ کرلیا ہے۔''

میں نے مستقل مزاجی سے کہا ''آپ فضول غصہ کرتے ہیں۔آپ کی جس قدر مٹھائیاں میں نے خرچ کی ہیں وہ سب منگا دوں گی۔یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی شخص تو مٹھائیاں کھائے اور کوئی پتل اور دونے چاٹے۔ڈومڑے بھی انسان ہیں ان کی بھی روح وہی ہے۔کیا یہ نا انصافی نہیں ہے؟''

شوہر صاحب بولے ''رہنے بھی دو، بے وقت شہنائی بجاتی ہو۔جب دیکھو وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ سب روحیں ایک سی ہیں ۔اگر ایک سی ہیں تو ایشور کو کس نے منع کر دیا تھا کہ سب کو ایک حالت میں نہ رکھے۔اس اعلی اورادنی کی تفریق اس نے کیوں کررکھی ہے۔بے سرپیر کی بحث کرتی ہو۔''

میں خاموش ہو گئی، بول نہ سکی۔ میرے دل سے شوہر کی عزت اور محبت اٹھنے لگی۔ افسوس، نفاست نے ہم کو کس قدر خود غرض بنا دیا ہے۔ ہم ایشور کا بھی سوانگ بھرتے ہیں۔ کتنی شرمناک ریا کاری ہے۔ ہم حقیقت کو ملکی مفاد اور ذاتی اغراض پر قربان کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کوشش بار آور نہیں ہوئی تو تعجب کیا ہے۔

عجیب ہولی

پہلی بار: ہندی میں ’’وچتر ہولی‘‘ کے عنوان سے ’’سرلیش‘‘ مارچ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں، ۱۹۲۸ء (خاک پروانہ)

ہولی کا دن تھا۔ مسٹر اے۔ بی کراس شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ سائیس، اردلی، مہتر، بہشتی، گوالا۔ دھوبی سب ہولی منا رہے تھے۔ سبھوں نے صاحب کے جاتے ہی خوب گہری بھنگ چڑھائی تھی۔ اور اس وقت باغیچہ میں بیٹھے ہوئے خوب پھاگ گا رہے تھے۔ لیکن رہ رہ کر بنگلہ کے پھاٹک کی طرف جھانک لیتے تھے کہ صاحب آتو نہیں رہے ہیں اتنے میں ’’شیخ نور علی آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔‘‘

سائیں نے پوچھا کہو خانساماں جی! صاحب کب آئیں گے۔

نورعلی بولا۔ ’’اس کا جب جی چاہے آئے۔ میر آج استعفا ہے اب اس کی نوکری نہ کروں گا۔‘‘

اردلی نے کہا۔ ’’ایسی نوکری نہ پاؤ گے پھر چار پیسے اوپر کی آمدنی ہے۔ ناحق چھوڑتے ہو۔‘‘

نورعلی ’’اجی لعنت بھیجو! اب مجھ سے غلامی نہ ہو گی۔ یہ ہمیں جوتوں سے ٹھکرائے اور ہم اس کی غلامی کریں۔ آج یہاں سے ڈیرا کوچ ہے۔ آؤ تم لوگوں کی دعوت کروں۔ چلو آؤ کمرے میں۔ آرام سے میز پر ڈٹ جاؤ۔ وہ وہ بوتلیں پلاؤں گا کلیجہ تر ہو جائے۔‘‘

سائیں: ''اور جو کہیں صاحب آ جائیں؟''

نورعلی ''وہ ابھی نہیں آئے گا۔ چلے آؤ۔''

صاحبوں کے ملازم عموماً شرابی ہوتے ہیں۔ جس روز سے صاحب کے یہاں غلامی کا پٹہ لکھا۔ اسی روز سے یہ بلا ان کے سر پڑ جاتی ہے۔ جب مالک خود بوتل کی بوتل انڈیل جاتا ہو، تو بھلا نوکر کیوں چوکنے لگے۔

یہ دعوت پا کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ بھنگ کا نشہ چڑھا ہی ہوا تھا۔ ڈھول مجیرے چھوڑ چھاڑ کر نور علی کے ساتھ چلے اور صاحب کے کمرے میں کرسیوں پر جا بیٹھے نور علی نے وسکی کی بوتل کھول کر گلاس بھرے اور چاروں نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ ٹھرا پینے والوں نے جب یہ مزیدار چیزیں پائیں تو گلاس پر گلاس چڑھانے لگے۔ خانساماں بھی حوصلہ افزائی کرتا جاتا تھا۔ ذرا دیر میں سبھوں کے سر پھر گئے۔ خوف جاتا رہا۔ ایک نے پھاگ چھیڑا اور دوسرے نے سر ہلایا اور گانے ہونے لگے۔ نور علی نے ڈھول مجیرا لا کر رکھ دیا۔ وہیں مجلس جم گئی۔ گاتے گاتے ایک اٹھ کر ناچنے لگا۔ دوسرا اٹھا حتی کہ سب کے سب کمرہ میں چوکڑیاں بھرنے لگے۔ ہو حق مچنے لگا۔ کبیر، پھاگ، چوتالا، گالی گلوچ مار پیٹ غرض باری باری سب کا نمبر آیا۔ سب نڈر ہو گئے تھے۔ گویا اپنے ہی مکان میں ہوں کرسیاں الٹ گئیں۔ دیواروں پر کئی تصویریں ٹوٹ گئیں۔ ایک نے میز الٹ دی۔ دوسرے نے کاپیوں کا گیند بنا کر اچھالنا شروع کیا۔

یہاں یہی ہنگامہ برپا تھا کہ شہر کے رئیس لالہ اجاگر مل تشریف لائے انہوں نے یہ تماشا دیکھا تو چکرائے خانساماں سے پوچھا کہ یہ کیا گول مال ہے ''شیخ جی!

صاحب دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔''

نورعلی ''صاحب کا حکم ہی ایسا تو کیا کریں؟ آج انہوں نے اپنے ملازموں کی دعوت کی ہے۔ان سے ہولی کھیلنے کو بھی کہا ہے۔ سنتے ہی لاٹ صاحب کے یہاں سے حکم آیا ہے کہ رعایا کے ساتھ خوب ربط ضبط رکھو اور ان کے تیوہاروں میں شریک ہو۔ جبھی تو یہ حکم دیا ہے ورنہ ان کے تو مزاج ہی نہ ملتے تھے۔آپ تشریف رکھیے۔ نکالوں کوئی مزیدار چیز ابھی حال میں ولایت سے پارسل آیا ہے۔

رائے اجاگرمل بڑے آزاد خیال تھے۔ انگریزی دعوتوں میں بے دھڑک شریک ہوتے تھے۔طرز معاشرت بھی انگریزی تھا۔اور یونین کلب کے تو وہ کرتا دھرتا تھا۔انگریزیوں سے ان کی خوب چھنتی تھی اور مسٹر کراس تو ان کے گہرے دوست تھے۔ حاکم ضلع سے خواہ وہ کوئی ہو۔ ہمیشہ ان کا گہرا تعلق رہتا تھا۔نورعلی کی باتیں سنتے ہی اسی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے اچھا یہ بات ہے۔ہاں تو پھر نکالو کوئی مزیدار چیز، کچھ گزک بھی ہو۔''

نورعلی ''حضور آپ کے سامنے سب کچھ حاضر ہے۔''

لالہ صاحب کچھ تو گھر سے پی کر چلے تھے۔ یہاں کئی گلاس چڑھائے تو لڑکھائی ہوئی زبان سے بولے'' کیوں نورعلی آج صاحب ہولی کھیلیں گے؟''

نورعلی۔''جی ہاں۔''

اوجاگرمل: لیکن رنگ ونگ تو کچھ لایا نہیں۔ جھبجو جٹ پٹ کسی کو میرے مکان سے رنگ پچکاری لائے'' سائیس سے'' کیوں گھسیٹے آج تو بڑی بہار ہے۔

گھسیٹے'' بہار سے بڑی بہار ہے۔ہولی ہے۔''

اجاگرمل گاتے ہوئے ''آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔ خوب پچکاری چلاؤں گا۔''

گھسیٹے: خوب عبیر لگاؤں گا۔

گوالا: خوب گلال اڑاؤں گا۔

اردلی: خوب کبیر سناؤں گا۔

اوجاگرمل: آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔

نورعلی: اچھا سب لوگ سنبھل جاؤ! صاحب کا موٹر آرہا ہے۔ سیٹھ جی یہ لیجیے۔ میں دوڑ کر رنگ پچکاری لایا۔ بس ایک چوتالہ چھیڑ دیجیے اور جونہی صاحب کمرے میں آویں ان پر پچکاری چھوڑے اور دوسرے سے، تم لوگ ان کے منہ سے گلال ملو۔ صاحب خوشی کے مارے پھول جائیں گے۔ وہ موٹر احاطہ میں آ گیا، ہوشیار۔

مسٹر کراس اپنی بندوق لیے ہوئے موٹر سے اترے اور لگے آدمیوں کو بلانے مگر وہاں زوروں سے چوتالا ہو رہا تھا۔ سنتا کون ہے؟ چکرائے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا سب میرے بنگلے میں گا رہے ہیں۔ غصہ سے بھرے ہوئے کمرے میں تشریف لائے تو ڈائننگ روم (کھانے کا کمرہ) سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اب کیا تھا۔ جامے سے باہر ہو گئے، چہرہ تمتما گیا۔ ہنٹر لے کر ڈرائینگ روم کی طرف چلے۔ لیکن ابھی ایک قدم دروازہ کے باہر ہی تھا کہ سیٹھ اجاگرمل نے پچکاری چلائی۔ سارے کپڑے تر ہو گئے۔ آنکھوں میں بھی رنگ چلا گیا آنکھیں پونچھ ہی رہے تھے کہ سائیس گوالا سب کے سب دوڑے اور صاحب کو پکڑ ان کے منہ پر رنگ ملنے لگے۔ دھوبی نے تیل اور کاجل کا مرکب لگا دیا۔ صاحب کے غصہ

کی حد نہ رہی ہنٹر لے کر سبھوں کو اندھا دھند مارنے لگے۔ بیچارے سوچے ہوئے تھے کہ صاحب خوش ہو کر انعام دیں گے۔ ہنٹر پڑے تو نشہ کافور ہو گیا۔ کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر۔

سیٹھ اجاگر مل نے یہ رنگ دیکھا تو تاڑ گئے کہ نور علی نے حکم دیا۔ ایک گوشہ میں دبک رہے۔ جب کمرہ نوکروں سے خالی ہو گیا تو صاحب ان کی طرف بڑھے۔ لالہ صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ تیزی سے کمرہ کے باہر نکلے اور سر پر پیر رکھ کر بے تحاشہ بھاگے۔ صاحب ان کے پیچھے دوڑے سیٹھ جی کی فٹن پھاٹک پر کھڑی ہوئی تھی۔ گھوڑے نے دھم دھم کھٹ پٹ کی آواز سنی تو بھڑکا، کنوتیاں کھڑی کیں اور فٹن کو لے کر بھاگا۔ عجیب منظر آگے آگے فٹن اسکے پیچھے سیٹھ اجاگر مل، ان کے پیچھے ہنٹر گیر مسٹر کراس۔ سب بگٹٹ دوڑے چلے جاتے تھے۔ سیٹھ جی ایک بار ٹھوکر کھا کر گرے مگر صاحب کے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئے احاطہ کے باہر سڑک تک گھوڑ دوڑ رہی۔ بالآخر صاحب رک گئے۔ منہ مین کالک لگائے اب اور آگے جانا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ یہ خیال بھی ہوا کہ سیٹھ جی کو کافی سزا مل چکی اپنے نوکروں کی خبر لینا ضروری تھی۔ واپس گئے سیٹھ اجاگر مل کی جان میں جان آئی بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ گھوڑا ابھی ٹھٹھک گیا۔ کوچوان نے اتر کر انہیں سنبھالا اور گودی میں اٹھا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔

لالہ اجاگر مل شہر کی موالاتی جماعت کے پیشوا تھے۔ انہیں انگریزوں کی نیک نیتی پر پورا پورا اعتقاد تھا۔ انگریزی سلطنت کی تعلیمی مالی اور ملکی ترقی کا راگ الاپا کرتے تھے۔ اپنی تقریروں میں تارکان موالات کو خوب پھٹکار کرتے تھے۔

انگریزوں میں ادھر قدر و منزلت خاص طور پر ہونے لگی تھی۔ کتنی بڑے بڑے ٹھیکے جو پہلے انگریز ٹھیکیداروں ہی کو ملا کرتے تھے ان کو دے دیے گئے تھے۔ ترک موالات کی تحریک نے ان کی عزت و دولت میں خوب اضافہ کیا تھا۔ بس وہ زبان سے تحریک مذکورہ کی خواہ کتنی خدمت کریں مگر دل سے اس کی ترقی چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ تحریک ایک ہوا ہے۔ جب تک بہتی رہے اس میں اپنے بھیگے کپڑے سکھا لیں۔ وہ تارکان موالات کے کاموں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اور حکام کو ان مصنوعی باتوں پر یقین کرتے دیکھ کر دل میں ان پر خوب ہنستے تھے جوں جوں عزت بڑھتی تھی، ان کی خودداری میں بھی افزونی ہوتی جاتی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح بزدل نہ تھے۔ گاڑی پر بیٹھے اور ذرا سانس ٹھکانے ہوئی۔ تو اس واقع پر غور کرنے لگے۔ ضرور نور علی نے مجھے دھوکا دیا۔ اس کی تارکان موالات سے سانٹھ گانٹھ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مانا کہ میرا پچکاری چلانا صاحب کو برا معلوم ہوا۔ اور یہ لوگ ہولی نہیں کھیلتے تو بھی ان کا غصہ سے اس قدر دیوانہ ہو جانا اس کے سوا اور کیا ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں کتوں سے بہتر نہیں سمجھتے۔ ان کو اپنے اقتدار پر کتنا غرہ ہے۔ یہ میرے پیچھے ہنٹر لے کر دوڑے۔ اب معلوم ہوا کہ میری تھوڑی بہت عزت کرتے تھے وہ صرف ایک دھوکا تھا۔ دل میں ہمیں اب بھی ذلیل اور کمینہ خیال کرتے ہیں سرخ رنگ کوئی تیز نہیں تھا۔ ہم بڑے دن میں گرجے جاتے ہیں۔ انہیں ڈالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارا تہوار نہیں ہے مگر یہ ذرا سا رنگ ڈال دینے پر اتنا بگڑا تھا۔ آہ یہ بے عزتی۔ مجھے اسے کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ بھاگنا بزدلی تھی۔ اسی سے یہ شیر ہو جاتے ہین بکوئی شک نہیں کہ یہ سب ملا کر

سہیوگیوں کو زیر کرنا چاہتے تھا ان کی یہ منکسر مزاجی اور شرافت صرف الوسید ھا کرنے کے لیے ہے ان کی خود مختاری ان کا غرہ رہی ہے ۔ ذرا بھی فرق نہیں ۔

سیٹھ جی کے دلی خیالات نے سنگین صورت اختیار کی ۔ میری یہ ذلت ۔ اپنی بے عزتی کی یاد ان کے دل کو رہ رہ کر بے قرار کر رہی تھی ۔ یہ میرے موالاتی ہونے کا نتیجہ ہے، میں اسی قابل ہوں ۔ میں ان کی ہمدردانہ باتیں سن کر پھولا نہ ہوتا تھا ۔ مجھے کوتاہ نہی سے اتنا بھی سوجھتا تھا کہ آزاد اور غلام میں کوئی میل جول نہیں ہوسکتا ۔ میں سہیوگیوں کی بے تعلقی پر ہنستا تھا ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ ہنسنے کے قابل نہیں ، بلکہ میں خود ہی قابل مذمت ہوں ۔

وہ اپنے گھر جا کر سیدھے کانگریس کمیٹی کے دفتر کے طرف گئے وہاں ایک بڑی مجلس دیکھی کمیٹی نے شہر کے اچھوت اور ہر چھوٹے بڑے کو ہولی کا جشن منانے کے لیے مدعو کیا تھا ۔ ہندو مسلم ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے محبت سے ہولی کھیل رہے تھے ۔ پھلی وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا تھا ۔ اس وقت لیکچر ہو رہا تھا ۔ سیٹھ جی گاڑی سے اترے مگر جلسہ میں جاتے ہوئے تامل ہوتا تھا ٹھٹکھتے ہوئے آہستہ سے جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ انہیں دیکھ کر لوگ چونک پڑے ۔ یہ خوشامدیوں کے سرغنہ آج یہاں کیسے بھول پڑے انہیں تو موالاتی جلسہ میں بادشاہ کی تجویز پاس کرنا چاہیے تھی ۔ شاید مخبر بن کر آئے ہیں کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں ۔ انہیں چڑوانے کے لیے لوگوں نے کہا، کانگریس کی جے ۔

اجاگر ملنے بلند لہجہ میں کہا، اسہیوگ کی جے ۔

پھر آواز اٹھی ۔ ''خوشامدیوں کی چھے ۔''

سیٹھ جی نے بلند آواز سے کہا۔ ''جی حضوریوں کی پیچھے۔''

یہ کہہ کروہ کل حاضرین جلسہ کو حیرت میں ڈالتے ہوئے پلیٹ فارم پر جا پہنچے اور متانت آمیز لہجے میں بولے۔

''بھائیو! دوستو! میں نے اب تک آپ سے ترک تعلق کیا تھا۔ اسے معاف فرمایے میں تہہ دل سے آپ سے معافی چاہتا ہوں مجھے گھر کا بھیدی جاسوس یا بھبھیکن نہ سمجھیے۔ آج میری آنکھوں کے سامنے پر پردہ ہٹ گیا ہے۔ آج اس پاک اور محبت انگیز ہولی کے دن میں آپ سے ملاپ کرنے آیا ہوں۔ اپنی فراخدلی سے کام لیجیے آپ سے دشمنی کرنے کی آج مجھے سزا مل گئی۔ حاکم ضلع نے آج میری بڑی بے عزتی کی۔ میں وہاں سے ہنٹروں کی مار کھا کر آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میں ملک کا دشمن تھا۔ قوم کا دشمن تھا۔ میں نے اپنی خودغرضی سے جھوٹے اعتبار میں آکر ملک کا بڑا نقصان کیا۔ اس کے لیے خوب کانٹے بوئے۔ اس کی یاد آتے ہی جی چاہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے کر ڈالوں (ایک آواز) ہاں ضرور کر ڈالیے۔ آپ سے نہ ہو سکے تو میں کر ڈالوں (پریذیڈنٹ آواز) یہ سخت باتوں کا موقع نہیں ہے نہیں آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہ کام اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ مگر ابھی مجھے بہت کچھ کنارہ کرنا ہے۔ نہ جانے کتنے پاپوں کا پراشچت کرنا ہے۔ امید ہے کہ زندگی کے بقیہ دن یہی پراشچت کرنے میں یہی منہ کی کالک دھونے میں بسر کروں۔ آپ سے صرف اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے اصلاح کا موقع دیجیے۔ مجھ پر اعتبار کیجیے اور مجھے اپنا غریب خادم سمجھیے۔ میں آج سے اپنا تن من دھن سب آپ پر قربان کرتا ہوں''

دستِ غیب

پہلی بار: ماہنامہ ''زمانہ'' اپریل ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: ۱۹۲۸ء (خواب وخیال)

(۱)

لالہ جیون داس کو بستر مرگ پر پڑے ہوئے چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ حکما پر اب انہیں مطلق اعتماد نہیں رہا۔ محض تقدیر کا بھروسہ ہے۔ کوئی ہمدرد کسی ویدیا ڈاکٹر کا نام لیتا ہے تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔ انہیں اپنی موت کا کامل یقین ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب انہیں اپنی بیماری کے ذکر سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ اپنی حالت کا احساس اتنا طاری ہو گیا ہے کہ پرسش حال بھی ان کے زخم پر نمک ہو جاتی ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھول جانا چاہتے ہیں کہ موت کی آغوش میں ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے اس بارگراں کو سر سے پھینک کر آزادی سے سانس لینے کو ان کی طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے انہیں سیاسیات سے ہمیشہ نفرت تھی۔ اپنے ذاتی معاملات انہیں مصروف رکھنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن اب انہیں ملکی حالات سے خاص دل چسپی ہو گئی ہے۔ انہیں اپنی بیماری کے ذکر کے علاوہ ہر ایک بات کو بڑے شوق سے سنتے تھے، مگر جوں ہی کسی نے ازراہ ہمدردی کسی دوا کا نام لیا، ان کے تیور بدل جاتے تھے۔ تاریکی میں صدائے درد اتنی خوش آیند نہیں ہوتی جتنی روشنی کی ایک جھلک۔

وہ مستقل مزاج آدمی تھے۔ سزا و جزا، عذاب و ثواب کے مسئلے ان کے ہر دائرۂ فکر سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ نامعلوم وحشت کا بھی ان پر غلبہ نہ تھا۔ آئندہ کے جانب سے وہ بالکل بےفکر تھے۔ مگر اس کا باعث ان کا ذہنی جمود نہ تھا، بلکہ فکرِ دنیا نے فکرِ عقبےٰ کی گنجائش نہ باقی رکھی تھی۔ ان کا کنبہ بہت مختصر تھا۔ بیوی تھی، وہ ایک خورد سال بچہ مگر مزاج میں ریاست کی بو تھی اور حوصلہ فراخ۔ نفی اثبات پر غالب رہتی تھی۔ اس پر اس طولانی اور لاعلاج مرض نے نفی پر کئی درجوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ میرے بعد ان بیکسوں کا کیا حشر ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی ان کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو جاتا تھا۔ ان کا نباہ کیسے ہوگا؟ یہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ کون ان کی خبر لے گا؟ آہ میں نے شادی کیوں کی؟ صاحب عیال کیوں بنا؟ کیا اس کے لیے کہ یہ دنیا کے احسان بارہ کے دستِ نگر بنیں؟ کیا اپنے خاندان کی عزت و حرمت کو یوں پامال ہونے دوں؟ جس درگا داس کے دست کرم سے سارے شہر نے فیض اٹھائی اسی کی بہو اور پوتا دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوں۔

ہائے کیا ہوگا؟ کوئی ہمدردی نہیں۔ گزران کی کوئی صورت نہیں، چاروں طرف ہولناک بیابان ہے، کہیں برگ و بار نظر نہیں آتا۔ یہ بھولی نازنین، یہ گلفام بچہ انہیں کس پر چھوڑ دوں۔

ہم وضعداری میں فرد تھے۔ ہم نے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا تھا۔ کسی سے شرمندہ احسان نہیں ہوئے ہمیشہ سر اٹھا کر چلے، اور اب یہ نوبت ہے کہ کفن کا بھی ٹھکانہ نہیں۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ جیون داس کی یہ حالت بہت نازک تھی۔ بار بار غشی

طاری ہو جاتی، بار بار دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ انہیں معلوم تھا کہ اب انجام قریب ہے۔ کمرے میں ایک لیمپ جل رہا تھا۔ ان کی چارپائی کے قریب ہی پر بھاوتی اور اس کا بچہ سوئے ہوئے تھے۔ جیون داس نے در و دیوار پر مایوسانہ نگاہ ڈالی، جیسے کوئی گم گشتہ مسافر مسکن کی تلاش میں ہو۔ چاروں طرف سے گھوم کر ان کی نگاہیں پر بھاوتی کے چہرے پر جم گئیں۔ آہ! یہ حسینہ چند لمحوں میں بیکس ہو جائے گی۔ یہ بچہ چند منٹوں میں یتیم ہو جائیگا۔ یہی دونوں ہستیاں میری زندگی وقف تھی اور اب انہیں اس منجدھار میں چھوڑے جاتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ گرداب بیکسی کا لقمہ بن جائیں۔ ان خیالات نے ان کے دل کو مسوس لیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ان آنکھوں میں کتنا درد تھا، کتنا جذبہ محبت، کتنا جوش و ایثار۔

دفعتاً ان کے خیالات نے پہلو بدلا۔ درد کی جگہ چہرہ پر عزم قومی کی جھلک نظر آئی۔ جیسے صاحبِ خانہ کی جھڑکیاں سن کر کسی درویش سائل کے تیور بدل جاتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں اپنے لختِ جگر کو اپنی پیاری بیوی کی تقدیر کا ستم بردار بننے دوں گا۔ میں اپنے خاندان کی عزت و ناموس کو یوں برباد نہ ہونے دوں گا۔ میں نیم جاں ہوں، خستہ حال ہوں، لبِ مرگ ہوں، لیکن تقدیر کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا۔ اس کا محکوم نہیں حاکم بنوں گا۔ اس کی آستانہ بوسی نہ کروں گا۔ اسے اپنے پیروں پر جھکاؤں گا۔ اپنی کشتی کو عناصر کا پابوس نہ بننے دوں گا۔

بے شک دنیا میرے اس فعل پر منہ بنائے گی، مجھے قاتل سفاک کہے گی۔ اس لیے کہ اس کی شیطانی دلچسپیوں میں اس کے خون آشام تفریحات میں ایک مد کم ہو جائے گی۔ مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ دنیا کی ستم اندیشیاں مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا

سکیں۔ میں اس کی جفا شعاریوں سے آزاد ہوں۔

جیون داس کے چہرے پر عزم نمودار ہوا۔ وہ عزم جو خودکشی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ چارپائی سے اٹھے مگر ہاتھ پاؤں تھرتھر کانپ رہے تھے۔ کمرے کی ہر ایک چیز ان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ انہیں الماری کے شیشے میں اپنا عکس نظر آیا، چونک پڑے۔ یہ کون؟ مگر خیال آیا کہ یہ تو اپنا ہی سایہ ہے۔ انہوں نے الماری سے ایک چمچہ اور پیالہ نکالا۔ پیالے میں وہ زہریلی دوا تھی جو ڈاکٹر نے سینے پر مالش کرنے کے لیے دی تھی۔ پیالے کو مضبوط پکڑے چاروں طرف سہمی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے وہ پربھاوتی کے سرہانے آ کر کھڑے ہوئے۔ دل پر رقت کا غلبہ ہوا۔ ہائے ستم! ان پیاروں کو کیا میرے ہی ہاتھ سے مرنا تھا۔ میں ان کا دیوتا اجل بنوں گا۔ یہ اپنے ہی کردار کی سزا ہے۔ میں نے کیوں آنکھیں بند کر کے تامل کی زنجیر گلے میں ڈالی۔ ان آنے والے حادثات کی طرف میرا خیال کیوں ہٹ گیا؟ میں اس وقت شاداں و خندہ تھا۔ گویا زندگی کا ایک نغمہ قائم ہے۔ ایک گلشن بے خار یہ انہی ناعاقبت نا اندیشیوں کی سی انجام بینی کی سزا ہے کہ آج میں یہ روز سیاہ دیکھ رہا ہوں۔

دفعتاً انہیں اپنے پیروں میں لغزش معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ نبض ساکت ہونے لگی۔ یہی دورہ غشی کی علامتیں تھیں۔ وہ حسرت ناک خیالات دل سے دور ہو گئے۔ کون جانے یہی وہ پیغام مرگ ہو۔ وہ تیزی سے سنبھل کر اٹھے اور پیالے سے دوا کا ایک چمچہ نکال کر پربھاوتی کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے نیند میں دو ایک بار منہ بنا کر کروٹ بدلی، تب انہوں نے لکھن داس کا منہ کھول

کر اس میں بھی دوا کا ایک چمچہ ڈال دیا، اور پیالے کو زمین پر پٹک دیا۔ ان کے پیروں کی لغزش غائب ہوگئی۔ بے ہوشی کی ساری علامتیں دور ہوگئیں۔ دل و دماغ پر ایک ہراس کا غلبہ ہوا۔ وہ کمرے میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ افشاءِ فعل کا خوف اقدام فعل سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔ خوفِ پاداش نہ تھا بلکہ ایک ہنگامۂ ناخوش گوار سے بچنے کی خواہش شماتت ہمسایہ کا نشانہ نہ بننا چاہتے تھے۔ مگر افسوس انہیں معلوم نہ تھا کہ تقدیر یہاں بھی ان کے ساتھ نرد دغا کھیل رہی ہے۔ جس دوا کو انہوں نے زہر سمجھا تھا وہ دراصل ٹانک تھا جو ڈاکٹر نے انہیں تقویت کے لیے دیا تھا۔ وہ گھر سے اس طرح باہر نکلے جیسے کسی نے انہیں دھکیل دیا ہو۔ وہ کبھی اتنے چاق و چست نہ تھے۔ مکان لب براہ تھا۔ دروازہ پر ایک تانگہ والا۔ وہ اس پر اچھل کر جا بیٹھے۔ اعضا میں برقی موج دوڑ رہی تھی۔

تانگے والے نے پوچھا۔ ''کہاں چلوں؟''

''جہاں چاہو۔''

''اسٹیشن چلوں۔''

''وہیں سہی۔''

''چھوٹی لائن چلوں یا بڑی لین؟''

''جہاں گاڑی جلد مل جائے۔''

تانگے والے نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ پہچانتا تھا ''بولا، کیا آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے کیا کوئی ساتھ نہ جائے گا۔''

''نہیں، میں اکیلا ہی جاؤں گا۔''

''آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''

''بہت باتیں نہ کرو۔ یہاں سے فوراً چلو۔''

تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا اور یہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا۔ جیون داس وہاں پہنچتے ہی تانگے سے کود پڑے اور اسٹیشن کی طرف دوڑے۔ تانگے والے نے کہا۔

''پیسے!''

جیون داس کو اب یاد آیا کہ میں گھر سے کچھ لے کر نہیں چلا۔ یہاں تک کہ جسم پر کپڑے بھی نہ تھے۔ بولے ''پیسے پھر ملیں گے؟''

''آپ نہ جانیں کب لوٹیں گے۔''

''میرا جوتا نیا ہے، لے لو۔''

تانگے والے کی جرأت اور بھی بڑھی۔ سمجھا کہ انہوں نے ضرور شراب پی لی ہے۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں۔ چپکے سے جوتے لیے اور چلتا ہوا۔

گاڑی کے آنے میں ابھی گھنٹوں کی دیر تھی۔ جیون داس پلیٹ فارم پر جا کر ٹہلنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے قدم تیز ہونے لگے، گویا وہ کسی کے تعاقب سے بچنا چاہتے ہوں۔ انہیں اس کی مطلق فکر نہ تھی کہ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ جاڑے کے دن تھے۔ لوگ سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے۔ مگر انہیں اوڑھنے بسترے کا خیال نہ تھا۔ ان کی قوت ادراک جواب دے چکی تھی۔ صرف اپنے کردار کا احساس زندہ تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ پربھاوتی میرے پیچھے دوڑی چلی آتی ہے کبھی معلوم ہوتا تھا کہ لکھن داس بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ کبھی پڑوسیوں کی

صدائے گیرودار کانوں میں آتی۔ لمحہ بہ لمحہ واہمہ مشکل ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ مال کے بوروں کے ڈھیر میں جا چھپے۔ ایک ایک منٹ پر چونک پڑتے تھے۔ پر وحشت نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر پھر چھپ جاتے۔ انہیں اب یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ صرف ایک تحفظ جان کا حس باقی تھا۔ گھنٹیاں بجیں۔ جوق در جوق مسافر آنے لگے۔ قلیوں کی بم چیخ، مسافروں کی چیخ پکار۔ آنے جانے والے انجنوں کی دھک دھک دھک۔ گھنٹیوں کی صدائے برخیز نے ایک قیامت برپا کر دی۔ مگر جیون داس بے جان تو دوں کے درمیان اس طرح پینترے بدل رہے تھے گویا وہ انہیں گھیر کر گرفتار کرنا چاہتے ہوں۔

اتنے میں گاڑی کے دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ جیون داس نے چونک کر دیکھا۔ ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ ان کی از خود رفتگی غائب ہوگی۔ خطرہ کا وجود بازیافت کا منتر ثابت ہوا۔ وہ کون سا نشہ ہے جو مار کے آگے ہرن نہ ہو جائے۔ ضرر کا اندیشہ اوسان کو بیدار کر دیتا ہے۔ انہوں نے پھرتی سے غسل خانے کا دروازہ کھولا اور جا کر ایک کونے میں دبک گئے۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا اور کوئی باقی ہے؟ مسافروں نے جیون داس کو غسل خانے میں جاتے دیکھا تھا۔ انہیں یقین نہ تھا کہ ان کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ اب کوئی باقی نہیں ہے۔ عوام کو اہل اختیار سے ایک ازلی قدر ہوتی ہے۔

گاڑی چلی تو جیون داس باہر نکلے۔ مسافروں نے ایک قہقہے سے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ ڈیڑھ دو میل تھا۔

(۳)

راستہ بھر جیون داس کو تصورات سے نجات نہ ملی۔ ہر دوار پہنچ کر وہ ہیجان بہت کچھ فرو ہو چکا تھا۔ عناصر کی حقیقت کا احساس ہوا۔ سردی سے پہلے ہی انجماد کی حالت طاری تھی۔ اب بھوک کی آگ نے جلانا شروع کیا۔ احسان کے کچے دھاگے کو وہ طوق آہنی سمجھتے تھے، مگر احتیاج کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ سدابرت میں جا کر کھانا کھایا اور وہیں سے ایک کمبل بھی لائے۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے، مگر موت کا تو ذکر ہی کیا۔ اب ان عوارض میں بھی افاقہ نظر آتا تھا جنہوں نے زندگی سے مایوس کر رکھا تھا۔ انہیں اپنے جسم میں روز بروز توانائی کا احساس ہونے لگا۔ چہرے کی زردی مٹنے لگی۔ اشتہا نے بھی فطری حالت اختیار کی۔ غلبہ اخلاط توازن پر آیا۔ گویا دو عزیز جانوں کے صدمے نے موت کو رام کر لیا تھا۔

جیون داس کو یہ افزوں اصلاح ان مہلک دردوں سے بھی جاں گداز معلوم ہوئی تھی۔ وہ اب موت کو بلاتے دعا کرتے کہ وہ مہلک علامتیں پھر نمودار ہوں۔ ہر ایک قسم کی بدپرہیزی اور بے احتیاطی کرتے، لیکن بے سود۔ ان صدموں نے موت کو فی الواقع رام کر لیا تھا۔

اب انہیں اندیشہ ہوا کہ میں سچ مچ زندہ رہوں گا۔ آثار ایسے ہی نظر آتے تھے۔ روز بروز اس کا یقین ہوتا تھا۔ انہوں نے تقدیر کو اپنے سروں پر جھکانا چاہا تھا مگر اب اپنے تئیں اس کے پیروں کے نیچے پڑا ہوا پاتے تھے۔ انہیں بار بار اپنے

اور غصہ آتا کبھی کبھی بیتاب ہو کر اٹھتے کہ زندگی کا خاتمہ کر دوں، تقدیر کو دکھا دوں کہ میں اب بھی اسے کچل سکتا ہوں لیکن اس کے ہاتھوں اتنی بڑی شکست پا کر انہیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں اس سے بھی بدتر کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اس کی طاقت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

ان خیالات نے ان کے دل میں فلسفیانہ شکوک پیدا کرنے شروع کیے۔ مادی تعلیم نے انہیں پہلے ہی بدیہہ پرست بنا دیا تھا۔ اب انہیں سارا نظام عالم پر فریب اور سفاک نظر آنے لگا۔ یہاں انصاف نہیں، رحم نہیں، ہمدردی نہیں۔ غیر ممکن ہے کہ یہ نظام کسی ذات کریم کے مطیع ہو۔ اور اس کے علم میں ایسی بدعتیں، ایسی جفا شعاریاں ایسی ایسی کرشمہ سازیاں وقوع میں آئیں۔ وہ نہ رحیم ہے نہ کریم، وہ علیم و خبیر بھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ ذات شریر، خبیث کج رو اور ستم شعار ہے۔ اہل دنیا نے اس کی قوت شر سے خائف ہو کر از راہ تملق اسے صفات حسنہ کا منبع، تقدس اور جلال کا سرچشمہ اور خیر و برکت کا ماخذ بنا دیا ہے۔ یہ بیکسانہ اور عاجزانہ ہرزہ رسائی ہے۔ اپنی خاکساری کا خالص اعتراف اس بے دست و پائی کو عبادت کہتے ہیں اور ان پر ناز کرتے ہیں۔ اہل فلسفہ فرماتے ہیں کہ یہ ساری کائنات اٹل قوانین کے تابع ہیں۔ ان کا عمل ہمیشہ ہوتا رہتا ہے یہ بھی ان کی سہل اعتقادی قوانین بے حس و جامد اور نابین ہوتے ہیں۔ ان میں ستم گاری کا سلیقہ نہیں۔ انہیں ایذا رسانی سے غرض نہیں۔ وہ اگر کسی کے دوست نہیں تو کسی کے دشمن بھی نہیں۔ ان قوانین کا محرک، اس سے شعبدہ کا کوئی رازی ضرور ہے اس سے مفر نہیں۔ مگر وہ قوت غیب فرشتہ نہیں، انسان نہیں، شیطان ہے۔

ان خیالات اور شکوک نے رفتہ رفتہ عمل کے دائرہ میں قدم رکھا۔اطاعت خیر ہمیں رفعت کی جانب مائل کرتی ہے۔اطاعت تا خیر پرستی کی طرف جیون داس کی کشتی کا لنگر ثبات اکھڑ گیا۔تب اسے نہ سکون تھا نہ قرار۔لہروں کے تلاطم سے زیرو زبر ہوتی رہتی تھی۔

(۴)

پندرہ سال گزر گئے،جیون داس اب امیرانہ شان وشکوہ سے زندگی گزارتے تھے۔عالی شان مکان تھا۔سواریاں تھیں،خدام تھے،آئے دن عیش وطرب کی مجلسیں ہوتی تھیں۔اب نفس پروری ان کا ایمان تھا،خود پرستی۔ان کا دین۔ضمیر اور اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے تھے۔حسن وخطا کا احساس فنا ہو گیا تھا۔وسائل کی بھی کمی نہ تھی۔سرقہ، مہذب، کذب مکلّف، افترا، محجوب، تحریف روپوش،تلبیس بالقاب اتنے آقاؤں کے غلام کو کس بات کی کمی۔وہاں صرف ظاہری وقار کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور کس قدر سختی سے اس دائرے کے سوا سمند نفس کی خوش خرامیوں کے لیے اور کوہ سد راہ نہ تھا۔ندیم وجلیس بھی اس قماش کے تھے۔کوئی یک فن قادر،کوی ہر فن مولا۔

جیون داس کو اب اپنے بیوی بچوں کا غم نہ ستاتا تھا۔ماضی اور مستقبل دونوں مٹ گئے تھے۔صرف حال پر ان کی نگاہ رہتی تھ۔وہ ثواب کم عذاب سمجھتے تھے اور عذاب کو ثواب۔انہیں نظام دنیا کو یہی بنیادی اصول نظر آتا تھا اور وہ خود اس

معکوس خیال کی زندہ مثال تھے۔ ضمیر کی گرہوں کو توڑ کر وہ جتنی رفعت پر پہنچے وہاں تک ضمیر کے قفس میں پڑے ہوئے شاید ان کی نگاہ بھی نہ پہنچتی۔ گرد و پیش کی مثالیں اس انحراف کی موید تھیں۔ شعبدہ اور ریا کی قوت فیصلہ کن نظر آتی تھی۔ یہی حیات موفور کا راز تھا۔ آزاد اڑتے تھے۔ پابند ایڑیاں رگڑتے تھے۔ تجارت اور سیاست کی شبستان علم و سخن کا مندر، سلوک و صفا کے دائرے خلوص و اتحاد کی مجلسیں سب اسی شمع سے منور نظر آتی تھیں۔ ایسی دیوی کی اپاسنا کیوں نہ کی جائے۔

گرمی کے دن تھے۔ شام کا وقت، ہردوار کے ریلوے اسٹیشن پر یاتریوں کا ہجوم تھا اور جیون داس ایک گیروے رنگ کی ریشمی چادر گلے میں ڈالے، سنہری عینک لگائے، زہد و اتقا کی زندہ مورت بنے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی ناقد نگاہیں یاتریوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دفعتاً انہیں دوسرے کمرے میں ایک شکار نظر آیا۔ یہ ایک شکیل، خوش وضع نوجوان تھا، بشرے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ گھڑی زنجیر طلائی تھی۔ تہذیب کی اچکن میں سونے کے بٹن۔ سامان سفر بھی پر تکلف۔ دو خدمت گار تھے۔ جس طرح قصاب کی نگاہ جانور کے گوشت پوست پر رہتی ہے اسی طرح جیون داس کی نگاہ میں انسان ایک جنس تصرف تھا۔ اس کے قیافے حیرت انگیز مہارت بہم پہنچائی تھی۔ اس سے کبھی سہو نہ ہوتا تھا۔ یہ نوجوان ضرور کوئی رئیس زادہ ہے۔ سادہ لوح، مغرور بھی، اس لیے آسانی سے دام میں آ جائے گا۔ صرف تالیف ہی کافی ہے۔ ذکی اور طباع ہے۔ اس کی تالیف کے لیے شعبدہ بازی کی ضرورت ہے۔ اس پر اپنے عارفانہ کمال کا سکہ بٹھانا چاہیے۔ اس کے حسن عقیدت پر نشانہ مارنا چاہیے۔ میں

پیر بنوں، یہ دونوں رفیق مرید بن جائیں۔ پر یدن اور پرانیدن کی گھاتیں چلیں۔ تردید کی چوٹیں پڑیں۔ مجھے مافوق البشر بتیا جائے۔ تعریفوں کے پل باندھے جائیں۔ فصاحت اور بلاغت کے انبار لگا دیے جائیں اور طائر کے سامنے دانہ بکھیر کر اس پر جال دیا جائے۔

یہ فیصلہ کر کے جیون داس اپنے دونوں گرگوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ نوجوان نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ گویا اپنے کسی از یادرفتہ دوست کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفعتاً بے صبرانہ انداز سے بولا۔

''مہاتما جی، آپ کا استھان کہاں ہے؟''

جیون داس دل میں باغ باغ ہو گئے۔ بولے ''بابا سنتوں کا استھان کیا۔ سارا سنسار ہمارا استھان ہے۔''

نوجوان نے پھر پوچھا۔ ''آپ کا نام لالہ جیون داس تو نہیں ہے؟''

جیون داس چونک پڑے۔ سینہ بلیوں اچھلنے لگا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کہیں خفیہ پولیس کا کوئی افسر تو نہیں ہے۔ نوجوان کے چہرے کی طرف تجسس کی نگاہ سے دیکھا۔ اقرار کروں یا انکار۔ اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔ دونوں صورتیں خطرناک تھیں، گم صم ہو گئے۔

نوجوان نے انہیں حیض بیض میں دیکھ کر کہا ''مہاراج! میری بے ادبی کو معاف فرمایئے گا۔ پوچھنے کی جرأت صرف اس لیے کی کہ آپ کی صورت میرے پتا جی سے بہت ملتی ہے۔ جو عرصہ دراز سے لاپتہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں سنیاسی ہو گئے ہیں۔ برسوں سے انہی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔''

جس طرح افق پر طوفان کی موجیں چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور طرفتہ العین میں آسمان میں محیط ہو جاتی ہیں اسی طرح جیون داس کو اپنے دل میں رقت کی ایک لہر سی اٹھی ہوئی محسوس ہوئی۔ گلا پھنس گیا اور نظروں میں ہر ایک چیز تیرتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ انہوں نے نوجوان کی طرف جھپی نگاہوں سے دیکھا۔ مغائرت کا پردہ ہٹ گیا۔ اس کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے۔

''لکھو............!''

لکھن داس ان کے پیروں پر گر پڑا اور بولا............لالہ جی۔

میں نے بالکل نہیں پہچانا۔

مدتیں گزر گئیں۔

(۵)

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لکھ داس سو رہا تھا اور جیون داس کھڑکی کے باہر نکالے خیالات میں غرق تھے۔ مشیت کا نیا کرشمہ پیش نظر تھا۔ وہ عقائد جو مدت دراز سے ان کے مشعل ہدایت بنے ہوئے تھے۔ متزلزل ہو گئے تھے۔ اپنی نخوت کے زعم میں کتنا از خود رفتہ ہو گیا تھا۔ سمجھتا تھا، میں ہی نظام دنیا کا سر رشتہ دار ہوں، میں ہی قضا کا داروغہ ہوں۔ رزق کی کنجی میرے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اپنی موت پر پسماندوں کی ذلت اور خرابی کا یقین سمجھتا تھا۔ میرا یہ زعم کتنا باطل ثابت ہوا۔ جنہیں میں نے زہر دینے میں دریغ نہ کیا وہ آج زندہ ہیں، خوش و خرم ہیں۔

صاحب ثروت ہیں غیر ممکن تھا کہ میں لکھو کو ایسی اعلیٰ تعلیم دے سکتا۔ اس کا اخلاقی نشوونما بھی اتنی خوبی سے مجھ سے انجام نہ ہوسکتا تھا، اور اسے اتنی اونچی حیثیت پر پہنچانے کا تو میں کبھی خواب میں بھی گمان نہ کرسکتا تھا۔ سمجھتا تھا وہ میرے مرتے ہی خستہ وخوار ہوجائیں گے۔

اس کے برعکس میری گم شدگی۔ ان کے حق میں کیمیا ہوگئی۔ کتنا خلیق، خوش کلام، خندہ رو، بے لوث نوجوان ہے۔ کتنا منسکر، کتنا موقع شناس۔ مجھے تو آپ اس کے ساتھ بیٹھنے میں اپنی پستی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھ جیسا سیہ کار، کور باطن، نفس پرور انسان اتنا خوش نصیب ہو۔ افسوس میری خود بینی میرے لیے غار سیاہ بن گئی۔

جس کی تہ میں پڑا ہوا میں تاریکی کے جانداروں سے بھی زیادہ ناپاک اور مکروہ ہوں۔ میں نظام عالم کو کسی شیطانی طاقت کا مطیع سمجھتا تھا جو اہل دنیا کے ساتھ گربہ موش کا تماشا کرتی ہے۔ کیسی جہالت تھی۔ آج مجھ جیسا آشیاں برباد دنیا کے خوش نصیب ترین آدمیوں میں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کا منتظم مصدر فیوض وبرکات ہے، ورنہ میں ان عطاہائے بیکراں کے قابل کب تھا۔ صبح ہوتے ہوتے مجھے دیوی کے درشن ہوں گے جس کے ساتھ میری زندگی کے بہترین ایام گزرے ہیں۔ میرے پوتے اور پوتیاں میری گود میں کھیلیں گے۔ عزیز واحباب میرا خیر مقدم کریں گے۔ مجھے مبارکبادیں گے۔ ایسے برکت پاش خبر الوجود کو میں مایہ شر سمجھتا تھا۔

انہی خیالات میں جیون داس کو نیند آگئی۔ جب آنکھیں کھلیں تو لکھو کی مانوس

اور شیریں صدا کانوں میں آئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ لکھن داس اسباب اتروا رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر ان کی فٹن کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اس پر بیٹھے۔ جیون داس کا دل ہجوم مسرت سے بیٹھا جاتا تھا۔ ان کے چہرے پر خوشی کی پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ گویا دنیا کی مطلق خبر نہیں ہے۔ گویا کوئی حس بھی کیا سیلاب مراد بھی اب نیستاں کی کثرت ہے، جو کشت زار دل کو ڈبو دیتی ہے۔

فٹن روانہ ہوئی۔ جیون داس کو ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہے۔ نہ وہ مکانات تھے۔ نہ وہ بازار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ انسان، ایک انقلاب سا ہو گیا تھا۔ دفعتاً انہیں ایک صاف ستھرا خوشنما بنگلہ نظر آیا جس کے پھاٹک پر جلی حروف میں منقش ''جیون داس پاٹ شالا۔''

لکھن داس نے کہا۔ ''اماں جان نے آپ کی یادگار میں یہ پاٹ شالا کھولی ہے۔ اس میں مفت تعلیم دی جاتی ہے اور کئی لڑکے وظیفے پاتے ہیں۔''

جیون داس کا دل اور بھی بیٹھ گیا۔ منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔

ایک لمحہ اور گزرا۔ فٹن رک گئی۔ لکھن داس اتر پڑے۔ جیون داس نے دیکھا تو ایک عالی شان پختہ عمارت تھی۔ پرانے کھپریل والے پیارے گھر کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک نیم کا درخت اس کی یادگار رہ گئی تھی۔ کئی نوکروں نے دوڑ کر اسباب اتارا۔ دو گلعذر بچے، بابو جی، بابو جی پکارتے ہوئے دوڑے۔ اور جیون داس کے پیروں سے چمٹ گئے۔ سارے گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی محلے کے لوگ مزاج پرسی کے لیے آنے لگے۔ دیوان خانہ کھل گیا جو تکلفات سے آراستہ

تھا۔جیون داس ایسے گم گشتہ ہو رہے تھے گویا یہ کوئی نیرنگ ہے۔

(۶)

آدھی رات گزر چکی ہے۔جیون داس کو کسی کروٹ نیند نہ آتی تھی۔اپنی عمر گزشتہ کا نقشہ ان کے پیش نظر تھا۔ان پندرہ سالوں میں انہوں نے جو کانٹے بوئے تھے وہ اس وقت انہیں نگلنے کے لیے منہ کھولے وہئے تھے۔ایک ہی دن میں ان کی حالت متغیر ہو گئی تھی۔بے اعتقادی کی جگہ دستِ غیب کا اعتقاد دل پر حاوی ہو گیا تھا اور یہ اعتقاد محض ذہنی نہیں بلکہ غیبی تھا۔مشیت غیب کا خوف ایک دیو سیاہ کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔اس سے اب انہیں کوئی مفر نظر نہ آتا تھا۔اب تک ان کی ذات آگ کی وہ بے ضرر چنگاری تھی، جو کسی ریگ زار میں پڑی ہو، لیکن وہ چنگاری خرمنِ دامن میں پڑی ہوئی تھی۔معلوم نہیں، وہ کب مشتعل ہو کر خرمن کو خاک سیاہ کر دے۔

جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی۔یہ دہشت ندامت کی صورت اختیار کرتی تھی۔میں اس قابل نہیں کہ اس مجسم رحم و عفو کو اپنا روئے سیاہ دکھاؤں۔اس نے ہمیشہ مجھے اپنے رحم و کرم کے سیاہ میں رکھا اور یہ مبارک دن دکھایا۔میری سیاہ روئی انہی کے رحم و کرم پر ایک داغ سیاہ ہے۔میں تنگِ وجود اس رحیمی کے صدقے کے قابل بھی نہیں۔

کیا میں اس وجود پاک کی نظروں میں حقیر بنوں؟ کیا میری سیہ کاری میرے

خاندان کوملوث ،میری طوفان انگیزیاں اس بہار کوملیا میٹ نہ کردیں گی۔

آہ!اسی خاندان کے ننگ ونام کی حفاظت کے لیے،اس کا وقار رکھنے کے لیے میں چلا گیا تھا۔کیا اب میں خود ننگ خاندان کہلاؤں؟اپنے اعمال کی سیاہی سے اس کے روشن کارنامے کو سیاہ کروں؟اپنی زندگی سے وہ ستم برپا کروں اور قہر ڈھاؤں جو موت کبھی نہ کرسکتی تھی۔میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں پرماتما وہ خون رنگ نہ لائے۔یہ دل گناہوں کے جرائم سے متعفن ہورہا ہے پرماتما یہ خاندان ان کے متعدی اثر سے مامون رہے۔

ان تصورات نے جیون داس کے جذبہ ندامت اور خوف کو اس قدر متحرک کیا کہ وہ متحرک کیا وہ متوحش ہوگئے۔جس طرح پرتی زمین میں بیج غیر معمولی نشوونما پاتا ہے۔اسی طرح اعتقاد سے خالی دل میں جب اعتقاد جاگزیں ہوتا ہے تو اس میں حیرت انگیز صداقت اور ہدایت ہوتی ہے۔اس میں علم کی بجائے عمل کا پہلو غالب ہوتا ہے۔سرفروشانہ جوش اس کی خاص صفت ہوتی ہے۔جیون داس کو اپنے چاروں طرف ایک وجود محیط،ایک دست غیب،ایک نگاہ سازی کا احساس ہورہا تھا اور یہ حسیات لمحہ بہ لمحہ تیز اور روشن ہوتی جاتی تھیں۔اپنی پرآشوب زندگی کی واردات لپکتے ہوئے شعلے بن بن کر اس گھر کی طرف۔اس امن وخوشی کے جلوہ گاہ کی طرف دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔گویا کہ وہ اسے نگل جائیں گے۔

مشرق کی طرف صبح کی تنویر نظر آنے لگی۔جیون داس گھر سے نکلے انہوں نے اپنے وجود نحس کو فنا کر دینے کا عزم کرلیا تھا۔اپنے گناہوں کی آنچ سے اپنے خاندان کو بچانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔اپنی ہستی کو مٹا کر اپنی ندامت کو مٹا دینے کا

تہیہ کر لیا تھا۔

آفتاب پردۂ افق سے باہر نکلا۔ اسی وقت جیون داس گومتی کی لہروں میں سما گئے۔

فلسفی کی محبت

پہلی بار: ہندی میں: ''تیاگی کا پریم'' کے عنوان سے
''مریادا'' نومبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: اردو میں ۱۹۲۸ء (خواب وخیال)

لالہ گوپی ناتھ کی طبیعت دورِ شباب ہی سے فلسفہ کی جانب مائل تھی۔ ابھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی مین تھے کومل اور برکلے ان کے نوک زبان ہو گئے تھے۔ وہ ہر قسم کی دلچسپیوں اور تفریحوں سے الگ رہتے۔ یہاں تک کہ کالج کے کرکٹ میچوں میں بھی ان کا جوش تماشا بیدار نہ ہوتا۔ زندہ دل، رنگین، بزلہ سنج، احباب کی صحبت سے کوسوں بھاگتے۔ اور ان سے حسن ومحبت کا ذکر کرتا تو گویا شیطان کو لاحول سناتا تھا۔ علی الصبح کو کوئی فلسفہ کی کتاب بغل میں دبا کر گھر سے نکل جاتے اور شہر سے باہر کسی گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ومحو ہو جاتے۔ فسانہ اور شعر وسخن سے انہیں مطلق ذوق نہ تھا۔ شاید ہی زندگی میں انہوں نے کوئی قصہ کی کتاب پڑھی ہو۔ اسے تضیع اوقات ہی نہیں بلکہ دل ودماغ کے لیے سم قاتل سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قومی جوش کی کمی نہ تھی۔ سیوا سمتیوں میں بڑا انہماک تھا۔ ابناء وطن کی خدمت کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اکثر محلّہ کے غریب دکانداروں کی دکان پر جا بیٹھتے اور ان کے خانگی تردوات اور گھاٹے ٹوٹے کی داستان سنتے رفتہ رفتہ کالج سے ان کی طبیعت متنفر ہوگئی۔ انہیں اگر اب کسی مضمون سے شوق تھا تو وہ فلسفہ تھا۔ اور کالج کا نصاب تعلیم ان کے مطالعہ خاص میں حارج

تھا۔انہوں نے کالج چھوڑ دیا۔اور یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔مگر اس شوق طلب کے ساتھ علمی خدمات کا جوش بھی بڑھتا گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اضطراری طور پر خدام قوم کے زمرے میں شامل ہو گئے۔فلسفہ میں روحانی شکوک تھے اور تاریکی اور ہیجانِ قلب۔خدمت میں تجسس تھی اور شہرت اور تشکر خاموش۔وہ زندہ دلی اور حرارت جو برسوں سے فلسفیانہ مسائل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔طوفانی جوش کے ساتھ ابل پڑی۔شہر کی تحریکات عامہ میں کود پڑے۔دیکھا تو یہاں میدان خالی تھا۔جدھر نگاہ دوڑاتے سناٹا نظر آتا تھا۔علم برداروں کی کمی نہ تھی پر سچے خادم معدوم تھے۔چاروں طرف ان کی کھینچ ہونے لگی۔کسی تحریک کے سیکرٹری ہوئے،کسی کے صدر،کسی کے کچھ۔کسی کے کچھ اس جوش خدمت میں فلسفہ کا ذوق بھی رخصت ہوا۔پنجرے میں گانے والی چڑیا، کہسار میں آکر اپنے نغمے بھول گئی۔حالانکہ اب بھی وہ موقع نکال کر تھوڑی دیر کے لیے روزانہ کتابیں الٹ پلٹ کیا کرتے تھے۔تحقیق وتصنیف کی فرصت کہاں اکثر دل میں کش مکش بھی ہوتی کدھر جاؤں، ادھر یا ادھر؟ فلسفہ اپنی جانب کھینچتا قوم اپنی طرف کھینچتی۔ایک روز وہ اسی الجھن میں گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔دریا ساحل کے شوروغل سے بے خبر ہواؤں کے جھونکوں سے بے اثر ایک روانی بیتاب کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑا چلا جاتا تھا۔ فلسفی نے سوچا میں بھی اسی طرح کیوں نہ یکسو ہو جاؤں۔وہ اپنے حافظے میں کسی ایسے فلاسفر کی تلاش کرنے لگے جس نے خدمت قوم کے ساتھ دریائے حقیقت کی غواصی بھی کی ہو۔دفعتاً ان کے کالج کے ایک پروفیسر پنڈت تربون ناتھ اگنی

ہوتری آ کر بیٹھ گئے اور بولے ''گوپی ناتھ کیا خبریں ہیں۔''

گوپی ناتھ نے بے رخی سے جواب دیا ''کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ دنیا میں اپنی رفتار قدیم پر چلی جاتی ہے۔''

تر بھون ناتھ: ''میونسپل وارڈ نمبر ۲۱ کے لیے آپ لوگوں نے کسے تجویز کیا ہے۔''

گوپی ناتھ ''دیکھیے کون ہوتا ہے؟ آپ بھی تو امیدوار ہیں۔''

تر بھون ناتھ: ''مجھے لوگوں نے زبردستی کھینچ لیا۔ ورنہ مجھے کہاں فرصت۔''

گوپی ناتھ: ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ پروفیسر کی عملی سیاست میں الجھنا مناسب نہیں۔''

بر جھون نکھ رکس طنز سے بہت خفیف ہوئے۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد انتقام کے ارادے سے بولے ''آج کل فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہو یا نہیں۔''

گوپی ناتھ ''بہت کم۔ اس کش مکش میں پڑا ہوں کہ قومی تحریکوں میں شریک ہو جاؤں یا تلاش حق میں عمر صرف کر دوں۔''

تر بھون ناتھ ''قومی تحریکوں میں شریک ہونے کا زمانہ بعد کو آئے گا! ابھی تو تمہارا تحصیل علم کا زمانہ ہے۔ جب تک عقائد میں استحکام اور متانت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک محض فوری تحریکوں سے کسی کام کو ہاتھ میں لینا مناسب نہیں۔ ابھی تو تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ قومی خدمت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔''

گوپی ناتھ نے فیصلہ کر لیا۔ کہ زندگی خدمت قوم کے نذر ہو گی۔ تر بھون ناتھ نے فیصلہ کیا ''میں دکھا دوں گا کہ تدریس کے ساتھ میونسپلٹی کی خدمت انجام دی جا

سکتی ہے۔''

(۲)

گوپی ناتھ کا وقار پہلے ہی سے قائم تھا۔ خاندان مرفہ حال تھا۔ شکر اور سونے چاندی کی دلالی ہوتی تھی۔ ان کے والد بزرگوار کا تاجروں کے حلقے میں بہت اعزاز تھا۔ دو بڑے بھائی تھے، وہ بھی دلالی کرتے تھے۔ آپس میں اتفاق تھا، دولت تھی۔ لڑکے بالے تھے، اگر نہ تھی تو تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقہ میں عزت۔ وہ گوپی ناتھ کی بدولت حاصل ہوگئی۔ ان کی بیکاری کسی کو ناگوار نہ گزری۔ کسی نے انہیں فکر معاش کے لیے مجبور نہ کیا۔ وہ آزاد اور بےفکر ہو کر رفاہ خلق میں منہمک ہوئے۔ کہیں کسی یتیم خانہ کے لیے چندہ جمع کرتے۔ کہیں لڑکی کے لیے روپے مانگتے۔ ان کی جاںنثاری اور اولوالعزمی نے ان تحریکوں میں جان ڈالدی۔ وہ صبح سے شام تک اور بسا اوقات پہر رات تک انہی فکروں میں رواں دواں رہتے۔ چندے کا رجسٹر ہاتھ میں لیے انہیں روزانہ شام سویرے انہیں امراء کے آستانہ پر کھڑے دیکھنا ایک عام نظارہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے عقیدت مندوں کی ایک خاص تعداد ہوگی۔ لوگ کہتے کتنا بےغرض بےنفس، جاں نثار، خادم قوم ہے۔ کون صبح سے شام تک بلا کسی قسم کے ذاتی مفاد کے محض صلاح خلق کے لیے یوں دوش کرے گا۔ ان کا ایثار اکثر بےغرضوں میں بھی حسن اعتقاد پیدا کر دیتا تھا۔ گوپی ناتھ کو بسا اوقات روسا وامراء کی بےرخی، ترشی یہاں تک کہ علامت بھی برداشت

کرنی پڑتی تھی۔ انہیں روز بروز تجربہ ہوتا تھا کہ قومی خدمت کم و بیش محض چندے مانگنے کا کام ہے اس کے لیے انہیں اہل زر کی دربارداری یا دوسرے الفاظ میں خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ فلسفہ کے اس بے نیاز مطالعہ اور اس قومی گداگری میں کتنا فرق تھا۔ کہاں مل اور کانٹ۔ سپنسر اور اپاپے نواز کے ساتھ خلوت میں بیٹھے حیات و ممات، روح اور مادہ کے حقائق پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا۔ کہاں اہل مغرور نااہل، کندہ ناتراش بیوپاریوں کے سامنے سرنیازخم کرنا پڑتا تھا۔ وہ دل میں انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ ان میں دولت کے سوا اور مجھ پر کون سی فضلیت ہے۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو مشکوک اور ناپسندیدہ ذرائع سے روپے کماتے تھے۔ پر یہ سب کے سب میرے معبود ہیں۔ انہی کی ذات اور دست کرم پر میری خدمت کا دارومدار رہے کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ میں اس جماعت سے بے نیاز رہ کر خدمت کرسکوں۔

اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ لالہ گوپی ناتھ کا شہر کے معززین میں شمار ہونے لگا۔ وہ غریبوں کے دستگیر محتاجوں کے معاون تھے عمر بھی تیس سے تجاوز ہوچکی تھی۔ چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہورہے تھے۔ گوپی ناتھ ٹالتے چلے آئے تھے لیکن اب آخری فیصلے کا زمانہ آ پہنچا۔ ایک روز ان کے والد بزگوار نے کہا اگر تم شادی نہ کروگے تو میں زہر کھالوں گا۔ مجھے خاندان کی رسوائی منظور نہیں۔ اس کا انجام ایک نہ ایک دن رسوائی کا ہونا ہے۔ گوپی ناتھ بڑی تشویش میں پڑے ہفتوں ہوگئے۔ اور کسی فیصلے پر نہ پہنچے۔ قوم اور ذات میں جنگ ہورہی تھی۔ شادی کا مفہوم تھا اپنی نگاہوں کو تنگ کرنا۔ اپنی وسیع دنیا کو چاردیواری میں بند کردینا قوم

کے لیے مر جانا۔ اور صرف عیال کے لیے زندہ رہنا۔ وہ اب اتنے اونچے معیار سے گرنا شرمناک سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے کو اہل اور نا قابل پاتے تھے۔ کسب معاش کے لیے جس دردسری، کاوش کی، جبیں سائی کی تحمل کی ضرورت ہے، وہ ان میں مفقود ہو گئی تھی۔ قومی خدمت میں بھی دردِسر اور کدوکاوش کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس میں ان کی شان بے نیازی قائم رہتی ہے۔ قوم کے لیے بھیک مانگنا فخر ہے، اپنے لیے صلہ خدمت کی تمنا بھی مایۂ شرم۔ عیالداری میں اس کا ابالی پن کا بے فکری کا کہاں گزر۔ ساری قوم کی فکر ایک طرف اور ایک بچے کی بیماری ایک طرف۔ ان خامیوں کے لیے قومی خدمت بہت اچھا بہانہ تھا۔

ایک روز سیر کرنے جا رہے تھے کہ راستہ میں پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہو گئی۔ پروفیسر صاحب اب میونسپل بورڈ کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ مسکرات کا ٹھیکہ لینے کی طبیعت لپکی تھی مگر بدنامی سے ڈرتے تھے۔ افسر مسکرات سے ان کا یارانہ تھا۔ رعایت سے معاملہ ہو جانے کا یقین تھا۔ پھر بھی رسوائی اور انگشت نمائی کا خوف کوئی رائے قائم کرنے نہ دیتا تھا۔ بولے ''کہیے لالہ صاحب مزاج تو اچھے ہیں آپ کی شادی کے متعلق کیا بات طے ہوئی کب تک ہو گئی؟''

گوپی ''میرا تو ارادہ شادی کا نہیں ہے حالانکہ والد صاحب بہت اصرار کر رہے تھے۔''

اگنی ہوتری ''ایسی غلطی مت کرنا، تم ابھی نوجوان ہو، نفس کی ترغیبات سے واقف نہیں۔ میں نے ایسی کئی مثالیں دیکھی ہیں۔ جہاں تجرد سے فائدے کے عوض نقصان ہی ہوا ہے۔ شادی انسان کو محتاط رکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔ جواب

تک انسان کی دریافت کیا ہے۔ اس تجرد سے کیا فائدہ جس کا انجام چھچھورا پن ہو۔''

گوپی ناتھ نے ازراہ انتقام کہا۔''آپ نے مسکرات کے ٹھیکہ سے متعلق کیا فیصلہ کیا؟''

اگنی ہوتری ''ابھی تک تو فیصلہ نہیں کر سکا ہوں، مگر اس پیشے کی طرف طبیعت سے راغب نہیں ہوتی کچھ نہ کچھ سبکی کا باعث ضرور ہے۔''

گوپی ناتھ:''ایک کالج کے پروفیسر کے لئے محض باعث سبکی ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے۔''

اگنی ہوتری:''کوئی پیشہ بذاتہ شرمناک نہیں ہوتا۔''

گوپی ناتھ:''میں آپ سے اس امر میں متفق نہیں ہوں۔ کتنے ہی ایسے پیشے ہین جنہیں ایک تعلیم یافتہ آدمی بغیر نشانہ ملامت بنے کبھی قبول نہیں کرسکتا۔''

گوپی ناتھ نے آ کر اپنے باپ سے کہا''میں شادی نہ کروں گا۔ آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں فقیر ہو جاؤں گا۔''

اگنی ہوتری نے دوسرے دن ٹھیکہ کی درخواست دے دی۔

(۳)

دو سال گزر گئے ہیں۔ گوپی ناتھ نے ایک لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا ہے اور اس کے منتظم ہیں۔ تعلیمی مسائل کا انہوں نے غائر مطالعہ کیا ہے۔ فلسفہ کے اس شک

میں انہیں تجرد کا دعویٰ ہے اس مدرسہ مین وہ اپنے معیاروں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔اس نے بڑی حد تک اس بے دل کا ازالہ کر دیا ہے جو والدین کو لڑکیوں کی جانب سے ہے۔معززین شہر اپنی لڑکیوں کو بلا تامل بھیجتے ہیں۔طرز تعلیم ایسا دلچسپ ہے کہ لڑکی ایک بار وہاں آ کر گویا طلسم میں مسحور ہو جاتی ہے، پھر اسے گھر پر چین نہیں آتا۔تین چار سال ہی میں اسے نسوانی ہنروں میں کافی دستگار ہو جاتی ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں مذہبی مسائل بھی نظر انداز نہیں کیے جاتے۔اہل ہنود کے مختلف فرقوں کے لیے ایک ہی سلسلہ کتب مقرر ہے، مگر کسی کی دل آزادی نہیں ہوتی۔امسال انہوں نے انگریزی جماعتیں بھی کھول دی ہیں۔ ایک انگریزی تعلیم یافتہ گجراتی خاتون کو بمبئی سے بلا رکھا ہے۔ان کا نام آنندی بائی ہے بیوہ ہیں۔ ہندی زبان سے بیگانہ ہیں۔لیکن گجراتی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کر چکی ہیں۔تعلیم کے اصول اور طرز میں ماہر ہیں ان کے تقرر سے مدرسہ مین اور بھی رونق ہو گی ہے۔کئی اصحاب نے جو اپنی لڑکیوں کو منصوری اور نینی تال کے انگریزی مدرسوں میں بھیجنا چاہتے تھے، اب انہیں اسی مدرسہ میں داخل کرا دیا ہے۔آنندی بائی روسا کے گھروں میں جاتی ہیں اور تعلیم کا شوق پیدا کرتی ہیں ان کی وضع قطع میں نفاست ہے خود بھی متمول خاندان کی عورت ہے، اس لیے شہر میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔لڑکیاں ان پر جان دیتی ہیں۔انہیں ''ماں'' کہہ کر پکارتی ہیں۔ گوپی ناتھ اپنے انتخاب پر پھولے نہیں سماتے۔جس سے ملتے ہی آنندی بائی کے محاسن اور اوصاف کی داستان سناتے ہیں۔باہر سے اگر کوئی نامور شخص آ جاتا ہے اس سے اپنے مدرسہ کا معائنہ ضرور کرواتے ہیں۔آنندی بائی کی

تعریف سے انہیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو اپنی تعریف سے ہوتی۔ اسے وہ بالواسطہ اپنی ہی تعریف سمجھتے ہیں۔ آنندی بائی کو بھی فلسفہ سے شوق ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں گوپی ناتھ سے حسن ارادات ہے وہ دل سے اس کی تعظیم کرتی ہیں۔ ان کے ایثار اور بے نفس خدمت نے انہیں مسخر کرلیا ہے وہ منہ پر لالہ جی کی تعریف سے اجتناب کرتی ہیں۔ مگر روسا کے گھرانوں سے اس کا راگ گاتی ہیں۔ ایسے آدمی آج کل کہاں؟ لوگ نام ونمود پر جان دیتے ہیں۔ کسی کے واسطے مرتا کون ہے۔ میں انہیں آدمی دیوتا سمجھتی ہوں۔ کتنی سادگی اور قناعت ہے۔ نہ کوئی شوق، نہ کوئی تکلف صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں نہ کھانے کا وقت متعین نہ سونے کا۔ کوئی ایسا نہیں جو ان کی آسائش کا خیال رکھے۔ بیچارے جلے بھنے گھر پر آئے جو کسی نے سامنے رکھدیا، چپکے سے کھالیا۔ پھر چھڑی اٹھائی اور اپنی منزل پر چل کھڑے ہوئے۔

کنوار کا مہینہ تھا۔ کنیا پاٹ شالہ میں وجے دسمی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک ڈرامہ کھیلنے کی تجویز تھی۔ عمارت خوب سجائی گئی تھی۔ شہر کے روسا کی دعوت کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کا جوش زیادہ تھا۔ آنندی کا یا لالہ گوپی ناتھ کا۔ گوپی ناتھ سامان فراہم کرتے تھے۔ آئیں سلیقے سے چننے کی خدمت آنندی بائی نے اپنے سر لی تھی۔ ڈرامہ بھی انہیں کی تصنیف تھا۔

دسمی کا دن تھا۔ دوپہر تک لالہ گوپی ناتھ فرش اور کرسیوں کا انتظام کرتے رہے جب ایک بج گیا اور اب بھی وہ کھانا کھانے گھر نہ گئے تو آنندی نے کہا ''مہاشے آپ کو کھانے میں دیر ہو رہی ہے اب سب کام ہو گیا۔ جو کچھ کسر ہے، وہ مجھ پر چھوڑ

دیجیے۔''

گوپی ناتھ: ''کھالوں گا۔ میں وقت معین پر کھانے کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ پھر گھر تک کون جائے۔ گھنٹوں کی دیر ہو گی۔ کھانے کے بعد آرام کرنے کو بھی جی چاہیے گا۔ شام ہو جائے گی۔''

آنندی: ''کھانا تو میرے ہاں تیار ہے براہمی پکاتی ہے چل کر بھوجن کر لیجیے۔''

گوپی: ''یہاں کیا کھالوں۔ ایک وقت کھانا نہ کھاؤں گا تو یا سا کون سا نقصان ہو گا۔''

آنندی: ''جب کھانا تیار رہے تو فاقہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

گوپی: ''آپ جائیں۔ بیشک آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میں کام میں ایسا بھولا کہ آپ کو یاد نہ رہی۔''

آنندی: ''آپ فاقہ کرتے ہیں تو مجھے ایک ہی وقت کھانا نہ کھانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔''

گوپی: ''نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں اکثر ایک ہی وقت کھاتا ہوں۔''

آنندی: ''آپ کے انکار کا راز سمجھ گئی۔ تعجب ہے اب تک یہ معمولی سی بات کیوں نہ سوجھی؟ کتنی سست عقل ہوں۔''

گوپی: ''کیا سمجھ گئیں؟ میں چھوت چھات کا قائل نہیں ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔''

آنندی: اتنا جانتی ہوں۔ مگر جس وجہ سے آپ میرے یہاں بھوجن نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق میں آپ سے اتنا عرض کرتی ہوں کہ آپ سے محض ماتحتی کا تعلق نہیں ہے، مجھے آپ سے روحانی پریم ہے۔ میں آپ کا میرے پان پھول سے انکار کرنا اپنے سچے بھگت کی دل شکنی کرنا ہیں آپ کو اسی نظر سے دیکھتی ہوں۔

گوپی ناتھ کوئی ضد نہ کر سکے۔ جا کر کھانا کھالیا۔ وہ جب تک آسن پر بیٹھے رہے آنندی پنکھا جھلتی رہی۔ اگنی ہوتری اور ان کے ندیموں نے اس واقعہ کی یوں تفسیر کی ''لالہ صاحب اب تو وہیں کھانا تناول فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو دونوں میں روحانی مناسبت ہے۔ دیکھیں یہ روحانیت کیا گل کھلاتی ہے۔''

(۴)

ضابطے اور تکلف کا پردہ ہٹنے لگا۔ لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہو گیا تھا۔ گھر سے انہیں ضروری مصارف مل جاتے تھے مگر اخباروں اور کتابوں کے لیے کبھی انہیں بہت مجبور ہونا پڑتا تھا۔ علاوہ بریں اب ان کی خودداری ذرا ذرا سی باتوں کے لیے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے مانع ہوتی تھی۔ وہ اپنی ضرورتیں آپ ہی پوری کر لینا چاہتے تھے۔ گھر پر لڑکے اتنا شور وغل کرتے کہ کام کرنے میں ان کی طبیعت نہ لگتی۔ گھر کے لڑکوں پر ان کے اصول تعلیم کا اچھا اثر نہ نظر آتا تھا۔ اس لیے جب ان کی طبیعت بھی جولان پذیر ہوتی تو بے تکلف کنیا

پاٹ شالا میں چلے جاتے۔ آنندی بائی بھی وہیں رہتی تھیں۔ تخلیہ ملتا۔ کام کرنے جی لگتا۔ کھانے کا وقت آ جاتا تو وہیں کھانا بھی کھا لیتے۔ رفتہ رفتہ آنندی نے محرر کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ لالہ صاحب کی ہی تحریک سے آنندی نے ہندی سیکھ لی تھی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی۔ کہ اب اسے لکھنے میں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی۔ لکھتے وقت اسے بعض اوقات ایسے الفاظ اور محاورے سوجھ جاتے کہ لالہ صاحب پھڑک اٹھتے۔ عبارت میں جان سی پڑ جاتی، کہتے اگر تم خود لکھو تو مجھ سے بہت اچھا لکھو گی، میں تو محض بیگار کرتا ہوں۔ تم میں خدا داد ملکہ ہے۔ شہر کے قاضیوں میں رائے زنی ہونے لگی۔ پر اہل فلسفہ اپنے ضمیر کی صفائی کے سامنے زبان حسد کی کب پروا کرتے ہیں۔ آنندی کہتی دنیا کے منہ میں زبان ہے جو چاہے کہے۔ پر میں اس آدمی سے پرہیز نہیں کر سکتی۔ جس سے مجھے روحانی تعلق ہے۔ گوپی ناتھ اتنے بیباک نہ تھے۔ زبان خالق پر ان کے نام نیک کا انحصار تھا۔ وہ اس کی تحقیر نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ انہوں نے دن کی بجائے رات کو تصنیف کا شغل اختیار کیا۔ کنیا پاٹ شالا میں رات کو کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تھا۔ تنہائی میں خوب کام کرتے۔ وہ خود تو آرام کرسی پر لیٹ جاتے۔ آنندی میز پر بیٹھی قلم لیے ان کی طرف دیکھا کرتی اس کی نگاہ سے ادب اور احترام، عقیدت اور محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ گوپی ناتھ جب کسی خیال کو دل مین غرتیب دینے کے بعد بولن یکے قبل آنندی کی طرف دیکھتے کہ وہ لکھنے کے لیے تیار ہے کہ نہیں تو دونوں کی نگاہیں مل جاتیں۔ گوپی ناتھ اس طرز عمل کے ایس عادی ہوتے جاتے تھے کہ اگر کبھی یہاں آنے کا موقع نہ ملتا تو گونہ اضطراب ہوتا تھا۔

گوپی ناتھ کو آنندی کے آنے سے قبل صنف نازک کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ حکما سابق و حال کی کتابیں ان کی نظر سے گزری تھی۔ سب جگہ عورت روحانی ترقی کی مانع، قومی خدمت کی سدراہ، دل کی پستی، تنگ خیالی اور کام جوئی کی طرف لے جانے والی، زہریلی ناگن، شراب دو آتشہ، دودھاری تلوار بنائی گئی تھی یہاں تک کہ مغرب کے علماء کا بھی یہی فیصلہ تھا۔ انہی وجوہ سے انہوں نے تجرد کو ترجیح دی تھی۔ مگر اب تجربہ بتلا رہا تھا کہ عورت تحریک خیر بھی کر سکتی ہے۔ وہ حقیقت کے راستے کی رفیق بھی بن سکتی ہے۔ اس کے فیض صحبت سے اچھے کام بھی ہو سکتے ہیں۔ تب ان کے دل مین سوال پیدا ہونا شروع ہوا۔ اگر آنندی کے ساتھ ہی میری شادی کرنے کی تجویز ہوئی تو مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ تو میری زندگی بڑی لطف سے گزرتی۔

ایک روزہ وہ آنندی کے یہاں آئے تو سر میں درد تھا۔ کچھ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی۔ آنندی نے ان کے سر میں تیل ملنا شروع کیا۔ وہ بہت نہیں نہیں کرتے رہے پر اس نے شیشی ان کے سر پر انڈیل دی۔ اس وقت گوپی ناتھ کے دل پر ایک عجیب سکون بخش سرورانگیز کیفیت طاری ہئی۔ جذبات نے ناطقہ پر یورش کی۔ لیکن گوپی ناتھ نے درد اور حسرت کا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلنے دیا۔ ہاں اسی دن سے انہوں نے آنندی کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور نہ گئے۔ آنندی نے لکھا۔ آپ کے آنے کی سخت ضرورت ہے مدرسہ کے متعلق کئی انتظامی امور میں آپ سے صلاح لینی ہے۔ گوپی ناتھ نے اس کا جواب نہ دیا آنندی نے پھر لکھا۔ آپ کی کتاب ادھوری پڑی ہے اسے ختم کر

ڈالیے تو جلد پریس چلی جائے۔تب بھی نہ گئے تیسری باراس نے لکھا۔معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں میں نے جان بوجھ کرتو آپ کی مرضی کے خلاف سمجھتی ہوں۔اگر آپ اب بھی نہ آئیں گے تو مدرسہ کا چارج استانی کو دیکر چلی جاؤں گی۔گوپی ناتھ اب بھی نہ پسیجے۔آخر دو مہینے کی بے اعتنائی کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ آنندی بیمار ہے اور دو دن مدرسہ نہیں آئی۔تب وہ کسی حیلہ اور دلیل سے اپنے نفس کو نہ تسکین دے سکے۔آئے کچھ جھجکتے کچھ شرماتے۔آنندی کے کمرے میں قدم رکھا دیکھا تو وہ خاموش پڑی ہوئی تھی۔چہرہ زرد تھا جسم گھل گیا تھا۔اس نے ان کی طرف چشم فریاد سے دیکھا۔اٹھنا چاہا۔مگر ضعف نے اجازت نہ دی۔گوپی ناتھ نے کہا لیٹی رہو۔کوئی ضرورت نہیں میں بیٹھ گیا۔ڈاکٹر صاحب آئے تھے؟

خادمہ نے کہا ''جی ہاں۔دوبار آئے تھے۔دوا دے دی ہے۔''

گوپی ناتھ نے نسخہ دیکھا تو ضعف جگر معلوم ہوا۔زیادہ تر ادویات مسکن و مقوی تھیں۔آنندی کی طرف پھر دیکھا۔اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بے اختیار جی بھر آیا۔جگر میں ایک ٹیس سی ہونے لگی۔دل کی زبان پر رکھ کر بولے آنندی تم نے اپنی بیماری کی اطلاع مجھے پہلے نہ دی،ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔

آنندی: ''کوئی بات نہیں۔اچھی ہو جاؤں گی۔جلدی اچھی ہو جاؤں گی۔مر بھی جاؤں گی تو کون رونے والا بیٹھا ہے؟ یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ کر رونے لگی۔''

گوپی ناتھ فلسفی تھے مگر ابھی ان کے جذبات میں باقی تھی کانپتی ہوئی آواز سے بولے ''آنندی کم سے کم دنیا میں ایک ایسا کوئی ہے جو تمہارے لیے اپنی جان

دیدیگا۔'' یہ کہتے کہتے وہ رک گئے۔ انہیں اپنا انداز کلام کچھ غیر موزوں معلوم ہوا۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے وہ ان سوقیانہ الفاظ کی نسبت سے زیادہ پاکیزہ زیادہ مہر انگیز طرز ادا چاہتے تھے۔ پر وہ الفاظ ذہن میں نہ آئے۔

آنندی نے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا ''دو مہینے تک کس پر چھوڑ دیا تھا۔''

گوپی ناتھ ''آنندی چھوڑ نہیں دیا تھا۔ اپنی تقدیر کو روتا تھا۔ یہی سمجھ لو کہ میں نے نہ جانے کیا سمجھ کر خودکشی نہیں کر لی۔ میں نے نہ سمجھا تھا کہ اپنے عہدے پر قائم رہنا میرے لیے اتنا دشوار ہو جائے گا۔ میں نے اس دوران میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اخباروں کی چٹ تک نہیں کھولی۔ شاید ہی کبھی آنکھوں میں نیند آئی ہو۔ بس ایک ہی خیال، ایک ہی صورت، ایک ہی بت شب و روز دل میں جمی رہتی تھی۔''

آنندی نے گوپی ناتھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''اب تو آپ کبھی اتنی بے اعتنائی نہ کیجیے گا۔''

گوپی ناتھ: ''انجام کیا ہے۔''

آنندی: ''کچھ بھی ہو؟''

گوپی ناتھ: ''کچھ بھی ہو؟''

آنندی: ''ہاں کچھ بھی ہو؟''

گوپی ناتھ: رسوائی، تحقیر، بدنامی، شرمندگی۔

آنندی: ''میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں اور میرے لیے آپ کو بھی سہنا پڑے گا۔''

گوپی ناتھ: ''آنندی! میں اپنے تئیں پریم پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن نام کو نہیں۔ میں انگشت نمائیوں کی پر معنی نگاہوں کی اہانت آمیز باتوں کی چوٹیں نہیں برداشت کر سکتا۔''

آنندی: ''نہ کیجیے۔ آپ نے بہت ایثار کے بعد یہ کمائی کی ہے میں آپ کو اس سے محروم کرنا نہیں چاہتی۔ (گوپی ناتھ کا ہاتھ پکڑا) اس کو چاہتی ہوں۔ اس سے اور زیادہ تیاگ کی تمنا نہیں رکھتی۔''

گوپی ناتھ ''دونوں باتیں ساتھ ممکن ہیں۔''

آنندی ''ممکن ہیں میرے لیے ممکن ہیں۔ میں آپ کے پریم کیلئے اپنی آتما بھی نچھاور کر سکتی ہوں۔''

(۵)

اس کے بعد لالہ گوپی ناتھ نے آنندی کی برائی کرنی شروع کی۔ دوستوں سے کہتے ان کی طبیعت کام میں نہیں لگتی۔ پہلے کی سی تن دہی نہیں ہے۔ کسی سے کہتے، وہ اب یہاں سے برداشتہ خاطر ہیں گھر جانا چاہتی ہیں ان کی منشا ہے مجھے سالانہ ترقی ملا کرے اور اس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مدرسے کے کئی معائنے کیے اور کیفیت بہت خراب لکھی۔ انتظام تعلیم، سبھی صیغوں میں ایک افسوسناک انحطاط کا اظہار کیا۔ سالانہ انتظام میں جب بعض ممبروں نے آنندی کی ترقی کا مسئلہ پیش کیا تو گوپی ناتھ نے سخت مخالفت کی۔ ادھر ادھر آنندی نے بھی لالہ گوپی ناتھ کے

دکھڑے رونے شروع کیے۔ کہتیں یہ آدمی نہیں پتھر کے دیوتا ہیں انہیں خوش رکھنا محال ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ رونہ غریب ان کے نخروں کی نذر ہو جاتی۔ کہاں تک کوئی صفائی اور انتظام کی طرف دھیان دے۔ دیوار پر ایک دھبہ بھی پڑ گیا۔ کسی کونے کو کھڑکی میں ایک جالا بھی لگ گیا یا برآمدوں میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی پڑا مل گیا تو آپ میرے سر ہو جاتے ہیں، تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں جوں توں کر کے نباہا۔ لیکن دیکھتی ہوں لالہ صاحب کی سخت گیریاں روز بروز بڑھی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ میرے لیے روزانہ فرمائشیں آتی رہتی ہیں جب چاہوں گی اٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہاں آپ لوگوں سے محبت ہوگئی ہے۔ لڑکیوں سے پیار ہو گیا ہے اسی لیے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ تعجب یہی تھا کہ اور کسی دوسرے آدمی کو مدرسہ کے انتظام یا تعلیم میں انحطاط نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ حالت پہلے سے بہتر تھی۔

ایک دن پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا کہیے مدرسہ کی کیا کیفیت ہے۔

گوپی ناتھ: کچھ نہ پوچھیے! آج کل حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔

اگنی ہوتری: ''آنندی بائی نے تساہل شروع کر دیا۔''

گوپی ناتھ: ''جی ہاں۔ سراسر۔ اب کام میں ان کا جی نہیں لگتا۔ بس زیادہ تر لوگ اور گیان کی کتابیں پڑھا کرتی ہے کہتا ہوں تو جواب دیتی ہیں۔''

میں اب اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکتی۔ کچھ پرلوک کی فکر چاہیے کہ چوبیسوں گھنٹے پیٹ ہی کی نذر کروں۔ پیٹ کے لئے پانچ گھنٹے بہت ہیں۔ اس سے زیادہ

ممکن نہیں۔ پہلے کچھ دنوں تک بارہ گھنٹے دیے تھے۔ مگر وہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی میں نے یہاں تک اپنی صحت زائل کر دی۔ ایک بار سخت بیمار پڑ گئی۔ کیا کمیٹی نے میرے معالجہ کی فکر کی؟ کوئی بات پوچھنے بھی نہ آیا۔ پھر میں کیوں جان دوں۔ سنا ہے عورتوں میں میری بدگوئی بھی کیا کرتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے عارفانہ انداز سے ہنس کر کہا ''یہ سب روحانیت کے کرشمے ہیں۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔''

دو سال گزر گئے۔ رات کا وقت تھا۔ کنیا پاٹ شالہ کے اوپر والے کمرے میں لالہ گوپی ناتھ میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بے قریب ہی آرام کرسی پر آنندی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ کئی منٹ خاموشی کے بعد گوپی ناتھ نے کہا ''میں نے تم سے پہلے ہی ماہ میں کہا تھا۔ متھرا چلی جاؤ۔''

آنندی ''میرے پاس، اتنے روپے کہاں تھے اور نہ تمہیں کچھ انتظام کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا تین چار مہینے یہاں اور رہوں۔ اس عرصہ میں کچھ پس انداز بھی کر لوں گی۔ تمہاری کتاب سے بھی کچھ روپے مل جائیں گے۔ تب متھرا چلی جاؤں گی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ بیماری بھی اس موقع کی منتظر ہے میری طبیعت ایک ہفتہ کے لیے سنبھلی بھی اور میں نہ روانہ ہوئی۔ مگر موجودہ حالت میں سفر کرنا میرے لیے تقریباً غیر ممکن ہے۔''

گوپی ناتھ: ''مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں یہ بیماری طول نہ کھینچے۔ مہینے دو مہینے بھی یہاں رہنا پڑے تو راز افشا ہو جائے گا۔''

گوپی ناتھ: ''میں بھی نہ ڈرتا۔ اگر میری باعث شہر کی کئی تحریکوں کی زندگی

خطرے میں نہ پڑتی مجھے اس لیے نام نیک کی پروا ہے۔سوسائٹی کی ان قیدوں کو مہمل سراسر ناروا سمجھتا ہوں۔تم اس بارے میں میرے خیالات سے بخوبی واقف ہو۔مگر کروں کیا۔بدقسمتی سے میں نے اپنے اوپر قومی خدمت کا بار لے لیا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مجھے اپنے بنائے اصولوں کو توڑنا پڑ رہا ہے اور جو چیز مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے اسے یوں خطروں سے ہٹانے کے سوا اور کوئی نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔"

مگر آنندی کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے روز بروز گرتی ہی گئی۔ضعف سے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا پر کسی ڈاکٹر یا وید کو اس کی حالت افشا کے خوف سے نہ دکھائی جاتی تھی۔گوپی ناتھ دوائیں لاتے تھے آنندی کمرے میں پڑے پڑے پیتی تھی۔ اور ضعیف سے ضعیف تر ہوتی جاتی تھی۔مدرسہ سے اس نے رخصت لے لی تھی۔ کسی سے ملتی جلتی نہ تھی۔بار بار ارادہ کرتی۔متھرا چلی جاؤں مگر ایک انجان دیس میں بے یار و مددگار کیسے رہوں گی۔نہ کوئی آگے نہ پیچھے کوئی ایک دو گھونٹ پانی دینے والا بھی نہیں۔یہ سب سوچ کر اس کی ہمت رخصت ہو جاتی تھی۔اس پس و پیش اور حیص بیض میں دو مہینے اور گزر گئے۔اب آنندی نے یہ فیصلہ کیا۔ہر چہ بادا باد۔یہاں سے چل ہی دوں۔ہم کو تکلیف دہ فیصلوں میں التوا میں نجات نظر آتی ہے۔آنندی نے اب سوچا۔سفر میں مر جاؤں گی تو کوئی مضائقہ نہیں ان کے نام نیک پر تو حرف نہ آئے گا۔میرے منہ پر تو کالک نہ لگے گی۔انہیں میرے باعث ذلت اور خفت تو نہ اٹھانی پڑے گی۔طعنے نہ سننے پڑیں گے۔سفر کی تیاریاں کرنے لگی۔جو آج سے دو مہینہ قبل ہوتیں تو منشا پوری ہو جاتی۔پر اب مشت بعد از جنگ

تھیں۔

رات کو جانے کا قصد تھا۔تانگے والے سے وقت پر آنے کی تاکید کر دی گئی تھی۔دفعتاً سرِ شام ہی سے آنندی کو دردِ زہ شروع ہوا۔اور گیارہ بجے ایک ننھی سی صنف اور نیم جان ہستی ظہور میں آئی۔بچے کے رونے کی آواز سنتے ہی لالہ گوپی ناتھ بے تحاشا اوپر سے اترے اور گرتے گرتے گھر بھاگے۔غریب آنندی نے اس راز کو دم آخر تک چھپائے رکھا۔اپنے درد جانگزا کی کسی کو اطلاع نہ دی۔خادمیوں کو پہلے ہی سے شکوک تھے انہیں زیادہ تعجب نہ ہوا۔آنندی بے ہوش تھی۔

(۲)

دوسرے دن دس بجتے خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔گھر گھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔کوئی تعجب کرتا تھا۔کوئی نفرت کرتا تھا۔کوئی مذاق اڑاتا تھا۔لالہ گوپی ناتھ کے بدخواہوں کی تعداد کافی تھی۔پنڈت تربھون ناتھ اگنی ہوتری ان کے سرغنہ تھے۔ان لوگوں نے مہاشے گوپی ناتھ کو بدنام کرنا شروع کیا۔جہاں دیکھیے وہاں دو چار آدمی بیٹھے رازدارانہ انداز سے اس واقعہ کی تلمیع وتفسیر کرتے نظر آتے تھے کوئی کہتا تھا اس عورت کے لچھن پہلے ہی سے برے معلوم ہوتے تھے نہیں تو بمبئی سے یہاں آتی ہی کیوں۔اسے جواب ملتا تھا۔اس غریب کی خطا نہیں ہے۔یہ سارے کرتوت اسی بنے ہوئے عینک باز فلاسفر کے ہیں اگر یہی کرنا تھا تو شادی کیوں نہ کر لی۔تب تو برہم چاری بننے کا حمق سوار تھا۔اب اس چھچھورے پن پر کمر

باندھی ہے۔ اسے تو منہ میں کالک لگا کر کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ استفسار حال کے بہانہ سے گوپی ناتھ کے گھر جاتے اور انہیں خفیف کر کے چلے آتے تھے۔ ہر شخص کو انہیں خفیف کرنے میں مزا آ رہا تھا۔ اس کے برعکس آنندی کی حالت پر لوگوں کو رحم آتا تھا۔

مگر گوپی ناتھ کے کتنے ہی عقیدت مند ایسے تھے جو اس واقعہ کو ان کی ذات سے کسی طرح منسوب نہ کر سکتے تھے۔ یہ کسی شریر النفس کی حرکت ہے جس شخص نے کبھی عورتوں کا ذکر تک نہ کیا۔ وہ آج یہ حرکت کرے گا۔ اگر انہیں یہی کرنا ہوتا تو شادی نہ کر لیتے۔

گوپی ناتھ نے خود ایک مشکک کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ سب کی سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔

سوال تھا اب کیا ہو۔ آنندی کی نسبت تو کلام کا موقع نہ تھا وہ عضو ناقص تھی۔ بحث یہ تھی۔ لالہ گوپی ناتھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ عام فیصلہ تھا کہ انہوں نے جو حرکت کی اس کا پھل کھائیں۔ آنندی بائی کو باقاعدہ طور پر گھر میں رکھیں۔ لیکن اکابر شہر غیر جانبداری کو ترجیح دیتے تھے ہمیں اس سے کیا مطلب۔ آنندی جانیں اور وہ جانیں۔ ہاں انہیں اب پاٹ شالہ کی مینجری سے الگ کر دینا چاہیے۔

پروفیسر اگنی ہوتری اور ان کے رفقا گوپی ناتھ کو اتنے سستے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہیں گوپی ناتھ سے پرانا حسد تھا۔ یہ کل کا لونڈا محض دو چار کتابیں ادھر ادھر پڑھ کر فلسفہ میں شدبد کر کے شہر میں لیڈر بنا ہوا گھومے۔ عینک لگائے ریشمی دوپٹہ گلے میں ڈالے سب کو مربیانہ انداز سے دیکھے گویا پارسائی اور ایثار کا پتلا ہے۔

ایسے لوگوں کا پردہ کیوں نہ فاش کیا جائے۔قوم کو ایسے دغاباز حرام کار خدمت گزاروں سے کیوں نہ متنبہ کیا جائے۔ یہ لوگ کنیا پاٹ شالہ کی معلموں سے چوکیداروں سے خادماؤں سے تفتیش کرتے تھے۔لالہ گوپی ناتھ یہاں کب آتے تھے،کتنی دیر تک رہتے تھے کیا کرتے تھےتم لوگ وہاں جاتے تھے یا جانے کی ممانعت تھی۔چھوٹی چھوٹی تنخواہوں کے ملازم اور وہ بھی ایس جو گوپی ناتھ کی سخت گیریوں سے بیزار تھے۔ایسے عزت کے معاملے میں مخبر کا کام کرنے سے گریز کرتے تھے،پر کسی قسم کی شہادت نہ ہونے پر بھی زبان خلق نے گوپی ناتھ کو مجرم قرار دے دیا تھا اور اب فیصلہ کی کہیں بھی اپیل نہ تھی۔

ادھر لالہ صاحب نے اسی دن سے آنندی کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔دو ہفتے تک وہ غریب کسی طرح کنیا پاٹ شالہ میں رہی۔پندرہویں دن انتظامیہ کمیٹی نے اس کے نام برطرفی کا پروانہ بھیج دیا۔ایک مہینے کی رسمی اطلاع دینا بھی ضروری نہ سمجھی۔بدنصیب عورت،ننھا سا نیم جان بچہ گود میں ہے ایک تنگ مکان میں چلی گئی۔اور زندگی کے دن کاٹنے لگی۔کوئی پرسان حال نہ تھا۔بچہ کمزور خود بیمار نہ کوئی تیماردار نہ غمگسار۔محض ایک مہری مل گئی جو اس حالت پر ترس کھا کر اس کے برتن دھویا کرتی تھی۔بیچاری بچہ کو چھاتی سے لگائے رات بھر بیٹھ کر گزارتی عجب مصیبت کا سامنا تھا۔پر واہ رے صبر،اور توکل،اور تحمل لالہ گوپی ناتھ سے نہ زبان پر شکایت تھی،نہ دل میں سوچتی۔موجودہ حالتوں میں انہیں مجھ سے بے اتفاقی کرنی ہی چاہیے تھی۔اس کے سوا اور کیا علاج تھا۔ان کی رسوائی سے شہر کو کتنا بڑا نقصان ہوتا گو اب بھی کتنے ہی آدمیوں کو ان پر شبہ ہے مگر کوئی ان پر علانیہ الزام

لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ رہی میں، میری ہستی، کیا میری بدنامی سے دنیا کو نقصان۔

تین مہینے گزر گیے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آنندی سوامی ابھیدانند کی ایک کتاب کا ترجمہ کر رہی تھی اب وہ بچے کے سو جانے پر ترجمہ کیا کرتی تھی۔ معاش کی اور صورت نہ تھی۔ دفعتاً کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ وہ چونک پڑی۔ دبے پاؤں دروازہ پر جا کر سننے لگی۔ لالہ گوپی ناتھ کی آواز معلوم ہوئی۔ فوراً دروازہ کھول دیا۔ گوپی ناتھ داخل ہوئے اور سوتے ہوئے بچہ کو پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے ''آنندی میں تمہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ میں اپنے کو اتنا بودا۔ اتنا کم ہمت۔ اتنا بے غیرت نہ سمجھتا تھا۔ پر میرا بوداپن، میری بے غیرتی اور بے شرمی مجھے بدنامی سے نہ بچا سکی۔ میری بدنامی جو کچھ ہو سکتی تھی۔ میری ذات سے چلنے والی تحریکات کو جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا۔ اب غیر ممکن ہے کہ میں پبلک کو پھر اپنا منہ دکھاؤں۔ اور نہ اب قوم ہی مجھ پر اعتبار کر سکتی ہے۔ باوجود اس کے مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنے فعل ذمہ داری اپنے سر لوں۔ میں پہلے سوسائٹی کی قیدوں کی شمہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا۔ پر اب قدم قدم پر اس کے خوف سے میری روح فنا ہو جاتی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر کہ تمہارے اوپر اتنی افتادیں پڑیں۔ تمہیں ہماری عسرت، اور رسوائی کا یوں مقابلہ کرنا پڑے۔ تم پر ایسی کٹھن گھڑیاں گزریں اور میں یوں الگ رہوں۔ گویا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ کتنی ہی بار یہاں آنے کا ارادہ کیا اور پھر ہمت ہار گیا۔ اب مجھ پر روشن ہو گیا کہ میری ساری فلاسفی

نمائش تھی۔ مجھ میں قوت عمل معدوم ہے میں محض اصولوں کا دفتر ہوں۔ محض مستعمار خیالات کا ایک تودہ بے جان، بے حس لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے الگ رہنا میرے لیے عذاب ہے۔ تم سے دور رہ کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے پیارے بچے کو ایک بار دیکھنے کے لیے میرے دل میں کتنی بار گدگدی سی ہوئی ہے۔ پر یہ امید کرنے کی جرأت کیونکر کروں کہ میرے اخلاقی ضعف کا ایسا دل شکن ثبوت پانے کے بعد تم مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگی ہو۔''

آنندی نے باچشم تر کہا ''سوامی آپ ایسا خیال کر کے مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ محض اپنی آسائش اور اطمینان کے لیے نام نیک میں داغ لگاؤں۔ میں آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہوں۔ یہی میری سب سے بڑی تمنا ہے۔ آپ مجھے ایک بار اسی وقت روزانہ درشن دیدیا کریں۔''

گوپی ناتھ اس طفلانہ بھولے پن پر شرمسار ہو گئے جی چاہا کہ شادی اور بیاہ کی بے معنی قیدوں کو توڑ دوں۔ اس دفتر بے معنی کو غرق مے ناب کر دوں۔ اپنا گھر بناؤں۔ آنندی اس گھر کی دیوی بنے۔ بچہ اس کے صحن میں کھیلے۔ اس کے رخ روشن سے یہ تیرو تارکی زندگی روشن کر دوں۔ مگر ایک ہی لمحہ میں یہ جوش غیرت پھر فنا ہو گیا۔ رسوائی کا خوف پھر دل پر مسلط ہو گیا۔ فلسفہ نے پھر کوتہ عملی کے سامنے سر جھکا دیا۔ نیک نامی کا خوانِ شیریں زمین پر گر کر خاک میں مل چکا تھا۔ پر دل چیونٹی کی طرح پھر انہیں خاک آلودہ ریزہائے شکر سے جا چمٹا۔

اس واقعہ کو پندرہ سال گزر گئے ہیں اور اب بھی لالہ گوپی ناتھ روزانہ رات کو یکہ و تنہا آنندی کمرے میں بیٹھے نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن وہ نام پر جان دیتے ہیں،

آنندی پریم پر۔ بدنام دونوں ہیں لیکن آنندی کے ساتھ لوگوں کو ہمدردی ہے گوپی ناتھ سب کی نظروں سے گر گئے ہیں۔ ہاں ان کے قریبی دوست اس واقعہ کو تقاضائے بشر سمجھ کر اب بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن پبلک اتنی متحمل نہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

ستیّہ گرہ

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری'' دسمبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: ۱۹۲۸ء (خاک پروانہ)

(۱)

ہز ایکسیلنسی وائسرائے بنارس آرہے تھے۔ سرکاری اہلکار کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی ان کے خیر مقدم کی تیار کر رہے تھے۔ ادھر کانگریس نے شہر میں ہڑتال کرنے کی منادی کر دی تھی جس سے اہلکاروں میں بڑی ہلچل تھی۔ ایک طرف سڑکوں پر جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ صفائی ہو رہی تھی۔ پنڈال بن رہا تھا اور دوسری طرف فوج و پولیس کے سپاہی سنگینیں چڑھائے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر قواعد کرتے پھرتے تھے۔ حکام کی سرتوڑ کوشش تھی کہ ہڑتال نہ ہونے پائے مگر کانگریس والوں کو دھن تھی کہ ہڑتال ہو اور ضرور ہو۔ اگر حکام کو حیوانی طاقت پر ناز ہے تو ہمیں روحانی قوت کا بھروسہ ہے۔ اس بار دونوں کی آزمائش ہو جائے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر صبح سے شام تک دکانداروں کو دھمکیاں دیتا پھرتا کہ ایک ایک کو جیل میں بھجوا دوں گا۔ یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔ دکان دار ہاتھ جوڑ کر کہتے کہ حضور بادشاہ ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں، مگر ہم کیا کریں کانگریس والے ہمیں جیتا نہ چھوڑیں گے۔ ہماری دکانوں پر دھرنا ماریں گے۔ ہمارے اور

بال بڑھادیں کنوئیں میں گریں گے، فاقے کریں گے۔ کون جانے دو چار جان ہی دے دیں۔ تو ہمارے منہ پر ہمیشہ کے لیے کالک لگ جائے گی۔ حضور! انہیں کانگریس والوں کو سمجھا دیں تو ہمارے اوپر بڑا احسان ہو۔ ہڑتال نہ کرنے سے ہمارا کچھ نقصان تھوڑا ہی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے آدمی آئیں گے۔ ہماری دکانیں کھلی رہیں گی تو ایک کے دو ملیں گے، مہنگے سودے بچیں گے مگر کیا کریں۔ ان شیطانوں سے کوئی بس نہیں چلتا۔

رائے ہرنندن سہائے راجہ لال چند اور خان بہادر مولوی محمود علی تو حکام سے بھی زیادہ بے چین تھے۔ مجسٹریٹ کے ساتھ اور تنہا بھی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اپنے مکانوں پر بلا کر دکان داروں کو سمجھاتے، منت سماجت کرتے، آنکھیں دکھلاتے، یکے بگھی والوں کو دھمکاتے، مزدوروں کو خوشامد کرتے مگر کانگریس کے مٹھی بھر آدمیوں کا کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ کنجڑوں نے بھی بے خوفی سے کہہ دیا کہ حضور چاہے مار ڈالو مگر دکان نہ کھلے گی۔ ناک نہ کٹواؤں گی۔ سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ پنڈال بنانے والے مزدور، بڑھئی، لوہار وغیرہ کام نہ چھوڑ دیں ورنہ غضب ہی ہو جائے گا۔

رائے صاحب نے کہا۔ ''حضور! دوسرے شہروں سے دکان دار بلوا دیں اور ایک بازار علیحدہ کھولیں۔''

خاں صاحب نے فرمایا۔ وقت اتنا کم ہے کہ دوسرا بازار تیار نہیں ہوسکتا۔ حضور! کانگریس والوں کو گرفتار کرلیں یا ان کی جائیداد ضبط کرلیں۔ پھر دیکھیں کیسے قابو میں نہیں آتے۔

راجہ صاحب بولے۔ ''اس داروگیر سے تو لوگ اور جھلائیں گے۔ کانگریس والوں سے حضور کہیں کہ تم ہڑتال بند کردو سب کو سرکاری ملازمت دے دی جائے گی۔ اس میں زیادہ تر بیکار لوگ بھرے پڑے ہیں۔ لالچ دکھانے سے خوش ہو جائیں گے۔ مگر مجسٹریٹ کو کوئی رائے پسند نہ آئی۔ یہاں تک کہ وائسرائے کے آنے میں تین روز رہ گئے۔''

(۲)

آخر راجہ صاحب کو ایک تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ ہم لوگ بھی روحانی طاقت سے کام لیں۔ آخر کانگرس والے مذہب اور روحانی طاقت ہی کے نام پر طومار باندھتے ہیں۔ ہم لوگ انہی کی تقلید کریں۔ شیر کو اس کی ماند میں پچھاڑیں۔ کوئی آدمی پیدا کرنا چاہیے، جو فاقے کرے کہ دکانیں نہ کھلیں تو جان دے دوں گا۔ یہ ضروری ہے کہ وہ برہمن ہو، اور ایسا ہو کہ جس کو شہر کے لوگ مانتے ہوں اور اس کی عزت کرتے ہو۔ یہ بات دیگر رفقا کے بھی دل نشیں ہوگئی۔ وہ اچھل پڑے۔ رائے صاحب نے کہا کہ بس اب میدان مار لیا۔ اچھا ایسا کون سا پنڈت ہے؟ پنڈت گدادھر شرما؟

راجہ۔ ''جی نہیں۔ اسے کون مانتا ہے، صرف اخبارات میں لکھا کرتا ہے، شہر لوگ اسے کیا جانیں۔''

رائے صاحب۔ ''دمڑی اوجھا تو ہے اسی ڈھنگ کا؟''

راجہ صاحب۔ ''پنڈت موٹے رام شاستری؟''

راجہ ''بس بس، آپ نے خوب سوچا۔ بے شک وہ ہے اس ڈھنگ کا۔ اسی کو بلانا چاہیے۔ عالم ہے۔ دھرم کرم سے رہتا ہے۔ ہوشیار بھی ہے، وہ اگر ہاتھ میں آ جائے تو بازی ہماری ہے۔''

رائے صاحب نے فوراً پنڈت موٹے رام کے گھر پر پیغام بھیجا۔ اس وقت شاستری جی پوجا کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ پیغام پاتے ہی جلد پوجا ختم کی اور چل دیے۔

''راجہ صاحب نے بلایا ہے۔ دھنیہ بھاگ!'' اہلیہ سے بولے۔ ''آج چندر مال کچھ بلوان معلوم ہوتا ہے۔ کپڑے لاؤ۔ دیکھو کیوں بلایا ہے۔''

اہلیہ نے کہا۔ ''کھانا تیار ہے، کھاتے جاؤ۔ نہ جانے کب لوٹنے کا موقع ملے۔''

مگر شاستری جی نے آدمی کو اتنی دیر کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ جاڑے کے دن تھے۔ سبز بانات کیا اچکن پہنی۔ جس پر سرخ سنجاف تھی۔ گلے میں ایک زری کا دوپٹہ ڈالا۔ سر پر بنارسی صافہ باندھا۔ سرخ چوڑے کنارے ریشمی دھوتی پہنی اور کھڑاؤں پر چلے۔ ان کے چہرے پر رونق برستی تھی۔ دور سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مہاتما آ رہے ہیں۔ راستے میں کوئی ماتا سر جھکاتا۔ کتنے ہی دکان داروں نے کھڑے ہو کر پا لاگن کیا۔ آج کاشی کا نام انہی کی بدولت چل رہا ہے، ورنہ اور کون ہے؟ کتنے منکسر المزاج ہیں۔ لڑکوں سے ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ اس ٹھاٹ سے پنڈت جی راجہ کے مکان پر پہنچے۔ تینوں دوستوں نے کھڑے ہو کر ان

کی تعظیم کی۔ خاں صاحب بولے ''کہیے پنڈت جی، مزاج تو اچھے ہیں۔ واللہ! آپ نمائش میں رکھنے کے قابل آدمی ہیں۔ آپ کا وزن تو دس من سے کم نہ ہو گا۔''

رائے صاحب۔ ''ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ اسی قاعدے سے ایک من عقل کے لیے دس من کا جسم ضروری ہے۔ ورنہ اس کا بوجھ کون اٹھائے؟''

راجہ صاحب۔ ''آپ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ عقل ایک قسم کا نزلہ ہے۔ جب دماغ میں نہیں سماتی تو جسم میں آجاتی ہے۔''

خاں صاحب۔ ''میں نے بزرگوں کو زبانی سنا ہے کہ موٹے آدمی عقل کے دشمن ہوتے ہیں۔''

رائے صاحب۔ ''آپ کا حساب کمزور ہے، ورنہ آپ کی سمجھ میں اتنی بات ضرور آجاتی کہ جب عقل اور جسم میں ایک اور دس کی نسبت ہے تو جتنا ہی موٹا آدمی ہو گا اتنا ہی اس کی عقل کا وزن بھی زیادہ ہو گا۔''

راجہ صاحب۔ ''اس سے ثابت ہوا کہ جتنا ہی موٹا آدمی، اتنی ہی اس کی عقل موٹی۔''

موٹے رام۔ ''جب موٹی عقل کی بدولت راج دربار میں پوچھ ہوتی ہے تو مجھے پتلی عقل لے کر کیا کرنا چاہیے۔''

ہنسی مذاق کے بعد راجہ صاحب نے پنڈت جی کے سامنے موجودہ مسئلہ پیش کیا اور اس کے حل کی جو تدبیر سوچی تھی وہ بھی ظاہر کی۔ بولے ''بس یہ سمجھ لیجیے کہ

اس سال آپ کا مستقبل پورے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شاید کسی آدمی کو اپنی تقدیر کے فیصلہ کا ایسا اہم موقع نہ ملا ہوگا۔ ہڑتال نہ ہوئی تو اور کچھ نہیں کہہ سکتے مگر عمر بھر کسی کے دروازے پر جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بس ایسا کوئی برت ٹھانیے کہ شہر والے تھرا اٹھیں۔ کانگرس والوں نے مذہب کی آڑ لے کر اتنی طاقت بڑھائی ہے بس ایسی کوئی ترکیب نکالیے کہ مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔''

موٹے رام نے متانت سے جواب دیا۔ ''یہ کوئی کٹھن کام نہیں ہے۔ میں تو ایسے ایسے اپائے کر سکتا ہوں کہ آسمان سے پانی برسا دوں مری (ہیضہ) کو بھی دور کر دوں۔ اناج کا بھاؤ گھٹا بڑھا دوں۔ پھر کانگریس والوں کو ہرا دیا کوئی بڑی بات نہیں۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ کوئی نہیں کر سکتا مگر گپت (پوشیدہ) ودیاؤں کا انہیں گیان (علم) ہی نہیں۔''

خاں صاحب۔ ''تب تو یہ کہنا چاہیے جناب کہ آپ دوسرے خدا ہیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ آپ میں یہ قدرت ہے، ورنہ اتنے دنوں تک کیوں پریشان ہوئے۔''

موٹے رام۔ ''صاحب! میں چھپے دھن کا پتہ لگا سکتا ہوں۔ پتروں (آباؤ اجداد) کو بلا سکتا ہوں۔ صرف گن کا گاہک چاہیے، سنسار میں گن دانوں کی کمی نہیں ہے۔ گن کے پارکھیوں کی کمی ہے۔ گن نا ہرانو گن گاہک ہرانو ہے۔''

راجہ۔ ''بھلا اس انوشٹھان کے لیے آپ کو کیا بھینٹ کرنا ہوگا؟''

موٹے رام۔ ''جو آپ کی مرضی۔''

راجہ۔ ''کچھ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کونسا انوشٹھان ہوگا؟''

موٹے رام۔ ''بلا بھوجن کے برت کے سات منتروں کا جاپ ہوگا۔ سارے شہر میں ہلچل نہ مچادوں تو موٹے رام نہیں۔''

راجہ۔ ''تو پھر کب؟''

موٹے رام۔ ''آج ہی ہوسکتا ہے۔ ہاں پہلے دیوتاؤں کے آواہن (بلانے) کے لئے کچھ روپے دلا دیجیے۔''

روپیہ کی کمی کیا تھی۔ پنڈت جی کو روپے مل گئے اور وہ خوش خوش گھر آئے۔ بیوی سے سارا حال کہا۔ اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

''تم نے ناحق یہ روگ اپنے سر لیا۔ بھوک نہ سہہ سکے تو؟ سارے شہر میں بدنامی ہوجائے گی۔ لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ روپے لوٹا دو۔''

موٹے رام نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھوک کیسے نہ برداشت ہوگی؟ ایسا مورکھ تھوڑا ہی ہوں کہ یونہی جا بیٹھوں گا؟ پہلے میرے کھانے کا بندوبست کرو۔ امرتیاں، لڈو، رس گلے منگاؤ۔ پیٹ بھر کے کھالوں۔ پھر آدھ سیر ملائی کھاؤں گا۔ اس کے اوپر آدھ سیر بادام کی تہہ جماؤں گا۔ بچی کھچی کسر ملائی والے دہی سے پوری کرلوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ بھوک کیونکر پاس پھٹکتی ہے۔ تین دن تو سانس ہی نہ جاوے گی۔ بھوک کو کون چلاوے۔ اتنے میں تو سارے شہر میں کھلبلی مچ جاوے گی۔ بھاگ کا سورج اودے (طلوع) ہوا ہے۔ اس وقت آگا پیچھا کرنے سے پچھتانا پڑے گا۔ بازار نہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ مالا مال ہوجاؤں گا، ورنہ گانٹھ سے کیا جاتا ہے۔ سو روپے تو ہاتھ لگ گئے۔''

ادھر تو کھانے کا بندوبست ہوا۔ ادھر پنڈت موٹے رام نے منادی کرادی کہ

شام کے وقت ٹاؤن ہال کے میدان میں موٹے رام ملک کے سیاسی مسئلہ پر لیکچر دیں گے۔ پس لوگ ضرور آویں۔ پنڈت جی ہمیشہ سیاسی امور سے علیحدہ رہتے تھے۔ آج وہ انہی امور کے متعلق کچھ کہیں گے، سننا چاہیے۔ لوگوں کو شوق ہوا۔ پنڈت جی گھر سے بخوبی تیار ہو کر پہنچے۔ پیٹ اتنا بھرا ہوا تھا کہ چلنا مشکل تھا۔ جو نہ یہ وہاں پہنچے، حاضرین نے کھڑے ہو کر انہیں مودبانہ ڈنڈوت پرنام کیا۔

موٹے رام بولے۔ ''شہر والو، کاروباری لوگو، سیٹھو اور مہاجنو! میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے کانگریس والوں کے کہنے میں آ کر بڑے لاٹ صاحب کے یہاں آنے کے موقع پر ہڑتال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ کتنی بڑی نمک حرامی ہے، وہ چاہیں تو آج لوگوں کو توپ کے منہ پر اڑا دیں۔ سارے شہر کو کھدوا ڈالیں۔ راجا ہیں ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ وہ طرح دیے جاتے ہیں، تمہاری غریبی پر دیا کرتے ہیں اور تم گئوؤں کی طرح ہتیا کے بل پر کھیت چرنے کو تیار ہو۔ لاٹ صاحب چاہیں تو آج ریل بند کر دیئں مال کا آنا جانا بند کر دیں تب بتاؤ کیا کرو گے؟ تم ان سے بھاگ کر کہاں کر سکتے ہو؟ ہے کہیں ٹھکانا؟ اس لئے جب اس دیش میں اور انہی کے ماتحت رہنا ہے تو اتنا جھگڑا کیوں مچاتے ہو؟ یاد رکھو۔ تمہاری جان ان کی مٹھی میں ہے۔ طاعون کے کیڑے پھیلا دے تو سارے شہر میں تہلکہ مچ جاوے۔ تم جھاڑو سے آندھی کو روکنے چلے ہو۔ خبر دار جو کسی نے بازار بند کیا۔ نہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میں دانہ پانی بنا پران دے دوں گا۔''

ایک آدمی نے سوال کیا۔ ''مہاراج! آپ کے پران نکلتے تھے مہینے بھر سے کم نہ لگے گا۔ تین دن میں کیا ہوگا؟''

موٹے رام نے گرج کر کہا۔ ''پران بدن میں نہیں رہتا۔ برہمانڈ میں رہتا ہے میں چاہوں تو یوگ کر کے ابھی پران چھوڑ دوں۔ میں نے تمہیں چیتاونی دے دی۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ میرا کہنا مانو گے تو تمہارا کلیان ہوگا، نہ مانو گے تو ہتیا لگے گی۔ دنیا میں کبھی منہ نہ دکھا سکو گے۔ بس یہ لو، میں آسن جماتا ہوں۔''

شہر میں یہ خبر پھیلی تو لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ حکام کی اس نئی چال نے ان کو مبہوت سا کر دیا۔ کارکنانان کانگریس تو کہتے تھے کہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سرکاری بہی خواہوں نے کچھ دے دلا کر یہ سوانگ کھڑا کیا ہے۔ جب اور کوئی بس نہ چلا۔ فوج، پولیس، قانون، سبھی تدبیروں سے ہار گئے تو یہی نئی حکمت نکالی ہے۔ یہ اور کچھ نہیں سیاست کا دیوالہ ہے۔ ورنہ پنڈت جی ایسے کہاں کے ملکی خادم تھے، جو ملکی حالت سے غمگین ہو کر برت ٹھانتے۔ انہیں بھوکوں مرنے دو۔ دو دن میں بدل جائیں گے۔ اس نئی چال کی جڑ ابھی سے کاٹ دینی چاہیے کہیں یہ چال چل گئی تو سمجھ لو کہ حکام کے ہاتھ میں ایک نیا ہتھیار آ جائے گا۔ اور وہ ہمیشہ اس کا استعمال کریں گے۔ عام لوگ اتنے سمجھدار تو نہیں کہ ان چالوں کو سمجھیں۔ گیدڑ بھبکی میں آ جائیں گے۔

لیکن شہر کے بنیے مہاجن جو مذہبی معاملات میں عموماً ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ایسے گھبرا گئے کہ ان پر ان باتوں کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے صاحب! آپ لوگوں کے کہنے سے سرکار سے برے بنے، نقصان اٹھانے کو تیار ہوئے، کاروبار ترک کیا، کتنوں کے دیوانے نکل گئے۔ افسروں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ پہلے جہاں جاتے تھے، حکام لوگ آیئے سیٹھ جی کہہ کر عزت بخشتے تھے۔

اب ریل گاڑیوں میں دھکے کھا لیتے ہیں مگر کوئی نہیں سنتا۔ آمدنی چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔ بیہیوں کا وزن دیکھ کر ٹیکس بڑھا جاتا ہے۔ یہ سب سہا اور سہیں گے مگر دھرم کے معاملے میں آپ لوگوں کو کہنا نہیں مان سکتے۔ جب ایک وودان کلین اور ادھر کرم والا برہمن ہمارے اوپر دانہ پانی چھوڑ رہا ہے تب ہم کیونکر بھوجن کریں، اور پیر پھیلا کر سوئیں؟ کہیں مر گیا تو بھگوان کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

خلاصہ یہ ہے کہ کانگریس والوں کی ایک نہ چلی۔ بیوپاریوں کا ایک وفد رات کے نو بجے پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پنڈت جی نے آج کھانا تو خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔ لیکن اس طرح کھانا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مہینے میں عموماً بیس روزہ وہ ضرور مدعو ہوتے تھے اور دعوت میں شکم سیر ہو کر کھانا بالکل قدرتی بات ہے۔ اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی لاگ ڈانٹ کے دھن میں یا مالک کے انکسار آمیز اصرار سے اور سب سے زیادہ اشیائے خوردنی کی عمدگی کے سبب کھانا حد سے زیادہ ہو ہی جاتا ہے۔ پنڈت جی کی قوت ہاضمہ ایسے امتحانوں میں پاس ہوتی رہتی تھی۔ پس اس وقت کھانے کا وقت آجانے پر نیت ڈانوں ڈول ہو رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ بھوک سے بےقرار تھے۔ لیکن کھانے کا وقت آجانے سے اگر خوب پیٹ بھرا ہوا نہ ہو، بدہضمی نہ ہو گی، ہو تو دل میں ایک طرح کی کھانے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ شاستری جی کی اس وقت یہی حالت ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی خوانچے والے کو بلا کر کچھ لے لیتے۔ مگر حکام نے ان کی جسمانی حفاظت کے لیے وہاں کئی حکام کو تعینات کر دیا تھا۔ وہ سب ٹلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ پنڈت جی کی بڑی عقل اس وقت یہی مسئلہ حل کر رہی تھی کہ ان شیطانوں کو

کیسے ٹالوں؟ خواہ مخواہ پاجیوں کو یہاں کھڑا کر دیا۔ میں کوئی قیدی تو ہوں نہیں کہ بھاگ جاؤں گا۔

حکام نے شاید یہ انتظام اس لیے کر رکھا تھا کہ کانگرس والے جبراً پنڈت جی کو وہاں سے بھگانے کی کوشش نہ کریں۔ کون جانے کیا چال چلیں۔ کہیں کسی کتے ہی کو ان پر چھوڑ دیں، یا دور سے پتھر پھینکنے لگیں، ایسے نامناسب اور ہتک آمیز سلوکوں سے پنڈت جی کہنی کے بل لیٹے ہوئے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پیشوان وفد نے ان کے قدم چھو کر کہا۔

''مہاراج! ہمارے اوپر آپ نے کیوں کوپ (غصہ) کیا ہے۔ آپ کا جو حکم ہو ہمارے سر آنکھوں پر۔ آپ اٹھیے، کھانا پینا شروع کیجیے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ سچ مچ یہ برت ٹھاننے والے ہیں۔ نہیں تو ہم پہلے ہی آپ سے بنتی (عرض) کرتے۔ اب کرپا کیجیے۔ دس بجے کا وقت ہے۔ ہم آپ کی بات کبھی نہ ٹالیں گے۔'' یہ کانگریس والے تمہیں ملیا میٹ کر کے چھوڑیں گے۔ آپ تو ڈوبتے ہی ہیں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے بازار بند رہے گا تو اس سے تمہارا گھاٹا ہو گا۔ سرکار کو کیا۔ تم نوکری چھوڑ دو گے تو آپ بھوکے مرو گے، سرکار کو کیا۔ نہ جانے ان سبھوں کو کیا سنک سوار ہو گئی ہے۔ اپنی ناک کٹا کر دوسرں کا اسگن مناتے ہیں۔ تم ان برے لوگوں کے بہکانے میں نہ آؤ کیوں، دکانیں کھلی رکھو گے؟

سیٹھ۔ ''مہاراج! شہر بھر کے آدمیوں کی پنچایت نہ ہو جائے تب تک ہم کیسے اس کا ذمہ لے سکتے ہیں؟''

کانگرس والوں نے کہیں لوٹ مچا دی تو کون ہماری مدد کرے گا۔ آپ اٹھیے۔ بھوجن

کیجیے۔ہم کل پنچایت کر کے آپ کی خدمت میں جیسا کچھ ہوگا عرض کریں گے۔

موٹے رام۔''تو پھر پنچایت کر کے آنا۔''

ڈیپوٹیشن جب مایوس ہو کر لوٹنے لگا تو پنڈت جی نے کہا۔''کسی کے پاس سنگھی تو نہیں ہے؟''

ایک شخص نہ ڈبیہ نکال کر دی۔

(۴)

لوگوں کے چلے جانے موٹے رام نے پولیس والوں سے پوچھا۔''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

سپاہیوں نے کہا۔''صاحب کا حکم ہے، ہم کیا کریں؟''

موٹے رام۔''یہاں سے چلے جاؤ۔''

سپاہی۔''آپ کے کہنے سے چلے جائیں۔کل نوکری چھوٹ جائے گی تو آپ کھانے کو دیں گے؟''

موٹے رام۔''ہم کہتے ہیں چلے جاؤ۔نہیں تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ہم کوئی قیدی نہیں ہیں، جو تم گھیرے کھڑے ہو۔''

سپاہی۔''چلے کہاں جایئے گا؟ مجال ہے؟''

موٹے رام۔''مجال کیوں نہیں ہے بے کوئی جرم کیا ہے؟''

سپاہی۔''اچھا جاؤ تو دیکھیں؟''

پنڈت جی اپنے برہمنی رعب میں آ کر اٹھے اور ایک سپاہی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پر جا گرا۔

دوسرے سپاہیوں کی ہمت چھوٹ گئی۔ پنڈت جی کو ان سبھوں نے محض موٹا سمجھ لیا تھا۔ ان کی طاقت دیکھی تو چپکے سے چل دیے۔

موٹے رام اب لگے ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے کوئی خوانچہ والا نظر آ جائے تو اس سے کچھ لیں، مگر فوراً خیال آ گیا کہ اگر اس نے کسی سے کہہ دیا تو لوگ تالیاں بجانے لگیں گے۔ نہیں ایسی ہوشیاری سے کام کرنا چاہیے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایسے سنکٹ (تکلیف) کے موقعوں پر ہی تو بدھی کے بل کا پتہ چلتا ہے۔ ایک لمحہ میں انہوں نے اس مسئلے کو حل کر لیا۔

اتفاقاً اسی وقت ایک خوانچہ والا جاتا دکھائی دیا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ پنڈت جی نے آواز دی۔

"خوانچہ والے، او خوانچہ والے۔"

خوانچہ والا۔ "کہیے کیا دوں؟ بھوک لگ آئی نا۔ دانہ پانی چھوڑنا سادھوؤں کا کام ہے۔ ہمارا آپ کا کام نہیں۔"

موٹے رام۔ "ابے کیا بکتا ہے، یہاں کیا کسی سادھو سے کم ہیں؟ چاہیں تو مہینوں پڑے رہیں، اور بھوک پیاس نہ لگے تجھے تو صرف اس لئے بلایا ہے کہ ذرا اپنی کپی (چراغ) مجھے دے دے۔ دیکھوں تو وہاں کیا رینگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں سانپ نہ ہو۔"

خوانچہ والا نے چراغ اتار کر دے دیا۔ پنڈت جی اسے لے کر ادھر ادھر زمین

پر کچھ کھوجنے لگے کہ اتنے میں چراغ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور بجھ گیا۔ پنڈت جی نے اسے ایک ٹھوکر لگائی کہ بچا کچھا تیل بھی بہہ جائے۔

خوانچہ والا۔ (چراغ ہلا کر) ''مہاراج!'' اس میں تو ذرا بھی تیل نہ بچا۔ اب تک چار پیسے کا سودا بیچتا۔ آپ نے یہ کھڑاگ بڑھا دیا۔

موٹے رام۔ ''بھیا ہاتھ ہی تو ہے، چھوٹ پڑا تو اب کیا میں ہاتھ کاٹ ڈالوں۔ لو پیسے، جا کر کہیں سے تیل ڈلوا لو۔''

خوانچہ والا۔ (پیسے لے کر) ''تو اب تیل لے کر یہاں تھوڑے آؤں گا۔''

موٹے رام۔ ''خوانچہ رکھ جاؤ۔ لپک کر تھوڑا تیل لے لو، نہیں تو مجھے سانپ کاٹ لے گا۔ تمہیں ہی ہتیا لگے گی۔ کوئی جانور ہے ضرور۔ دیکھو وہ رینگتا ہے۔ غائب ہو گیا۔ دوڑ جاؤ پٹھے تیل لیتے آؤ۔ میں تمہارا خوانچہ دیکھتا رہوں گا۔ ڈرتے ہو تو اپنے روپے پیسے لیتے جاؤ۔''

خوانچہ والا بڑے شش و پنج میں پڑا۔ خوانچہ سے پیسے نکالتا ہے تو خوف ہے کہ پنڈت جی اپنے دل میں برا نہ منائیں۔ سوچیں کہ مجھے بے ایمان سمجھ رہا ہے۔ چھوڑ کر جاتا ہے تو کون جانے کہ ان کی نیت کیا ہو۔ آخر اس نے طے کیا کہ خوانچہ نہیں چھوڑ دوں، جو کچھ تقدیر میں ہوگا وہی ہوگا۔

وہ ادھر بازار کی طرف چلا۔ ادھر پنڈت جی نے خوانچہ پر نگاہ ڈالی۔ مٹھائی بہت کم بچ رہی تھی۔ پانچ چھ چیزیں تھیں، مگر کسی میں سے دو عدد سے زیادہ نکالنے کی گنجائش نہ تھی۔ بھانڈا پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ پنڈت جی نے سوچا۔ گناہ صرف اتنے سے کیا ہوگا۔ بھوک اور تیز ہو جائے گی۔ شیر کے منہ میں خون لگ

جائے گا۔ گناہ بے لذت ہے۔ اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ لیکن دم بھر بعد پیاس نے پھر زور کیا، سوچا کہ کچھ تو ڈھارس ہو ہی جائے گی۔ کھانا کتنا ہی کم نہ ہو پھر بھی کھانا ہی ہے۔ اٹھے اور مٹھائی نکالی۔ مگر پہلا ہی لڈو منہ میں رکھا تھا کہ دیکھا خوانچہ والا کپی جلائے قدم بڑھاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ اس کے آنے کے قبل مٹھائی کا ختم ہونا ضروری تھا۔ ایک ساتھ دو چیزیں اور منہ میں ڈالیں اور ادھر کچلی ہی نکل گئے۔ ابھی چھ اور تھیں اور خوانچہ والا تھا پھاٹک تک آ گیا تھا۔ سب کی سب مٹھائی منہ میں ڈال لی۔ اب نگلتے بنتا ہے نہ اگلتے۔ اور وہ شیطان موڑ کی طرح کپتی چمکاتا چلا ہی آتا ہے۔ جب وہ بالکل سامنے آ گیا تو پنڈت جی نے جلدی سے ساری مٹھائی نگل لی مگر آخر آدمی ہی تھے، کوئی مگر گھڑیال تو تھے نہیں۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ گلا پھنس گیا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ زور سے کھانسنے لگے۔ خوانچہ والے نے کپتی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لیجیے، دیکھ لیجیے، چلے تو ہیں آپ اپاس (فاقہ) کرنے، مگر جان کا اتنا ڈر ہے۔ آپ کو کیا پروا جان بھی نکل جائے گی تو سرکار بال بچوں کی پروتی (پرورش) کرے گی۔''

پنڈت جی کو غصہ آیا کہ اس پاجی کو کھوٹی کھری سنا دیں، مگر گلے سے آواز نہ نکلی۔ کپتی چپکے سے لے لی۔ اور جھوٹ موٹ ادھ ادھر دیکھ کر لوٹا دی۔

خوانچہ والا۔ ''آپ کو کیا پڑی تھی جو چلے سرکار کا پچھ (طرفداری) کرنے۔ کہیں کل دن پر پنچایت ہو گی تب رات تک جا کر کچھ طے ہو گا۔ تب تک تو آپ کی آنکھوں میں تتلیاں اڑانے لگیں گی۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور پنڈت جی تھوڑی دیر تک کھانسنے کے بعد سو رہے۔

(۵)

دوسرے دن سویرے ہی سے بیوپاریوں نے صلاح مشورہ شروع کیا۔ ادھر کانگریس والوں میں بھی ہلچل مچی، امن سبھا کے عہدیداروں نے بھی کان کھڑے کیے۔ یہ تو ان بھولے بھالے بنیوں کو دھمکانے کی اچھی ترکیب ہاتھ آئی۔ یہ پنڈت سماج نے الگ الگ سبھا کی، اوراس میں یہ طے کیا کہ پنڈت موٹے رام کو سیاسی معاملات میں پڑنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق۔ غرض سارا دن اسی بحث مباحثہ میں گزر گیا اور کسی نے پنڈت جی کی خبر نہ لی۔ لوگ علانیہ کہتے تھے کہ پنڈت جی نے ایک ہزار روپے سرکار سے لے کر یہ نوشٹھان کیا ہے۔

بیچارے پنڈت جی نے رات لوٹ کر کاٹی۔ مگر اٹھے تو بدن مردہ سا معلوم ہوتا تھا۔ کھڑے ہوتے تھے تو آنکھیں تلملانے لگتی تھیں، سر میں چکر آ جاتا تھا۔ پیٹ میں جیسے کوئی بیٹھا ہوا کریدرہا ہوی۔ سڑک کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ لوگ منانے تو نہیں آ رہے ہیں۔ پوجا پاٹ کا وقت اسی انتظار میں گزر گیا۔ اس وقت پوجا کے بعد روز ناشتہ کیا کرتے تھے۔ آج ابھی منہ میں پانی بھی نہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ شبھ گھڑی کب آئے گی۔ پھر پنڈتائن پر غصہ آنے لگا۔ آپ تو رات پیٹ بھر کر کھا کر سوئی ہوگی۔ اس وقت بھی جل پان (ناشتہ) کر ہی چکی ہوگی۔ مگر ادھر بھول کر بھی نہ جھانکا کہ مرے یا جیے ہیں۔ کچھ بات کرنے ہی کے بہانے سے کیا تھوڑا سا موہن بھوگ بنا کر نہ لا سکتی تھی۔ مگر کسے اتنی فکر ہے۔ روپیہ لے کر رکھ لیا۔

پھر جو کچھ ملے گا اسے بھی لے کر رکھ لے گی۔ مجھے اچھا الو بنایا۔

قصہ کوتاہ، پنڈت جی نے تمام دن انتظار کیا، مگر کوئی منانے والا نظر نہ آیا۔ لوگوں کے دل میں جو شبہ پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی نے کچھ لے دے کر یہ سوانگ بھرا ہے۔ محض اپنی خودغرضی کے سبب سے ڈھلملا کھڑا کیا ہے، وہی ان کو منانے میں عارض ہوتا تھا۔

(۶)

رات کے نو بج گئے تھے۔ سیٹھ بھوندومل نے جو بیوپاری کے پیشوا تھے۔ تیقن آمیز لہجے میں کہا۔

''مان لیا پنڈت جی نے کسی لالچ سے یہ برت کیا ہے مگر اس سے وہ تکلیف تو کم نہیں ہوسکتی، جو دانہ پانی کے بغیر ہر جان دار کو ہوتی ہے۔ یہ دھرم کے خلاف ہے کہ ایک برہمن ہمارے اوپر دانہ پانی چھوڑ دے اور ہم پیٹ بھر بھر کر چین کی نیند سوئیں۔ اگر انہوں نے دھرم کے خلاف کام کیا ہے تو اس کا ڈنڈا انہی کو بھوگنا پڑے گا۔ ہم کیوں اپنے فرض سے منہ موڑیں۔''

کانگریس کیسکریٹری نے دبے لہجہ میں کہا۔ ''مجھے تو خود کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ آپ لوگ سماج کے پیشوا ہیں، جو فیصلہ کریں منظور ہے۔ چلیے، میں بھی آپ کے ساتھ چلا چلوں گا۔ دھرم کا کچھ حصہ مجھے بھی مل جائے گا۔ مگر ایک عرض سن لیجیے۔ آپ لوگ پہلے مجھے وہاں جانے دیجیے۔ میں تنہائی میں ان سے دس منٹ باتیں

کرنا چاہتا ہوں، آپ لوگ پھاٹک پر کھڑے رہیے گا۔ جب میں وہاں سے لوٹ آؤں تو پھر جایے، ہولی۔''

اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ عرض قبول ہوئی۔

سیکرٹری صاحب پولیس کے محکمہ میں بہت روز رہ چکے تھے۔ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، وہ سیدھے بازار گئے اور پانچ روپے کی مٹھائی خریدی۔ اس میں انداز سے زیادہ خوشبو ڈالنے کا بندوبست کیا۔ نقرئی ورق لگوائے اور ایک دونے میں لئے ہوئے روٹھے برہمن دیوتا کی پوجا کرنے چلے۔ ایک مٹی کی صراحی میں ٹھنڈا پانی لیا اور اس میں عرق کیوڑا ملایا۔ دونوں چیزوں سے تیز خوشبو آ رہی تھی۔ خوشبو میں کتنی محرک قوت ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ اس سے بلا بھوک کے بھوک لگتی ہے۔ پھر بھوکے آدمی کی بات ہی کیا ہے۔

پنڈت جی اس وقت بدحواس زمین پر پڑے تھے۔ رات کو کچھ نہیں ملا۔ دس پانچ چھوٹی چھوٹی مٹھائیوں کا کیا شمار۔ دوپہر کو کچھ نہیں ملا، اور اس وقت بھی کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ بھوک میں اب امید کی بیتابی نہیں مایوسی کا سکون تھا۔ سارے اعضا سست ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھیں بھی نہ کھلتی تھیں۔ انہیں کھولنے کی بار بار کوشش کرتے مگر خود بخود بند ہو جاتیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت تھی تو بس ان کا آہستہ آہستہ کراہنا۔ ایسی سخت مصیبت ان پر کبھی نہ پڑی تھی۔ بدہضمی کی شکایت تو انہیں مہینے میں دو چار بار ہو جاتی تھی۔ جسے وہ ہرڑ وغیرہ کی پھنکیوں سے دور کر لیا کرتے تھے۔ مگر بدہضمی میں ایسا کبھی نہ ہوا کہ انہوں نے غذا ترک کر دی ہو۔ اہالیانِ شہر کو، امن سبھا کو، سرکار کو، کانگرس کو اور اپنی اہلیہ کو جی بھر کو

کوس چکے تھے۔ کسی سے کوئی امید نہ تھی۔ اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ خود کھڑے ہو کر بازار جاسکیں۔ یقین ہو گیا کہ آج رات کو جان ضرور نکل جائے گی۔ زندگی کا دھاگا کوئی رسی تو ہے نہیں کہ چاہے جتنے جھٹکے دو، ٹوٹنے کا نام نہ لے۔

سیکرٹری نے پکارا۔ شاستری جی!

موٹے رام نے پڑے پڑے آنکھیں کھول دیں، ان میں دردِ غم بھرا ہوا تھا جیسے کسی لڑکے کے ہاتھ سے کوئی مٹھائی لے گیا ہو۔

سیکرٹری نے دونے کی مٹھائی سامنے رکھ دی اور صراحی پر مٹی کا آبخورا رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر بولے۔

''یہاں کب تک پڑے رہیے گا۔''

خوشبو نے پنڈت جی کے حواس پر امرت کا کام کیا۔ پنڈت جی اٹھ بیٹھے اور بولے۔ ''دیکھو کب تک فیصلہ ہوتا ہے۔''

سیکرٹری نے کہا۔ ''یہاں کچھ فیصلہ وغیرہ نہ ہوگا۔ آج دن بھر پنچایت ہوا کی، لیکن کچھ طے نہ ہوا۔ کل کہیں شام کو لاٹ صاحب آویں گے اس وقت تک تو نہ جانے آپ کی کیا حالت ہو گی۔ آپ کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔''

موٹے رام۔ ''یہیں مرنا بدا ہو گا تو کون ٹال سکتا ہے۔ اس دونے میں قلاقند ہے کیا؟''

سیکرٹری ''ہاں طرح طرح کی مٹھائیاں ہیں۔ ایک رشتے دار کے یہاں باین بھیجنے کو خاص طور پر تیار کرائی ہیں۔''

موٹے رام۔ ''جبھی تو ان میں اتنی خوشبو ہے۔ دونا کھولیے تو۔''

سیکرٹری نے مسکرا کر دونا کھول دیا۔ پنڈت جی آنکھوں سے مٹھائیاں کھانے لگے۔ اندھا آنکھیں پا کر بھی دنیا کو ایسی ہراس نگاہوں سے نہ دیکھے گا۔ منہ میں پانی بھر آیا۔

سیکرٹری نے کہا:

"آپ کا برت نہ ہوتا تو دو چار مٹھائیاں آپ کو چکھاتا۔ پانچ روپے سیر کے دام دیے ہیں۔"

موٹے رام۔ "تب تو بہت بڑھیا ہوں گی۔ میں نے بہت دن ہوئے قلاقند نہیں کھائی۔"

سیکرٹری "آپ نے بھی تو بیٹھے بٹھائے جھنجھٹ مول لے لیا۔ جان ہی نہ رہے گی تو روپیہ کس کام آئے گا؟"

موٹے رام "کیا کروں۔ پھنس گیا۔ میں اتنی مٹھائیوں کا جل پان کر جاتا تھا (ہاتھ سے مٹھائیوں کو ٹٹول کر) بھولا کی دکان کی ہوں گی۔"

سیکرٹری "چکھیے دو چار۔"

موٹے رام "کیا چکھوں۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہوں۔"

سیکرٹری "اجی چکھیے بھی۔ اس وقت جو آنند ملے گا، وہ لاکھ روپے میں بھی نہیں مل سکتا۔ کوئی کسی سے کہنے جاتا ہے کیا؟"

موٹے رام "مجھے ڈر کس کا ہے میں یہاں دانہ پانی بنا مر رہا ہوں اور کسی کو پروا ہی نہیں ہے تو پھر مجھے کیا ڈر۔ لاؤ ادھر دونا لاؤ۔ جاؤ سب سے کہہ دینا کہ شاستری نے برت توڑ دیا۔ بھاڑ میں جائے، بازار اور بیوپار۔ یہاں کسی کی پروا نہیں جب

کسی میں دھرم نہیں رہا، تو میں نے ہی، دھرم کا بیڑا تھوڑے ہی اٹھایا ہے۔''

یہ کہہ کر پنڈت جی نے دونا اپنی طرف کھینچ لیا اور لگے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ میں نصف دونا ختم ہو گیا۔ سیٹھ لوگ آ کر پھاٹک پر کھڑے تھے۔

سیکرٹری نے جا کر کہا۔

''ذرا تماشا دیکھیے۔ آپ لوگوں کو نہ بازار کھولنا پڑے گا، نہ خوشامد کرنی پڑے گی۔ میں نے ساری مشکلیں حل کر دیں۔ یہ کانگرس کا اقبال ہے۔''

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لوگوں نے آ کر دیکھا کہ پنڈت جی مٹھائی ٹھکانے لگانے میں ویسے ہی محو ہیں جیسے کوئی مہاتما سمادھی میں محو ہو۔

بھوندو مل نے کہا۔

''پنڈت جی کے چرن چھوتا ہوں۔ ہم لوگ تو آ ہی رہے تھے۔ آپ نے جلدی کیوں کی۔ ایسی ترکیب بتاتے کہ آپ کا برت بھی نہ ٹوٹتا اور کام بھی پورا ہو جاتا۔''

موٹے رام۔ ''میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ سرگ کا آنند ہے جو دھن کے ڈھیروں سے نہیں مل سکتا۔ اگر کچھ شردھا (اعتقاد) ہو تو اسی دکان کی اتنی مٹھائی اور منگوا دو۔''

---

[1] ہم یہ کہنا بھول گئے کہ سیکرٹری صاحب کے میدان میں آتے وقت پولیس کے سپاہی کو دینے پڑے تھے یہ خلاف قاعدہ تھا لیکن سیکرٹری نے اس بات پر اڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

راہِ نجات

پہلی بار: ہندی میں ''مکتی مارگ کے عنوان سے ''وشال بھارت'' اپریل ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت: اردو میں ۱۹۲۹ء (فردوس خیال)

سپاہی کو اپنی لال پگڑی پر، عورت کو اپنے گہنوں پر، اور طبیب کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے مریضوں پر جو ناز ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگر اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا تو اس پر نشہ چھا جاتا ہے۔ تین بیگھے زمین تھی۔ اس کے چھ سو تو آپ ہی مل جائیں گے، اور جو کہیں بھگوان نے ڈنڈی تیز کر دی۔ (مراد رخ سے) تو پھر کیا پوچھنا، دونوں بیل بوڑھے ہو گئے۔ اب کی نئی گوئیں بیٹسر کے میلہ سے لے کر آوے گا۔ کہیں دو بیگھے کھیت اور مل گئے تو لکھا لے لگا۔ روپیوں کی کیا فکر ہے، بنئے ابھی سے خوشامد کرنے لگتے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جس سے اس نے گاؤں میں لڑائی نہ کی ہو۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔

یاک روز شام کے وقت وہ اپنے بیٹے کو گود میں لئے مٹر کی پھلیاں توڑ رہا تھا۔ اتنے میں اس کو بھیڑوں ایک جھنڈ اپنی طرف آتا دکھائی دیا، وہ اپنے دل میں کہنے لگا، ادھر سے بھیڑوں کے نکلنے کا راستہ نہ تھا کیا کھیت کی مینڈ پر سے بھیڑوں کا جھنڈ نہیں جا سکتا تھا؟ بھیڑوں کو ادھر سے لانے کی کیا ضرورت؟ یہ کھیت کو کچلیں گی؟ چریں گی؟ اس کا دام کون دے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بدھو گڈریا ہے بچہ کو گھمنڈ

ہو گیا ہے جبھی تو کھیتوں کے بیچ میں سے بھیڑیں لیے جا رہا ہے۔ ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ دیکھ رہا ہے کہ میں کھڑا ہوں اور پھر بھی بھیڑوں کو لوٹاتا نہیں۔ کون میرے ساتھ کبھی سلوک کیا ہے کہ میں اس کی مرمت کروں۔ ابھی ایک بھیڑا مول مانگوں تو پانچ ہی روپے سنا دے گا۔ ساری دنیا میں چار روپے کے کمبل ملتے ہیں پر یہ پانچ روپے سے کم بات نہیں کرتا۔

اتنے میں بھیڑیں کھیت کے پاس آ گئیں۔ جھینگر نے للکار کر کہا ارے یہ بھیڑیں کہاں لیے آتے ہو۔ کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں؟

بدھو۔ انکسار سے بولا۔ مہتو۔ ڈانڈ پر سے نکل جائیں گی گھوم کر جاؤں گا تو کوس بھر کا چکر پڑے گا۔ جھینگر: تو تمہارا چکر بچانے کے لیے میں اپنا کھیت کیوں کچلاؤں ڈانڈ ہی پر سے لے جاتا ہے تو اور کھیتوں کے ڈانڈے سے کیوں نے لے گئے؟ کیا مجھے کوئی چمار بھنگی سمجھ لیا ہے یا روپیہ کا گھمنڈ ہو گیا ہے، لوٹاؤ ان کو۔
بدھو: مہتو آج نکل جانے دو۔ پھر کبھی ادھر سے آؤں تو جو ڈنڈ (سزا) چاہے دینا۔

جھینگر۔ کہہ دیا کہ لوٹاؤ انہیں۔ اگر ایک بھیڑ بھی مینڈ پر چڑھ آئی تمہاری کسل نہیں۔ بدھو۔ مہتو، اگر تمہاری ایک بیل بھی کسی بھیڑ کے پیروں کے نیچے آ جائے تو مجھے بیٹھا کر سو گالیاں دینا۔

بدھو باتیں تو بڑی لجاجت سے کر رہا تھا۔ مگر لوٹنے میں اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ اس نے دل مین سوچا کہ اسی طرح ذرا ذرا سی دھمکیوں پر بھیڑوں کو لوٹانے لگا تو پھر میں بھیڑیں چرا چکا آج لوٹ جاؤں گا تو کل کو کہیں نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے گا۔ سبھی رعب جمانے لگیں گے۔

بدھو بھی گھر کا مضبوط آدمی تھا۔ بارہ کوڑی بھیڑیں تھیں۔ انہیں کھیتوں میں بٹھانے کے لئے فی شب ۸ کوڑی مزدوری ملتی تھی۔ اس کے علاوہ دودھ بھی فروخت کرتا تھا۔ اون کے کمبل بناتا تھا۔ سوچنے لگا یہ اتنے گرم ہو رہے ہیں۔ میرا کر ہی کیا لیں گے؟ کچھ ان کا بیل تو ہوں نہیں بھیڑوں نے جو ہری ہری پتیاں دیکھیں تو بے کل ہو گئیں۔ کھیت میں گھس پڑیں۔ بدھو انہیں ڈنڈوں سے مار مار کر کھیت کنارے سے ہٹاتا تھا۔ اور وہ ادھر ادھر سے نکل کر کھیت میں جا گھستی تھی۔

جھینگر نے گرم ہو کر کہا۔ تم مجھے ہیکڑی جتانے چلے ہو تو تمہاری ہیکڑی بھلا دوں گا۔

بدھو۔ تمہیں دیکھ کر بھڑکتی ہیں، تم ہٹ جاؤ تو میں سب نکال لے جاؤں۔

جھینگر نے لڑکے کو گودی سے اتار دیا اور اپنا ڈنڈا سنبھال کر بھیڑوں کے سر پر گیا۔ دھوبی بھی اتنی بے دردی سے اپنے گدھوں کو نہ مارتا ہوگا کسی بھیڑ کی ٹانگ ٹوٹی کسی کی کمر ٹوٹی۔ سب نے زور سے ممیانا شروع کیا۔ بدھو خاموش کھڑا ہوا اپنی فوج کی تباہی، اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا وہ نہ بھیڑوں کو ہانکتا تھا، اور نہ جھینگر سے کچھ کہتا تھا۔ بس کھڑا ہوا تماشا دیکھتا رہا............ دو منٹ میں جھینگر نے اس فوج کو اپنی حوانی طاقت سے مار بھگایا۔ بھیڑوں کی فوج کو تباہ کر کے فاتحانہ غرور سے بولا۔ اب سیدھے چلے جاؤ، پھر ادھر سے آنے کا نام نہ لینا۔

بدھو نے چوٹ کھائی ہوئی بھیڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جھینگر تم نے یہ اچھا کام نہیں کیا پچھتاؤ گے۔

کیلے کا کاٹنا بھی اتنا آسان نہیں، جتنا کسان سے بدلا لینا۔ ان کی ساری کمائی کھیتوں میں رہتی ہے یا کھلیانوں میں۔ کتنی ارضی وسماوی آفات کے بعد اناج گھر

میں آتا ہے۔ اور جو کہیں آفات کے ساتھ عداوت نے میل کر لیا تو بے چارہ کسان کہیں کا نہیں رہتا۔ جھینگر نے گھر آ کر اور لوگوں سے اس لڑائی کا حال کہا تو لوگ سمجھانے لگے۔ ''جھینگر''، تم نے بڑا برا کیا۔ جان کر انجان بنتے ہو۔ بدھو کو جانتے نہیں کہ کتنا جھگڑالو آدمی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، جا کر اسے منا لو نہیں تو تمہارے ساتھ گاؤں پر آفت آ جائے گی جھینگر کے سمجھ میں بات آئی، پچھتانے لگا کہ میں نے کہاں سے کہاں اسے روکا۔ اگر بھیڑیں تھوڑا بہت چر ہی جاتیں تو کون میں اجڑا جاتا تھا۔ اصل میں ہم کسانوں کا بھلا دب کر رہنے ہی میں ہے، بھگوان کو بھی ہمارا سر اٹھا کر چلنا اچھا نہیں لگتا۔'' جی تو بدھو کے یہاں جانے کو نہ چاہتا تھا مگر دوسروں کے اصرار سے مجبور ہو کر چلا۔ اگہن کا مہینہ تھا۔ کہرا پڑ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ یکایک اپنے اکھ کے کھیت کی طرف آگ کے شعلے دیکھ کر چونک پڑا دل دھڑ کنے لگا۔ کھیت میں آگ لگی ہوئی تھی بے تحاشا دوڑا۔ مناتا جاتا تھا کہ میرے کھیت میں نہ ہو۔ مگر جیوں جیوں قریب پہنچتا تھا یہ پر امید وہم دور ہوتا جاتا تھا۔ وہ غضب ہی ہو گیا جیسے روکنے کے لیے وہ گھر سے چلا تھا۔ ہتھیارے نے آگ لگا دی اور میرے پیچھے سارے گاؤں کو چوپٹ کر دیا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھیت آج بہت قریب آ گیا ہے گویا درمیان کے پرتی کھیتوں کا وجود ہی نہیں رہا۔ آخر جب وہ کھیت پر پہنچا تو آگ خوب بھڑک چکی تھی۔ جھینگر نے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ گاؤں کے لوگ دوڑ پڑے اور کھیتوں سے ارہر کے پودے اکھاڑ کر آگ کو پیٹنے لگے۔ انسان و آتش کی باہمی جنگ کا منظر پیش ہو گیا۔ ایک پہر تک کہرام برپا رہا۔ کبھی

ایک فریق غالب آتا، کبھی دوسرا۔ آتشی جانباز مرکرجی اٹھتے تھے اور دوگنی طاقت سے لڑائی میں مستعد ہوکر ہتھیار چلانے لگتے تھے۔ انسانی فوج میں جس سپاہی کی مستعدی سب سے زیادہ روشن تھی وہ بدھو تھا۔ بدھو کمر تک دھوتی چڑھائے اور جان کو ہتھیلی پر رکھے آگ کے شعلوں میں کود پڑتا تھا اور دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے بال بال بچ کر نکل آتا تھا۔ بالآخر انسانی فوج فتح یاب ہوئی مگر ایسی فتح جس پر شکست بھی خندہ زن تھی گاؤں بھر کی اکھ جل کر راکھ ہوگئی اور اکھ کے ساتھ ساری تمنائیں بھی جل گئیں۔''

آگ کس نے لگائی یہ کھلا ہوا راز تھا، مگر کسی کو کہنے کی ہمت نہ تھی کوئی ثبوت نہیں اور بلا ثبوت کے بحث کی وقعت ہی کیا؟ جھینگر کو گھر سے نکلنا محال ہوگیا۔ جدھر جاتا طعن و تشنیع کی بوچھار ہوتی۔ لوگ علانیہ کہتے کہ یہ آگ تم نے لگوائی تمہیں نے ہمارا ستیا ناس کیا۔ تمہیں مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہ رکھتے تھے۔ آپ کے آپ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں بھر کو بھی لے ڈوبے بدھو کو نہ چھیڑتے تو آج کیوں یہ دن دیکھنا پڑتا۔ جھینگر کو اپنی بربادی کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا ان پرجلی کٹی باتوں کا۔ تمام دن گھر میں بیٹھا رہتا۔ پوس کا مہینہ آیا۔ جہاں ساری رات کولہو چلا کرتے تھے وہاں سناٹا تھا۔ جاڑوں کے سبب لوگ شام ہی سے کواڑ بند کرکے پڑے رہتے اور جھینگر کو کوستے تھے۔ راکھ اور بھی تکلیف دہ تھا۔ اکھ صرف دولت دینے والی نہیں بلکہ کسانوں کیلئے زندگی بخش بھی ہے اسی کے سہارے کسانوں کا جاڑا پار ہوتا ہے۔ گرم رس پیتے ہیں، اکھ کی پتیاں جلاتے ہیں اور اس کے اگوڑے جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ گاؤں کے سارے کتے جورات کو بھٹیوں کی

راکھ میں سویا کرتے تھے سردی سے مر گئے۔ کتنے ہی جانور چارے کی قلت سے ختم ہو گئے۔ سردی کی زیادتی ہوئی اور کل گاؤں کھانسی بخار میں مبتلا ہو گیا اور یہ ساری مصیبت جھینگر کی کرنی تھی۔

جھینگر نے سوچتے ہوئے قصد کر لیا کہ بدھو کی حالت بھی اپنی ہی سی بناؤں گا اس کارن میں میرا ستیاناس ہو گیا، اور وہ چین کی بانسری بجارہا ہے اس کا ستیاناس کر دوں گا۔

جس روز اس مہلک عناد کی ابتدا ہوئی اسی روز سے بدھو نے اس طرف آنا ترک کر دیا تھا۔ جھینگر نے اس سے ربط وضبط بڑھانا شروع کیا۔ وہ بدھو کو دکھلانا چاہتا تھا کہ تم پر مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے۔ ایک روز کمبل لینے کے بہانے گیا، پھر دودھ لینے کے بہانے جانے لگا۔ بدھواس کی خوب آؤبھگت کرتا۔ چلم تو آدمی دشمن کو بھی پلا دیتا ہے، وہ اسے بلا دودھ اور شربت پلائے نہ جانے دیتا۔ جھینگر آج کل ایک سن لپٹنے والی مشین میں مزدوری کرنے جایا کرتا تھا۔ اکثر کئی روز کی اجرت یکجائی ملتی تھی۔ بدھو ہی کی مدد سے جھینگر کا روزانہ خرچ چلتا تھا۔ بس جھینگر نے خواب میل جول پیدا کر لیا۔ ایک روز بدھو نے پوچھا۔ کیوں جھینگر، اگر اپنی ایکھ جلانے والے کو پاجاؤ تو کیا کرو؟ سچ کہنا۔

جھینگر نے متانت سے کہا۔ میں اس سے کہوں کہ بھیا، اس نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ میرا گھمنڈ تو توڑ دیا مجھے آدمی بنا دیا۔

بدھو۔ میں جو تمہاری جگہ ہوتا تو اس کا گھر جلائے بغیر نہ مانتا۔

جھینگر۔ چار دن کی جندگانی میں بیر بڑھانے سے کون فائدہ؟ میں تو بربادی

ہوا، اب اسے برباد کر کے کیا پاؤں گا؟

بدھو۔ بس یہی تو آدمی کا دھرم ہے۔ مگر بھائی کرودھ (غصہ) کے بس میں ہو کر بدھی الٹی ہو جاتی ہے۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ کسان اکھ بونے کے لیے کھیتوں کو تیار کر رہے تھے۔ بدھو کا بازار گرم تھا۔ بھیڑوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دو چار آدمی روزانہ دروازہ پر کھڑے خوشامد کیا کرتے۔ بدھو کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا بھیڑ بٹھانے کی اجرت دوگنی کر دی تھی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو بے لاگ کہتا۔ ’’بھیا‘‘ بھیڑیں تمہارے گلے تو نہیں لگاتا ہوں۔ جی نہ چاہے تو نہ بٹھلاؤ لیکن میں نے جو کہہ دیا ہے اس سے ایک کوڑی بھی کم نہیں ہو سکتی۔ غرض تھی لوگ اس کی بے مروتی پر بھی اسے گھیرے ہی رہتے تھے۔ جیسے پنڈت کسی جاتری کے پیچھے پڑے ہوں۔

لکشمی کا جسم تو بہت بڑا نہیں اور وہ بھی وقت کے مطابق چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ حتی کہ کبھی وہ اپنی قد و قامت کو سمیٹ کر چند کاغذی الفاظ ہی چھپا لیتی ہے، کبھی کبھی تو وہ انسان کی زبان پر جا بیٹھتی ہے، جسم غائب ہو جاتا ہے۔ مگر ان کے رہنے کے لیے وسیع جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آئیں اور گھر بڑھنے لگا چھوٹے چھوٹے مکان میں ان سے نہیں رہا جاتا۔ بدھو کا گھر بھی بڑھنے لگا۔ دروازہ برآمدے کی تعمیر ہوئی، دو کی جگہ چھ کوٹھریاں بنوائی گئیں۔ یوں کہیے کہ مکان از نو سر نو بننے لگا۔ کسی کسان سے لکڑی مانگی کسی سے کھپریل کا آنوا لگانے کے لیے اپلے، کسی سے بانس اور کسی کے سرکنڈے۔ دیوار بنانے کی اجرت دینی پڑی۔ وہ بھی نقد نہیں، بھیڑ کے بچوں کی شکل میں لکشمی کا یہ اقبال ہے، سارا کام بیگار میں ہو گیا،

مفت میں اچھا خاصا مکان تیار ہو گیا داخلہ کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ادھر جھینگر دن بھر مزدوری کرتا تو کہیں آدھا پیٹ اناج ملتا۔ بدھو کے گھر میں کنچن برس رہا تھا۔ جھینگر جلتا تھا تو کیا برا کرتا تھا؟ یہ انیائے کس سے سہا جائے گا۔

ایک روز وہ ٹہلتا ہوا چماروں کے ٹولے کی طرف چلا گیا۔ ہری ہر کو پکارا ہری ہر نے آ کر رام رام کی اور چلم بھری، دونوں پینے لگے۔ یہ چماروں کا مکھیا بڑا بدمعاش آدمی تھا۔ سب کسان اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔

جھینگر نے چلم پیتے پیتے کہا۔ آج کل بھاگ واگ نہیں ہوتا کیا؟ کہو، تمہاری آج کل کیسی کٹتی ہے؟

جھینگر۔ کیا کٹتی ہے۔ نکٹا جیا برے حال؟ دن بھر کارخانے میں مجوری کرتے ہیں تو چولھا جلتا ہے۔ چاندی تو آج کل بدھو کی ہے۔ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ نیا گھر بنا۔ بھیڑیں اور لی ہیں۔ اب گرہ پرویش (داخلہ مکان) کی دھوم ہے۔ ساتوں گاؤں میں نیوتنے کی سپاری جائے گی۔

ہری ہر چھمی میا آتی ہیں تو آدمی کی آنکھوں میں سیل (مروت) آ جاتی ہے۔ مگر اس کو دیکھو دھرتی پر پاؤں نہیں دھرتا۔ بولتا تو اینٹھ کر بولتا ہے۔

جھینگر کیوں نہ اینٹھے؟ اس گاؤں میں کون ہے اس کے ٹکر کا؟ پر یار یہ انیائے تو نہیں دیکھا جاتا۔ جب بھگوان دیں تو سر جھکا کر چلنا چاہیے یہ نہیں کہ اپنے برابر کسی کو سمجھے ہی نہیں۔ اس کی مونگ سنتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ کل کا بانی آج سیٹھ چلا ہے ہمیں سے اکڑنے ابھی کل لنگوٹی لگائے کھیتوں میں کوے ہانکا کرتا تھا، آج اس کا آسمان میں دیا جلتا ہے۔

ہری ہر۔کہوتو جوگ جاگ کروں۔

جھینگر۔کیا کروگے؟اسی ڈر سے تو وہ گائے بھینس نہیں پالتا۔

ہری ہر۔بھیڑیں تو ہیں۔

جھینگر۔کیا بگلا مارے پکھنا ہاتھ۔

ہری ہر۔پھرتمہیں سوچو۔

جھینگر۔ایسی جگت نکالو کہ پھر پنپنے نہ پائے۔

اس کے بعد دونوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے،بدی میں اتنی ہی رقبت۔عالم عالم کو دیکھ کر،سادھو سادھو کو دیکھ کر،شاعر شاعر کو دیکھ کر جلتا ہے۔ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔مگر جواری جواری کو دیکھ کر،شرابی شرابی کو دیکھ کر،چور چور کو دیکھ کر،ہمدردی جتاتا ہے،مدد کرتا ہے۔ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی انہیں اٹھانے کے بجائے دو دھوکریں اور لگائے کہ وہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں،مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ کر لیتا ہے۔بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اس لیے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے۔نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے،اس لیے نیکوں میں مخالف ہوتی ہے۔چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟نفرت عالم کی توہین کرکے عالم کیا پائے گا؟نیک نامی۔

جھینگر اور ہری ہر نے صلاح کر لی۔سازش کی تدبیر سوچی گئی اس کا نقشہ،وقت اور طریقہ طے کیا گیا۔جھینگر چلا تو اکڑا جاتا تھا۔مار لیا دشمن کو۔اب کہاں جاتا ہے۔

دوسرے روز جھینگر کام پر جانے لگا تو پہلے بدھو کے گھر پہنچا۔ بدھو نے پوچھا کیوں آج نہیں گئے کیا؟ جھینگر۔ جا تو رہا ہوں، تم سے یہی کہنے آیا تھا کہ میری بچھیا کو اپنی بھیڑوں کے ساتھ کیوں نہیں چرا دیا کرتے؟ بے چاری کھونٹے پر بندھی مری جاتی ہے۔ ''نہ گھاس، نہ چارا کیا کھلا دیں؟''

بدھو: بھیا میں گائے بھینس نہیں رکھتا۔ چماروں کو جانتے ہوں یہ ایک ہی ہتھیارے ہوتے ہیں۔ اسی ہری ہر نے میری دو گائیں مار ڈالیں، نہ جانے کیا کھلا دیتا ہے۔ تب سے کان پکڑے کہ اب گائے بھینس نہ پالوں گا۔ لیکن تمہاری ایک ہی بچھیا ہے اس کا کوئی کیا کرے گا؟ جب چاہو پہنچا دو۔

یہ کہہ کر بدھو اپنے مکان والی دعوت کا سامان اسے دکھانے لگا۔ گھی، شکر، میدہ، ترکاری سب منگا کر رکھا تھا۔ صرف ست نرائن کی کتھا کی دیر تھی۔ جھینگر کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسی تیاری نہ اس نے خود کبھی کی تھی اور نہ کسی کو کرتے دیکھی تھی مزدوری کر گھر کو لوٹا تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنی بچھیا کو بدھو کے گھر پہنچانا تھا۔ اسی رات کو بدھو کے یہاں ست نرائن کی کتھا ہوئی ''وبرمہ بھوج'' بھی کیا گیا، ساری رات برہمنوں کی تواضع وتکریم میں گزری بھیڑوں کے گلہ میں جانے کا موقع ہی نہ ملا علی الصبح کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا (کیوں کہ رات کا کھانا صبح ملا) کہ ایک آدمی نے آ کر خبر دی۔ بدھو تم یہاں بیٹھے ہو ادھر بھیڑوں میں بچھیا مری پڑی ہے بھلے آدمی اس کی پگھیا بھی نہیں کھولی تھی۔

بدھو نے سنا اور گویا ٹھوکر لگ گئی۔ جھینگر بھی کھانا کھا کر وہیں بیٹھا تھا۔ بولا ہائے میری بچھیا۔ چلو ذرا دیکھوں تو، میں نے تو پگھیا نہیں لگائی تھی۔ اسے بھیڑوں میں

پہنچا کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تم نے یہ پگھیا کب لگا دی۔

بدھو۔ بھگوان جانے جو میں نے اس کی پھگیا دیکھی ہو، تو تب سے بھیڑوں میں گیا ہی نہیں۔

جھینگر۔ جاتے نہ تو پگھیا کون لگا دیتا؟ گئے ہو گئے، یاد نہ آتی ہو گی۔

ایک برہمن۔ مری تو بھیڑوں ہی میں یا؟ دنیا تو یہی کہے گی کہ بدھو کی غفلت سے اس کی موت ہوئی چاہے پگھیا کسی کی ہو۔

ہری ہر۔ میں نے کل سانجھ کو انہیں بھیڑوں میں بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا۔

بدھو۔ مجھے؟

ہری ہر۔ تم نہیں لاٹھی کندھے پر رکھے بچھیا کو باندھ رہے تھے؟

بدھو۔ بڑا سچا ہے تو۔ تو نے مجھے بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا؟

ہری ہر۔ تو مجھ پر کاہے کو بگڑتے ہو بھائی؟ تم نے نہیں باندھی تو نہیں سہی۔

برہمن۔ اس کا نشچے کرنا ہو گا گو ہتھیا کو پراشچت کرنا پڑے گا، کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے۔

جھینگر۔ مہاراج، کچھ جان بوجھ کر تو باندھی نہیں۔

برہمن۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہتھیا اسی طرح لگتی ہے کوئی گئو کو مارنے نہیں جاتا۔

جھینگر۔ ہاں۔ گئوؤں کو کھولنا باندھنا ہے تو جوکھم کا کام۔

برہمن شاستروں میں اسے مہا پاپ کہا ہے۔ گئو کی ہتھیا برہمن کی ہتھیا سے کم نہیں۔

جھینگر۔ہاں، پھر گئوتو ٹھہری ہی اسی سے نہ ان کا مان (اور) ہے۔ جو ماتا سو گئو ہے۔لیکن مہاراج۔چوک ہوگئی۔کچھ ایسا کیجیے کہ بے چارہ تھوڑے ہی نپٹ جائے۔

بدھو کھڑا سن رہا تھا کہ خواہ مخواہ میرے سر گو ہتھیا کا الزام تھوپا جا رہا ہے۔جھینگر کی چالاکی کی بھی سمجھ رہا تھا، میں لاکھ کہوں کہ میں نے بچھیا نہیں باندھی پر مانے گا کون؟لوگ یہی کہیں گے کہ پراشچت سے بچنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

برہمن دیوتا کا بھی اس کے پراشچت کرانے میں فائدہ تھا۔بھلا ایسے موقع پر کب چوکنے والے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ بدھو کو ہتھیا لگ گئی۔برہمن بھی اس سے جل رہے تھے۔کسر نکالنے کا موقع ملا۔تین ماہ تک بھیک مانگنے کی سزا دی گئی۔پھر سات تیرتھوں کی جاترا، اس پر پانچ سو برہمنوں کا کھلانا اور پانچ گایوں کا دان۔ بدھو نے سنا تو ہوش اڑ گئے۔رونے پیٹنے لگا۔تو سزا گھٹا کر دو ماہ کر دی۔اس کے سوا کوئی رعایت نہ ہوسکی۔نہ کہیں اپیل، نہ کہیں فریاد۔بے چارے کو یہ سزا قبول کرنی پڑی۔

بدھو نے بھیڑیں۔ایشور کو سونپیں۔لڑکے چھوٹے تھے۔عورت اکیلی کیا کرتی۔غریب جا کر دروازوں پر کھڑا ہوتا اور منہ چھپاتے ہوئے کہتا گائے کی باچھی دیو بن باس ''بھیک تو مل جاتی مگر بھیک کے ساتھ دو چار سخت اور توہین آمیز فقرے بھی سننے پڑتے۔دن کو کچھ پاتا اسی کو شام کے وقت کسی درخت کے نیچے پکا کر کھالیتا اور وہیں رہتا۔تکلیف کی تو اس کو پروا نہ تھی، بھیڑوں کے ساتھ تمام دن چلتا ہی تھا، درخت کے نیچے سوتا ہی تھا، کھانا بھی اس سے کچھ بہتر ہی ملتا تھا مگر شرم

بھی بھیک مانگنے کی خصوصاً جب کوئی بدمزاج عورت یہ طعنے دیتی کہ روٹی کمانے کا اچھا ڈھنگ نکالا ہے، تو اسے دلی قلق ہوتا تھا مگر کرے کیا۔

دو ماہ بعد وہ گھر واپس آیا۔ بال بڑھے ہوئے تھے، کمزور اس قدر کہ گویا ساٹھ سال کا بوڑھا ہو۔ تیرتھ جانے کے لیے روپیوں کا بندوبست کرنا تھا۔ گڈریوں کو کون مہاجن قرض دے۔ بھیڑوں کا بھروسہ کیا؟ کبھی کبھی وبا پھیلتی ہے تو رات بھر میں گلہ کا گلہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس پر جیٹھ کا مہینہ جب بھیڑوں سے کوئی آمدنی ہونے کی امید نہیں، ایک تیلی راضی بھی ہوا تو ۲ فی روپیہ سود آٹھ ماہ میں سود اصل کے برابر ہو جائے گا۔ یہاں قرض لینے کی ہمت نہ پڑی۔ اور دو مہینوں میں کتنی ہی بھیڑیں چوری چلی گئیں۔ لڑکے چرانے لے جاتے تھے دوسرے گاؤں والے چپکے سے دو ایک بھیڑیں کسی کھیت یا گھر میں چھپا دیتے اور بعد کو مار کر کھا جاتے، لگے بے چارے ایک تو نہ پکڑ سکتے اور جو کچھ بھی لیتے تو لڑیں کیسے؟ سارا گاؤں ایک ہو جاتا تھا۔ ایک ماہ میں بھیڑیں آدھی بھی نہ رہ جائیں گی۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ مجبوراً بدھو نے ایک قصاب کو بلایا اور سب بھیڑیں اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں، پانچ سو روپے ہے ان میں سے دو سو لے کر وہ تیرتھ یاترا کرنے گیا۔ بقیہ روپیہ برمہہ بھوج کے لئے چھوڑ گیا۔''

بدھو کے جانے پر اس کے مکان میں دوبارہ نقب ہوتے مگر یہ خیریت ہوئی کہ جاگ پڑنے کی وجہ سے روپے بچ گئے۔

ساون کا مہینہ تھا چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگر کے بیل نہ تھے، کھیت بٹائی پر دے دیے تھے۔ بدھو پراشچت سے فارغ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ

ہی مایا کے پھندے سے بھی آزادی ہو گیا تھا۔ نہ جھینگر کے پاس کچھ تھا، نہ بدھو کے پاس۔ کون کس سے جلتا اور کس لیے جلتا؟

سن کی کل بند ہو جانے کے سب جھینگر بیلداری کا کام کرتا تھا۔ شہر میں ایک بڑا دھرم شالہ بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام کرتے تھے جھینگر بھی انہیں میں تھا۔

ساتویں روز مزدوری کے پیسے لے کر گھر آتا تھا، اور رات بھر رہ کر سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

بدھو بھی مزدوری کی تلاش میں یہیں پہنچا۔ جمعدار نے دیکھا کہ کمزور آدمی ہے، سخت کام تو اس سے ہو نہ سکے گا۔ کری گروں کا گارا پہنچانے کے لیے رکھ لیا، بدھو سر پر طاش رکھے گارا لینے گیا تو جھینگر کو دیکھا۔ رام رام ہوئی۔ جھینگر نے گارا بھر دیا۔ بدھو نے اٹھا لیا۔ دن بھر دونوں اپنا کام کرتے رہے۔

شام کو جھینگر نے پوچھا۔ کچھ بناؤ گے نا؟

بدھو۔ نہیں تو کھاؤں گا کیا؟

جھینگر۔ میں تو ایک جون جینا کر لیتا ہوں۔ اس جوں ستو کھاتا ہوں۔ کون جھنجھٹ کرے؟

بدھو۔ ادھر ادھر لکڑیاں پڑی ہوتی ہیں۔ بٹور لاؤ۔ آٹا گھر سے لیتا آیا ہوں گھر ہی میں پسوا لیا تھا۔ یہاں تو بڑا مہنگا ملتا ہے۔ اسی پتھر والی چٹان پر آٹا گوندھے لیتا ہوں۔ تم تو میرا بنایا کھاؤ گے نہیں۔ اس لیے تم روٹیاں سینکو میں روٹیاں بناتا جاؤں گا۔

جھینگر۔ توا بھی نہیں ہے۔

بدھو۔ تو بہت ہیں یہ گارے کا تسلہ مانجے لیتا ہوں۔

آگ جلی، آٹا گوندھا گیا جھینگر نے کچی پکی روٹیاں تیار کیں۔ بدھو پانی لایا۔ دونوں نے نمک مرچ کے ساتھ روٹیاں کھائیں۔ پھر چلم بھری گی دونوں پتھر کی سلوں پر لیٹے اور چلم پینے لگے۔

بدھو نے کہا۔ تمہاری اوکھ میں آگ میں نے لگائی تھی۔

جھینگر نے مذاق آمیز لہجہ میں کہا۔ جانتا ہوں۔

ذرا دیر بعد جھینگر بولا۔ بچھیا میں نے ہی باندھی تھی اور ہری ہر نے اسے کچھ کھلا دیا تھا بدھو نے بھی اسی لہجہ میں کہا جانتا ہوں۔

پھر دونوں سو گئے۔

عفو

پہلی بار ہندی میں ''چھما'' کے عنوان سے ''مادھوی''

جون ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اردو میں ''زمانہ'' مئی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: ۱۹۲۹ء (فردوس خیال) اور ۱۹۳۰ء (پریم چالیسی، دوم)

مسلمانوں کی اسپین پر حکومت کرتے ہوئے کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ کلیساؤں کی جگہ مسجدیں بنتی جاتی تھیں۔ گھنٹوں کی جگہ اذان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ غرناطہ اور الحمرہ میں زمانہ کی چندہ روزہ حالت پر ہنسنے والے محل بن چکے تھے۔ جن کے کھنڈر اب تک تماش بینوں کو اپنی شانِ ماضیہ کی جھلک دکھاتے ہیں۔ معزز عیسائی مرد، عورت حضرت مسیح کا آستانہ چھوڑ کر اسلامی اخوت میں شامل ہوتے جاتے تھے اور آج تک مورخوں کے لیے یہ امر باعث حیرت ہے کہ عیسائیوں کا نام ونشان وہاں کیوں کر باقی رہا۔ جو عیسائی لیڈر اب تک مسلمانوں کے آگے سر نہ جھکاتے تھے اور اپنے ملک میں سوراج قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے ان میں ایک سوداگر داؤد بھی تھا۔ داؤد عالم اور بہادر تھا۔ وہ اپنے علاقہ میں اسلام کو قدم نہ جمانے دیتا تھا۔ غریب اور مفلس عیسائی باقی صوبہ جات سے آکر پناہ گزیں ہوئے تھے اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان کی پرورش کرتا تھا مسلمان لوگ داؤد سے خائف رہتے تھے۔ وہ مذہبی طاقت سے اس پر فتح نہ پاکر اس کو ہتھیاروں کی طاقت سے مغلوب کرنا چاہتے تھے مگر داؤد کبھی ان کا مقابل نہ کرتا البتہ وہ جہاں کہیں عیسائیوں کے مسلمان ہونے کی خبر پاتا وہاں ہوا کی طرح

جا پہنچتا اور بحث یا التجا سے انہیں اپنے مذہب پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیتا۔

بالآخر مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اس کو گرفتار کرنے کی تیاری کی۔ فوج نے اس کے علاقے کو محصور کر لیا۔ داؤد کو جاں بری کے لیے اپنے متعلقین کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ وہ گھر سے بھاگ غرناطہ میں آیا، جو ان دنوں اسلامی دارالسلطنت تھا۔ وہاں سب سے علیحدہ رہ کر بھلے دنوں کے انتظار میں زندگی بسر کرنے لگا۔ مخبر اس کا سراغ لگانے کے لیے بہت سر مارتے پھرتے تھے۔ اس کی گرفتاری کے لیے انعامات کثیر مشتہر کیے جاتے تھے۔ مگر داؤد کا پتہ نہ چلتا۔

(۲)

ایک روز تنہائی سے اکتا کر داؤد غرناطے کے ایک باغ میں سیر کرنے چلا گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ مسلمان لمبی عبائیں پہنے بڑے بڑے عمامے پر باندھ کمر میں تلوار لٹکائے، روشوں پر ٹہل رہے تھے۔ عورتیں سفید برقعہ ڈالے زری کی جوتیاں پہنے بنچوں اور کرسیوں پر متمکن تھیں۔ داؤد سب سے الگ ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ مبارک دن کب آئے گا جب ہمارا وطن ان ظالموں کے پنجہ سے چھٹکارا پا جائے گا۔ وہ گزرے ہوئے زمانہ کا پھر خیال کر رہا تھا، جب عیسائی عورت مرد ان روشوں پر ٹہلتے ہوں گے اور جب یہ مقام عیسائیوں کی باہمی خوش گفتاریوں کی ان کی چہل پہل سے گلزار ہو رہا ہو گا۔

دفعتاً ایک نوجوان مسلمان آ کر داؤد کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے سر سے پیر

تک حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا ''کیا ابھی تمہارا دل اسلامی نور سے منور نہیں ہوا۔''

داؤد نے متانت سے کہا ''اسلام کا نور پہاڑ کی چوٹیوں کو منور کر سکتا ہے، تاریک گھاٹیوں میں اس کا گزر نہیں ہو سکتا۔''

اس مسلمان عربی کا نام جمال تھا، یہ بات وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

داؤد: ''اس سے میرا مطلب یہی ہے کہ عیسائیوں میں جو لوگ مرتبہ والے ہیں وہ جاگیر اور اقتدار کے لالچ اور سزا کے خوف سے اسلام کی پناہ لے سکتے ہیں مگر کمزور اور غریب عیسائیوں کے لیے اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے خدمت کے سہارے نہیں۔''

جمال اپنے مذہب کی توہین سن کر تلملا اٹھا، گرم ہو کر بولا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسلام کی طاقت اس کی اندرونی اخوت اور مساوات ہے، تلوار نہیں۔

داؤد۔ اسلام نے مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا ہے اس میں اس کی مسجدیں غرق ہو جائیں گی۔

جمال: تلوار نے ہمیشہ سچائی کی حفاظت کی ہے۔

داؤد نے اسی استقلال کے لہجے میں ''جس کو تلوار کا سہارا لینا پڑے وہ سچائی ہی نہیں۔''

جمال قومی غرور سے دیوانہ ہو کر بولا۔ ''جب تک جھوٹ کے ماننے والے رہیں گے اس وقت تک تلوار کی ضرورت بھی رہے گی۔''

داؤد: تلوار کا منہ تا کنے والی سچائی ہی چھوٹی ہے۔

عرب نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا، خدا کی قسم! اگر تم بلا ہتھیار کے نہ ہوتے تو تمہیں اسلام کی توہین کرنے کا مزا چکھا دیتا۔

داؤد نے اپنے سینے میں چھپی ہوئی کٹار کو نکال کر کہا "نہیں میں غیر مسلح نہیں ہوں۔ مسلمانوں کا جس روز اتنا اعتبار کروں گا اس روز عیسائی نہ رہوں گا۔ تم اپنے دل کے حوصلے نکال لو۔"

دونوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ عرب کی بھاری تلوار عیسائی کی ہلکی کٹار کے سامنے ست پڑ گئی۔ ایک سانپ کی طرح پھن سے چوٹ کرتی تھی تو دوسری ناگن کی طرح اڑتی۔ ایک لہروں کی طرح لپکتی تھی، دوسری پانی کی مچھلیوں کی طرح چمکتی تھی۔ دونوں بہادروں میں کچھ دیر تک وار ہوتے رہے۔ دفعتاً ایک بار ناگن اچھل کر عرب کے کلیجے میں جا پہنچی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

(۳)

جمال کے گرتے ہی لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ اور داؤد کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے۔ داؤد نے دیکھا کہ لوگ تلوار لیے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ جان لے کر بھاگا۔ مگر جدھر جاتا تھا، سامنے باغ کی دیوار راستہ میں حائل ہو جاتی۔ دیوار بلند تھی، اسے پھاندنا مشکل تھا۔ یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی کہیں

پناہ کی امید نہیں۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں۔ ادھر عربوں کی خون کی پاس لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ یہ صرف ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش نہ تھی۔ قومی ہتک کا انتقام مقصود تھا۔ ایک مفتوح عیسائی کی یہ ہمت کہ عرب پر ہاتھ اٹھائے۔ ایسا اندھیر!۔

جس طرح تعاقب کرنے والے کتوں کے سامنے گلہری ادھر ادھر دوڑتی ہے۔ کسی درخت پر چڑھنے کی بار بار کوشش کرتی ہے، مگر ہاتھ پیر پھول جانے کی وجہ سے بار بار گر پڑتی ہے وہی حالت داؤد کی بھی تھی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا دم پھول گیا۔ پیر من من بھر کے ہو گئے۔ کئی بار دل میں آیا کہ ان سب پر ٹوٹ پڑے اور جان جتنی مہنگی فروخت ہو سکے اتنی مہنگی فروخت کرے، مگر دشمنوں کی تعداد دیکھ کر حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔ لینا، دوڑنا، پکڑنا کا شور برپا تھا۔ کبھی کبھی پیچھا کرنے والے اتنے قریب آ جاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ اب لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ وہ تلوار پڑی مگر پیروں کی ایک ہی حرکت ایک ہی گردش اسے خون کی پیاسی تلواروں سے بال بال بچا لیتی تھی۔

داؤد کو اب لڑائی میں کھلاڑیوں کا سا لطف آنے لگا۔ یہ یقینی تھا کہ اس کی جان نہیں بچ سکتی۔ مسلمانوں رحم کرنا نہیں جانتے اس لیے اپنے داؤں پیچوں میں مزہ آ رہا تھا۔ کسی وار سے بچ کر اب اسے یہ خوشی نہ ہوتی تھی کہ اس کی جان بچ گئی، بلکہ یہ خیال مسرت بخش تھا کہ اس نے قاتل کو کیسا زچ کیا۔

دفعتاً اسے اپنے داہنے جانب کے باغ کی دیوار کچھ نیچے نظر آئی۔ آہ، یہ دیکھتے ہی اس کے پیروں میں ایک نئی طاقت عود کر آئی۔ رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا۔ وہ ہرن کی طرح اس طرف دوڑا۔ اور ایک جست میں باغ کے اس

پار پہنچ گیا۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا پیچھے موت تھی اور آگے زندگی کی وسیع فضا جہاں تک نظر جاتی تھی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ داؤد ایک سل کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔

دم بھر میں تعاقب کرنے والے بھی وہاں آ پہنچے اور ادھر ادھر جھاڑیوں میں گڑھوں میں سلوں کے نیچے تلاش کرنے لگے۔ ایک عرب اسی چٹان پر کھڑا ہو گیا جس کے نیچے داؤد چھپا ہوا تھا۔ داؤد کا دل دھڑک رہا تھا کہ اب جان گئی۔ عرب نے ذرا نیچے جھانکا اور زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اتفاق، صرف اتفاق پر اب اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ داؤد نے سانس روک لی۔ بالکل ساکت ہو گیا۔ ایک نگاہ پر اس کی زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی اور موت میں کتنی قربت ہے۔

مگر عربوں کو اتنی فرصت کہاں تھی وہ ہوشیاری سے سلوں کے نیچے دیکھتے۔ وہاں تو قاتل کو پکڑنے کی عجلت تھی۔ داؤد کے سر سے آئی بلا ٹل گئی وہ ادھر ادھر دیکھ بھال کر آگے بڑھ گئے۔

(۴)

اندھیرا ہو گیا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے اور ستاروں کے ساتھ داؤد بھی چٹان کے نیچے سے نکلا لیکن دیکھا تو اس وقت ہلچل مچی ہوئی ہے۔ دشمنوں کی جماعت مشعلیں لیے جھاڑیوں میں گھوم رہی ہے۔ ناکہ ناکہ پر پہرہ ہے۔ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں ہے، داؤد ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر سوچنے لگا

کہ اب کیوں کر جان بچے۔ اپنی جان کی ایسی پروا نہ تھی زندگی کے سکھ دکھ سب اٹھا چکا تھا۔ اگر اسے زندگی کی تمنا تھی تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ لڑائی انجام کیا ہو گا۔ میرے ہم وطن پست ہمت ہو جائیں گے یا مستقل ارادہ کے ساتھ میدانِ جنگ میں اڑے رہیں گے۔

جب رات زیادہ ہو گئی اور دشمنوں کی خونخوار مساعی میں کچھ کمی نظر آئی تو داؤد خدا کا نام لے کر جھاڑیوں سے نکلا اور دبے پاؤں درختوں کے آڑ میں آدمیوں کی نظر بچاتا ہوا ایک طرف کو روانہ ہوا۔ وہ ان جھاڑیوں سے نکل کر آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ویرانی کسی کی آڑ نہیں سکتی بستی کی گھنی آبادی خود ہی ایک آڑ ہے۔

کچھ دور تک داؤد کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوئی، جنگلی درختوں نے اس کی حفاظت کی۔ مگر جب وہ ناہموار زمین سے نکل کر ہموار زمین پر آیا تو ایک عرب کی نگاہ اس پر گئی۔ اس نے للکارا۔ داؤد بھاگا۔ ''قاتل بھاگا جاتا ہے۔'' یہ آواز ہوا میں ایک ہی بار گونجی کہ ایک لمحہ میں عربوں نے چاروں طرف سے اس کا تعاقب کیا، سامنے بہت دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ بہت فاصلہ پر ایک دھندلا سا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں، وہ اس چراغ کی طرف اس تیزی سے دوڑ رہا تھا گویا وہاں پہنچتے ہی امان پا جائے گا۔ امید اسے اڑائے لئے جا رہی تھی۔ عربوں کا گروہ پیچھے رہ گیا۔ مشعلوں کی روشنی ماند پڑ گئی، دوڑتے چلے آتے تھے۔ بالآخر وہ پرامید چراغ سامنے آ گیا۔ ایک چھوٹا سا پھونس کا جھونپڑا تھا۔ ایک بوڑھا عرب زمین پر بیٹھا ہوا رحل پر قرآن رکھے اسی چراغ کی دھندلی روشنی میں پڑھ رہا تھا داؤد آگے نہ جا سکا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ

بے دم ہوکر گر پڑا۔ راستہ کی تکان گھر پہنچنے پر محسوس ہوتی ہے۔

عرب نے اٹھ کر پوچھا: ''تو کون ہے؟''

داؤد: ''ایک غریب عیسائی، مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں، اب آپ ہی پناہ دیں تو میری جان بچ سکتی ہے۔''

عرب: ''خدائے پاک تیری مدد کرے گا۔ تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے؟''

داؤد: ''خوف ہے کہ کہہ دوں تو کہیں آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہ ہو جائیں۔''

عرب: ''جب تو نے میری پناہ لے لی تو تجھ کو مجھ سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ ہم مسلمان ہیں، جسے ایک بار اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، اس کی تمام عمر حفاظت کرتے ہیں۔''

داؤد: ''میں نے ایک مسلمان نوجوان کا خون کر ڈالا ہے۔''

بوڑھے عرب کا چہرہ تمتما اٹھا بولا اس کا نام؟

داؤد: ''اس کا نام جمال تھا۔''

عرب سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ چہرے پر غیر معمولی اضطراب کی جھلک نظر آئی نتھنے پھڑکنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں سخت جدوجہد ہو رہی ہے اور وہ پورے غور وخوض سے کام لے کر اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دو تین منٹ تک وہ اسی اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاکتا رہا، آخر اس کے روندھے ہوئے حلق سے یہ الفاظ نکلے ''نہیں نہیں۔'' پناہ لینے والے کی حفاظت کرنی ہی

پڑے گی، او ظالم، تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میں اسی نوجوان کا بدنصیب باپ ہوں جسے آج تو نے اتنی بے رحمی سے قتل کیا ہے، تو جانتا ہے تو نے مجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟ تو نے میرے خاندان کا نشان مٹا دیا۔ میرا چراغ گل کر دیا۔ آہ، جمال میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری ساری تمناؤں کا اسی پر انحصار تھا۔ وہی میری آنکھوں کا نور تھا۔ مجھ اندھے کی لاٹھی' میری زندگی کا سہارا' میرے نحیف جسم کی جان تھا۔ ابھی ابھی اسے قبر کی گود میں لیٹا کر آیا ہوں۔ آہ، میرا شیر آج خاک کے نیچے سو رہا ہے، ایسا دلیر، ایسا دین دل، ایسا خوش رو جوان میری قوم میں دوسرا نہ تھا۔ ظالم تجھے اس پر تلوار چلاتے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ تیرا پتھر دل ذرا بھی نہ پسیجا۔ تو جانتا ہے کہ مجھے اس وقت تجھ پر کتنا غصہ آ رہا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تیری گردن پکڑ کر اس طرح دباؤں کہ تیری زبان باہر نکل پڑے۔ تیری آنکھیں کوڑیوں کی طرح نکل کر گر پڑیں۔ مگر نہیں تو نے میری پناہ لی ہے، فرض میرے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہے۔ کیونکہ ہمارے رسولِ پاکؐ نے ہدایت کی ہے کہ جو اپنی پناہ میں آوے اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، میں نہیں چاہتا کہ نبی کے حکم کے خلاف چل کر دنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی بگاڑوں۔ دنیا تو نے بگاڑی، دین اپنے ہاتھوں بگاڑوں گا نہیں! ضبط مشکل ہے مگر ضبط کروں گا تاکہ نبی کے سامنے آنکھیں نہ نیچی کرنی پڑیں۔ آ گھر میں آ۔ تیرا پیچھا کرنے والے وہ دوڑے آ رہے ہیں تجھے دیکھ لیں گے تو پھر ساری منت و سماجت تیری جان نہ بچا سکے گی تو نہیں جانتا کہ عرب لوگ خون کبھی معاف نہیں کرتے۔

یہ کہہ کر عرب نے داؤد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھر میں لے جا کر ایک کوٹھڑی

میں چھپا دیا۔ وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ عرب کی ایک جماعت اس کے دروازے پر آ پہنچی۔

ایک شخص نے پوچھا: تم نے ادھر سے کسی کو بھاگتے دیکھا ہے؟

ہاں۔ دیکھا ہے۔

اسے پکڑ کیوں نہ لیا؟ وہی تو جمال کا قاتل ہے۔

یہ جان کر بھی میں نے اس کو چھوڑ دیا۔

ایں، غضب اللہ کا یہ تم نے کیا کیا؟ جمال حشر کے روز ہمارا دامن پکڑے گا تو ہم کیا جواب دیں گے؟

تم کہہ دینا کہ تمہارے باپ نے تمہارے قاتل کو معاف کر دیا۔

عرب نے کبھی قاتل کو معاف نہیں کیا۔

یہ تمہاری ذمہ داری ہے، میں اسے اپنے سر کیوں لوں؟

عربوں نے شیخ حسن سے زیادہ حجت نہ کی، وہ قاتل کی تلاش میں دوڑے شیخ حسن پھر چٹائی پر بیٹھ کر قرآن پڑھنے لگا۔ لیکن اس کا دل پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ دشمن سے بدلہ لینے کی خواہش عربوں کی جبلی خاصیت تھی خون کا بدلہ خون تھا۔ اس لیے خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، شہر کے شہر ویران ہو جاتے تھے۔ اس بدلہ کی خواہش پر فتح پانا شیخ حسن کے لیے ناممکن سا معلوم ہوتا تھا، بار بار پیارے بیٹے کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ بار بار اس کے دل میں زبردست تحریک ہوتی تھی کہ داؤد کے خون سے اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کروں۔ عرب بہادر ہوتے تھے، کٹنا، مرنا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ مرنے

والے کے لیے وہ آنسوؤں کے چند قطرے بہا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔وہ مردہ کی یاد کو صرف ایسی حالت میں تازہ رکھتے تھے جب اس کے خون کا بدلہ لینا ہوتا تھا۔آخر شیخ حسن بے قرار ہوا تھا۔اسے اندیشہ ہوا کہ اب میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا۔اس نے تلوار نیام سے باہر کر لی اور دبے پاؤں اس کوٹھری کے دروازے پر جا کھڑا ہو گیا، جس میں داؤد چھپا ہوا تھا۔تلوار کو دامن میں چھپا کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔داؤد ٹہل رہا تھا۔بوڑھے عرب کا غضب ناک چہرہ دیکھ کر داؤد اس کے ارادے کو تاڑ گیا۔اسے بوڑھے سے ہمدردی ہو گئی۔اس نے سوچا یہ مذہب کا قصور نہیں، قوم کا قصور نہیں، میرے لڑکے کو کسی نے قتل کر دیا ہوتا تو شاید میں بھی اس کے خون کا پیاس ہو جاتا۔یہی انسانی خاصہ ہے۔

عرب نے کہا: داؤد تمہیں معلوم ہے کہ بیٹے کی موت کا کتنا غم ہوتا ہے؟

داؤد: اس کا تجربہ تو نہیں ہے، مگر اندازہ کر سکتا ہوں۔اگر میری جان سے آپ کے اس غم کا ایک حصہ بھی کم ہو سکے تو لیجیے یہ سر حاضر ہے۔میں اسے شوق سے آپ کی نذر کرتا ہوں۔آپ نے داؤد کا نام سنا ہو گا؟

عرب: کیا پطیر کا بیٹا؟

داؤد: جی ہاں، میں وہی بدنصیب داؤد ہوں۔میں صرف آپ کے بیٹے کا قاتل نہیں بلکہ اس کا دشمن ہوں۔مجھے قتل کر کے آپ جمال کے خون کا انتقام ہی نہ لیں گے بلکہ اپنے قوم و مذہب کی سچی خدمت بھی انجام دیں گے۔

شیخ حسن نے متانت سے کہا،''داؤد میں نے تمہیں معاف کیا۔میں جانتا

ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو کافی اذیتیں پہنچی ہیں مسلمانوں نے ان پر بڑے بڑے مظالم کیے ہیں، ان کی آزادی چھین لی ہے۔لیکن یہ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہے۔فتح کے غرور نے مسلمانوں کی عقل بگاڑ دی ہے۔ ہمارے پاک نبیؐ نے یہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج عمل کر رہے ہیں وہ خود عفو اور رحم کے بلند ترین معیار تھے۔اسلام کے نام کو بٹہ نہ لگاؤں گا۔میری اونٹنی لے لو وار راتوں کو جہاں تک بھاگ سکو، بھاگو، کہیں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھہرنا۔ عربوں کو تمہاری بو بھی مل گئی تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔جاؤ تمہیں اللہ پاک گھر پہنچادے۔بوڑھے شیخ حسن اور اس کے بیٹے جمال کے لیے خدا سے دعا کرنا۔''

داؤد بخیریت گھر پہنچ گیا۔مگر اب وہ داؤد نہ تھا جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔اس کے خیال میں تغیر ہو گیا تھا۔اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا اور اسلام کا نام عزت سے لیتا تھا۔

بُھوت

پہلی بار: ہندی میں ''مادھوری'' اگست ۱۹۲۴ء

کتابی صورت میں: ۱۹۲۹ فردوس خیال

مراد آباد کے پنڈت ستیا رتھ چوبے گزشتہ تیس سالوں سے مقامی وکلاء کے لیڈر ہیں، ان کے والد انہیں بچپن ہی میں چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی پونجی نہ تھی۔ میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر ان کی پرورش کی اور انہیں پڑھایا۔ سب سے پہلے وہ کچہری میں پندرہ روپے مشاہرہ پر ملازم ہوئے۔ پھر وکالت کا امتحان دیا پاس ہو گئے۔ آدمی ذہین تھے، وکالت دو چار برسوں میں ہی چمک اٹھی۔ جب ماں کا انتقال ہوا تو لائق بیٹے کا شمار ضلع کے ممتاز لوگوں میں ہو گیا تھا۔ ان کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ ایک عالیشان مکان بنوالیا تھا، کچھ زمینداری بھی خرید لی تھی، کچھ روپے بنک میں جمع کر دیے تھے وار کچھ داد و شد میں لگا دیے تھے۔ اس ترقی پر چار لڑکوں کے وجود نے انہیں اور بھی زیادہ خوش نصیب بنا دیا تھا۔ چاروں لڑکے مختلف درجوں میں تعلیم پاتے تھے۔ مگر یہ کہنا کہ ساری پونجی چوبے جی کے لگاتار محنت کا نتیجہ تھی، ان کی اہلیہ منگلا دیوی کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ منگلا بہت سادہ مزاج امور خانہ داری سے واقف، اور پیسے کا کام دھیلے میں چلانے والی عورت تھی۔ جب تک اپنا مکان نہ بن گیا، اس نے تین روپیہ ماہوار سے زیادہ کا مکان کرایہ پر نہیں لیا اور رسوئی کے لئے مسرانی تو اس نے اب تک نہ رکھی تھی۔ اسے اگر کوئی شوق تھا تو زیور کا اور چوبے جی کو بھی اگر

کوئی شوق تھا تو بیوی کو زیور پہنانے کا۔ وہ نہایت باوقار شوہر تھے۔ عموماً محفلوں میں رنڈیوں سے ہنسی مذاق کر لینا اتنا برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر پنڈت اپنی زندگی بھر کبھی کسی رقص و سرور کی محفل میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ پانچ بجے سے لے کر بارہ بجے رات تک ان کا شوق ان کی تفریح، ان کا پڑھنا لکھنا، جو کچھ تھا وہ صرف قانون تھا، نہ انہیں سیاسی کاموں سے رغبت تھی، نہ قومی خدمت سے، یہ سبھی کام انہیں فضول سے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں اگر کوئی کام کرنے کے لائق تھا تو بس کچہری جانا، روپیہ جمع کرنا اور کھا پی کر سو رہنا جیسے ویدانتی کو برمھ کے سوا سنسار جھوٹا معلوم ہوتا ہے ویسے ہی چوبے جی کو قانون کے سوا ساری دنیا ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ سب جھوٹ تھا۔ صرف قانون سچ تھا۔

(۲)

پنڈت جی کی دلی راحت میں صرف ایک کسر تھی۔ ان کی کوئی لڑکی نہ تھی۔ پہلی لڑکی کے بعد پھر کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور نہ اب پیدا ہونے کی امید تھی۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں اس لڑکی کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔ لڑکیاں بچپن میں لڑکوں سے زیادہ نخرے کیا کرتی ہیں۔ ان باتوں کے لیے دونوں بے قرار رہتے ماں سوچتی کہ لڑکی ہوتی تو اس کے لیے گہنے بنواتی۔ اس کے بال گوندھتی لڑکی گھنگھرو پہن کر ٹھمک ٹھمک کر آنگن میں چلتی تو کتنا مزہ آیا۔ چوبے جی سوچتے کہ کنیا دان کے بغیر موکش (نجات) کیسے ملے گی؟ کنیا دان مہادان ہے۔ جس نے یہ دان نہ

دیا اس کا جنم ہی اکارت ہو گیا۔

آخر یہ خواہش اتنی بڑھی کہ منگا نے اپنی چھوٹی بہن کو بلا کر لڑکی کی طرح پرورش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے ماں باپ غریب تھے راضی ہو گئے۔ یہ منگا کی سوتیلی ماں کی لڑکی تھی۔ بڑی خوبصورت اور بڑی شوخ۔ نام تھا بنی۔ چوبے جی کا گھر اس کے آنے سے کھل اٹھا۔ دو چار روز میں ہی لڑکی اپنے والدین کو بھول گئی۔ اس کی عمر تو صرف چار سال کی تھی۔ مگر اسے کھیلنے کی بہ نسبت کچھ کام کرنا زیادہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ منگا کھانا پکانے جاتی تو بنی بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتی، اس سے آٹا گوندھنے کے لیے جھگڑا کرتی۔ ترکاری کاٹنا اسے بہت اچھا لگتا۔ جب تک وکیل صاحب گھر پر رہتے۔ وہ ان کے ساتھ دیوان خانہ میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کتابیں الٹتی، کبھی دوات قلم سے کھیلتی۔ چوبے جی مسکرا کر کہتے! بیٹی، مار کھاؤ گی۔ بنی کہتی تم مار کھاؤ گے میں تمہارے کان کاٹ لوں گی۔ جو، جو، کو بلا کر پکڑا دوں گی، اس پر دیوان خانے میں خوب قہقہے اڑتے۔ وکیل صاحب بچوں کے ساتھ کبھی اتنا میل جول نہ کرتے تھے، بنی بیٹی! چلو۔ بنی دوڑتی ہوئی آ کر ان کی گود میں بیٹھ جاتی۔

آخر یہ خواہش اتنی بڑھی کہ منگا نے اپنی چھوٹی بہن کو بلا کر لڑکی کی طرح پرورش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے ماں باپ غریب تھے راضی ہو گئے۔ یہ منگا کی سوتیلی ماں کی لڑکی تھی۔ بڑی خوبصورت اور بڑی شوخ۔ نام تھا بنی۔ چوبے جی کا گھر اس کے آنے سے کھل اٹھا۔ دو چار روز میں ہی لڑکی اپنے والدین کو بھول گئی۔ اس کی عمر تو صرف چار سال کی تھی۔ مگر اس کھیلنے کی بہ نسبت کچھ کام کرنا زیادہ

بھلا معلوم ہوتا تھا۔ منگلا کھانا پکانے جاتی تو بنی بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتی، اس سے آٹا گوندھنے کے لیے جھگڑا کرتی۔ ترکاری کاٹنا اسے بہت اچھا لگتا۔ جب تک وکیل صاحب گھر پر رہتے۔ وہ ان کے ساتھ دیوان خانہ میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کتابیں الٹتی، کبھی دوات قلم سے کھیلتی۔ چوبے جی مسکرا کر کہتے! بیٹی، مار کھاؤ گی۔ بنی کہتی تم مار کھاؤ گے میں تمہارے کان کاٹ لوں گی۔ جو، جو کو بلا کر پکڑا دوں گی، اس پر دیوان خانے میں خوب قہقہے اڑتے۔ وکیل صاحب بچوں کے ساتھ کبھی اتنا میل جول نہ کرتے تھے، بنی بیٹی! چلو۔ بنی دوڑتی ہوئی آ کر ان کی گود میں بیٹھ جاتی۔

منگلا ایک روز بنی کو لیے بیٹھی تھی۔ اتنے میں پنڈت جی آ گئے۔ بنی دوڑ کر ان کی گود میں جا بیٹھی۔ پنڈت جی نے پوچھا۔ ”تو کس کی بیٹی ہے۔“

بنی ”نہ بتاؤں گی۔“

منگلا کہہ دے بیٹا، جی جی کی بیٹی ہوں۔

پنڈت ”تو میری بیٹی ہے بنو! کہ ان کی؟“

بنی ”یہ بتاؤں گی۔“

منگلا ”اچھا ہم لوگ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ بنی جس کی بیٹی ہو گی اس کی گود میں بیٹھے گی۔“

پنڈت ”میری بیٹی ہے، میری بیٹی ہے (بیوی سے) اب یہ کہنا کہ میری بیٹی ہے؟“

منگلا ”اچھا جاؤ بنی اب میں تمہیں مٹھائی نہ دونگی۔ گڑیا بھی نہ منگاؤں گی۔“

بنی 'بھیا جی منگوا دیں گے۔ تمہیں نہ دوں گی۔"

وکیل صاحب نے ہنس کر بنی کو سینہ سے لگا لیا۔ اور گودی میں لیے ہوئے باہر چلے گے۔ وہ اپنے خاص دوستوں کو بھی ان طفلانہ حرکتوں سے لطف اندوز کرنا چاہتے تھے۔ آج سے جو کوئی بنی سے پوچھتا کہ تو کس کی بیٹی ہے تو بنی فوراً کہہ دیتی۔ 'بھیا' کی۔

ایک مرتبہ بنی کا باپ آ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ بنی نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا ادھر چوبے جی کو دن کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پاتا تھا کہ وہ پھر سسرال گئے اور بنی کو لے آئے بنی اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ وہ چوبے جی کو اپنا باپ اور منگلا کو اپنی ماں سمجھنے لگی۔ جنہوں نے اس کو جنم دیا تھا وہ اب غیر ہو گئے۔

(۴)

کئی سال گزر گئے۔ وکیل صاحب کے بیٹوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ان میں دو اپنے بال بچوں کو لے کر دیگر اضلاع میں وکالت کرنے چلے گئے۔ دو کالج میں پڑھتے تھے۔ بنی بھی کلی سے پھول ہوئی۔ ایسی شکل، ایسے مزاج اور ایسے اوصاف والی لڑکی برادری میں اور نہ تھی۔ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار، گرہستی کے کاموں سے واقف، کاڑھنے، سینے پرونے میں مشتاق، کھانا پکانے میں پختہ کار، شیریں کلام، حیادار اور حسن بے نظیر کی مالکہ۔ اندھیرے گھر میں اس کے نور حسن سے اجالا ہوتا

تھا۔ افق کی سرخی میں چاندنی کی دل کش ضیا میں کھلے ہوئے گلاب کے پھول پر آفتاب کی شعاعوں سے مجلاّ شبنمی قطروں میں بھی وہ زینت اور وہ رونق نہ تھی۔ برف کا سفید تاج پہنے ہوئے پہاڑوں میں بھی وہ روح افزا ٹھنڈک نہ تھی جو بنی یعنی بندھیشوری کی بڑی بڑی آنکھوں میں تھی۔

چوبے جی نے بنی کے لیے کسی قابل لڑکے کی تلاش شروع کی لڑکیوں کی شادیوں مین دل کے حوصلے نکال چکے تھے۔ اب لڑکی کی شادی میں ان حوصلوں کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ دولت لٹا کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اب جہیز دے کر نام کمانے کی خواہش تھی۔ بیٹے کا بیاہ کر لینا آسان ہے مگر بیٹی کے بیاہ میں آبرو نبھائے جانا مشکل ہے۔ کشتی پر سبھی پار اترتے ہیں۔ جو تیر کر دریا عبور کرتے وہی تعریف کا مستحق ہے۔

روپیہ کی کمی نہ تھی۔ اچھا گھر اور اچھا لڑکا مل گیا۔ زائچے بھی موافق ہوئے۔ برچھا اور تلک کی رسمیں بھی ادا کر دی گئیں۔ مگر ہائے بدنصیبی! کہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، دروازہ پر درزی، سنار، حلوائی سب اپنا کام کر رہے تھے، کہاں ظالم آسمان نے کچھ اور ہی نقشہ جما دیا۔ شادی کے ایک ہفتہ قبل منگلا اچانک بیمار پڑی اور تین ہی روز میں اپنے سارے ارمانوں کو لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ منگلا چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ بیٹے، بہوئیں پوتے، پوتیاں، سب پلنگ کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ بنی پائنتے بیٹھی ہوئی پیر دبا رہی تھی، نزع کی حالت کا خوفناک سا سکوت طاری تھا۔ کوئی کسی سے نہ بولتا تھا، دل میں

سب سمجھ رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔صرف چوبے جی وہاں نہ تھے۔

دفعتاً منگلا نے ادھر ادھر آرزومند نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''ذرا انہیں بلا دو۔ کہاں ہیں؟''

پنڈت جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔خبر پاتے ہی آنسو پونچھتے ہوئے مکان میں آئے۔اور بڑے صبر و استقلال کے ساتھ منگلا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔اندیشہ تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی گرا تو گھر میں کہرام مچ جائے گا۔

منگلا نے کہا ''ایک بات پوچھتی ہوں، برا نہ ماننا۔بنی تمہاری کون ہے؟''

پنڈت جی ''بنی کون ہے۔میری بیٹی ہے اور کون؟''

منگلا ''ہاں میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھی۔اسے سدا اپنی بیٹی سمجھتے رہنا۔اس کے بیاہ کے لیے میں نے جو جو تیاریاں کی تھیں ان میں کچھ کمی نہ کرنا۔''

پنڈت ''اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ایشور نے چاہا تو اس سے کچھ زیادہ دھوم دھام کے ساتھ بیاہ ہوگا۔''

منگلا ''اسے ہمیشہ بلاتے رہنا۔تیج تہوار میں کبھی مت بھولنا۔''

پنڈت ''ان باتوں کی مجھے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔''

منگلا نے کچھ سوچ کر پھر کہا ''اسی سال بیاہ کر دینا۔''

پنڈت ''اس سال کیسے ہوگا۔''

منگلا ''یہ پھاگن کا مہینہ ہے۔جیٹھ تک لگن ہے۔''

پنڈت: ''ہو سکے گا تو اس سال کر دوں گا۔''

منگا: ''ہو سکنے کی بات نہیں، ضرور کر دینا۔''

پنڈت ''کر دوں گا۔''

اس کے بعد گودان کی تیاری ہونے لگی۔

(۴)

بڑھاپے میں بیوی کا مرنا، برسات میں گھر کا گرنا ہے پھر اس کے بننے کی امید نہیں ہوتی۔

منگا کی موت سے پنڈت کی زندگی بے قاعدہ اور بے سلسلہ ہو گی۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک ہوا۔ کئی روز کچہری نہ جاتے، جاتے بھی تو بڑے اصرار سے۔ کھانا اچھا نہ لگتا۔ بندھیشوری ان کی حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتی۔ او رحتی الامکان ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہتی۔ وہ انہیں پرانوں کی داستان پڑھ کر سناتی۔ ان کے لیے انواع واقسام کے کھانے تیار کرتی اور انہیں ضد کر کے کھلاتی۔ جب تک وہ نہ کھاتے آپ کچھ نہ کھاتی۔ گرمی کے دن تھے ہی۔ رات کو بڑی دیر تک ان کے پائنتے بیٹھی پنکھا جھلا کرتی اور جب تک وہ سو نہ جاتے تو آپ بھی سونے نہ جاتی۔ وہ ذرا بھی دردسر کی شکایت کرتے تو فوراً اس کے سر پر تیل پانی پلاتی۔ رفتہ رفتہ پنڈت جی کے دل میں منگا صرف ایک راحتِ ماضیہ کی یادگار رہ گئی۔ ایک روز چوبے جی نے بنی کو منگا کے کل گہنے دے دیے۔ منگا کی یہ آخری تمنا تھی۔ بنی پھولی نہ سمائی۔ اس نے اس روز خوب بناؤ سنگار کیا۔ جب شام کے وقت پنڈت

جی کچہری سے تشریف لائے تو وہ زیوروں سے لدی ہوئی ان کے سامنے کچھ لجاتی اور کچھ مسکراتی ہوئی جا کھڑی ہوگئی۔

پنڈت جی نے پرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ بندھیشوری کے متعلق اب ان کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہو رہا تھا۔ منگلا جب تک زندہ تھی وہ ان کے پدرانہ جذبات کو متحرک اور مضبوط کرتی رہتی تھی۔ اب منگلا نہ تھی۔ بس وہ جذبہ روز بروز کمزور ہو جاتا تھا۔ منگلا کے سامنے بنی محض بچہ تھی منگلا کی عدم موجودگی میں وہ ایک خوبصورت وار جوان عورت تھی۔ لیکن سادہ مزاج بنی کو اس کی ذرا بھی خبر نہ تھی کہ ''بھیا'' کے خیالات میں کیا تغیر ہو رہا ہے۔ اس کے لیے وہ وہی باپ کے درجے والا بھیا تھے۔ مردوں کے مزاج سے وہ ناواقف تھی۔ عورتوں میں عمر کے ساتھ مادرانہ جذبہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب عورت کی نظروں میں کل نوجوان اشخاص بیٹوں کی طرح دکھنے لگتے ہیں۔ اس کے دل میں نفسانی خواہشوں کا نام ونشان بھی نہیں رہ جاتا۔ مگر مردوں میں یہ حالت کبھی نہیں ہوتی۔ خواہ ان کے اعضا نکمے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ امکاناً نفسانی خواہشات میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مرد کو نفس پرستیوں سے کبھی نجات ہی نہیں ملتی۔ بلکہ جیوں جیوں عمر زیادہ ہوتی ہے۔ گرمی کی شام کی طرح اس کی نفسانی حرارت بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ وہ آسودگی کی غرض سے ذلت آمیز ذرائع کا سہارا لینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ جوانی میں انسان اتنا نہیں گرتا تو اس کے اطوار میں غرور کا شائبہ زیادہ ہوتا ہے جس کو ایسے ذرائع سے نفرت ہوتی ہے وہ کسی کے مکان میں جبراً دخل ہو سکتا ہے۔ مگر موری کے راستہ سے وہاں نہیں جا سکتا۔

پنڈت جی نے بنی کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنی اس شرارت پر نادام ہو کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ بنی اس کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکی۔

پنڈت جی بولے ''تمہیں دیکھ کر مجھے منگا کے اس وقت کی یاد آ رہی ہے جب وہ بیاہ کے دن یہاں آئی تھی۔ بالکل ایسی ہی شکل تھی۔ یہی گورا رنگ، یہی بشاش چہرہ، یہی نازک جسم، یہی شرمیلی آنکھیں وہ تصویر اب تک میرے دل کے پردے پر کھینچی ہوئی ہے، کبھی نہیں مٹ سکتی ایشور نے تمہاری شکل میں میری منگا مجھے پھر دیدی۔''

بنی ''آپ کے لیے کیا جل پان لاؤں۔''

پنڈت ''لے آنا۔ ابھی بیٹھو۔ میں بہت دکھی ہوں۔ تم نے میرے دکھ کو بھلا دیا ہے۔ واقعی تم نے مجھے جلا دیا۔ ورنہ مجھے امید نہ تھی کہ منگا کے بعد میں زندہ رہوں گا، تم نے مجھے زندگی دی۔ نہیں معلوم تمہارے چلے جانے پر میری کیا حالت ہو گی۔''

بنی ''کہاں چلے جانے پر؟ میں تو کہیں نہیں جا رہی ہوں۔''

پنڈت ''کیوں، تمہارے بیاہ کی ساعت آ رہی ہے چلی ہی جاؤں گی۔''

بنی (شرماتی ہوئی) ''ایسی جلدی کیا ہے؟''

پنڈت۔ ''جلدی کیوں نہیں ہے؟ دنیا ہنسے گی۔''

بنی۔ ''ہنسنے دیجیے۔ میں یہیں آپ کی سیوا کرتی رہوں گی۔''

پنڈت ''نہیں بنی! میرے لیے تم کیوں ہلکان ہو گی؟ میں ابھاگا ہوں، جب تک زندگی ہے جیوں گا، خواہ رو کر جیوں، خواہ ہنس کر، ہنسی میرے بھاگ سے روٹھ

گئی ہے،تم نے اتنے دنوں تک سنبھال لیا یہی کیا کم احسان کیا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد کوئی میری خبر لینے والا نہیں رہے گا، یہ گھر اجڑ جائے گا، اور مجھے گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ مگر کیا کیا جاوے، مجبوری ہے۔ تمہارے بغیر اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔ منگلا کی خالی جگہ تو تم نے پوری کی۔ اب تمہاری جگہ کون پورے کرے گا؟''

کیا اس سال رک نہیں سکتا؟ میں اس حالت میں آپ کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی؟

پنڈت ''اپنے بس کی بات تو نہیں، وہ لوگ جلدی کرینگے تو مجبور ہر کر کرنا ہی پڑے گا؟''

بنی ''بہت جلدی مچا دیں تو آپ کہہ دیجیے گا کہ اب ہم نہیں کریں گے، ان لوگوں کے جو جی میں آوے وہ کریں۔ کیا یہاں کوئی ان کا دبیل بیٹھا ہوا ہے۔''

پنڈت جی ''وہ لوگ تو ابھی سے اصرار کر رہے ہیں۔''

بنی ''آپ پھٹکار کیوں نہیں دیتے؟''

پنڈت ''کرنا تو ہے ہی، پھر دیر کیوں کروں؟ یہ دکھ اور جدائی تو ایک دن ہونی ہے، اپنی مصیبت کا بوجھ تمہارے سر کیوں رکھوں؟''

بنی ''دکھ سکھ میں کام نہ آؤں گی تو اور کس دن کام آؤں گی۔''

(۵)

پنڈت جی کے دل میں کئی روز تک ایسا ہنگامہ برپا رہا۔ وہ اب بنی کو پدرانہ

نگاہوں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ بنی اب منگلا کی بہن اوران کی سالی تھی۔ دنیا ہنسے گی تو ہنسے، زندگی تو آرام سے کٹے گی۔ ان کے خیالات کبھی اس قدر سرور افزا نہ تھے۔انہیں اپنے اعضا میں پھر شباب کی حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ سوچتے کہ بنی کو میں اپنی لڑکی سمجھتا تھا،مگر وہ میری لڑکی ہے تو نہیں۔ اس طرح سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ کون جانے ایشور کو یہی منظور ہو ورنہ بنی یہاں آتی ہی کیوں؟ اس نے اسی حیلے سے یہی ملاپ تجویز کر دیا ہو گا، اس کی لیلا کوئی کیا جانے۔

پنڈت جی نے نوشہ کے باپ کو اطلاع دے دی کہ چند خاص وجوہات سے امسال شادی نہیں ہوسکتی بندھیشوری کو ابھی تک کچھ خبر نہ تھی کہ میرے لیے کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔وہ خوش تھی کہ میں بھیا جی کی خدمت کر رہی ہوں اور بھیا جی مجھ سے خوش ہیں۔بہن کا انہیں بڑا رنج ہے۔میں نہ رہوں گی تو یہ کہیں چلے جائیں گے۔کون جانے سادھوسنیاسی ہو جائیں؟ گھر میں کیسے جی لگے گا؟

وہ پنڈت جی کے دل بہلاؤ کی ہمیشہ کوشش کرتی رہتی تھی انہیں کبھی اداس نہ بیٹھنے دیتی تھی پنڈت جی کا دل اب کچہری میں نہ لگتا تھا۔ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر چلے آتے تھے۔نوجوانوں کی محبت میں اضطراب ہوتا ہے۔اور بوڑھوں کی محبت میں اعتقاد وہ اپنے شباب کی کمی کو خوشامد سے شیریں کلامی سے اور حاضری سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔

منگلا کو مرے ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ چوبے جی سسرال پہنچے۔ساس نے منہ مانگی مراد پائی ان کے دو لڑکے تھے۔گھر میں کچھ سرمایہ نہ تھا۔ان کی پرورش و

تعلیم کے لیے کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا۔ منگا مر چکی تھی۔ لڑکی کا جیون ہی بیا نہ ہو جائے گا وہ اپنے گھر کی ہو رہے گی۔ پھر چوبے سے ناتا ہی ٹوٹ جائے گا۔ وہ اس کاوش میں مبتلا تھی کہ چوبے جی پہنچے گویا دیوتا خود ہی بر دان دینے آئے ہوں۔

جب چوبے جی کھانا کھا کر لیٹے تو ساس نے کہا ''بھیا'' ابھی کہیں بات چیت ہوئی کہ نہیں؟

پنڈت ''اماں، اب میرے بیاہ کی بات چیت کیا ہوگی؟''

ساس ''کیوں بھیا، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

پنڈت ''کرنا بھی چاہوں تو بدنامی کے ڈر سے نہیں کر سکتا پھر مجھے پوچھتا ہی کون ہے؟''

ساس ''پوچھنے کی ہزاروں ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ اپنے گھر ہی میں لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ تم نے منگا کے سب گہنے بنی کو دیے دیے ہیں۔ کہیں اور بیاہ ہوا تو یہ کئی ہزار کی چیزیں تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں گی۔ تم سا اچھا لڑکا میں کہاں پاؤں گی؟ تم اسے قبول کر لو تو میں تر جاؤں گی؟''

اندھا کیا چاہیے؟ دو آنکھیں۔ چوبے جی نے گویا مجبور ہو کر ساس کی التجا منظور کر لی۔

(۶)

بنی اپنے گاؤں کے کچے مکان میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ اب

کے چوبے جی نے اس کی خدمت کے لیے ایک خادمہ بھی ساتھ کر دی ہے۔ بندھیشوری کے دونوں بھائی متعجب ہو کر اس کے گہنوں کو دیکھ رہے ہیں۔ گاؤں کی اور کئی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے آئی ہوئی ہیں اور اس کے حسن کی افزونی دیکھ کر متحیر ہو رہی ہیں۔ یہ وہی بنی ہے جو یہاں موٹی پھریا پہنے کھیلا کرتی تھی۔ رنگ روپ کیسا نکھر آیا ہے۔ سکھ کی دیہہ (بدن) ہے نا۔

جب مجمع کم ہوا تو ماں نے پوچھا۔ تیرے بھیا جی تو اچھی طرح ہیں نہ بیٹی؟ یہاں آئے تھے تو بہت دکھی تھے۔ منگلا کا سوچ انہیں کھائے جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے مرد بھی ہیں جو بیوی کے لیے جان دیتے ہیں نہیں تو یہاں استری مری اور چٹ پٹ دوسرا بیاہ ہوا۔ گویا مناتے رہتے ہیں کہ یہ مرے نئی نویلی بہو گھر لا دیں۔

بندھیشوری۔ ''انہیں یاد کر کے رویا کرتے ہیں۔ چلی آئی ہوں نہ جانے کیسے ہوں گے؟''

ماں ''جتنے ہی دن ان کی سیوا کروں گی اتنی ہی محبت بڑھے گی۔ اور تمہارے جانے سے انہیں اتنا ہی دکھ بھی ہو گا، بیٹی سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں دیکھ کر جیتے ہیں۔ ادھر تمہاری ڈولی اٹھی اور ادھر ان کا گھر ستیاناس ہوا۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو انہیں سے نباہ کر لیتی۔''

بندھیشوری ''اے ہٹو اماں! گالی دیتی ہو۔ انہوں نے مجھے بیٹی کر کے پالا ہے میں بھی انہیں اپنا باپ..........''

ماں ''چپ رہ پگلی، کہنے سے کیا ہوتا ہے؟''

بندھیشوری ''ارے سوچو تو اماں، کتنی بے ڈھنگی بات ہے؟''

ماں ''مجھے تو اس میں کوئی بے ڈھنگا پن نہیں دکھائی دیتا۔''

بندھیشوری ''کیا کہتی ہو اماں؟ ان سے میرا۔ میں تو لاج کے مارے مر جاؤں، ان کے سامنے نہ تاک سکوں۔ وہ بھی کبھی نہ مانیں گے۔ ماننے کی بات بھی ہو کوئی!''

ماں ''انکا ذمہ میں لیتی ہوں۔ میں انہیں راضی کرلوں گی تو راضی ہو جا۔ یاد رکھ کہ یہ کوئی ہنسی خوشی کا بیاہ نہیں ہے۔ اس آدمی کی جان بچانے کی بات ہے۔ جس کے سوائے دنیا میں اور ہمارا کوئی نہیں ہے۔ پھر ان کی ابھی کچھ ایسی عمر بھی نہیں ہے۔ پچاس سے دو چار برس ہی اوپر ہوں گے۔ انہوں نے جیوتشی سے پوچھا بھی تھا اس نے ان کی کنڈلی دیکھ کر بتایا ہے کہ آپ کی عمر کم سے کم ستر برس کی ہے دیکھنے سننے میں بھی وہ سو دو سو میں ایک ہیں۔''

بات چیت میں چالاک ماں نے ایسا جال رچایا کہ سیدھی سادی لڑکی اس میں سے نہ نکل سی۔ ماں جانتی تھی کہ لالچ کا جادو اس پر نہ چڑھے گا۔ روپے کا، زیور کا، خاندانی عزت کا، امیرانہ زندگی کا اس نے ذکر تک نہ کیا۔ اس نے صرف چوبے جی کی قابل رحم حالت پر زور دیا۔ آخر بندھیشوری نے کہا۔ ''اماں میں جانتی ہوں کہ میرے نہ رہنے سے ان کو بڑا رنج ہوگا۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھے سکھ نہین بدا ہے اچھا ان کی بھلائی کے لیے میں اپنی زندگی نچھاور کر دوں گی۔ ایشور کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔''

چوبے جی کے گھر میں شگون کے گیت گائے جا رہے تھے بندھیشوری آج بہو بن کر گھر میں آئی ہے۔ کئی سال قبل وہ چوبے جی کی بیٹی بن کر آئی تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ میں ایک روز اس گھر کی مالک بنوں گی۔

چوبے جی کے سج دھج آج دیکھنے کے لائق ہیں۔ تن زیب کا رنگین کرتا، کتری اور سنواری ہوئی مونچھیں، خضاب کے چمکتے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ چڑھتی ہوئی آنکھیں، شباب کا پورا سوانگ تھا۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ بندھیشوری گہنوں سے لدی ہوئی بھاری جوڑا پہنے، فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے کوئی حوصلہ کوئی شوق نہ تھا، کوئی خوف نہ تھا۔ صرف یہ خیال تھا کہ میں ان کے سامنے منہ کھولوں گی؟ ان کی گود میں کھیلی ہوں، ان کے کندھوں پر بیٹھی ہوں، ان کی پیٹھی پر چڑھی ہوں۔ ایشور انہیں خوش رکھے۔ جس کے لیے میں نے بیٹی سے بیوی بنا منظور کیا وہ آرزو پوری ہو۔ ان کی زندگی آرام سے بسر ہو۔

اتنے میں چوبے جی آئے۔ بندھیشوری اٹھ کھڑی ہوئی اسے اتنی شرم آئی کہ جی چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاوے کھڑکی سے نیچے کود پڑے۔

چوبے جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے ''بنی مجھ سے ڈرتی ہو؟''

بنی کچھ نہ بولی۔ بت کی طرح وہیں کھڑی رہی۔ ایک لمحہ میں چوبے جی نے اسے بٹھا دیا۔ وہ بیٹھ گئی، اس کا گلا بھر بھر آتا تھا تقدیر کا یہ بے رحمانہ کھیل، یہ وحشت خیز تماشا اس کے لیے نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔

پنڈت جی نے پھر پوچھا ''بنی! بولتی کیوں نہیں؟ کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

بندھیشوری نے اپنے کان بند کر لیے۔ یہی پہچانی ہوئی آوازوہ کتنے دنوں سے سنتی چلی آئی تھی۔ آج طنز سے بھی زیادہ دل دوز اور مضحکہ سے بھی زیادہ سمع خراش معلوم ہوتی تھی۔

دفعتاً پنڈت جی چونک پڑے اور ان کے دونوں ہاتھ مینڈک کے پیروں کی طرح سکڑ گئے۔ دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کھڑکی سے منگلا اندر جھانک رہی تھی! منگلا تھی، سایہ نہیں، منگلا تھی، مجسم اور زندہ! اس کی آنکھیں غصہ اور حقارت سے معمور تھیں!

چوبے جی کانپتی ہوئی، ٹوٹی پھوٹی آواز سے بولے۔ ''بنی! دیکھووہ کیا ہے؟''

بنی نے بھی گھبرا کر کھڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ بولی۔ کیا ہے؟ مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

چوبے جی ''اب غائب ہوگئی۔ لیکن ایشور جانتا ہے، منگلا تھی۔''

بنی۔ بہن؟

چوبے جی۔ ہاں، وہی کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

بندھیشوری کانپتی ہوئی بولی ''میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

چوبے ''نہیں نہیں بنی، کوئی ڈر نہیں ہے۔ مجھے دھوکا ہوا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ وہ اسی گھر میں رہتی تھی، یہیں سوتی تھی، اسی سے شاید میرے خیال نے اس کی مورت لا کھڑی کر دی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کا دن کتنا مبارک ہے کہ میری بنی واقعی میری ہو گئی............''

یہ کہتے کہتے چوبے جی پھر چونک پڑے۔ پھر وہی مورت کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ مورت نہیں، سرتا پا مجسم اور زندہ منگلا! اب اس کی آنکھوں میں غصہ نہ تھا، حقارت نہ تھی، ان میں ہنسی بھری ہوئی تھی۔ گویا وہ اس نظارہ پر ہنس رہی ہے۔ گویا اس کے سامنے کوئی تماشا ہو رہا ہے۔

چوبے جی نے کانپتے ہوئے کہا ''پھر وہی بات ہوئی۔ وہ دیکھو منگلا کھڑی ہے۔''

بندھیشوری چیخ کر ان کے گلے سے لپٹ گئی۔

چوبے نے مہابیر کا نام جپتے ہوئے کہا ''میں کواڑ بند کیے دیتا ہوں۔''

بنی ''میں اس مکان میں نہ رہوں گی (رو کر) بھیا جی تم نے بہن کی آخری بات نہیں مانی اسی سے ان کا دل دکھی ہو رہا ہے مجھے تو کسی بدی کا اندیشہ ہو رہا ہے۔''

چوبے جی نے اٹھ کر کھڑکی کے کواڑ بند کر دیے اور کہا ''میں کل درگا پاٹھ کراؤں گا۔''

آج تک ایسا گمان نہ ہوا تھا۔ تم سے کیا کہوں؟ معلوم ہوتا ہے.......... ہوگا، اس بات کو جانے دو۔ یہاں بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ ابھی بارش کو دو ماہ سے کم نہیں ہیں ہم لوگ منصوری کیوں نہ چلیں؟

بندھیشوری ''میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ کل سے درگا پاٹھ ضرور کرانا۔ مجھے اب اس کمرہ میں نیند نہ آوے گی۔''

پنڈت جی ''کتابوں میں تو یہی لکھا ہے کہ مرنے کے بعد صرف سوکشم شریر۔ (جسم لطیف) رہ جاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صورت کیوں دکھائی پڑ رہی

ہے، کچھ نہیں یہ میرے خیال کا قصور ہے۔ کبھی کبھی ایسا وہم ہو جاتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ نبی اگر تم نے مجھ پر دیا نہ کی ہوتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ شاید اس وقت میں بدری ناتھ کے پہاڑوں میں سر ٹکراتا ہوتا یا کون جانے کچھ کھا کر مر چکا ہوتا؟''

بندھیشوری ''منصوری میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا؟''

پنڈت ''نہیں مکان بھی ملتے ہیں۔ میں اپنے ایک دوست کو لکھ دیتا ہوں وہ کہیں مکان طے کر رکھیں گے۔ وہاں..........''

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ جانے کہاں سے (جیسے پردہ غیب سے) آواز آئی۔ نبی تمہاری لڑکی ہے؟

چوبے جی نے دونوں کان بند کر لیے۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولے ''نبی یہاں سے چلو نہ جانے کہاں سے آوازیں آ رہی ہیں۔''

''نبی تمہاری لڑکی ہے۔ یہ آوازیں ہزاروں کانوں سے پنڈت جی کو سنائی پڑنے لگی۔ گویا اس کمرہ کی ایک ایک چیز سے یہ صدا آ رہی تھی!''

سواسیر گیہوں

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''چاند'' نومبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: اردو میں ۱۹۲۹ء (فردوس خیال)

(۱)

کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کورمی نامی کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادا غریب آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام، نہ کسی کے لینے میں، نہ کسی کے دینے میں، چھکا پنجانہ جانتا تھا۔ چھل کپٹ کی اسے چھوت بھی نہ لگی تھی۔ ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ ودیا نہ جانتا تھا۔ کھانا ملا تو کھا لیا نہ ملا تو چربن پر قناعت کی۔ چربن بھی نہ ملا تو پانی پی لیا اور راما کا نام لے کر سو رہا۔ مگر جب کوئی مہمان دروازے پر آ جاتا تو اسے یہ غنا کا راستہ ترک کر دینا پڑتا تھا۔ خصوصاً جب کوئی سادھو مہاتما آ جاتے تھے تو اسے لازماً دنیاوی باتوں کا سہارا لینا پڑتا۔ خود بھوکا سو سکتا تھا مگر سادھو کو کیسے بھوکا سلاتا۔ بھگوان کے بھگت جو ٹھہرے۔

ایک روز شام کو ایک مہاتما نے آ کر اس کے دروازے پر ڈیرا جما دیا۔ چہرے پر جلال تھا۔ پیتامبر گلے میں، جٹا سر پر، پیتل کا کمنڈل ہاتھ میں، کھڑاؤں پیر میں، عینک آنکھوں پر، غرض کہ پورا بھیس ان مہاتما کا سا تھا جو روسا کے محلوں میں ریاضت، ہوا گاڑیوں پر مندروں کا طواف اور یوگ (مراقبہ) میں کمال حال کرنے کے لیے لذیذ غذائیں کھاتے ہیں۔ گھر میں جو کا آٹا تھا وہ انہیں کیسے

کھلاتا؟ زمانہ قدیم میں جو کی خواہ کچھ اہمیت رہی ہو، مگر زمانہ حال میں جو کی خورش مہاتما لوگوں کے لیے ثقیل اور دیر ہضم ہوئی ہے، بڑی فکر ہوئی کہ مہاتما جی کو کیا کھلاؤں؟ آخر طے کیا کہ کہیں سے گیہوں کا آٹا ادھار لاؤں۔ گاؤں بھر میں گیہوں کا آٹا نہ ملا۔ گاؤں بھر میں سب آدمی ہی آدمی تھے، دیوتا ایک بھی نہ تھا، دیوتاؤں کو خورش کیسے ملتی؟ خوش قسمتی سے گاؤں کے پروہت جی کے یہاں تھوڑے سے گیہوں مل گئے۔ ان سے سوا سیر گیہوں ادھار لیے اور بیوی سے کہا کہ پیس دے۔ مہاتما نے کھایا۔ لمبی تان کر سوئے اور صبح آشیرواد دے کر اپنا راستہ لیا۔

پروہت جی۔ سال میں دو بار کھلیانی لیا کرتے تھے۔ شنکر نے دل میں کہا کہ سوا سیر گیہوں کیا لوٹاؤں۔ پنسیری کے بدلے کچھ زیادہ کھلیانی دے دوں گا۔ میں بھی سمجھ جائیں گے، میں بھی سمجھ جاؤں گا۔ چیت میں جب وہ پروہت جی پہنچے تو انہیں ڈیڑھ پنسیری کے قریب گیہوں دے دیے اور اپنے کو سبکدوش سمجھ کر اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ پروہت جی نے بھی پھر کبھی نہ مانگا۔ سیدھے سادھے شنکر کو کیا معلوم کہ یہ سوا سیر گیہوں چکانے کے لیے مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے گا۔

سات سال گزر گئے۔ پروہت جی برہمن سے مہاجن ہوئے۔ شنکر کسان سے مزدور ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی منگل اس سے الگ ہو گیا تھا۔ ایک ساتھ رہ کر دونوں کسان تھے، الگ ہو کر دونوں مزدور ہو گئے تھے۔ شنکر نے بہت چاہا کہ نفاق کی آگ بھڑکنے نہ پاوے۔ مگر حالت نے اس کو مجبور کر دیا۔ جس وقت الگ چولھے جلے وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ آج سے بھائی بھائی دشمن ہو جائیں گے۔

ایک روئے تو دوسرا ہنسے گا، ایک کے گھر غمی ہو گی تو دوسرے کے گھر گلگلے پکیں گے۔ محبت کا رشتہ، دودھ کا رشتہ آج ٹوٹا جاتا ہے۔ اس نے سخت محنت کر کے خاندانی عزت کا یہ درخت لگایا تھا۔ اسے اپنے خون سے سینچا تھا، اس کا جڑ سے اکھڑنا دیکھ کر اس کے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ سات روز تک اس نے دانے کی صورت بھی نہ دیکھی۔ دن بھر جیٹھ کی دھوپ میں کام کرتا اور رات میں منہ لپیٹ کر سو رہتا۔ اس سخت رنج اور ناقابل برداشت تکلیف نے خون کو جلا دیا، گوشت وار چربی کو گھلا دیا۔ بیمار پڑا تو مہینوں چارپائی سے نہ اٹھا۔ اب گزر بسر کیسے ہو؟ پانچ بیگھے کے آدھے کھیت رہ گئے، ایک بیل رہ گیا۔ کھیتی کیا خاک ہوتی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کھیتی صرف نام بھر کو رہ گئی۔ معاش کا سارا بھار مزدوری پر آ پڑا۔

سات سال گزر گئے۔ ایک دن شنکر مزدوری کر کے لوٹا تو راستہ میں پروہت جی نے ٹوک کر کہا۔ شنکر کل آ کے اپنے بیج بینک کا حساب کر لے۔ تیرے یہاں ساڑھے پانچ من ہو گئے؟ تم بھولتے ہو، میرے یہاں نہ کسی چھٹانک بھر اناج ہے، نہ ایک پیسہ ادھار۔

پروہت۔ ’’اسی نیت کا تو یہ پھل بھوگ رہے ہو کھانے کو نہیں جڑتا۔‘‘

یہ کہہ کر پروہت جی نے اس کا سوا سیر گیہوں کا ذکر کیا جو آج سے سال قبل شنکر کو دیے تھے۔ شنکر سن کر ساکت رہ گیا۔ میں نے کتنی بار انہیں کھلیانی دی۔ انہوں نے میرا کون سا کام کیا۔ جب پوتھی پترا دیکھنے، ساعت شگون بچارنے دوار آتے تھے تو کچھ نہ کچھ دچھنا لے ہی جاتے تھے۔ اتنا سوارتھ۔ سوا سیر اناج کو لے انڈے

کی طرح یہ بھوت کھڑا کر دیا۔ جو مجھے نگل ہی جائے گا۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی کہہ دیتے تو گیہوں دے ہی دیتا۔ کیا اسی نیت سے چپ بیٹھے رہے۔ بولا۔ ''مہاراج نام لے کر تو میں نے اتنا اناج نہیں دیا، مگر کئی بار کھلیانی میں سیر سیر، دو دو سیر دے دیا ہے۔ اب آپ آج ساڑھے پانچ من مانگتے ہو، میں کہاں سے دوں گا؟''

پروہت۔ ''لیکھا جو جو بکسیں سو سو۔ تم نے جو کچھ دیا ہوگا، کھلیانی میں دیا ہوگا، اس کا کوئی حساب نہیں۔ چاہے ایک کی جگہ چار پنسیری دے، تمہاری نام ہی میں ساڑھے پانچ من لکھا ہوا ہے۔ جس سے چاہے حساب لگوا لو۔ دے دو تو تمہارا نام جھیک (کاٹ) دوں، نہیں تو اور بڑھتا رہے گا۔''

شنکر ''پانڈے، کیوں ایک غریب کو ستاتے ہو۔ میرے کھانے کا ٹھکانا نہیں، اتنا گیہوں کس کے گھر سے دوں گا۔''

پروہت۔ ''جس کے گھر سے چاہے لاؤ، میں چھٹانک بھر بھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں نہ دوگے، بھگوان کے گھر تو دوگے۔''

شنکر کانپ اٹھا۔ ہم پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو کہہ دیتے۔ ''اچھی بات ہے، ایشور کے گھر ہی دیں گے وہاں کی تول یہاں سے کچھ بڑی تو نہ ہوگی۔ کم سے کم اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں۔ پھر اس کی کیا فکر؟'' مگر شنکر اتنا عقل مند، اتنا چالاک نہ تھا۔ ایک تو قرض، وہ بھی برہمن کا! بہی میں نام رہے گا تو سیدھے نرک میں جاؤں گا۔ اس خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بولا۔ مہاراج تمہارا جتنا ہوگا یہیں دوں گا۔ ایشور کے یہاں کیوں دوں؟ اس جنم میں تو ٹھوکر کھا

ہی رہا ہوں اس جنم کے لیے کیوں کانٹے بوؤں؟ مگر یہ کوئی نیا ئے نہیں ہے ۔تم نے رائی کا پربت بنا دیا۔ برہمن ہو کے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہتے تھا۔اسی گھڑی تقاضا کر کے لے لیا ہوتا تو آج میرے اوپر اتنا بڑا بوجھ کیوں پڑتا؟ میں تو دے دوں گا، لیکن تمہیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا؟

پروہت ''وہاں کا ڈر تمہیں ہوگا۔ مجھے کیوں ہونے لگا۔وہاں تو سب اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ رشی منی سب تو برہمن ہی ہیں۔ کچھ بنے بگڑے گی، سنبھال لیں گے۔تو کب دیتے ہو؟''

شنکر۔''میرے پاس دھرا تو ہے نہیں، کسی سے مانگ جانچ کر لاؤں گا تبھی دوں گا۔''

پروہت۔''میں یہ مانوں گا۔سات سال ہو گئے۔اب ایک کا بھی ملاحظہ نہ کروں گا۔گیہوں نہیں دے سکتے تو دستاویز لکھ دو۔''

شنکر۔''مجھے تو دینا ہے۔ چاہیے گیہوں لے لو۔ چاہے دستاویز لکھاؤ کس حساب سے دام رکھو گے؟''

پروہت۔''بازار جاؤ پانچ سیر کا ہے، تمہیں سوا پانچ سیر کاٹ دوں گا۔''

شنکر۔''جب دے ہی رہا ہوں تو بازار بھاؤ کاٹوں گا۔ پاؤ بھر چھڑا کر کیوں برا بنوں۔''

حساب لگایا گیا تو گیہوں کی قیمت ساٹھ روپیہ بنی۔ ساٹھ کا دستاویز لکھا گیا۔ تین روپیہ سیکڑہ سود۔ سال بھر میں نہ دینے پر سود کی شرح ساڑھے تین روپے سیکڑہ۔ آٹھ آنے کا اسٹامپ، ایک روپیہ دستاویز کی تحریر شنکر کو علیحدہ دینی پڑتی۔

سارے گاؤں نے پروہت جی کی مذمت کی مگر سامنے نہیں۔ مہاجن سے سبھی کو کام پڑتا ہے اس کے منہ کون لگے؟

(۳)

شنکر نے سال بھر تک سخت ریاضت کی میعاد سے قبل اس نے روپیہ ادا کرنے کا برت سا کر لیا۔ دوپہر کو پہلے بھی چولہا نہ جلتا تھا، صرف چربن پر بسر ہوتی تھی۔ اب وہ بھی بند ہوا۔ صرف لڑکے کے لیے رات کو روٹیاں رکھ دی جاتیں۔ ایک پیسہ کی تمباکو روز پی جاتا تھا۔ یہی ایک لت تھی جسے وہ کبھی نہ چھوڑ سکا تھا۔ اب وہ بھی ان کٹھن برت کے بھینٹ ہوگئی۔ اس نے چلم پٹک دی، حقہ توڑ دیا اور تمباکو کی ہانڈی چور چور کر ڈالی۔ کپڑے پہلے بھی ترک کی انتہائی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اب وہ باریک ترین قدرتی کپڑوں میں منسلک ہو گئے۔ ماگھ کی ہڈیوں تک میں سیرایت کر جانے والی سردی کو اس نے آگ کے سہارے کاٹ دیا۔

اس اٹل ارادے کا نتیجہ امید سے بڑھ کر نکلا۔ سال کے آخر تک اس کے پاس ساٹھ روپے جمع ہو گئے۔ اس نے سمجھا کہ پنڈت جی کو اتنے روپے دے دوں گا اور کہوں گا مہاراج باقی روپے بھی جلدی آپ کے سامنے حاضر کر دوں گا۔ پندرہ کی تو اور بات ہے۔ کیا پنڈت جی اتنا بھی نہ مانیں گے۔ اس نے روپے لیے اور لے جا کر پنڈت جی کے قدموں پر رکھ دیے۔

پنڈت جی نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''کسی سے ادھار لیے کیا؟''

شنکر۔ ’’نہیں مہاراج! آپ کی اسیس سے اب کی مجوری اچھی ملی۔‘‘

پنڈت جی، ’’لیکن یہ تو ساٹھ ہی ہیں۔‘‘

شنکر۔ ’’ہاں مہاراج! اتنے ابھی لے لیجیے۔ باقی دو تین مہینے میں دے دوں گا۔ مجھے ارن کر دیجیے۔‘‘

پنڈت جی۔ ’’ارن تو جبھی ہوں گے، جب میری کوڑی کوڑی چکا دو گے؟ جا کر میرے پندرہ اور لاؤ۔‘‘

شنکر۔ ’’مہاراج! اتنی دیا کرو۔ اب سانجھ کی روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ گاؤں میں ہوں تو کبھی نہ کبھی دے ہی دوں گا۔‘‘

پنڈت۔ ’’میں یہ روگ نہیں پالتا۔ نہ بہت باتیں کرنا جانتا ہوں۔ اگر میرے پورے روپے نہ ملیں گے تو آج سے ساڑھے تین روپے سیکڑہ کا بیاج چلے گا۔ اتنے روپے چاہے اپنے گھر میں رکھو چاہے میرے یہاں چھوڑ جاؤ۔‘‘

شنکر۔ ’’اچھا، جتنا لایا ہوں، اتنا رکھ لیجیے۔ میں جاتا ہوں، کہیں سے پندرہ اور لانے کی فکر کرتا ہوں۔‘‘

شنکر نے سارا گاؤں چھان مارا مگر کسی نے روپے نہ دیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا اعتبار نہ تھا، یا کسی کے پاس روپے نہ تھے، بلکہ پنڈت جی کے شکار کو چھیڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

عمل کے بعد ردعمل کا قدرتی قاعدہ ہے۔شنکر سال بھر تک تپسیا کرنے پر بھی جب قرض بیباق کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کی احتیاط مایوسی کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔اس نے سمجھ لیا کہ جب اتنی تکلف اٹھانے پر سال بھر میں ساٹھ روپے سے زیادہ نہ جمع کر سکا تو اب کون سا اپائے ہے جس سے اس کے دو نے روپے جمع ہوں۔جب سر پر قرض کا بوجھ ہی لدنا ہے تو کیا من بھر اور کیا سوا من کا۔ اس کی ہمت پست ہوگئی محنت سے نفرت ہوگئی۔امید ہی حوصلہ کی پیدا کرنے والی ہے۔امید میں رونق ہے، طاق ہے، زندگی ہے، امید ہی دنیا کی متحرک کرنے والی قوت ہے۔شنکر مایوس ہوکر بے پروا ہو گیا۔وہ ضرورتیں جن کو اس نے سال بھر تک ٹال رکھا تھا۔اب دروازے پر کھڑی ہونے والی بھکارنیں نہ تھیں، بلکہ سر پر سوار ہونے والی چڑیلیں تھیں جو اپنا چڑھاوا لیے بغیر جان ہی نہیں چھوڑتیں۔ کپڑوں میں پیوند لگنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔اب شنکر کو حساب ملتا تو روپے جمع نہ کرتا۔کبھی کپڑے لاتا اور کبھی کھانے کی کوئی چیز۔جہاں پہلے تمبا کو پیا کرتا تھا وہاں اب گانجہ اور چرس کا چسکا بھی لگا۔اسے اب روپے ادا کرنے کی کوئی فکر نہ تھی۔گویا اس پر کسی کا ایک پیسہ بھی نہ تھا۔پہلے لرزہ آ جانے پر بھی وہ کام کرنے ضرور جاتا تھا۔اب کام پر نہ جانے کا بہانہ تلاش کیا کرتا۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔پنڈت جی مہاراج نے ایک بار بھی تقاضا نہ کیا۔وہ ہوشیاری شکاری کی طرح تیر بہدف نشانہ لگانا چاہتے تھے۔پہلے سے شکار کو بھڑکا دینا ان کے شیوہ کے خلاف تھا۔

ایک روز پنڈت جی نے شنکر کو بلایا۔حساب دکھایا۔ساٹھ روپے جمع تھے وہ منہا

کرنے پر بھی اب شنکر کے ذمے ایک سو بیس روپے نکلے۔

''اتنے روپے تو اسی جنم میں دوں گا۔ اس جنم میں نہیں ہو سکتا؟''

پنڈت ''میں اسی جنم میں لوں گا۔ اصل نہ سہی سود تو دینا ہی پڑے گا۔''

شنکر۔ ''ایک بیل ہے وہ لے لیجیے۔ ایک جھونپڑی ہے، وہ لے لیجیے'' اور میرے پاس رکھا کیا ہے؟

پنڈت۔ ''مجھے بیل بدھیا لے کر کیا کرنا ہے۔ مجھے دینے کو تمھارے پاس بہت کچھ ہے۔''

شنکر۔ ''اور کیا ہے مہاراج۔''

پنڈت۔ ''کچھ نہیں ہے، تم تو ہو؟ آخر تم بھی کہیں مزدوری کرنے ہی جاتے ہو۔ مجھے بھی کھیتی کرنے کے لیے ایک مزدور رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سود میں تم ہمارے یہاں کام کیا کرو۔ جب سبھیتا ہو اصل بھی دے دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تم دوسری جگہ کام کرنے کے لیے جا نہیں سکتے۔ جب تک میرے روپے نہ چکا دو۔ تمھارے پاس کوئی جائیداد نہیں ہے۔ اتنی بڑی گٹھری میں کس اعتبار پر چھوڑ دوں؟ کون اس کا ذمہ لے گا تم مجھے مہینے مہینے سود دیے جاؤ گے۔ اور کہیں کما کر جب تم مجھے سود بھی نہیں دے سکتے تو اصل کی کون کہے؟''

شنکر۔ ''مہاراج! سود میں تو کام کروں گا اور کھاؤں گا کیا؟''

پنڈت ''تمھاری گھر والی ہے، لڑکے ہیں۔ کیا وہ ہاتھ پیر کٹا بیٹھیں گے، تمھیں آدھ سیر جو روز چربن کے لیے دے دیا کروں گا۔ اوڑھنے کے لیے سال میں کمبل پا جاؤ گے۔ ایک سلوکا بھی بنوا دیا کروں گا، اور کیا چاہیے؟ یہ سچ ہے کہ اور لوگ

تمھیں چھ آنے روز دیتے ہیں لیکن مجھے ایسی غرض نہیں ہے۔ میں تو تمھیں اپنے روپے بھرانے کے لیے رکھتا ہوں۔"

شنکر نے کچھ دیر تک گہرے سوچ میں پڑے رہنے کے بعد کہا۔ "مہاراج! یہ تو جنم بھر کی گلامی ہوئی؟"

پنڈت۔ "غلامی سمجھو، چاہے مجوری سمجھو۔ میں اپنے روپے بھرائے بنا تمھیں نہ چھوڑوں گا۔ تم بھاگوگے تو تمہارا لڑکا۔ ہاں جب کوئی نہ رہے گا تب کی بات دوسری ہے۔"

اس فیصلہ کی کہیں اپیل نہ تھی۔ مزدور کی ضمانت کون کرتا؟ کہیں پناہ نہ تھی؟ بھاگ کر کہاں جاتا؟ دوسرے روز سے اس نے پنڈت جی کے ہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ سوا سیر گیہوں کی بدولت عمر بھر کے لیے غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالنی پڑیں۔ اس بدنصیب کو اب اگر کسی خیال سے تسکین ہوتی تھی تو اسی سے کہ یہ سب میرے پچھلے جنم کا بھوگ ہے۔ عورت کو وہ کام کرنے پڑے تھے جو اس نے کبھی نہ کیے تھے۔ بچے دانے دانے کو ترستے تھے، لیکن شنکر چپ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ گیہوں کے دانے کسی دیوتا بدھا کی طرح تمام عمر اس کے سر سے نہ اترے۔

(۵)

شنکر نے پنڈت جی کے یہاں بیس برس تک غلامی کرنے کے بعد اس غم

کدے سے رحلت کی۔ ایک سو بیس ابھی تک اس کے سر پر سوار تھے۔ پنڈت جی نے اس غریب کو ایشور کے دربار میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ پس انہوں نے اس کے جوان بیٹے کی گردن پکڑی۔ آج تک وہ پنڈت جی کے یہاں کام کرتا ہے۔ اس کا ادھار کب ادا ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں، ایشور ہی جانے۔

ناظرین! اس قصہ کو فرضی نہ سمجھیے، یہ سچا واقعہ ہے ایسے شنکروں اور ایسے پروہتوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔

شطرنج کی بازی

پہلی بار:ہندی میں ''شطرنج کے کھلاڑی'' کے عنوان سے ''مادھوری'' ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: ۱۹۲۸ء (خواب وخیال)

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔لکھنؤ عیش وعشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر وغریب سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی ومستی کا زور تھا۔امور سیاست میں شعر وسخن میں،طرز معاشرت میں،صنعت وحرفت میں،تجارت وتبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔اراکین سلطنت سب مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔شعرا بوسہ وکنار میں مست اہل حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں اہل سیف تیتر بازی میں، اہل روزگار سرمہ ومسی،عطر وتیل کی خرید وفروخت کا دلدادہ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر وجام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔علم وحکمت کے کن کن ایجادوں میں مصروف ہے۔بحر وبر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں۔اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔بٹیر لڑ رہے ہیں تیتروں میں پالیاں ہو رہی تھیں کہیں چوسر ہو رہی ہے۔پوبارہ کا شور مچا ہوا ہے۔کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔فوجیں زیروزبر ہو رہی ہیں۔نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔حظ نفس کے لیے نئے، لٹکے

نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر خوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اربابِ نشاط سے قلم بند کرتے تھے۔ رئیس زادے حاضر خوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ارباب نشاط سے قلم بند کرتے تھے۔ فکر کو جولاں، عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں۔ جو اس دلیل کو بڑے شدومد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انہیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکر معاش سے آزاد تھے۔ آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے پھر انہیں خبر نہ ہوتی تھی۔ کہ کب دوپہر ہوا کب سہ پہر اور کب شام۔ گھر سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں۔

دستر خوان بچھاؤ مگر شطرنج کے سامنے قورے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا۔ اور دونوں دوست کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انہی کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی

نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے۔ ہرگز نہیں۔ محلّہ کے گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں ماماؤں میں بڑی حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کو رہتا ہے نہ دنیا کے کام کو بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو گھر کا نہ گھاٹ کا۔ برا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ انہیں اس کے موقع مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات وک سو جاتی تھیں۔ تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جوالا ہے کا غصہ ڈاڑھی پر اتارا کرتی تھیں نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں کیا میاں نے پان مانگے ہیں۔ کہدو آ کر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانے لے جا کر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا مگر لطف یہ تھا کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے وہ میر صاحب کو نکھٹو۔ بگاڑو، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا۔ تو ماما سے کہا۔ جا کر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لا دیں۔ دوڑ جلدی کر سر پھٹا جاتا ہے ماما گئی تو مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جا کر کہہ کہ

ابھی چلیے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ کچھ ان کے آنکھوں دیکھا راستہ نہیں ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتیوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے۔ ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب چھو منتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی دردِ سر رفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا، "ارے جا کر سن ہی آیئے نہ۔ عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں۔"

مرزا جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں دو کشتوں میں میر صاحب کی مات ہو جاتی ہے۔

میر صاحب جی اس بھروسے نہ رہیے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے کے دھرے رہے جائیں۔ اور مات ہو جائے۔ پر جایئے سن آیئے کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھایئے گا۔

مرزا جی۔ جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔

میر صاحب۔ میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سن آئیں۔

مرزا جی۔ ارے یار جانا پڑے گا۔ حکیم کے یہاں دردو ردخاک نہیں ہے مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر صاحب۔ کچھ بھی ہو ان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا جی۔ اچھا ایک چال اور چل لوں۔

میر صاحب۔ ہرگز نہیں۔ جب تک آپ سن نہ آئیں گے مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحب نے کراہتے ہوئے کہا تمہیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے۔ پر اٹھنے کا نام نہیں، شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا کیا کروں۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔

بیگم۔ کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کر دیا۔

مرزا۔ بڑا لتی آدمی ہے جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے تو مجبور کر مجھے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔

بیگم۔ دھتکار کیوں نہیں دیتے کہ کتے کی طرح۔

مرزا۔ سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں، رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ تو ہی میں دھتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی (ماما سے) عباسی شطرنج اٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا۔ میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھایئے گا۔

مرزا۔ ہائیں ہائیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کراؤ گی۔ ٹھہر عباسی، کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا خون پیو جو روکے، اچھا اسے روک لیا۔

مجھے روک لوتو جانوں ۔ یہ کہہ کر بیگم خود جھلائی ہوئی دیوانخانہ کی طرف چلیں ۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں ۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لیے تمھیں شہید کربلا کی قسم ۔ میری ہی میت دیکھے جو ادھر قدم رکھے لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں ۔ یکا یک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رک گئے ۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا حسن اتفاق سے کمرہ خالی تھا میر صاحب نے حسب ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیے تھے اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے پھر کیا تھا بیگم صاحب کو منہ مانگی مراد ملی ۔ اندر پہنچ کر بازی الٹ دی ۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی ۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے ۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو سمجھ گئے بیگم صاحب بگڑ گئیں ۔ چپکے سے گھر کی راہ لی ۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا تم نے غضب کر دیا۔

بیگم ۔ اب موا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں ۔ گھر نہیں چکلا سمجھ لیا ہے ۔

اتنی تو اگر خدا سے ہو تو ولی ہو جاتے ۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں ہیں یہاں چولھے چکی میں سر کھپاؤں لونڈی سمجھ رکھا ہے جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں یہ اب بھی تامل ہے ۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے تو معذرت آمیز لہجہ میں باد دل پر درد ماجرا کہہ سنایا ۔

میر صاحب ہنس کو بولے ۔اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب دردسر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں ۔مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں ۔اف اتنی تمکنت آپ نے انہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے ۔ یہ مناسب نہیں، انہیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں ۔خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انہیں کیا مجال ۔میرے یہاں دیکھیے ۔کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا۔خیر اب یہ بتایئے اب جماؤ کہاں ہوگا۔

میر ۔اس کا کیا غم ہے اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے بس یہیں جمے گی۔

مرزا۔لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا۔تب تو اتنی خفگی تھی ۔گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر ۔اجی بکنے دیجیے۔ دو چار دن خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔ہاں آپ بھی ذرا تن جایئے۔

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں ۔اس لیے وہ ان کے مشغلہ تفری کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں ۔ بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ الکساتے تو سرو دیہ مستان یاد دہانیدن کے مصداق انہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحب نہایت خلیق متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں ۔لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج پیدا ہونے لگا۔تو انہیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے

دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں۔ سوچنے لگیں کیونکر یہ بلا سر سے ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھ نہ سروکار مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہوگئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی پانی پلانے کبھی برف لانے کا، کبھی تمباکو بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہردم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہوگیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی، اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلےوالے ہردم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا پر کیا کروں میرا کیا بس ہے۔

محلّہ میں دو چار بڑے بوڑھے تھے وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے، یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگئی۔ لچھن برے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دھاڑے لٹتی تھی۔ پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھچی چلی آتی تھی اور یہاں سامان عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ۔ نقال۔ کتھک، ارباب نشاط

کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دکان پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی یہاں تک کہ سالانہ اخراج بھی ادا نہ ہوسکتا تھا۔ ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا۔ دھمکیاں دیتا، مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے نت نئے نقشے حل کیے جاتے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے، کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی، تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر رنجیاں بہت جلد رفع ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آ بیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آ پہنچا میر صاحب کے حواس اڑے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لیے اور نوکروں سے کہا۔ گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے کہا گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔

خدمت گار میں یہ نہیں جانتا گھر میں سے یہی جواب ملا ہے کیا کام ہے۔

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لیے کچھ سپاہی

مانگے گئے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمت گار۔ اچھا تشریف لے جایئے۔ کہہ دیا جائے گا۔

سوار۔ کہنے سننے کی بات نہیں۔ میں کل پھر آؤں گا اور تلاش کر کے لے جاؤں گا اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے اب کیا ہو گا۔

مرزا۔ بڑی مصیبت ہیں کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر۔ کمبخت کل پھر آئے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا۔ قہر آسمانی ہے اور کیا کہیں سپاہیوں کی مانگ ہو تو بن موت میرے یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آئی ہے۔

میر۔ یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھیے۔

مرزا۔ بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملیے ہی نہیں دونوں آدمی غائب ہو جائیں۔ سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کیا خبر ہو گی۔ حضرت اپنا سا منہ لے لوٹ جائیں گے۔

میر۔ بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں۔ تم نے خوب بہروپ بھرا۔

اس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے صبح کا گیا پھر رات کو آئے گا۔

اس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے۔ ڈبے میں گلوریاں بھرے، گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جابیٹھے جو شاید عہد مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں۔ تمباکو، مدریا لے لیتے اور مسجد میں پہنچ، دری بچھا حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انہیں دین دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت شہ پٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کوئی چلہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا تھا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دکان پر کھانا کھا لیتے اور چلم حقہ پی کر پھر محو شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی سدھ نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غم وزدا۔ اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے۔ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب انہیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ قرض

کی ملت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی۔ جس سے آج ساری کمزور قومیں پا بہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔

مرزا۔ آنے دیجیے۔ کشت بچائیے۔ یہ کشت۔

میر۔ ذرا دیکھنا چاہیے۔ آڑ سے دیکھیں کیسے قومی ہیکل نوجوان ہیں دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔ مرزا۔ دیکھ لیجیے گا کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر۔ توپ خانہ بھی ہے کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ سرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مرزا۔ جناب حیلے نہ کیجیے۔ یہ کشت۔

میر۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجیے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا تو گھر پہلے چلیں گے۔

مرزا۔ جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات۔

فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسی رہے گی۔

میر۔ آج روزہ ہے کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے۔

مرزا۔ جی نہیں۔ شہر میں نا معلوم کیا ہو رہا ہو گا۔

میر۔ شہر میں کچھ نہیں ہو رہا ہو گا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے۔ حضور جان عالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو گا۔

اب کے دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے اب کے مرزا جی کی بازی کمزوری تھی۔ اسی اثناء میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ نہ کشت خون یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے۔ جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے بیگمیں روئیں۔ نواب زادے۔ مامائیں مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا ازل سے کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہو گی۔ کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسا نہ تھی۔ جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرمانروا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔

--------صفحہ نمبر ۳۹۵ تک--------

میر۔ ہو گا۔ آپ کوئی قاضی ہیں یہ لیجیے شہ۔

مرزا۔ حضرت ذرا ٹھہریئے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔

حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گل ہو گیا۔

میر۔ رویا ہی چاہئیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ۔

مرزا۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے کتنی سخت مصیبت میں ہے بلائے

آسانی۔

مرزا۔ ہاں ہے ہی۔ پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے۔ بچ نہیں سکتے۔

مرزا۔ آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے حضور جانِ عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدر دان نہ رہا۔ لکھنؤ ویران ہوگیا۔

میر۔ پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے پھر حضور پر نور کا ماتم کیجیے یہ کشت اور مات، لانا ہاتھ۔

نواب کو لیے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی۔ ہار کی چوٹ بری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا آئے نواب صاحب کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن مرزا جی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنے ہار کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔

شام ہو گئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کر دی ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں۔ یہ دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا وہ خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی ادھر

صاحب غزلیں پڑھتے تھے۔ ٹھمریاں گاتے تھے چٹکیاں لیتے تھے۔ آوازیں کستے تھے، ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فہمیاں سن سن کر جھنجلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے آپ چال نہ تبدیل کیا کیجیے۔ یہ کیا چال چلے اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجیے۔ جناب آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجیے۔ جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجیے۔ حضرت آپ ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگے۔ اس کی مات سمجھی جائے۔ پھر آپ نے چال بدلی مہرہ وہیں رکھ دیجیے۔

میر صاحب کا فرزین پٹا جاتا تھا۔ بولے میں نے چال چلی کب تھی۔

مرزا۔ آپ کی چال ہو چکی ہے خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ لیجیے۔

میر۔ اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا۔

مرزا۔ آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہو گی۔ فرزین پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر۔ دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔

مرزا۔ یہ بازی آپ کی مات ہو گی۔

میر۔ میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا۔ تو آپ مہرہ اس کی گھر میں رکھ دیجیے جہاں پہلے رکھا جاتا۔

میر ۔ وہاں کیوں رکھوں۔ نہیں رکھتا۔

مرزا۔ آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر ۔ ہرگز نہیں ۔

مرزا۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی دونوں اپنے ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشا ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے مرزا جی نے فرمایا اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کیے۔ آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر۔ گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گزر گئیں۔

مرزا۔ اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گزری گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چڑھ آیا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالک لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے ہمارے بزرگ تو نواب کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا۔ بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔

میر ۔ زبان سنبھالیے۔ ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں ہیں

کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈرا کھل گئے۔

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جایئے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے ادھر یا ادھر۔

میر۔ ہاں آ جاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکالیں۔ ان دونوں ادنا اعلا سبھی کٹار خنجر، قبض شیر پنجہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لیے سلطنت کے لیے، قوم کے لیے کیوں مریں۔ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ قومی ہو گئے تھے۔ دونوں پینترے بدلے لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلوایں چمکیں چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لیے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لیے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی پوشیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے۔ جس میں سنگ وخشت کا ثبات بھی نہیں۔

ڈگری کے روپے

پہلی بار: ہندی میں، اسی عنوان سے "مادھوری" جنوری ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں ۱۹۲۹ء (فردوس خیال)

(۱)

نعیم اور کیلاش میں اتنی دماغی، اخلاقی اور سوشل تفاوت تھی جتنی دو انسانوں میں ہوسکتی ہے۔ نعیم بڑا بھاری درخت تھا، کیلاش باغ کا نازک پودا، نعیم کو کرکٹ، فٹ بال، سیر و شکار کا شوق تھا۔ کیلاش کو مطالعہ کتب کا۔ نعیم، شوخ پرگو آزاد، مذاق پسند اور عیش پسند نوجوان تھا۔ اسے کل کی فکر نہ ستاتی تھی۔ مدرسہ اس کے لیے کھیل کا مقام تھا اور کبھی کبھی بنچ پر کھڑے ہونے کا بھی۔ اس کے برخلاف کیلاش تنہائی پسند، سست، ورزش سے کوسوں دور بھاگنے والا، کھیل کود سے بچنے والا، انجام اندیش اور معیار پرست تھا۔ وہ مستقبل کے خیالات سے پریشان رہتا تھا۔ نعیم ایک ذی ثروت اور اعلیٰ عہدے والا باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کیلاش ایک معمولی کاروباری شخص کے کئی لڑکوں میں سے ایک تھا اسے کتابوں کے لیے کافی روپیہ نہ ملتا تھا اوروں سے مانگ کر کام نکالا کرتا تھا۔ ایک کے لیے زندگی کا آرام خوب تھا اور دوسرے کے لیے مصیبت کا پہاڑ، مگر اس باہمی اختلاف کے باوجود بھی ان دونوں میں گہری دوستی اور خالص بے غرضانہ محبت تھی کیلاش مرجاتا مگر نعیم رہین منت نہ بنتا اور نعیم مرجاتا مگر کیلاش سے بے اعتنائی نہ کرتا۔ نعیم کی خاطر سے کیلاش

کبھی کبھی مستقبل کا خواب دیکھ لیا کرتا تھا۔ مرزا نعیم کے لیے سرکاری عہدے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، مستقبل کوئی اتھاہ ساگر نہ تھا۔ کیلاش کو اپنے ہاتھ ہی سے کنواں کھود کر پانی پینا تھا۔ جس کے خیال ہی سے اس کا دل پریشان ہو جاتا تھا۔

(۲)

کالج سے نکلنے کے بعد نعیم کو شعبہ حکومت میں ایک بڑا عہدہ مل گیا اگرچہ وہ تیسرے درجہ میں پاس ہوا تھا۔ کیلاش اول درجہ میں ہوا تھا مگر اس کو برسوں ایڑیاں رگڑنے، خاک چھاننے اور کنویں جھانکنے پر بھی کوئی کام نہ ملا۔ حتیٰ کہ مجبور ہو کر اسے اپنے قلم کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے ایک اخبار نکالا۔ ایک نے حکومت اور اقتدار کا راستہ اختیار کیا۔ جس کا مقصد زر تھا اور دوسرا مقصد خدمت خلق کا جس کا نتیجہ شہرت، تکلیف اور کبھی کبھی قید کی اذیت ہوا کرتی تھی۔ نعیم کو اس کے دفتر کے باہر کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر وہ بنگلہ میں رہتا تھا۔ موٹر پر سوار ہو کر ہوا خوری کرتا تھا، تھیٹر دیکھتا اور موسم گرما میں نینی تال کی سیر کو جاتا۔ کیلاش کو کل دنیا جانتی تھی مگر اس کا رہائشی مکان خام تھا اور سواری کے لیے اور اس کے اپنے پیر بچوں کے لیے دودھ بھی مشکل سے ملتا۔ ترکاری سبزی میں کفایت کرنی پڑتی۔ نعیم کے لیے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اس کا صرف ایک لڑکا تھا مگر کیلاش کے لیے سب سے بدنصیبی کی بات کثیر الاولادی تھی جو اسے پنپنے نہ دیتی تھی۔ دونوں دوستوں میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میں ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ نعیم

کہتا تھا کہ یار تم ہی مزے میں ہو، ملک اور قوم کی کچھ خدمت تو کر رہے ہو۔ یہاں تو شکم پرستی کے سوا اور کسی کام کے نہ ہوئے۔ تم جدھر نکل جاتے ہو لوگ دعائیں دیتے ہیں یہاں چاروں طرف گالیاں ہی گالیاں ہیں۔

کیلاش خوب سمجھتا تھا کہ یہ صرف نعیم کا انکسار ہے۔ یہ میری بدحالی سے مغموم ہو کر میری اس طریقہ پر تشفی کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ اپنی واقعی حالت کو اس سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔

وشنوپور کی ریاست میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ریاست کا مینجر اپنے بنگلہ میں ٹھیک دوپہر کے وقت قتل کر دیا گیا تھا اگرچہ قاتل مفرور تھا مگر حکام کو شک تھا کہ کنور صاحب کی ترغیب ہی سے یہ خون ہوا تھا۔ کنور صاحب ابھی بالغ نہ ہوئے تھے۔ ریاست کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے ذریعہ ہوتا تھا۔ مینجر پر کنور صاحب کی نگرانی کی.......... ذمہ داری بھی تھی، عیش پسند کنور کو مینجر کا دخل دینا سخت ناگوار ہوتا تھا، دونوں میں برسوں کی کبید گی تھی۔ یہاں تک کہ کئی بار سخت کلامی کی نوبت بھی آ پہنچی تھی۔ پس کنور صاحب پر شک ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے حاکم ضلع نے مرزا نعیم کو تعینات کیا کسی اہلکار کی معرفت تحقیقات کرانے میں کنور صاحب کی توہین کا اندیشہ تھا۔

نعیم کو تقدیر سازی کا زریں موقع ملا۔ وہ نہ بے لوث تھا، نہ عقل مند سبھی اس کے طرز معاشرت کی کمزوریوں سے واقف تھے اگر کوئی جانتا تھا تو حکامِ سرکاری۔ کنور صاحب نے منہ مانگی مراد پائی۔ نعیم صاحب وشنوپور پہنچا تو اس کی حد سے زیادہ خاطر مدارت ہوئی نذریں گزرنے لگیں۔ اردلی چپراسی، پیشکار، سائس،

باورچی خدمت گار سبھی کی زبانیں تر اور مٹھائیاں گرم ہونے لگیں۔ کنور صاحب کے اہالی موالی رات دن گھیرے رہتے، گویا داماد سسرال آیا ہوا۔

ایک روز اعلی الصباح کو کنور صاحب کی ماں آ کر نعیم کے سامنے دستہ بستہ کھڑی ہو گئیں۔ نعیم لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ ریاضت پاکیزہ روی اور بیوگی کے اس آبدار مجسمہ کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ رانی نے اس کو مامتا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ حضور میرے بیٹے کی زندگی آپ کے ہاتھ ہے آپ ہی اس کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ آپ کو اسی ماں کی قسم ہے جس کے آپ لائق بیٹے ہیں کہ میرے بیٹے کی حفاظت کیجیے گا۔ میں اپنا تن من دھن آپ کے پیروں پر نثار کرتی ہوں۔ خود غرضی اور رحم کے اتصال نے نعیم کو پورے طور پر مسخر کر لیا۔

(۳)

انہیں دنوں کیلاش نعیم سے ملنے آیا۔ دونوں دوست بڑے تپاک سے گلے ملے۔ نعیم نے باتوں باتوں میں یہ سارا حال کہہ سنایا اور کیلاش پر اپنے طرزِ عمل کی واجبیت ثابت کرنی چاہی۔

کیلاش نے کہا میری رائے میں گناہ ہمیشہ گناہ ہے، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔

نعیم۔ اور میری رائے ہے کہ اگر گناہ سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ عین ثواب ہے کنور صاحب ابھی .... نوجوان شخص ہیں، نہایت ہونہار، عقل مند، سخی اور ہمدرد ہیں آپ ان سے ملیں تو خوش ہو جائیں وہ نہایت منکسر مزاج ہیں۔ منیجر واقعی

بدمزاج تھا، خواہ مخواہ کنور صاحب کو تنگ کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موٹر کے لیے اس نے روپے منظور کیے تو منظوری کی سفارش کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کنور صاحب کا یہ کام واجبی ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ انہیں مجرم ثابت کر کے کالا پانی کی ہوا کھلائی جاہے یا بے قصور ثابت کر کے ان کی جان بچائی جائے اور بھائی تم سے تو کوئی پردہ ہے نہیں پورے بیس ہزار کی رقم ہے بس مجھے اپنی رپورٹ میں یہ لکھ دینا ہوگا کہ ذاتی عناد کی وجہ سے واقعہ ہوا ہے، راجہ صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شہادتیں مل سکیں انہیں میں نے غائب کر دیا۔ مجھے اس کام کے لیے تعینات کرنے میں حکام کی ایک مصلحت تھی۔ کنور صاحب ہندو ہیں، اسی لیے کہ کسی ہندو حاکم کو تعینات نہ کر کے حاکم ضلع نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ یہ فرقہ وارانہ عناد مجھے بے لوث ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے دو چار موقعوں پر کچھ حکام کی ترغیب سے اور کچھ اپنی طبیعت سے مسلمانوں کی طرف داری کی جس سے یہ مشہور ہو گیا کہ میں ہندوؤں کا دشمن ہوں۔ ہندو لوگ تو مجھے جانب داری کا اوتار سمجھتے ہیں۔ یہ خیال مجھے الزامات سے بری کرنے کے لیے کافی ہے۔ بتلاؤ ہوں کہ قسمت ور کہ نہیں۔

کیلاش ''اگر کہیں بات ظاہر ہو گی تو؟''

نعیم ''یہ میری سمجھ کا پھیر، میری تحقیقات کا قصور، بشریت کے ایک اٹل قانون کا نمونہ ہوگا۔ میں کوئی عالم کل تو ہوں نہیں۔ میری نیت پر آنچ نہ آئے گی۔ مجھ پر رشوت ستانی کا شبہ نہ ہو سکے۔ آپ اس کے عملی پہلو پر نہ جائیے صرف اخلاقی پہلو پر نگاہ رکھیے۔ آیا کام حکمت عملی کے مطابق ہے یا نہیں؟ روحانی اصولوں کو کھینچ نہ

لائے گا۔ صرف حکمت عملی کے اصولوں سے اسے جانچیے۔''

کیلاش ''اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دیگر روؤسا کو بھی ایسی بداعمالیوں کی تحریک ہوگی۔ دولت سے بڑے بڑے پاپوں پر پردہ پڑ سکتا ہے۔ اس خیال کی اشاعت کا نتیجہ کتنا خوفناک ہوگا، اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں؟''

نعیم ''جی نہیں، میں یہ قیاس نہیں کر سکتا۔ رشوت اب بھی ۹۰ فیصدی مقدمات کی پردہ پوشی کرتی ہے، پھر گناہوں کا خوف ہر دل میں موجود ہے۔''

دونوں دوستوں میں دیر تک اس موضوع پر بحث ہوتی رہی لیکن کیلاش کا منصفانہ خیال نعیم کے مذاق اور تمسخر سے پیش نہ پاسکتا۔

(۴)

وشنو پور کے قتل پر اخبارات میں رائے زنی ہونے لگی۔ سبھی ہم آواز ہو کر راجہ صاحب کو ملزم قرار دیتے اور سرکار کو راجہ صاحب کی ناواجب طرف داری کرنے کی مجرم لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ ابھی یہ مقدمہ زیر تجویز ہے۔ پس اس پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

مرزا نعیم نے اپنی تحقیقات کو صحیح دکھلانے کے لیے پورا ایک مہینہ گزار دیا۔ جب ان کی رپورٹ شائع ہوئی تو سیاسی فضا میں تہلکہ مچ گیا۔ عوام کا شبہ یقین کے درجہ پر پہنچ گیا۔

کیلاش کے سامنے اب پیچیدہ مسئلہ آموجود ہوا۔ ابھی تک اس نے اس

معاملہ میں بالکل خاموش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ یہ طے نہ کر سکتا تھا کہ کیا لکھوں۔ گورنمنٹ کی طرف داری کرنا۔ اپنی روح کو پامال کرنا تھا۔ دل کی آزادی کو قربان کرتا تھا۔ مگر خاموش رہنا اور بھی ہتک آمیز تھا۔ آخر جب معاصرین میں دو چار نے اس پر حملے کرنے شروع کیے کہ اس کا سکوت بے وجہ نہیں ہے تو اس کے لیے کنارہ کش رہنا دشوار ہو گیا۔ اس کے ذاتی اور قومی فرائض میں سخت جدوجہد ہونے لگی۔ اس دوستی کو جس کا بیج پچیس سال قبل دل میں بویا گیا تھا۔ اور اب جو ایک گھنے بھاری درخت کی صورت اختیار کر چکی تھی دل سے نکالنا دل کو چیر ڈالنا تھا۔ وہ دوست جو اس کے دکھ میں دکھی اور سکھ میں سکھی ہوتا تھا جس کا فیاض دل ہمیشہ اس کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ جس کے گھر میں جا کر وہ اپنی تفکرات کو بھول جاتا تھا۔ جس کے گلے لگ کر وہ اپنی تکلیفوں سے نجات پا جاتا تھا جس کے دیکھتے ہی سے اسے تشفی استواری اور تازگی نصیب ہوتی تھی، اسی دوست کی جڑ کھودنی پڑے گی۔ وہ بری ساعت تھی جب میں نے اخباری دنیا میں قدم رکھا، ورنہ آج اس دھرم سنکٹ، میں کیوں پڑتا کتنی زبردست بے اعتباری کا کام ہو گا۔ اعتبار دوستی کا خاص جزو ہے۔ نعیم نے مجھ پر ہمیشہ اعتبار کیا ہے اس نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں رکھا۔ اس کی ان پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرنا اس کے ساتھ کتنی زبردست ناانصافی ہو گی، نہیں میں دوستی کو کلنک نہیں لگاؤں گا۔ اس کی سفیدی کو داغ دار نہیں ہونے دوں گا۔ دوستی کی بیخ کنی کروں گا۔ ایشور وہ دن نہ لاوے کہ میرے ہاتھوں نعیم کو نقصان پہنچے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر مجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو نعیم میرے لیے جان تک دید ینے کو تیار ہو جائے گا۔ اسی دوست کی میں دنیا کے سامنے توہین

کروں۔اس کی گردن پر کلہاڑا چلاؤں ایشور وہ دن مجھے نہ دکھانا۔

لیکن قومی فرض کی بات بھی کمزور نہ تھی۔اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ کے لیے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے۔وہ جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے اس۔اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور نا قابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضا ہے حتی کہ وہ اکثر اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا تھا۔اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور اس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقدر ہوتا ہے جنہوں نے قوم کو بنایا اور سنوارا ہے، جن کا نام امر ہو گیا ہے۔جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا کرتا جس سے اس کے پیش روؤں کی چمکتی ہوئی شہرت حاصل کر چکا تھا اس کی رائے عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔اس کے لیے بے خوف خیالات نے اس کی غیر جانبدارانہ رویہ نے اسے ایڈیٹروں کی جماعت کا پیشوا بنا دیا تھا۔اس میں اس کی توہین تھی پستی تھی، بزدلی تھی اور فرض کے راستے سے منحرف ہونا وار سیاسی حلقہ سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جانا تھا ایک شخص کی خواہ وہ مجھے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو،قوم کے سامنے کیا ہستی ہے؟نعیم کے بننے یا بگڑنے سے قوم پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔لیکن حکومت کی خود مختارانہ روش اور زیادتیوں پر پردہ ڈالنا قوم کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اسے اس کی پروا نہ تھی کہ میری راہ زنی کا ظاہرہ کوئی اثر ہو گا یا نہیں۔ایڈیٹر کی نگاہوں میں اپنی رائے شیر کی گرج کی

مانند معلوم ہوتی ہے۔ وہ شاید سمجھتا ہے کہ میرا قلم حکومت کو، ساری دنیا کو، ہلا دے گا۔ شاید میرے قلم کی جنبش سے پورا برہمانڈ کانپ اٹھے گا۔ میرے خیالات کا ظہور انقلاب عظیم پیدا کر دے گا۔ نعیم میرا دوست ہے، مگر قوم میری دیوی ہے کیا اپنے دوست کی حفاظت کے لیے اپنی قاتل پرستش دیوی کو مہلک چوٹ پہنچاؤں؟

کئی روز تک کیلاش کے شخصی اور راداری فرائض میں مجالہ ہوتا رہا۔ آخر قومیت نے شخصیت کو شکست دی اس نے تہیہ کر لیا کہ اس راز کی اصلیت ظاہر کر دوں گا۔ حکومت کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کو عوام کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔ حکومت کے اہل کاروں کی خود غرضیوں کا نمونہ دکھا دوں گا۔ دنیا پر روشن کر دوں گا کہ سرکار کن آنکھوں سے دیکھتی ہے اور کن کانوں سے سنتی ہے۔ اس کی نا قابلیت اور اس کی کمزوری کو ثابت کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کون سی مثال ہو سکتی ہے۔ نعیم میرا دوست ہے تو ہوا کرے۔ قوم کے مقابلہ میں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نقصان کے خیال سے میں قومی فرض سے کیوں منہ موڑوں؟ اپنی آتما کو کیوں بگاڑ دوں؟ اپنی آزادی کو کیوں بدنام کروں؟ آہ! جان سے عزیز نعیم! آج تم جیسے عزیز دوست کو میں فرض پر قربان کرتا ہوں۔ مگر تمہاری جگہ اگر میرا خاص لڑکا ہوتا تو اسے بھی اس کی فرض کی درگاہ میں قربان کر دیتا۔

دوسرے روز سے کیلاش نے اس المناک واقعہ پر لکھنا شروع کیا جو کچھ اس نے نعیم سے سنا تھا وہ سب ایک سلسلۂ مضامین کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ ’’گھر کا بھیدی لنکا ڈھاوے! دوسرے ایڈیٹروں کو جہاں قیاس دلیل اور بحث کی بنا پر اپنی رائے قائم کرنی پڑتی تھی اور اس لیے وہ کتنی ہی فضول اور قابلِ اعتراض باتیں

لکھ ڈالتے تھے وہاں کیلاش کی رائے عین ثبوتوں سے مزین ہوتی تھی وہ بڑے پتے کی باتیں کہتا تھا اور ایسی بے خوفی سے جو روشن ضمیری کا اظہار کرتی تھی۔اس کے مضامین میں طول کم تفتیش زیادہ ہوتی تھی۔اس نے نعیم کو بھی نہ چھوڑا۔اس کی حرص وطمع کا خوب مضحکہ اڑایا۔یہاں تک کہ ان روپیوں کی تعداد بھی لکھدی جو اس ناجائز معاملہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے دی گئی تھی۔سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے نعیم سے ایک قومی جاسوس کی ملاقات کا تذکرہ بھی کیا تھا جس نے نعیم کو روپیہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔آخر میں سرکار کو بھی چنوتی دی کہ اگر اس میں ہمت ہو تو میرے ثبوت کی تردید کرے اتنا ہی نہیں، اس نے وہ گفتگو بھی حرف بحرف شائع کردی جو اسکے اور نعیم کے درمیان ہوئی۔رانی کا نعیم کے پاس انا، اس کے پیروں پڑنا، کنور صاحب کا نعیم کے پاس انواع واقسام کے تحائف لے کر جانا، ان سبھی باتوں نے اس کے مضامین میں ایک جاسوسی ناول کا لطف پیدا کر دیا۔‘‘

ان مضامین نے سیاسی فضا میں ہل چل پیدا کردی۔ایڈیٹر صاحب ان کو حکام پر نشانہ لگانے کے لیے ایسے مواقع بڑی خوش قسمتی سے ملتے ہیں جگہ جگہ اس حکومت کے کرتوت کی مذمت کرنے کے لیے جلسے ہونے لگے۔کئی ممبروں نے قانونی مجالس میں اس بارے میں سوال کرنے کی نوٹس دی۔حکام کو بھی ایسی منہ کی کھانی پڑی تھی۔آخر انہیں اپنی عزت کی حفاظت کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی کہ وہ مرزا نعیم کو کیلاش پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلانے کے لیے مجبور کریں۔

(۵)

کیلاش پر استغاثہ دائرہ ہوا۔مرزا نعیم کی طرف سے سرکار پیروی کرتی تھی۔ کیلاش خودہی پیروی کرر ہا تھا۔انصاف کے خاص محافظ صاحبانِ (وکیل بیرسٹر وغیرہ) نے کسی نامعلوم سبب سے ان کی پیروی کرنا منظور نہ کیا۔حاکم کومجبور ہوکر کیلاش کو قانونی سند نہ رکھنے پر بھی اپنے مقدمے کی اجازت دینی پڑتی۔مقدمہ مہینوں تک چلتا رہا۔عوام میں سنسنی پھیل گئی۔روز ہزاروں آدمی عدالت میں جمع ہوتے تھے بازاروں میں مقدمہ کی خبر پڑھنے کے لیے اخباروں کی لوٹ ہوتی تھی ہوشیار پڑھنے والے پڑھے ہوئے اخباروں سے گھڑی رات جاتے جاتے دوگنے پیسے کھرے کرلیتے تھے کیوں کہ اس وقت تک اخبارفروشوں کے پاس ایک پرچہ نہ رہ جاتا تھا،جن باتوں کا علم پہلے اخبارات کے محض ان گنے گاہکوں کوتھا ان پر اب عوام رائے زنی کرنے لگے۔نعیم کی مٹی کبھی اتنی پلید نہ ہوئی تھی گلی گلی،گھر گھر،اسی کا چرچا تھاعوام کا غصہ اس پرمرکوز ہوگیا تھا۔وہ دن بھی یادگار رہے گا جب دونوں سچے اور ایک دوسرے پر جان دینے والے دوست عدالت میں بالمقابل کھڑے ہوئے اور کیلاش نے مرزا نعیم سے جرح شروع کی۔کیلاش کوایسی روحانی تکلیف ہورہی تھی۔گویا وہ نعیم کی گردن پرتلوار پھیرنے جارہا ہےاورنعیم کے لیےوہ سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے،ایک کادلی تکلیف سے اور دوسرے کا خوف سے نعیم ظاہرہ خوش ہونے کی کوشش کرتا تھا۔کبھی کبھی خشک ہنسی بھی ہنستا تھالیکن کیلاش،آہ اس غریب کے دل پر جوگزر رہی تھی۔اسے

کون جان سکتا ہے؟

کیلاش نے پوچھا ''آپ اور میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اسے آپ تسلیم کرتے ہیں؟''

نعیم ''ضرور تسلیم کرتا ہوں۔''

کیلاش ''ہم دونوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہم آپس میں کوئی پردہ نہ رکھتے تھے۔ اسے بھی آپ تسلیم کرتے ہیں؟''

کیلاش ''کیا آپ نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ کنور صاحب کی تحریک سے یہ قتل ہوا ہے؟''

نعیم: ''ہرگز نہیں۔''

کیلاش: ''آپ کی زبان سے یہ الفاظ نہیں نکلے تھے کہ بیس ہزار کی تھیلی ہے؟''

نعیم ذرا بھی نہ جھجکا، ذرا بھی محجوب نہ ہوا، اس کی زبان میں ذرا بھی لکنت نہ ہوئی۔ آواز میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوئی، اس کے چہرہ پر بے اطمینانی، پریشانی یا بے صبری کی کوئی بھی علامت نظر نہ آئی وہ ساکت کھڑا رہا کیلاش نے بہت ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا تھا اسے خوف تھا کہ نعیم اس کا جواب نہ دے سکے گا۔ لیکن نعیم نے بے خوفی سے کہا۔ ''ممکن ہے، آپ نے مجھ سے خواب میں باتیں سنی ہوں۔''

کیلاش ایک لمحہ کے لیے دنگ ہو گیا۔ پھر اس نے حیرت سے نعیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں نے دو چار موقعوں پر مسلمانوں کی طرف داری کی ہے اور اسی لیے ہندوؤں کا مخالف سمجھ کر اس تحقیقات کا کام

میرے سپرد کیا گیا ہے؟

نعیم ذرا بھی نہ جھجکا، استقلال اور سکون کے لہجہ میں والا۔ ''واقعی میں بولا۔ واقعی آپ کا تخیل نہایت تعجب خیز ہے۔ برسوں تک آپ کے ساتھ رہنے پر بھی مجھے یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ آپ میں واقعاتی کی ایسی حیرت انگیز قوت ہے۔''

کیلاش نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ اسے اپنے ہار کا غم نہ تھا، غم جو تھا۔ نعیم کے اخلاقی زوال کا۔ وہ گمان بھی نہ کرسکتا تھا کہ کوئی شخص اپنے منہ سے کہی ہوئی بات سے ایسی بے حیائی کے ساتھ انکار کرسکتا ہے اور وہ بھی اسی شخص کے منہ پر جس سے یہ بات کہی گئی ہو۔ یہ انسانی کمزوری کی انتہا ہے وہ نعیم جس کا ظاہرہ باطن ایک تھا۔ جس کے قول وفعل میں فرق نہ تھا جس کی تقریر دل جذبات کا آئینہ تھی، وہ نعیم، وہ سادہ، خوددار، راست باز نعیم ایسا جھوٹا اور مکار ہوسکتا ہے! کیا غلامی کے سانچے میں ڈھل کر انسانی اپنی انسانیت کھو بیٹھتا ہے؟ کیا یہ نیک اوصاف کو معکوس بنا دینے کی مشین ہے۔

عدالت نے نعیم کو بیس ہزار روپیوں کی ڈگری دے دی! کیلاش پر گویا بجلی گری!

(۶)

اس فیصلہ پر سیاسی دینا میں پھر کہرام مچا۔ سرکار کے جانبدار اخبارات نے کیلاش کو فریبی بتایا، عوام کی طرف والوں نے نعیم کو شیطان کہا۔ نعیم کی دیدہ دلیری

نے سرکاری انصاف کی نگاہوں میں خواہ اسے بے قصور ٹھہرایا ہو مگر عوام کی نظروں میں تو اسے اور بھی ذلیل کر دیا۔ کیلاش کے پاس ہمدردی کے خطوط اور تار آنے لگے۔ اخبارات میں اس کی ہمت اور راست بازی کی تعریف ہونے لگی۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور عدالت کے فیصلہ پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔ مگر سوکھے بادلوں سے تو زمین سیراب نہیں ہوتی۔ روپے کہاں سے آئیں اور وہ بھی ایک دم بیس ہزار۔ معیار پرستی کی یہ قیمت ہے۔ قومی خدمت، مہنگا سودا ہے۔ بیس ہزار اتنے روپے تو کیلاش نے شاید خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے اب وہی دینے پڑیں گے۔ کہاں سے دے گا؟ اتنے روپیوں کے سود ہی سے وہ کب معاش کی تفکرات سے نجات پا سکتا تھا۔ اسے اپنے اخبار میں اپنی مصیبت کا رونا رو کر چندہ فراہم کرنے سے نفرت تھی میں نے اپنے گاہکوں کی صلاح لے کر اس شیر سے مورچہ نہیں لیا تھا۔ منیجر کی وکالت کرنے کے لیے کسی نے میرا گلا نہیں دبایا تھا۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر حکام کو للکارا تھا۔ جس کام کے لیے میں تنہا ذمہ دار ہوں اس کا بار اپنے گاہکوں پر کیوں ڈالوں؟ بے انصافی ہے، ممکن ہے عوام میں تحریک کرنے سے دو چار ہزار روپے ہاتھ آ جائیں۔ مگر یہ ادارتی معیار کے خلاف ہے۔ اس سے میری شان میں بٹا لگتا ہے دوسروں کو یہ کہنے کا کیوں موقع دوں کہ اور کے ماتھے پکوڑیاں کھائیں تو کیا بڑا جگت جیت لیا؟ جب جانتے کہ اپنے بل بوتے پر گرجتے۔ بے خوفی سے رائے زنی کا سہرا تو میرے سر بندھا، اس کی قیمت کیوں دوسروں سے وصول کروں؟ میرا اخبار بند ہو جائے، میں پکڑ کر قید کیا جاؤں، میرا مکان قرق کیا جائے، برتن وغیرہ نیلام ہو جائیں یہ سب سے مجھے منظور ہے جو کچھ سر پڑے گی۔

بھگت لوں گا، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا۔

طلوع آفتاب کا وقت تھا۔ مشرق سے نورانی شعاعیں ایسی دوڑی چلی آتی تھیں۔ جیسے آنکھ میں آنسوؤں کی لڑیاں سرد ہوا کلیجے میں یوں لگتی تھی جیسے کسی کے آہ و بکا کی آواز ''سامنے کا میدان کسی مغموم دل کی طرح روحانی تیروں سے بند رہا تھا۔ مکان میں وہ خاموشی تھی جو گھر کے مالک کی خاموش گریہ کی خبر دیتی ہے نہ لڑکوں کا شور و غل تھا اور نہ ماں کی سکوں گستر لفظی دھمکیاں۔ جب چراغ بجھ رہا ہو تو گھر میں اجالا کہاں سے آوے؟ یہ اطمینان کا اثر نہیں غم کا اثر تھا، کیوں کہ آج ہی قرق امین کیلاش کے مال و اسباب کو نیلام کرنے کے لیے آنے والا تھا۔''

اس دلی رنج سے بے قرار ہو کر کہا۔ آہ، آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس مکان کی تعمیر میں اپنی زندگی کے پچیس سال لگا دیے وہ آج تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اخبار کی گردن پر چھری پھر جاوے گی۔ میرے پیروں میں ذلت و مضحکہ کی بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ چہرے پر کالک لگ جائے گی یہ سکوں بخش مکان اجڑ جائے گا اور یہ مغموم کنبہ کسی.......... مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح بکھر جائے گا؟ دنیا میں اس کے لیے کہیں بھی سہارا نہیں ہے۔ عوام کی یاد میں قیام نہیں ہوتی تھوڑے ہی عرصہ میں میری خدمات سہو کی تاریکی میں جذب ہو جائیں گی۔ کسی کو میرا خیال بھی نہ رہے گا۔ کوئی میری مصیبت پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہو گا۔

دفعتاً اس کو یاد آیا کہ آج کے لیے ابھی افتتاحیہ مضمون لکھنا ہے آج اپنے ہمدرد ناظرین کو خبر دوں کہ اس اخبار کی زندگی کا آخری دن ہے، اسے پھر آپ کی

خدمت میں پہنچنے کا افتخار نہ حاصل ہوگا ہم سے متعدد خطائیں سرزد ہوئی ہونگی۔ آج ہم ان کے لیے آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔آپ نے ہمارے ساتھ جو رفاقت اور ہمدردی کی ہے اس کے لیے ہم ہمیشہ آپ کے ممنون رہیں گے ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ یہ خوش نصیبی انہیں کا حصہ ہے جو اپنے فرض کے راستے میں اٹل رہتے ہیں۔افسوس یہی ہے کہ ہم قوم کے لیے اس سے بھی زیادہ قربانی کرنے کے قابل نہ ہو سکے اس مضمون کو شروع سے آخر تک سوچ کر کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی۔گردن اٹھا کر دیکھا تو مرزا نعیم تھے! وہی ہنس مکھ صورت وہی دلاویز تبسم، وہی شوخی بھری آنکھیں، آتے ہی کیلاش کے گلے سے لپٹ گیا۔

کیلاش نے گلا چھڑاتے ہوئے کہا ''کیا کہاں! کیا میرے زخم پر نمک چھڑکنے آئے ہو میری لاش کو پیروں سے ٹھکرانے آئے ہو۔''

نعیم نے اس کی گردن کو اور زور سے دبا کر کہا ''اور کیا محبت کے یہی تو مزے ہیں۔''

کیلاش ''مجھ سے مذاق نہ کرو۔بھرا بیٹھا ہوں، مار بیٹھوں گا۔''

نعیم کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔بولا ''آہ ظالم، میں تیری زبان سے یہی سخت لفظ سننے کے لیے تو بے قرار ہو رہا تھا۔جی بھر کے کوسو، خواب گالیاں دو مجھے اس میں نغمہ شیریں کا مزہ آ رہا ہے۔''

کیلاش ''اور ابھی جب قرق امین میرا گھر بار نیلام کرنے آ ؤ گے تو کیا ہوگا؟ بولو، اپنی جان بچا کر تو الگ ہو گئے۔''

نعیم ''ہم دونوں مل کر خوب تالیاں بجائیں گے اور اسے بندر کی طرح نچا دیں گے۔''

کیلاش ''تم اب پٹو گے میرے ہاتھوں سے۔ظالم! تجھے میرے بچوں پر بھی رحم نہ آیا۔''

نعیم ''تم نے بھی تو چلے مجھ سے زور آزمائی کرنے۔کوئی وقت تھا۔جب باری تمہارے ہاتھ رہتی تھی۔اب میرے ہے۔تم نے موقع محل کا خیال نہیں کیا بس مجھ پر برس پڑے۔''

کیلاش ''سچائی کی ذلت کرنا میرے اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔''

نعیم ''اور سچائی کا گلا گھونٹنا میرے اصول کے عین مطابق۔''

کیلاش ''ابھی ایک پورا کنبہ تمہارے گلے مڑھ دوں گا،تو اپنی قسمت کو روؤ گے۔دیکھنے میں تمہارا نصف بھی نہیں مگر بچے پیدا کرنے میں تم جیسے تین سے بھی زیادہ وزنی ہوں۔پورے سات بچے ہیں۔کم نہ زیادہ!''

نعیم ''اچھا اؤ کچھ کھلاتے پلاتے ہو یا تقدیر کا مرثیہ ہی گائے جاؤ گے؟ تمہارے سر کی قسم بہت بھوکا ہوں،گھر سے بلا کھائے ہی چل پڑا تھا۔''

کیلاش ''یہاں آج سولہوں ڈنڈا ایکادشی ہے۔سب کے سب غم میں بیٹھ ہوئے اسی عدالتی جلاد کی راہ دیکھ رہے ہیں۔کھانے پینے کا کیا ذکر؟ تمہارے بیگ میں کچھ ہو تو نکالو،آج ساتھ بیٹھ کر کھالیں،پھر تو زندگی بھر کا رونا ہی ہے۔''

نعیم ''پھر تو ایسی شرارت نہ کرو گے۔''

کیلاش ''واہ،یہ تو اپنے بال بال میں سرایت کر گئی ہے۔جب تک سرکار حیوانی

طاقت سے ہم پر حکومت کرتی رہے گی، ہم اس کی مخالفت کرتے رہیں گے۔ افسوس یہی ہے کہ مجھے اس کا موقع ہی نہ ملے گا۔ مگر تمہیں بیس ہزار میں سے بیس بھی نہ ملیں گے۔ یہاں ردی کے انبار کے سوا اور کچھ اور نہیں ہے۔''

نعیم ''اجی میں تم سے بیس ہزار کے بجائے اس کا پانچ گناہ وصول کرلوں گا۔ تم ہو کس پھیر میں؟''

کیلاش ''منہ دھو رکھو۔''

نعیم ''مجھے روپیوں کی ضرورت ہے آؤ کچھ سمجھوتہ کرلو۔''

کیلاش ''کنور صاحب کی بیس ہزار روپے ہضم کر گئے پھر بھی آسودگی نہیں ہوئی۔ بدہضمی ہو جائے گی۔''

نعیم ''روپیہ سے روپیہ کی تشنگی بڑھتی ہے، آسودگی نہیں ہوتی۔ کچھ معاملہ کرلو، سرکاری اہل کاروں کی معرفت معاملہ کرنے میں اور بھی زیر باری ہوگی۔''

کیلاش ''ارے تو کیا معاملہ کرلوں؟ یہاں کاغذوں کے سوا اور کچھ ہو بھی تو!''

نعیم ''میری بے باقی بھر کو بہت ہے۔ اچھا اسی بات پر سمجھوتہ کرلو کہ میں جو چیز چاہوں گا۔ پھر رونا نہیں۔''

کیلاش ''اجی۔ تم سارا دفتر سر پر اٹھا لے جاؤ، مجھے پکڑ لے جاؤ، اور میٹھے ٹکڑے کھلاؤ۔ قسم نے جو ذرا چوں وچرا کروں؟''

نعیم ''نہیں، میں صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔ صرف ایک چیز؟''

کیلاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سوچنے لگا کہ میرے پاس ایسی کونسی بیش قیمت چیز ہے؟ کہیں مجھ سے مسلمان ہونے کو نہ کہے گا۔ یہی امکان ایک چیز ہے،

جس کی قیمت ایک سے لے کر بے شمار روپیوں تک رکھی جا سکتی ہے خیر ذرا دیکھوں تو حضرت کہتے کیا ہیں؟

اس نے پوچھا ”کیا چیز؟“

نعیم ”مسز کیلاش سے ایک منٹ تک تنہائی میں گفتگو کرنے کی اجازت۔“

کیلاش نے نعیم کے سر پر ایک چپت لگا کر کہا ”پھر وہی شرارت سیکڑوں بار تو دیکھ چکے ہو، ایسی کون اندر کی پری ہے۔“

نعیم ”وہ جو کچھ بھی ہو، معاملہ کرتے ہو تو کرو۔ مگر یاد رکھنا تنہائی کی شرط ہے۔“

کیلاش ”منظور ہے! پھر جو ڈگری کے روپے طلب کیے گئے تو نوچ ہی کھاؤں گا؟“

نعیم ”دل سے منظور ہے!“

کیلاش ”(آہستہ سے) مگر یار! نازک مزاج عورت ہے، کوئی بے ہودہ مذاق نہ کر بیٹھنا۔“

نعیم ”جی، ان باتوں میں مجھے آپ کی نصیحت کی حاجت نہیں مجھے کمرے میں لے تو چلیے۔“

کیلاش ”سر نیچے کیے رہنا“

نعیم ”اجی آنکھوں میں پٹی باندھ دوں۔“

کیلاش کے مکان میں پردہ نہ تھا۔ اما مغموم بیٹھی ہوئی تھی۔ دفعتاً نعیم اور کیلاش کو دیکھ کر چونک پڑی، بولی ”آئیے مرزا جی۔ اب کے تو بہت دنوں میں یاد کیا۔“

کیلاش ”وہیں نعیم کو چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل آیا لیکن پردہ کے آڑ سے چھپ

کر دیکھنے لگا کہ ان میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ اسے کچھ بدگمانی نہ تھی صرف حیرت تھی۔''

نعیم ''ہم سرکاری آدمیوں کی اتنی فرصت کہاں؟ ڈگری کے روپے وصول کرنے تھے اس لیے چلا آیا ہوں۔''

اما کہاں تو مسکرا رہی تھی کہاں روپے کا نام سنتے ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ متانت سے بولی ''ہم لوگ خود اسی فکر میں ہیں کہیں روپے ملنے کی امید نہیں ہے اور ان کو عوام سے اپیل کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔''

نعیم ''اجی، کہتی کیا ہیں؟ میں نے سب روپے پائی پائی وصول کر لیے۔''

اما نے متحیر ہو کہا ''سچ؟ ان کے پاس روپے کہاں تھے؟''

نعیم ''ان کی ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔ آپ سے کہہ رکھا ہو گا کہ میرے پاس کوڑی نہیں ہے۔ لیکن میں نے چٹکیاں بجاتے وصول کر لیا آپ اٹھئے اور کھانے کا انتظام کیجیے۔''

اما ''روپے بھلا کیا دیے ہوں گے مجھے اعتبار نہیں ہوتا۔''

نعیم ''آپ سیدھے مزاج کی ہیں اور وہ ایک ہی کائیاں اسے تو میں خوب جانتا ہوں، اپنی غریبی کے دکھڑے سنا سنا کر آپ کو چکما دیا کرتا ہو گا۔''

کیلاش مسکراتے ہوئے کمرہ میں آئے اور بولے ''اچھا اب نکلیئے باہر! یہاں بھی اپنی شیطانیت سے باز نہیں آئے۔''

نعیم ''روپیوں کی رسید تو لکھ دوں۔''

اما ''کیا تم نے روپے دے دیے؟ کہاں ملے؟''

کیلاش ''پھر کبھی بتلا دوں گا۔ اٹھیے حضرت!''

اما ''بتلاتے کیوں نہیں، کہاں سے ملے؟ مرزا سے کون سا پردہ ہے؟''

کیلاش ''تم اما کے سامنے توہین کرنا چاہتے ہو۔''

نعیم ''تم نے ساری دنیا کے سامنے میری توہین نہیں کی؟''

کیلاش ''تمہاری توہین کی تو اس کے لیے بیس ہزار روپے نہیں دینے پڑے؟''

نعیم ''میں بھی اسی ٹکسال سے روپے دے دوں گا۔ اما! میں روپے پا گیا۔ ان بیچارے کا پردہ ڈھکا ہی رہنے دو۔''

بھاڑے کا ٹٹو

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری'' جولائی ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: اردو میں ''۱۹۲۹ء میں (فردوس خیال)''

(۱)

آگرہ کالج کے میدان میں شام کو دونوں جوان ہاتھ میں ہاتھ دیے ٹہل رہے تھے۔ ایک کا نام جسونت تھا، اور دوسرے کا رمیش۔ جسونت قد و قامت کا اونچا اور طاقت ور تھا۔ اس کے چہرے پر باقاعدگی اور صحت کی جھلک تھی۔ رمیش پستہ قد، چھیرے بدن کا، بے رونق اور کمزور تھا، دونوں میں کسی بات پر مباحثہ ہو رہا تھا۔

جسونت نے کہا۔ ''میں آتما کے مقابلے میں دولت کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا۔''

رمیش بولا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے۔''

جسونت۔ ''ہاں دیکھ لینا۔ تم طعنے دیتے رہو، لیکن میں دکھلا دوں گا کہ میں دولت کو کتنی حقیر چیز سمجھتا ہوں۔''

رمیش ''خیر دکھلا دینا۔ میں تو روپے کو اتنا حقیر نہیں سمجھتا۔ روپے کے لیے آج پندرہ برس سے کتابیں چاٹ رہا ہوں۔ روپے کے لیے والدین عزیز، رشتے دار، سب سے علیحدہ یہاں پڑا ہوا ہوں، نہ جانے ابھی کتنی سلامیاں دینی پڑیں گی، کتنی خوشامد کرنی پڑے گی۔ کیا اس میں روحانی زوال نہ ہوگا۔ میں تو اتنے بلند معیار پر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہاں تو اگر کسی مقدمے میں اچھی رشوت ملے تو شاید چھوڑ نہ

سکوں، کیا تم چھوڑ دو گے؟"

جسونت "میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم جتنے پست بنتے ہو اتنے نہیں ہو۔"

رمیش "میں اس سے کہیں پست تر ہوں جتنا کہتا ہوں۔"

جسونت "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اپنے فائدہ کے لیے تم کسی کو نقصان پہنچا سکو گے۔"

رمیش "بھائی دنیا میں معیارانہ روش صرف سنیاسی ہی اختیار کر سکتا ہے۔ میں تو نہیں کر سکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمہیں دھکا دے کر تم سے بازی جیت سکوں تو تمہیں ضرور گرا دوں گا اور برا نہ مانو تو کہہ دوں کہ تم مجھے ضرور گرا دو گے۔ خودغرضی کا ترک کرنا مشکل ہے۔"

جسونت "تو میں کہوں گا کہ تم بھاڑے کے ٹٹو ہو۔"

رمیش۔ اور میں کہوں گا کہ تم کاٹھ کے الو ہو۔

(۲)

جسونت اور رمیش ایک ساتھ ہی اسکول میں داخل ہوئے اور ایک ہی ساتھ ڈگریاں لے کر کالج سے نکلے۔ جسونت کسی قدر کم فہم مگر بلا کا محنتی تھا جس کام کو ہاتھ میں لیتا اس سے چمٹ جاتا اور اسے پورا ہی کر کے چھوڑتا۔ رمیش تیز تھا مگر کاہل، گھنٹہ بھر تک جم کر بیٹھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ ایم اے تک وہ آگے رہا اور

جسونت پیچھے محنت دانائی سے ہارتی رہی۔ لیکن سول سروس میں پانسہ پلٹ گیا۔ جسونت سب کام چھوڑ کر کتابوں سے لگ گیا۔ گھومنا پھرنا سیر وتفریح، کھیل و تماشے، سرکس، تھیٹر، یار دوست سب سے منہ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا۔ رمیش دوستوں کے ساتھ غپ شپ اڑاتا اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ کبھی کبھی تفریحاً کتابیں بھی دیکھ لیتا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اب کے بھی میری تیز فہمی بازی لے جائے گی۔ اکثر جا کر جسونت کو دق کرتا۔ اس کی کتاب بند کر دیتا، کہتا، کیوں جان دے رہے ہو؟ سول سروس کوئی مایۂ نجات تو ہے نہیں جس کے لیے دنیا سے ترک تعلق کر لیا جاوے۔ یہاں تک کہ جسونت اسے آتا دیکھتا تو دروازہ بند کر لیتا۔

آخر امتحان کا دن آ پہنچا۔ جسونت نے سب کچھ یاد کیا تھا مگر کسی سوال کا جواب سوچنے لگتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھول گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ رمیش پیشتر سے کچھ سوچنے کا عادی نہ تھا۔ سوچتا کہ جب پرچہ سامنے آوے گا۔ اس وقت جاوے گا۔ وہ خود اعتباری سے پھولا پھرتا تھا۔

امتحان کا نتیجہ شائع ہوا تو سست کچھوا تیز خرگوش سے بازی مار لے گیا۔

اب رمیش کی آنکھیں کھلیں، مگر وہ مایوس نہ ہوا۔ قابل شخص کے لیے شہرت اور دولت کی کمی نہیں اسے اس کا یقین تھا۔ اس نے قانونی امتحان کی تیاری شروع کی اور اگرچہ اس نے زیادہ محنت نہ کی، پھر بھی اول درجہ میں پاس ہوا۔ جسونت نے اس کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ وہ اب ایک ضلع کا حاکم ہو گیا تھا۔

(۳)

دس سال گزر گئے۔ جسونت دل و جان سے کام کرتا تھا۔ اور اس کے افسر اس سے بہت خوش تھے۔ مگر افسر جس قدر خوش تھے ماتحت اسی قدر ناخوش رہتے تھے۔ وہ خود جتنی محنت کرتا تھا، ماتحتوں سے بھی اتنی ہی محنت لینا چاہتا تھا، خود جتنا بے لوث تھا، ماتحتوں کو بھی اتنا ہی بے لوث بنانا چاہتا تھا۔ ایسے لوگ بڑے کارگزار سمجھے جاتے ہیں۔ جسونت کی کارگزاری کا افسروں پر سکہ جمتا جاتا تھا۔ پانچ ہی سال میں وہ ضلع کا جج بنا دیا گیا۔

رمیش اتنا خوش نصیب نہ تھا۔ وہ جس اجلاس میں وکالت کرتے جاتا وہیں ناکامیاب رہتا۔ حاکم کو وقت مقرر پر آنے میں دیر ہو جاتی تو خود ہی چل دیتا اور پھر بلانے سے بھی نہ آتا۔ اگر حاکم وقت کی پابندی نہیں کرتا تو میں کیوں کروں؟ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ گھنٹوں اس کے اجلاس میں کھڑا اس کی راہ دیکھا کروں؟
مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ گھنٹوں اس کے اجلاس میں کھڑا اس کی راہ دیکھا کروں؟
بحث اتنی بے خوفی سے کرتا کہ خوشامدی حکام کی نگاہوں میں اس کی یہ بے خوفی گستاخی معلوم ہوتی۔ تحمل اسے چھو نہیں گیا تھا۔ حاکم یا ہو، یا مقابل کا وکیل جو اس کے منہ لگتا اسی کی خبر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ ضلع کے جج سے بھی لڑ بیٹھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سند چھین لی گئی مگر موکلوں کے دل میں اس کی عزت ویسی ہی قائم و برقرار رہی۔

اب اسے آگرہ کالج میں پروفیسری کا عہدہ مل گیا۔ مگر بدقسمتی نے وہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ پرنسپل نے پہلے ہی روز جھگڑا ہو گیا۔ پرنسپل کا اصول یہ تھا کہ طلبا کو سیاسی امور سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ وہ اپنے کالج کے کسی معلم کو کسی سیاسی جلسے میں

شریک نہ ہونے دیتے۔ رمیش پہلے ہی روز سے اس حکم کی علانیہ مخالفت کرنے لگا۔ اس کا قول تھا کہ اگر کسی کو سیاسی جلسوں میں جانا چاہیے تو طلبا کو ان کی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ دیگر ممالک میں طلبا نے ملکی حالت کو تبدیل کر دیا تو اس ملک میں ان کی زبان کیوں بند کی جاتی ہے؟ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی رمیش کو استعفے دینا پڑا، مگر طلبا پر اس کا جو اثر تھا اس میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہوئی۔

اس طرح کچھ تو اس کے مزاج اور کچھ موجودہ حالات نے رمیش کو مار مار کر حکیم بنا دیا۔ پہلے مؤکلوں کی طرف ہو کر عدالت سے لڑا۔ پھر طلبا کی جانب داری کر کے پرنسپل سے عداوت مول لی اور اب رعایا کا ساتھ دے کر سرکار کو چنوتی دی۔ وہ فطرتاً بے خوف، معیار پرست، راست باز اور خود دار تھا۔ ایسے شخص کے لیے رعایا کا خادم بننے کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا؟ اخباروں میں واقعات حاضرہ پر اس کے مضامین نکلنے لگے۔ اس کی رائے اتنی صاف اتنی جامع اور اتنی پراثر ہوتی تھی کہ جلد ہی اس کی شہرت ہو گئی لوگ مان گئے کہ اس فضا میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا ہے۔ حکام اس کے مضامین پڑھ کر تلملا اٹھتے تھے۔ اس کا نشانہ اتنا ٹھیک بیٹھتا تھا کہ اس سے بچنا ناممکن تھا۔ مبالغے تو ان کے سروں پر ہو کر بالا بالا نکل جاتے تھے۔ جو صرف دور ہی سے ان کا تماشہ دیکھ سکتے تھے۔ امور معلومہ کی تحقیر کر سکتے تھے۔ یہ سب ہتھیار ان کے پاس تک پہنچتے ہی نہ تھے۔ راستے ہی میں گر جاتے تھے۔ مگر رمیش کے نشانے ٹھیک سروں پر بیٹھتے اور حکام میں تہلکہ اور کہرام برپا کر دیتے تھے۔

ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ جسونت اپنے قدیم دوست کے مضامین کو پڑھ پڑھ کر کانپ اٹھتے تھے۔ اندیشہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں قانون کی زد میں آ جائے، بار بار اسے محتاط رہنے کی تاکید کرتے، بار بار منتیں کرتے کہ ذرا اپنے قلم کو نرم کر دو اور جان بوجھ کر کیوں قانونی سانپ کے منہ میں انگلی ڈالتے ہو؟ لیکن رمیش کو لیڈری کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ ان باتوں کا جواب تک نہ دیتا تھا۔

پانچویں سال جسونت تبدیل ہو کر آگرہ کالج چلا گیا۔

(۴)

ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ خفیہ پولیس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی فرضی داستانیں سن سن کر حکام کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کہیں اخباروں کا منہ بند کیا جاتا تھا۔ کہیں رعایا کے لیڈروں کا خفیہ پولیس نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے حکام کے اس طرح کان بھرے کہ انہیں ہر ایک آزاد خیال شخص خونی اور قاتل نظر آتا تھا۔

رمیش یہ اندھیرا دیکھ کر خاموش بیٹھنے والا انسان نہ تھا۔ جیوں جیوں حکام کی خودمختاری بڑھتی جاتی تھی۔ اس نسبت سے اس کے جوش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں لیکچر دیتا اور عموماً اس کے سارے لیکچر باغیانہ خدمات سے مملو ہوتے تھے۔ صاف اور کھری بات کہنا ہی بغاوت ہے۔ اگر کسی کا لیکچر باغیانہ نہیں سمجھا گیا تو سمجھ لو کہ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپا رکھا ہے۔ اس کے دل

میں جو کچھ ہے اسے زبان پر لانے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔ رمیش نے دلی جذبات کو مخفی رکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ رعایا کا لیڈر بن کر جیل اور پھانسی سے ڈرنا کیا؟ جو آفت آنی ہو آوے۔ وہ سب کچھ سہنے کو تیار بیٹھا تھا۔ حکام کی نظروں میں وہی سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا۔

ایک روز جسونت نے رمیش کو اپنے یہاں بلا بھیجا۔ رمیش کے جی میں تو آیا کہ کہہ دیں کیا تمہیں آتے شرم آتی ہے؟ آخر ہو تو غلام ہی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر کہلا بھیجا کہ شام کو آؤں گا۔ دوسرے روز ٹھیک چھ بجے جسونت کے بنگلے پر جا پہنچا۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ کچھ تو خیال تھا لوگ کہیں گے میں افسروں کی خوشامد کرتا ہوں اور کچھ یہ شاید جسونت کو اس سے کچھ نقصان پہنچے۔

وہ جسونت کے بنگلے پر پہنچا تو چراغ جل چکے تھے۔ جسونت نے آ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ آدھی رات تک دونوں دوستوں میں خوب باتیں ہوتیں رہیں۔ جسونت نے اتنے دنوں میں ملازمت سے جو تجربے حاصل کیے تھے وہ سب بیان کیے۔ رمیش کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ جسونت کے سیاسی خیالات کتنی ہی باتوں میں میرے خیالات سے بھی زیادہ آزاد ہیں۔ اس کا خیال بالکل غلط نکلا کہ وہ تبدیل ہو گیا ہو گا۔

رمیش نے کہا۔ بھلے آدمی! جب اتنا جلے ہوئے ہو تو پھر ملازمت ترک کیوں نہ کر دیتے؟ اور کچھ نہ سہی، اپنے ضمیر کی پاسداری تو کر سکو گے۔

جسونت۔ میری فکر بعد میں کرنا۔ اس وقت اپنی فکر کرو۔ میں نے تمہیں ہوشیار کرنے کو بلایا ہے۔ اس وقت سرکار کی نگاہوں میں تم بے طرح کھٹک رہے ہو مجھے

اندیشہ ہے کہ کہیں تم گرفتار نہ کر لیے جاؤ۔

رمیش ''میں اس کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔''

جسونت ''آخر آگ میں کودنے سے فائدہ کیا؟''

رمیش ''نفع نقصان دیکھنا میرا کام نہیں۔ میرا کام تو اپنے فرض کو انجام دینا ہے۔''

جسونت ''ضدی تو تم ہمیشہ کے ہو مگر موقع نازک ہے، سنبھلے رہنا ہی اچھا ہے۔ اگر میں دیکھتا کہ عوام میں واقعی بیداری ہے تو تم سے پیشتر میدان میں آتا مگر جب دیکھتا ہوں کہ اپنے مرنے سے جنت دیکھنا ہے تو آگے قدم رکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔''

دونوں دوستوں میں دیر تک گفتگو ہوئی۔ کالج کے دن یاد آئے۔ ہم سبق لوگوں کے لیے کالج کے مشاغل کی قدیم یاد تفریح اور مذاق کا سرچشمہ ہوا کرتی ہے۔ پروفیسروں پر رائے زنی ہوئی۔ کون کون ہم سبق کیا کر رہا ہے، اس کا تذکرہ ہوا۔ بالکل یہی معلوم ہوتا تھا کہ دونوں اب بھی کالج کے لڑکے ہیں متانت نام کو بھی نہ تھی۔

رات زیادہ ہوگئی۔ کھانا کھاتے کھاتے ایک بج گیا۔ جسونت نے کہا۔ اب کہاں جاؤ گے، یہیں سو رہو اور باتیں ہوں۔ تم تو کبھی آتے بھی نہیں۔

رمیش تو رمتا جوگی تھا ہی۔ کھانا کھا کر باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ آنکھ کھلی تو نو بج گئے تھے۔ جسونت سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اسی رات کو آگرہ میں سنگین ڈاکہ پڑا۔

(۵)

رمیش دس بجے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کا مکان پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی پولیس افسر نے وارنٹ دکھلایا، فوراً گھر کی تلاشی ہونے لگی۔ معلوم نہیں کیوں کر رمیش کی میز کی دراز میں ایک پستول نکل آیا۔ پھر کیا تھا، ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑ گئی۔ اب کس کو ان کے ڈاکے میں شریک ہونے سے انکار ہو سکتا تھا؟ اور بھی کتنے ہی لوگوں پر آفت آئی۔ سبھی خاص خاص لیڈر چن لیے گئے۔ مقدمہ چلایا گیا۔

اوروں کی بات ایشور جانے، مگر رمیش بے قصور تھا۔ اس کا اس کے پاس ایسا زبردست ثبوت تھا۔ جس کی سچائی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا مگر کیا وہ اس ثبوت سے کام لے سکتا تھا؟

رمیش نے سوچا کہ جسونت خود ہی میرے وکیل کی معرفت صفائی کے گواہوں میں اپنا نام لکھوانے کو کہے گا۔ مجھے کو بے قصور جانتے ہوئے وہ مجھ کو جیل کبھی نہ جانے دے گا۔ وہ اتنا سنگدل نہیں ہے۔ لیکن گزرتے جاتے تھے اور جسونت کی طرف سے اس طرح کی کوئی بات نہ کہی جاتی تھی۔ رمیش کو خود ہی اس کا نام لکھاتے ہوئے پس و پیش ہوتا تھا، نہ جانے اس میں اسے کیا دقت پیش آوے۔ اپنی بچت کے لیے وہ اسے تکلیف میں مبتلا نہ کرنا چاہتا تھا۔

جسونت سنگدل نہ تھے۔ بے حس بھی نہ تھے۔ لیکن بے عمل ضرور تھے۔ انہیں اپنے عزیز دوست کے بے قصور مارے جانے پر رنج تھا۔ کبھی کبھی رو دیتے تھے مگر

یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ صفائی دے کر اسے چھڑا لیں۔ نہ جانے حکام کو کیا خیال ہو۔ کہیں یہ سمجھنے لگیں کہ میں بھی اس سازش کرنے والوں سے ہمدردی رکھتا ہوں، میرا بھی ان سے کچھ تعلق ہے۔ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جان بوجھ کر زہر نگلنا پڑ رہا ہے۔ پولیس نے حکام کے دلوں پر ایسا سکہ جما لیا ہے کہ خواہ میری شہادت سے رمیش بری بھی ہو جاوے اور مجھ پر علانیہ کوئی شبہ بھی نہ کیا جاوے، مگر یہ خیال دلوں سے کیوں کر دور ہوگا کہ میں نے صرف ایک ہم وطن کی بریت کے لیے جھوٹی شہادت دی؟ اور وہ ہم وطن بھی کون جو بغاوت میں ماخوذ ہے۔

اسی حیص بیص میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ادھر مجسٹریٹ نے یہ مقدمہ جسونت ہی کے اجلاس میں بھیج دیا۔ ڈاکہ میں کئی خون ہو گئے تھے اور مجسٹریٹ کو اتنی سخت سزائیں دینے کا اختیار نہ تھا، جتنی اس کی تجویز میں دی جانی چاہیے تھیں۔

(۶)

جسونت اب بڑے مخمصہ میں پڑا۔ اس نے چھٹی لینی چاہی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ سول سرجن انگریز تھا۔ اس وجہ سے اس کا سرٹیفکیٹ لینے کی ہمت نہ پڑی۔ بلا سر پر آ پڑی تھی اور اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔

قسمت کا الٹ پھیر دیکھیے۔ ساتھ کھیلے اور ساتھ پڑھے ہوئے دو دوست ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے، صرف ایک کٹگھر ا درمیان میں حائل تھا۔ مگر ایک

کی جان دوسرے کی مٹھی میں تھی۔ دونوں کی آنکھیں کبھی چار نہ ہوتیں۔ دونوں سر نیچا کیے رہتے تھے۔ اگرچہ جسونت کی آتما ندامت، پشیمانی اور روحانی تکلیف سے تڑپ رہی تھی اور رمیش کا چہرہ معصومیت کی چمک سے منور تھا۔

دونوں دوستوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک کتنا فراخ دل تھا، دوسرا کتنا خودغرض۔ رمیش چاہتا تو ابھی عدالت میں اس رات کی بات کہہ دیتا، لیکن جسونت جانتا تھا کہ رمیش پھانسی سے بچنے کے لیے بھی اس شہادت کا سہارا نہ لے گا جسے میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔

جب تک مقدمے کی پیشیاں ہوتی رہیں، رمیش کو سخت بے چینی محسوس ہوتی رہی۔ اس کے ضمیر اور اس کی خودغرضی میں روزانہ کش مکش ہوتی رہتی تھی، مگر فیصلہ کے روز تو اس کی وہی حالت ہوتی رہی تھی جو کسی قتل کے ملزم کی ہو۔ اجلاس پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ تین بجے کچہری پہنچا۔ ملزم اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ رمیش بھی آج ہر روز سے زیادہ اداس تھا۔ اس کارزارِ حیات میں موقع آ گیا تھا، جب اس کا سر تلوار کی دھار کے نیچے ہوگا۔ اب تک خون لطیف شکل میں تھا، آج اس نے کثیف صورت اختیار کر لی تھی۔

جسونت نے استقلال آمیز لہجے میں فیصلہ سنایا، جب اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ رمیش چندر کو سات برس کی قید سخت تو اس کا گلا بھر آیا۔ اس نے تجویز میز پر رکھ دی۔ کرسی پر بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگا۔ حیا سے امنڈے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ پھر اس سے آگے وہ اپنے فیصلے کو نہ پڑھ سکا۔

(۷)

رمیش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا۔ جیل کی تاریک کوٹھری میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ سوچتا کہ انسان کیوں گناہ کرتا ہے؟ اس لیے نا کہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے۔ کوئی تو عالیشان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں۔ کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے، کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں۔ ایسی بے انصاف دنیا میں اگر چوری ہتھیا اور ادھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟ وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے افتراق کو ناپید کر دینا ہو۔ دنیا سب کے لیے ہے اور دنیا سب کو راحت اور آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ، ڈاکہ ہے، نہ چوری چوری۔ دولت مند اگر اپنی دولت کو خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ؟ دولت مند اسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ سبھی لوگ ملزم ہوں گے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ راحت کے سامان ہیں۔ ہم بھی انہیں سزا دیں گے۔ ہم بھی ان سے سخت محنت لیں گے۔ جیل سے نکلتے ہی اس نے اسی جماعتِ انقلاب کا اعلان کر دیا۔ انجمن قائم ہونے لگی ہتھیار جمع کیے جانے لگے اور چند ہی روز بعد ڈاکہ کا بازار گرم ہو گیا۔ پولیس نے ان کا سراغ لگانا شروع کیا۔ ادھر انقلاب پسندوں نے پولیس پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ان کی طاقت روز

بروز بڑھنے لگی ،مگر سارا کام اتنی ہوشیاری سے ہوتا تھا کہ کسی کو ملزموں کا کچھ سراغ نہ ملتا۔ رمیش کہیں غربا کے لیے دوا خانے کھولتا۔ کہیں بینک۔ ڈاکہ کے روپے سے اس نے علاقے خریدنے شروع کیے۔ جہاں کوئی علاقہ نیلام ہوتا وہ اسے فوراً خرید لیتا۔ تھوڑے دنوں میں اس کے پاس ایک بڑی جائیداد ہو گئی۔ اس کا نفع صرف غربا کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ طرفہ یہ کہ سبھی کو معلوم تھا کہ یہ رمیش کی کرامات ہیں مگر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مہذب جماعت کی نگاہوں میں رمیش سے زیادہ قابلِ نفرت اور کوئی شخص ساری دنیا میں نہ تھا۔ لوگ اس کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ شاید اسے پیاسا مرتا دیکھ کر کوئی ایک قطرہ پانی بھی اس کے حلق میں نہ ٹپکاتا لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے کاموں پر علانیہ اعتراض کر سکے۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ سرکار نے ڈاکہ کا پتہ لگانے کے لیے بڑے بڑے اشتہارات مشتہر کیے۔ یورپ سے خفیہ پولیس کے ہوشیار آدمیوں کو بلا کر اس کام پر تعینات کیا گیا۔ لیکن غضب کے ڈاکو تھے جن کی حکومتوں کے آگے کسی کی کچھ نہ چلتی تھی۔

مگر رمیش خود اپنے اصولوں پر عامل نہ رہ سکا۔ جیوں جیوں دن گزرتے گئے اسے احساس ہوتا تھا میرے مقلدوں میں بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں بھی زیادہ ہوشیار اور جری تھے، وہ دوسروں پر رعب جماتے اور مالِ غنیمت میں برابر کا حصہ نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ رمیش سے بھی جلنے لگے۔ وہ اب شاہانہ تزک و احتشام سے رہتا تھا۔ لوگ کہتے کہ اسے ہماری کمائی یوں تصرف

کرنے کا کیا حق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔

رات کا وقت تھا۔ سیاہ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ آج ڈاک گاڑی میں ڈاکہ پڑنے والا تھا۔ پروگرام پیشتر سے تیار کر لیا گیا تھا۔ پانچ بہادر نوجوان اس کام کے لیے منتخب کیے گئے۔

دفعتاً ایک جوان نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''آپ بار بار مجھ کو ہی کیوں چنتے ہیں؟ حصہ لینے والے تو سبھی ہیں۔ میں ہی کیوں اپنی جان کو بار بار جوکھم میں ڈالوں؟''

رمیش نے استقلال سے کہا۔ ''یہ تجویز کرنا میرا کام ہے کہ کون کہاں بھیجا جاوے۔ تمہارا کام صرف میرے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔''

جوان۔ ''اگر مجھ سے کام زیادہ لیا جاتا ہے تو مجھے حصہ بھی کیوں زیادہ نہیں دیا جاتا۔''

رمیش نے اس کے تیور دیکھے اور چپکے سے پستول ہاتھ میں لے کر بولے۔ اس کا فیصلہ وہاں سے لوٹنے پر ہوگا۔

جوان۔ ''میں جانے سے پہلے اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔''

رمیش نے اس کا جواب نہ دیا۔ وہ پستول سے اس کا کام تمام کر دینا چاہتے ہی تھے کہ وہ فوراً کھڑکی سے نیچے کود پڑا۔ کود پھاند میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ چلتی ریل گاڑی سے کود پڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا خفیہ پولیس افسر کے پاس پہنچا۔

جسونت نے بھی پنشن لے کر وکالت شروع کی تھی۔ عدالت کے سبھی لوگوں سے ان کا تعارف تھا۔ ان کی وکالت بہت جلد چمک اٹھی۔ جسونت کے پاس لاکھوں روپے تھے۔ انہیں پنشن بھی کثیر ملتی تھی۔ وہ چاہتے تو گھر بیٹھے خوشی سے زندگی کے بقیہ دن بسر کر دیتے۔ ملک وقوم کی کچھ خدمت کرنی بھی ان کے لیے مشکل نہ تھی۔ ایسے ہی لوگوں سے بے غرضانہ خدمت کی امید کی جا سکتی ہے، مگر جسونت نے ساری عمر روپیہ کمانے ہی میں گزار دی تھی اور اب کوئی ایسا کام نہ کر سکتے تھے، جس کا ثمرہ روپے کی صورت میں نہ ملے۔

یوں تو سبھی مہذب لوگ رمیش سے نفرت کرتے تھے، لیکن جسونت سب سے بڑھا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر کبھی رمیش پر مقدمہ چلے گا تو میں بلا فیس کے سرکار کی طرف سے پیروی کروں گا۔ علانیہ رمیش پر طعنہ زنی کیا کرتا۔ یہ آدمی شیطان ہے۔ ایسے آدمی کا تو منہ نہ دیکھنا چاہیے۔ اف! اس کے ہاتھوں کتنے بھلے گھروں کا ستیاناس ہو گیا۔ کتنے بھلے آدمیوں کی جانیں گئیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ آدمی نہیں بھوت ہے۔ میرا بس چلے تو اسے گولی ماردوں، جیتا چنوا دوں۔

(۹)

سارے شہر میں غوغا مچا ہوا تھا۔ رمیش بابو پکڑ لیے گئے۔ بات سچی تھی۔ رمیش سچ مچ گرفتار ہو گیا تھا۔ اسی شخص نے جو رمیش کے سامنے سے کود کر بھاگا تھا، اس

نے پولیس کے افسر سے سارا ماجرا من وعن بیان کر دیا تھا۔ استحال بالجبر اور قتل کی کسی پر مصیبت کیسی شیطنت آمیز اور کیسے رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان تھی۔

مہذب جماعت بغلیں بجاتی تھی۔ سیٹھوں کے مکانوں میں گھی کے چراغ جلتے تھے۔ ان کے سروں پر شمشیر برہنہ لٹکتی رہتی تھی۔ آج وہ ہٹ گئی تھی۔ اب وہ خواب شیریں کے مزے اٹھا سکتے تھے۔

اخباروں میں رمیش کے ہتھکنڈے چھپنے لگے۔ وہ باتیں جو اب تک خوف کے سبب سے کسی کی زبان پر نہ آتی تھیں، اب اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ انہیں پڑھ کر پتہ چلتا تھا کہ رمیش نے کتنا اندھیر مچا رکھا تھا۔ کتنے ہی راجا اور روسا اس کو ماہوار ٹیکس دیا کرتے تھے۔ اس کا پرزہ پہنچتا کہ فلاں تاریخ کو اتنے روپے بھیج دو، پھر کس کی مجال تھی کہ اس کی حکم عدولی کر سکے؟ وہ عوام کے فائدے کے لیے جو کام کرتا تھا، اس کے لیے بھی امرا سے چندے لیے جاتے تھے۔ رقم لکھنا رمیش کا کام تھا۔ امرا کو بلا چوں وچرا وہ رقمیں دے دینی پڑتی تھیں۔

لیکن مہذب سوسائٹی ہی خوش تھی، عوام اسی قدر غمگین تھے۔ کون پولیس والوں کے مظالم سے ان کی حفاظت کرے گا۔ کون سیٹھوں کی دست درازیوں سے انہیں بچائے گا۔ کون ان کے لڑکوں کے لیے صنعت وحرفت کے مدرسے کھولے گا؟ وہ اب کس کے بل پر کودیں گے؟ وہ اب بے یارومددگار تھے۔ وہی ان کا سہارا تھا۔ اب وہ کس کا منہ تاکیں گے؟ کس کو اپنی فریاد سنائیں گے؟

پولیس شہادتیں جمع کر رہی تھی۔ سرکاری وکیل زوروں سے مقدمہ چلانے کی

تیاریاں کر رہا تھا۔لیکن رمیش کی جانب سے وکیل نہ کھڑا ہوتا تھا۔سارے ضلع میں ایک ہی شخص تھا جو اسے قانونی پنجے سے چھڑا سکتا تھا۔وہ تھا جسونت لیکن جس کے نام سے کانوں پر انگلی رکھتا تھا کیا وہ اس کی وکالت کرنے کو کھڑا ہوگا؟ ناممکن۔

رات کے 9 بجے تھے، جسونت کے کمرے میں ایک عورت داخل ہوئی۔

جسونت اخبار پڑھ رہا تھا۔بولا۔''کیا چاہتی ہو؟''

عورت۔''اپنے شوہر کے لیے ایک وکیل۔''

جسونت۔''تمہارا شوہر کون ہے؟''

عورت۔''وہی جو آپ کے ساتھ پڑھتا تھا اور جس پر ڈاکہ کا جھوٹا مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔''

جسونت نے چونک کر پوچھا۔''تم رمیش کی بیوی ہو؟''

عورت۔''ہاں۔''

جسونت۔''میں ان کی وکالت نہیں کرسکتا۔''

عورت۔''آپ کو اختیار ہے۔آپ اپنے ضلع کے آدمی ہیں۔میرے شوہر کے دوست بھی رہ چکے ہیں۔اس لیے سوچا تھا، کیوں باہر والوں کو بلاؤں۔مگر اب الہ آباد یا کلکتہ سے ہی کسی کو بلاؤں گی۔''

جسونت۔محنتانہ دے سکو گی؟

عورت نے فخر سے کہا۔''بڑے سے بڑے وکیل کا محنتانہ کیا ہوتا ہے؟''

جسونت۔''تین ہزار روپے روزانہ۔''

عورت۔''بس آپ اس مقدمے کو لے لیں۔میں آپ کو تین ہزار روپے

روزانہ دوں گی۔''

جسونت۔''تین ہزار روپے روزانہ؟''

عورت۔''ہاں۔اور اگر آپ نے ان کو چھڑا لیا تو پچاس ہزار روپے آپ کو شکرانے کے طور پر اور دوں گی۔''

جسونت کے منہ میں پانی بھر آیا۔اگر مقدمہ دو ماہ بھی چل گیا تو کم از کم ایک لاکھ روپے سیدھے ہو جائینگے۔شکرانہ اوپر سے۔پورے دو لاکھ کی گوڑی ہے۔اتنی دولت تو ساری عمر میں بھی جمع نہ کر پائیں گے۔مگر دنیا کیا کہے گی۔اپنا ضمیر بھی تو اجازت نہیں دیتا۔ایسے شخص کو قانون سے چھڑانا بے شمار آدمیوں کا خون کرنا ہے، لیکن دو لاکھ کا معاملہ ہے۔کچھ رمیش کے سزایاب ہو جانے سے اس جماعت کا خاتمہ تو ہوا نہیں جاتا۔اس کے چیلے تو رہیں گے ہی۔شاید وہ اور بھی ہنگامہ برپا کریں، پھر میں دو لاکھ کی گوڑی کیوں جانے دوں؟ لیکن مجھے کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی، نہ سہی۔جس کا جی چاہے خوش ہو، جس کا جی چاہے ناراض۔یہ دو لاکھ تو نہیں چھوڑے جاتے۔کچھ میں کسی کا گلا تو دباتا نہیں، چوری تو کرتا نہیں۔ ملزموں کو بچانا تو میرا فرض ہے۔

دفعتاً عورت نے پوچھا۔''آپ کیا جواب دیتے ہیں؟''

جسونت نے کہا۔''میں کل جواب دوں گا، ذرا سوچ تو لوں۔''

عورت۔''نہیں مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔آپ کو کچھ عذر ہو تو صاف صاف کہہ دیجیے، میں دوسرا بندوبست کروں۔''

جسونت کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔جلدی کا فیصلہ اپنے ہی فائدے کی

جانب جھکتا ہے۔ یہاں نقصان کا امکان نہیں ہوتا۔

جسونت ''آپ کچھ روپے پیشگی دے سکتی ہیں؟''

عورت۔ ''روپیوں کا مجھ سے بار بار ذکر نہ کیجیے۔ ان کی جان کے سامنے روپیوں کی ہستی کیا ہے؟ آپ جتنی رقم چاہیں مجھ سے لے لیں۔ آپ چاہے انہیں چھڑا نہ سکیں، مگر سرکار کے دانت ضرور کھٹے کر دیں۔''

جسونت۔ ''میں ہی وکیل ہو جاؤں گا۔ کچھ پرانی دوستی کا نباہ بھی تو کرنا چاہیے۔''

(۱۰)

پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ سیکڑوں شہادتیں پیش کیں۔ مخبر نے تو پوری داستان ہی سنا دی۔ لیکن جسونت نے کچھ ایسی دلیلیں کیں۔ شہادتوں کو کچھ اس طرح لغو ثابت کیا، اور مخبر کی ایسی خبر لی کہ رمیش بے داغ چھوٹ گئے۔ ان پر کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا۔ جسونت جیسے محتاط اور دانا وکیل کا ان کی پیروی میں کھڑا ہو جانا ہی اس امر کا ثبوت تھا کہ سرکار نے غلطی کی۔

شام کا وقت تھا۔ رمیش کے دروازے پر شامیانہ لگا ہوا تھا۔ غربا کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ جسونت کا چاروں طرف سے شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔ رمیش کو مبارک باد دیا جا رہا تھا۔ جسونت بار بار رمیش سے بولنا چاہتا تھا مگر رمیش اس کی جانب سے منہ پھیر لیتے تھے۔ اب تک ان دونوں میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔

آخر جسونت نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ ''تم تو مجھ سے اس طرح اینٹھے ہوئے ہو جیسے میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔''

رمیش۔ ''اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے ساتھ بھلائی کی ہے؟ پہلے آپ نے میری دنیا بگاڑی تھی، اب کی میری عاقبت بگاڑی۔ پہلے معاف کیا ہوتا تو میری زندگی سدھر جاتی۔ اور اب جیل جانے دیتے تو عاقبت بن جاتی۔''

جسونت۔ ''یہ تو نہ کہو گے کہ مجھے اس معاملہ میں کتنی ہمت سے کام لینا پڑا۔''

رمیش۔ ''آپ نے ہمت سے کام لیا، خود غرضی سے کام لیا۔ آپ اپنی غرض کے معتقد ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت برا استعمال کیا، لیکن اسے آپ کی زندگی سے تبدیل کرنے کو کسی حالت میں تیار نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے شکریہ کی امید نہ رکھیں۔''

اختتام ــــــــــــــــــ حصہ دوم

فہرست

لاٹری	03
تہذیب کا راز	22
تالیف	33
قذاقی	51
لیلیٰ	69
بڑے بابو	95
پنہاری کا کنواں	110
منتر	127
خودی	147
شدھی	155
تحریک	165
پراشچت	184
گلی ڈنڈا	202
خانہ داماد	214
گھاس والی	230
مریدی	246
پوس کی رات	250
بند دروازہ	259
جیل	261
آشیاں برباد	275

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

لاٹری

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے "ہنس" اکتوبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں، ۱۹۳۲ء (زادِ راہ)

(۱)

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد، چچا، بھائی، ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے، روپے رہیں گے تو گھر ہی میں، کسی کے نام آ جائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی، اس وقت مجھے زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا، وہ بہت ہمت افزا نہ تھا۔ لیکن بھئی تقدیر کا حال کون جانے گاہ باشد کہ کودک ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بیتاب ہو گیا اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بننا چاہتا تھا۔ جس کے نام روپے آئیں گے۔ وہ خود موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے۔ دس پانچ ہزار اس کے حصے میں آ جائیں گے، وہ خود موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے۔ دس پانچ ہزار اس کے حصے میں آ جائیں گے، مگر اس سے کیا ہو گا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ پہلے تو ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی۔ ایک ایک کونے کی عام سیاحوں کی طرح نہیں ہو کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آ پہنچے۔ وہ ایک خطہ میں کافی عرصہ تک

رہ کر وہاں کے باشندوں معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ پیرو برازیل، ٹڈ غا سکر اور ادبی سینیا، یہ سبھی دشوار گزار خطے اس کے پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرانا تھا جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں اس کے علاوہ لاکھ تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں، مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔ منصوبے تو اتنے اونچے تھے۔ لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ گھر سے روپے ملنے کی اسے امید تھی۔ ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میرے پاس بھی روپے تھے، میں سکول میں ماسٹر تھا، بیس روپے ملتے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا، دس میں لشٹم پشٹم اپنا گزارہ کرتا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لیے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا ''کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا انگلی سے پھسل پڑی۔'' میں نے منع کیا تھا نہیں چوری فوراً کھل جائے گی اور مفت میں شرمندگی ہو گی۔ ایسا کام کیوں کرو کہ بعد میں خفت ہو۔ یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پرانی کتابیں کسی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے دکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جیومیٹری، جغرافیہ موجود تھیں۔ میں تو ماسٹر تھا۔ کسی بک سیلر کی دکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ اس لیے یہ خدمت بکرم کے سپرد ہوئی اور وہ آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لیے آ پہنچا۔ کتابیں پچیس سے کم کی

نہ تھیں مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لیے پانچ ہزار کے برابر تھے۔ فیصلہ ہو گیا۔ ہم دونوں ساجھے میں ٹکٹ لیں گے۔ آدھا میرا ہو گا آدھا بکرم کا، دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصے میں آئیں گے۔ پانچ لاکھ بکرم کے، ہم اپنے اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی سکیم میں کچھ ترمیم کرنا پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی یہ بکرم کی زندگی کا مقصد دلی تھا۔

میں نے اعتراض کیا۔ ''یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔''

بکرم مستقل تھا، ''ہرگز نہیں، کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہو گا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو گے؟''

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ''بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔''

''تمہارے گھر میں کافی جائداد موجود ہے۔ والدین بھی زندہ ہیں کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں ہے۔ میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہیں، دو بھائیوں کی تعلیم ہے۔ نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا۔ میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے۔ کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا میرے بعد کوئی اصلی کو نہ نکال سکے۔''

''تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے۔ لیکن بینکوں کا شرح سود گرا ہوا ہے۔''

''پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں۔ اگر پانچ فیصدی بھی ہے 25 ہزار سالانہ ہوئے، تھوڑے ہیں۔ ہم نے کئی بینکوں کی شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا۔ خیال آیا کیوں نہ لین دین میں کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی

مشترکہ کمپنی ہو لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا اور اپنا رعب داب رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے، ہاں جب تک اچھی جائداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے، چاہے کتنا ہی معتبر اسامی ہو، مجبوری معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے، جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ روپے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل ہی جاتی ہے۔''

''مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے کس کا نام دیا جائے۔''

بکرم نے کہا ''میرا نام رہے گا۔''

''کیوں میرا کیوں نہ رہے گا؟''

''تمہارا ہی نام سہی، لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی، اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں پر گولا چھوڑوں گا، اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا، بالکل طفلانہ خواہش ہے۔''

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

(۲)

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے۔ صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے منصوبے باندھا کرتے اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے۔ ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا، ''بھئی شادی وادی کا خلجان نہیں چلانا چاہتا خواہ مخواہ کی کوفت اور پریشانی۔ بیوی کی ناز برادری میں ہی بہت سے روپے اڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے لیے کوئی ٹھیکہ دار ہیں؟''

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ ''ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی وغم میں کوئی رفیق نہ ہو، دولت کا لطف ہی کیا۔ تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے، میں تو بھئی عیال داری سے اتنا بیزار نہیں ہاں رفیق ہو اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔''

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے بولا ''خیر اپنا اپنا نقطہ نظر ہے آپ کو عیال داری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا، اپنے مزے سے جہاں چاہا اڑ گئے اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب، آپ کہیں چلے اور فوراً سوال ہوا، کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو۔''

''میں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں، اور نہ چاہتا ہوں مجھ سے کوئی سوال کرے۔ نا بابا آپ کو شادی مبارک، بچے کو ذرا ساز کام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس، ذرا عم کھسکی اور لونڈے منتیں ماننے لگے کہ کب آپ راہی عدم ہوں اور وہ گل چھرے اڑائیں، نہ اس وبال..........''

بکرم کی بہن کنتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مگر بڑی خوش مزاج اور انتہا درجہ کی شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا، ''تو بڑی شیطان ہے کنتی، میں تو ڈر گیا کس نے تجھے بلایا

یہاں۔''

کنتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا، جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو اور بولی تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو، جب دیکھو یہیں جمے ہو نہ کوئی کام نہ دھندا، کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے ایسے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے، تم چلے ہی نہیں آخر کس کے ساتھ جاؤ گی۔ کیا کوئی جادو منتر جگا رہے ہو؟

بکرم ہنسا''ہاں جادو جگا رہے ہیں۔ جس میں تجھے ایسا دولہا ملے جو گن کر روز پانچ ہنٹر جمائے۔''

کنتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔

''مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی کیوں کسی مرد کی غلامی کروں؟ کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسی جتائے گا جیسے اس کی زر خرید لونڈی ہوں۔ بندی باز آئی ایسی شادی سے، میں روز اماں کے ٹکٹ کے لیے ایشور سے پراتھنا کرتی ہوں، اماں کہتی ہیں۔ کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے، میرا تو دل کہتا ہے اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔''

مجھے اپنی ننھیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی بھادوں کا مہینہ آ گیا اور پانی کی ایک بوند نہیں تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی اور دوسرے دن موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ ضرور کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میں نے بکرم کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کر لیا

ایسا شفیع پا کر کیوں چوکتے۔

بکرم بولا اچھا کنتی۔ تجھ سے ایک بات کہیں کسی سے کہے گی تو نہیں اگر کہا تو حلال کر دوں گا۔ میں اب کے تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا اور پاس کرا دوں گا۔ ہم دونوں نے بھی لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے، ہم لوگوں کے لیے بھی ایشور سے دعا کرو۔ اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے سچ، مگر خبر دار کسی سے کہنامت۔ مگر کنتی کا ہاضمہ مضبوط نہ تھا۔ یہاں تو وہ وعدہ کر گئی، مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ اب جسے دیکھیے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیے، گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے، نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا لے کے روپے پھینک دیے۔ خود را نصیحت والی کہانی سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا، بچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

(۳)

بکرم کے والد ٹھاکر کہلاتے تھے، چچا چھوٹے ٹھاکر، دونوں ہی ملحد تھے، پکے ناستک دیوتاؤں کے دشمن، پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے۔ گنگا کو پانی کی دھار اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے۔ مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر صاحب علی الصبح ننگے پاؤں اشنان کرنے جاتے، اور ادھر سے

شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ رام نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتی ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھاگوت کی کتھا سنا کرتے تھے۔ بکرم کے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش، انہیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہوگئی تھی، انہیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرواد دیا اور ان کا نام آیا۔ وہیں بکرم کی اماں جی ان میں ایسا کوئی خاص تغیر تو نہ تھا۔ ہاں آج کل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں۔ درگا پاٹ کا بھی انتظام کیا تھا۔ لوگ ناحق کہتے تھے کہ مادہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دین داری ہے وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل، ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیا کے بل پر لٹکا ہوا ہے۔ ہوس انسان کی رائے اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے، یہ میرے لیے نیا تجربہ تھا اور محض روحانیت کا ملمع نہ تھا وہی خلوص، وہی نشہ، وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں، ساجھے دار تھے ہمارے پاس روپے نہ تھے، نہ اتنا وقت تھا۔ مجھے نوکری بچانی تھی بکرم کو کالج جانا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ مل رہے تھے۔ جوتشیوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر ان کے لیے ہمارے پاس نیازمندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قتل کی رات قریب آتی جاتی تھی ہمارا سکون غائب ہوتا جاتا تھا۔ ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کردے تو کیا کروں۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے

ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی دوسرا ثبوت۔ سارا دارومدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اسی کی نیت میں .... ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام، کہیں فریاد نہیں کر سکتا۔ زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لیے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں، اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا۔ اگر نیت درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہوگا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے۔ لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے۔ ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں۔ اس وقت ایماندار بننے میں کچھ ہرج نہیں ہوتا آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسن اتفاق سے میرا نام آجاتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟ .... قرض دیے تھے ان کے پانچ لے لو اور کیا کرو گے؟ مگر نہیں شاید اتنی بد دیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی وارتشہیر کے خوف سے ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکا یک بکرم نے کہا ''ہمارا ٹکٹ نکل آئے، مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔''

میں نے چونک کر کہا ''اچھا، مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہوسکتا؟''

''لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔''

''اچھا مان لو، میں کہہ دوں، تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔''

''میرے خون کی حرکت بند ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔''

”میں تمہیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا۔“

”مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ، سوچو۔“

”تو آؤ لکھا پڑھی کرلو، جھگڑا کیوں رہے۔“

بکرم نے ہنس کر کہا۔ ”تم بڑے شکی ہو یار۔“ ”میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ بھلا ایسا کہیں ہوسکتا ہے۔ پانچ لاکھ نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی، دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی۔ کہیں سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔

میں نے کہا ”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آسکتا لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا حرج ہے؟“

”فضول ہے۔“

”فضول ہی سہی۔“

”تو پکے کاغذ پر لکھنا پڑے گا۔ دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گی کس خیال میں ہو آپ۔“

میں نے تامل کر کے کہا، ”مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔“

”جس معاہدے کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو، اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں؟“

”قانونی اہمیت نہ ہو، اخلاقی اہمیت تو ہے۔“

”اچھا لکھ دوں گا، جلدی کیا ہے۔“

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا، بگڑ کر بولا ''تمہاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔''

''تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمہاری نیت فاسد نہ ہو جاتی۔''

''میری نیت اتنی کمزور نہیں ہے۔''

''اجی رہنے بھی دو بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔''

مجھے اپنے اوپر اعتبار نہیں رہا، ''میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

بڑے نشست خانے میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے، اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سنکر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں مدیں ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ سچ مچ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے نے کہا ''مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپے آئے، ان پر سب کا مساوی حق ہے۔''

بڑے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا ''ہرگز نہیں، جا کر قانون دیکھو اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہو گی مشترکہ خاندان کو نہیں، یہ انفرادی معاملہ ہے۔''

''اس کا فیصلہ عدالت کرے گا۔''

''شوق سے عدالت جایئے، اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو گا، جیسے آپ کے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا

میری لڑکی سے یا میری بیوی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر میں جانتا۔ آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنی بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا۔''

''تو یہ آپ کا قصور ہے۔''

''اسی لیے مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور ایک جا معاملہ ہے۔''

''یہ جوا ہے، یہ آپ کو سمجھ لینا چاہیے۔''

''بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔''

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے ''آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں انہیں سمجھایئے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں میرے پاس صرف ایک، میرے مقابلے میں آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔''

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا بولے ''ہم نے بیس روپے نہیں دیے ٹھناٹھن۔''

اماں نے انہیں ملامت کے انداز میں دیکھا، اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا بولیں۔ ''تم میرے روپے سے آدھے لے لینا۔ میں اپنے بیٹے...........''

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑ لی، ''کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو، وہ کیوں آدھا لے لیں گے؟ میں ایک دھیلہ بھی نہیں چھونے دوں گا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انہیں پانچویں حصے سے زائد کسی طرح نہ ملے گا۔ آدھے کا دعویٰ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔''

چھوٹے ٹھاکر صاحب نے خونی نظروں سے دیکھا۔ ''ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں۔''

''جانتے ہیں۔ بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے؟''

''یہ وکالت نکل جائے گی، جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا؟''

''بیرسٹر کی ایسی تیسی۔''

''اچھا زبان سنبھالیے میں نصف لوں گا، اسی طرح جیسے گھر کی جائداد میں میرا نصف ہے۔''

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا ''یہ تمہیں کیا ہو گیا، ارے یہ چوٹ کیسی، یہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ کہیں گر پڑے۔ اے مہنگو! جا تو ڈاکٹر کو بلا لا۔''

اماں جی نے پرکاش کو ایک کرسی پر لٹا دیا اور دفور اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرت ناک لہجے میں کہا اور کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔ بڑے ٹھاکر صاحب جو غم و غصہ سے کانپ رہے تھے۔ کہا ''کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی۔ سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے کہتے ہیں چوٹ نہیں لگی۔ کس سے جھگڑا ہوا، کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں۔ میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔''

''آپ ناحق گھبراتے ہیں بہت معمولی چوٹ ہے دو چار روز میں اچھی ہو

جائے گی۔'' اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی۔ ندامت غصہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا، ''بھگوان کریں جلد اچھے ہو جاؤ۔ لیکن چوٹ لگی کیسے کیا کسی تانگہ سے گر پڑے۔''

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا، ''کچھ نہیں نہ کسی تانگہ سے، نہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ ذرا جھگڑ بابا کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ انہی کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں اور پتھر مارنے دوڑتے ہیں، جو دوڑ کر بھاگا وہ نامرادرہ جاتا ہے، جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لیے کوئی پھولوں کی مالا، کوئی شال دوشالے جھگڑ بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکایک انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے بھاگے لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انہوں نے پتھر چلا ہی تو دیا۔ پہلا پتھر سر میں لگا کھوپڑی بھنا گئی، معلوم ہوا جیسے گولا لگ گیا ہو۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا، بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے۔ ادھر گھنٹہ بھر تک مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا آخر ہمت باندھ کر اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے کہا فریکچر ہو گیا ہے، پٹی باندھ دی۔ بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے مطلق شبہ

نہیں سب سے پہلے جھگڑ بابا کی کٹی بنواؤں گا۔ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔''

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔اماں جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا سر پھٹا تو کیا ہوا۔ہاتھ بھی ٹوٹا تو کیا غم ہے لاڑی تو اپنی ہوگی۔

شام ہوگئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے، بھگوت سننے کا وقت آگیا تھا۔چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔بولے''جھگڑ بابا تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے نیچے میں۔''

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا''جی ہاں''

''کیا بہت زور سے مارتے ہیں؟''

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔

''آپ زور سے کہتے ہیں، ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم کے گولے سا لگتا ہے۔دیو سا تھ ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیروں کو گھونسے مار ڈالتے ہیں۔اف سر پھٹا جا رہا ہے۔ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں۔ جب تک گر نہ پڑی مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد کے قریب پہنچیں گے۔ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لیے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے۔آدھا یا اس سے کم۔میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔''

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے۔جھگڑ

بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(۴)

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی، سویرے ہی ڈاکخانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں پوجا کر کے ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا۔ بکرم تو ڈاکخانہ گیا۔ میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی، جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے تھے۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں۔ کیوں پجاری جی؟'' پجاری نے فرمایا ''ہاں سرکار!''

''گج کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لیے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا ''بھگوان تو انتر جامی ز عالم الغیب ہیں'' کسی میں کتنی بھگتی ہے، یہ کیا ان سے چھپا رہتا ہے۔''

پجاری نے فرمایا ''نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے۔''

ادھر پوجا ہو رہی تھی۔ ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔ ''تمہارا دل کیا چاہتا ہے پجاری جی۔''

پجاری نے فرمایا ''آپ کی پھتے (فتح) ہوگی سرکار۔''

چھوٹے سرکار نے پوچھا ''اور میری؟''

پجاری نے بے تکلف کہا ''آپ کی بھی پھتے ہوگی۔''

دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہوگی، اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔

کتھا ختم ہوگئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشہ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے، بھجن گاتے ہوئے

سو میں تو تیری چرنوں میں آیا

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبھوت لپیٹے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی

اور سر پر لاجور کیا آسمان بنایا

زندگی میں جب تیرا ہم کو ہمیشہ تھا خیال

بعد مردن بھی ہوس دل میں وہی لے جائینگے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلہ بانٹ رہے تھے۔ اور بار بار فون پر جا کر پوچھتے تھے۔ کیا خبر ہے ہر شخص کے چہرے پر امید و بیم کا رنگ تھا۔ امید رگوں میں، آنکھوں میں، ہر شخص میں امنڈی پڑی تھی۔ اور ہمارے دل میں دماغ میں، جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی سب کے سب دوڑے، رسیور بکرم کے ہاتھ لگا

''کون ہے؟''

''میں ہوں بکرم۔''

''کیا خوشخبری ہے۔''

''اس شہر کا صفایا ہے، شہر ہی کافی نہیں، سارے ہندوستان کا، امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے۔''

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو۔ بے حس وحرکس نقش دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں، مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھی سبھوں نے بے ایمانی کی، کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصہ اتارا اور انہیں برخاست کر دیا اسی لیے تمہیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو۔

اتنے میں بکرم رونی صورت لیے آ کر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اب معاملہ ختم ہو گیا، مگر سچ کہنا، تمہاری نیت فاسد تھی یا نہیں؟''

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

''اب کیا کرو گے پوچھ کر، پردہ ڈھکا رہنے دو۔''

ا روایت ہے کہ ایک بار ہاتھی گج ندی میں پانی پینے گیا۔ ندی میں ایک مگرمچھ

تھا اس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑ لی۔ ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام چھیر ساگر اودھ کے سمندر سے ہاتھی کی مدد کی۔

تہذیب کا راز

پہلی بار: ہندی میں ''سبھیتا کا رہسہ'' عنوان سے ''مادھوری'' ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں، ۱۹۲۹ء (فردوسِ خیال)

(۱)

یوں تو میری سمجھ میں دنیا کی ایک ہزار ایک باتیں نہیں آتیں، جیسے لوگ علی الصبح اُٹھتے ہی بالوں پر چھرا کیوں چلاتے ہیں؟ کیا اب مردوں میں بھی اتنی نزاکت آ گئی ہے۔ بالوں کا بوجھ ان سے نہیں سنبھلتا۔ ایک ساتھ ہی سبھی پڑھے لکھے لوگوں کی آنکھیں کیوں کمزور ہو گئی ہیں؟ دماغ کی کمزوری ہی اس کا سبب ہے یا اور کچھ؟ لوگ خطابوں کے لیے اتنے حیران ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس وقت مجھے ان باتوں سے مطلب نہیں۔ میرے دل میں ایک نیا سوال اٹھ رہا ہے اور اس کا جواب مجھے کوئی دیتا۔ سوال یہ ہے کہ مہذب کون ہے اور نا مہذب کون؟ تہذیب کی علامتیں کیا ہیں؟ سرسری نظر سے دیکھیے تو اس سے زیادہ آسان اور کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔ بچہ بچہ اس کا جواب دے سکتا ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو سوال اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کوٹ پتلون پہننا، ٹائی ہیٹ، کالر لگانا، میز پر بیٹھ کر کھانا، دن میں تیرہ بار قہوہ یا چائے پینا اور سگار پیتے ہوئے چلنا تہذیب ہے تو ان گوروں کو بھی مہذب کہنا پڑے گا جو سڑکوں پر شام کو کہیں کہیں ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ شراب کے نشے سے آنکھیں سرخ، پیر لڑکھڑاتے ہوئے۔

راستہ چلنے والوں کو خواہ مخواہ چھیڑنے کی دھن۔ کیا ان گوروں کو مہذب کہا جا سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ تو یہ ثابت ہوا کہ تہذیب کوئی اور چیز ہے۔ اس کا جسم سے اتنا تعلق نہیں ہے۔ جتنا دل سے۔

(۲)

میرے انے گنے دوستوں میں ایک رائے رتن کشور بھی ہیں۔ آپ بہت ہی نیک دل، بہت ہی سخی بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور ایک بہت بڑے عہدے دار ہیں۔ بہت اچھی تنخواہ پانے پر بھی ان کی آمدنی خرچ کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ ایک چوتھائی تنخواہ تو بنگلے ہی کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ اکثر متفکر رہتے ہیں۔ رشوت تو نہیں لیتے، کم از کم میں نہیں جانتا۔ حالانکہ کہنے والے کہتے ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ سفر خرچ بڑھانے کے لیے دورے پر زیادہ رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے لیے ہر سال بجٹ کے کسی دوسری مد سے روپے نکالنے پڑتے ہیں۔ ان کے افسر کہتے ہیں کہ اتنا دورہ کیوں کرتے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ اس ضلع کا کام ہی ایسا ہے کہ جب تک خود دورے نہ کیے جاویں، رعایا ٹھیک ہی نہیں رہ سکتی۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ رائے صاحب اتنے دورے واقعی نہیں کرتے جتنے وہ اپنے روزنامچہ میں درج کرتے ہیں۔ ان کے پڑاؤ شہر سے پچاس میل پر ہوتے ہیں۔ خیمے وہاں گڑے رہتے ہیں۔ عملے وہاں پڑے رہتے ہیں اور رائے صاحب گھر پر دوستوں کے ساتھ غپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ مگر کس کی مجال ہے کہ رائے

صاحب کی نیک نیتی پر شک کر سکے۔ ان کے مہذب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایک روز میں ان سے ملنے گیا۔ اس وقت وہ اپنے گھسیارہ دمڑی کو ڈانٹ رہے تھے۔ دمڑی رات دن کا نوکر تھا لیکن روٹی کھانے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر تھوڑی دور پر گاؤں میں تھا۔ کل رات کو کسی سبب سے یہاں نہ آ سکا تھا اسی لیے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔

رائے صاحب۔ ''جب ہم تمہیں رات دن کے لیے رکھے ہوئے ہیں تو تم گھر پر کیوں رہے؟ کل کے پیسے کٹ جائیں گے۔''

دمڑی۔ ''حضور ایک مہمان آ گئے تھے، اسی سے نہ آ سکا۔''

رائے صاحب۔ ''تو کل کے پیسے اسی مہمان سے لے لو۔''

دمڑی۔ ''سرکار، اب کبھی ایسی کھتا (خطا) نہ ہو گی۔''

رائے صاحب۔ ''بک بک مت کرو۔''

دمڑی۔ ''ہجور............''

رائے صاحب۔ ''دو روپے جرمانہ۔''

دمڑی روتا ہوا چلا گیا۔ روزہ بخشوانے آیا تھا۔ نماز گلے پڑ گئی۔ دو روپے جرمانہ ٹھونک دیا گیا۔ خطا یہی تھی کہ بے چارہ قصور معاف کرانا چاہتا تھا۔

یہ ایک رات غیر حاضر ہونے کی سزا تھی۔ بے چارہ دن بھر کا کام کر چکا تھا۔ رات کو یہاں سویا نہ تھا۔ اس کی یہ سزا! اور گھر بیٹھے بھتے اڑانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کوئی سزا نہیں دیتا؟ سزا تو ہے اور ایسی ہے کہ عمر بھر یاد رہے۔ مگر پکڑنا تو

مشکل ہے۔ دمڑی بھی اگر ہوشیار ہوتا تو ذرا رات رہے آ کر کوٹھری میں سو جاتا۔ پھر کسے خبر ہوتی کہ وہ رات میں کہاں رہا؟ مگر غریب اتنا چالاک نہ تھا۔

(۳)

دمڑی کے پاس کل چھ بسوہ زمین تھی، مگر اتنے ہی آدمیوں کا خرچ بھی تھا۔ اس کے دو لڑکے، دو لڑکیاں اور بیوی سب کھیتی میں لگے رہتے تھے۔ پھر بھی پیٹ بھر کھانے کو روٹیاں میسر نہیں ہوتی تھیں۔ اتنی زمین کیا سونا اگل دیتی؟ اگر سب کے سب گھر سے نکل کر مزدوری کرنے لگتے تو آرام سے رہ سکتے تھے لیکن موروثی کسان مزدور کہلانے کی بے عزتی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس بدنامی سے بچنے کے لیے دو بیل باندھ رکھے تھے۔ اس کی تنخواہ کا کثیر حصہ بیلوں کے چارہ دانہ ہی میں صرف ہو جاتا تھا۔ یہ ساری تکلیفیں منظور تھیں۔ مگر کھیتی چھوڑ کر مزدور بن جانا منظور نہ تھا۔ کسان کی جو عزت ہے وہ کہیں مزدور کی ہو سکتی ہے۔ خواہ ایک روپیہ روز ہی کیوں نہ کمائے؟ کسانی کے ساتھ مزدوری کرنا اتنی ذلت کی بات نہیں۔ دروازے پر بندھے ہوئے بیل اس کی عزت قائم رکھتے ہیں مگر بیلوں کو بیچ کر پھر کہاں منہ دکھانے کی جگہ رہ سکتی ہے؟

ایک روز رائے صاحب اسے ٹھنڈ سے کانپتا دیکھ کر بولے۔ کپڑے کیوں نہیں بنواتا؟ کانپ کیوں رہا ہے؟

دمڑی۔ ''سرکار پیٹ کی روٹی بھی تو پوری نہیں پڑتی۔ کپڑے کہاں سے

بنواؤں؟''

رائے صاحب۔ ''بیلوں کو بیچ کیوں نہیں ڈالتا؟ سیکڑوں بار سمجھا چکا، لیکن نہ جانے کیوں اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟''

دمڑی۔ ''سرکار برادری میں کہیں منہ دکھانے کے لایک نہ رہوں گا۔لڑکی کی سگائی نہ ہونے پاوے گی۔ ٹاٹ باہر کر دیا جاؤں گا؟''

رائے صاحب۔ ''ان ہی حماقتوں کی وجہ سے تو تم لوگوں کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ ایسے آدمیوں پر رحم کرنا بھی گناہ ہے۔ (میری طرف مڑ کر) کیوں منشی جی اس پاگل پن کا بھی کوئی علاج ہے؟ جاڑوں میں مر رہے ہیں، مگر دروازے پر بیل ضرور بندھیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! یہ تو اپنی اپنی سمجھ ہے۔''

رائے صاحب۔ ''ایسی سمجھ کو دور سے سلام کیجیے۔ میرے یہاں کئی پشتوں سے جنم اشٹمی کا جشن منایا جاتا تھا۔ کئی ہزار روپیوں پر پانی پھر جاتا تھا۔ گانا ہوتا تھا۔ دعوتیں ہوتی تھیں۔ رشتہ داروں کو نوید وغیرہ بھیجا جاتا تھا۔ غربا کو کپڑے وغیرہ بانٹے جاتے تھے۔ والد صاحب کے بعد اول ہی سال میں نے یہ جلسہ بند کر دیا۔ فائدہ کیا؟ مفت چار پانچ ہزار کی چپت پڑتی تھی۔ کل قصبہ میں واویلا مچا، آوازے کسے گئے، کسی نے ناستک بھی کہا ہے، کسی نے عیسائی بنایا۔ لیکن یہاں ان باتوں کی کیا پروا۔ آخر چند روز میں سارا کہرام مٹ گیا۔ اجی بڑی دل لگی تھی۔ قبصہ میں کسی کے یہاں شادی ہو تو لکڑی مجھ سے لے۔ پشت ہا پشت سے یہ رسم چلی آئی تھی۔ والد صاحب تو اوروں سے درخت خرید خرید کر اس رسم کو نبھاتے تھے۔ ے تھی

حماقت یا نہیں؟ میں نے فوراً لکڑی دینا بند کر دیا۔ اس پر بھی لوگ بہت روئے دھوئے۔ مگر دوسروں کا رونا دھونا سنوں یا اپنا نفع نقصان دیکھوں؟ اس لکڑی ہی سے کم از کم پانچ سو سالانہ کی بچت ہو گئی۔ اب کوئی بھول کر بھی مجھے ان چیزوں کے لئے دق کرنے نہیں آتا۔"

میرے دل میں پھر سوال پیدا ہوا، دونوں میں کون مہذب ہے؟ خاندانی وقار پر جان دینے والا جاہل دمڑی یا روپیہ پر خاندانی وقار کو قربان کرنے والے رائے رتن کشور؟

(۴)

رائے صاحب کے اجلاس میں ایک بڑے معرکے کا مقدمہ پیش تھا۔ شہر کا ایک رئیس قتل کے الزام میں ماخوذ تھا۔ اس کی ضمانت کے لیے رائے صاحب کی خوشامدیں ہونے لگیں، عزت کی بات تھی۔ رئیس کا حکم تھا کہ چاہے ریاست فروخت ہو جاوے مگر اس مقدمے سے بے داغ نکل آؤں۔ ڈالیاں لگائی جانے لگیں۔ سفارشیں پہنچائی گئیں۔ مگر رائے صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رئیس کے آدمیوں کو علانیہ رشوت کا تذکرہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ آخر جب کوئی بس نہ چلا تو رئیس کی بیوی نے رائے صاحب کی بیوی سے مل کر سودا کرنے کی ٹھان لی۔

رات کے دس بجے تھے۔ دونوں خواتین میں گفتگو ہونے لگی۔ بیس ہزار کی بات چیت تھی۔ رائے صاحب کی بیوی تو اتنی خوش ہوئیں کہ اسی وقت رائے

صاحب کے پاس دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ ’’لے لو، لے لو، تم نہ لوگے تو میں لے لوں گی۔‘‘

رائے صاحب نے کہا۔ ’’اتنی بے صبر نہ ہو۔ وہ تمہیں اپنے دل میں کیا سمجھیں گی؟ کچھ اپنی عزت کا خیال بھی ہے یا نہیں؟ مانا کہ رقم بڑی ہے اور اس میں یکبارگی تمہارے آئے دن کی فرمائشوں سے چھٹکارا پا جاؤں گا۔ لیکن ایک سویلین کی عزت بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمہیں پہلے بگڑ کر کہنا چاہیے تھا کہ مجھ سے ایسی بے ہودہ باتیں کہتی ہو تو یہاں سے چلی جاؤ۔ میں اپنے کانوں سے نہیں سننا چاہتی۔‘‘

بیوی۔ ’’یہ تو میں نے پہلے ہی کیا۔ بگڑ کر خوب کھری کھوٹی سنائی، کیا اتنا بھی نہیں جانتی؟ بے چاری میرے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگی۔‘‘

رائے صاحب۔ ’’یہ کہا تھا کہ رائے صاحب سے کہوں گی تو مجھے کچا ہی چبا جائیں گے۔‘‘ یہ کہہ کر رائے صاحب نے جوش محبت سے بیوی کے گلے لگالیا۔

بیوی۔ ’’اجی، میں ایسے نہ جانے کتنی باتیں کہہ چکی ہوں، مگر وہ کسی طرح ٹالے نہیں ٹلتی۔ رو رو کر جان دے رہی ہے۔‘‘

رائے صاحب۔ ’’اس سے وعدہ تو نہیں کرلیا؟‘‘

بیوی۔ ’’وعدہ! میں تو روپے لے کر صندوق میں رکھ آئی ہوں، نوٹ تھے۔‘‘

رائے صاحب۔ ’’کتنی بڑی احمق ہو۔ نہ معلوم ایشور تمہیں سمجھ بھی دے گا یا نہیں۔‘‘

بیوی۔ ’’اب کیا دے گا، دینا ہوتی تو دے نہ دی ہوتی۔‘‘

رائے صاحب۔ ''ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھ سے کہا تک نہیں اور روپے لے کر صندوق میں داخل کر دیے۔ اگر کسی طرح بات کھل جائے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔''

بیوی۔ ''تو ابھی سوچ لو۔ اگر کچھ گڑ بڑ ہو تو میں جا کر روپے واپس کر دوں۔''

رائے صاحب۔ ''پھر وہی حماقت! ارے اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ایشور پر بھروسہ کر کے ضمانت لینی پڑے گی۔ جانتی ہو، یہ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنی ہے۔ یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے ایسی باتوں سے کتنی نفرت ہے۔ پھر بھی بے صبر ہو جاتی ہو۔ اب کی بار تمہاری حماقت سے میرا برت ٹوٹ رہا ہے۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب اس معاملے پر ہاتھ نہ ڈالوں گا، مگر تمہاری حماقت کے آگے میری کچھ چلنے پاوے۔''

بیوی۔ ''تو میں جا کر لوٹائے دیتی ہوں۔''

رائے صاحب۔ ''اور میں جا کر زہر کھائے لیتا ہوں۔''

ادھر تو میاں بیوی میں یہ ناٹک ہو رہا تھا۔ ادھر دمڑی اسی وقت اپنے گاؤں کے مکھیا کے کھیت میں جوار کاٹ رہا تھا۔ آج وہ رات بھر کی چھٹی لے کر گھر گیا تھا۔ دیکھا کہ بیلوں کے لیے چارہ کا ایک تنکا بھی نہیں ہے۔ ابھی تنخواہ ملنے میں کئی دن کی دیر تھی۔ مول لے نہ سکتا تھا۔ گھر والوں نے دن کو کچھ گھاس چھیل کر کھلائی تو تھی۔ مگر اونٹ کے منہ میں زیرہ، اتنی گھاس سے کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں بیل بھوکے کھڑے تھے۔ دمڑی کو دیکھتے ہی دونوں پونچھیں کھڑی کر کے ہنکارنے لگے۔ جب پاس گیا تو دونوں اس کی ہتھیلیاں چاٹنے لگے۔ بے چارہ دمڑی من مسوس کر

رہ گیا۔ سوچا کہ اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ سویرے کسی سے ادھار لے کر چارہ لاؤں گا۔

لیکن جب گیارہ بجے رات کو اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دونوں بیل ابھی تک ناند پر کھڑے ہیں۔ چاندنی رات تھی۔ دمڑی کو معلوم ہوا کہ دونوں اس کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کو بھوک سے دکھی دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کسان کو اپنے بیل اپنے لڑکے کی طرح پیارے ہوتے ہیں۔ انہیں جانور نہیں بلکہ اپنا دوست اور مددگار سمجھتا ہے۔ بیلوں کو بھوکا کھڑا دیکھ کر اس کی نیند اچٹ گئی۔ آخر وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھا۔ ہنسیا نکالی اور چارے کی فکر میں چلا۔ گاؤں کے باہر باجرا اور جوار کے کھیت کھڑے تھے۔ دمڑی کے ہاتھ کانپنے لگے، لیکن بیلوں کی یاد نے اسے کام پر آمادہ کر دیا۔ چاہتا تو کئی بوجھ کاٹ سکتا تھا، لیکن وہ چوری کرتے ہوئے بھی چور نہ تھا۔ اس نے اتنا ہی چارہ کاٹا جتنا بیلوں کے لیے رات بھر کے لیے کافی ہو۔ سوچا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو اس سے کہہ دوں گا کہ بیل بھوکے تھے، اس لیے کاٹ لیا۔ اسے یقین تھا کہ تھوڑے سے چارے کے لیے کوئی مجھے پکڑ نہیں سکتا۔ میں کچھ بیچنے کے لیے تو کاٹ نہیں رہا ہوں۔ پھر ایسا بے درد کون ہے جو مجھے پکڑ لے؟ بہت کرے گا اپنے دام لے لے گا۔ اس نے بہت سوچا۔ چارہ کا قلیل ہونا ہی اسے چوری کے الزام سے بچانے کے لیے کافی تھا۔ چارہ اتنا کاٹا جتنا اس سے اٹھ سکتا۔ اسے کسی نقصان سے کیا مطلب؟ گاؤں کے لوگ دمڑی کو چارہ لیے دیکھ کر پکڑتے ضرور مگر کوئی اس پر چوری کا الزام نہ لگاتا۔ لیکن اتفاق سے حلقہ کے تھانے کا سپاہی ادھر آ نکلا۔ وہ قریب کے ایک بنیے کے

یہاں جو ہونے کی خبر پا کر کچھ اینٹھنے کی فکر میں آیا تھا۔ دمڑی کو چارہ سر پر اٹھاتے دیکھا تو اسے شک ہوا۔ اتنی رات گئے کون چارہ کاٹتا ہے۔ ہو نہ کوئی چوری سے کاٹ رہا ہے۔ ڈانٹ کر بولا۔ ''کون چارہ لیے جا رہا ہے، کھڑا رہ!''

دمڑی نے چونک کر پیچھے دیکھا تو پولیس کا سپاہی ہاتھ پیر پھول گئے۔ کانپتا ہوا بولا۔ ''سرکار تھوڑا سا کاٹا ہے، دیکھ لیجیے۔''

''تھوڑا کاٹا ہو یا بہت۔ ہے تو چوری۔ کھیت کس کا ہے۔''

دمڑی۔ ''بلدیو مہتو کا۔''

سپاہی نے سمجھا تھا، شکار پھنسیا۔ اس سے کچھ اینٹھ لوں گا۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ پکڑ کر گاؤں میں لایا اور جب وہاں بھی کچھ ہاتھ آتا نہ دکھائی دیا تو تھانہ لے گیا۔ تھانہ دار نے چالان کر دیا۔ مقدمہ رائے صاحب ہی کے اجلاس میں پیش ہوا۔

رائے صاحب نے دمڑی کو ماخوذ دیکھا تو ہمدردی کے بجائے سختی سے کام لیا۔ بولے۔ ''یہ میری بدنامی کی بات ہے تیرا کیا بگڑا؟ سال چھ مہینے کی سزا ہو جائے گی۔ شرمندہ تو مجھے ہونا پڑ رہا ہے۔ لوگ یہی تو کہتے ہوں گے کہ رائے صاحب کے آدمی ایسے بدمعاش اور چور ہیں۔ تو میرا نوکر نہ ہوتا تو ہلکی سزا دیتا، لیکن تو میرا نوکر ہے اس لیے سخت سے سخت سزا دوں گا۔ میں یہ نہیں سن سکتا کہ رائے صاحب نے اپنے ملازم کے ساتھ رعایت کی۔''

یہ کہہ کر رائے صاحب نے دمڑی کو چھ ماہ کی قید سخت کا حکم سنایا۔

اسی روز انہوں نے اس قتل کے مقدمہ میں ضمانت لے لی۔ میں نے دونوں داستانیں سنیں اور میرے دل میں یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا کہ تہذیب صرف ہنر

کے ساتھ عیب کرنے کا نام ہے۔ آپ برے سے برا کام کریں، لیکن اگر آپ اس پر پردہ ڈال سکے تو آپ مہذب ہیں، شریف ہیں۔ جنٹلمین ہیں۔ اگر آپ میں یہ وصف نہیں تو آپ غیر مہذب ہیں، دہقانی ہیں، بدمعاش ہیں۔ یہی تہذیب کا راز ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

تالیف

پہلی بار ہندی میں ''منتر'' کے عنوان سے ''مادھوری'' فروری ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں ۱۹۲۸ء (خاک پروانہ)

(۱)

پنڈت لیلا دھر چوبے کی زبان میں جادو تھا۔ جس وقت وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگتے۔ سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی تقریروں میں خیالات بہت کم ہوتے تھے۔ الفاظ بھی بہت موزوں نہ ہوتے۔ لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا موثر اور دل کش تھا کہ ایک ہی تقریر کو بار بار دہرانے پر بھی اس کا اثر کم نہ ہوتا۔ بلکہ ہر بار قندِ مکرر اور سہ مکرر کا مزہ آتا۔ ہمیں تو یقین نہیں آتا، پر سننے والے کہتے ہیں کہ انہیں صرف ایک تقریر یاد ہے اور اسی کو وہ لفظ بہ لفظ ہر بار نئے انداز سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں کی خاص صفت تھی، تفاخر قومی۔ وہ حال میں نہیں ماضی میں پرواز کرتے تھے۔ فوراً پرانے زمانے کے ہندو عروج کا نقشہ کھینچ کر لوگوں کو گرویدہ کر لیتے۔ سجنو! یونان کا مورخ کہتا ہے کہ چندر گپت کے زمانے میں ہندوستان میں قفل نہیں لگاتے تھے۔ چوری کی وارداتیں معدوم تھیں اور زنا کاری عنقا۔ حضرات ان سے کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا (چیئرز) ہاں ان کا کبھی کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا۔ باپ کے سامنے بیٹے کا مرنا بعید از قیاس بات تھی۔ غرض موجودہ زمانے کی نکبت اور زمانہ قدیم کی ثروت اور

شکوت کا راگ الاپ کر وہ لوگوں کو متوالا بنا دیتے۔ اسی تاثیر زبان کی بدولت ان کا اکابرِ قوم میں شمار تھا۔ خصوصاً ہندو قوم کے تو وہ ناخدا ہی سمجھے جاتے تھے۔ ہندو سبھائی خادموں میں ایسا جاں نثار دوسرا نہ تھا۔ یوں کہیے کہ سبھا کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ دولت تو ان کے پاس نہ تھی۔ کم سے کم لوگوں کا خیال ایسا ہی تھا، لیکن درد اور جوش اور ہمت سے انہوں نے حصہ وافر پایا تھا اور یہ سب قوم کے نذر تھا۔ شدھی کی تحریک کے تو وہ روحِ رواں تھے۔ ہندو قوم کی فنا اور بقا کا مسئلہ اب ان کے خیال میں شدھی کی تحریک پر اٹکا ہوا تھا۔ شدھی کے سوا اب کوئی دوسری صورت ان کے زندہ رہنے کی نہ تھی۔ قوم کی ساری اخلاقی، جسمانی، ذہنی اور تمدنی مالی مصیبتوں کا دفعیہ اسی تحریک کی کامیابی میں تھا اور وہ اس میں دل و جان سے کوشاں رہتے تھے۔ چندہ وصول کرنے میں چوبے جی کو ید طولیٰ تھا۔ ایشور نے وہ طاقت عطا کی تھی کہ پتھر سے تیل نکال لیتے تھے۔ کنجوسوں کو تو وہ ایسا الٹے استرے سے مونڈتے تھے کہ انہیں زندگی بھر کے لیے سبق مل جاتا تھا۔ کان پکڑتے کہ اب کسی تحریک کے قریب نہ جائیں گے۔ چندے کے معاملہ میں پنڈت جی لسانی لفاظی، گندم نمائی، افترا، تملق، چشم نمائی، تخویف، تحریص ہر آلے سے کام لینا انسب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ قومی چندے کے لیے ڈاکہ اور سرقہ تک جائز ہے۔

(۲)

گرمی کا موسم تھا۔ لیلا دھر جی کسی کوہستانی مقام میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ سیر کی سیر ہو جائے گی اور کچھ قومی چندہ بھی وصول ہو جائے گا۔ چندے کی بدولت انہیں زادِ راہ سے گونہ بے فکری تھی اگر چہ ایک ہزار صول کر کے چار پانچ سو روپیہ خرچ ہو جائیں تو ہندو سبھا کا کیا نقصان۔ اسے تو کچھ نہ کچھ مل ہی گئے۔ پنڈت جی نے اب تک معہ اعیال جانے کا ارادہ کیا تھا۔ جب سے شدھی کی تحریک جاری ہوئی تھی۔ ان کی مالی حالت رو بہ اصلاح ہو گئی تھی، لیکن خادمِ قوم کے لیے یہ موقع کہاں کہ وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ سکے۔ خبر آئی کہ مدراس میں مسلمانوں نے طوفان مچا رکھا ہے۔ ہندوؤں کے خطے کے خطے مشرف بہ اسلام ہوتے جاتے تھے۔ علماء نے بڑے جوش سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اگر جلد ہندو سبھا کی طرف سے انتظام نہ ہوا تو یہ لوگ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ پنڈت جی نے معاً پہاڑ کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دکن جانے کو تیار ہو گئے۔ ہندو سبھا کے سیکرٹری نے جب بچشمِ تر ان سے گزارش کی اس مہم کو آپ ہی سر کر سکتے ہیں۔ ایسا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا، جسے یہ کام سپرد کیا جا سکے۔ قوم کی حالتِ زار پر ترس کھائے تو چوبے جی انکار نہ کر سکے۔ فوراً خدام کی ایک جمعیت فراہم کی گئی اور قافلہ چوبے جی کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ ہندو سبھا کی جانب سے اسے ایک رخصتی دعوت دی گئی۔ ایک فیاض رئیس نے پنڈت جی کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی اور ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں آدمی رخصت کرنے آئے۔ سفر میں کیا کیا واقعے پیش آئے۔ اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کئی جگہ تھیلیاں ملیں۔ رتلام کی ریاست نے ایک

شامیانہ نذر کیا۔ بڑودہ ریاست نے خدام کے لیے ایک موٹر پیش کیا۔ یہاں تک کہ مدارس پہنچتے پہنچتے خدام کے ہاتھ ایک معقول رقم کے علاوہ ضرورت کے کتنے ہی سامان آ گئے۔ وہاں آبادی سے دور ایک کھلے میدان میں ہندو سبھا کا شامیانہ نصب ہو گیا۔ قومی جھنڈا لہرانے لگا۔ خدام نے اپنی اپنی وردیاں نکالیں۔ مقامی بااثر ہندوؤں نے ضیافت کے سامان مہیا کیے۔ راوٹیاں کھڑی ہو گئیں۔ چاروں طرف ایسی چہل پہل نظر آنے لگی، گویا کسی بڑے راجہ کی فرودگاہ ہے۔

(۳)

رات کے آٹھ بجے تھے۔ اچھوتوں کی ایک بستی کے قریب ہندو سبھا کے خدام کا خیمہ گیس کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ کئی ہزار آدموں کا مجمع تھا، جس میں زیادہ تر اچھوتوں کی تعداد تھی۔ ان کے لئے الگ ٹاٹ بچھا دیے گئے تھے۔ اونچی ذات کے ہندو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت لیلادھر کی جادو اثر تقریر ہو رہی تھی۔ ''ہم انہیں رشیوں کی اولاد ہیں جو آسمان کے نیچے آسمان بنا سکتے تھے۔ دفعتاً ایک بوڑھے اچھوت نے اٹھ کر کہا۔ ہم لوگ بھی انہیں رشیوں کی اولاد ہیں۔''

لیلادھر۔ ''بے شک تم بھی انہیں رشیوں کی سنتان ہو۔ تمہاری رگوں میں انہیں تپسیوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ گو آج کا ظالم، بے درد، کم اندیش، تنگدل ہندو سماج تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے، لیکن تم کسی ہندو سے نیچے نہیں ہو، چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی اونچا کیوں نہ سمجھتا ہو۔''

بوڑھا۔ ''تمہاری ہندو سبھا کیوں ہم لوگوں کی خبر نہیں لیتی؟''

لیلا دھر۔ ''ہندو سبھا کا جنم ابھی تھوڑے ہی دنوں سے ہوا ہے اور اس قلیل عرصہ میں اس نے جتنے کام کیے ہیں، ان پر اسے جس قدر فخر ہو زیبا ہے۔ ہندو قوم ایک عرصہ دراز کے بعد بیدار ہوئی ہے اور اب وہ زمانہ قریب ہے جب اس ملک میں کوئی ہندو کسی ہندو کو نیچ نہ سمجھ سکے گا۔ جب سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں گے رام نے نشاد کو چھاتی سے لگایا تھا اور شبری کے جھوٹے بیر کھائے تھے۔''

بوڑھا۔ ''جب آپ انہی مہاتماؤں کی سنتان ہیں تو پھر اونچ نیچ میں کیوں اتنا بھید مانتے ہیں؟''

چوبے۔ ''اس لیے کہ ہم پتت ہیں۔ اگیان میں پڑ کر ان مہاتماؤں کو بھول گئے ہیں۔''

بوڑھا۔ ''اب تو آپ کو ہوش آیا ہے۔ ہمارے ساتھ بھوجن کیجیے گا۔''

چوبے۔ ''میں کسی ہندو کے ہاتھ کا بھوجن کر سکتا ہوں۔''

بوڑھا۔ ''میرے لڑکے سے اپنی کنیا کا بواہ کیجیے گا۔''

چوبے۔ ''تم میرے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ جب تک تمہارے جنم کا سنسکار نہ بدل جائے، جب تک تم میں وچار کا پرکاش نہ آ جائے، اس وقت تک بواہ کا سمبندھ نہیں ہو سکتا۔''

بوڑھا۔ ''جب آپ خود کو پتت مانتے ہیں۔ خود اگیان میں پڑے ہوئے ہیں تو آپ کو ہمارے سنسکاروں کو برا کہنے کا کیا حق ہے۔ جائیے، ابھی کچھ دنوں اپنی آتما کا سدھار کیجیے۔ آپ کا دل ابھی تک ابھیمان سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ابھی بھید

بھاؤ سے مکت نہیں ہوا۔اب ہم اس دیوتا کی شرن جا رہے ہیں جس کے ماننے والے ہم سے گلے ملنے کو آج بھی تیار بیٹھے ہیں۔ہم کو ان سے ملنے کے لیے اپنے سنسکاروں کے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ہم جیسے ہیں اچھے یا برے۔ویسے ہی وہ ہم کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔آپ اگر اونچے ہیں تو اونچے بنے رہیئے۔ہم میں اڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ہم ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہ رہیں جن کے ساتھ ہمیں اڑنا نہ پڑے گا۔آخر ہم میں کیا برائیاں ہیں جن کی وجہ سے آپ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ہم شراب پیتے ہیں،لیکن آپ شرابیوں کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔ہم مانس کھاتے ہیں لیکن آپ گئو کا مانس کھانے والوں کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔اسی لیے نہ کہ وہ آپ کو ٹھوکر جمائیں گے۔ہم بھی آج راجہ ہو جائیں تو آپ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔وہی اونچا ہے جو بلوان ہے۔وہی نیچا ہے جو نربل ہے۔یہی آپ کا دھرم ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا وہاں سے چلا گیا اور اس کے ساتھ سارے آدمی اٹھ گئے۔صرف چوبے جی اور ان کے چیلے پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے۔گویا نغمے کے بعد اس کی صدائے بازگشت گونج رہی ہو۔

(۴)

تبلیغی جماعت نے جب سے چوبے جی کے آنے کی خبر سنی تھی،اس فکر میں تھی کہ کسی حکمت سے اسے یہاں سے دور کرنا چاہیے۔چوبے جی کا نام دور دور تک

مشہور تھا۔ ان کی سحر کار تقریر کا لوہا سب مانتے تھے۔ اگر ان کے قدم یہاں جم گئے تو پھر تبلیغ کو راہِ فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔ پہلے سوچا کہ کوئی مباحثہ چھیڑ دیا جائے، لیکن یہ خیال مانع ہوا کہ ان گندہ ناتراشوں پر مباحثہ کا کوئی اثر نہ ہوگا آخر یہ رائے طے پائی کہ چوبے جی کی مرمت کی جائے۔ رات کو کچھ لوگ ہندو سبھا کے کیمپ میں جا کر چھپ جائیں۔ جونہی موقع ملے کمین گاہوں سے نکل پڑیں اور اپنا کام کر کے رفو چکر ہو جائیں۔ مذہبی فدائیوں کی وہاں کیا کمی۔ کئی آدمی کمر کس کر تیار ہو گئے۔ عیدو اور روفاقی دونوں بلا کے سرفروش تھے۔ انہیں منہ مانگی مراد ملی۔

رات کے دو بجے تھے۔ ہندو کیمپ نیند میں مست تھا۔ لیلا دھر بھنگ کے نشہ میں چور ہندو سبھا کے سیکرٹری کو خط لکھ رہے تھے۔ حالت خراب ہے۔ حریفوں نے یہاں اپنا اڈہ جما لیا ہے۔ یہاں جب تک باقاعدہ کیمپ نہ کھولا جائے گا، کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے۔ فی الفور روپے ارسال فرمائیے۔ اس موقع پر اگر سبھا نے بخل کیا تو ہمیشہ کے لیے اسے کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ میری طرف سے اخبارات میں ایک اپیل علیحدہ نکال دیجیے۔ یہاں کامیابی کا راز روپیہ ہے۔ چاروں طرف سے صدا آ رہی ہے۔ روپیہ روپیہ، عیسائیوں نے روپے سے اپنی دھاک بٹھائی۔ تبلیغ روپے سے عمل تسخیر کر رہا ہے اور ہم تقدیر کا دامن پکڑے بیٹھے ہیں۔ کوری تقریر سے کچھ نہ ہوگا۔ آخر میں کوئی دیوتا تو نہیں جو محض تقریر کے جادو سے کایا پلٹ کر دوں گا۔

اگر وہ لوگ ایک خرچ کریں تو ہمیں دو خرچ کرنے کو تیار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے ہی جسم کے اعضا پر نشتر چلایا جا رہا ہے۔ آہ مندو جاتی، تیرے یہ برے

دن آ گئے کہ دشمن چاروں طرف سے تجھ پر حربے چلا رہے ہیں اور تو جمود کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔

یکا یک عیدو اور وفاقی چھرے لیے ہوئے خیمہ میں گھس پڑے۔ پنڈت جی انہیں دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خیمہ سے بھاگنے کی راہ دیکھنے لگے۔ جب مفر نظر نہ آیا تو ہمت اور یاس سے کام لے کر بولے۔ ''تم لوگ کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟''

عیدو۔ ''ہم لوگ حضرت میکائیل کے فرشتے ہیں۔ تمہاری روح قبض کرنے آئے ہیں۔''

یہ کہہ کر دونوں نے چھرے مارنے شروع کر دیے۔ لیلا دھر لحیم شحیم آدمی تھے۔ مشکل سے جنبش کر سکتے تھے۔ تین پاؤ امرتیوں کا ناشتہ کرتے تھے۔ بھوجن کے وقت سوا پاؤ گھی دال میں کھاتے۔ تیسرے پہر بادام اور دودھ ملا کر شربت پیتے، جس میں بھنگ کی ہلکی سی چاشنی ہوتی تھی۔ رات کو بالائی پوریاں، حلوہ وغیرہ مرغن اشیاء کثیر مقدار میں چٹ کر جاتے۔ ایسا آدمی اکھاڑے میں گھنٹوں پٹ پڑا رہے۔ یہاں تک کہ حریف عاجز آ کر اسے چھوڑ دے، لیکن چھرے کے سامنے چستی اور پھرتی کی ضرورت تھی، وہ یہاں مفقود تھی۔ قاتلوں نے تابڑ توڑ اپنی چھریاں ماریں کہ بیچارے چلا بھی نہ سکے۔ حالانکہ چلانا بھی اس وقت بے سود تھا۔ آخر زخموں سے چور ہو کر وہ گر پڑے قاتلوں نے سمجھا کام تمام ہو گیا۔ اور وہ نو دو گیارہ ہو گئے۔

(۵)

صبح کو گرد و نواح میں شور مچ گیا۔ ہزاروں آدمی جائے واردات پر جمع ہو گئے۔ پنڈت جی کو زخم گہرے لگے تھے، مگر ابھی جان باقی تھی۔ لوگوں نے قیاس دوڑانا شروع کیا۔ یہ حرکت کس کی ہے۔ گھنٹوں رائے زنی ہوتی رہی۔ کوئی کہتا ڈاکوؤں کی حرکت ہے، کوئی کسی رقیب کا مورد الزام ٹھہراتا۔ لیکن کسی کو نہ سوجھی تھی کہ زخمی کی مرہم پٹی کرے۔ سرکاری شفاخانہ وہاں سے بیس میل پر تھا۔ ادھر حالت اتنی نازک تھی کہ نہ جانے کون سی سانس دم واپسیں ہو۔ کیمپ کے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے، نظریں بچا بچا کر لوگ یکے بعد دیگرے کھسکتے جاتے تھے۔ آج چوبے جی کی باری تھی۔ کل نہ جانے ہم میں سے کس کے سر آفت آئے۔ کچھ یہاں جان دینے تو آئے نہیں۔ قوم کی خدمت کرنے آئے ہیں۔ اگر خدمت کے معنی جانبازی ہے تو ہم اس خدمت سے درگزرے۔ اگر جان ہی دینی ہے تو فوج میں نہ چلے جائیں گے، جہاں ایک دن صوبیدار، میجر ہو سکتے ہیں۔ یہاں کیوں پڑے رہیں گے۔ کون کہے کہ ہندو سبھا ہمارے بال بچوں کے لیے وظیفہ مقرر کر دے گی۔

شام ہوتے ہوتے کیمپ میں سناٹا چھا گیا کیمپ کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہا۔ تماشائیوں کا ہجوم بھی کم ہوا۔ پنڈت جی بے چارے خاک و خون میں لپٹے بے ہوش، نیم جاں، مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ ہوش تھا، پر درد کا حس باقی نہ تھا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہیر طیسدان جنگلی جانور سرِ شام سے شکار کی تلاش میں

نکل پڑتے تھے۔ رات کیسے گزرے گی۔

اچھوتوں کا مکھیا بوڑھا آج کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نو بجے رات کو گھر واپس آیا تو خبر سنی۔ گھر والوں سے بولا۔ ''تم نے پنڈت جی کی مرہم پٹی کی فکر بھی نہیں کی۔ ان کا یہاں کوئی دوسرا بیٹھا ہوا ہے۔ ان کے ساتھ کے آدمی پردیسی ٹھہرے، گھبرا گئے ہوں گے، شاید بھاگ بھی گئے ہوں۔ یہ تو تمہارا دھرم تھا کہ زخمی کو گھر لاتے۔ اس کی دوا دارو کرتے۔ ہمارے ہی اُپکار کے لیے تو وہ یہاں آئے تھے۔ اگر ہماری فکر نہ ہوتی تو وہ یہ زحمت کیوں اٹھاتے اور زخمی کیوں ہوتے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ تو ہمارے لیے سیکڑوں کوس سے آئیں اور ایسے ظلم اٹھائیں اور ہم ان کی خبر تک نہ لیں۔ پرماتما کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اتنا بڑا گاؤں ہے کسی میں بھی اتنی دیا نہ آئی۔ اگر کوئی جانور اٹھا لے گیا تو کس پر مصیبت پڑے گی۔ پرماتما کے یہاں کون پکڑا جائے گا۔ کس کے منہ میں کالک لگے گی۔''

یہ کہتا ہوا وہ الٹے پاؤں لوٹا اور ہندو کیمپ کی طرف چلا۔ سارا گاؤں اس کی رضا کا غلام تھا۔ چودھری کا حکم سب کے لیے قانون تھا۔ اس کے جاتے ہی لوگ ڈولی لے کر کیمپ کی طرف دوڑے۔ چودھری نے پنڈت جی کو بڑی نرمی سے اٹھا کر ڈولی میں لٹایا اور ایک لمحہ میں ڈولی اس کے گھر پہنچ گئی۔ دور کے گاؤں میں ایک نائی رہتا تھا، وہی وہاں کا سرجن تھا۔ وہیں تک لوگوں کی دوڑ تھی۔ اچھے ہوتے تو اس کے ہاتھوں، مرتے تو اس کے ہاتھوں۔ راتوں رات اس کے پاس قاصد دوڑایا گیا اور وہ غریب آدھی رات کے قریب اس پہاڑی راستے اور اندھیری رات میں گرتا پڑتا چودھری کے گھر آ پہنچا۔

دیکھیے، یہ جہلا کی تہذیب کا نمونہ۔ آپ کا سرجن رات کو باہر نہیں نکلتا۔ نکلتا ہے تو دوگنی تگنی فیس لے کر۔ اگر سواری نہ ہو تو قدم نہ اٹھائے۔ وہاں آدھی رات کو غریب خبر پاتے ہی دوڑا چلا آتا ہے۔ کسی صلہ کی تمنا میں نہیں اگر کچھ مل جائے تو واہ واہ، ورنہ کسی سے شکایت نہیں۔ سانپ کا منتر جاننے والا اگر کسی حادثے کی خبر پا کر دوڑ نہ پڑے تو اسے پاپ لگتا ہے۔ ندی چڑھی ہو، رات اندھیری ہو، کوئی پروا نہیں۔ اس کا دھرم ہے کہ مارگزیدہ کے پاس آکے اور حتی الامکان اس کی خدمت کرے۔ نائی نے زخمی کو دیکھا۔ اس کے زخموں کو دھویا۔ مرہم رکھا، پٹی باندھی اور وہیں لیٹ رہا۔ تین دن تک وہ پنڈت کے سرہانے سے نہ ٹلا۔ یہاں تک کہ پنڈت جی نے آنکھیں کھولیں۔

(۶)

مہینے بھر تک پنڈت جی چارپائی پر پڑے رہے۔ زخم روز بروز بھرتے جاتے تھے۔ جسم میں قوت عود کرتی جاتی تھی، لیکن نائی کی سخت تاکید تھی کہ یہ اٹھنے نہ پائیں۔ سارا گھر ان کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ گھر ہی نہیں گاؤں بھر کے مرد عورتیں ان کی خدمت کرتے۔ خود چاہے فاقے کر جائیں لیکن پنڈت جی کے لیے مقوی غذا بہم پہنچاتے۔ ایک آدمی سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا پنکھا جھلتا رہتا۔ انہیں سہارے سے کروٹ بدلواتا۔ اٹھاتا، حوائج کے لیے چارپائی سے نیچے اتارتا۔ ایک مستقل تیماردار کے بغیر ان کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ وہ لوگ یہ

ساری خدمت خندہ پیشانی سے کرتے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ کہاں کی بلا کہاں گلے پڑی۔ چوبے جی زود رنج ہو گئے تھے۔ بیماری میں انسان کچھ چڑچڑا ہو ہی جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتے، اور گھر والوں کو ڈانٹ بیٹھتے۔ پر کوئی برا نہ مانتا۔ خاص کر اس لیے کہ ذرا سی دیر میں پنڈت جی چشم پرنم معذرت کرنے لگتے۔ ان کا ضمیر کہتا۔ تم ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ یہ بے چارے مزدور ہیں۔ انہیں اتنی فرصت کہاں کہ کسی کی تیمارداری کریں۔ تمہارے ساتھ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ کیا کم ہے کہ تم اس سے زیادہ کی امید رکھتے ہو۔ دہقانوں کے اس ایثار کے مقابلے میں پنڈت جی کو اپنی دنیا پرستی پر شرم آتی ہے۔ وہ سوچتے اگر میرے یہاں کوئی باہر کا آدمی یوں آ کر پڑ جاتا تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ شاید قریب کھڑا بھی نہ ہوتا۔ وہ بے چارہ کراہ کراہ کر مر جاتا۔ میری تیمارداری، معالجہ اور خوراک میں ان غریبوں کے سیکڑوں روپے صرف ہو گئے۔ یہ کتنے بے غرض، فراخ دل، کتنے پاک نفس لوگ ہیں اور میں انہیں شدھ کرنے چلا تھا۔ انہیں انسانیت کا سبق دینے چلا تھا۔ میں انہیں جاہل، غیر مہذب، نیچ سمجھتا تھا۔ ہم عالموں سے جاہل ہی اچھے۔ ہم تہذیب یافتوں سے یہ غیر مہذب لوگ ہزار درجہ بہتر۔ ہم اونچوں سے یہ نیچے بدرجہا قابل عزت۔ اگر تہذیب علم اور شرافت کے معنی دنیا پروری، تنگ دلی اور غرور ہے تو اس علم اور اس تہذیب کو سلام۔ ان خیالات نے پنڈت جی کے باطن پر عمل کرنا شروع کیا۔ ان کی خود شدھی ہونے لگی۔ منتروں سے نہیں، اگن کنڈ کے سامنے نہیں، گوبر کھلا کر نہیں بلکہ وہ سچی شدھی، وہ معنوی تالیف جو حق و باطل کی تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ ان

کے غرور نے انکسار کے سامنے سر جھکا دیا۔ خود غرضی نے ایثار کے سامنے بوسہ دیا۔ انہیں معلوم ہوا، یہ دیوتا لوگ ہیں اور مجھے پرماتما نے اصلاحِ باطن کے لیے ان کے بیچ میں ڈال رکھا ہے۔

رفتہ رفتہ پنڈت جی میں چلنے پھرنے کی طاقت آ گئی، اور وہ ان احسانات عظیم کے اظہار شکریہ کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ ایشور کی کچھ مرضی۔ اسی زمانے میں اس علاقے میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ اچھوتوں میں یہ وہم پھیلا ہوا تھا کہ یہ کوئی شیطانی بلا ہے اور جو آدمی کسی طاعون زدہ کی امداد کرے گا، وہ اور اس کا خاندان اس شیطان کے قہر کا شکار ہو گا۔ توہمات کے زیر اثر انسان سے حیوانی حرکات سرزد ہوا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ آدمیوں کا بلیدان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ طاعون کا دورہ ہوتے ہی کئی آدمی بیمار ہو گئے اور سارے گاؤں کے لوگ انہیں ان کی قسمت پر چھوڑ کر گاؤں کے باہر نکل گئے۔ کوئی ان غریبوں کے نزدیک نہ جاتا۔ ان کی تیمارداری تو درکنار شیطان کے پنجہ میں پھنسا ہوا انسان شیطان سے کم خوف انگیز نہ تھا۔ بوڑھے چودھری بھی شیطان کی زد میں آ گئے۔

صبح کا وقت تھا۔ گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دو تین گھروں کے دروازے کھلے تھے مگر انسان کا وجود نہ تھا۔ چوبے جی گاؤں میں داخل ہوئے۔ انہیں بھی گاؤں والے اپنے ساتھ زبردستی کھینچ لے گئے تھے۔ اس وقت بھی آدمی ان کے ساتھ گاؤں کے ڈانڈے تک منع کرتے ہوئے آئے۔ انہیں خوف تھا کہ گاؤں میں جا کر پنڈت جی سلامت نہ لوٹیں گے لیکن پنڈت جی نے انہیں تشفی دی اور انہیں رخصت کر کے گاؤں میں آ رہے۔ ان کا دل بھی ایک نامعلوم خوف سے

دھڑک رہا تھا، مگر انہوں نے دل کو مضبوط کیا اور چودھری کے مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو بوڑھا چودھری آنکھیں بند کیے توکل کی تصویر بنا ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑا ہوا ہے۔ ان کی آہٹ پاتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔

چوبے جی نے پوچھا۔ ''چودھری کیسی طبیعت ہے؟''

چودھری۔ ''اچھا ہوں، تم جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔ کیا گاؤں والوں نے تم کو نہیں بتلایا۔ کچھ نہیں بتلایا۔ کیسے بے سمجھ ہیں، کیسے نردئی۔ جاؤ مجھے مرنے دو۔''

چوبے۔ ''گھبراؤ مت۔ مجھے بہت سے منتر یاد ہیں۔ بھوت پریت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

چودھری۔ ''ارے بابا، کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ یہاں سے جاؤ جاؤ نہیں، مجھے مت چھونا۔''

مگر چوبے جی نے نہ مانا۔ چودھری جی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا تو سارا بدن توے کی طرح جل رہا تھا۔ بغل میں ایک گلٹی نکل آئی تھی، مگر پلیگ خوفناک قسم کا تھا۔ پنڈت جی نے فوراً آگ جلائی اور گلٹی کو پتھر سے سینکنا شروع کیا۔ چودھری لیٹے لیٹے ان کی طرف مرغوب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ یہ کوئی دیوتا ہے۔ اب تک شیطان نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ پنڈت جی آدھ گھنٹے تک گلٹی کو سینکا اور تب دوسرے مریضوں کے یہاں پہنچے، وہاں بھی یہی کیفیت تھی۔ ایک تو بالکل بے ہوش تھا مگر دو ہوش میں تھے۔ انہوں نے بھی چوبے جی کو

بھگانا چاہا، مگر چوبے جی ان ان کی تشفی کی۔ یہاں تک کہ وہ بھی خاموش ہو گئے۔

اگر چہ سرکاری شفاخانہ وہاں سے دس کوس پر تھا اور راستہ نہایت خراب۔ اس پر پنڈت جی ابھی تک کمزور تھے، پر انہوں نے گلٹیوں کو کپڑے سے باندھ کر شفاخانے سے دوا لانے کی ٹھانی۔ سوچا اگر مر بھی گئے تو کیا غم۔ انہی لوگوں نے تو مجھے دوبارہ زندگی عطا کی۔ ورنہ اب تک جنگلی جانوروں کے پیٹ میں ہضم ہو گیا ہوتا۔ بھاگم بھاگ چلے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستے میں کسی کا ٹٹو چرتا ہوا مل گیا۔ راس بھی پڑی ہوئی تھی۔ آپ جھٹ اس پر سوار ہو گئے۔ دل تو سمجھایا ٹٹو میں کہیں لیے تو جاتا نہیں۔ لوٹ کر یہاں چھوڑ دوں گا۔ مالک صاحب بہت گرم پڑیں گے تو ایک روپیہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ ٹٹو تھا سبک خرام۔ تیسرے پہر ان کو منزل مقصود پر جا پہنچایا۔ چوبے جی سرجن سے ملے۔ گاؤں کی ساری کیفیت بیان کی اور مرہم اور ادویات کا بکس لیے ہوئے پھر لوٹے۔ ٹٹو کو راستے میں چھوڑ دیا۔ آٹھ بجتے بجتے گاؤں میں آ پہنچے اور اسی وقت مریضوں کو دوا پلا دی۔ پہلے تو کوئی مریض دوا پینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں بھوت مہاشے بگڑ نہ جائیں کہ یہ میرے پنجے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور غصہ میں آ کر میرے بال بچوں کو ستائیں لیکن پنڈت جی نے دلاسا دے کر دوائیں پلائیں۔ پھر مرہم بھی رکھ دیا۔

آج پنڈت جی میں اتنی قوت نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ دن بھر دوڑے۔ بیس کوس کی منزل طے کی مگر نہ ماندگی اور تکان، نہ نیند کا غلبہ۔ ساری رات مریضوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ کبھی اس گھر میں جاتے کبھی اس گھر میں باری

باری تینوں مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔

پانچ دن تک یہی کیفیت رہی۔ چوبے جی نے ملکوتی ایثار سے کام لیا۔ کھانے پینے کی چیزیں برتن وغیرہ تو گھروں میں موجود تھے۔ پر وہ ایک بار بمشکل تمام کچھ بنا کر بھوک مٹا لیتے تھے۔ باقی سارا دن اور ساری رات مریضوں کے علاج معالجہ اور عیادت میں صرف کرتے۔ مریضوں کو بچنا تھا بچ گئے۔ مگر اس کا جس پنڈت جی کو ہوا۔

(۷)

اس جانبازانہ عیادت نے لوگوں کو چوبے جی کا معتقد بنا دیا۔ جنہیں لوگوں نے مایوس العلاج سمجھ لیا تھا، وہ چنگے ہو گئے۔ جن کی ساری زندگی کی امیدیں منقطع ہو گئی تھیں۔ وہ زندہ تھے۔ پنڈت جی نے انہیں شیطان کے پنجہ بیدرد سے نجات دے دی تھی۔ یہ عام خیال تھا کہ پنڈت جی کی بھوتوں سے خونریز جنگ ہوئی اور پنڈت جی ان پر غالب آئے، مگر وہ جان پر کھیل کر ان آدمیوں کی حمایت نہ کرتے تو ان کا بچنا محال تھا۔ یہ آدمی نہیں کوئی دیوتا ہیں۔ ضرور دیوتا ہیں۔ دیوتاؤں کے سوا اور کون غریب ستم زدوں کی حمایت کرتا ہے۔ کون بے کسوں کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ بھوتوں کی فوج آئی ہو گی۔ ایک سے ایک مہیب اور کریہہ منظر دیو سامنے آئے ہوں گے، مگر اس شیر نے سبھوں کو نیچا دکھایا۔

ایک آدمی بولا۔ ”کسی دیوتا کا اوتار ہے۔“

بوڑھے چودھری نے کہا۔ ''دیوتا کا اوتار نہیں۔ تمہارا سر دھرماتما آدمی ہیں اور دھرماتما آدمی دیوتاؤں سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ رات کی رات جاگتے رہتے تھے، پلک تک نہیں جھپکتی تھی۔ کبھی میرے پاس بیٹھتے تھے۔ کبھی بھیکو کے پاس جاتے، کبھی چمرو کے گھر۔ نہ کھانے کی فکر رہتی تھی نہ پینے کی۔ دوا پلانا۔ دوڑ کر پانی دینا۔ میں تو ایمان کی کہتا ہوں، اپنا بیٹا بھی ہوتا، اس طرح خدمت نہ کرتا۔''

بھیکو۔ ''میں تو کبھی کبھی غصہ میں آ کر گالیاں دینے لگتا تھا، لیکن مجال کہ ذرا بھی من میلا ہو۔ ایسا دھیرج تو کسی میں دیکھا ہی نہیں۔ میری تو اگر وہ جان بھی مانگیں تو دونوں ہاتھوں سے دے دوں۔''

چودھری۔ ''میں نے تو طے کر لیا ہے کہ اب ان کا چیلا ہو جاؤں گا۔ پرانے زمانے میں ایسے ہی رشی مہاتما ہوتے ہوں گے۔ ایسے مہاتماؤں کی شرن چھوڑ کر اور کہاں جاؤں۔ مولوی لوگ بھی باتیں بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اونچ نیچ، بھید بھاؤ نہیں۔ ان لوگوں کے دل صاف نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا ایسے مہاتما پر چھپ کر وار کرتے ہیں۔ ہم لوگ بھوتوں کے پنجے میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے کوئی پاس نہ پھٹکا۔ جس دھرم میں سچے مہاتما نہیں وہ دھرم کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ تم لوگوں کی مرضی جیسی ہو وہ کرو۔ لیکن میں تو اپنا دھرم نہ چھوڑوں گا۔ پہلے میں سمجھتا تھا، ہمارا دھرم مردہ ہو گیا ہے، جبھی تو یہ خرابیاں آ گئی ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ ہمارا دھرم جیتا جاگتا ہے۔ اس میں اب بھی دکھیوں کا دکھ ہرنے والے رشی مہاتما پیدا ہو رہے ہیں۔''

بھیکو۔ ''چودھری تم نے میرے من کی بات کہہ دی۔ میں بھی سوچ رہا تھا ایسے

مہاتما کو چھوڑ کر اب ہم اور کسی کی بھگتی نہ کریں گے۔"

چمرو۔"جب مولوی لوگ آئیں گے تو دور ہی سے سلام کروں گا۔ ہم کسی سے نیچے نہیں ہیں۔ ایسے ایسے مہاتما جن کے لئے اپنی جان کی پروا نہ کریں وہ نیچے نہیں ہو سکتے۔"

یوں ہی دیر تک لوگوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن سارے گاؤں نے پنڈت جی کو اپنا گورو بنایا اور سارے علاقے میں ان کی پاک نفسی کا شہرہ ہو گیا۔ جوق در جوق ان کے درشنوں کو آنے لگے۔ ہندو دھرم کے اکھڑے ہوئے قدم یہ صدائے سنتے ہی سنبھل گئے اور چوبے جی کو تالیف کا ایک ایسا منتر ہاتھ آ گیا جو کبھی چوک ہی نہ سکتا تھا، جس سے چاروں پدارتھ، آٹھوں سدھیاں اور ساری ودھیاں مل جاتی ہیں۔

قزاقی

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری'' اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: اردو میں ۱۹۳۰ء (پریم چالیسی، اول)

(۱)

میری بچپن کی یادداشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونے والا شخص ہے۔ آج چالیس برس گزر گئے مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ میں ان دنوں اپنے والد کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کی ایک تحصیل میں تھا۔ قزاقی ذات کا پاسی تھا۔ بڑا ہی ہنس مکھ، بڑا ہی ہمتور، بڑا ہی زندہ دل۔ وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا۔ رات بھر رہتا اور سویرے ڈاک لے کر چلا جاتا۔ شام کو پھر ادھر سے ڈاک لے کر آجاتا۔ میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جونہی چار بجتے، بے چین ہو کر، سڑک پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے اس کے گھنگھرو بجاتا دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ وہ سانولے رنگ کا، مضبوط اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابک دست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے سڈول چہرے پر بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ تیز دوڑنے لگتا، اس کے بلم کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے اور میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا۔ خوشی کی امنگ میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن

بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لیے ہوئے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہوں۔

قزاقی ڈاکخانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا۔ لیکن آرام کرنے کی اس کی عادت نہ تھی۔ تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا، کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری، ڈاکہ، مار پیٹ، بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا۔ اس کے قصوں کے چور ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے جو اُمراء کو لوٹ کر غرباء و مساکین کی پرورش کرتے تھے۔ مجھے ان سے نفرت کے بجائے عقیدت ہوتی تھی۔

(۲)

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہوگئی۔ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ نظر نہ آیا۔ میں کھویا ہوا سا سڑک پر دور دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نہ نظر آتی تھی۔ کان لگا کر سنتا تھا مگر ''جھن جھن'' کی وہ مسرت افزا آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ روشنی کے ساتھ میری امید بھی غائب ہوتی جاتی تھی۔ ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا............قزاقی آتا ہے؟ مگر یا تو

کوئی سنتا ہی نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً ''جھن جھن'' کی آواز کانوں میں آئی۔ مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے، حتی کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لیے قابل ترک ہو جاتی تھی۔ مگر وہ آواز سنتے ہی میں اس کی طرف زور سے دوڑا۔ ہاں وہ قزاقی ہی تھا! اسے دیکھتے ہی میری بے قراری غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ میں اسے مارنے لگا پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا............ ''مارو گے تو میں ایک چیز لایا ہوں، وہ نہ دونگا۔''

میں نے ہمت کرکے کہا............ ''جاؤ نہ دینا، میں لونگا ہی نہیں۔''

قزاقی: ابھی دکھادوں تو دوڑ کر گودی میں اٹھا لوگے۔

میں نے پگھل کر کہا۔ ''اچھا دکھا دو۔''

قزاقی: تو آکر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ۔ بھاگ چلوں آج بہت دیر ہو گئی، بابو جی بگڑ رہے ہونگے۔ میں نے اکڑ کر کہا۔ ''پہلے دکھا دو۔''

میری فتح ہوئی۔ اگر قزاقی کو دیر کا خوف نہ ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو شاید پانسہ پلٹ جاتا۔ اس نے کوئی چیز دکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا۔ لانبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اسے قزاقی کی گود سے لے لیا۔ وہ ہرن کا بچہ تھا۔ آہ، میری اس خوشی کا کون اندازہ کرے گا؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کیے، بڑا عہدہ بھی پایا۔ رائے بہادر بھی ہوا، مگر ویسی خوشی پھر نہ نصیب ہوئی۔ میں اسے گود

میں لیے، اس کے نرم و نازک مس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے میں کیوں اتنی دیر ہوئی، اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا............ ''یہ کہاں ملا قزاقی؟''

قزاقی۔ ''بھیا، یہاں سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ اس میں بہت سے ہرن ہیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کوئی بچہ مل جائے تو تمھیں دوں۔ آج یہ بچہ ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا۔ میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچہ بھی بھاگا پر میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دور نکل گئے پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔''

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاک خانہ پہنچے۔ بابو جی نے مجھے نہ دیکھا، ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا، قزاقی ہی پر ان کی نگاہ پڑی۔ بگڑ کر بولے............

''آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے، اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی گئی۔ بتا، تو نے اتنی دیر کہاں لگائی۔''

قزاقی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابو جی نے کہا۔ ''تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے۔ رذیل ہے نہ، پیٹ بھرا تو موٹا ہو گیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔''

قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا، بولے............ ''اچھا، تھیلا رکھ دے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ سور، اب ڈاک لے کے آیا ہے۔ تیرا کیا بگڑے گا؟ جہاں چاہے گا مزدوری کرے گا۔ ماتھے تو میرے جائے گی، جواب تو مجھ سے طلب ہو گا۔''

قزاقی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ سرکار، اب کبھی دیر نہ ہوگی۔

بابو! ''آج کیوں دیر کی، اس کا جواب دے۔''

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہو گئی۔ بابو جی بڑے غصہ ور تھے۔ انہیں کام بہت کرنا پڑتا تھا، اسی وجہ سے بات بات پر جھنجھلا پڑتے تھے۔ میں تو ان کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا۔ وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے۔ دن میں وہ صرف دو بار ایک ایک گھنٹہ کے لیے کھانا کھانے جاتے تھے، باقی تمام دن دفتر میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے لیے افسروں سے درخواست کی تھی، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تھا۔ حتی کہ تعطیل کے دن میں بھی بابو جی دفتر ہی میں رہتے تھے۔ صرف والدہ ان کے غصہ کو فرو کرنا جانتی تھیں، مگر وہ دفتر میں کیسے آتیں؟ بیچارہ قزاقی اسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا۔ اس کا بلم، چپراس اور صافہ چھین لیا گیا اور اسے ڈاکخانہ سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم سنا دیا گیا۔ آہ، اس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا اور بابو جی کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے، اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپراس پر تھا۔ جب وہ چپراس کھولنے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا۔ میرے گھر کے دروازہ پر آ کر قزاقی نے کہا ''بھیا! اب گھر جاؤ، سانجھ ہوگئی۔''

میں چپ چاپ کھڑا اپنے آنسوؤں کے جوش کو پوری طاقت سے ضبط کر رہا تھا۔

قزاقی پھر بولا.........."بھیا، میں کہیں باہر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا، پھر آؤں گا اور تمھیں کندھے پر بٹھا کر دوڑاؤں گا۔ بابو جی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے؟ تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا بھیا، جا کر اماں سے کہدو، کجا کی جاتا ہے، اس کا کہا سنا معاف کریں۔"

میں دوڑا ہوا گھر گیا مگر ماں سے کچھ کہنے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں رسوئی سے باہر آ کر پوچھنے لگیں، "کیا ہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟ بابو جی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا، رہ تو جاؤ، آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں۔ چپ رہو بیٹا۔ اب تم اس کے پاس کبھی مت جانا۔"

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا..........قزاقی..........

ماں نے سمجھا کہ قزاقی نے مارا ہے۔ "اچھا آنے دو قزاقی کو، دیکھو کھڑے کھڑے نکلوائے دیتی ہوں۔ ہرکارہ ہو کر میرے راجہ بیٹا کو مارے۔ آج ہی تو صافہ، بلم، سب چھنوائے لیتی ہوں۔ واہ!"

میں نے جلدی سے کہا، "نہیں، قزاقی نے نہیں مارا۔ بابو جی نے اسے نکال دیا۔ اس کا صافہ بلم چھین لیا۔ چپراس بھی لے لیا۔"

ماں: "یہ تمھارے بابو جی نے بہت برا کیا۔ وہ بیچارہ اپنے کاموں میں اتنا مستعد رہتا ہے، پھر اسے کیوں نکالا؟"

میں نے کہا، "آج اسے دیر ہو گئی تھی۔"

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گودی سے اتار دیا۔ گھر میں اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ ابتک ماں کی نگاہ بھی اس پر نہ پڑی تھی۔ اسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکایک چونک پڑیں اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے۔ میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، کہاں ماں کی اس گھبراہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ماں: ''ارے، یہ تو ہرن کا بچہ ہے۔ کہاں ملا؟''

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اس کے خوفناک نتیجہ کا حال ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا.......... اماں! یہ اتنا تیز بھاگتا تھا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ ہی نہ سکتا۔ سن سن ہوا کی طرح اڑتا چلا جاتا تھا۔ قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک اس کے پیچھے دوڑتا رہا تب کہیں بچہ جا کر ملے۔ اماں؟ قزاقی کی طرح کوئی دنیا بھر میں نہیں دوڑ سکتا۔ اسی سے تو دیر ہو گئی۔ سو بابو جی نے بیچارے کو نکال دیا۔ چپراس، صافہ، بلم سب چھین لیے۔ اب بیچارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مر جائے گا۔

ماں نے پوچھا.......... ''کہاں ہے قزاقی، ذرا اسے بلا تو لاؤ۔''

میں نے کہا ''باہر تو کھڑا ہے۔ کہتا ہے، اماں جی سے میرا کہا سنا معاف کرا دینا۔''

اب تک ماں میری باتوں کو مذاق سمجھ رہی تھیں۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہو گا۔ مگر میرا آخری جملہ سن کر انہیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا۔ وہ باہر جا کر قزاقی قزاقی پکارنے لگیں مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بار بار پکارا، رو رو کر پکارا، مگر قزاقی وہاں نہ تھا۔

کھانا تو میں نے کھا لیا۔ بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے، خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو۔ مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا۔ میرے پاس روپے ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دیتا اور کہتا کہ بابو جی سے کبھی مت بولنا .... بیچارہ بھوکوں مر جائے گا۔ دیکھیں، کل آتا ہے یا نہیں۔ اب کیا کرے گا آ کر؟ مگر آنے کو تو کہہ گیا ہے۔ میں کل اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤنگا۔

یہی ہوائی قلعے بناتے بناتے مجھے نیند آ گئی۔

(۳)

دوسرے روز میں تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا۔ پہلے اس کے نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی۔ منو نام رکھا گیا۔ پھر میں نے اس کا اپنے جملہ دوستوں اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا۔ ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اتنی ہی دیر میں میں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دیدی۔ اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اس کے لیے ایک علیحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کر لیا۔ پلنگ، فٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کر لیں۔

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا۔ یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے۔ اب اس یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔

یکا یک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہوگا۔ میں فوراً گھر گیا، والدہ چراغ جلا رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے، ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا۔ آ کر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا۔ اس کے بلم میں ڈاک تھیلا ابھی بندھا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اس کی کمر سے لپٹ گیا اور متحیر ہو کر بولا، ''تمھیں چپراس اور بلم کہاں سے مل گیا قزاقی؟'' قزاقی نے مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا، ''وہ چپراس کس کام کی تھی بھیا؟ وہ تو گلامی کی چپراس تھی۔ یہ اپنی خوشی کی چپراس ہے۔ پہلے سرکار کا نوکر تھا، اب تمہارا نوکر ہوں۔''

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پر پڑی جو وہیں رکھی تھی۔ بولا، ''یہ آٹا کیسا ہے بھیا؟'' میں نے شرمائے کہا، ''تمہارے ہی لیے تو لایا ہوں۔ تم بھوکے ہوگے، آج کیا کھایا ہوگا؟''

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا، اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا، ہاں، اس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے۔ بولا، ''بھیا! کیا روکھی روٹیاں کھاؤں گا؟ دال، نمک، گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔''

میں اپنے سہو پر بہت نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟ لیکن نمک، دال اور گھی کیسے لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہونگی۔ آٹا لے کر تو کسی طرح بھاگ آیا تھا۔ (ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی، آٹے کی لکیر نے سراغ دے دیا ہے) اب یہ تین تین چیزیں کیسے لاؤں گا؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی۔ ایک ایک پیسے کے لیے تو گھنٹوں رلاتی ہیں، اتنی

سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں۔ یکا یک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے اپنی کتابوں کے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ معلوم نہیں۔ اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا۔ بابو جی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے۔ شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لیے اسی نسخے کو سب سے آسان سمجھتے تھے۔ انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا۔ اس بلا کو وہ دور ہی سے ٹال دیتے تھے۔ ماں کا مزاج اس کے ٹھیک برعکس تھا۔ انہیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں خلل پڑنے کا خوف نہ تھا۔ آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سن سکتا ہے حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے۔ اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں مگر پیسہ کا نام سنتے ہی ان کی تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ میرے پاس کتابیں نہ تھیں۔ ہاں ایک بستہ تھا جس میں ڈاکخانہ کے دو چار فارم تہہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا، دال، نمک اور گھی کے لیے کیا اتنے پیسے کافی نہ ہونگے؟ میری تو مٹھی میں نہیں سماتے! خیر، یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا، ''اچھا، مجھے اتار دو تو میں دال اور نمک لا دوں۔ مگر روز آیا کرو گے نہ؟''

قزاقی۔ ''بھیا، کھانے کو دو گے تو کیوں نہ آؤں گا؟''

میں نے کہا، ''میں روز کھانے کو دوں گا۔''

قزاقی بولا۔ ''تو میں بھی روج آؤں گا۔''

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے

لیے اس وقت میرے پاس کوہ نور ہیرا ہوتا تو اسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''یہ پیسے کہاں پائے، بھیا؟''

میں نے فخر سے کہا۔ ''میرے ہی تو ہیں۔''

قزاقی: ''تمہاری اماں جی تم کو ماریں گی۔ کہیں گی کہ کجا کی نے پھسلا کر منگوا لیے ہوں گے۔ بھیا، ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا۔ اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا۔ میں بھوکوں نہیں مرتا۔ میرے دو ہاتھ ہیں، بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟''

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لیے۔ اس نے بڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کرائی، گیت سنائے اور مجھے گھر پہنچا کر چلا گیا۔ میرے دروازہ پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا، ''کیوں رے چور، تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟ اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا۔ ورنہ تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔''

میری نانی مر گئی ماں غصہ میں شیرنی ہو جاتی تھیں۔ میں سٹ پٹا کر بولا، ''کسی کو تو نہیں دے آیا۔''

ماں: ''تو نے آٹا نہیں نکالا؟ دیکھ کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔''

میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں، چمکارتی تھیں مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ آنے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی۔ یہاں تک بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بگڑتی کیوں ہو؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہے۔ نہ اٹھا کر

لاتے بنتا تھا۔ گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی تھی۔ گویا پیروں میں ہلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ دفعتاً قزاقی نے پکارا، ''بہو جی، آٹا یہ دروا جے پر رکھا ہوا ہے۔ بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔''

یہ سنتے ہی ماں دروازہ کی طرف چلی گئیں، قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن اماں جی خالی ٹوکری لیے ہوئے گھر میں آئیں۔ پھر کوٹھری میں جا کر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازہ کی طرف گئیں۔ میں نے دیکھا، ان کی مٹھی بند تھی۔ اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا۔ ماں نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا!

میں نے بڑی بہادری سے کہا، ''میں جا کر کھوج لاؤں، اماں جی؟''

ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا، ''تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہیں رہنا، میں آتی ہوں۔ تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا۔ بڑا سنکوچی آدمی ہے۔ آٹا تو لیتا ہی نہ تھا۔ میں نے زبردستی اس کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ مجھے تو بیچارے پر بڑا ترس آتا ہے۔ نہ جانے، غریب کے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی۔ میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھدار بچے بن کر والدین ان پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں۔ جتنی نصیحت دے سکتے ہیں، اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

ماں نے کہا، ''تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی؟''

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل میں کہا، اس وقت تمہیں قزاقی پر رحم آ گیا ہے، جو چاہو دے ڈالو۔ لیکن میں مانگتا تو مارنے دوڑتیں۔ ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا اماں جی اسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے کندھے پر بٹھا کر سیر کراویگا۔

دوسرے روز میں دن بھر منو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ شام کو سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اندھیرا ہو گیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چراغ جل گیا، راستہ میں سناٹا چھا گیا مگر قزاقی نہ آیا؟

میں روتا ہوا گھر آیا۔ ماں نے پوچھا، ''کیوں روتے ہو بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا؟''

میں اور زور سے رونے لگا۔ ماں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے۔ انہوں نے کہا، ''بیٹا، چپ ہو جاؤ۔ میں کل کسی ہرکارے کو بھیج کر قزاقی کو بلاؤں گی۔''

میں روتے ہی روتے سو گیا۔ صبح جونہی آنکھیں کھلیں۔ میں نے ماں سے کہا قزاقی کو بلوا دو۔

ماں نے کہا، ''آدمی گیا ہے بیٹا، قزاقی آتا ہوگا۔'' میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جی جو بات کہتی ہیں اسے پورا ضرور کرتی ہیں۔ انہوں نے سویرے ہی ایک ہرکارہ کو بھیج دیا تھا۔ دس بجے جب میں منو کو لئے ہوئے گھر آیا تو

معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے اسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔اس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ان میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہوتے۔انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی بات انہیں بے چین کر رہی ہے؟ کونسا کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے؟ کیوں بار بار انہیں رونا آتا ہے؟ کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں؟ کھیلنے میں جی نہیں لگتا۔میری بھی یہی حالت تھی۔کبھی گھر میں آتا،کبھی باہر جاتا،کبھی سڑک پر جا پہنچتا۔آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟

تیسرے پہر کو میں گم شدہ سا سڑک پر کھڑا تھا۔یکا یک میں نے قزاقی کو ایک گلی میں دیکھا۔ہاں،وہ قزاقی ہی تھا! میں اس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اس کا پتہ نہ تھا۔نہ جانے کدھر غائب ہوگیا۔میں نے گلی کو اس سرے سے اس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کی بو تک نہ ملی۔

گھر جا کر میں نے ماں سے یہ بات کہی۔مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سن کر بہت متفکر ہو گئیں۔اس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا۔میں بھی اب اس کو کچھ کچھ بھولنے لگا۔بچے پہلے جتنی محبت کرتے ہیں بعد کو اتنے ہی بے اعتنا بھی ہو جاتے ہیں۔جس کھلونے پر جان دیتے ہیں اسی کو دو چار روز بعد ٹپک کر توڑ بھی ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے۔دوپہر کا وقت تھا۔بابو جی کھانا کھا رہے تھے۔میں

منو کے پیروں میں پیتل کی پہنچیاں باندھ رہا تھا۔ ایک عورت گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور صحن میں کھڑی ہوگئی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے۔ مگر گوری، خوبصورت عورت تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، ''بھیا، بہو جی کہاں ہیں؟''

میں نے اس کے پاس جا کر اس کا منہ دیکھتے ہوئے کہا، تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو؟''

عورت: ''کچھ بیچتی نہیں ہوں۔ تمہارے لیے یہ کمل گٹے لائی ہوں بھیا! تمہیں تو کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں نا!'' میں نے اس کے ہاتھوں سے لٹکتی ہوئی پوٹلی کو شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا، ''کہاں سے لائی ہو، دیکھیں۔''

عورت: ''تمہارے ہرکارے نے بھیجا ہے بھیا!''

میں نے اچھل کر پوچھا، ''قزاقی نے؟''

عورت نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی۔ اتنے میں ماں بھی رسوئی سے نکل آئیں۔ اس نے ماں کے پیر چھوئے۔ ماں نے پوچھا، ''تو قزاقی کی گھر والی ہے؟''

عورت نے سر جھکا لیا۔

ماں: ''آج کل قزاقی کیا کرتا ہے؟''

عورت نے رو کر کہا، ''بہو جی جس دن سے آپ کے پاس سے آٹا لے کر گئے ہیں۔ اسی دن سے بیمار پڑے ہیں۔ بس بھیا بھیا کیا کرتے ہیں۔ بھیا ہی میں ان کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ نہ جانے، انہیں کیا ہو گیا ہے، بہو جی۔ ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سنا، گھر سے چل دیے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیا کو دیکھتے رہے۔ جب بھیا نے

انہیں دیکھ لیا تو بھاگ گے۔ تمہارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔''

میں نے کہا، ''ہاں ہاں، میں اس دن تم سے جو کہا تھا۔ اماں جی۔''

ماں: ''گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے؟''

عورت: ''ہاں بہوجی، تمہارے آشیرباد سے کھانے پینے کا دکھ نہیں ہے۔ آج سیرے اٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے۔ بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ، ہوا لگ جائے گی۔ مگر نہ مانا۔ مارے مجوری کے پیر کانپنے لگتے ہیں۔ مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے توڑ لائے اور مجھ سے کہا کہ لیجا، بھیا کو دے آ۔ انہیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کسل چھیم (خیروعافیت پوچھتی آنا)''

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال لیے تھے اور مزے سے کھا رہا تھا۔ ماں نے بہت آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں؟

ماں نے کہا، ''کہہ دینا، سب کسل ہے۔''

میں نے کہا، ''یہ بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے۔ نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے، ہاں..........''

بابوجی کھانا کھا کر نکل آئے تھے۔ تولیے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولے، ''اور یہ بھی کہہ دینا کہ صاحب نے تم کو بحال کر دیا ہے۔ جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاویگا۔''

عورت نے اپنا کپڑا اٹھایا اور چلی گئی۔ ماں نے بہت پکارا مگر وہ نہ رکی۔ شاید اماں جی اسے آٹا دال وغیرہ دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا، ''سچ مچ بحال ہو گیا؟''

بابو جی: ''اور کیا جھوٹ ہی بلا رہا ہوں۔ میں نے تو پانچویں ہی روز اس کی بحال کی رپورٹ کی تھی۔''

ماں: ''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔''

بابو جی: ''اس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔''

(۴)

علی الصباح میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھونٹھ ہو گیا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ قزاقی نے میری گالوں کو چوما اور مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر میں نہ اٹھ سکا۔ تب وہ چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ڈاکخانہ کی طرف چلا۔ میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا، اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا!

بابو جی نے کہا، ''قزاقی تم بحال ہو گئے، اب کبھی دیر نہ کرنا۔''

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔ مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا۔ منو ملا تو قزاقی چھوٹا، قزاقی آیا تو منو ہاتھ سے گیا اور ایسا گیا کہ اس کے جانے کا رنج آج تک ہے۔ منو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا۔ جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں، وہ بھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ اسے بھات سے بہت ہی رغبت

تھی مگر جب تک خوب گھی نہ پڑا ہواس کا جی نہ بھرتا تھا۔ وہ میرے ہی ساتھ سوتا بھی تھا اور میرے ہی ساتھ اٹھتا بھی۔ صفائی تو اسے اس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا۔ کتوں سے اس کو چڑ تھی۔ کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا۔ کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اٹھ جاتا اور اسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاکخانہ میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو منو بھی آ بیٹھا۔ ابھی دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا جھبرا کتا صحن میں نظر آیا۔ منو اسے دیکھتے ہی دوڑا۔ دوسرے مکان میں جا کر کتا چوہا ہوتا ہے۔ جھبرا کتا اسے آتے دیکھ کر بھاگا۔ منو کو اب لوٹ آنا چاہیے تھا۔ مگر وہ کتا اس کے لیے ملک الموت تھا۔ منو کو اسے گھر سے نکال کر ہی صبر نہ ہوا، وہ اسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا۔ منو کو شاید خیال نہ رہا کہ یہاں میری عملداری نہیں ہے۔ وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا تھا جہاں جھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا جتنا منو کا اپنے گھر میں۔ منو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوت بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ مکان میں اس کی حمایت میں مالک مکان کا خوف کام کیا کرتا ہے۔ جھبرے نے اس میدان میں آتے ہی پلٹ کر منو کی گردن دبا دی۔ بیچارے منو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا۔ دیکھا تو منو مرا پڑا ہے اور جھبرے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیلیٰ

پہلی بار: ہندی میں، اسی عنوان سے، ''سرسوتی'' ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: ۱۹۲۹ء، (فردوس خیال! ۱۹۳۰ء پریم چالیسی دوم)

(۱)

یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ لیلیٰ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ ایک روز لوگوں نے ایک بے مثال حسینہ کو طہران کے چوک میں اپنے دف پر حافظ کی یہ غزل جھوم جھوم کر گاتے ہوئے سنا۔

رسید مژدہ کہ ایام غم نہ خواہد ماند
چناں نماندو چنیں نہ خواہد ماند

اور سارا طہران اس پر فدا ہو گیا۔ یہی لیلیٰ تھی۔

لیلیٰ کے دل کش حسن کا تصور کرنا ہو تو افق کی شگفتہ سرخی کو خیال میں لائے۔ جب نیلگوں آسمان زریں شعاعوں سے منور ہو جاتا ہے۔ موسم بہار کو خیال میں لائے۔ جب باغ میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور ان پر بلبلیں چہچہاتی ہیں۔

لیلیٰ کی دل کش آواز کا تصور کرنا ہو تو اس گھنٹی کی لگاتار آواز کو خیال میں لائے جو رات کی خاموشی میں اونٹوں کی گردنوں میں بجتی سنائی دیتی ہے۔ یا اس بانسری کی آواز کو خیال میں لائے جو دوپہر کے تکان افزا سکوت میں کسی درخت کے

سائے میں لیٹے ہوئے چرواہے کے منہ سے نکلتی ہے۔

جس وقت لیلی مست ہو کر گاتی تھی تو اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی رونق آ جاتی تھی۔ وہ شعر، نغمہ، نکہت اور خوشی کی ایک نفیس مورت تھی، جس کے سامنے چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب سب ہی سر جھک جاتے تھے۔ سب ہی پر جادو سا ہو جاتا تھا، سب ہی سر دھنتے تھے اور اس آنے والے زمانے کا پیغام سناتی تھی جب ملک میں امن و آشتی کی سلطنت ہو گی، جب مخالفت اور جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ بادشاہ کو بیدار کرتی اور کہتی کہ یہ عیش پسندی کب تک؟ وہ رعایا کی خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کرتی اور ان کے رگ ہائے جاں تک کو اپنے نغموں سے متحرک کر دیتی۔ وہ ان زندہ جاوید بہادروں کے کارنامے سناتی جو غمزدوں کی پکار سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ ان دیویوں کی عظمت کا راگ گاتی جو خاندانی عزت پر قربانی ہو چکی تھیں۔ اس کا دل کش نغمہ سن کر لوگ دلوں کو تھام لیتے تھے۔ تڑپ جاتے تھے۔

سارا طہران لیلی پر فدا تھا۔ مظلوموں کے لئے امید کا چراغ تھی، رنگین مزاجوں کے لیے جنت کی حور، دولت مندوں کے لیے ضمیر کی بیداری اور ذی اقتدار لوگوں کے لیے رحم اور انصاف کا پیغام۔ اس کے ابروؤں کے اشارے پر عوام آگ میں کود سکتے تھے، جیسے جاندار بے جان کو کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح لیلی نے عوام کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔

اور یہ حسن بے مثال امرت کی طرح پاک، برف کی طرح سفید اور گل نو کی طرح تر و تازہ تھا۔ اس کی ایک محبت بھری نگاہ، ایک رازدارنہ تبسم، ایک رسیلی ادا پر

کیا کچھ نہ ہو جاتا۔ سونے کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے اقتدار اس کی پرستش کرتا۔ ریاستیں پیروں کی دھول چاہتیں۔ شعراء مرمٹتے اور علما گھٹنے ٹیکتے، لیکن لیلی کسی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ وہ ایک درخت کے نیچے رہتی۔ بھیک مانگ کر کھاتی، اور اپنے دل کی بین کا راگ الاپتی تھی۔ وہ شاعر کے نکتہ کی طرح صرف مسرت اور روشنی کی چیز تھی، استعمال کی نہیں۔ وہ رشیوں کے آشیرواد (دعا) کی مورت تھی۔ فلاح میں ڈوبی ہوئی اور سکون میں رنگی ہوئی، کوئی اسے چھو نہ سکتا تھا، اسے خرید نہ سکتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت طہران کا شہزادہ نادر گھوڑے پر سوار ادھر سے نکلا۔ لیلی گا رہی تھی۔ نادر نے گھوڑے کو روک لیا دیر تک محویت کی حالت میں کھڑا سنتا رہا۔ غزل کا پہلا شعر یہ تھا۔

مر درد پست اندر دل اگر گوید زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

پھر وہ گھوڑے سے اتر کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور سر جھکائے روتا رہا۔ وہ پھر اٹھا اور لیلی کے پاس جا کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ لوگ ادب سے ادھر ادھر ہٹ گئے۔

لیلی نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

نادر۔ ''تمہارا غلام۔''

لیلی۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

نادر۔ ''آپ کی خدمت کرنے کا حکم۔ میرے غریب خانے کو اپنے قدموں

سے زینت بخشیے۔''

لیلیٰ۔ ''یہ میری عادت نہیں ہے۔''

شاہزادہ پھر وہیں بیٹھ گیا اور لیلیٰ پھر گانے لگی۔ لیکن گلا تھرانے لگا۔ جیسے باجہ کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے نادر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔'' کئی آدمیوں نے کہا۔ ''لیلیٰ یہ ہمارے حضور شہزادہ نادر ہیں۔'' لیلیٰ بے پروائی سے بولی۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن یہاں شہزادوں کا کیا کام! ان کے لیے محلات ہیں۔ محفلیں ہیں اور شراب کے دور ہیں۔ میں ان کے لیے گاتی ہوں جن کے دل میں درد ہے، ان کے لیے نہیں جن کے دل میں شوق ہے۔''

شہزادے نے مجنونانہ لہجہ میں کہا۔ ''میں تمہاری ایک تان پر سب کچھ نثار کر سکتا ہوں۔ میں شوق کا غلام تھا، مگر تم نے درد کا مزہ چکھا دیا۔''

لیلیٰ پھر گانے لگی، لیکن آواز قابو میں نہ تھی۔ گویا وہ اس کا گلا ہی نہ تھا۔

لیلیٰ نے دف کندھے پر رکھ لیا اور اپنے ڈیرے کی طرف چلی۔ سامعین اپنے اپنے گھر چلے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے پیچھے اس درخت تک آئے جہاں وہ رہتی تھی۔ جب وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر پہنچی تو سب ہی لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ صرف ایک شخص جھونپڑی سے کئی ہاتھ پر خاموش کھڑا تھا۔

لیلیٰ نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

نادر نے کہا۔ ''تمہارا غلام نادر۔''

لیلیٰ۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ میں اپنے گوشۂ عافیت میں کسی کو نہیں آنے دیتی؟''

نادر۔ ''یہ تو دیکھ ہی رہا ہوں۔''

لیلی۔ ''پھر کیوں بیٹھے ہو؟''

نادر۔ ''امید دامن پکڑے ہوئے ہے۔''

لیلی نے کچھ دیر کے بعد پوچھا۔ ''کچھ کھا کر آئے ہو؟''

نادر۔ ''اب تو نہ بھوک ہے نہ پیاس۔''

لیلی۔ ''آؤ آج تمہیں غریبوں کا کھانا کھلاؤں۔ اس کا مزہ بھی چکھ لو۔''

نادر انکار نہ کر سکا۔ آج اسے باجرہ کی روٹیوں نایاب لذت ملی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کے اس وسیع محل میں کتنا لطف ہے۔ اسے اپنی روح میں ارتقاء کا احساس ہو رہا تھا۔

جب وہ کھا چکا تو لیلی نے کہا۔ ''اب جاؤ، آدھی رات سے زیادہ گزر گئی ہے۔''

نادر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''نہیں لیلی اب میرا قیام بھی یہیں رہے گا۔''

نادر دن بھر لیلی کے نغمے سنتا رہا، گلیوں میں، سڑکوں پر، جہاں وہ جاتی، اس کے پیچھے گھومتا۔ رات کو اسی درخت کے نیچے جا کر پڑ رہتا۔ بادشاہ نے سمجھایا، ملکہ نے سمجھایا۔ امراء نے منتیں کیں۔ لیکن نادر کے سر سے لیلی کا سودا نہ گیا۔ جس حالت میں لیلی رہتی تھی اسی حالت سے وہ بھی رہتا تھا۔ ملکہ اس کے لیے اچھے سے اچھے کھانے بنوا کر بھیجتی، مگر نادر ان کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔

لیکن لیلی کے نغموں میں اب وہ شیرینی نہ تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے تاروں کا

راگ تھا، جس میں نہ وہ لوچ تھا، نہ وہ جادو، نہ وہ اثر۔ وہ اب بھی گاتی تھی۔ سننے والے اب بھی آتے مگر وہ اپنا دل خوش کرنے کو نہیں بلکہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے آتے تھے۔

اس طرح چھ مہینے گزر گئے۔ ایک روز لیلیٰ گانے نہ گئی تو نادر نے کہا۔ ''کیوں لیلیٰ، آج گانے نہ چلو گی؟''

لیلیٰ نے کہا۔ ''اب کبھی نہ جاؤں گی۔'' سچ کہنا، تمہیں اب بھی میرے گانے میں پہلے ہی کا سا لطف آتا ہے۔

نادر بولا۔ ''پہلے سے کہیں زیادہ۔''

لیلیٰ۔ ''لیکن اور لوگ تو اب نہیں پسند کرتے۔''

نادر۔ ''ہاں، مجھے اس کا تعجب ہے۔''

لیلیٰ۔ ''تعجب کی بات نہیں۔ پہلے میرا دل کھلا ہوا تھا۔ اس میں سب کے لئے جگہ تھی۔ وہ سب کو خوش کر سکتا تھا، اس میں سے آواز نکلتی تھی۔ وہ سب کے دلوں میں پہنچتی تھی۔ اب تم نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہاں صرف تم ہو، اس لیے اس کی آواز تم ہی کو پسند آتی ہے۔ یہ دل اب تمہارے سوا کسی کے کام کا نہیں رہا۔ چلو آج تک تم میرے غلام تھے، آج سے میں تمہاری کنیز ہوتی ہوں۔ چلو، میں تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ آج سے تم میرے آقا ہو۔ تھوڑی سی آگ لے کر اس جھونپڑے میں لگا دو۔ اس دف کو اسی میں جلا دوں گی۔''

طہران میں گھر گھر خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ آج شہزادہ نادر لیلیٰ کو بیاہ کر گھر لایا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس کے دل کی مراد پوری ہوئی تھی۔ سارا طہران شہزادہ پر جان دیتا تھا اور اس کی خوشی میں شریک تھا۔ بادشاہ نے تو اپنی طرف سے منادی کرادی تھی، کہ اس مبارک موقع پر روپیہ اور وقت بے جا طور پر صرف نہ کیا جائے۔ صرف لوگ مسجدوں میں جمع ہو کر خدا سے دعا مانگیں کہ دولہا اور دلہن سلامت اور خوش رہیں، لیکن اپنے پیارے شہزادے کی شادی میں روپیہ اور روپے سے زیادہ قیمتی وقت کا منہ دیکھنا کسی کو گوارا نہ تھا۔ روسا نے محفلیں سجائیں، چراغ جلائے، شادیانے بجوائے، غرباء نے اپنی ڈفلیاں سنبھالیں۔ اور سڑکوں پر گھوم گھوم کر اچھلتے کودتے پھرے۔

شام کے وقت جملہ امراء و روسا، شہزادے کو مبارکباد دینے کے لیے دیوان خاص میں جمع ہوئے۔ شہزادہ عطروں سے مہکتا، جواہرات سے چمکتا اور خوشی سے کھلتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

قاضی نے عرض کیا۔ ”حضور پر خدا کی برکت ہو۔“ ہزاروں آدمیوں نے کہا۔ ”آمین۔“

شہر کی خاتونیں بھی لیلیٰ کو مبارکباد دینے آئیں۔ لیلیٰ بالکل سادی پوشاک پہنے ہوئے تھی۔ گہنوں کا کہیں نام نہ تھا۔

ایک خاتون نے کہا۔ آپ کا سہاگ سدا سلامت رہے۔ ”ہزاروں گلوں سے آواز نکلی۔ آمین۔“

(۳)

کئی سال گزر گئے۔ نادر اب بادشاہ تھا اور لیلیٰ اس کی ملکہ۔ ایران کی حکومت ایسے عمدہ طریقے پر کبھی نہ ہوئی تھی۔ دونوں ہی رعایا کے بھی خیر خواہ تھے۔ دونوں ہی اسے خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ محبت نے وہ مشکلات رفع کر دیں جو لیلیٰ کو پہلے پریشان کیے رہتی تھیں۔ نادر پر شاہانہ اقتدار کی کفالت تھی اور لیلیٰ پر حقوق عامہ کی۔ لیکن عملی نقطۂ خیال سے ان میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ کبھی یہ دب جاتا، کبھی وہ ہٹ جاتی۔ ان کی ازدواجی زندگی معیاری تھی۔ نادر لیلیٰ کا رخ دیکھتا تھا اور لیلیٰ نادر کا پاس کرتی تھی۔ کام سے فرصت ملتی تو دونوں بیٹھ کر گاتے بجاتے۔ کبھی دریاؤں کی سیر کرتے، کبھی کسی درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے حافظ کی غزلیں پڑھتے اور وجد کرتے۔ نہ لیلیٰ میں اب ان سادگی تھی، نہ نادر میں اتنا تکلف تھا۔ نادر کا لیلیٰ پر پورا قابو تھا جو معمولی بات تھی۔ مگر لیلیٰ کا نادر پر پورا قابو تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی جہاں بادشاہوں کی محل سرا میں بیگمات کے محلے بستے تھے، درجنوں اور کوڑیوں سے ان کا شمار ہوتا تھا، وہاں لیلیٰ تنہا تھی۔ ان محلات میں اب شفا خانے، مدرسے اور کتب خانے تھے، جہاں محل سرا کا سالانہ خرچ کروڑوں تک پہنچتا تھا، وہاں اب ہزاروں سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ بقیہ روپے رعایا کے فلاحی کاموں میں صرف کر دیے جاتے تھے۔ یہ ساری قطع و برید لیلیٰ نے کی تھی۔ بادشاہ نادر تھا مگر حکومت لیلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔

سب کچھ تھا مگر رعایا مطمئن نہ تھی۔ اس کا اضطراب دن بہ دن بڑھتا جاتا تھا۔

اقتدار پرستوں کا اندیشہ تھا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہت کے مٹ جانے میں شبہ نہیں تھا۔ جمشید کا لگایا ہوا درخت جس نے ہزاروں صدیوں سے آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیا۔ اب ایک حسینہ کے نازک مگر قاتل ہاتھوں سے ایک دم اکھڑا جا رہا ہے۔ ادھر جمہوریت پسندوں کو لیلی سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ سبھی ناامیدیاں ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ایران اس رفتار سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گا تو اس کے قبل کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے قیامت ہی آ جائے گی، دنیا ہوائی جہاز پر بیٹھی اڑی جا رہی ہے اور ہم ابھی ٹھیلوں پر بیٹھتے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کی حرکت سے دنیا میں زلزلہ نہ آ جائے۔ دونوں جماعتوں میں آئے دن خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ نہ نادر کی فہمائش کا اثر امراء پر ہوتا تھا۔ نہ لیلی کی فہمائش کا اثر غرباء پر، جاگیردار نادر کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ رعایا لیلی کی دشمن بن گئی۔

(۴)

سلطنت میں تو یہ بدامنی پھیلی ہوئی ہوتی تھی۔ بغاوت کی آگ دلوں میں سلگ رہی تھی اور شاہی محل میں محبت کا پرسکون سماں تھا۔ بادشاہ اور بیگم دونوں رعایا کے امن وسکون کا تصور کر کے خوش تھے۔

رات کا وقت تھا۔ نادر اور لیلی دونوں اپنی خواب گاہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ کمرے میں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف ایک جاجم بچھی ہوئی تھی۔

نادر نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''بس اب یہ زیادتی نہیں۔ تمہاری چال ہو چلی، یہ دیکھو، تمہارا پیادہ اب پٹ گیا۔''

لیلیٰ۔ ''اچھا، یہ شہ۔ آپ کے سارے پیادے رکھے رہ گئے اور بادشاہ پر شہہ پڑ گئی۔ اسی پر دعویٰ تھا۔''

نادر۔ ''تم سے ہارنے میں جو مزا ہے وہ جیتنے میں نہیں۔''

لیلیٰ۔ ''اچھا تو گویا آپ میرا دل خوش کر رہے ہیں۔ شہ بچائیے، نہیں تو دوسری چال میں مات ہوتی ہے۔''

نادر۔ (اردب دے کر) ''اچھا سنبھل جانا۔ تم نے میرے بادشاہ کی توہین کی ہے۔ ایک بار میرا فرزیں اٹھا تو تمہارے پیادوں کا صفایا کر دے گا۔''

لیلیٰ۔ ''کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟ یہ شہ۔ لائیے فرزیں۔ اب کہیے، اب کی میں نہ مانوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ آپ کو دوبارہ چھوڑ دیا۔ اب کی ہرگز نہ چھوڑوں گی۔''

نادر۔ ''جب تک میرے پاس میرا دل آرام (گھوڑا) ہے، بادشاہ کو کوئی غم نہیں۔''

لیلیٰ۔ ''اچھا یہ شہ لائیے۔ اپنے دل آرام کو کہیے۔ اب تو مات ہوئی۔''

نادر۔ ''ہاں جانِ من۔ اب مدت ہو گئی۔ جب میں ہی تمہاری اداؤں پر نثار ہو گیا تو میرا بادشاہ کب بچ سکتا ہے۔''

لیلیٰ۔ ''باتیں نہ بنائیے۔ چپکے سے اس فرمان پر دستخط کر دیجیے۔ جیسا آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

یہ کہہ کر لیلیٰ نے ایک فرمان نکالا۔ جسے اس نے خود ہی اپنے موتی کے سے حرف میں لکھا۔ اس میں غلہ کی درآمد کا محصول گھٹا کر نصف کر دیا گیا تھا۔ لیلیٰ رعایا کو بھولی نہ تھی۔ وہ اب بھی ان کی بہبود کے لیے دل و جان سے کوشاں رہتی۔ نادر نے اس شرط پر دستخط کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ لیلیٰ اسے شطرنج کی بازی نہ تھی۔ صرف محبت کا کھیل تھا۔ نادر نے مسکراتے ہوئے فرمان پر دستخط کر دیے۔ قلم کی ایک روش سے رعایا کو پانچ کروڑ سالانہ محصول سے سالانہ چھٹکارا مل گیا۔ لیلیٰ کا چہرہ غرور سے سرخ ہو گیا۔ جو کام برسوں کی تحریک سے نہ ہو سکتا تھا، وہ محبت بھری چتونوں سے دنوں میں پورا ہو گیا۔

یہ سوچ کر وہ پھولی نہ سماتی تھی کہ جس وقت یہ فرمان سرکاری اخبار میں شائع ہو جائے گا اور قانون ساز مجلس میں لوگ دیکھیں گے اس وقت جمہوریت پسندوں کو کتنی خوشی ہو گی۔ لوگ میری تعریف کریں گے اور مجھے دعائیں دیں گے۔

نادر محبت سے سرشار ہو کر اس کے چاند سے مکھڑے کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا قابو ہوتا تو حسن کے امورت کو اپنے دل میں بٹھا لیتا۔

(۵)

دفعتاً شاہی محل کے پھاٹک پر شور مچنے لگا۔ ایک لمحہ میں معلوم ہوا کہ عوام کا ٹڈی دل ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دروازہ پر کھڑا ہوا دیواروں کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر لمحہ شور بڑھتا جاتا تھا اور یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ یہ خشمگیں مجمع دروازوں کو

توڑ کر اندر داخل ہو جائے گا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ کچھ لوگ سیڑھیاں لگا کر دیوار پر چڑھ رہے ہیں۔ لیلیٰ ندامت سے سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کیا یہی وہ مجمع ہے جس کی تالیف کی داستان کہتے ہوئے اس کی آواز میں جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی وہ کمزور، مظلوم، فاقہ کش، سختیوں سے تڑپتے ہوئے عوام ہیں جن پر وہ خود کو قربان کر چکی تھی۔

نادر بھی خاموش کھڑا تھا، لیکن شرم سے نہیں، غصہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ بار بار ہونٹ چباتا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر رہ جاتا تھا۔ وہ بار بار لیلیٰ کی فوج اس باغی جماعت کو یوں بھگا دے گی، جیسے آندھی پتوں کی اڑا دیتی ہے۔ مگر لیلیٰ سے آنکھیں چار نہ ہوتی تھیں۔

آخر وہ بے قرار ہو کر بولا۔ ''لیلیٰ میں شاہی فوج کو جلانا چاہتا ہوں، کیا کہتی ہو؟''

لیلیٰ نے عاجزانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''ذرا ٹھہر جایئے۔ پہلے ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا چاہتے ہیں؟''

یہ حکم پاتے ہی نادر چھت پر چڑھ گیا اور لیلیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر آ پہنچی۔ دونوں اب عوام کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مشعلوں کی روشنی میں لوگوں نے ان دونوں کو چھت پر کھڑا دیکھا۔ گویا آسمان کے فرشتے اتر آئے ہوں۔ ہزاروں گلوں سے یہ آواز نکلی۔ ''وہ کھڑی ہے لیلیٰ، وہ کھڑی ہے؟'' یہ مجمع تھا جو لیلیٰ کے گانے پر مست ہو جایا کرتا تھا۔

نادر نے بلند لہجہ میں باغیوں سے خطاب کیا۔ اے ایران کی بدنصیب رعایا! تم

نے شاہی محل کو کیوں گھیر رکھا ہے؟ تم نے کیوں بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنی آنکھوں کے ایک اشارے سے تمہاری ہستی کو خاک میں ملا سکتا ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ایک لمحہ کے اندر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ کلام پاک کی قسم میں تمہارے خون کی ندیاں بہا دوں گا۔

ایک شخص نے جو باغیوں کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا سامنے آ کر کہا۔ ''ہم اس وقت تک نہ جائیں گے، جب تک شاہی محل لیلیٰ سے خالی نہ ہو جائے گا۔''

نادر نے بگڑ کر کہا۔ ''اے احسان فراموش! خدا سے ڈرو۔ تمہیں اپنی ملکہ کی شان میں ایسی بے ادبی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جب سے لیلیٰ تمہاری ملکہ ہوئی ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ کتنی مراعات کی ہیں۔ کیا تم انہیں بالکل بھول گئے۔ ظالمو! یہ ملکہ ہے مگر کھانا وہی کھاتی ہے جو تم کتوں کو کھلا دیتے ہو۔ وہی کپڑے پہنتی ہے جو تم فقیروں کو دے دیتے ہو۔ آ کر محل سرا میں دیکھو، تم اسے اپنے جھونپڑوں کی طرح آرائش و تکلف سے خالی پاؤ گے۔ لیلیٰ تمہاری ملکہ ہو کر فقیروں کی سی زندگی بسر کرتی ہے۔ تمہاری خدمت میں ہمیشہ مست رہتی ہے۔ تمہیں اس کے پیروں کی خاک ماتھے پر لگانی چاہیے۔ اسے آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہیے۔ ایران کے تخت پر کبھی بھی ایسی غریبوں پر جان دینے والی ان کے دکھ درد میں شریک ہونے والی، ان پر اپنے راحت و آرام کو نثار کرنے والی ملکہ نے قدم نہیں رکھا اور اس کی شان میں تم ایسی بے ہودہ باتیں کرتے ہو۔ افسوس! مجھے معلوم ہو گیا کہ تم جاہل، انسانیت سے بے بہرہ، کمینے ہو۔ تم اسی قابل ہو کہ تمہاری گردنیں کند چھری سے کاٹی جائیں، تمہیں پیروں تلے روندا جائے..........''

نادر نے بات بھی پوری نہ کر پائی تھی کہ باغیوں نے ہم آواز زور سے کہا۔

"لیلیٰ، لیلیٰ ہماری دشمن ہے اسے ہم ملکہ کی صورت میں نہیں دیکھ سکتے۔"

اب بادشاہ غصے سے کانپنے لگا۔ لیلیٰ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ اگر رعایا کی یہی مرضی ہے کہ میں دف بجا کر گاتی پھروں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مجھے یقین ہے میں اپنے گانے سے ایک بار پھر ان کے دلوں پر حکومت کر سکتی ہوں۔

نادر نے جوش میں آ کر کہا۔ "لیلیٰ! میں رعایا کی تنک مزاجیوں کا غلام نہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں تمہیں اپنے سے جدا کروں طہران کی گلیاں خون سے سرخ ہو جائیں گی۔ میں ان بدمعاشوں کو ان کی شرارت کا مزہ چکھاتا ہوں۔"

نادر نے مینار پر چڑھ کر خطرہ کا گھنٹہ بجایا۔ سارے طہران میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ مگر شاہی فوج کا ایک سپاہی نظر نہ آیا۔

نادر نے دوبارہ گھنٹہ بجایا۔ آسمان اس کی جھنکار سے تھرا گیا۔ ستارے کانپ اٹھے۔ مگر ایک بھی سپاہی نہ برآمد ہوا۔

اب نادر نے تیسری بار گھنٹہ بجایا۔ مگر اس کا بھی جواب صرف ایک کمزور گونج سے دیا۔ گویا کسی مرنے والے کی آخری دعا کے الفاظ ہوں۔

نادر نے سر پیٹ لیا۔ سمجھ لیا کہ برے دن آ گئے۔ اب بھی لیلیٰ کو عوام کی ضد پر قربان کر کے وہ اپنی بادشاہت کی حفاظت کر سکتا تھا۔ مگر لیلیٰ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس نے چھت پر آ کر لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لیے ہوئے صدر پھاٹک سے نکلا۔ باغیوں نے ایک فتح کے نعرے کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر سب کے سب کسی نامعلوم تحریک کے سبب راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

دونوں چپ چاپ طہران کی گلیوں میں ہوتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دکانیں بند تھیں، بازاروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی گھر سے باہر نہ نکلتا تھا۔ فقیروں نے بھی مساجد میں پناہ لی تھی، مگر ان دونوں کے لیے کوئی سہارا نہ تھا۔ نادر کی کمر میں تلوار تھی۔ لیلیٰ کے ہاتھ میں دف تھا۔ یہ ان کی شاہانہ شان و شوکت کی مٹی ہوئی نشانی تھی۔

(۶)

پورا سال گزر گیا۔ لیلیٰ اور نادر ملک ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ سمرقند اور بخارا، بغداد اور حلب، قاہرہ اور عدن، یہ سارے ممالک انہوں نے چھان ڈالے، لیلیٰ کا دف پھر جادو کرنے لگا۔ اس کی آواز سنتے ہی شہروں میں ہلچل مچ جاتی۔ آدمیوں کا میلہ لگ جاتا۔ آؤ بھگت ہونے لگتی لیکن یہ دونوں مسافر کہیں ایک روز سے زیادہ نہ رکتے تھے۔ نہ کسی سے کچھ مانگتے، نہ کسی کے دروازے پر جاتے۔ روکھا سوکھا کھاتے اور کبھی کسی درخت کے نیچے، کبھی کسی پہاڑ کی غار میں اور کبھی کسی سڑک کے کنارے رات بسر کر دیتے تھے۔ دنیا کے ظالمانہ سلوک نے انہیں تارک الدنیا بنا دیا تھا، اس کی رغبت سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ یہاں جس کے لیے جان قربان کر دو وہی اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو، وہی بدی پر کمر باندھتا ہے۔ یہاں کسی سے دل نہ لگانا چاہیے۔ ان کے پاس بڑے بڑے رؤساء کے دعوتی پیغام آتے۔ انہیں ایک

رزا اپنا مہمان بنانے کے لیے لوگ منتیں کرتے ،مگر لیلی کسی کی نہ سنتی تھی۔ نادر کو اب تک بادشاہت کی سنک سوار ہو جاتی وہ چاہتا کہ پوشیدہ طور پر کافی فوج مہیا کر کے طہران پر حملہ کروں اور باغیوں کو شکست دے کر بلا خدشہ حکومت کروں۔ مگر لیلی کی بے پروائی دیکھ کر اس کو کسی سے ملنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیلی اس کے دل و جان کی ملکہ تھی۔ وہ اسی کے اشاروں پر چلتا تھا۔

ادھر ایران میں بھی بغاوت کا دور دورہ تھا۔ جمہور سے تنگ آ کر روسا نے بھی فوجیں جمع کر لی تھیں اور فریقین میں آئے دن جنگ ہوتی رہتی تھی۔ پورا سال گزر گیا اور کھیت نہ جوتے بوئے گئے۔ ملک میں زبردست قحط پڑا ہوا تھا۔ تجارت سست تھی۔ خزانہ خالی۔ روز بروز رعایا کی طاقت گھٹتی جاتی تھی اور امراء کا زور بڑھتا جاتا تھا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ رعایا نے ہتھیار ڈال دیے اور امراء نے شاہی محل پر اپنا قبضہ جمالیا۔ رعایا کے سرغنوں کو پھانسی دے دی گئی۔ کتنے ہی قید کر لیے گئے اور جمہوریہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اقتدار پسندوں کو اب نادر کی یاد آئی۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہو گئی تھی کہ ملک میں جمہور قائم کرنے کی طاقت کا فقدان ہے۔ ظاہر کے لیے ہوت کی کیا ضرورت تھی، اس موقع پر شاہی حکومت ہی ملک کو بچا سکتی تھی۔ یہ بات بھی مسلم تھی کہ نادر اور لیلی کو جمہوریت سے کوئی خاص رغبت نہ ہو گی۔ وہ تخت پر بیٹھ کر بھی امراء و روسا کے ہی ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہیں گے۔ اور اس طرح ان لوگوں کو رعایا پر حسب دل خواہ زیادتیاں کرنے کا موقع ملے گا۔ پس انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور لوگ نادر کو منانے کے لئے روانہ ہوئے۔

(۷)

شام کا وقت تھا، لیلیٰ اور نادر دمشق میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی اور اس سے ملی ہوئی سلسلہ کوہ کی سیاہی ایسی معلوم ہوتی تھی، گویا کمل کا پتہ مرجھا گیا ہو۔ لیلیٰ مسرت بھری نگاہوں سے قدرت کی یہ بہار دیکھ رہی تھی۔ نادر اداسی اور پریشانی کے عالم میں لیٹا ہوا سامنے دور دراز ملک کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گویا اس زندگی سے تنگ آ گیا ہو۔

دفعتاً بہت دور گرد اڑتی ہوئی نظر آئی، اور ایک لمحہ میں ایسا معلوم ہوا کہ کچھ آدمی گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ نادر اٹھ بیٹھا اور غور سے دیکھنے لگا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یکا یک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ چراغ کی طرح چمک اٹھا۔ نحیف جسم میں جان سی پڑ گئی۔ وہ جوش سے بولا۔ ”لیلیٰ! یہ تو ایران کے آدمی ہیں۔ کلام پاک کی قسم! یہ ایران کے آدمی ہیں۔ ان کے لباس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔“

لیلیٰ نے بھی آنے والوں کی طرف دیکھا اور متفکرانہ لہجہ میں بولی۔ ”اپنی تلوار سنبھالو، شاید اس کی ضرورت پڑے۔“

نادر۔ ”نہیں لیلیٰ، یہ ایران کے لوگ اتنے کمینے نہیں کہ اپنے بادشاہ پر تلوار اٹھائیں۔“

لیلیٰ۔ ”پہلے میں بھی یہی سمجھتی تھی۔“

سواروں نے قریب آ کر گھوڑے روک لیے اور اتر کر بڑے ادب سے نادر کو سلام کیا۔ نادر بہت ضبط کرنے پر بھی اپنے دلی جذبات کو نہ روک سکا۔ وہ دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ وہ اب بادشاہ نہ تھا۔ ایک ایرانی سیاح تھا۔ بادشاہت مٹ گئی تھی مگر ایرانیت روئیں روئیں میں بھری ہوئی تھی۔ وہ تینوں آدمی اس وقت ایران کے مالک تھے۔ انہیں وہ خوب پہچانتا تھا۔ ان کی وفاداری کی کئی بار آزمائش کر چکا تھا۔ انہیں لا کر اپنے بوریے پر بٹھانا چاہا مگر وہ زمین پر ہی بیٹھے۔ ان کی نگاہوں میں وہ بوریا اس وقت تختِ شاہی بنا ہوا تھا۔ جس پر اپنے آقا کی موجودگی میں وہ اس وقت قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ باتیں ہونے لگیں۔ ایران کی حالت بہت افسوس ناک تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ نہ کوئی قانون تھا نہ کوئی قانون ساز۔ اگر یہی حالت رہی تو بہت جلد اس کی گردن میں غلامی کا طوق پڑ جائے گا۔ ملک اب نادر کو کھوج رہا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی ڈوبتے ہوئے بیڑے کو پار نہ لگا سکتا تھا۔ اسی امید سے یہ لوگ اس کے پاس آئے تھے۔

نادر نے بے نیازی کے لہجے میں کہا: ''ایک بار عزت لی۔ کیا اب جان لینے کا ارادہ ہے۔ میں بڑے آرام سے ہوں۔ آپ مجھے دق نہ کریں۔''

سرداروں نے اصرار کرنا شروع کیا۔ ''ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ یہیں اپنی گردنوں پر چھری پھیر کر حضور کے قدموں پر جان دیں گے۔ جن بدمعاشوں نے آپ کو دق کیا تھا، اب ان کا کہیں نشان بھی نہیں رہا۔ ہم لوگ انہیں پھر کبھی سر اٹھانے نہ دیں گے۔ صرف حضور کا سہارا چاہیے............''

نادر نے بات کاٹ کر کہا...... ''صاحبو! اگر آپ مجھے ایران کا بادشاہ بنانا

چاہتے ہیں تو معاف رکھیے۔ میں نے اسی سیاحت میں رعایا کی حالت کو غور سے معائنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سبھی ممالک میں ان کی حالت خراب ہے۔ وہ رحم کے قابل ہیں۔ ایران میں مجھے کبھی ایسے مواقع نہ ملے تھے۔ میں رعایا کو اپنے درباریوں کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ مجھ سے آپ لوگ یہ امید نہ رکھیں کہ رعایا کو لوٹ کر آپ کی جیبیں بھر دوں گا۔ یہ عذاب اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔ میں میزانِ عدل کو برابر رکھوں گا اور اسی شرط پر ایران جا سکتا ہوں۔''

لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔ ''تم رعایا کا قصور معاف کر سکتے ہو، کیوں کہ اس کی تم سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ اس کے دانت تو مجھ پر تھے، میں اسے کیسے معاف کر سکتی ہوں۔''

نادر نے متانت سے کہا۔ ''لیلیٰ مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن رہا ہوں۔''

لوگوں نے سمجھا کہ ابھی سے انہیں بھڑکانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایران میں چل کر دیکھا جائے گا۔ دو چار مخبر رعایا کے نام پر ایسے فتنے برپا کر دیں گے کہ ان کے یہ سارے خیالات پلٹ جائیں گے۔ ایک سردار نے عرض کیا۔ معاذ اللہ! حضور یہ کیا فرماتے ہیں؟ کیا ہم اتنے نادان ہیں کہ حضور کو انصاف کے راستہ سے منحرف کرنا چاہیں گے؟ انصاف ہی بادشاہ کا جوہر ہے اور ہماری دلی آرزو ہے کہ آپ انصاف نوشیرواں کو بھی شرمندہ کرے۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ آئندہ ہم رعایا کو کبھی ایسا موقع نہ دیں گے کہ وہ حضور کی شان میں بے ادبی کر سکے۔ ہم اپنی جانیں حضور پر نثار کرنے کے لیے حاضر رہیں گے۔

دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ ساری قدرت نغموں سے معمور ہوگئی۔ پہاڑ اور درخت اور تارے اور چاند، ہوا اور پانی سب ہی ہم آہنگ ہوکر گانے لگے۔ چاندنی کے صاف شفاف منظر میں ہوا کے پرسکون بہاؤ میں نغموں کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔ لیلیٰ اپنا دف بجا بجا کر گا رہی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ نغمہ ہی کائنات کی اصلیت ہے۔ پہاڑوں پر دیویاں نکل نکل کرناچنے لگیں۔ آسمان پر دیوتا رقص کرنے لگے۔ نغموں نے ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔

اسی روز سے جب رعایا نے شاہی پھاٹک پر فساد کیا تھا اور لیلیٰ کی جلاوطنی پر مصر ہوئے تھے، لیلیٰ کے خیالات میں تغیر ہو گیا تھا۔ پیدائش ہی سے اس نے عوام کے ساتھ ہمدردی کرنا سیکھا تھا۔ وہ شاہی اعمال کو رعایا پر ظلم کرتے دیکھتی تھی اور اس کا دل تڑپ جاتا تھا۔ اس وقت دولت و اقتدار، راحت و آرام سے اسے نفرت ہونے لگتی تھی جن کے سبب رعایا کو اتنی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ وہ اپنے میں کوئی ایسی طاقت پیدا کرنا چاہتی تھی جو ظالموں کے دل میں رحم وار رعایا کے دل میں بے خوفی پیدا کرے۔ اس کا طفلانہ تصور اسے تخت شاہی پر بٹھا دیتا جہاں وہ اپنے عدل و انصاف سے دنیا میں ایک نیا دور قائم کر دیتی۔ کتنی ہی راتیں اس نے ایسے ہی خوابوں کے دیکھنے میں گزار دی تھیں۔ کتنی ہی بار وہ مظلوموں کے سرہانے بیٹھ کر روئی تھی۔ مگر جب ایک دن ایسا آیا کہ اس کا سنہرا خواب جزوی واقعیت کی شکل اختیار کرنے لگا تو اسے نیا اور سخت تجربہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ رعایا اتنی مضمحل، اتنی کمزور نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی۔ اس کی بہ نسبت اس میں کمینہ پن، ناعاقبت اندیشی اور بدتہذیبی کہیں زیادہ ہے۔ وہ اچھے سلوک کی قدر کرنا نہیں

جانتی! مقدر پاکر اس کا اچھا استعمال نہیں کر سکتی۔ اسی روز سے اس کا دل رعایا کی جانب سے پھر گیا تھا۔

جس روز نادر اور لیلی نے پھر طہران میں قدم رکھا۔ سارا شہر ان کے خیر مقدم کے لیے امنڈ پڑا۔ شہر پر خوف طاری تھا۔ چاروں طرف گریہ وزاری کی آواز سنائی دیتی تھی۔ امراء کے محلوں میں دولت لوٹتی پھرتی تھی۔ غربا کے محلے اجڑے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر جگر پاش پاش ہو جاتا تھا۔ نادر رو پڑا۔ مگر لیلی کے ہونٹوں پر بے رحمانہ تبسم اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔

نادر کے سامنے اب ایک مشکل سوال تھا۔ وہ ہر روز دیکھتا کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا اور جو نہیں کرنا چاہتا وہی ہوتا ہے اور اس کی علت لیلی ہے۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لیلی اس کے ہر کام میں دخل انداز ہوتی تھی۔ وہ رعایا کی فلاح و نجات کے لیے جو تدبیریں کرتا۔ لیلی ان میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ ضرور ڈال دیتی اور اس کو خاموش رہ جانے کے سوا اور کچھ نہ سوجھتا۔ لیلی کے لیے اس نے ایک بار سلطنت ترک کر دی تھی۔ اس وقت مصیبت نے لیلی کی آزمائش نہ کی تھی۔ اتنے دنوں کی مصیبت میں اسے لیلی کے طرزِ عمل کا جو تجربہ حاصل ہوا تھا، وہ اتنا راحت آفریں، اتنا دل کش، اتنا پر لطف تھا کہ اس کے رگ و ریشے میں لیلی سما گئی تھی۔ وہ خود ہی لیلی سا ہو گیا تھا کہ اس کی بہشت تھی، اس کی محبت میں مست رہنا ہی اس کی دلی تمنا تھی۔ اس لیلی کے لیے وہ اب کیا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ رعایا کی اور سلطنت کی اس کے سامنے کیا ہستی تھی۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ رعایا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔

(۸)

ایک روز نادر شکار کھیلنے گیا اور ہمراہیوں سے الگ ہو کر جنگل میں بھٹکتا پھرا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اور ان لوگوں کا پتہ نہ چلا۔ گھر لوٹنے کا بھی راستہ نہ معلوم تھا۔ آخر خدا کا نام لے کر ایک طرف چلا کہ کہیں تو کسی گاؤں یا آبادی کا نشان ملے گا۔ وہاں رات بھر پڑا رہوں گا۔ سویرے واپس جاؤں گا۔ چلتے چلتے جنگل کے دوسرے سرے پر اسے ایک گاؤں نظر آیا، جس میں بمشکل تین چار مکانات ہوں گے۔ وہاں ایک مسجد البتہ بنی ہوئی تھی مسجد میں ایک چراغ ٹمٹمارہا تھا مگر کسی آدمی کا نام ونشان نہ تھا۔ نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لیے کسی کو تکلیف دینا مناسب نہ تھا۔ نادر نے گھوڑ کو ایک درخت سے باندھ دیا اور اسی مسجد میں رات بسر کرنے کی ٹھانی۔ وہاں ایک بوسیدہ چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اسی پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ مگر کسی کی آہٹ پاکر وہ چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا نماز پڑھ رہا ہے۔ نادر کو تعجب ہوا کہ اتنی رات گئے کون آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ رات ختم ہو چکی اور یہ فجر کی نماز کا وقت ہے۔ وہ پڑا پڑا دیکھتا رہا۔ بوڑھے نے نماز ادا کی۔ پھر سینے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر خدا سے دعا مانگنے لگا۔ دعا کے الفاظ سن کر نادر کا خون سرد ہو گیا۔ وہ دعا اس کی حکومت ایسی سخت، ایسی واقعی، ایسی نصیحت خیز تنقید تھی جو آج تک کسی نے نہ کی تھی۔ اسے اپنی زندگی میں اپنی بدنامیاں سننے کا موقع ملا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ میری حکومت اعلیٰ نہیں ہے، مگر اس

نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ رعایا کی مصیبت اتنی نا قابلِ برداشت ہوگئی ہے۔ دعا یہ تھی:

''اے خدا! تو ہی غریبوں کا مددگار اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ تو اس ظالم بادشاہ کے ظلم کو دیکھتا ہے اور تیرا قہر اس پر نازل نہیں ہوتا ہے۔ یہ بے دین، کافر ایک حسین عورت کے عشق میں اپنے کو اتنا بھول گیا ہے کہ نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور نہ کانوں سے سنتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے تو عورت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو اسی عورت کے کانوں سے۔ اب یہ مصیبت نہیں سہی جاتی۔ یا تو تو اس عورت کو جہنم واصل کر دے، یا ہم بے کسوں کو دنیا سے اٹھا لے۔ ایران ان کے مظالم سے تنگ آ گیا ہے۔ اور تو ہی اس کے سر سے اس بلا کو ٹال سکتا ہے۔''

بوڑھے نے تو اپنی چھڑی سنبھالی اور چلتا ہوا، لیکن نادر مردے کی طرح وہیں پڑا رہا۔ گویا اس پر بجلی گر پڑی۔

(۱۰)

ایک ہفتہ تک نادر دربار میں نہ آیا، اور نہ کسی اہلکار کو اپنے پاس آنے کی اجازت دی۔ تمام دن اندر پڑا ہوا سوچا کرتا کہ کیا کروں۔ صرف برائے نام کچھ کھا لیتا۔ لیلی بار بار اس کے پاس جاتی اور کبھی اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر، کبھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر پوچھتی ''تم کیوں اتنے اداس اور غمگین ہو؟ نادر اسے دیکھ کر رونے لگتا، مگر منہ سے کچھ نہ کہتا۔ رعیت یا لیلی یہی اس کے سامنے

مشکل مسئلہ تھا۔ اس کے دل میں خوفناک کشمکش ہوتی رہتی، اور وہ کچھ تصفیہ نہ کر سکتا تھا۔ رعیت اس سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ بدنام ہو کر زندہ رہ سکتا تھا مگر لیلی کے بغیر زندہ رہنے کا خیال ہی نہ کر سکتا تھا۔ لیلی اس کے روئیں روئیں میں پیوست ہو گئی تھی۔"

بالآخر اس نے یہ طے کیا۔ لیلی میری ہے اور میں لیلی کا ہوں، نہ وہ مجھ سے الگ، نہ وہ مجھ سے جدا، جو کچھ وہ کرتی ہے میرا ہے، جو کچھ میں کرتا ہوں، وہ اس کا ہے۔ یہاں من وتو کا فرق ہی کیا ہے۔ بادشاہت فانی ہے، محبت لافانی ہے۔ ہم روز ابد تک ایک دوسرے کے پہلو میں ہوئے بہشت کا لطف اٹھائیں گے۔ ہمارا عشق ابد تک ستارے کی طرح چمکے گا۔

نادر خوش ہو کر اٹھا، اس کا چہرہ فتح کی سرخی سے لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے شجاعت ٹپکی پڑتی تھی۔ وہ لیلی کی محبت کا جام پینے جا رہا تھا، جسے ایک ہفتے سے اس نے منہ نہیں لگایا تھا۔ اس کا دل اسی امنگ سے اچھلا پڑتا تھا۔ جو آج سے پانچ سال پہلے پیدا ہوا کرتی تھی۔ محبت کا پھول کبھی نہیں مرجھاتا۔ محبت کی ندی کبھی نہیں اترتی۔

لیکن لیلی کی آرام گاہ کا دروازہ بند تھا، اور اس کا دف جو روزانہ دروازہ پر ایک کھونٹی سے لٹکا رہتا تھا، غائب تھا۔ نادر کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کا مطلب تو یہ ہو سکتا تھا کہ لیلی باغ میں ہو گی، مگر دف کہاں گیا؟ ممکن ہے وہ دف لے کر باغ میں گئی ہو، لیکن یہ اداسی کیوں چھائی ہے۔ یہ حسرت کیوں برس رہی ہے۔

نادر نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ لیلیٰ اندر نہ تھی۔ پلنگ بچھا ہوا تھا، شمع جل رہی تھی۔ وضو کا پانی رکھا ہوا تھا۔ نادر کے پیر کانپنے لگے، کیا لیلیٰ رات کو بھی نہیں سوئی۔ کمرے کی ایک ایک چیز میں لیلیٰ کی یاد تھی۔ اس کی تصویر تھی، اس کی مہک تھی، مگر لیلیٰ نہ تھی۔ مکان سونا معلوم ہوتا تھا جیسے بے نور آنکھ۔

نادر کا دل بھر آیا، اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی سے کچھ دریافت کرے۔ دل اتنا رنجیدہ ہو گیا کہ دیوانہ سا وہیں فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ جب ذرا آنسو تھمے تو اس نے بستر کو سونگھا کہ شاید لیلیٰ کی کچھ خوشبو معلوم ہو۔ لیکن خس اور گلاب کی مہک کے سوا اور کوئی خوشبو نہ تھی۔

دفعتاً اسے تکیے کے نیچے سے باہر نکلا ہوا کاغذ کا ایک پرزہ نظر آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کلیجہ سنبھال کر وہ پرزہ نکال لیا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ ایک نظر میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ نادر کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ نادر کے منہ سے نکلا۔

''ہائے لیلیٰ۔'' اور غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لیلیٰ نے پرزے میں لکھا تھا۔

''میرے پیارے نادر! تمہاری لیلیٰ تم سے جدا ہوتی ہے، ہمیشہ کے لیے۔ مجھے تلاش نہ کرنا، تم میرا سراغ نہ پاؤ گے۔ میں تمہاری محبت کی کنیز تھی، تمہاری بادشاہت کی بھوکی نہیں۔ آج ایک ہفتے سے دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری نگاہ پھری ہوئی ہے۔ تم مجھ سے نہیں بولتے۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجھ سے بیزار رہتے ہو۔ میں کن کن ارمانوں سے تمہارے پاس جاتی ہوں اور کتنی مایوس ہو کر لوٹتی ہوں۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سزا کا لائق کوئی کام نہیں کیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تمہاری بھلائی کی نیت سے۔ ایک ہفتہ

مجھے روتے گزر گیا۔ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اب میں تمہاری نگاہوں سے گر گئی۔ تمہارے دل سے خارج ہو گئی۔ آہ! یہ پانچ سال ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہی دف لے کر آئی تھی۔ یہی دف لے کر جاتی ہوں۔ پانچ سال تک محبت کے مزے اٹھا کر عمر بھر کے لیے داغ حسرت لیے جاتی ہوں۔ لیلیٰ محبت کی لونڈی تھی جب محبت نہ رہی تو لیلیٰ کیوں کر رہتی؟ رخصت!''

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بڑے بابو

پہلی بار: ''بہارستان'' فروری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: ۱۹۲۸ء (خاکِ پروانہ)

(۱)

تین سو پینسٹھ دن کئی گھنٹے اور کئی منٹ کی متواتر پیہم مسلسل اور انتھک دوا دوش کے بعد بالآخر منزل مقصود پر دھڑ سے پہنچ گیا۔ بڑے بابو کی زیارت حاصل ہوگئی۔ کرۂ خاکی نے کرۂ آتشیں کا طواف پورا کرلیا۔ اب تو آپ بھی میرے جغرافی تجر کے قائل ہوگئے ہونگے۔ اسے استعارہ سمجھے گا۔ بڑے بابو میں مہر نیمروز کی تابش تجلی اور حرارت تھی۔ اور میں کیا اور میری بساط کیا۔ ایک مشتِ خاک۔ بڑے بابو مجھے دیکھ کر مسکرائے ہائے وہ تبسم پر جلال میرے تنِ نیم جان میں رعشہ سا آ گیا۔ جی میں آیا بڑے بابو کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ میں کافر نہیں، غالب کا مرید نہیں، جنت کے وجود پر مجھے یقین کامل ہے اتنا ہی کامل جتنا اپنے خانۂ تاریک پر۔ لیکن فرشتے مجھے جنت لے جانے کے لیے آتے تو بھی یقیناً مجھے وہ مسرت بیکراں نہ حاصل ہوتی جو اس تبسم پر نور سے ہوئی آنکھوں میں سرسوں پھول گئی۔ سارا دل و دماغ لالہ زار بن گیا۔ تخیل نے مصری اہرام کی تعمیر شروع کردی سامنے کرسیوں پردوں اور خس کی ٹٹیوں سے سجا سجایا کمرہ تھا۔ دروازہ پر سائلوں کا انبوہ کثیر اور ایں جانب ایک کرسی پر شان سے بیٹھے ہوئے قیام ازل کے دنیاوی

فرائض ادا کر رہے تھے۔ نذر و نیاز کا طوفانِ بدتمیزی بپا تھا۔ اور میں شانِ استغنا سے کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ دفعتاً ایک شیرانہ گرج نے زیرِ تعمیر اہرام کو متزلزل کر دیا۔

''کیا کام ہے۔''

ہائے تجاہل، اس پر ساری دنیا کے حسینوں کا تجاہل اور تغافل نثار۔ اس آستانۂ دولت پر جبیں سائی کرتے تین سو پینسٹھ دن کئی گھنٹے اور کئی منٹ گزر گئے۔ چوکھٹ زمین دوز ہو گیا عیدو بساطی کی دکان کے آدھے کھلونے اور گوردھن حلوائی کی آدھی دکان اسی آستانہ پر نذر ہو گئی اور مجھ سے آج سوال ہوتا ہے کہ کیا کام ہے؟

مگر نہیں یہ میری زیادتی ہے۔ سراسر ظلم ہے۔ جو فکرِ عالی اہم ملکی و مالی تمدنی معاملات میں شبانہ روز منہمک رہتی ہو۔ جو دماغ ڈاکیوں، سرکلروں، پروانوں، حکمناموں نقشوں وغیرہ سے گرانبار ہو رہا ہو۔ اس کے نزدیک مجھ جیسے خاک کے پتلے کی حقیقت ہی کیا۔ مچھر اپنے کو چاہے ہاتھ سمجھ لے پر بیل کے سینگ کو اس کی کیا خبر۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔

بڑے بابو پھر گرجے یہ کیا کام ہے۔

اب کی بار میرے روئیں کھڑے ہو گئے۔ خدا کے فضل سے لحیم شحیم آدمی، جن دنوں کالج میں تھا۔ میری شجاعت و بسالت کی دھوم تھی۔ ہاکی ٹیم کا کپتان چھ فٹ لمبا ٹیم کا نائب کپتان اور کرکٹ کا جنرل تھا۔ کتنے ہی گوروں کے جسم پر اب بھی میری شجاعت کے داغ باقی ہوں۔ ممکن ہے دو چار اب بھی بیساکھیاں لیے چلتے رینگتے ہوں۔ بمبئی کرانیکل اور ٹائمز میں میرے گیندوں کی دھوم تھی۔ مگر اس وقت

بابو صاحب کی گرج سن کر میرے جسم میں رعشہ آ گیا۔ کانپتے ہوئے بولا۔ ''حضور کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔''

بڑے بابو نے اپنا سلیپر دار پیر میری طرف بڑھا کر کہا۔ شوق سے لیجئے۔ یہ قدم حاضر ہے جتنے بوسے چاہئے لے لیجیے۔ بے حساب معاملہ ہے۔ مجھ سے قسم لے لیجیے جو میں شمار کروں۔ جب تک آپ کا منہ نہ تھک جائے لیے جائیے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کا کیا موقع ہوگا۔ اوروں کی جو بات بڑی ریاضت بڑی چلہ کشی بڑے زہد و اتقا سے حاصل ہوئی ہے وہ مجھے بیٹھے بیٹھائے بغیر ہرڑ پھٹکری لگائے حاصل ہوگئی واللہ ہوں میں بھی خوش نصیب۔ آپ اپنے دوست احباب، اعزہ و اقربا بھی لائیں تو اور بھی بہتر۔ میرا اذن عام ہے۔

اس ستم ظریقی پر بڑے بابو شاید اپنے دل میں نازاں ہوں۔ ضرور ہونگے اس شومیٔ تقدیر کا برا ہو۔ جو اس دروا وہ کا گداگر بنائے ہوئے ہے۔ جی میں آیا کہ حضرت کے بڑھے ہوئے پیر کو کھینچ لوں۔ اور آپ کو زندگی بھر کے لیے سبق دے دوں کہ بدنصیبوں سے دل لگی کرنے کا یہ مزہ ہے۔ مگر بدنصیبی اگر دل پر جبر نہ کرائے، جذبات کا قتل نہ ہو جائے، ذلت کا احساس نہ پیدا کرے تو وہ بدنصیبی کیوں کہلائے۔ میں بھی ایک زمانے میں ستم ظریف تھا۔ اس وقت ان بڑے بابوؤں کی میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ کتنے ہی بڑے بابوؤں کو رلا کر چھوڑ دیا کوئی ایسا پروفیسر نہ تھا جس کا چہرہ میری صورت دیکھتے ہی زرد نہ ہو جاتا ہو۔ ہزار ہزار روپیہ پانے والے پروفیسروں کی مجھ سے کورد بتی تھی۔ ایسے کلرکوں کو میں سمجھتا ہی کیا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ کہاں۔ دل میں پچھتایا کہ ناحق قدم بوسی کا لفظ زبان

پر لایا۔ مگر عرض مد عا ضرور تھا۔ میں مصمم ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس در سے آج کچھ لے کے ہی اٹھوں گا۔ میرے صبر اور بڑے بابو کے تجاہل میں ٹگ آف وار تھا۔ دبی آواز سے بولا۔ ''حضور گریجوایٹ ہوں۔''

شکر ہے ہزار شکر ہے۔ بڑے بابو ہنسے جیسے ہانڈی ابل پڑی ہو۔ وہ گرج اور وہ کرخت آواز نہ تھی۔ میری جبہ سائی آخر کہاں تک اثر نہ کرتی۔ شاید اثر کو میری دعا سے دشمنی نہیں۔ میرے کان بڑی بے قراری سے کلمات روح افزا سننے کے لیے منتظر تھے۔ مگر آہ جتنی مایوسی ان کانوں کو ہوئی ہے۔ اتنی شاید کوہکن کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ تبسم نہ تھا۔ خندۂ تقدیر تھا۔ حضور نے فرمایا:

بڑی خوشی کی بات ہے۔ ملک اور قوم کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا کیا امر ہو سکتا ہے۔ میری دلی تمنا ہے ملک کا ہر ایک نوجوان گریجوایٹ ہو جائے۔ گریجوایٹ زندگی کے جس شعبہ میں جائے اس کو فروغ ہی پہنچائے گا۔ ملکی مالی تمدنی معاشرتی مذہبی غرض ہر ایک قسم کی تحریک کی بقا اور ارتقا گریجوایٹوں پر منحصر ہے۔ اگر ملک میں گریجوایٹ کا یہ افسوس ناک فقدان نہ ہوتا تو عدم تعاون کی تحریک کیوں اتنی جلدی مردہ ہو جاتی کیوں بنے ہوئے رنگے ہوئے سیار، جو فروش گندم نماز رپرست لیڈروں کو ڈاکہ زنی کے ایسے موقعے ملتے۔ تبلیغ کیوں مبلغ علیہ السلام کی علت بنتی۔ گریجوایٹ میں حق و باطل کی تیز نگاہ کی وسعت اور موازنہ کی قابلیت ہونا امر لازم ہے۔ میری آنکھیں تو گریجوایٹوں کو دیکھ کر نشہ کے درجہ تک مخظوظ ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی خدا کے فضل سے اپنی قسم کی بہت اچھی مثال ہیں۔ بالکل اپٹوڈیٹ۔ یہ شیروانی تو برکت اینڈ کو کے دکان کی سلی ہوئی ہوگی۔

جوتے بھی ڈاسن کے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ آپ لوگوں نے قوم کے معیار زندگی کو بہت رفیع بنا دیا ہے۔ اور اب وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچے گی۔ بلیک برڈ بھی ہے ویسٹ اینڈ کی رسٹ واچ بھی ہے بے شک اب قومی بیڑے کو خواجہ خضر کی ضرورت ہی نہیں وہ اس کا منت شناس نہ ہوگا۔

ہائے تقدیر اور وائے تقدیر۔ اگر جانتا کہ یہ شیروانی اور فاؤنٹن پن اور رسٹ واچ یوں آماجگاہ ظرافت بنے گی تو احباب کا شرمندہ احسان کیوں بنتا۔ نماز بخشوانے آیا تھا۔ روزے گلے پڑے۔ کتابوں میں پڑھا تھا ہیئت کذائی اعلان ہے اپنی ناکامی کا، دعوت ہے اپنی تحقیر کی۔ تجربہ بھی مطالعہ کا شاہد تھا۔ چیتھڑے پوش بھک منگوں کو کتنی بیدردی سے دھتکارتا ہوں لیکن جب کوئی حضرت صوفی صافی بنے ہوئے گیسو دراز شانوں پر بکھیرے سنہرا عمامہ سر پر شان کجکلا ہی سے باندھے صندلی رنگ کا نیچا کرتا پہنے کمرہ میں آ پہنچتے ہیں تو جبراً ان کی تعظیم کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ ان کی پاک نفسی کے متعلق ہزاروں اشتباہات پیدا ہونے پر بھی چھوٹی سی رقم جو ان کی نذر کی جاتی ہے۔ وہ ایک درجن بھکاریوں کو خوانِ نعمت کے سامان مہیا کر دیتی۔ پرانی مثل ہے بھیس سے ہی بھیک ملتی ہے۔ پر آج اس کلیہ کی تکذیب ہوگئی ہے اب اہلیہ محترمہ کی وہ تنبیہہ یاد آئی جو اس نے چلتے وقت کی تھی۔

"کیوں خواہ مخواہ اپنی بے عزتی کرانے جا رہے ہو۔ وہ صاف سمجھیں گے کہ یہ مانگے تانگے کا ٹھاٹھ ہے۔ ایسے رئیس ہوتے تو میرے دروازے پر آتے ہی کیوں۔ اس وقت میں نے اس تنبیہہ کو اہلیہ کی کم نگاہی اور دہقانیت پر محمول کیا تھا۔ پر اب معلوم ہوا کہ گنواریں بھی کبھی کبھی سوجھ کی باتیں کہتی ہیں مگر اب دست

تاسف ماننا بے سود ہے۔ میں نے عاجزانہ انداز سے کہا حضور کہیں میری پرورش فرمائیں۔" بڑے بابو نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا میں کوئی عجیب الخلقت وجود ہوں اور نہایت تشفی آمیز لہجہ میں بولے۔ "آپ کی پرورش خدا کرے گا۔ وہی سب کا رازق ہے۔ ازل سے شعراء حکماء اولیاء یہی تلقین کرتے آئے ہیں کہ خدا پر توکل رکھو۔ اور ہم ہیں کہ ان کی ہدایت کو فراموش کر جاتے ہیں۔ لیکن خیر میں آپ کو صلاح نیک دینے میں بخل نہ کروں گا۔ آپ ایک اخبار نکال لیجیے۔ یقین مانیے اس کے لیے علمیت یا تدبر کی ضرورت نہیں آپ تو خدا کے فضل سے گریجوایٹ ہیں۔ محبوب امساک اور ملذذ طلا کے نسخے لکھیے۔ طب اکبر میں آپ کو ہزاروں نسخے ملیں گے، لائبریری جا کر نقل کرائیے۔ اور اخبار میں نئے عنوان سے شائع کیجیے۔ کوک شاستر کا تو آپ نے مطالعہ کیا ہو گا۔ اگر نہ کیا ہو تو ایک بار کریئے۔ اور اپنے اخبار میں لطف مواصلت کے طریقے ارقام فرمائیے۔ اعضاء شہوانی کے نام جتنے زیادہ آ سکیں بہتر ہے۔ پھر دیکھیے کیسے ڈاکٹر اور پروفیسر اور ڈپٹی کلکٹر آپ کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ کام حکیمانہ انداز سے کیا جائے تاجرانہ اور حکیمانہ انداز میں تھوڑا فرق ہے۔ تاجر محض اپنی دواؤں کی تعریف کرتا ہے۔ حکیم اصطلاحات اور اعضاء مخفی کی تشریح کر کے اپنے مضامین کو علمی رنگ دیتا ہے۔

تاجر کی تعریف سے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ حکیم کی تعریف اعتماد انگیز ہوتی ہے۔ اگر اس معاملہ میں کچھ استصواب کی ضرورت ہو تو رسالہ درویش حاضر ہے۔ اگر اس کام میں آپ کو کچھ دقت معلوم ہو۔ تو سوامی شردھانند کی خدمت میں جا کر

شدھی پر آمادگی ظاہر کیجیے۔ پھر دیکھیے آپ کی کتنی تواضع اور تکریم ہوتی ہے۔ اتنا سمجھائے دیتا ہوں کہ شدھی کے لیے فوراً تیار نہ ہو جائیے گا۔ پہلے دن تو دو چار ہندو دھرم کی کتابیں مانگ لائیے گا۔ ایک ہفتہ کے بعد جا کر کچھ اعتراضات کیجیے گا۔ مگر اعتراضات ایسے ہوں جن کا جواب آسانی سے دیا جا سکے اس سے سوامی جی کو آپ کی تحقیق اور تجسس کا یقین ہو جائے گا۔ بس آپ کی چاندی ہے۔ آپ اس کے بعد اسلام کی مخالفت پر ایک دو مضمون یا سلسلہ مضامین کسی ہندو رسالہ میں لکھ دیں گے۔ تو آپ کی زندگی اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے بھی ایک سہل نسخہ ہے۔ تبلیغی مشن میں شریک ہو جائیے۔ کسی ہندو عورت خصوصاً نوجوان بیوہ پر ڈورے ڈالیے آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ کتنی آسانی سے آپ سے ملتفت ہو جاتی ہے۔ آپ اس کی حیاتِ تاریک کے لیے مشعل ثابت ہوں گے۔ وہ بے عذر ہوتی ہے۔ شوق سے اسلام قبول کر لے گی۔ بس آپ شہیدوں میں داخل ہو گئے۔ اگر آپ ذرا احتیاط سے کام کرتے رہیں۔ تو آپ کی زندگی بڑی فارغ البالی سے گزرے گی۔ ایک ہی کھیوے میں دین و دنیا دونوں ہی پار ہیں۔ جناب لیڈر بن جائیں گے۔ واللہ ایک ہفتہ میں آپ کا شمار معززین میں ہونے لگے گا۔ دین کے سچے پیرو ہزارہا سیدھے سادے مسلمان آپ کو دین کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا سمجھیں گے۔ پھر خدا کے سوائے اور کسی کو خبر نہ ہوگی کہ آپ کے ہاتھ کیا آتا ہے۔ اور وہ کہاں جاتا ہے۔ اور خدا افشائے راز نہیں کرتا۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں۔ تعجب ہے کہ ان موقعوں پر آپ کی نگاہ کیوں نہیں جاتی۔ میں تو بوڑھا ہو گیا اور اب کوئی نیا کام نہیں سیکھ سکتا۔ ورنہ اس وقت لیڈروں کا لیڈر ہوتا۔"

اس شعلہ انگیز شرافت نے جسم میں شعلے پیدا کر دیے۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ تحمّل کی برودت حائل تبخیر ہو گئی۔ مگر قہر درویش بر جان درویش کے مصداق سر جھکا کر کھڑا رہا جتنی دلیلیں ذہن میں کئی دنوں سے ریزہ ریزہ کر کے رکھی تھیں صرف اظہار ہو گئیں۔ بہت سوچنے پر بھی کوئی نیا پہلو ذہن میں نہ آیا۔ یوں خدا کے فضل سے غبی یا کند ذہن نہیں ہوں۔ فکر رسا پائی ہے۔ اتنی فکر سے کوئی اچھی سی غزل ہو جاتی پر طبیعت ہی تو ہے نہ لڑی۔ اتفاق سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معاً یاد آ گیا کہ سفارشی خطوط کا ایک دفتر بھی ساتھ لایا ہوں۔ رعب کا اوسان پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا آج تجربہ ہو گیا۔ امید کی شگفتگی چہرہ پر نمودار ہو گئی۔ خطوط کا پلندہ ہاتھ میں لے کر بولا۔ حضور! یہ چند خطوط ہیں۔ انہیں ملاحظہ فرمالیں۔

بڑے بابو نے بنڈل لے کر میز پر رکھ دیا اور ان پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر بولے۔ ''آپ نے اب تک ان جواہر ریزوں کو کیوں چھپا رکھا تھا؟''

میرے دل میں مسرت امید کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گویائی نے عود کیا امنگ سے بولا۔ ''حضور کے جاہ و جلال نے اتنا مرعوب اور مسحور کر دیا کہ مجھے ان خطوط کی یاد نہ رہی۔ حضور سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے ان کے لیے کسی قسم کی سعی و سفارش نہیں بہم پہنچائی۔ کسی قسم کی جستجو نہیں کی۔''

بڑے بابو نے مسکرا کر فرمایا۔ ''اگر آپ ان کے لیے سعی و طلب کی انتہائی قوتیں صرف کرتے تو بھی میں آپ کو متہم نہ کرتا۔ آپ بے شک بڑے خوش نصیب ہیں کہ یہ نایاب...... جنس آپ کو بے مانگے مل گئی۔ اسے زندگی کے سفر کا پاسپورٹ سمجھئے واہ آپ کو خدا کے فضل سے ایک سے ایک قدر دان نصیب

ہوئے۔آپ ذہین ہیں۔راست باز ہیں۔ بےلوث ہیں، اطاعت شعار ہیں۔ افواہ! آپ کے اوصاف کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔قسم خدا کی آپ جامع کمالات صوری معنوی معلوم ہوئے ہیں۔آپ میں فراست، متانت، دیانت، صیانت، اصابت، نجابت، شرافت، جسارت سبھی انسانی اور ملکوتی صفات موجود ہیں۔ آپ تو نمائش میں رکھے جانے کے قابل معلوم ہوتے ہیں، کہ دنیا نگاہ حیرت سے دیکھےاور دانتوں میں انگلی دبائے۔آج کسی بھلے کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا کہ آپ جیسے پاکیزہ منش شخص سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں آپ کو نام و نمود کے مدارج تک پہنچا سکتے ہیں۔سرکار کی ملازمت آپ جیسے باکمال اصحاب کے شایانِ شان نہیں۔آپ کو یہ کب گوارا ہوگا۔اس دائرہ میں آتے ہی انسان حیوان مطلق بن جاتا ہے۔بولیے آپ اسے منظور کر سکتے ہیں۔ہرگزنہیں..........!''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔''جناب ذرا ان الفاظ کی توضیح فرمائیں۔انسان کے حیوان مطلق بننے سے آپ کا کیا منشا ہے؟''

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔''یہ تو کوئی ایسا پیچیدہ توضیح طلب امر نہ تھا۔جب تو مجھے اپنے حسن ظن میں کچھ ترمیم کرنے پڑے گی۔اس دائرہ کے عبودیت کشوں کے لیے سب سے ضروری اور لازمی صفت فراست ہے۔میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے خیال پر یہ لفظ قادر ہے یا نہیں اس کا انگریزی مترادف ہے، انٹیوشن۔کنایہ کے اصلی مفہوم سمجھنا مثلاً اگر سرکار بہادر یعنی حاکم ضلع کو شکایت ہو کہ آپ کے علاقہ میں انکم ٹیکس کم وصول ہوتا ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس میں اندھا

دھند اضافہ کریں۔ آمدنی کی پروانہ کریں۔ آمدنی کا بڑھانا آپ کی معاملہ فہمی پر منحصر ہے۔ ایک خفیف سی دھمکی کام کر جائے گی اور انکم ٹیکس دو چند سہ چند ہو جائے گا۔ یقیناً آپ کو یہ ضمیر فروشی گوارا نہ ہو گی۔''

میں نے سمجھ لیا کہ میرا امتحان ہو رہا ہے۔ عاشقانہ سرگرمی سے بولا، ''میں تو اسے ضمیر فروشی نہیں سمجھتا۔ یہ تو حق نمک ہے۔ میرا ضمیر اس درجہ نازک نہیں ہے۔''

بڑے بابو نے میری طرف قدردانہ نگاہ سے دیکھ کر فرمایا۔

''شاباش! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ آپ مجھے ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شاید دوسری شرط آپ کو منظور نہ ہو۔ اس دائرہ کے مریدوں کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے کو بھول جائیں۔ کچھ آیا ذہن شریف میں؟''

میں نے دبی زبان سے کہا ''جناب کو تکلیف تو ہو گی۔ ذرا پھر اس کی توضیح فرما دیجیے۔''

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا، جناب بار بار کی توضیح مجھے بری معلوم ہوتی ہے میں اس سے آسان طریقہ پر اپنے خیال کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اپنے کو بھول جانا بہت ہی عام محاورہ ہے۔ اپنی خودی کو مٹا دینا اپنی شخصیت کو فنا کر دینا ہے۔ اپنی پرسنلیٹی کو زائل کر دینا۔ آپ کی وضع قطع سے آپ کے خطاب و کلام سے آپ کے انداز و اطوار سے آپ کی ہندیت کی تکذیب ہو جانی چاہیے۔ آپ کے مذہبی اخلاقی اور تمدنی اثرات کا ایک قلم محو ہو جانا ضروری ہے۔ مجھے آپ کے بشرہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اس توضیح پر بھی آپ میرا مفہوم سمجھنے پر قاصر ہیں۔

سنئے آپ غالباً مسلمان ہیں۔ شاید آپ راسخ العقیدہ بھی ہوں آپ نماز اور روزے کے پابند ہیں؟

میں نے انداز تفاخر سے کہا۔ ’’جناب میں اتنا ہی راسخ العمل ہوں جتنا کوئی مولوی ہو سکتا ہے میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ الا اس وقت جب میں بسترِ علالت پر تھا۔‘‘

بڑے بابو نے مسکرا کر کہا۔ ’’یہ آپ کے پسندیدہ اخلاق ہی کہے دیتے ہیں۔ مگر اس دائرہ میں آ کر آپ کو اپنے عقیدہ اور عمل میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنی پڑے گی یہاں آپ کا مذہب مذہبیت کا نامہ اختیار کرے گا۔ آپ بھول کر بھی اپنی پیشانی کو منت کش سجدہ نہ بنائیں کوہی مضائقہ نہیں۔ آپ بھول کر بھی زکوۃ سے اپنے کو ملوث نہ بنائیں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آپ کو اپنے مذہب کے نام پر فریاد کرنے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ کے ضلع میں دو ڈپٹی کلکٹر ہندو ہیں۔ اور مسلمان صرف ایک تو آپ کا فرض ہے کہ ہز ایکسلینی گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے لیے روسا قوم کو آمادہ کریں اگر آپ کو معلوم ہو کہ کسی میونسپلٹی نے قصابوں کو شہر سے بارہ دکان رکھنے کی تجویز پاس کر دی ہے تو آپ کا فرض ہے .... کہ زعیمانِ قوم کو اس میونسپلٹی کی سرزنش کرنے کے لیے تحریک کریں۔ آپ کو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قومی فدایت کا راگ الاپنا چاہیے۔ مثلاً امتحان کے نتائج میں اگر آپ کو مسلمان طلباء کی تعداد مناسب سے کم نظر آئے تو آپ کو فوراً چانسلر کے پاس ایک گمنام خط لکھ کر بھیجنا ہو گا۔ کہ اس معاملہ میں ضرور ہی سختی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں اسی انٹیوشن

والی شرط کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ آپ کو صراحتاً یا کنایتاً یہ لائحہ عمل قائم کرنے کے لیے ہدایت نہ کی جائے گی۔ سب کچھ آپ کی فراست پر مبنی ہوگا۔ آپ نے اس جوہر سے بہرہ وافی پایا ہے تو آپ کو ایک دن ضرور منصب اعلیٰ پر پہنچیں گے۔ آپ کو حتے الامکان انگریزی میں تحریر و تقریر کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر حکام آپ سے خوش نہ ہوں گے۔ لیکن قومی زبان کی حمایت اور اشاعت کی صدا آپ کی زبان سے پیہم نکلتی رہنی چاہیے۔ آپ شوق سے اخبارات کا چندہ ہضم کریں۔ مستعار کتابیں پڑھیں چاہے واپسی کے وقت کتاب کی قلب ہیئت کے باعث آپ کو معذرت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ لیکن زبان کی حمایت بانگ دہل سے کرتے رہئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو جس کا کھانا اسی کا گانا ہوگا۔ آپ کے قول سے، فعل سے اور دل سے اپنے آقا کے فلاح اور استحکام میں منہمک ہونا پڑے گا۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آقا کی خدمت کے ذریعہ قوم کی خدمت بھی کروں گا تو یہ خیال خام ہے۔ سودا ہے۔ جنوں ہے، حماقت ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ فرمائیے آپ اس حد تک اپنے کو بھول سکتے ہیں۔"

مجھے جواب دینے میں ذرا تامل ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ میں بھی آدمی ہوں اور بیسویں صدی کا آدمی ہوں۔ میں بیدار نہ سہی، مگر بالکل غافل بھی نہیں ہوں۔ میں بھی اپنے ملک اور قوم کو بامِ عروج پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب دنیا میں صرف ایک ہے، اور اس کا نام ہے درد۔ مذہب کی موجودہ صورت دھڑے بندی کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ختنہ یا چوٹی سے کسی کی ماہیت نہیں تبدیل ہوسکتی۔ پرستش کے

لیے کلیسا، مسجد، مندر کی میں بالکل ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہاں نفسانیت کو دبائے رکھنے کے لیے کسی عمل کی ضرور تسلیم کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ اس سے مجھے جنت ملے گی یا میری مکتی ہو گی بلکہ صرف اس لیے کہ مجھے دوسروں کے حقوق غضب کرنے سے اکراہ ہو گا۔ مجھ میں خودی کا خاصہ عنصر موجود ہے۔ یوں اپنی رضا و رغبت سے کہیے آپ کی جوتیاں سیدھی کروں لیکن حکومت کی برداشت نہیں۔ محکوم بننا شرمناک، حقارت انگیز سمجھتا ہوں۔ کسی غریب کو ظلم کا شکار ہوتے دیکھ کر میرے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی سے دب کر رہنے سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن خیال حالات پر تو فتح نہیں پا سکتا۔ معاش کی فکر تو مقدم ہے۔ اتنے دنوں کے بعد بڑے بابو کی نگاہ کرم کو اپنی جانب ملتفت دیکھ کر بجز سر تسلیم خم کرنے کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ بولا جناب میری جانب سے مطمئن رہیں۔ آقا کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔

’’غیرت کو فنا کر دینا ہو گا۔‘‘

’’منظور۔‘‘

’’مخبری کرنی پڑے گی۔‘‘

’’منظور۔‘‘

’’تو بسم اللہ کل سے آپ کا نام امیدواروں کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا۔‘‘

میں نے سوچا تھا کل سے کوئی جگہ مل جائے گی۔ اتنی ذلت قبول کرنے کے بعد معاش کے فکر سے تو آزادی نصیب ہو گی۔ اب حقیقت کھلی۔ بے اختیار منہ سے نکلا اور جگہ کب تک ملے گی؟

بڑے بابو ہنسے۔ وہی دلخراش ہنسی جس میں ذم کا پہلو غالب تھا۔ جناب میں عالم الغیب نہیں۔ روشن ضمیر نہیں، بہتر ہو اس سوال کا جواب آپ کسی اولیا سے پوچھیں۔ دستر خوان بچھا دینا میرا کام ہے۔ کھانا آئے گا اور وہ آپ کے حلق میں جائے گا۔ پیشین گوئی میں نہیں کر سکتا۔ میں نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ''میں تو صرف اس سے بڑی عنایت کا منتظر تھا۔'' بڑے بابو کرسی سے اٹھ کر بولے۔ قسم خدا کی آپ پرلے درجے کے کوڑمغز آدمی ہیں۔ بالکل خشک دماغ۔ دستر خوان کا سامنے آ جانا۔ آپ کوئی چھوٹی بات سمجھتے ہیں۔ لطف انتظار آپ کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں حالانکہ انتظار میں انسان عمریں گزار سکتا ہے۔ آپ روزانہ کچہری میں آئیں گے۔ غرض مندوں سے آپ کا سابقہ ہوگا۔ عمال سے آپ روشناس ہو جائیں گے۔ معاملے بٹھانے سودے پٹانے کے زریں موقعے ہاتھ آئیں گے۔ حکام کے لڑکے پڑھایئے اگر گنڈے تعویز کا فن سیکھ لیجیے تو آپ کے حق میں بہت مفید ہو۔ کچھ طبی معلومات بھی بہم پہنچایئے۔ اچھے ہوشیار زرگروں سے یارانہ پیدا کیجیے۔ کیونکہ آپ کو ان سے اکثر سابقہ پڑے گا۔ حکام کی مستورات آپ ہی کی معرفت اپنی نسوانی فرمائشیں پوری کرائیں گی۔ مگر ان سب لٹکوں سے کارگر ایک اور لٹکا ہے۔ اگر وہ ہنر آپ میں ہے تو یقیناً آپ کے انتظار کی مدت میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ آپ حکام عالی مقام کے لیے سامانِ تفریح مہیا کر سکتے ہیں؟

بڑے بابو میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرائے سامانِ تفریح سے ان کی کیا مراد ہے۔ یہ میں نہ سمجھ سکا۔ مگر پوچھتے ہوئے بھی خوف ہوتا تھا کہ کہیں بڑے بابو بگڑ نہ جائیں اور پھر معاملہ خراب ہو جائے۔ ایک اضطراب کی حالت میں زمین

کی طرف تاکنے لگا۔

بڑے بابو تاڑ گئے کہ اس کی سمجھ میں میری بات نہ آئی۔لیکن اب کے وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔نہیں ان کے لہجے میں ہمدردی کی جھلک تھی۔"فرمایا یہ تو غیر ممکن ہے کہ آپ نے بازار کی سیر نہ کی ہو۔"

میں نے شرماتے ہوئے کہا"نہیں حضور! بندہ اس کوچے سے نا آشنا ہے۔"

بڑے بابو بولے"تو آپ کو اس کوچہ کی خاک چھاننی پڑے گی۔حکام بھی باصرہ اور سامعہ رکھتے ہیں۔دن بھر کی دماغی تکان کے بعد فطرتاً شب کو ان کی طبیعت تفریح کی جانب مائل ہوتی ہے۔اگر آپ ان کے لیے حسن باصرہ فروز اور نغمہ سامعہ نواز کا انتظام سستے داموں کر سکتے ہیں☆یا کر سکیں تو............"

میں نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔"آپ کا منشا یہ ہے کہ مجھے بازار حسن کی دلالی کرنی پڑے گی؟بابو صاحب بولے تو آپ تیز کیوں ہوتے ہیں۔اگر اب تک اتنی موٹی سی بات آپ نہیں سمجھے تو یہ میرا قصور ہے یا آپ کی کوتاہ فہمی کا؟"

میرے جسم میں آگ لگ گئی۔جی میں آیا کہ بڑے بابو کو جی جٹسو کے دو چار ہاتھ دکھاؤں مگر گھر کی بے سروسامانی کا خیال آ گیا۔بیوی کی منتظر آنکھیں اور بچوں کی گرسنہ صورتیں یاد آ گئیں۔ذلت کا ایک دریا حلق کے نیچے ڈھکیلتے ہوئے بولا۔"جی نہیں۔ میں تیز نہیں ہوا تھا۔ ایسی بے ادبی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔(آنکھوں میں آنسو بھر کر)ضرورت نے میری غیرت کو فنا کر دیا ہے۔آپ میرا نام امیدواروں میں درج کر دیں۔حالات مجھ سے جو کچھ کرائیں گے۔وہ کروں گا۔اور تادم آخر آپ کا ممنون رہوں گا۔"

پنہاری کا کنواں

پہلی بار ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری''

جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔

بستر مرگ پر پڑی گومتی نے چودھری ونایک سنگھ سے کہا۔ ''چودھری میری زندگی کی یہی لالسا تھی۔''

چودھری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''اس کی کچھ چنتا نہ کرو کاکی۔ تمہاری لالسا بھگوان پوری کریں گے۔ میں آج ہی سے مزدوروں کو بلا کر کام پر لگائے دیتا ہوں۔ دیو نے چاہا تو تم اپنے کنویں کا پانی پیو گی۔ تم نے گنا ہو گا کتنا روپے ہیں؟''

گومتی نے ایک پل آنکھیں بند کر کے بکھری ہوئی یادداشت کو یکجا کر کے کہا۔ بھیا میں کیا جانوں کتنے روپے ہیں جو کچھ ہیں وہ اسی ہانڈی میں ہیں۔ اتنا کرنا کرنا کہ اتنے ہی میں کام چل جائے۔ کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے۔

چودھری نے بند ہانڈی کو اٹھا کر ہاتھوں سے تولتے ہوئے کہا۔ ''ایسا تو کریں گے ہی کاکی کون دینے والا ہے۔ ایک چٹکی بھیک تو کسی کے گھر سے نکلتی نہیں۔ کنواں بنوانے کے لیے کون دیتا ہے۔ دھنیہ ہو تم کو کہ اپنی عمر بھر کی کمائی اس دھرم کاج کے لیے دے دی۔''

گومتی نے فخر سے کہا۔ ''بھیا تم تو بہت چھوٹے تھے تمہارے کاکا مرے تو میرے ہاتھ میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ دن دن بھر بھوکی رہتی۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کی بیماری پر اٹھ گیا۔ وہ بھگوان کے بڑے بھگت تھے۔ اس لیے انہیں

بھگوان نے جلدی سے اپنے پاس بلا لیا۔ اس دن سے آج تک تم دیکھ رہے ہو کہ کس طرح دن کاٹ رہی ہوں۔ میں نے ایک رات میں من بھر اناج پیسا ہے۔ بیٹا دیکھنے والے تعجب کرتے تھے۔ نہ جانے اتنی طاقت مجھ میں کہاں سے آ جاتی تھی۔ بس یہی تمنا رہی کہ ان کے نام پر گاؤں میں ایک چھوٹا سا کنواں بن جاتا۔ نام تو چلنا چاہئے اسی لیے تو آدمی بیٹے بیٹی کو روتا ہے۔

اس طرح چودھری ونایک سنگھ کو وصیت کر کے اسی رات کو بڑھیا گومتی پرلوک سدھاری۔ مرتے وقت آخری الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے تھے وہی تھے۔ ''کنواں بنوانے میں دیر مت کرنا۔'' اس کے پاس دولت ہے یہ تو لوگوں کو اندازہ تھا لیکن وہ ہزار ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ بڑھیا اپنی دولت کو عیب کی طرح چھپاتی تھی۔ چودھری ونایک سنگھ گاؤں کا مکھیا اور نیت کا صاف آدمی تھا اس لیے بڑھیا نے اسے یہ آخری حکم دیا تھا۔

چودھری نے بڑھیا کے کریا کرم میں بہت روپے خرچ نہیں کیے۔ جوں ہی ان سنسکاروں سے چھٹی ملی وہ اپنے بیٹے ہرناتھ سنگھ کو بلا کر اینٹ، چونا، پتھر کا تخمینہ کرنے لگا۔ ہرناتھ سنگھ اناج کا کاروبار کرتا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بیٹھا سنتا رہا پھر بولا۔ ''ابھی دو چار مہینے کنواں نہ بنے تو کوئی بڑا ہرج ہے کیا؟''

چودھری نے ''ہوں'' کر کے کہا۔ ''ہرج تو کچھ نہیں لیکن دیر کرنے کا کام ہی کیا ہے۔'' روپے اس نے دے ہی دیے ہیں۔ ہمیں تو مفت میں ناموری ملے گی۔ گومتی نے مرتے مرتے جلد کنواں بنوانے کو کہا تھا۔

ہرناتھ بولا۔ ''ہاں۔ کہا تو تھا، لیکن آج کل بازار اچھا ہے تین ہزار کا اناج بھر

لیا جائے تو اگہن پوس تک سوایا ہو جائے گا۔ میں آپ کو کچھ سود دے دوں گا۔"

چودھری کا دل شک اور خوف کی وجہ سے کش مکش میں پھنس گیا۔ دو ہزار کے کہیں ڈھائی ہزار ہو گئے تو کیا کہنا، کچھ بیل بوٹے بنوا دوں گا۔ لیکن خوف تھا کہ کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟ اس شک کو وہ چھپا نہ سکے۔ بولے "جو کہیں گھاٹا ہو گیا تو؟"

ہرناتھ نے تڑپ کر کہا۔ "گھاٹا کیوں ہو جائے گا؟ کوئی بات ہے۔"

"ماں لو گھاٹا ہو گیا تو؟"

ہرناتھ نے مشتعل ہو کر کہا۔ "یہ کہو کہ تم روپیہ نہیں دینا چاہتے ہو۔ بڑے دھرماتما بنے ہو۔"

دوسرے بزرگوں کی طرح چودھری بھی بیٹے سے ڈرتے تھے۔ دبے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں یہ کب کہتا ہوں کہ روپیہ نہیں دوں گا لیکن پرایا دھن ہے سوچ سمجھ کر ہی تو اس میں ہاتھ لگانا چاہیے۔ بیوپار کا حال کون جانتا ہے۔ کہیں بھاؤ اور زیادہ گر جائے تو؟ اناج میں گھن ہی لگ جائے، کوئی مدعی گھر میں آگ لگا دے۔ سب باتیں سوچ لو اچھی طرح۔"

ہرناتھ.......... طنز سے کہا۔ "اس طرح سوچنا ہے تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی چور ہی اٹھا لے جائے یا بنی بنائی دیوار بیٹھ جائے۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔

چودھری کے پاس اب اور کوئی دلیل نہیں تھی۔ کمزور سپاہی نے تال تو ٹھونکی اکھاڑے میں اتر بھی پڑا تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہاتھ پھول گئے، بغلیں جھانک کر چودھری نے کہا

"تو کتنا لو گے؟"

ہرناتھ ہوشیار جنگجو کی طرح دشمن کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر پھر کر بولا۔ ''سب کا سب دیجیے سو پچاس لے کر کیا کھلواڑ کرنا ہے۔''

چودھری راضی ہو گئے۔ گومتی کو انہیں روپیہ دیتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دنیا برائی کرے گی اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ ہرناتھ نے اناج بھرا۔ اناج کے بوروں کا ڈھیر لگ گیا۔ آرام کی میٹھی نیند سونے والے چودھری اب ساری رات چوروں کی رکھوالی کرتے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی چوہیا بوروں میں گھس جائے۔ چودھری اس طرح جھپٹتے کہ بلی بھی ہار مان جاتی اس طرح چھ مہینے گزر گئے۔ اناج بکا۔ پورے پانچ سو روپے کا منافع ہوا۔

ہرناتھ نے کہا۔ ''اس میں پچاس روپیہ آپ لے لیں۔''

چودھری نے جھلا کر کہا۔ ''پچاس روپیہ کیا خیرات لے لوں۔ کسی مہاجن سے اتنے روپے لیے ہوتے تو کم سے کم دو سو روپیہ سود کے ہوتے۔''

ہرناتھ نے بات کو زیادہ نہیں بڑھایا۔ ایک سو پچاس روپے چودھری کو دے دیے۔ چودھری کی آتما اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ اپنی کوٹھری میں سونے گیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ بڑھیا گومتی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ چودھری کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا وہ نیند میں نہ تھا۔ کوئی نشہ نہ کھایا تھا۔ گومتی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہاں اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک عجیب تازگی تھی۔

کئی سال گزر گئے چودھری برابر اسی فکر میں رہتے کہ ہرناتھ سے روپیہ نکال لوں۔ لیکن ہرناتھ ہمیشہ ہی حیلے حوالے کرتا رہتا تھا۔ وہ سال میں تھوڑا سا سود

دے دیتا تھا۔ مگر مول کے لیے ہزاروں باتیں بناتا تھا۔ کبھی لینے کا رونا تھا کبھی چکنے کا۔ ہاں کاروبار بڑھتا جاتا تھا۔ آخر کار ایک دن چودھری نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تمہارا کام چلے یا ڈوبے مجھے پروانہیں۔ اس مہینے میں تمہیں ضرور روپے چکانے پڑیں گے۔ ہرناتھ نے بہت اڑن گھائیاں بتائیں چودھری اپنے ارادے پر جمے رہے۔

ہرناتھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کہتا ہوں کہ دو مہینے اور ٹھہر یئے۔ مال فروخت ہوتے ہی میں روپے دے دوں گا۔''

چودھری نے سختی سے کہا۔ ''تمہارا مال کبھی نہ بکے گا اور نہ کبھی تمہارے مہینے پورے ہوں گے۔ میں آج روپیہ لوں گا۔''

ہرناتھ اسی وقت غصے میں بھرا ہوا اٹھا اور دو ہزار روپیہ لا کر چودھری کے سامنے پٹک دیا۔

چودھری نے کچھ جھینپ کر کہا ''روپے تو تمہارے پاس تھے۔''

''تو کیا باتوں سے روزگار ہوتا ہے۔''

''تم اس وقت مجھے پانچ سو روپے دے دو۔ باقی دو مہینے میں دے دینا۔ سب آج ہی تو خرچ نہیں ہو جائیں گے۔''

ہرناتھ نے تاؤ کھا کر کہا۔ ''آپ چاہے خرچ کیجیے یا جمع کیجیے مجھے ان روپیوں سے کام نہیں۔ دنیا میں کیا مہاجن مر گئے ہیں جو آپ کی دھونس سہوں۔''

چودھری نے روپے اٹھا کر ایک طاق پر رکھ دیے کنویں کی داغ بیل ڈالنے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

ہرناتھ نے روپے لوٹا تو دیے تھے مگر من میں کچھ اور منصوبہ باندھ رہا تھا۔ آدھی رات کو جب گھر میں سناٹا چھا گیا تو ہرناتھ چودھری کی کوٹھری کی چول کھسکا کر اندر گھسا۔ چودھری بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ہرناتھ نے چاہا کہ دونوں تھیلیاں اٹھا کر باہر نکل جاؤں لیکن جوں ہی ہاتھ بڑھایا اسے اپنے سامنے گومتی کھڑی دکھائی دی۔ وہ دونوں تھیلیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ ہرناتھ خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔

پھر یہ سوچ کر کے شاید مجھے دھوکا ہورہا ہے۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا پر اب کی وہ مورتی اتنی ڈراونی ہوگئی کہ ہرناتھ ایک پل بھی وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ بھاگا پر برآمدے میں ہی بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

ہرناتھ نے چاروں طرف سے روپے وصول کر کے بیوپاریوں کو دینے کے لیے جمع کرر کھے تھے۔ چودھری نے آنکھیں دکھائیں تو وہی روپیہ لاکر پٹک دیا۔ دل میں اسی وقت سوچ لیا تھا کہ رات کو روپے اڑا لاؤں گا۔ جھوٹ موٹ چور کا غل مچاؤں گا تو میری طرف شک بھی نہ ہوگا۔ پر جب یہ پیش بندی ٹھیک نہ اتری تو اس پر بیوپاریوں کے تقاضے ہونے لگے۔ وعدوں پر لوگوں کو کہاں تک ٹالتا جتنے بہانے ہوسکتے تھے سب کیے۔ آخر یہ نوبت آ گئی کہ لوگ نالش کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ ایک نے تو تین سو روپے کی نالش بھی کر دی۔ بچارے چودھری بڑی مشکل میں پھنسے۔

دکان پر ہرناتھ بیٹھتا تھا۔ چودھری کو اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پر اس کی جو ساکھ تھی وہ چودھری کی وجہ سے تھی۔ لوگ چودھری کو کھرا اور لین دین کا صاف

آدمی سمجھتے تھے حالانکہ اب بھی ان سے کوئی تقاضا نہیں کرتا تھا پر وہ سب سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ مگر انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کنویں کے روپے نہ چھوؤں گا۔ چاہے کچھ بھی آ پڑے۔

رات کو ایک بیوپاری کے مسلمان چپراسی نے چودھری کے دروازے پر جا کر ہزاروں گالیاں سنائیں چودھری کو بار بار غصہ آیا تھا کہ چل کر اس کی مونچھ اکھاڑ لوں، پر دل کو سمجھایا۔ ہم سے مطلب ہی کیا ہے۔ بیٹے کا قرض ادا کرنا باپ کا فرض نہیں ہے۔

جب کھانا کھانے گئے تو بیوی نے کہا۔ ''یہ سب کیا جھگڑا کر رکھا ہے۔''

چودھری نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''میں نے کر رکھا ہے؟''

''اور کس نے؟ بچہ قسم کھاتا ہے کہ میرے پاس صرف تھوڑا سا مال ہے۔ روپے تو سب تم نے مانگ لیے۔''

چودھری: مانگ نہ لیتا تو کیا کرتا۔ حلوائی کی دکان پر دادا کا فاتحہ پڑھنا مجھے پسند نہیں ہے۔

استری: یہ ناک کٹائی اچھی لگتی ہے؟

چودھری: تو میرا کیا بس ہے بھائی۔ کبھی کنواں بنے گا کہ نہیں، پانچ سال ہو گئے۔

استری: اس وقت اس نے کچھ نہیں کھایا۔ پہلی جون بھی منہ جھوٹا کر کے اٹھ گیا تھا۔

چودھری: تم نے سمجھا کر کھلایا نہیں۔ دانہ پانی چھوڑ دینے سے تو روپے نہیں

ملیں گے۔

استری: تم کیوں نہیں جا کر سمجھا دیتے۔

چودھری: مجھے تو وہ اس وقت بیری سمجھ رہا ہو گا۔

استری: میں روپیہ لے جا کر بچہ کو دے آتی ہوں۔ ہاتھ میں جب روپے آ جائیں تو کنواں بنوا دینا۔

چودھری: نہیں، نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ میں اتنا بڑا دھوکا نہ کر سکوں گا چاہے گھر مٹی میں مل جائے۔

لیکن استری نے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا وہ لپک کر اندر گئی اور تھیلیوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا سارا جسم ستار کی طرح کانپنے لگا۔

چودھری نے گھبرا کر پوچھا، ”کیا ہوا، تمہیں چکر تو نہیں آ رہا۔“

عورت نے طاق کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”وہ............وہ چڑیل وہاں کھڑی ہے۔“

چودھری نے طاق کی طرف دیکھ کر کہا۔ کون چڑیل؟ مجھے تو وہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

استری: میرا تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس بڑھیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

چودھری: یہ سب وہم ہے۔ بڑھیا کو مرے ہوئے پانچ سال ہو گئے۔ کیا اب تک وہ یہاں بیٹھی ہے۔

استری: میں نے صاف دیکھا وہی تھی بچہ کہتا تھا کہ اس نے رات تھیلیوں پر ہاتھ رکھے دیکھا تھا۔

چودھری: وہ رات کو میری کوٹھری میں کب آیا؟

استری: تم سے کچھ روپیوں کے بارے میں ہی کہنے آیا تھا، اسے دیکھتے ہی بھاگا۔

چودھری: اچھا پھر تم اندر جاؤ میں دیکھ رہا ہوں۔

استری نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''نا بابا۔ اب میں اس کمرے میں قدم نہ رکھوں گی۔''

چودھری: اچھا میں جا کر دیکھتا ہوں۔

چودھری نے کوٹھری میں جا کر دونوں تھیلیاں طاق پر سے اٹھالیں۔ کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ گومتی کی چھایا کا کہیں نام تک نہیں تھا۔ استری دروازے پر کھڑی جھانک رہی تھی۔ چودھری نے آ کر فخے سے کہا۔

''مجھے تو کہیں کچھ نہ دکھائی دیا۔ وہاں ہوتی تو کہاں چلی جاتی۔''

استری: کیا جانے تمہیں کیوں نہیں دکھائی دی۔ تم پر مہربان تھی، اسی لیے ہٹ گئی ہو گی۔

چودھری: تمہیں وہم تھا اور کچھ نہیں۔

استری: بچہ کو بلا کر پچھوائے دیتی ہوں۔

چودھری: کھڑا تو ہوں جا کر دیکھ کیوں نہیں آتی۔

استری کی کچھ ہمت بندھی۔ اس نے طاق کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے ہاتھ

بڑھایا۔ اور زور سے چلا کر بھاگی اور آنگن میں آ کر دم لیا۔

چودھری بھی اس کے ساتھ آنگن میں آ گیا اور حیرت سے بولا۔ کیا تھا؟ کیا بیکار میں بھاگی چلی آئی۔ مجھے تو کچھ نہ دکھائی دیا۔

استری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ چلو ہٹو۔ اب تک تو تم نے میری جان ہی لے لی تھی نہ جانے تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کھڑی تو ہے وہ ڈائین۔

اتنے میں ہرناتھ بھی وہاں آ گیا۔ ماتا کو آنگن میں پڑے دیکھ کر بولا۔ ''کیا ہے اماں کیسا جی ہے۔''

استری: وہ چڑیل آج دوبارہ دکھائی دی۔ بیٹا میں نے کہا لاؤ تمہیں روپے دے دوں۔ جب ہاتھ میں آ جائیں گے تو کنواں بنوا دیا جائے گا۔ لیکن جیوں ہی تھیلیوں پر ہاتھ رکھا اس چڑیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پران نکل گئے۔

ہرناتھ نے کہا۔ ''کسی اچھے اوجھا کو بلانا چاہئے جو اسے مار بھگائے گا۔''

چودھری: کیا رات کو تمہیں بھی دکھائی دی تھی۔

ہرناتھ: ہاں، میں تمہارے پاس ایک معاملے میں صلاح کرنے آیا تھا۔ جیوں ہی اندر قدم رکھا۔ وہ چڑیل طاق کے پاس کھڑی دکھائی دی، میں بدحواس ہو کر بھاگا۔

چودھری: اچھا پھر تو جاؤ۔

استری: کون؟ اب تو میں نہ جانے دوں چاہے کوئی لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ دے۔

ہرناتھ: میں آپ نہ جاؤں گا۔

چودھری: مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات کیا ہے؟

ہرناتھ: کیا جانے آپ سے ڈرتی ہوگی۔ آج کسی اوجھا کو بلانا چاہیے۔

چودھری: کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ماجرا ہے۔ کیا ہوا بیجو پانڈے کی ڈگری کا؟

ہرناتھ ان دنوں چودھری سے اتنا جلتا تھا کہ اپنی دکان کے بارے میں کوئی بات بھی ان سے نہ کہتا۔ آنگن کی طرف تاکتا ہوا جیسے ہوا سے بولا۔ ''جو ہونا ہوگا وہ ہوگا۔ میری جان کے سوا اور کوئی کیا لے لے گا۔ جو کھا گیا ہوں وہ تو اگل نہیں سکتا۔''

چودھری: کہیں اس نے ڈگری جاری کرادی تو۔

ہرناتھ: تو کیا دکان میں چار پانچ سو کا مال ہے وہ نیلام ہو جائے گا۔

چودھری: کاروبار تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔

ہرناتھ: اب کاروبار کے نام کو کہاں تک روتا ہوں۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا کہ کنواں بنوانے کی اتنی جلدی ہے تو یہ کام چھیڑتا ہی کیوں۔ روٹی دال تو پہلے بھی مل جاتی تھی۔ بہت ہوگا دو چار مہینے حوالات میں رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماتا نے کہا: ''جو تمہیں حوالات میں لے جائے اس کا منہ جھلس دوں۔ ہمارے جیتے جی تم حوالات میں جاؤ گے۔''

ہرناتھ نے فلاسفر بن کر کہا۔ ''ماں باپ جنم کے ساتھی ہوتے ہیں، کسی کے کرم کے ساتھی نہیں ہوتے۔''

چودھری کو بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر انہیں شک تھا کہ ہرناتھ روپے ہضم

کرنے کے لیے ٹال مٹول کر رہا ہے اسی لیے انہوں نے تقاضا کر کے روپے وصول کر لیے تھے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ہرناتھ کی جان سچ مچ مصیبت میں ہے۔ سوچا اگر لڑکے کو حوالات ہو گئی یا دکان پر قرقی آ گئی تو خاندان کی عزت دھول میں مل جائے گی۔ کیا ہرج ہے اگر گومتی کے روپے دے دوں۔ آخر دکان چلتی ہی ہے، کبھی نہ کبھی تو روپے ہاتھ میں آ ہی جائیں گے۔

یکایک کسی نے باہر سے پکارا ''ہرناتھ سنگھ''

ہرناتھ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

چودھری نے پوچھا ''کون ہے؟''

''قرقی کرنے والا امین۔''

''کیا دکان قرق کرنے آیا ہے؟''

''ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔''

''کتنے روپے کی ڈگری ہے؟''

''بارہ سو روپے کی۔''

''قرقی کرنے والا امین کچھ لے دے کے نہ ٹلے گا۔''

''ٹل تو جاتا پر مہاجن بھی تو اس کے ساتھ ہو گا۔ اسے جو کچھ لینا ہے ادھر سے لے چکا ہو گا۔''

''نہ ہو۔ بارہ سو روپے گومتی کے روپیوں میں سے دے دو۔''

''اس کے روپے کون چھوئے گا۔ نہ جانے گھر پر کیا آفت آئے۔''

''اس کے روپے کوئی ہضم تھوڑے ہی کیے لیتا ہے چلو میں دے دوں۔''

چودھری کو اس وقت ڈر ہوا کہیں وہ مجھے بھی دکھائی نہ دے لیکن ان کا شک بے بنیاد تھا۔ انہوں نے ایک تھیلی سے بارہ سو روپے نکالے اور دوسری تھیلی میں رکھ کر ہرناتھ کو دے دیے۔ شام تک ان دو ہزار روپیوں میں سے ایک روپیہ بھی نہ بچا۔

بارہ سال گزر گئے۔ نہ چودھری اب اس دنیا میں ہے اور نہ ہرناتھ چودھری جب تک زندہ رہے انہیں کنواں بنوانے کی فکر بنی رہی۔ یہاں تک کہ مرتے دم بھی ان کی زبان پر کنویں کی رٹ لگی ہوئی تھی لیکن دکان میں ہمیشہ روپیوں کی کمی رہی۔ چودھری کے مرتے ہی سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ ہرناتھ نے ایک آنہ روپے کے منافع سے مطمئن نہ ہو کر دگنے تگنے منافع پر ہاتھ مارا جو کھیلنا شروع کیا۔ سال بھر بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ دکان بند ہو گئی۔ گہنے پاتے برتن بھانڈے سب مٹی میں مل گئے۔

چودھری کی موت کے ٹھیک سال بھر بعد ہرناتھ نے بھی اس نفع نقصان کی دنیا سے کوچ کیا۔ ماتا کی زندگی کا اب کوئی سہارا نہ رہا۔ بیمار پڑی پر دوا دارو نہ ہو سکی۔ تین چار مہینے تک طرح طرح کے دکھ جھیل کر وہ بھی چل بسی۔ اب صرف بہو تھی اور وہ بھی حاملہ اس بیچاری کے لیے اب کوئی سہارا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مزدوری بھی نہ کر سکتی تھی۔ پڑوسیوں کے کپڑے سی کر اس نے کسی طرح پانچ چھے مہینے کاٹے۔ تیرے لڑکا ہو گا۔ ساری علامات لڑکے کی تھیں۔ یہی ایک زندگی کا سہارا تھا۔ جب لڑکی ہوئی تو وہ سہارا بھی جاتا رہا۔

ماں نے اپنا دل اتنا سخت کر لیا کہ نومولود بچے کو چھاتی بھی نہ لگاتی تھی۔ پڑوسیوں کے بہت سمجھانے بجھانے پر چھاتی سے لگایا پر اس کی چھاتی میں دودھ کی

ایک بوند بھی نہ تھی۔اس وقت بدنصیب ماں کے دل میں رحم اور ممتا کا ایک زلزلہ سا آ گیا۔اگر کسی طریقے سے اس کے سینے کی آخری بوند دودھ بن جاتی تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی۔

بچی کی یہ بھولی، معصوم قابل رحم اور پیاری صورت دیکھ کر ماں کا دل جیسے ہزاروں آنکھوں سے رونے لگا۔اس کے دل کی ساری نیک خواہشات، ساری آشیرواد، ساری محبت جیسے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس بچی کو اس طرح شرابور کر دیتے تھے جیسے چاند کی ٹھنڈی روشنی پھولوں کو نہلا دیتی ہے۔ پر اس بچی کی قسمت میں ماں کی محبت کے سکھ نہیں تھے۔ ماں نے کچھ اپنا خون، کچھ اوپر کا دودھ پلا کر اسے زندہ رکھا مگر اس حالت کی دن بدن پتلی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن لوگوں نے آ کر دیکھا تو وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی اور بچی اس کی چھاتی سے چپٹی ہوئی اس کے پستان کو چوس رہی تھی۔ دکھ اور غریبی کے مارے ہوئے جسم میں خون کہاں جس سے دودھ بنتا۔

وہی بچی پڑوسیوں کے رحم و کرم سے پل کر ایک دن گھاس کھودتی ہوئی اس مقام پر پہنچی جہاں بڑھیا گومتی کا گھر تھا۔چھپر کب کے زمین میں مل چکے تھے۔ صرف جہاں تہاں دیواریں کھڑی تھیں۔لڑکی نے جانے کیا سوچ کر کھرپی سے گڈھا کھودنا شروع کیا۔ دوپہر سے شام تک وہ گڈھا کھودتی رہی۔ نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ نہ کوئی خوف تھا نہ ڈر۔اندھیرا ہو گیا پر وہ جیوں کی تیوں بیٹھی گڈھا کھودتی رہی۔اس وقت کسان لوگ بھول کر بھی ادھر نہیں آتے تھے۔یہ لڑکی بے خوف بیٹھی زمین سے مٹی نکال رہی تھی۔ جب اندھیرا ہو گیا تو چلی گئی۔

دوسرے دن وہ بڑے سویرے اٹھی اور اتنی گھاس کھودی جتنی وہ کبھی دن بھر میں بھی نہیں کھودتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ اپنی کھانچی اور کھرپی لیے ہوئے پھر اسی جگہ پر پہنچی پر وہ آج اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو بچے اور بھی تھے۔ تینوں وہاں شام تک کنواں کھودتے رہے۔ لڑکی گڈھے کے اندر کھودتی تھی اور دونوں بچے مٹی نکال نکال کر پھینکتے تھے۔

تیسرے دن دو اور لڑکے بھی اس کھیل میں مل گئے۔ شام تک کھیل ہوتا رہا۔ آج گڈھا دو ہاتھ گہرا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیوں میں اس عجیب کھیل نے بے مثال حوصلہ بھر دیا تھا۔

چوتھے دن اور بھی کئی بچے آ ملے۔ صلاح ہوئی کون اندر جائے۔ کون مٹی اٹھائے گڈھا اب چار ہاتھ گہرا ہو گیا تھا پر ابھی تک بچوں کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔

ایک دن رات کو ایک کسان اپنی کھوئی ہوئی بھینس ڈھونڈتا ہوا اس کھنڈر میں آ پہنچا اندر مٹی کا اونچا ڈھیر۔ ایک بڑا سا گڈھا اور ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ دیکھا تو ڈر کر بھاگا۔

اوروں نے بھی آ کے دیکھا۔ کئی آدم تھے، کوئی ڈر نہ تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو بچی بیٹھی تھی۔

ایک آدمی نے پوچھا۔ ''ارے کیا تو نے یہ گڈھا کھودا ہے؟''

بچی نے کہا۔ ''ہاں۔''

''گڈھا کھود کر کیا کرے گی؟''

''یہاں کنواں بناؤں گی۔''

''کنواں کیسے بنائے گی؟''

جیسے اتنا کھودا ہے ویسے ہی اور کھودلوں گی۔گاؤں کے سب لڑکے کھیلنے آتے ہیں۔

''معلوم ہوتا ہے تو اپنی جان دے گی اور اپنے ساتھ اور لڑکوں کو بھی مارے گی خبردار جو کل سے گڈھا کھودا۔''

دوسرے دن اور لڑکے نہ آئے۔لڑکی بھی دن بھر مزدوری کرتی رہی لیکن شام کے وقت وہاں پھر چراغ جلا اور پھر وہ کھرپی ہاتھ میں لیے ہوئے وہاں بیٹھی دکھائی دی۔

گاؤں والوں نے اسے مارا پیٹا۔کوٹھری میں بند کیا پر وہ موقع پاتے ہی وہاں جا پہنچتی۔

گاؤں کے لوگ عام طور پر عقیدت مند ہوتے ہیں۔لڑکی کے اس روحانی لگاؤ نے آخر ان میں بھی لگاؤ پیدا کیا۔کنواں کھدنے لگا۔

ادھر کنواں کھد رہا تھا ادھر وہ بچی مٹی سے اینٹیں بناتی تھی۔اس کھیل میں سارے گاؤں کے لڑکے شریک ہوتے تھے۔اجالی راتوں میں جب سب لوگ سو جاتے تھے تب بھی وہ اینٹیں تھاپتی دکھائی دے جاتی۔نہ جانے اتنی لگن اس میں کہاں سے آ گئی تھی سات سال کی عمر والوں کے کان کاٹتی تھی۔

آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ کنواں بن گیا اور اس کی پکی جگت بھی تیار ہو گئی اس دن بچی اسی جگت پر سوئی۔آج اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔وہ گاتی تھی، چہکتی تھی۔

صبح کے وقت اس جگت پر صرف اس کی لاش ملی۔ اس دن سے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ وہی بڑھیا گومتی تھی اور اس کنویں کا نام ''پسنہاری کا کنواں'' پڑ گیا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

منتر

پہلی بار: ''زمانہ'' فروری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: ۱۹۳۰ء (پریم چالیسی، اول)

(۱)

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی اٹھائے ہوئے آتے دکھائی دیئے۔ عقب میں ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا آ رہا تھا۔ ڈولی دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے آ کر دروازہ پر پڑی چک میں سے جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اسے خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کوئی جھڑک نہ دے۔ ڈاکٹر صاحب کو میز کے قریب کھڑے دیکھ کر بھی اسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''حضور! بڑا غریب آدمی ہوں۔ میرا لڑکا کئی روز...........''

ڈاکٹر صاحب نے سگار سلگا کر جواب دیا۔ ''کل صبح آؤ۔ کل صبح، ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔''

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ دوہائی سرکار کی۔ لڑکا مر جائے گا۔ حضور چار دن سے آنکھیں نہیں کھولیں؟

ڈاکٹر چڈھا نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی محض دس منٹ باقی تھے۔ گولف اسٹک کھونٹی سے اتارتے ہوئے بولے۔

''کل سویرے آنا۔ کل سویرے۔ یہ ہمارے کھیلنے کا وقت ہے۔''

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا۔ حضور ایک نگاہ ڈال دیں۔ محض ایک نگاہ لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ حضور! کئی لڑکوں میں سے یہی ایک بچ رہا ہے۔ حضور ہم دونوں آدمی رو رو کر مر جائیں گے۔ سرکار کا اقبال بڑھے.........دین بندھو۔

ایسے ناگوار اور ناسمجھ دیہاتی تقریباً روز ہی آیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے کوئی کتنا ہی کیوں نہ کہے وہ اپنی رٹ لگائے جائیں گے۔ کسی کی سنیں گے نہیں۔ آہستگی سے چک اٹھا کر موٹر کی طرف بڑھے۔ بوڑھا ان کے پیچھے یہ کہتا ہوا لپکا۔ سرکار بڑا اکرم ہوگا۔ حضور رحم کیجیے بڑا بے بس اور دکھی ہوں دنیا میں اور کوئی نہیں ہے بابو جی۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف منہ گھما کر دیکھا تک نہیں موٹر میں بیٹھ کر بولے۔ ''کل صبح آنا۔''

موٹر چلی گئی۔ بوڑھا کئی منٹ تک تصویر کی طرح ساکن کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تفریح کے لیے دوسروں کی زندگی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ شاید اس پر اب بھی اسے وشواش نہ ہوتا تھا۔ مہذب دنیا اس قدر سنگ دل اور بے حس ہے۔ اسی کا ایسا تعجب انگیز احساس اسے اب تک نہ ہوا تھا۔ وہ پرانے زمانے کے ان لوگوں میں سے تھا جو لگی ہوئی آگ کو بجھانے مردے کو کندھے دینے کسی

کے چھپر کو اٹھانے اور کسی جھگڑے کو مٹانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جب تک موٹر بوڑھے کی نظروں میں رہی وہ وہیں کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ شاید اسے اب بھی ان کے لوٹ آنے کی امید تھی۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ ڈولی جدھر سے آئی تھی ادھر ہی چلی گئی۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر وہ ڈاکٹر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہاں سے ناامید ہو کر وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ ماتھا پیٹ کر رہ گیا تھا۔

اسی رات اس کا ہنستا کھیلتا سات برس کا بچہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بوڑھے ماں باپ کی زندگی کا یہی سہارا تھا۔ اسی کا منہ دیکھ کر وہ زندہ تھے۔ اس چراغ کے گل ہوتے ہی زندگی کی تاریک رات سنسناہٹیں سی آ گئیں بڑھاپے کی تند محبت ٹوٹے ہوئے دل سے نکل کر اس تاریکی میں بلک بلک کر رونے لگی۔

(۲)

کئی برس گزر گئے۔ ڈاکٹر چڈھا نے دولت کے ساتھ عزت بھی پائی اور اپنی صحت کی سختی سے حفاظت کی جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہ ان کی باقاعدہ زندگی کا ہی نتیجہ تھا کہ 50 برس کی عمر میں ان میں پھرتی ایک نوجوان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ ان کا ہر کام وقت کا پابند تھا۔ اس پابندی سے وہ ذرہ بھر بھی پرے نہ ہٹتے۔ عام طور پر لوگ صحت کے اصولوں کی پیروی اس وقت کرتے ہیں۔ جب وہ بیمار ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے عام اصولوں کا بھید اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کی اولاد

بھی اس قانون کے تحت تھی۔ ان کے محض دو بچے ہوئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ تیرا بچہ نہ ہوا اس لیے شریمتی چڈھا بھی ابھی جوان نظر آتی تھیں۔ لڑکی کی شادی ہو چکی تھی لیکن لڑکا ابھی کالج ہی میں پڑھتا تھا۔ وہی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھا۔ طبیعت میں انتہائی سکون شرافت کا پتلا، بے حد باذوق اور فیاض، یونیورسٹی کا عزیز ترین طالب علم، نوجوان طبقہ کا محبوب رکن۔ جب بات کرتا تو جیسے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ہری بھری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف اور کالج کے لڑکے دوسری طرف بیٹھے کھانا تیار کر رہے تھے۔ بجلی کے قمقموں سے میدان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تفریح کا تمام سامان بھی موجود تھا۔ چھوٹا سا مزاحیہ ڈرامہ کھیلنے کی تیاری بھی ہو رہی تھی۔

کھیل خود کیلاش ناتھ نے لکھا تھا۔ نمایاں کردار بھی وہی تھا۔ اس وقت وہ ایک ریشمی قمیض پہنے، ننگے سر، ننگے پاؤں ادھر ادھر دوستوں کی آؤ بھگت میں مشغول تھا۔ کوئی پکارتا۔ کیلاش ذرا ادھر آنا۔ کوئی ادھر سے بلاتا۔ کیلاش، کیلاش کیا ادھر ہی رہو گے سبھی اسے چھیڑتے مذاق کرتے تھے۔ بے چارے کو دم مارنے تک کو فرصت نہ ملتی تھی۔

اچانک ایک حسینہ نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''کیوں کیلاش! تمہارے سانپ کہاں ہیں۔ ذرا مجھے دکھاؤ تو۔''

کیلاش نے اس سے مصافحہ کر کے کہا۔ ''مرنالنی! اس وقت معاف کرو کل دکھا دوں گا۔''

مرنالنی نے اصرار کر کے کہا۔ ’’جی نہیں! تمہیں دکھانا پڑے گا۔ میں آج ماننے کی نہیں۔ تم ہر روز کل کل کرتے رہتے ہو۔‘‘

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے۔ اور ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار۔ کیلاش کو سانپوں کو پالنے، کھلانے اور نچانے کا بڑا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے۔ ان کی فطرت اور رہن سہن کا مطالعہ گہری نظر سے کیا کرتا تھا.........تھوڑے دن ہوئے انہوں نے کالج میں سانپوں پر ایک معرکتہ الآرا تقریر کی تھی۔ سانپوں کے رقص کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس موضوع کے بڑے بڑے عالم بھی یہ مضمون سن کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ یہ فن اس نے ایک معمر سپیرے سے حاصل کیا تھا۔ سانپوں کی جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے کا اسے جنون تھا۔ محض اس قدر اطلاع مل جانے پر کہ آدمی کے پاس کوئی جڑی ہے اسے چین نہ آتا تھا۔ وہ اسے حاصل کر کے ہی دم لیتا تھا۔ یہی ایک عیب تھا جس پر ہزار ہا روپے خرچ کر چکا تھا۔ مرنالنی کئی مرتبہ آ چکی تھی۔ لیکن کبھی سانپوں کو دیکھنے کے لیے اس قدر مصر نہ ہوئی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعی اس کا اشتیاق اس قدر شدید ہو گیا تھا۔ یا وہ محض کیلاش پر اپنے حقوق کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت یکسر بے موقع تھی۔ اس کوٹھری میں کتنی بھیڑ لگ جائے گی۔ ہجوم کو دیکھ کر سانپ کس قدر چونکیں گے اور رات کو انہیں چھیڑنا کتنا برا لگے گا۔ ان باتوں پر اس نے ذرا بھی غور نہ کیا۔

کیلاش نے کہا۔ ’’نہیں کل ضرور دکھا دوں گا۔ اس وقت عمدگی سے دکھا بھی تو نہ سکوں گا۔ کمرے میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہے گی۔‘‘

ایک صاحب چھیڑ کر بولے۔ ''دکھا کیوں نہیں دیتے! اتنی سی بات کے لیے اتنی ٹال مٹول کر رہے ہو۔ مس گوبند! ہرگز نہ ماننا۔ دیکھیں کیوں کر نہیں دکھاتے۔''

دوسرے مہاشہ اور بھی طنز سے بولے۔ ''مس گوبند اس قدر معصوم اور سادہ دل ہیں۔ سبھی اس قدر مذاق کرتے ہیں۔ کوئی اور ہوتی تو اب تک اس بات پر بگڑ چکی ہوتیں۔''

تیسرے صاحب مذاق اڑا کر بولے۔ ''اجی تعلقات قطع کر لیتیں۔ بھلا کوئی بات ہے یہ بھی اس پر دعویٰ ہے کہ مرنالنی کے لیے جان تک حاضر ہے۔''

مرنالنی نے دیکھا کہ سبھی مل جل کر اسے بنا رہے ہیں تو بولی۔

''آپ لوگ میری وکالت نہ کریں۔ میں خود اپنی وکالت کر لوں گی۔ میں اس وقت سانپوں کا تماشا نہیں دیکھنا چاہتی چلو چھٹی ہوئی۔''

ایک دوست نے مذاق اڑایا۔ ''دیکھنا تو آپ سب کچھ چاہیں لیکن کوئی دکھائے بھی تو۔''

کیلاش کو مرنالنی کی اتری اور بدلی ہوئی شکل دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس کا یہ انکار اسے انتا برا معلوم ہو رہا ہے۔ جیوں ہی پریتی بھوجن ختم ہو کر گانا شروع ہوا۔ اس نے مرنالنی اور دوسرے دوستوں کو سانپوں کے ڈربے کے سامنے لے جا کر ڈگڈگی بجانا شروع کر دیا۔ پھر ایک خانہ کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ کمال تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات اس کے دل کا ہر ایک جذبہ سمجھتے ہیں۔ کسی کو اٹھا لیا۔ کسی کو گردن میں حمائل کر لیا۔ کسی کو ہاتھ میں

لپیٹ لیا۔ مرنالنی ہر مرتبہ منع کرتی کہ انہیں گلے میں مت ڈالو۔ دور سے ہی دکھا دو۔ بس ذرا نچا دو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹے دیکھ کر اس کی جان ہی نکلی جا رہی تھی۔ پچھتا رہی تھی کہ میں نے خواہ مخواہ انہیں سانپ دکھانے کو کہا۔ لیکن کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ محبوب کے سامنے اپنے اس فن کی نمائش کا ایسا موقع پا کر وہ کب چوکتا تھا۔ ایک دوست سے کہا۔

''دانت تو توڑ ڈالے ہوں گے۔''

کیلاش نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دانت توڑ ڈالنا مداریوں کا کام ہے۔ کسی کے دانت نہیں توڑے گئے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ ''میرے پاس اس سے بڑھ کر اور زہریلا سانپ کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو آدمی چشم زدن میں مر جائے، ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ ملے۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اگر کہو تو اس کے دانت دکھا دوں۔''

مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''نہیں نہیں کیلاش! ایشور کے لیے اسے چھوڑ دو۔ تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ اس پر ایک دوست بولے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ لیکن تم کہتے ہو تو مان لوں گا۔''

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ ''نہیں صاحب! آپ آنکھوں سے دیکھ کر ہی دم لیں۔ دانت توڑ کر بس میں کیا تو کیا کیا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے۔ اگر اسے وشواس ہو جائے کہ اس آدمی سے اسے کوئی نقصان کا احتمال نہیں تو وہ اسے کبھی نہ کاٹے گا۔''

مرنالنی نے جب یہ دیکھا کہ کیلاش کے سر پر بھوت سوار ہے تو اس نے مظاہرہ

ختم کردینے کے ارادے سے کہا۔

''اچھا بھئی اب یہاں سے چلو۔ دیکھو گانا شروع ہو گیا ہے۔ میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔''

یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا شانہ پکڑ کر اسے چلنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل گئی۔ لیکن کیلاش تو مخاطب لوگوں کا وہم دور کر کے دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ اس کا منہ سرخ ہو گیا اور جسم کی تمام رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اس کے ہاتھوں کبھی ایسا سلوک نہ دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ اسے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی حفاظت کے لیے مستعد ہو گیا۔ کیلاش نے اس کی گردن خوب دبا کر اس کا منہ کھول دیا۔ اور اس کے زہریلے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ ''جن دوستوں کو شک ہو آ کر دیکھ لیں۔ یقین آیا یا اب بھی کچھ شک ہے۔''

احباب نے آ کر اس کے دانت دیکھے اور متعجب رہ گئے، ٹھوس ثبوت کے سامنے شک و شبہ کی گنجائش کہاں۔ دوستوں کے شکوک کا ازالہ کرنے کے بعد اس نے سانپ کی گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے زمین پر رکھنا چاہا۔ لیکن وہ کالا سانپ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ گردن نرم پڑتے ہی اس نے کیلاش کی انگلی پر لپک کر زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ انگلی سے ٹپ ٹپ لہو ٹپکنے لگا۔ پوری قوت سے انگلی دبا کر کیلاش اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہاں میز کی دراز میں ایک جڑی پڑی تھی۔ جسے پیس کر لگا دینے سے سمِ قاتل بھی دور ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں ہل

چل مچ گئی۔ باہر محفل میں اطلاع پہنچی اور ڈاکٹر صاحب گھبرا کر دوڑے۔ فوراً انگلی کی جڑ کس کر باندھی گئی۔ اور جڑی پینے کے لیے دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب جڑی کے قائل نہ تھے۔ وہ انگلی کا ڈسہ ہوا نشتر سے کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیلاش کو جڑی پر مکمل وشواس تھا۔ مرنالنی پیانو پر بیٹھی تھی۔ خبر ملتے ہی دوڑی آئی، اور کیلاش کی انگلی سے ٹپکتے لہو کو رومال میں جذب کرنے لگی۔ جڑی پیسی جانے لگی۔ لیکن اس ایک لمحہ میں کیلاش کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ ہونٹوں پر زردی پھیل گئی۔ یہاں تک کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ فرش پر بیٹھ گیا۔ سارے مہمان کمرے میں جمع ہونے لگے۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ، اتنے میں جڑی پس کر آ گئی۔ مرنالنی نے انگلی پر لیپ کیا۔ ایک منٹ اور گزرا اور کیلاش کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ لیٹ گیا اور ہاتھ سے ہوا کرنے کا اشارہ کیا۔ ماں نے دوڑ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور میز کا برقی پنکھا لگا دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے جھک کر پوچھا۔ ''کیلاش کیسی طبیعت ہے؟''

کیلاش نے آہستگی سے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ مرنالنی نے رونی آواز میں کہا۔ ''کیا یہ جڑی کچھ اثر نہیں کرے گی۔''

ڈاکٹر صاحب نے سر تھام کر کہا۔ ''کیا بتاؤں میں اس کی باتوں میں آ گیا اب تو نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔''

نصف گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ کیلاش کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اور چہرہ ماند پڑ گیا۔ نبض کا کہیں پتہ نہ تھا۔ موت کے سبھی آثار نظر آ رہے تھے۔ گھر میں کہرام مچ

گیا۔ ایک طرف مرنالنی سر پیٹنے لگی۔ دوسری طرف ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی۔ ڈاکٹر چڈھا کو احباب نے تھام لیا۔ نہیں تو وہ اپنی گردن میں نشتر اتار لیتے۔

ایک صاحب بولے۔ ''کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو عین ممکن ہے کہ اب بھی بچ جائے۔''

ایک مسلمان نے اس کی تائید کی۔ ''ارے صاحب قبر میں پڑی ہوئی لاشیں زندہ ہوگئیں۔ ایسے ایسے باکمال لوگ موجود ہیں یہاں۔''

ڈاکٹر چڈھا بولے۔ ''میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا کہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا تھا کہ بیٹا سانپ نہ پالو مگر کون سنتا تھا۔ بلائیے کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو ہی بلا لیجیے۔ میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی تمام جائیداد اس کے قدموں پر رکھ دینے کو تیار ہوں۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا۔ لیکن میرا کیلاش میرا عزیز کیلاش جی اٹھے۔ بھگوان کے لیے کسی کو بلائیے۔''

ایک صاحب کی کسی جھاڑنے والے سے جان پہچان تھی۔ دوڑ کر اسے بلا لائے۔ لیکن کیلاش کی شکل دیکھ کر اسے منتر چلانے کی جرأت نہ ہوئی۔

وہ بولا۔ ''اب کیا ہو سکتا ہے سرکار۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔''

ارے احمق! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا؟ مرنالنی کی آرزوؤں کی تکمیل کہاں ہوئی۔ دل کے وہ حسین خواب جس سے زندگی مسرتوں اور قہقہوں سے بھرپور تھی۔ کہاں پورے ہوئے۔ زندگی کے رقصاں سمندر میں دل کی خوشی لوٹتے ہوئے کیا اس نیا کو پانی

نے نگل لیا۔ جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہی ہرا بھرا امیدان تھا۔ وہ نشیلی روشن چاندنی ایک خاموش سنگیت کی طرح ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی احباب کا جم غفیر تھا۔ وہ ہی عیش و نشاط کے سامان تھے۔ لیکن جہاں ترنم قہقہے گونجتے تھے وہاں اب درد و کرب اور آنسوؤں کا دور دورہ تھا۔

(۳)

شہر سے کئی میل دور ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بوڑھا اور بڑھیا انگیٹھی کے سامنے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ بوڑھا ناریل پیتا اور بیچ بیچ میں کھانستا بھی جاتا تھا۔ بڑھیا دونوں گھٹنوں میں سر دیئے آگ کی طرف تاک رہی تھی۔ مٹی کے تیل کی ایک کپی طاق پر جل رہی تھی۔ گھر میں نہ چارپائی تھی نہ بچھونا۔ ایک کنارے میں تھوڑی سی پیالیاں پڑی تھی۔ اس کوٹھری میں ایک چولہا تھا۔ بڑھیا دن بھر سوکھی لکڑیاں اور اپلے چنتی تھی۔ بوڑھا رسی بنا کر شہر میں فروخت کر آتا تھا۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ انہیں نہ کسی نے روتے دیکھا نہ ہنستے۔ ان کا تمام وقت زندہ رہتے کٹ جاتا تھا۔ موت دروازے پر کھڑی تھی۔ رونے یا مسکرانے کی فرصت کہاں۔

بڑھیا بولی۔ ''کل کے لیے سن تو ہے نہیں۔ کام کیا کرو گے؟''

''جا کر جھگرو شاہ سے دس بیس سیر سن ادھار لاؤں گا۔''

''اس کے سابقہ دام تو دیئے نہیں اور ادھار کیوں کر دے گا۔''

''نہ دے گا نہ سہی۔ گھاس تو کہیں نہیں گئی۔ دوپہر تک کیا دو آنے کی گھاس نہ کاٹ سکوں گا۔''

اتنے میں ایک آدمی نے آ کر آواز دی۔ ''بھگت بھگت کیا سو گئے ذرا کواڑ تو کھولو۔''

بھگت نے اٹھ کر کواڑ کھول دیے۔ ایک آدمی نے اندر آ کر کہا۔

''کچھ سنا؟ ڈاکٹر چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ کھایا۔''

بھگت نے چونک کر کہا۔ ''چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نہ چو چھاؤنی کے بنگلے میں رہتے ہیں............؟''

''شہر بھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو، جاؤ آدمی بن جاؤ گے۔''

بوڑھے نے سخت لہجے میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں نہیں جاتا۔ میری بلا جائے وہی چڈھا ہیں خوب جانتے ہیں۔ بھیا کو انہیں کے پاس لے کر گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پاؤں پر گرا تھا کہ ایک نظر دیکھ لیجیے۔ لیکن سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے ہیں۔ اب جان پڑے گا کہ بیٹے کا غم کیسا ہوتا ہے۔ اور کئی لڑکے ہیں۔''

''نہیں جی۔ یہی تو ایک لڑکا تھا۔ سنا ہے سب نے جواب دے دیا ہے۔''

''بھگوان بڑا کارساز ہے۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تیر آئے تھے۔ لیکن انہیں ذرا بھی رحم نہ آیا............ میں تو ان کے دروازے پر ہوتا تو بھی بات نہ پوچھتا۔''

''تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے سنا تھا تم سے آ کر کہہ دیا۔''

''اچھا کیا.........اچھا کیا۔ کلیجہ شانت ہو گیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ لڑکا بھی سرد ہو گیا ہو گا۔ تم جاؤ۔ آج سکھ کی نیند سوؤں گا (بڑھیا سے) ذرا تمبا کو لے لے ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہو گا لالہ کو ساری صاحبی نکل جائے گی۔ ہمارا کیا ہوا۔ لڑکے کے مر جانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ جہاں چھ بچے چلے گئے ایک اور گیا تو کیا ہوا؟ تمہارا تو راج سونا ہو گیا۔ اسی کے لیے سب کا گلا دبا دبا کر جمع کیا تھا اب کیا کرو گے؟ ایک بار تو دیکھنے جاؤں گا لیکن کچھ دن بعد طبیعت کا حال پوچھوں گا۔''

''آدمی چلا گیا۔ بھگت نے کواڑ بند کر لیے اور چلم پر تمبا کو رکھ کر پینے لگا۔ بڑھیا نے کہا۔ اتنی رات گئے جاڑے میں کون جائے گا۔''

''ارے دوپہر ہوتی تو بھی نہ جاتا۔ سواری دروازے پر لینے آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا۔ پنا کی صورت اب بھی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اس بے رحم اور سنگ دل نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہیں بچے گا۔ خوب جانتا تھا۔ چڑھا بھگوان نہیں تھے کہ ان کے ایک نظر دیکھ لینے سے امرت برس پڑے گا محض دل کا وہم تھا۔ ذرا تسلی ہو جاتی۔ بس اسی لیے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی روز جاؤں گا اور پوچھوں گا۔ کیوں صاحب! کہیے کیسے رنگ ہیں۔ دنیا برا کہے گی کہے کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہیں۔ بڑوں میں کوئی خامی نہیں ہوتی۔ دیوتا ہوتے ہیں۔''

بھگت کے لیے زندگی میں یہ اولین موقع تھا کہ ایسی خبر پا کر وہ خاموش بیٹھا رہا ہو۔ ۶۰ برس کی زندگی میں ایسا کبھی نہ ہوا کہ سانپ کی خبر پا کر وہ دوڑا نہ گیا ہو۔

پوہ ماگھ کی اندھیری رات چیت بیساکھ کی دھوپ اور ساون بھادوں کے سیلاب زدہ ندی نالے۔ کسی کی اس نے پروا نہ کی تھی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا بے لوث اور بے مدعا۔ لینے دینے کا جذبہ کبھی دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ ایک نیک کام تھا۔ وہاں مایوس آدمیوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کی تھی۔ لیکن آج وہ گھر سے قدم نہیں نکال سکا۔ یہ اطلاع پا کر بھی سونے جا رہا تھا۔

بڑھیا نے کہا۔ ''تمبا کو انگیٹھی کے قریب رکھی ہوئی ہے۔ اس کے بھی آج اڑھائی پیسے ہو گئے ہیں دیتی ہی نہ تھی۔''

بڑھیا یہ کہہ کر لیٹ گئی۔ بوڑھے نے کپی گل کی۔ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ گیا۔ آخر میں لیٹ گیا۔ لیکن وہ خبر اس کے سینے پر ایک بوجھ سا بن کر موجود تھی۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ جیسے کوئی اس کے دل میں بیٹھا اسے گھر سے نکلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ بڑھیا تھوڑی دیر میں ہی خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے باتیں کرتے کرتے سوتے ہیں۔ اور ذرا سی آہٹ پا کر ہی جاگ اٹھتے ہیں۔ تب بھگت اٹھا اپنی لکڑی اٹھائی اور آہستہ سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا کی نیند کھل گئی۔ اس نے جلدی سے پوچھا ''کہاں جاتے ہو؟''

''کہیں نہیں، دیکھتا تھا کہ کتنی رات باقی ہے۔''

''ابھی بہت رات باقی ہے سو جاؤ۔''

''نیند نہیں آتی۔''

''نیند کاہے کو آئے گی دل تو چڈھا کے گھر کے اردگرد گھوم رہا ہے۔''

''اس نے کون سی نیکی کی ہے جو اس کے ہاں جاؤں وہ آ کر پاؤں پر گرے تو

بھی نہ جاؤں..........''

''اٹھے تو اسی ارادے سے ہو۔''

''نہیں ری! ایسا احمق میں بھی نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے دے اسی کے لئے پھول بوتا پھروں۔''

بڑھیا پھر سوگئی۔ بھگت نے کواڑ بند کر دیے اور پھر آ کر بیٹھا لیکن اس کی حالت بالکل ویسے ہی تھی۔ جیسے اپدیش سننے والوں کی باجا کی آواز کان میں پڑنے پر ہوتی ہے۔ آنکھ چاہے اپدیشک کی طرف ہی ہو۔ لیکن کان باجے پر لگے رہتے ہیں۔ دل میں بھی یہی آواز گونجتی رہتی ہے۔ بے رحم سلوک کا احساس بھگت کے لیے اپدیشک تھا۔ لیکن دل بدقسمت نوجوان کی طرف جھک رہا تھا۔ جو اس وقت مر رہا تھا جس کے لیے ایک ایک پل کے تاخیر بھی تباہ کن اور ہولناک ثابت ہو گی۔ اس نے پھر کواڑ کھولے اس آہستگی سے کہ بڑھیا کو بھی خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل کر اسی وقت گاؤں کا چوکیدار گشت لگا رہا تھا۔ بولا۔

''کیسے اٹھے بھگت؟ آج تو بہت سردی ہے کہیں جا رہے ہو کیا؟''

بھگت نے کہا۔''نہیں جی جاؤں گا کہاں۔ دیکھتا تھا۔ ابھی کتنی رات باقی ہے بھلا وقت کیا ہو گا۔''

''ایک بجا ہو گا۔ اور کیا ابھی تھانے سے آ رہا تھا تو دیکھا کہ ڈاکٹر چڈھا بابو کے بنگلہ پر بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہو گا۔ کیڑے نے چھو لیا ہے۔ چاہے مر بھی گیا ہو۔ تم چلے جاؤ تو شاید بچ جائے گا دس ہزار دینے کو تیار ہیں۔''

میں نہ جاؤں گا۔ خواہ دس لاکھ بھی دے مجھے دس ہزار یا دس لاکھ لے کر کرنا بھی کیا ہے۔ کل مر جاؤں گا۔ پھر کون بھوگنے والا بیٹھا ہے۔

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے پاؤں آگے بڑھائے۔ جیسے نشے میں انسان کا جسم اس کی روح سے باغی ہو جاتا ہے۔ اس کے بس میں نہیں رہتا۔ پاؤں کہیں رکھتا ہے اور پڑتا کہیں ہے۔ کہتا کچھ ہے اور زبان سے نکلتا کیا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت بھگت کی تھی۔ دل میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ انتقام تھا۔ جوابی عمل کی آگ روشن تھی۔ لیکن عمل دل کے قابو میں نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار کو حرکت نہیں دی وہ ارادہ کرنے پر بھی اسے نہیں چلا سکتا۔ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ اٹھتے ہی نہیں۔

بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا جا رہا تھا۔ احساس روکتا تھا۔ جذبہ اڑائے لیے جا رہا تھا۔ خادم آقا پر فوقیت حاصل کر کے قابض تھا۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد اچانک بھگت بہک گیا اور ہنسا انتقام نے فرض پر غلبہ پا لیا۔ میں یونہی اتنی دور چلا۔ اس سردی اور تاریکی میں بے مقصد ہی اتنی دور آ گیا۔ مجھے جان مارنے کی کیا پڑی ہے؟ آرام سے سویا کیوں نہ رہا۔ نیند نہ آئی نہ سہی۔ دو چار بھجن ہی گاتا یوں ہی یہاں تک دوڑ آیا۔ چڈھا کا لڑکا رہے یا مرے۔ میری بلا سے۔ میرے ساتھ انہوں نے ایسا کون سا اچھا سلوک کیا تھا کہ میں ان کے لیے مروں! دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں۔ ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے کیا واسطہ؟

لیکن انتقام نے ایک دوسرا رخ اختیار کیا۔ جو ہنسا سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ وہ بھاڑ جھونکنے نہیں جا رہا۔ وہ تو دیکھے گا کہ بڑے لوگ بھی چھوٹوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر لیتے ہیں۔ بدلہ لینے کے جذبہ کو تسکین دیتا ہوا اس طرح وہ آگے بڑھنے

لگا۔

اتنے میں دو آدمی آتے دکھائی دیئے دونوں باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ چڑھا بابو کا گھر اجڑ گیا۔ یہی تو ایک لڑکا تھا۔ بھگت کے کانوں میں آواز پڑی۔ اس کی چال پھر تیز ہو گئی۔ تکان کے مارے پاؤں نہ اٹھتے تھے۔

اس قدر جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح وہ کوئی دس منٹ تک چلا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھی۔ لیکن سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رونے پیٹنے کی آواز بھی نہ آئی تھی۔ بھگت کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے کہیں بہت دیر تو نہیں ہو گئی۔ اپنی عمر میں وہ اس قدر تیز کبھی نہ دوڑا ہو گا۔ یہی معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے عقب میں موت دوڑی آ رہی ہے۔

(۴)

دو بج رہے تھے۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ رونے والوں میں محض آکاش کے تارے رہ گئے تھے اور سبھی رو رو کر تھک گئے تھے۔ بڑی بے تابی سے لوگ رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کسی طرح صبح ہو۔ اور راش کو گنگا کی آغوش میں بہا دیا جائے۔

اچانک بھگت نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ ڈاکٹر صاحب سمجھے کوئی مریض آیا ہے۔ کسی اور دن انہوں نے اس آدمی کو لوٹا دیا تھا۔ لیکن آج وہ باہر

آئے دیکھا ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہے۔ کمر جھکی ہوئی۔ پوپلا منہ۔ بھویں تک سفید ہوگئی تھیں۔ لکڑی کے سہارے کانپ رہا تھا۔ بڑی نرمی سے بولے۔

''کیا ہے بھائی! آج تو ہم پر مصیبت آ پڑی ہے۔ کچھ کہتے نہیں بنتا پھر کسی وقت آنا ادھر ایک مہینہ تک تو شاید میں کسی مریض کو نہ دیکھ سکوں گا۔''

بھگت نے کہا۔ ''سن چکا ہوں بابو جی! اسی لیے تو آیا ہوں، بھیا کہاں ہیں ذرا مجھے بھی دکھا دیجیے۔ بھگوان بڑا کارساز ہے۔ مردے کو بھی جلا سکتا ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آجائے۔''

چڈا نے بے قرار لہجہ میں کہا ''چلو دیکھ لو لیکن تین چار گھنٹے ہو گئے، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بہتیرے جھاڑنے پھونکنے والے دیکھ کر لوٹ گئے۔''

صاحب کو امید تو کیا ہوتی۔ ہاں بوڑھے پر دیا آ گئی۔ اندر لے گئے۔ بھگت نے لاش کو دو منٹ دیکھا۔ تب مسکرا کر بولا۔

''ابھی کچھ نہیں بگڑا بابو جی! نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بھیا اٹھ بیٹھیں گے۔ آپ ناحق دل چھوٹا کر رہے ہیں ذرا کہاروں سے کہیئے پانی تو بھریں۔''

کہاروں نے پانی بھر بھر کر کیلاش کو نہلانا شروع کیا۔ پائپ بند ہو گیا تھا۔ کہاروں کی زیادہ تعداد نہ تھی اس لیے مہمانوں نے احاطہ کے بیرونی کنویں سے پانی بھر بھر کر انہیں دینا شروع کر دیا۔ مرنالنی برتن لیے پانی لا رہی تھی۔ بوڑھا بھگت مسکرا مسکرا کر منتر پڑھ رہا تھا۔ جیسے کامیابی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جب وہ ایک منتر ختم کرتا تو جڑی نکال کر سنگھا دیتا۔ اس طرح نہ جانے کتنے گھڑے کیلاش پر ڈالے گئے۔ اور نہ جانے کتنی مرتبہ بھگت نے منتر پھونکا۔ آخر آکاش

نے جب اپنی لال لال آنکھیں کھولیں تو کیلاش کی بھی لال لال آنکھیں کھل گئیں۔ایک لمحہ میں ہی اس نے انگڑائی لی اور پینے کا پانی مانگا۔

ڈاکٹر چڈھا نے دوڑ کر اپنی بیوی نارائنی کو گلے لگا لیا۔نارائنی دوڑ کر بھگت کے پاؤں پر گر پڑی۔اور مرنالنی کیلاش کے سامنے آنسوؤں سے آنکھیں تر کر کے بولی اب کیسی طبیعت ہے۔

ایک ہی لمحہ میں یہ خبر ہر طرف منتشر ہو گئی۔احباب مبارکباد دینے آنے لگے۔ڈاکٹر صاحب ہر ایک کے سامنے انتہائی عقیدت سے بھگت جی کا تذکرہ کر رہے تھے۔سبھی لوگ بھگت کے درشنوں کے لیے بیتاب ہو اٹھے۔لیکن اندر جا کر دیکھا تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔نوکروں نے کہا۔"ابھی تو یہیں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ہم لوگ تمباکو نکال کر دینے لگے تو نہیں لی۔اپنی نکال کر چلم سلگائی۔"

یہاں تو بھگت کی چاروں طرف تلاش ہونے لگی اور ادھر بھگت لپکا ہوا گھر جا رہا تھا کہ بڑھیا کے بیدار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔

جب مہمان چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے نارائنی سے کہا۔

بوڑھا نہ جانے کہاں چلا گیا۔ایک چلم تمباکو کا بھی روادار نہ ہوا۔

نارائنی نے کہا۔"میں نے تو سوچا تھا کہ اسے کوئی بہت بڑی رقم نذر کروں گی۔"

ڈاکٹر چڈھا بولے۔"رات کو تو میں نے نہیں پہچانا۔لیکن ذرا صاف ہونے پر میں اسے پہچان گیا تھا۔ایک بار یہ ایک مریض لے کر آیا تھا۔مجھے اب یاد آتا ہے کہ میں اس وقت کھیلنے جا رہا تھا اور مریض کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔آج اس روز کی بات یاد کر کے مجھے اس قدر کوفت اور خجالت ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر

سکتا۔ میں اب اسے کھوجوں گا اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگوں گا۔ وہ کچھ لے گا نہیں۔ یہ میں جانتا ہوں اس کا جنم لیش کی بارش کرنے کے لیے ہی ہوا ہے۔ اس کے خلوص نے ایسا مجھے آدرش دکھایا ہے جو زندگی بھر میری نظروں میں رہے گا۔''

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خودی

پہلی بار: کتابی صورت میں، ''خاک پروانہ'' اور ''خواب وخیال''
دونوں مجموعوں میں ایک ساتھ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔
اس سے پہلے کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں۔

(۱)

منی جس وقت دلدار نگر میں آئی۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ ماں باپ دونوں مر گئے یا نامعلوم کہیں پردیس چلے گئے تھے۔ منی صرف اتنا جانتی تھی کہ کبھی ایک دیوی اسے کھلایا کرتی تھی۔ اور ایک دیوتا اسے کندھے پر لے کر کھیتوں کی سیر کرایا کرتا تھا۔ پر ان باتوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتی تھی، گویا اس نے خواب دیکھا ہو۔ خواب تھا یا واقعہ اس کا اسے علم نہ تھا۔ جب کوئی پوچھتا تیرے ماں باپ کہاں گئے تو وہ بے چاری کوئی جواب دینے کے بجائے رونے لگتی اور یوں ہی سوالوں کو ٹالنے کے لئے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر کہتی۔ اوپر، کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی۔ وہاں، اس اوپر، اور وہاں سے اس کا مطلب کیا تھا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید منی کو یہ خود ہی معلوم نہ تھا۔ بس ایک دن لوگوں نے اسے ایک پیڑ کے نیچے کھیلتے دیکھا اور اس سے زیادہ اس کی بابت کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی، جو اسے دیکھتا موہ جاتا۔ اسے کھانے پینے کی

کچھ فکر نہ رہتی تھی۔ جب کوئی بلا کر کچھ دیتا، وہیں کھا لیتی اور پھر کھیلنے لگتی۔ شکل و صورت سے وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ غریب سے غریب گھر میں بھی اس کے کھانے کے دو لقمے اور سونے کے لیے ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کی کمی نہ تھی۔ وہ سب کی تھی، اس کا کوئی نہ تھا۔

اس طرح کچھ دن بیت گئے۔ منی اب کچھ کام کرنے کے قابل ہوگئی۔ کوئی کہتا ذرا جا کے تالاب سے یہ کپڑے تو دھولا۔ منی بے عذر دھونے کو چلی جاتی۔ لیکن راہ میں کوئی اسے بلا کر کہتا۔ ”بیٹی! کنوئیں سے دو گھڑے پانی تو کھینچ لا تو وہ کپڑے وہیں رکھ کر گھڑے لے کر کنوئیں کی طرف چل دیتی۔ کنوئیں پر کوئی کہہ دیتا ذرا کھیت سے جا کر تھوڑا سا ساگ تو لے آ۔ اور منی گھڑے وہیں رکھ کر ساگ لینے چلی جاتی۔ پانی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہے۔ کنوئیں پر جا کر دیکھتی ہے تو گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ منی کو گالیاں دیتی ہوئی کہتی۔ آج سے اس کل موہی کو کھانے کو نہ دوں گی۔ کپڑوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور غصہ میں تالاب کی طرف جاتی تو راستے میں کپڑے پڑے ہوئے ملتے۔ تب وہ بھی اسے گالیاں دے کر کہتی۔ آج سے اسے کچھ کھانے کو نہ دوں گی۔ اس طرح منی کو کبھی کبھی کچھ کھانے کو نہ ملتا اور تب اسے بچپن یاد آتا۔ جب وہ کچھ کام نہ کرتی تھی اور لوگ بلا کر کھانا کھلا دیتے تھے۔ وہ سوچتی کس کا کام نہ کروں۔ جسے جواب دوں وہی ناراض ہو جائے گا۔ میرا اپنا کون ہے۔ میں تو سب کی ہوں۔ اس غریب کو یہ نہ معلوم تھا کہ جو سب کا ہوتا ہے وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ وہ دن کتنے اچھے تھے جب اسے

کھانے پینے کی اور کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہ تھی۔ بخت سیاہ میں بھی بچپن کا وہ زمانہ چین کا تھا۔ کچھ دن اور گزرے۔ منی جوان ہوگئی۔ اب تک وہ عورتوں کی تھی، اب مردوں کی ہوگئی۔ وہ سارے گاؤں کی معشوقہ تھی۔ پر کوئی اس کا محبوب نہ تھا۔ سب اس سے کہتے تھے میں تم پر مرتا ہوں۔ تمہارے فراق میں تارے گنتا ہوں۔ تم میرے دل وجان کی مراد ہو۔'' پر اس کا سچا محبوب کون ہے، اس کی اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی اس سے یہ نہ کہتا تھا کہ تو میرے رنج وغم کی شریک ہو جا۔ سب اس سے اپنا خانۂ دل آباد کرنا چاہتے تھے۔ سب اس کی نگاہ پر ایک تبسم ریز لب پر قربان ہو جانا چاہتے تھے، پر کوئی اس کی بانہہ پکڑنے والا، اس کی لاج رکھنے والا نہ تھا۔ وہ سب کی تھی۔ اس کی محبت کے دروازے سب پر کھلے ہوئے تھے، پر کوئی اس پر اپنا قفل نہ ڈالتا تھا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔

وہ بھولی بھالی لڑکی جو ایک دن نہ جانے کہاں سے بھٹک کر آ گئی تھی۔ اب اس گاؤں کی ملکہ تھی۔ جب وہ اپنا فراخ سینہ ابھار کر غرور حسن سے گردن اٹھائے، نزاکت سے لچکتی ہوئی چلتی تو منچلے نوجوان دل تھام کر رہ جاتے، اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھائے۔ کون تھا جو اس کے اشارے پر اپنی جان نثار نہ کر دیتا۔ وہ یتیم لڑکی جسے کبھی گڑیاں کھیلنے کو نہ ملیں، اب دلوں سے کھیلتی تھی۔ کسی کو مارتی تھی، کسی کو جلاتی تھی۔ کسی کو ٹھکراتی تھی، کسی کو تھپکیاں دیتی تھی۔ کسی سے روٹھتی تھی، کسی کو ستاتی تھی۔ اس کھیل میں اسے سفا کانہ مزا آتا تھا۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ وہ سب کی تھی، کوئی اس کا نہ تھا۔ اب سب اس کے تھے، وہ کسی کی نہ تھی۔ اسے جس چیز کی تلاش تھی، وہ کہیں نہ ملتی تھی۔ کسی میں وہ ہمت نہ تھی جو اس سے کہتا، آج سے تو

میری ہے۔ اس پر نثار ہونے والے بہتیرے تھے، سچا رفیق ایک بھی نہ تھا۔ اصل میں وہ ان آشفتہ سروں کو حقیر سمجھتی تھی۔ کوئی اس کی محبت کے قابل نہ تھا۔ ایسے پست ہمتوں کو وہ کھلونوں سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی، جس کا مارنا اور جلانا ایک دلچسپ مشغلہ سے زیادہ نہیں۔ جس وقت کوئی نوجوان مٹھائیوں کے خوان اور پھولوں کے ہار لیے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تو اس کا جی چاہتا منہ نوچ لوں۔ اسے وہ چیزیں زہر ہلاہل سی لگتیں۔ ان کی جگہ وہ روکھی روٹیاں چاہتی تھی۔ سچی محبت میں ڈوبی ہوئی زیوروں اور اشرفیوں کے انبار اسے بچھو کے ڈنک سے لگتے۔ ان کی جگہ وہ سچی تہِ دل سے نکلی ہوئی باتیں چاہتی تھی، جن میں الفت کی بو اور خلوص کا نغمہ ہو۔ اسے رہنے کو محل ملتے تھے۔ پہننے کو ریشم، کھانے کو غذائے لطیف۔ پر وہ ان چیزوں کی طالب نہ تھی۔ وہ طالب تھی پھونس کے جھونپڑے، موٹے موٹے کپڑے اور روکھے سوکھے کھانے کی۔ اسے اثباتِ روح سوز سے نفئی روح پرور کہیں زیادہ مرغوب تھی۔ فضا کے مقابلے کنج قفس کہیں زیادہ مطلوب۔

(۲)

ایک دن ایک پردیسی گاؤں میں آ نکلا۔ بہت ہی کمزور خستہ حال آدمی تھا۔ ایک پیڑ کے نیچے ستو کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ دفعتاً منی ادھر جا نکلی۔ مسافر کو دیکھ کر بولی۔

''کہاں جاؤ گے؟''

مسافر نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''جہنم۔''

منی نے مسکرا کر کہا۔ ''کیوں کیا دنیا میں جگہ نہیں۔''

مسافر۔ ''اوروں کے لیے ہوگی، میرے لیے نہیں۔''

منی۔ ''دل پر کوئی چوٹ لگی ہے؟''

مسافر نے زہر خندہ کر کے کہا۔ ''اور بدنصیبوں کی تقدیر میں کیا ہے، رونا دھونا اور ڈوب مرنا۔ یہی ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ پہلی دو منزلیں تو طے کر چکا۔ اب تیسری منزل اور باقی ہے۔ کوئی دن وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ ایشور نے چاہا تو بہت جلد۔''

یہ ایک چوٹ کھائے دل کے الفاظ تھے۔ ضرور اس کے پہلو میں دل ہے۔ ورنہ غیرت کہاں سے آتی۔ منی بہت دنوں سے ایسے ہی دل کی تلاش کر رہی تھی۔ بولی۔ ''کہیں اور وفا کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟''

مسافر نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ ''میری تقدیر میں نہیں، ورنہ کیا میرا بنا بنایا آشیانہ اجڑ جاتا۔ دولت میرے پاس نہیں، حسن میرے پاس نہیں۔ پھر وفا کی دیوی مجھ پر کیوں مہربان ہونے لگی۔ پہلے سمجھتا تھا وفا دل کے بدلے ملتی ہے۔ اب معلوم ہوا اور جنسوں کی طرح وہ بھی زر و جواہر سے خریدی جا سکتی ہے۔''

منی کو معلوم ہوا میری نظروں نے دھوکا کھایا تھا۔ مسافر سیاہ فام نہیں صرف سانولا تھا۔ اس کے خط و خال بھی اس دلآویز معلوم ہوئے۔ بولی۔ ''نہیں، یہ بات نہیں۔ تمہارا پہلا خیال صحیح تھا۔''

یہ کہہ کر منی چلی گئی۔ اس کے دل کے جذبات اس کی قوتِ ضبط سے باہر ہو

رہے تھے۔ مسافر کسی خیال میں محو ہو گیا وہ اس حسینہ کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کیا سچ مچ یہاں وفا ملے گی۔ کیا یہاں تقدیر فریب نہ دے گی؟

مسافر نے رات اسی گاؤں میں کاٹی۔ وہ دوسرے دن بھی نہ گیا۔ تیسرے دن اس نے پھونس کا ایک جھونپڑا تیار کیا۔

منی نے پوچھا۔ "یہ جھونپڑا کس کے لیے تیار کرتے ہو؟"

مسافر نے کہا۔ "جس سے وفا کی امید ہے۔"

"چلے تو نہ جاؤ گے؟"

"جھونپڑا تو رہے گا۔"

"خالی گھر میں بھوت رہتے ہیں۔"

"اپنے پیارے کا بھوت بھی پیارا ہوتا ہے۔"

دوسرے دن منی اس جھونپڑے میں رہنے لگی۔ لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ منی اس جھونپڑی میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس بھولے بھالے مسافر کو ضرور دغا دے گی۔ یہ عام خیال تھا لیکن منی پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ نہ کبھی اتنی حسین نظر آتی تھی، نہ اتنی خوش۔ اسے ایک ایسا انسان مل گیا تھا جس کے پہلو میں دل تھا۔

(۳)

لیکن مسافر کو دوسرے دن یہ فکر پیدا ہوئی، کہیں یہاں بھی وہ روزِ سیاہ نہ دیکھنا پڑے۔ حسن میں وفا کہاں؟ اسے یاد آیا۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ہوئی تھیں۔

ایسے ہی عہدو پیان ہوئے تھے، مگر ان کچے دھاگوں کو ٹوٹتے کتنی دیر لگی۔ وہ دھاگے کیا پھر نہ ٹوٹ جائیں گے؟ اس مرہم سے بھی اس کے جگر کا زخم نہ بھرا۔ تیسرے دن وہ تمام دن مغموم اور متفکر بیٹھا رہا اور چوتھے دن وہ لاپتہ وہ گیا۔ اس کی یادگار صرف اس کی پھوس کی جھونپڑی رہ گئی۔

منی دن بھر اس کی راہ دیکھتی رہی۔ اسے یہ امید تھی وہ ضرور آئیں گے، لیکن مہینوں گزرے گئے اور مسافر نہ لوٹا۔ کوئی خط بھی نہ آیا لیکن منی کو امید تھی وہ ضرور آئیں گے۔ سال گزر گیا۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ پھول کھلے، پھل لگے، کالی گھٹائیں آئیں۔ بجلی چمکی۔ یہاں تک کہ سرما بھی گزر گیا اور مسافر نہ لوٹا۔ مگر منی کو اب بھی اس کے آنے کی امید تھی۔ وہ ذرا بھی متفکر نہ تھی، ذرا بھی خائف نہ تھی۔ وہ دن بھر مزدوری کرتی اور شام کو جھونپڑے میں پڑ رہتی۔ لیکن وہ جھونپڑا اب تک محفوظ قلعہ تھا جہاں آشفتہ سروں کا بھی پائے نگاہ لنگ ہو جاتا ہے۔

ایک دن وہ سر پر لکڑی کا گٹھا لیے چلی آتی تھی۔ ایک رسیا نے چھیڑ خانی کی۔ ’’منی کیوں اپنے نازک جسم کے ساتھ یہ ستم کرتی ہو۔ تمہاری ایک نگاہِ کرم پر اس لکڑی کے برابر سونا صدقہ کر سکتا ہوں۔‘‘

منی نے روح شکن حقارت کے ساتھ کہا۔ ’’تمہارا سونا تمہیں مبارک ہو۔ یہاں اپنی محنت کا بھروسہ ہے۔‘‘

’’کیوں اتنا اتراتی ہو، اب وہ لوٹ کر نہ آئے گا۔‘‘

منی نے اپنے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ’’وہ گیا کہاں جو لوٹ کر آئے گا۔ میرا ہو کر پھر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ وہ میرے سینے میں بیٹھا ہوا ہے۔‘‘

اسی طرح ایک عاشق تن نے کہا۔ ''تمہارے لیے میرا محل حاضر ہے، اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں کیا پڑی ہو۔''

منی نے غرور کے ساتھ کہا۔ ''اس جھونپڑے پر ایک لاکھ محل نثار ہیں۔ یہاں میں نے وہ چیز پائی ہے جو اور کہیں نہ مل سکتی ہے۔ یہ جھونپڑا نہیں ہے، میرے پیار کا دل ہے۔''

اس جھونپڑے میں منی نے ستر سال کاٹے۔ مرنے کے دن تک اسے مسافر کے لوٹنے کی امید تھی۔ اس کی آخری نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خریداروں میں کچھ تو مر گئے، کچھ زندہ ہیں مگر جس دن سے وہ ایک کی ہو گئی۔ اسی دن سے اس کے چہرے پر وہ نورانی جلوہ نمودار ہوا۔ جس کی طرف تاکتے ہی نگاہِ ہوس بے نور ہو جاتی تھی۔ خودی جب بیدار ہو جاتی ہے تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔

شدھی

پہلی بار: کتابی صورت میں، افسانوی مجموعے ''خواب وخیال'' میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

(۱)

آخر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ لالہ پریم ناتھ کو اپنا سب کچھ کھو چکنے کے بعد آخر کار معلوم ہوا کہ بازارِ حسن میں وفا کی جنس عنقا ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے، وہ احباب میں زاہد خشک مشہور تھے مگر ایک دن دوستوں کے اصرار سے ایک محفل میں شریک ہوئے اور بی حسنہ کے حسن زاہد فریب نے وہیں مجمع عام میں ان کا دل لوٹ لیا۔ رنگین مزاجوں کے لیے حسن اور ادا مشغلۂ تفریح ہے۔ زاہدوں کے لیے پیغام شہادت۔ ان پانچ برسوں میں پریم ناتھ نے دولت، عزت، دین، ایمان سب کچھ بی حسنہ کی نذر کر دیا۔ اگر وہ چھپے چھپے حسنہ کی پرستش عمر بھر کیا کرتے تو کوئی باز پرس نہ ہوتی، لیکن علانیہ، کھلے بندوں، ڈنکے کی چوٹ رنگ رلیاں منانا سماج کو کب برداشت ہوسکتا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہوگئی۔ اعزا بیگانے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر کترا جاتے۔ ماں نے رو رو کر سمجھایا۔ منتیں کیں۔ دانہ پانی چھوڑا۔ مگر پریم ناتھ کے دل میں حسنہ کے سوا اور کسی کے لیے اب جگہ نہ تھی۔ یہاں تک آخر ماں مجبور ہو کر تیرتھ یاترا کرنے چلی گئی۔ اور گومتی نے میکے کی راہ لی۔ پریم ناتھ کا راستہ اور بھی صاف ہوگیا۔ عطائیوں اور میراثیوں کی صحبت رہنے

لگی۔ مذہبی پابندیاں پہلے ہی شاخ پر جا بیٹھی تھیں۔ اب ان کے پر نکل آئے۔ اڑ گئیں۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوئے۔ بغیر لطف صحبت کہاں؟ خلوص میں امتیاز کہاں؟ الفت میں مغائرت کیسی۔ چھوت چھات کے مٹتے ہی ان کا ہندو پن بھی مٹ گیا۔ جب ہندو نہ رہے تو مسلمان عیسائی جو چاہے کہو، جو چاہے سمجھو، ماں اور بیوی کی کنارہ کشی نے بغاوت کی اور پھر بھی تحریک کی ایک دن جامع مسجد میں کلمہ پڑھ لیا۔ انہیں اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔ جذبات ہندو تھے، خیالات ہندو تھے، تعلقات ہندو تھے۔ ہمدردیاں ہندو تھیں، لیکن آداب ہندو نہ تھے اس لیے وہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا۔ کیا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل قاطع نہ تھی، پر اس سے فائدہ ہی کیا کہ نہ ادھر میں نہ ادھر۔ کلمہ پڑھتے ہی پریم ناتھ الفت حسین بن گئے۔

لیکن اس کوچہ میں کون صاحب زر آیا جو چند دنوں میں دانوں کا محتاج نہ ہو گیا ہو۔ دنیا کے بازار میں نقد جنس کی صورت اختیار کرتی ہے۔ نشاط کے باغ میں رندی اور رفاقہ مستی کے سوا اور کیا ہے۔ شمع بجھتے ہی پروانے منتشر ہو گئے۔ نخلِ بے ثمر پر طیور کیوں چہکیں۔ بوا آدم کے زمانے سے جو ہوتا ہے۔ وہی پھر ہوا۔ حسنہ نے نئے نئے عاشق ڈھونڈ نکالے اور میاں الفت حسین بے یار و مددگار بے رفیق غم گسار، ایک پرانی مسجد میں پناہ گزین ہوئے۔ ساری دولت خرچ کر کے رسوائی، ندامت، ذلت اور عسرت جیسی بے بہا چیزیں خرید لائے۔ بیماری گھاٹے میں ملی۔

اب پریم ناتھ کی آنکھیں کھلیں۔ تین ہفتے سے مسجد کے گوشے میں پڑا کراہ رہا تھا۔ پر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ پرانے دوست اس کی آشفتہ سری سے مایوس ہو کر اس کے نام سے رو بیٹھے تھے۔ نئے دوستوں میں۔ ہنسنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس ہیئت کذائی میں پریم ناتھ کو پیاری ماں اور مہربان بیوی کی یاد آئی۔ آہ کتنی قابلِ رشک زندگی تھی۔ کیا بے فکری کے دن تھے۔ وہ عصمت کی دیوی مجھے کتنا سمجھاتی رہی۔ پر میں ہوس کے نشہ میں بے خود ہو رہا تھا۔ کاش ایک بار پھر اس دیوی سے مل جاتا تو زندگی بھر اس کے قدموں سے جدا نہ ہوتا۔ مگر اب ایسے نصیب کہاں۔ اب مجھے کون پوچھے گا۔ گومتی کو تو مجھ سے نفرت ہوگئی ہے۔

مسجد میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ طاہر علی نام تھا۔ بے لوث آدمی تھے۔ انہیں پریم ناتھ کی حالت پر رحم آتا تھا۔ اپنے کھانے میں اسے شریک کر لیتے، ایک دن ان سے کہا۔ کیوں اپنے گھر نہیں چلے جاتے۔ یہاں کب تک پڑے رہو گے، آخر گھر تو نہیں گر گیا۔ میں دیکھتا ہوں یہاں تمہاری حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے۔

پریم ناتھ نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ کیوں جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ مولوی صاحب اب میرا گھر بار کہاں۔ گھر تو کب کا بک چکا ہے۔ اب تو قبر میں ہی عافیت نصیب ہوگی۔

طاہر۔ ''بھلا ایک بار اپنے گھر والوں کو بلاؤ تو دیکھو، کیا جواب آتا ہے۔ بیوی کو تو نہیں کہتا، لیکن ماں بچے کی یہ حالت دیکھ کر اس کے سارے قصور معاف کر دے گی اور چھاتی سے لگا لے گی۔

پریم ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اتنا جانتا ہوں مولوی صاحب۔ اماں کو خبر مل جائے تو وہ چاہے کہیں ہوں، دوڑی چلی آئیں گی۔ بیوی کی جانب سے بھی مجھے اس کا کامل یقین ہے، وہ وفا کی دیوی ہے مولوی صاحب! ایسی شرم و حیا تو میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔ مگر کہوں کس منہ سے، جاؤں کیسے؟ اب انہیں یہ روئے سیاہ نہیں دکھا سکتا۔ یہیں پڑے پڑے مر جانا قبول ہے۔ ان کے غم کو تازہ نہیں کر سکتا۔ آہ! میں ننگِ خاندان ہوں۔ مولوی صاحب! میں نے بزرگوں کا نام ڈبو دیا۔ میرے پاس اتنا اثاثہ تھا کہ کئی پیڑھیوں تک فراغت سے گزران ہوتی۔ لیکن اب قلاش ہوں۔ یہاں تک کہ ہمت کی لکڑی بھی ہاتھ میں نہیں ہے۔ اب تو ایشور سے یہی دعا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیں۔''

مولوی صاحب نے ترش ہو کر کہا۔ ''ایشور کیوں، خدا کہو صاحب۔''

پریم ناتھ حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''آپ کے لیے خدا اور ایشور دو ہوں گے، جناب میرے لیے ایک ہیں۔ دنیا ساجھے کی کھیتی نہیں۔ جسے ایشور، خدا، برمھ، لارڈ اور جہوا نے مل کر اگائی ہو۔''

مولوی صاحب نادم ہو کر بولے۔ ''بات تو یہی ہے برادر۔ ہاں ایک معبود کا جو نام ہمیشہ سنتے آئے ہیں اس کے بجائے کوئی دوسرا نام سنتے ہیں تو وہ ذرا کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ خیر کہو تو تمہارے سسرال ایک خط لکھ دوں۔''

پریم ناتھ نے ہاتھ ہلا کر منع کرتے ہوئے کہا۔ ہرگز نہیں۔ مجھے یہیں مرنے دیجیے۔ میرے اعمال کی یہی سزا ہے۔ مرنے کے بعد گور و کفن کی فکر کوئی کر ہی

دے گا۔ اس وقت البتہ ایک خط ڈال دیجیے گا کہ بدنصیب پریم ناتھ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ اور اب جہنم کی اذیتیں جھیل رہا ہے۔ مرنے میں اب بہت دیر نہیں۔ طاہر علی زیادہ سے زیادہ دو دن میری سسرال لکھنؤ میں ہے۔ محلّہ نوبستہ۔ میرے سسر کا نام بابو نہال چند ہے۔ مگر بھائی جان خدا کے لیے مرنے سے پہلے خط نہ لکھیے گا۔ آپ کو خدا کی قسم ہے۔ اس روسیاہ کی اب کفن میں ہی پردہ پوشی ہوگی۔

(۳)

تیسرے دن کوئی پہر رات گئے دو عورتیں مسجد کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک مزدورنی تھی۔ دوسری گومتی۔ دونوں مسجد کی طرف تاک رہی تھیں۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھیں۔ گومتی ہمت سے بولی۔ ''یہاں کوئی ہے کہ نہیں۔ پوچھ یہی رحیم خاں کی مسجد ہے۔''

مزدورنی نے کہا۔ ''کس سے پوچھوں۔ کوئی دکھائی بھی تو دے۔ (مولوی کو دیکھ کر) ارے میاں صاحب! یہی رحیم خاں کی مسجد ہے نا۔''

طاہر علی ان دونوں کو دیکھتے ہی لپک کر اندرے آ ہے اور پریم ناتھ سے بولے۔ ''الفت حسین، الفت حسین، سو گئے کیا؟ تمہارے گھر کے لوگ آ گئے۔''

پریم ناتھ اٹھ کر بیٹھا ہی نہیں، کھڑا ہو گیا، اور اضطراب کے عالم میں دو قدم آگے بڑھ کر پھر رک گیا اور تعجب سے بولا۔ ''میرے گھر کے لوگ! خواب دیکھا ہے کیا۔''

طاہر۔ ''خواب نہیں ہے۔ جناب حقیقت ہے۔ضرور تمہارے گھر والے ہیں ۔بلا لاؤں؟ ایک بڑھیا نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔سوچا پہلے تمہیں خبر کر دوں۔''

پریم نے اندازِ ملامت سے دیکھ کر پوچھا۔ ''تم نے خط تو نہیں لکھ دیا تھا؟''

طاہر علی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں بھئی لکھ تو دیا۔مجھ سے تمہاری حالت دیکھ کر رہا نہ گیا۔''

پریم: میں نے تو تمہیں قسم دلا دی تھی، پھر بھی تم نے نہ مانا۔ مجھے تم سے اس کمینہ پن کی امید نہ تھی۔ میں اسے صریح کمینہ پن اور دغا سمجھتا ہوں۔

گالیاں پھر دے لینا بھئی۔ اس وقت کیا کہتے ہو۔ بلا لاؤں نا! ذرا بھلے آدمی کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کو اول جلول بکنے لگو۔

پریم۔ ''نہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہہ دو یہاں کوئی نہیں ہے۔''

طاہر۔ ''ذرا سوچ لو۔''

پریم۔ ''کون! اگر تم کسی کو یہاں لائے تو میں اسی کوئیں میں کود پڑوں گا۔ بڑے ذلیل آدمی ہو، بنتے ہو بڑے پارسا، مگر چھپے ہوئے گرگے۔''

بڑھیا مزدورنی نے مسجد کے دروازے پر آ کر پوچھا۔ ''ارے میاں صاحب، رحیم خاں کی مسجد یہی ہے۔ کب سے کھڑی بھونک رہی ہوں۔ کوئی بولتا ہی نہیں۔''

طاہر (پریم سے) بھئی اس وقت مجھ پر رحم کرو۔ اگر میں جانتا کہ تم اپنے جامہ سے باہر ہو جاؤ گے تو بھول کر بھی نہ لکھتا۔ (بڑھیا سے) ہاں یہی ہے رحیم خاں کی

مسجد۔ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا۔ ’’لکھنؤ سے آئی ہوں۔ بابو پیر ناتھ کی سسرال سے۔ بہو جی آئی ہیں۔ بابو صاحب کہاں ہیں؟‘‘

پریم (طاہر سے) طاہر علی، تم نے میرے ساتھ بڑی دغا کی۔ سچ کہتا ہوں اس وقت میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو تمہاری گردن ضرور توڑ دیتا۔ ظالم! ذرا تو سوچنا تھا کہ اس دیوی کے روبرو یہ کیسے جائے گا؟ کیسے کیا ہوگا؟

طاہر۔ ’’بھائی جان معاف کرو۔ سخت غلطی ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ مجھے ان کے آنے کی امید نہ تھی۔‘‘

پریم۔ ’’میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گومتی میری حالت کی خبر پا کر ضرور چلی آئے گی۔ خیر اب تو امتحان لے چکے۔ معلوم ہو گیا کہ ہندو عورت کتنی وفادار ہوتی ہے۔ اب آپ جا کر خدا کے لیے کہہ دیجیے کہ پریم ناتھ یہاں نہیں ہیں۔ اور پوچھیں تو کہہ دینا کہ دوپہر تک یہاں تھے، مگر نہ جانے کہاں چلے گئے، مجھ سے کچھ نہیں کہا۔‘‘

طاہر علی نے بے کسانہ انداز سے کہا۔ ’’بھائی جان مجھ پر رحم کرو۔ ایک عفیفہ کے ساتھ دغا کرنے پر مجھے مجبور نہ کرو۔ جو تم کہتے ہو۔ وہ میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔‘‘

پریم ناتھ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس ملا کے دل میں کتنا درد، کتنا خلوص، کتنی ہمدردی ہے مولوی صاحب کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ جائیے ’’بلا لائیے۔ کہہ دیجیے، بدنصیب پریم ناتھ یہیں ہے۔ طے تو کر چکا

تھا کہ گھر والوں کو صورت نہ دکھاؤں۔ ایسی جگہ مرنا چاہتا تھا جہاں کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہو۔ لیکن ایشور کو میری ایسی پرسکون موت بھی منظور نہ تھی۔"

(۴)

کتنا دردناک منظر تھا۔ گومتی کھڑی تھی۔ پریم ناتھ اس کے پیروں پر سر جھکائے ہوئے تھا، اور گومتی کی پرزور مدافعت کے باوجود سر نہ اٹھاتا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، زبان دونوں کی بند۔ جذبات کے طوفان میں الفاظ ڈگمگائے ہوئے چلتے تھے۔ پر ناطقہ تک پہنچتے پہنچتے غرقاب ہو جاتے تھے۔

آخر گومتی نے سسکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ مولوی صاحب خط نہ لکھتے تو مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ ہم ایسے غیر ہو گئے۔"

پریم ناتھ نے سر اٹھایا اور رقت آمیز لہجے میں کہا۔ معاف کرو گومتی۔ میری خطا معاف کرو۔ اپنی نادانی کا خوب مزا چکھ چکا ہوں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ تمہیں خبر نہ ہو اور دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مگر تقدیر میں یہ ذلت اور شرمندگی بدی تھی۔

گومتی بیٹھ گئی اور شوہر کی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "ذلت اور شرمندگی کیسی؟ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ میرا ایشور جانتا ہے کہ میں تمہیں جو پہلے سمجھتی تھی وہی اب بھی سمجھتی ہوں،"

بلکہ اس سے بھی زیادہ دولت کا کیا غم تقدیر میں ہو گی پھر مل رہے گی میرے

لئے تمہاری خدمت ہی سب سے بڑی دولت ہے سہاگ عورت کے لیے سب سے بڑی ممانعت ہے تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا، لیکن میں تمہیں کویں کر چھوڑ دیتی میں تو ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں۔

پریم ناتھ نے مشتبہ انداز سے کہا پر یہ کیسے ہوگا گومتی ہمارے درمیان تو ایک آہنی دیوار کھڑی ہے دنیا مجھے مسلمان کہتی ہے اور مسلمان سمجھتی ہے حالانکہ میں سچے دل سے کہتا ہوں، مجھے اسلام سے کبھی عقیدت نہ تھی مجھے مر جانا قبول ہے پر تمہیں رسوا نہیں کر سکتا۔

اس خیال سے پریم ناتھ کے دل پر ٹھیس لگی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ایک لمحہ کے بعد اس نے آنسو ضبط کر کے پوچھا ایک بات پوچھوں، بتلاؤ گی؟ سچ بتلانا

گومتی ''کیا بات ہے کہو، میں تم سے جھوٹ نہیں بولتی''

پریم ''پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تمہیں مجھ سے نفرت ضرور ہوگی''

پریم ناتھ نے شرم سے سر جھکا لیا یہ سوال بے موقع تھا یہ بات اس سے چھپی نہ تھی اس کا جواب گومتی کے لیے کتنی روحانی کوفت کا باعث ہوگا یہ بھی وہ جانتا تھا، تاہم وہ گومتی کے چہرے کی طرف جواب کے لیے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا

گومتی نے سر جھکائے ہوئے مگر دلیرانہ لہجے میں کہا بہتر ہوتا کہ مجھ سے یہ سوال نہ کرتے پیارے! اگر میں کئی سال غائب رہنے کے بعد تمہارے پاس آتی تو تمہارے دل میں میری جانب سے جو کچھ خیال ہوتے ان سے میرے دل کا اندازہ کر سکتے ہو دل تمہاری طرف دوڑتا ہے مگر جسم پیچھے ہٹتا ہے میں تمہارے لیے

اس وقت بھی جان قربان کر سکتی ہوں۔

گومتی خاموش ہوگئی اپنے اظہار خیال کے لیے اسے مناسب الفاظ نہ ملے

پریم ناتھ اس جھجک کا مطلب سمجھ کر جوش سے بولا میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں گومتی! اور خوش ہوں کہ تم نے اسے ظاہر کر دیا آپس میں کسی طرح کا پردہ نہ ہونا چاہئے میری شدھی تو ہو سکتی ہے، کیا تب بھی تمہیں مجھ سے احتراز ہوگا میں شدھی کا حامی نہیں ہوں گومتی! ہندو سماج میں اب بھی ایسے بے شمار آدمی پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاتھ کا پانی پینے مجھے گوارہ نہ ہوگا ہمارا سماج ایسے ہی آدمیوں سے بھرا ہوا ہے لیکن ان کے ساتھ ملنے کے لیے میں اپنی شدھی کرانی شرم نام سمجھتا ہوں لیکن تمہاری خاطر مجھے یہ آزمائش بھی قبول ہے۔

گومتی نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا ''تو کب؟''

پریم ناتھ بولے ''جب تمہارا جی چاہے''

☆☆☆☆☆☆☆

تحریک

پہلی بار: کتابی صورت میں 1928ء (خاک پروانہ) میں شائع ہوا
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

(1)

میری کلاس میں سورج پرکاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا بلکہ یوں کہو اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے ناہموار طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا فتنہ انگیزی میں اس کی جان بستی تھی مدرسوں کو بنانے اور چڑھانے سرگرم طالب علموں کو ذلیل کرنے اور رلانے میں اسے مزا آتا تھا ایسی ایسی سازشیں کرتا ایسے ایسے پھندے ڈالتا ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہو جاتی تھی گروہ بندی میں اسے خداداد ملکہ تھا خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنالی تھی اور اس کے زور سے سکول پر حکومت کرتا تھا پرنسپل کا حکم ٹل جائے مگر کیا مجال کہ کوئی اس کے حکم سے سرمو انحراف کر سکے جینا محال کر دیتا تھا اسکول کے چپراسی اور اردلی اس سے تھرتھر کانپتے تھے انسپکٹر کا معائنہ ہونے والا تھا پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آجائیں منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائنہ کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں کر دیں، مگر دس بج گئے انسپکٹر صاحب آکر بیٹھ گئے اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں گیارہ بجے خود بخود سب لڑکے اس طرح نکل پڑے جیسے کوئی پنجرہ کھول دیا گیا ہو

انسپکٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا کہ ڈسپلن بہت خراب ہے پرنسپل صاحب کی کر کری ہوئی مدرسین بدنام ہوئے اور یہ ساری شرارت سورج پرکاش کی تھی مگر ہر چند تحقیقات کی گئی، سورج پرکاش کا کسی نے نام تک نہ لیا مجھے اپنی تنظیم پر غرہ تھا ٹریننگ کالج میں اس صیغہ میں میں نے امتیاز حاصل کیا تھا مگر یہاں میری ساری تنظیمی قابلیت میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی کام نہ کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہ راست پر لاؤں کئی بار مدرسوں کی میٹنگ ہوئی پر یہ عقدہ نہ حل ہوا نئے اصول تعلیم کے مطابق میں جوراستاد کا قائل نہ تھا۔ پر یہاں ہم اس طرز عمل سے محض اس لیے محترز تھے کہ علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے سورج پرکاش کو اسکول سے نکال دینے کی تجویز بھی کی پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے بیس بائیس سند یافتہ آزمودہ کار آمد مدرس ایک بدمعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کرسکیں یہ خیال حد درجہ شرمناک تھا یوں تو سارا اسکول اس سے بیزار تھا مگر سب سے پریشان میں تھا کیوں کہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا اور اس کی شرارتوں کا خمیازہ زیادہ تر مجھے اٹھانا پڑتا تھا اسکول آتا تو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا شگوفہ کھلتا ہے ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی تو اس میں سے ایک بڑا سا مینڈک نکل پڑا میں چونک کر پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا کلاس میں ایک شور برپا ہو گیا مگر قہر درویش بر جان درویش ۔۔۔۔سورج پرکاش کی طرف غضبناک معذوری کی نگاہ ڈال کر رہ گیا سارا گھنٹہ پند و نصیحت میں گزر گیا اور بدمعاش سر جھکائے بیٹھا مسکرا رہا تھا مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں میں پاس ہو کر کیوں کر میرے درجہ تک آیا ہے اس میں ابتدائی درجوں

تک کی لیاقت بھی نہ تھی آٹھویں درجہ تک آ پہنچا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے پاس کیوں کر ہوتا تھا، خدا ہی جانے

ایک دن میں نے غصہ سے کہا "تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہو سکتے"

سورج پرکاش نے پر اطمینان اور لا پروائی سے کہا "آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں اور اب کے بھی پاس ہوں گا"

"غیر ممکن"

"غیر ممکن ممکن ہو جائے گا"

میں اس استعجاب سے اس کا منہ دیکھنے لگا ذہین سے ذہین لڑکا بھی اپنی کامیابی کا دعویٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کر سکتا تھا معاً خیال آیا یہ امتحانی پرچے اڑا لیتا ہوگا ممتحوں کے نوکروں یا لڑکوں سے مل کر کچھ لالچ دے کر پرچے نقل کر لیتا ہوگا میں نے عہد کیا اب کے میں اس کی ایک بھی چال نہ چلنے دوں گا دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہے آپ گھبرا کر نکل بھاگے گا۔

سالانہ امتحان کے موقعہ پر میں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا مگر سورج پرکاش کی کاپی دیکھی تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی میرے دو پرچے تھے دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے اور ممتحوں کے پرچے شاید اتنے اچھے نہ کیے تھے مگر پاس سب پرچوں میں تھا مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچہ کا کوئی سوال بھی حل نہیں کر سکتا میں اسے ثابت کر سکتا تھا مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا تحریر میں اتنا فرق نہ تھا جو کوئی شبہ پیدا کر سکتا امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر عجلت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا

وہ بھی چکرا گئے مگر انہیں بھی دیدہ دانستہ مکھی نگلنی پڑی میں شاید معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں اور مدرسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردد نہ پاتا تھا گویا ایسے لڑکوں کا سکول میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر میرے لیے وہ ایک ہیجان انگیز معمہ تھا اگر اس کے اطوار یہی رہے تو ایک دن یا تو جیل میں ہو گا یا جیل کے راستہ میں

(2)

اسی سال میرا تبادلہ ہو گیا یہاں کی آب وہوا مجھے موافق تھی پرنسپل اور دوسرے ماسٹروں سے یارانہ وہ گیا تھا اور ہر قسم کی چیز ارزاں تھی مگر میں اپنے تبادلہ سے خوش ہوا کیوں کہ سورج پرکاش سے میری گلو خلاصی ہو جائے گی لڑکے مجھ سے مایوس ہو گئے تھے ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے اس وقت سبھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے میں بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا اتفاق سے اسی وقت میری نگاہ سورج پرکاش پر پڑی جو سب سے پیچھے کچھ نادم کھڑا تھا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے چلتے چلتے دو چار باتیں کر لوں شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے پیش قدمی کی اور نہ اس نے حالانکہ مجھے دنوں تک اس کا افسوس رہا اس کا حجاب قابل معافی ہے اس نے مجھے ناراضگی کے بے شمار موقع دیے تھے میرا احتراز نا قابل عفو تھا ممکن تھا کہ وقت اور

ندامت کے عالم میں دو چار خلوص کی باتیں اس کے دل پر اثر کر جاتیں مگر انہی کھوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے گاڑی آہستہ آہستہ چلی لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے میں کھڑکی کے باہر سے سر نکالے کھڑا تھا کچھ دیر تک مجھے ان کے ملتے ہوئے رومال نظر آئے پھر وہ صورتیں حباب کی طرح مٹ گئیں مگر ایک ننھی سی صورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی میں نے قیاس کیا وہ سورج پرکاش ہے اس وقت میرا دل کسی بے تاب قیدی کی طرح نفرت، کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا۔

نئے مقام کی نئی دلچسپیوں اور مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنی جانب مائل کر لیا تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا پچھلے دنوں کی یاد ایک حسرت بن کر رہ گئی جس میں درد اور لذت تھی مگر تحریک عمل نہیں نہ کسی کا کوئی خط آیا نہ میں نے کوئی خط لکھا شاید دنیا کا یہی دستور ہے برسات کے بعد برسات کی ہریالی کتنے دنوں قائم رہتی ہے عارضی صحبتوں کا یہی انجام ہے خیر اتفاق سے مجھے انگلینڈ میں تکمیل تعلیم کا ایک موقع ہاتھ آ گیا وظیفہ ملا، انگلینڈ پہنچ گیا وہاں تین سال لگے، وہاں سے لوٹا تو اپنے وطن سے بہت دور ایک کالج کا پرنسپل مقرر ہوا فروغ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا خواب میں بھی میرے تخیل نے اتنی بلند پروازی نہ کی تھی مگر وص رفعت اب کسی بلند تر شاخ پر اپنا آشیانہ بنانا چاہتا تھا وزیر تعلیم سے رابطہ ضبط پیدا کیا یارانہ بڑھا میں نے بھی ان کے بنگلہ سے متصل بنگلہ لیا منسٹر صاحب میرے کرم فرما ہیں ان کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ وزیر تعلیم ہو کر تعلیم کے اصول امور سے واقف نہ تھے گھوڑے پر سوار وہ تھے پر عنان میرے ہاتھ میں تھی

اور یہ کھلا ہوا راز تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفین سے میری مخالفت ہو گئی مجھ پر جا بجا حملے کئے جانے لگے میں خلوص کے ساتھ اصلاح وفلاح کی تجویز پیش کرتا اس کی مخالفت کی جاتی میں اصولاً جبری اصلاح کا مخالف ہوں میرا خیال ہے کہ ہر ایک انسان کو ان معاملات میں زیادہ آزادی ہونی چاہیے جن کا تعلق ان کی ذات سے ہے۔ بہت ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میں جبری تعلیم کا قائل نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ یورپ میں اس کی ضرورت ہے ہندوستان میں نہیں مادیت مغربی تہذیب کی روح ہے وہاں کسی کام کی تحریک مالی فوائد کے اعتبار سے ہوتی ہے ضروریات زندگی زیادہ ہیں، اس لیے کشمکش حیات بھی زیادہ دلکش والدین ضرورتوں کے غلام ہو کر بچوں کو جلد سے جلد کسب معاش پر مجبور کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ شراب ترک کر کے ایک شلنگ روز کی بچت کر لیں وہ اپنے کمسن بچے کو ایک شلنگ کی مزدوری کرنے کے لیے مجبور کریں گے ہندوستان میں زندگی فقیرانہ سادگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے ہم اس وقت تک اپنے بچوں سے مزدوری نہیں کراتے جب تک کہ حالات ہمیں مجبور نہ کریں ہم بھوکے رہیں ننگے رہیں مگر لڑکوں سے مزدوری نہ کرائیں گے تاوقتیکہ فاقہ کشی کی نوبت نہ پہنچے۔

غریب سے غریب اور بے نوا سے بے نوا ہندوستانی مزدور بھی تعلیم کی برکات کا قائل ہے اس کے دل میں یہی تمنا ہے کہ میرا بچہ چار حرف پڑھ جائے اس لیے نہیں کہ اسے کوئی رتبہ حاصل ہو گا بلکہ محض اس لیے کہ علم انسانی خصلت کا ایک زیور ہے تعلیم کے فوائد اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں اگر وہ یہ علم ہونے پر بھی اپنے بچے کو مدرسے نہیں بھیجتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی مجبوری حائل ہے ایسی حالت میں

قانوناً! اسے مجبور کرنا میری نگاہ میں قرین انصاف نہیں اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کے فرائض پدری کو تشویش سے بیدار کر دیں اس کے علاوہ میرے خیال میں ابھی تعلیم کے وہ عناصر ملک میں ناکافی ہیں، جن سے تعلیم کی فضیلت ہے نیم تعلیم یافتہ فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی اونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو گا کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائے گا میں اسے کوہ کندن وکاہ بر آوردن کے مصداق سمجھتا ہوں سن شعور میں یہ مرحلہ ایک مہینہ میں آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہم جتنا ایک مہینہ میں پڑھ سکتے ہیں اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی پڑھ سکتے پھر خواہ مخواہ بچوں کو مدرسے میں قید کرانے سے فائدہ؟ یوں چاہے اسے روٹیاں نہ ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا مدرسہ میں بند کر کے تو آپ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں اس لیے جب صوبہ کی کونسل میں جبری تعلیم کی تجویز پیش ہوئی تو میری تحریک کی منسٹر صاحب نے مخالفت کی گورنمنٹ تو مخالفت پر پہلے ہی آمادہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ بل مسترد ہو گیا پھر کیا تھا منسٹر صاحب کی اور میری وہ لے دے شروع ہوئی کہ الاماں! ایک طوفان برپا ہو گیا ذات پر حملے کیے جانے لگے میں عضو ضعیف تھا اس لیے نزلہ مجھی پر گرا مجھے ملک کا بدخواہ ترقی کا دشمن، قومی غدار اور گورنمنٹ کا گداگر بنایا گیا کئی اخبارات میں آبروریز کارٹون بھی نکلے میرے کالج میں ذرا سی بھی کوئی بات ہوتی تو کونسل میں اس پر سوالوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے ایک چپراسی کو برخاست کیا ممبر اصحاب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے

اعتراضات کا تانتا بندھ گیا یہاں تک کہ منسٹر کو مجبور ہو کر اس چپراسی کو بحال کرنا پڑا میں یہ توہین برداشت نہ کر سکا شاید کوئی بھی نہ کر سکتا منسٹر صاحب سے مجھے شکایت نہیں، وہ مجبور تھے ان حالات میں کام کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا تحمل اور ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے مجھے اپنے کالج کی اندرونی تنظیم کا بھی اختیار نہیں۔ فلاں کیوں امتحان میں بھیجا گیا فلاں کے عوض فلاں کو کیوں وظیفہ نہیں دیا گیا فلاں پروفیسر کو فلاں کلاس کیوں نہیں دی جاتی اس طرح کے بے معنی مہمل اور لچر اعتراضات نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس نئی چوٹ نے تسمہ بھی الگ کر دیا میں نے استعفیٰ دے دیا مخالفین کو یہ صبر کہاں کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ چلا جانے دیتے میری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا مجھے منسٹر صاحب سے اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کم از کم اس معاملہ میں انصاف اور حق سے کام لیں گے مگر انہوں نے حق کی بجائے مصلحت کو مقدم سمجھا اور مجھے کئی سال کی مخلصانہ رفاقت کا صلہ یہ ملا کہ میری برطرفی کا نوٹس آ پہنچا۔ دنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک مجھے نہ ہوا تھا تقدیر بھی کچھ برگشتہ تھی اسی دوران میں بیوی کا انتقال ہو گیا آخری دیدار بھی نہ کر سکا شام کو دریا کنارے سیر کرنے گیا ہوا تھا ان کی طبیعت کچھ کسل مند تھی لوٹا تو ان کی لاش ملی شاید قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی اس سانحہ نے کمر توڑ دی ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے ہیں جو کچھ ہوا، بیوی کے فیض اور اثر سے ہوا وہ میری تقدیر کا معمار تھی کتنی بلند حوصلہ تھی کتنی آہنی ہمت کتنی ملکوتی صفت اس شیرینی میں تلخی کا نام بھی نہ تھا مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے کبھی چیں بجبیں دیکھا ہو ہمیشہ ہر حالت میں صابر اور خوش تھی مگر اس کیس اتھ ہی ترقی کی ایک تحریک باطن اس کے ایک ایک

قطرہ خون میں بھری ہوئی تھی مایوس ہونا تو جانتی ہی نہ تھی میں کئی بار سخت بیمار پڑا ہوں معالجوں پر بھی مایوسی کا غلبہ ہو گیا پر اس کے سکون و اطمینان میں شمہ بھر بھی تزلزل نہ ہو۔ اسے اعتقاد تھا میں اپنے شوہر کی حیات میں مروں گی اور وہی ہوا میں زندگی میں اسی کے سہارے اب تک کھڑا تھا جب وہ سہارا ہی نہ رہا تو زندگی کہاں رہتی کھانے اور سونے کا نام زندگی نہیں ہے زندگی نام ہے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی لگن کا وہ لگن غائب ہو گئی میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور گوشہ گمنامی میں زندگی کے دن پورا کرنے کا ارادہ کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہو گیا چاروں طرف اونچے ٹیلے تھے ایک طرف گنگا بہتی تھی میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا اور اس میں رہنے لگا

(3)

مگر اہل دنیا یہاں بھی مجھے دق کرنے کے لیے کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے کسی کو کوئی میموریل لکھنا ہوتا تو میرے پاس آتا کبھی کبھی اخباروں کے نامہ نگاروں اور پبلشروں کے ایجنٹ بھی سر پر سوار ہو جاتے تھے ان کے پاس خاطر سے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا تھا

دلبستگی کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا تھا ایک درخت کے نیچے گاؤں کے لڑکوں کو جمع کر کے کچھ پڑھایا کرتا تھا اس کا یہاں اتنا شہرہ ہوا کہ آس پاس کے مواضعات کے نوجوان بھی آنے لگے۔

ایک روز میں اپنی کلاس پڑھا رہا تھا کہ موٹر آ کر رکی حلقہ کا سب انسپکٹر تحصیلدار گھوڑوں پر سوار پیچھے دوڑے چلے آتے ہیں معلوم ہوا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں میں اس وقت محض ایک کرتہ اور دھوتی پہنے ہوئے تھا اس ہیئت میں ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آ رہی تھی مگر کپڑے منگانے کا موقع نہ تھا ڈپٹی کمشنر اپنی موٹر سے اتر پڑے اور میری طرف بڑھے میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا مگر مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد میرے پیروں کی طرف جھکے اور ان پر سر رکھ دیا میں کچھ ایسا سٹپٹا گیا کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا میں انگریزی اچھی لکھتا ہوں ولایت ہو آیا ہوں فلسفہ میں مجھے اچھا دخل ہے تقریر بھی خوب کر لیتا ہوں مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدس کے قابل نہیں وہ درجہ تو عارف اور کامل کو ہی ہے اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات تھی حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا میں ابھی اسی حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا ’’آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں‘‘

اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا صورت مانوس معلوم ہوئی اسے ضرور کہیں دیکھا ہے

دفعتہً حافظہ کی آنکھیں کھل گئیں بولا آپ کا نام پرکاش تو نہیں ہے؟

’’جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں مگر آپ نے خوب پہچانا مجھے امید نہ تھی میں 1912ء میں اس اسکول میں تھا بارہ تیرہ سال ہو گئے‘‘

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا، ’’ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں مگر لڑکے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں‘‘

میں نے اسی مذاق کے انداز سے جواب دیا ”تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے“

سورج پرکاش: ”انہیں خطاؤں کی معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہوں میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا جب آپ انگلینڈ گئے تب میں نے آپ کے لیے مبارکباد لکھی مگر اسے بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب آپ پرنسپل ہوئے اس وقت میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا ورنہ ضرور حاضر ہوتا وہاں میں آپ کے مضامین اخبارات میں پڑھتا تھا جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا اور کہیں دیہات میں چلے گئے ہیں اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوا مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں آج باتوں ہی باتوں میں کسی زمیندار نے آپ کا ذکر کیا آپ کا نام تو اسے معلوم نہ تھا مگر اس نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا ڈاکخانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تحقیق ہوگئی دوڑا چلا آرہا ہوں آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے اس کورویہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی ہے ابھی تو آپ کی عمر 46 سال سے زیادہ نہ ہوگی بان پرست کا زمانہ تو 60 کے بعد آتا ہے۔“

میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوئی اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی میں اسے اپنے جھونپڑے میں لایا اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کہانی سنائی

سورج پرکاش نے کہا ”تو یہ کہیے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بیوفائی کا شکار ہوئے میرا تجربہ تو ابھی بہت ہی مختصر ہے مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا

ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے جہاں دیکھئے وہاں خودغرضی منسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا؟''

میں نے جواب دیا'' بھئی ان کی کوئی خطا نہیں ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انہوں نے کیا مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا مل گئی ہے اور اس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں تصنع نہیں میں دل سے کہتا ہوں کہ یہاں مجھے جتنا سکون اور اطمینان ہے اتنا کبھی نہ تھا اس گوشہ قناعت میں مجھے حقائق زندگی کا وہ علم ہوا جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کر کے بھی میں اپنی خود پروری کا ازالہ نہ کر سکا۔ بلکہ یہ مرض روز بروز زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقف کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے ثروت کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کی زندگیاں ہی زمینوں کا کام دیتی ہیں آپ انہیں کچلے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے وہاں انسانیت شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں درندوں کے بیچ میں تھا اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہو جاتی تھیں یہاں میں اپنے چاروں طرف خلوص اور سادگی دیکھتا ہوں میرے پاس جو لوگ آتے ہیں کوئی کمینہ غرض لے کر نہیں آتے اور نہ میری خدمات میں صلہ یا ستائش کی تمنا ہے میں بھی کسی کے پاس جاتا ہوں تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا مجھے یہاں کے در و دیوار اور برگ و بار میں بھی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے سورج پرکاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا مگر شرارت

آمیز تبسم کی جگہ پشیمانی کا رنگ تھا مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے وہ مجھ سے اپنی سعی جمیل کی داد چاہتا تھا مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا ایک صاحب ثروت کے روبرو ثروت وجاہ کی مذمت زیبا نہیں میں نے فوراً سلسلہ تقریر بدل کر کہا ''مگر تم اپنا حال تو کہو تمہاری یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی؟ تمہاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یکایک یہ انقلاب کیسے ہوا؟''

''کسی فقیر کے سوا اور کوئی طاقت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی''

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا ''آپ کی دعا تھی''

''دعا نہیں بددعا ہو سکتی تھی''

''ابھی اس حد تک دنیا سے بیزار نہیں ہوا ہوں''

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پرکاش نے اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔

آپ کے چلے آنے کے بعد کئی روز میرا ماموں زاد بھائی سکول میں داخل ہوا اس کی عمر آٹھ نو سال سے زائد نہ تھی پرنسپل صاحب اسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے اور نہ ماموں صاحب اس کے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے انہیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجئے پرنسپل صاحب اس پر راضی نہ ہوئے کہنے لگے یہ قاعدہ کے خلاف ہے میں بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا میں نے اسی دن ہوسٹل چھوڑ دیا اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لے کر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا زائد خرچ کا بار ماموں صاحب نے لیا لڑکے کا نام موہن تھا اس کی ماں کئی سال پہلے مر چکی تھی اتنا دبلا پتلا

کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اس پر رحم آنے لگا کبھی اس کے سر میں درد ہوتا کبھی بخار آتا آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی رہتی تھی سر شام سو جاتا اور اسے کھانا کھانے کے لیے مجھے اس کی منتیں کرنی پڑتیں دن چڑھے تک سوتا رہتا اور جب تک میں گود میں اٹھا کر بٹھا نہ دیتا اٹھنے کا نام نہ لیتا رات کو چونک پڑتا۔۔۔۔۔۔اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری چارپائی پر آجاتا اور میرے گلے سے لپٹ کر سوتا مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس سے اتنا انس ہو گیا میں جو نو بجے سو کر اٹھا کرتا تھا تڑکے اٹھ بیٹھتا اور اس کے لیے دودھ گرم کرتا پھر اسے اٹھا کر ہاتھ منہ دھلاتا اور اس کی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کرانے لے جاتا میں جو کبھی کتاب لے کر نہ بیٹھتا تھا اسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس کیونکر ہو گیا۔اس کا اب تک مجھے تعجب ہے اسے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی تو میری جان ناخن میں سما جاتی ڈاکٹر کے پاس دوڑتا دوائیں لاتا اور موہن کی خوشامد کر کے اسے دوا پلاتا ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے؟ ماموں صاحب اسے میرے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں بیچارا بے ماں کا لڑکا ہے میرے بدمعاش دوستوں میں کوئی اسے چڑاتا یا چھیڑتا تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں کئی لڑکے تو مجھے بوڑھی دایہ کہہ کر چڑاتے تھے پر میں ہنس کر ٹال دیتا تھا میں اس کے سامنے کوئی بیہودہ حرکت نہ کرتا تھا ایک بھی ناشائستہ لفظ منہ سے نہ نکلتا یہ خیال ہوتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائے گا میں اس کے سامنے اس طرح رہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے اور اس کے لئے لازمی تھا کہ پہلے ہی اپنی

اصلاح کروں وہ دو بجے سو کر اٹھتا، وہ بارہ بجے تک مٹر گشت کرنا، وہ نئی نئی شرارتوں کے منصوبے باندھنا وہ ماسٹروں کی آنکھ بچا کر اسکول سے اڑ جانا، آپ ہی آپ جاتا رہا صحت اور اخلاق کے آئین کا میں دشمن تھا پر اب مجھ سے بڑھ کر ان کا پابند دوسرا نہ تھا میں ایشور کا مذاق اڑایا کرتا تھا مگر اب پکا خدا دوست ہو گیا تھا وہ بڑی سادگی سے پوچھتا تھا پرماتما سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہونگے اس سوال کا مذاق اڑانا میرے لیے غیر ممکن تھا میں کہتا، ہاں پرماتما تمہارے ہمارے سب کے پاس رہتے ہیں اور ہماری حفاظت کرتے ہیں اس کا چہرہ نورانی مسرت سے چمک اٹھتا تھا شاید وہ پرماتما کے وجود کو محسوس کرنے لگتا تھا ماسٹر صاحب یقین مانیے سال بھر میں ہی موہن کچھ سے کچھ ہو گیا۔۔۔۔وہ منحنی غریب صورت، کامل بے خبر لڑکا اب توانا، شگفتہ رو، چاق و چست اور بشاش ہو گیا ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اسے دیکھ کر حیرت میں آ گئے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

''بیٹا تم نے اسے جلا دیا ورنہ میں تو مایوس ہو چکا تھا اس کا صلہ تمہیں ایشور دیں گے اس کی ماں جنت میں بیٹھی ہوئی تمہیں دعائیں دے رہی ہے''

سورج پرکاش کی آنکھیں اس وقت بھی آبگوں ہو گئی تھیں

میں نے پوچھا موہن بھی تمہیں بہت پیار کرتا ہوگا

سورج پرکاش کی آبگوں آنکھوں میں ایک حسرت ناک مسرت جلوہ افروز ہوئی بولا ''جناب! وہ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی نہ چھوڑتا تھا میرے ساتھ کھاتا، میرے ساتھ بیٹھتا میرے ساتھ سوتا میں ہی اس کا سب کچھ تھا افسوس وہ آج اس

دنیا میں نہیں ہے مگر میں اسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں میں جو کچھ ہوں اسی کا بنایا ہوا ہوں اگر وہ فرشتہ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج میں کسی جیل میں پڑا ہوتا ایک دن میں نے کہہ دیا اگر تم روز نہا نہ لیا کرو گے تو میں تم سے نہ بولوں گا نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چراتا تھا میری اس دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ وہ روزانہ علی الصباح نہانے لگا کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا دیکھتا رہتا تھا کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں ایک روز میں چند احباب کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلا گیا تاکید کر گیا تھا کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہوا ہے میں نے پوچھا تم سوئے نہیں؟ بولا نیند نہیں آئی اس دن سے میں نے تھیٹر جانے کا نام نہ لیا بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منہ نہیں دیکھا تھا پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اس کی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی اس سے چمٹ جاتی ہے وہی حال موہن کا تھا وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا کہ اس کی نازک بیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا اور مجھے استوار کر دیا۔ اس کی ذات کا قصہ نہایت دردناک ہے میرے دل پر اس کا غم اس وقت بھی تازی ہے اور مجھ میں اتنا ضبط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں وہ میرے ساتھ تین سال رہا شاید غیب سے میری ہدایت کے لیے جو مشعل عطا ہوا تھا وہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا اس ننھے سے دل میں کیا کیا ارمان بھرے ہوئے تھے بی اے

پاس کرنا، ایم اے پاس کرنا، وظیفہ پانا، ولایت جانا، وہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا۔۔۔۔۔۔یہی اس کے زندگی کے خواب تھے جو مرگ بے ہنگام نے پریشان کر دیے۔''

گرمیوں کی تعطیلات تھیں دو تعطیلوں میں موہن میرے ساتھ رہا ماموں صاحب کے اصرار کرنے پر بھی گھر نہ گیا تیسری تعطیل میں میری کالج پارٹی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا اور مجھے اس کا کپتان بنایا۔ کشمیر کی سیاحت کی تمنا مدت سے تھی اس موقع کو غنیمت سمجھا موہن کو ماموں صاحب کے پاس بھیج کر میں کشمیر چلا گیا دو ماہ کے بعد لوٹا تو معلوم ہوا کہ موہن بیمار ہے کشمیر میں مجھے بار بار موہن کی یاد آتی تھی اور جی چاہتا تھا لوٹ جاؤں مجھے اس سے اتنی محبت ہے اس کا اندازہ مجھے کشمیر جا کر ہوا مگر احباب سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اس کی بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد چہرے پر مسرت کی زندگی کی جھلک پڑی میں دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا اس کی آنکھوں میں کچھ وہ دور نظری اور چہرے پر وہ روحانیت تھی جو منڈلاتی ہوئی موت کی خبر دیتی تھی میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے پوچھا،تمہاری کیا حالت ہے موہن!۔۔۔دو ہی مہینہ میں یہ نوبت پہنچ گئی۔

موہن نے معصوم تبسم کے ساتھ کہا'' آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے میں آسمان کی سیر کرنے جارہا ہوں''

مگر اس قصہ غم کو بیان کر کے میں رونا اور رلانا نہیں چاہتا میرے چلے جانے کے بعد موہن اس طرح پڑھنے لگا جیسے تپسیا کر رہا ہو اسے یہ خبط پیدا ہو گیا کہ سال

بھر کا کورس دو ماہ میں ختم کرے اور جب مجھ سے ملاقات ہو تو اپنی کارگزاری کی داد وصول کرے اس اشتیاق نے محویت کی صورت اختیار کر لی میں کس طرح اس کی پیٹھ ٹھونکوں گا، شاباشی دونگا، اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کروں گا یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور نہاک کے ساتھ اس پر غالب آ گئے ماموں صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس کی تفریح کی فکر کریں شاید اسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے ایسا کون باپ ہے جو لڑکے کے شوق طلب میں مخل ہو موہن کو کھیلتے دیکھ کر وہ ضرور ڈانٹتے ''کتاب لے کر کیوں نہیں بیٹھتے'' پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہے کسی باپ نے بھلا لڑکے کو پڑھنے کے لیے نہیں ڈانٹا نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کی نازک صحت یہ ریاضت شاقہ برداشت نہ کر سکی اسے ہلکا بخار آنے لگا مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کئی اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہو جاتا تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکروں سے پوچھتا ''بھیا کا خط آیا؟ وہ کب آئیں گے؟ اس وقت اس کے سوا اسے کوئی دوسری تمنا نہ تھی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیر کشمیر اتنی مہنگی پڑے گی تو میں اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے اسے سنبھالنے کی حتے الامکان بڑی کوشش کی مگر بخار ٹائیفائڈ تھا۔ اس کی جان لے کر ہی اترا۔ پہلی بار میں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریک عمل کرنے لگے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا اس پر عمل کر کے مجھے یہ مسرت ہوئی

ہے کہ شاید اس کی معصوم روح مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو یہی تحریک تھی جس نے ایم اے سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا ورنہ میں آج بھی وہی نالائق گستاخ اور غبی سورج پرکاش ہوں جس کی صورت سے بھی آپ بیزار تھے۔"

اس دن سے میں کئی بار سورج پرکاش سے مل چکا ہوں وہ جب اس گردونواح میں آجاتا ہے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا موہن اب بھی اس کے دل ودماغ میں بسا ہوا ہے انسانی فطرت کا یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

☆☆☆☆☆☆☆

پرائشچت

پہلی بار: ہندی میں ''سرسوتی'' جنوری 1929ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: ''کفارہ'' کے نام سے 1930ء (پریم چالیسی، اول)

دفتر میں ذرا دیر سے آنا افسروں کی شان ہے جتنا بڑا افسر ہوگا اتنی ہی دیر سے آئے گا اور اسی قدر جلد چلا جائے گا چپراسی کی حاضری چوبیس گھنٹوں کی وہ چھٹی پر بھی نہیں جاسکتا۔ اس کا معاوضہ دینا پڑتا ہے خیر جب بریلی ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہیڈ کلرک بابو مداری لال گیارہ بجے دفتر آئے تو دفتر جیسے نیند سے اٹھا چپراسی نے دوڑ کر موٹر سائیکل تھاما اردلی نے لپک کر چک اٹھائی اور جمعدار نے ڈاک کی کشتی میز پر لاکر رکھدی مداری نے پہلا سرکاری لفافہ کھولا ہی تھا کہ ان کے منہ کا رنگ اڑ گیا وہ کئی منٹ تک سکتے کی حالت میں کھڑے رہے جیسے تمام اعضاء شل ہو گئے ہوں ان پر صدہا مصیبتیں ٹوٹیں، لیکن اس قدر بدحواس وہ کبھی نہ ہوئے تھے بات دراصل یہ تھی کہ ایک ماہ سے بورڈ کے سیکرٹری کی جو جگہ خالی تھی اس پر سرکار نے مسٹر سوبودھ چندر کو تعینات کیا تھا اور وہ آدمی تھا جس کے نام سے ہی مداری لال کو چڑ اور نفرت تھی وہی سوبودھ چندر جوان کا ہم جماعت تھا اور جسے زک پہنچانے کی وہ کتنی ہی مرتبہ ناکام کوشش کر چکے تھے وہی آج ان کا حاکم ہوکر آرہا تھا سوبودھ کی کئی سالوں سے کوئی اطلاع نہ ملی تھی محض اس قدر ہی معلوم ہوسکا تھا لیکن آج جیسے وہ زندہ ہو گیا تھا اور سیکرٹری بن کر آرہا تھا اس توہین سے مر جانا کہیں اچھا تھا

سوبودھ کو کالج اور سکول کی سبھی باتیں یقیناً یاد ہوں گی مداری لال نے اسے کالج سے خارج کروانے کے لیے کتنے حیلے کیے بے شمار بہانے تراشے، بدنام کیا کیا وہ سب کچھ فراموش کر چکا ہوگا۔ نہیں! ہر گز نہیں وہ آتے ہی پرانی کسریں نکالیں گے مداری لال کو اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر نہ سوجھی مداری اور سوبودھ کے ستاروں میں ہی شدید اختلاف تھا دونوں ایک ہی دن ایک ہی سکول میں داخل ہوئے اور پہلے ہی روز مداری لال کے دل میں بغض اور عناد کی وہ چنگاری سلگ اٹھی جو آج بیس برس گزر جانے کے باوجود بھی نہ بجھ سکی سوبودھ کا جرم محض یہ تھا کہ وہ مداری پر ہر بات میں فوقیت رکھتا تھا ڈیل، ڈول، روپ، لین، دین، تعلیم اور دوسری سبھی چیزوں میں میدان اس کے ہاتھ رہتا۔ مداری لال نے اس کا یہ قصور کبھی معاف نہیں کیا وہ مسلسل بیس برس تک اس کے دل میں کانٹا بنا رہا جب سوبودھ ڈگری لے کر کالج سے نکلا تو مداری امتحان میں ناکام ہو کر اس دفتر میں ملازم ہو گیا تب کہیں اس کو ذہنی سکون حاصل ہوا اور مداری نے جب یہ سنا کہ وہ بصرہ جا رہا ہے تو اس کا چہرہ کھل اٹھا آج وہ پرانا ناسور کئی گنا زیادہ ٹیس اور سوجن سے کھل گیا آج کی قسمت سوبودھ کے ہاتھ میں تھی خدا اس قدر بے رحم ہے قدرت اس قدر سنگ دل ہے۔۔۔۔؟

ذرا شانتی ملنے پر مداری لال نے دفتر کے کلرکوں کو سرکاری حکم سناتے ہوئے کہا ''اب آپ لوگ چوکنے ہو کر رہیے سوبودھ ایسا آدمی نہیں ہے جو غلطیاں معاف کر دے''

ایک کلرک نے پوچھا ''کیا وہ بہت سخت دل ہے؟''

مداری لال نے مسکرا کر کہا ”وہ تو آپ لوگوں کو دو چار روز میں ہی معلوم ہو جائے گا میں اپنی زبان سے کسی کی شکایت کیوں کروں؟ بس اب آپ کو متنبہ کر دیا ہے کہ ذرا سنبھل کر رہیے گا آدمی قابل ہے لیکن بے حد غصیل اور کڑا غصہ تو اس کی ناک پر رہتا ہے خود ہزاروں ہضم کر جائے اور ڈکار تک نہ لے لیکن مجال جو ماتحت ایک کوڑی بھی لے سکے ایسے آدمی سے تو ایشور ہی بچائے میں تو سوچ رہا ہوں کہ رخصت لے کر گھر چلا جاؤں دونوں وقت گھر پر حاضری دینی ہوگی آپ لوگ آج سے حکومت کے نوکر نہیں، سیکرٹری صاحب کے ملازم ہیں کوئی ان کے لڑکے کو پڑھائے گا کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا کوئی انہیں اخبار سنائے گا اور چپراسیوں کو تو شاید دفتر میں درشن بھی نہ ہو سکیں گے۔“

اس طرح تمام دفتر کو سوبودھ کی طرف سے بدظن کر کے مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

(2)

اس کے ایک ہفتہ بعد جب سوبودھ چندر گاڑی سے اترا تو دفتر کے تمام اراکین کو اسٹیشن پر حاضر پایا سب ان کے استقبال کے لیے آئے مداری لال کو دیکھتے ہی سوبودھ لپک کر ان کے گلے سے لپٹ کر بولے۔

”تم خوب ملے بھائی یہاں کیسے آئے؟ مدت کے بعد تم سے ملاقات ہوئی“

مداری لال بولے ”یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہیڈ کلرک ہوں آپ تو بخیریت

ہیں نا؟''

اجی! میری نہ پوچھو بصرہ، فرانس اور مصر نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا دفتر میں ہو، یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ میری تو سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا میں تو بالکل کورا ہوں لیکن جہاں جاتا ہوں میری تقدیر میرے ساتھ رہتی ہے بصرے میں سبھی افسر خوش تھے فرانس میں بھی خوب چین کیے دو برس میں تقریباً پچاس ہزار روپیہ بنالیا لیکن سب اڑ گیا وہاں سے آ کر کچھ روز کارپوریشن کے دفتر میں مٹر گشت کرتا رہا یہاں آیا تو تم مل گئے (کلرکوں کو دیکھ کر) ''یہ سب کون ہیں''

مداری لال کے سینے پر چھریاں سی چل رہی تھیں ظالم پچاس ہزار روپیہ بصرہ سے کما لایا یہاں قلم گھستے گھستے عمر گزر گئی اور پانچ سو بھی جمع نہ ہو سکا بولے ''یہ لوگ بورڈ کے ملازم ہیں سلام کرنے آئے ہیں''

سوبودھ نے باری باری سب لوگوں سے مصافحہ کیا اور بولا

''آپ لوگوں نے ناحق تکلیف کی بے حد ممنون ہوں امید ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مجھے اپنا حاکم نہیں بھائی سمجھے! آپ لوگ مل کر اس طرح کام کیجئے کہ بورڈ کی نیک نامی کے ساتھ میں بھی سرخرو ہو سکوں آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے دوست اور لنگوٹیے یار ہیں''

ایک باتون کلرک نے کہا ''ہم سب حضور کے تابعدار ہیں حتیٰ المقدور آپ کو مطمئن کریں گے لیکن آدمی ہی تو ہیں اگر کوئی خطا ہو جائے تو بخش دیں''

سوبودھ نے کہا ''یہی میرا اصول ہے ہمیشہ یہی نظریہ رہا جہاں ماتحتوں سے دوستوں کا سلوک کیا ہم اور آپ دونوں کسی تیسرے کے غلام ہیں پھر سختی اور

حکومت کیسی ہاں ہمیں نیک نیتی سے اپنا فرض نبھانا چاہئے‘‘

جب سوبودھ کو رخصت کر کے ملازم چلے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں

’’یہ آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے‘‘

’’ہیڈ کلرک کے کہنے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب کو کچا ہی چبا جائے گا‘‘

’’پہلے سبھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں‘‘

’’یہ دکھانے کے دانت ہیں‘‘

سوبودھ کو آئے ایک مہینہ گزر گیا بورڈ کے کلرک، اردلی، چپراسی سبھی اس کے برتاؤ سے خوش تھے وہ اتنا ہنس مکھ، بامذاق اور حلیم ہے کہ جس سے ایک مرتبہ ملتا ہے اس کا دوست بن جاتا ہے کڑا لفظ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں انکار کو بھی وہ ذہن پر گراں نہیں گزرنے دیتا۔ لیکن حسد کی نگاہوں سے وصف اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے سوبودھ کے یہ سارے اوصاف مداری لال کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں وہ اس کیہر خلاف کوئی نہ کوئی ڈھونگ رچاتا ہی رہتا۔ پہلے ملازمین کو بدظن کرنا چاہا نہ کر سکا۔ بورڈ ممبران کو بھڑکانا چاہا، نا کام رہا۔ ٹھیکیدار کو ابھارنے کی سوچی منہ کی کھائی وہ چاہتا تھا کہ بھس میں آگ لگا دے اور دور سے تماشا دیکھے سوبودھ سے یوں ہنس کر ملتا، چکنی چپڑی باتیں کرتا جیسے اس کا حقیقی دوست یہی ہے لیکن گھات میں لگا رہتا سوبودھ میں اور سب خوبیاں تھیں لیکن آدمی نہ پہچان سکتے تھے وہ مداری لال کو اب بھی اپنا دوست سمجھتے تھے۔

ایک روز مداری لال سیکرٹری کے کمرے میں گئے تو کرسی خالی دیکھی کسی کام سے سوبودھ باہر چلے گئے تھے ان کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندوں میں

بندھے رکھے تھے بورڈ کے مدرسوں کے لیے کچھ لکڑی کا سامان بنوایا گیا تھا اسی کے دام تھے ٹھیکیدار وصولی کے لیے بلایا گیا تھا آج ہی سیکرٹری صاحب نے چیک بھیج کر روپے منگوائے تھے مداری لال نے برآمدہ میں جھانک کر دیکھا سو بودھ کا کہیں پتہ نہیں تھا ان کی نیت بدل گئی حسد میں تحریص شامل ہو گئی تھی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اٹھائے پتلون کی جیبوں میں ڈالے اور باہر نکل آئے چپراسی کو پکار کر پوچھا۔

''بابو جی اندر ہیں؟''

چپراسی آج ٹھیکیدار سے کچھ وصول کرنے کی خوشی میں پھول رہا تھا سامنے والے تنبولی کی دکان سے آ کر بولا

''جی نہیں کچہری میں کسی سے بات کر رہے ہیں ابھی ابھی تو گئے ہیں''

مداری لال نے دفتر میں آ کر ایک کلرک سے کہا

''یہ مسل لے جا کر سیکرٹری صاحب کو دکھاؤ''

کلرک مسل لے کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد لوٹ کر بولا ''سیکرٹری صاحب تو کمرے میں نہیں تھے میز پر رکھ آیا ہوں''

مداری لال نے منہ بنا کر کہا ''کمرہ چھوڑ کر کہاں کہاں جایا کرتے ہیں کسی روز دھوکا کھائیں گے۔''

کلرک نے کہا ''ان کے کمرے میں دفتر والوں کے سوا اور جاتا ہی کون ہے؟''

مداری لال نے تیکھے لہجہ میں کہا ''تو کیا دفتر والے سبھی دیوتا ہیں کب کس کی نیت بدل جائے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھے اچھے

لوگوں کی نیتیں بدلتی دیکھتی ہیں اس وقت ہم سب نیک منش ہیں لیکن موقع پا کر شاید ہی کوئی چوکے آدمی کی یہی فطرت ہے آپ ابھی جا کر ان کے دروازے بند کر دیجیے''

کلرک نے لوٹ کر کہا''چپراسی تو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے''

مدراسی لال نے جھنجھلا کر جواب دیا'' آپ سے جو میں نے کہا ہے وہ کیجیے کہنے لگے چپراسی کوئی رشی منی ہے۔۔۔۔''

چپراسی ہی کچھ اڑا لے تو اس کا کیا بگاڑ لیں گے! ضمانت بھی ہے تو تین سو کی یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔

یہ کہہ کر مداری لال خود اٹھے اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیئے جب دل ذرا مطمئن ہوا تو نوٹوں کے پلندے جیبوں سے نکال الماری کے کاغذات میں چھپا دیئے پھر آ کر اپنے کام میں لگ گئے۔

سو بودھ چندر تقریباً ایک گھنٹہ بعد لوٹے تو اپنے کمرے کے کواڑ بند پائے دفتر میں آ کر مسکراتے ہوئے بولے''میرا کمرہ کس نے بند کر دیا ہے، بھائی کیا میری بے دخلی ہوگئی ہے؟''

مداری لال نے کھڑے ہو کر تیکھے طنز سے کہا'' صاحب! آپ جب بھی باہر جائیں خواہ ایک منٹ کے لیے ہی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر جایا کریں آپ کی میز پر روپے پیسے اور دوسرے کاغذات بکھرے رہتے ہیں نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے میں نے ابھی سنا کہ باہر گئے ہوئے ہیں تو دروازے فوراً بند کر دیئے۔''

سوبودھ چندر کواڑ کھول کر کمرے میں گئے اور مزے سے سگار پینے لگے میز پر نوٹ دھرے ہیں اس کی انہیں خبر نہ ہوئی۔

اچانک ٹھیکیدار نے آ کر سلام کیا سوبودھ کرسی سے اٹھ بیٹھے اور بولے ''تم نے بہت دیر کر دی کافی دیر سے تمہارا منتظر ہوں دس بجے ہی روپے منگوا لیے تھے رسیدی ٹکٹ لائے ہونا۔۔۔۔۔؟''

ٹھیکیدار بولا ''رسید لکھوا تا لایا ہوں حضور''

''تو اپنے روپے لے جاؤ تمہارے کام سے میں زیادہ خوش نہیں ہوں لکڑی تم نے اچھی نہیں لگائی اور کام میں صفائی بھی کچھ زیادہ نہیں اگر آئندہ بھی ایسا ہی کام کرو گے تو ٹھیکیداری کے رجسٹر سے تمہارا نام کاٹ دیا جائے گا۔''

یہ کہہ کر سوبودھ نے میز پر نگاہ دوڑائی نوٹوں کے پلندے وہاں موجود نہ تھے سوچا، شاید کسی فائل تلے دب گئے ہوں گے، کرسی کے قریب دھرے سب کاغذات پلٹ کر دیکھے، مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہ لگا۔ ہیں! نوٹ کہاں گئے ابھی یہیں تو میں نے رکھے تھے۔۔۔۔۔؟ جا کہاں سکتے ہیں؟ پھر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگے وہ تھوڑا گھبرا گئے میز کے تمام کاغذات چھان ڈالے پلندوں کا پتہ نہیں تھا میز پر بیٹھ کر تب سے لے کر اب تک اس آدھ گھنٹہ میں گزرنے والے واقعات کا جائزہ لینے لگے مجھے خوب یاد ہے کہ چپراسی نے نوٹوں کے پلندے مجھے دیئے تھے بھلا یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے اور پھر اس قدر جلد۔۔۔۔۔میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا تھا گنا تک نہیں پھر وکیل صاحب آ گئے پرانے ملاقاتی ہیں ان سے بات کرتا ہوا ذرا اس پیڑ تک چلا گیا انہوں نے پان منگوائے بس اتنی

ہی دیر ہوئی جب گیا تھا تو پلندے موجود تھے خوب اچھی طرح یاد ہے تب یہ نوٹ کہاں غائب ہو گئے میں نے کسی صندوق الماری یا دراز میں نہیں رکھے پھر گئے تو کہاں شاید دفتر میں کسی نے محتاط رکھنے کے لیے کہیں رکھ دیئے ہوں میں یوں ہی اس قدر گھبرا یا چھی، چھی۔

فوراً دفتر میں آ کر مداری لال سے بولے ''آپ نے میری میز پر سے نوٹ اٹھا کر تو نہیں رکھ دیئے۔''

مداری لال نے متحیر ہو کر کہا ''آپ کی میز پر نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے تو کوئی خبر نہیں ابھی پنڈت موہن لال فائل لے کر آپ کے کمرے میں گئے تھے تب آپ کمرے میں نہیں تھے جب معلوم ہوا کہ آپ کسی سے باتیں کرتے کرتے چلے گئے ہیں تو دروازہ بند کروا دیا کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں۔''

سوبودھ آنکھیں پھیلا کر بولے ''اجی صاحب! پورے پانچ ہزار کے ہیں ابھی چیک تڑوایا ہے''

مداری لال نے سر پیٹ کر کہا ''پورے پانچ ہزار کے۔۔۔۔۔ تو آپ نے میز پر خوب دیکھ لیا۔''

''ابھی پندرہ منٹ سے تلاش کر رہا ہوں''

''چپراسی سے پوچھ لیا کہ کون کون آیا تھا''

''آیئے! ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجئے میرے تو ہوش اڑے ہوئے ہیں''

سارا دفتر سیکرٹری صاحب کے کمرے کی تلاشی لینے لگا میز، الماری، صندوق، سب چھان مارے رجسٹر کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے گئے مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہ

تھا کوئی اڑا لے گیا اب اس میں کوئی شبہ نہ رہا سوبودھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ذرا سا منہ نکل آیا اس وقت کوئی انہیں دیکھتا تو سمجھتا کہ مہینوں سے بیمار ہیں۔

مداری لال نے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا غضب ہو گیا اور کیا آج تک ایسا اندھیر انہ ہوا تھا مجھے یہاں کام کرتے دس برس گزر گئے کبھی کوڑی کی چیز بھی غائب نہ ہوئی میں نے پہلے دن ہی آپ کو خبر دار کر دینا چاہا تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں محتاط رہیے گا مگر قسمت میں یہی بدا تھی خیال ہی نہ رہا، یقیناً باہر سے کوئی آدمی آیا اور نوٹ اڑا کر غائب ہو گیا چپراسی کا بھی قصور ہے کہ اس نے کمرے میں ہر کسی کو داخل ہونے سے کیوں نہ روکا؟ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی آدمی نہیں آیا لیکن میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا یہاں سے محض موہن لال ہی ایک فائل لے کر گئے تھے لیکن دروازے میں سے ہی جھانک کر لوٹ آئے۔

موہن لال نے صفائی دی ''میں نے تو اندر قدم ہی نہ رکھا صاحب اپنے جوان بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر میں نے اندر قدم بھی رکھا ہو۔''

مداری لال نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا آپ فضول ہی قسمیں کھاتے ہیں کوئی آپ سے کچھ کہہ رہا ہے (سوبودھ سے کان میں کہا) اگر بنک میں کچھ روپے ہوں تو نکلوا کر ٹھیکیدار کو دے دیئے جائیں ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔

سوبودھ نے بے بس انداز میں کہا ''بنک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے بھائی جان! روپے رہتے تو کیا فکر تھی جیسے پچیس ہزار اڑ گئے ویسے تیس ہزار ہی یہاں تو کفن کے لیے بھی کوڑی نہیں''

اسی رات کو سوبودھ چندر نے خودکشی کر لی اتنے روپوں کا انتظام کرنا ان کے لیے مشکل بات تھی موت کے پردے کے سوا انہیں اپنی اس بدنامی اور بےبسی کو چھپانے کا اور کوئی ذریعہ نہ ملا۔

(4)

دوسرے روز صبح ہی چپراسی نے مداری لال کے گھر جا کر آواز دی مداری لال کو شب بھر نیند نہ آئی تھی گھبرا کر باہر نکلے چپراسی انہیں دیکھتے ہی بولا۔

''حضور! غضب ہو گیا۔۔۔۔سیکرٹری صاحب نے رات کو اپنی گردن پر چھری پھیر لی''

مداری لال کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں منہ لٹک گیا اور سارا جسم لرز اٹھا جیسے ان کا ہاتھ بجلی کے تار سے چھو گیا ہے۔

''چھری پھیر لی''

''جی ہاں! آج صبح ہی معلوم ہوا پولیس والے جمع ہیں آپ کو بلایا ہے''

''لاش ابھی پڑی ہوئی ہے؟''

''بہت سے لوگ جمع ہیں''

سب بڑے بڑے آدمی جمع ہیں حضور! لاش کی طرف تکتے نہیں بنتا کیا بھلمنسا ہیرا آدمی تھا سب لوگ رو رہے ہیں چھوٹے بڑے دو بچے ہیں ایک سیانی لڑکی ہے بیاہنے کے قابل بہو جی کو لوگ بار بار روک رہے ہیں لیکن دوڑ دوڑ کر بار بار لاش

کے قریب آ جاتی ہیں کوئی ایسا نہیں جو رومال سے آنکھیں نہیں پونچھ رہا ہو اتنے دن بھی نہیں ہوئے لیکن سب سے کس قدر میل جول تھا روپے کی تو کبھی پرواہی نہ تھی۔ دل رو رہا تھا۔

مداری لال کے سر میں چکر آنے لگا دروازے کو تھام کر اگر سہارا نہ لیتے تو شاید گر پڑتے پوچھا بہو جی بہت رو رہی ہیں۔

''کچھ نہ پوچھیے حضور! پیڑ کی پتیاں جھڑی جاتی ہیں آنکھیں پھول کر گلر ہو گئی ہیں کتنے لڑکے بتلائے تم نے''

''حضور! ایک لڑکی ہے اور دو لڑکے''

''ہاں، ہاں! لڑکوں کو تو دیکھ چکا ہوں لڑکی تو سیانی ہو گی''

''جی ہاں! بیاہنے کے لائق ہے روتے روتے بیچاری کی آنکھیں سوج گئی ہیں''

''نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہو گی''

''جی ہاں! سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دفتر کے کسی آدمی کا کام ہے داروغہ جی تو موہن لال کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن شاید آپ سے صلاح لینا چاہتے ہیں سیکرٹری صاحب تو لکھ گئے ہیں کہ میرا کسی پر شک نہیں ہے نہیں تو اب تک تہلکہ مچ جاتا سارا دفتر پھنس جاتا۔''

''کیا سیکرٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں''

''ہاں شاید چھری چلاتے وقت یاد آیا کہ دفتر کے سارے لوگ شک میں پھنس جائیں گے۔ بس کلکٹر صاحب کے نام خط لکھ دیا۔''

مداری لال کی سانس تیز ہوگئی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بڑی بوندیں گر پڑیں۔ نندو آٹھ دس سال ساتھ رہا ساتھ اٹھتے بیٹھتے ایک ساتھ کھاتے اکٹھے کھیلتے بس اس طرح رہتے تھے جیسے دو سگے بھائی ہوں'' خط میں میری کیا تعریف لکھی تھی؟ تمہیں کیا یہ معلوم ہوگا''

''آپ تو چل ہی رہے ہیں دیکھ لیجئے گا؟''

''کفن کا انتظام ہو گیا ہے؟''

''نہیں حضور! ایک بار لاش کی ڈاکٹری ہوگی ذرا آپ جلدی چلئے ایسا نہ ہو کوئی دوسرا آدمی بلانے آتا ہو''

''ہمارے دفتر کے سب لوگ آگئے ہوں گے؟''

''جی ہاں! اس محلے کے سبھی تھے''

''پولیس نے میرے بارے میں تو ان سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی''

''جی نہیں کسی سے نہیں''

مداری لال جب سوبودھ چندر کے گھر پہنچے تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے سبھی لوگ ان کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں پولیس انسپکٹر نے آتے ہی انہیں بلا کر پوچھا آپ بھی اپنا بیان لکھوا دیں اور تو سب کے بیان لکھ چکا ہوں۔۔۔۔

مداری لال نے ایسی ہوشیاری سے اپنا بیان لکھوایا کہ پولیس افسر بھی دنگ رہ گئے انہیں مداری لال پر شبہ ہوتا تھا لیکن اس بیان نے رفع کر ڈالا۔

اسی وقت سوبودھ کے دونوں بچے روتے ہوئے قریب آئے اور بولے۔

''چلیے آپ کو امی بلاتی ہیں'' دونوں مداری لال سے مانوس تھے مداری لال

یہاں تک تو روز آتے تھے، لیکن گھر میں کبھی نہ گئے تھے سوبودھ کی بیوی اس سے پردہ کرتی تھیں یہ بلاوا سن کر اس کا دل دھڑک اٹھا کہ کہیں اس کا مجھ پر شبہ نہ ہو کہیں سوبودھ نے میری ذات پر کچھ شبہ نہ ظاہر کیا ہو کچھ جھجھکتے کچھ ڈرتے اندر گئے تب بیوہ کا دل ہلا دینے والا نوحہ سن کر کلیجہ لرز اٹھا انہیں دیکھتے ہی بے بس عورت کے آنسوؤں کا سوتا کھل گیا اور لڑکی تو دوڑ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئی دونوں لڑکوں نے بھی انہیں گھیر لیا مداری لال نے ان تینوں کی آنکھوں میں ایسا غم، ایسی بے بسی کی جھلک بھری ہوئی دیکھی کہ وہ اسے سہ نہ سکے ان کی آتما انہیں ملامت کرنے لگی جن بے چاروں کو ان پر اس قدر اعتبار اتنا بھروسہ پورا روحانی تعلق اور محبت تھی۔ان کی گردن پر ہی چھری چلائی ان ہی کے ہاتھوں یہ بھرپور کنبہ خاک میں مل گیا ان بے آسرا بچوں کا کیا حال ہو گیا لڑکی کی شادی کرنی ہے کون کرے گا بچوں کی غور و پرداخت کون اٹھائے گا مداری لال کو اس قدر ذہنی کوفت اور خجالت ہوئی کہ وہ تسلی کا ایک بھی لفظ نہ کہہ سکے انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہے قد چھوٹا ہو گیا ہے انہوں نے جس وقت اڑائے تھے ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا وہ محض سوبودھ کو زچ کرنا چاہتے تھے ان کا یہ سب کچھ تباہ کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

غم کے بوجھ تلے دبی بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا ”بھیا جی! ہم لوگوں کو وہ منجدھار میں چھوڑ گئے ہیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ان کا ارادہ اس قسم کا ہے تو اپنے پاس جو کچھ تھا ان کے قدموں پر رکھ دیتی۔مجھ سے تو یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی حل ہو ہی جائے گا آپ ہی کی معرفت وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے آپ

کے اوپر انہیں اس قدر بھروسہ تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ان کے سینے پر نشتر چھو رہا ہے انہیں اپنے گلے میں کوئی چیز پھنسی معلوم ہوئی رامیشوری نے پھر کہا

"رات سوئے تو خوب ہنس رہے تھے روز کی مانند دودھ پیا اور بچوں کو پیار کیا تھوڑی دیر ہارمونیم بجایا اور منہ صاف کر کے سو رہے کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے خفیف سا بھی شبہ ہوتا مجھے دیکھ کر بولے تم یوں ہی پریشان ہوتی ہو بابو مداری لال سے پرانی دوستی ہے آخر وہ کس روز کام آئے گا میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں شہر بھر میں ان کا رسوخ ہے روپوں کا انتظام بآسانی ہو جائے گا پھر نہ جانے یہ بات کب دل میں سما گئی میں نصیبوں جلی اتنی سوئی کہ ہلی تک نہیں کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے"

مداری لال کو دنیا آنکھوں میں گھومتی نظر آئی انہوں نے بہت ضبط کیا لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب نہ روک سکے۔

رامیشوری نے آنکھیں صاف کر کے کہا "بھیا جی! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا لیکن آپ اس بے رحم کا پتہ ضرور لگایئے جس نے ہمارا سب کچھ تباہ کر ڈالا دفتر کے ہی کسی آدمی کا کام ہے آپ سے صرف یہی درخواست کرتی ہوں کہ اس ظالم کو بچ کر نہ جانے دیجئے پولیس والے اسے شاید کچھ رشوت لے کر چھوڑ دیں آپ کو دیکھ کر ان کا حوصلہ نہ ہوگا اب ہمارے سر پر آپ کے سوا اور ہے کون کس سے اپنا دکھ کہیں لاش کی یہ درگت ہونی بھی لکھی تھی"

مداری لال کے دل میں ایک مرتبہ ایسا ابال اٹھا کہ سب کچھ کہہ ڈالیں کہ میں

ہی وہ بے رحم قاتل اور کمینہ ہوں بیوہ کے قدموں پر گر پڑیں اور کہیں کہ وہ چھری اس قاتل کی گردن پر بھی چلادے۔لیکن زبان نہ کھلی اسی میں ان کے سر میں چکر سا آیا اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑے۔

تیسرے پہر لاش کا امتحان ختم ہوا ارتھی شمشان کی طرف چلی سارا دفتر سبھی حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے واہ سنسکار لڑکوں کو کرنا چاہئے لیکن لڑکے نابالغ تھے اس لیے بیوہ چلنے کو تیار ہو رہی تھی مداری لال نے کہا ’’بہو جی! سنسکار مجھے کرنے دو تم کریا پر جا بیٹھو گی تو بچوں کو کون سنبھالے گا سو بودھ میرے بھائی تھے زندگی میں ان کے ساتھ کچھ سلوک نہ کر سکا تو اب بعد میں تو کچھ ادا کرنے کا آخر میرا ابھی تو ان پر کچھ حق تھا‘‘

رامیشوری نے رو رو کر کہا ’’آپ کو بھگوان نے بڑا وسیع دل دیا ہے بھیا جی! نہیں تو مرنے پر کون کسی کو پوچھتا ہے دفتر کے اور لوگ جو آدھی رات تک ان کے ساتھ رہتے تھے جھوٹوں بات پوچھنے بھی نہ آئے کہ ذرا ڈھارس ہوتا۔‘‘

مداری لال نے واہ سنسکار کیا تیرہ دن تک کریا پر بیٹھے رہے تیرھویں روز پنڈوان ہوا۔ براہمنوں نے بھوجن کیا بھکاری کوان وان ہوا دوستوں کو دعوت دی اور یہ سب کچھ مداری لال نے اپنی گرہ سے کیا رامیشوری نے بہت کہا کہ آپ نے جتنا کیا اتنا ہی کافی ہے اب میں آپ کو اور زیادہ زیر بار نہیں کروں گی دوستی کا حق اس سے زیادہ اور کوئی کیا کرے گا مگر اس نے ایک نہ سنی سارے شہر میں اس کی نیکی کی دھوم مچ گئی دوست ہو تو ایسا ہو۔

سولہویں دن بیوہ نے کہا ’’بھیا جی! آپ نے ہمارے ساتھ جو کچھ احسان و

اعانت کی ان سے ہم مرتے دم تک سبکدوش نہیں ہو سکتے آپ نے ہماری پشت پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو اب تک نہ جانے کیا حالت ہوتی کہیں چھپنے کے لیے بھی جگہ نہ تھی اب ہمیں گھر جانے دیجئے وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا اور کچھ کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کروں گی کسی نہ کسی طرح مصیبت کے دن بھی کٹ ہی جائیں گے اسی طرح ہم پر کرم کیجئے گا''

مداری لال نے پوچھا ''گھر پر کتنی جائیداد ہے؟''

''جائیداد کیا ہوگی؟ ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھا کاشتکاری ہوگی پکا مکان بنوانا شروع کیا تھا کہ روپوں کی کمی پڑ گئی ابھی ادھورا ہی پڑا ہوا ہے دس بارہ ہزار خرچ ہو گئے اور ابھی چھت پڑنے کی نوبت نہیں آئی'' کچھ روپے بنک میں بھی ہیں یا بس کھیتی کا ہی سہارا ہے؟

''تو ان کھیتوں میں سے اس قدر پیداوار ہو جائے گی کہ تم لوگوں کا گزر بھی ہو جائے اور لگان بھی ادا کیا جا سکے؟''

''اور کر ہی کیا سکتے ہیں کسی نہ کسی طرح زندگی تو کاٹنا ہی ہے بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھا لیتی۔''

''ابھی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے''

اس کے بیاہ کی اب کوئی فکر نہیں کسانوں میں ایسے بہت سے مل جائیں گے جو کچھ لیے دیئے بغیر ہی بیاہ کر لیں گے۔

مداری لال نے کچھ سوچ کر کہا ''اگر میں کچھ صلاح دوں تو کیا مانیں گے آپ''

''بھیا جی! اگر آپ کی صلاح نہ مانوں گی تو اور کس کی مانوں گی میرا اور ہے ہی کون''

''تو آپ گھر جانے کے بجائے میرے گھر جا رہیے۔ جیسے میرے بال بچے رہیں گے ویسے ہی تم بھی، ایشور نے چاہا تو لڑکی کا بیاہ بھی کسی اچھے گھر میں ہو جائے گا۔''

بیوہ کی آنکھیں تر ہو گئیں بولی ''مگر بھیا جی! سوچیے۔۔۔۔۔۔۔''

مداری لال نے بات کاٹ کر کہا ''میں کچھ نہ سوچوں گا اور نہ کچھ عذر سنوں گا کیا دو بھائیوں کا کنبہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتا؟ سوبودھ کو میں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور ہمیشہ سمجھوں گا''

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا اسی روز مداری لال سب کو اپنے گھر لے گئے آہ! آج دس برس سے وہ ان کی پرورش کر رہے ہیں دونوں بچے کالج میں پڑھتے ہیں اور لڑکی کا کسی اچھے گھر بیاہ ہو گیا مداری لال اور ان کی بیوی تن من سے رامیشوری کی خدمت کرتے ہیں اور ان کے اشاروں پر چلتے ہیں مداری لال خدمت سے اپنے گناہوں کا پراشچت کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

گلی ڈنڈا

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''ہنس'' فروری 1929ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، فروری 1938ء (واردات)

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجا ہے اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ کورٹ کی، نہ نیٹ کی نہ بلے کی مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجئے کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے ہمارے سکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیل کھلائیں جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپے ہیں بیچارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو ٹھیک ہے گلی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں

رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلی کا داغ لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی ایسے دوست بھی ہیں جو بلے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکیٹ رکھتے ہیں خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے مجھے گلی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے وہ علی الصبح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلی ڈنڈے بنانا وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی، جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت چھات اور غریب و امیر کی کوئی تمیز نہ تھی، جس میں امیرانہ چونچلوں کی غرور اور خودنمائی کی گنجائش ہی نہ تھی اسی وقت بھولے گا جب گھر والے بگڑ رہے ہیں، والد صاحب چوکے پر بیٹھے روٹیوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں، اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں نہ نہانے کا خیال ہے نہ کھانے کا گلی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہم جولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا دبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ گلی کیسی ہو اس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا پر تھا ہمارے گلی کلب کا چیمپئن جس کی طرف وہ آجائے اس کی جیت یقینی تھی ہم سب اسے دور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا، میں پد رہا تھا لیکن کچھ

عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں، پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے مواقع پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہیں، لیکن گیا اپنا دانو لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا، منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا، گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا ''میرا دانو دے کر جاؤ پدایا تو بہادر بن کر پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟''

''تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟''

''ہاں تمہیں دن بھر پدنا پڑے گا؟''

''نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں؟''

''ہاں میرا دانو دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے''

''میں تمہارا غلام ہوں؟''

''ہاں تم میرے غلام ہو''

''میں گھر جاتا ہوں دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟''

''گھر کیسے جاؤ گے کوئی دل لگی ہے دانو دیا ہے دانو لیں گے''

''اچھا کل میں نے تمہیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو''

''وہ پیٹ میں چلا گیا''

''نکالو پیٹ سے، تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا تب میں نے کھایا میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا''

''جب تک میرا امرود نہ دو گے میں دانو نہ دوں گا''

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلایا ہو گا۔کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے دانو لینے کا کیا حق حاصل ہے رشوت دے کر تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے یہ سراسر بے انصافی ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ''میرا دانو دے کر جاؤ امرود سمرود میں نہیں جانتا''

مجھے انصاف کا زور تھا میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا

میں نے گالی دی اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا، گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا، بھاگا، میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا میں تھانے دار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہیں کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہم جولیوں سے جدا ہونے کا بالکل افسوس نہ ہوا والد صاحب افسوس کرتے تھے یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں یہاں پر سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا لیکن میں

مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں، وہاں کے انگریزی سکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے دوست کہہ رہے تھے ''تم خوش قسمت ہو، بھائی جاؤ، ہمیں تو اسی گانو میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی''

بیس سال گزر گئے میں نے انجینئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا، اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دل کش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھے وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا پرانا درخت تھا۔ وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے نام و نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں مگر وہ دنیا بدل گئی تھی جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں ''تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمہاری یاد تازہ ہے''

اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا ایک لمحے کے

لیے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں جا کر ایک لڑکے سے پوچھا ’’کیوں بیٹے! یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟‘‘

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا ’’کون گیا، گیا چمار؟‘‘

میں نے یوں ہی کہا ’’ہاں ہاں وہی گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو‘‘

’’ہاں ہے تو‘‘

’’ذرا اسے بلا سکتے ہو؟‘‘

لڑکا دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا میں نے دور ہی سے پہچان لیا اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا: ’’کہو مجھے پہچانتے ہو؟‘‘

گیا نے جھک کر سلام کیا: ’’ہاں مالک! بھلا پہچانوں گا نہیں آپ مزے میں رہے‘‘

’’بہت مزے میں تم اپنی کہو؟‘‘

’’ڈپٹ صاحب کا سائیس ہوں‘‘

’’ماتا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں کچھ خبر ہے؟‘‘

’’ماتا تو مر گیا موہن اور رودر گا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں، آپ؟‘‘

’’میں ضلع کا انجینئر ہوں‘‘

''سرکار تو پہلے ہی بڑے ذہین تھے''

''اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا ''گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار، اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی''

''آؤ آج ہم تم کھیلیں تم پدانا ہم پدیں گے تمہارا ایک دانو ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو''

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور میں ایک بڑا افسر میرا اور اس کا کیا جوڑ بیچارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کم جھینپ نہ تھی، اس لیے نہیں کہ میں گیا سے کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کا عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنا لیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دور تنہائی میں جا کر کھیلیں وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہو گا مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی اس مٹھائی کو خوب مزے لے لے کر کھائیں گے میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے ساتھا یک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے سوچا: ''تمہیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا!''

گیا جھینپتا ہوا بولا: ''میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں، قسمت میں

کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا نہیں تو میری کیا گنتی‘‘

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا ’’لیکن مجھے تو تمہاری یاد برابر آتی تھی تمہارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا‘‘

گیا نے شرماتے ہوئے کہا: ’’وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ‘‘

’’واہ، وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے تمہارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں نہ دولت میں کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے‘‘

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے چاروں طرف سناٹا تھا مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آ کر کسی وقت ہم کنول کے پھول توڑنے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آ رہی ہے میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا کھیل شروع ہو گیا۔ میں راب میں گلی رکھ کر اچھالی، گیا کے سامنے سے نکل گئی اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو گلی اس کے پیچھے جا گری، یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی وہ اپنے دائیں بائیں کہیں ہو، گلی اس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی جیسے گلیوں پر اس نے جادو کر کے انہیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوک دار گلی سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے جو گلیوں کو کھینچ لیتی ہو، لیکن آج گلی کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا مشق

کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا دانو پورا ہونے پر بھی میں کھیلے جاتا تھا حالاں کہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی گلی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور پر گر پڑتی تو میں لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا مگر نہ بولتا تھا گویا اسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں، اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا گلی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آ کر لگتی تھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد ایک بار گلی ڈنڈے میں آ لگی میں نے دھاندلی کی گلی ڈنڈے میں نہیں لگی، پاس سے گئی لیکن لگی نہیں۔

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا ''نہ لگی ہو گی''

''ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا!''

''نہیں بھیا تم بھلا بے ایمانی کرو گے!''

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا ''گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا''

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں، میرا حرج ہی کیا ہے مان گیا واہ وا، ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑا لوں

گا پھر کون انو دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا: ''لگ گئی لگ گئی ٹن سے بولی''

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا''

''ٹن سے بولی ہے سرکار!''

''اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو''

''میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا اس پر مجھے خود حیرت ہے اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا''

''ہاں سرکار کسی اینٹ سے لگی ہوگی ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی''

میں نے پھر پدانا شروع کیا، لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخ دلی سے دانو دینا طے کر لیا۔

''گیا نے کہا:'' اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیا کل پر رکھو

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا ''نہیں نہیں ابھی بہت اجالا ہے تم اپنا دانو لے لو''

''گلی سوجھے گی نہیں''

''کچھ پروا نہیں''

گیا نے پدانا شروع کیا لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی اس نے دو بار ٹل

لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا دانو پورا کر چکا بیچارہ گھنٹہ بھر پدا لیکن ایک منٹ میں ہی اپنا دانو کھو بیٹھا میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا ایک دانو اور لےلوتم تو پہلے ہی ہاتھ میں بچ گئے۔

''نہیں بھیا! اب اندھیرا ہو گیا ہے''

''تمہاری مشق چھوٹ گئی کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟''

''کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا''

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاو پر پہنچ گئے

گیا چلتے چلتے بولا: ''کل یہاں گلی ڈنڈا ہو گی سب ہی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے تم بھی آؤ گے؟ جب تمہیں فرصت ہو سب کھلاڑیوں کو بلا لوں''

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے جنہیں میں پہچان نہ سکا کھیل شروع ہوا میں موٹر میں بیٹھا تماشا دیکھنے لگا آ گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے اسے کمال معراج تک پہنچا دیا۔ کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے گیا کا کہنا تھا گلی زمین سے لگ کر اچھلی ہے اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی نوجوان دب گیا گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا میں

کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آ رہا تھا، جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا اس نے مجھے قابل رحم سمجھا میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کیں اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا میرا جی رکھ رہا تھا وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا میں اب افسر ہوں یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہم جولی نہیں بن سکتا لڑکپن تھا تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا وہ بڑا ہو گیا ہے میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

خانہ داماد

پہلی بار: ہندی میں ''گھر جوائی'' کے عنوان سے نومبر 1929ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1936ء (زادِ راہ)

جیٹھ کا دوپہر تھا ہری دھن ایک کھیت میں پانی دے آیا اور باہر بیٹھا رہا گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز بھی آ رہی تھی اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے۔ ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے مگر ہر دھن اندر نہ جا سکا ادھر ایک مہینہ سے اس کا ساتھ جو برتاؤ ہو رہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی، وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے گھبرا گیا، میں کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکا لیے بیٹھی ہوں؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بیدردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ کو بھی تو نہ نکلا کہ اماں؟ تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی اس گھر میں وہ کیسے جائے کیا پھر وہی گالیاں کھانے، وہی دل آزار باتیں سننے کے لیے اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے کیا میں کسی سے کام کم کرتا ہوں؟ دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں، اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ شام کو گھر

والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں میں بڑی رات تک گائیں، بھینس دوہتا رہتا ہوں ان سب کاموں کے لیے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا الٹی اور گالیاں سننے کو ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی ''ذرا اسے کنویں سے کھینچ تو لو، گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔''

ہری دھن ڈول لے کر کنوئیں پر گیا، اور پانی بھر لایا۔

اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی، سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی ہو رہی۔ ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا سو گیا۔

دفعتاً اس کی بیوی نے آ کر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا کیا ہے، کیا ہے، کیا پڑا بھی رہنے دے گی کیا اور پانی چاہیے؟

گمانی سخت لہجہ میں بولی، ''غراتے کیوں ہو، کھانے کو بلانے آئی ہوں''

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں اس کے بدن میں آگ لگ گئی میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ یہ لوگ مالک ہیں، میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں۔ میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے، یہ ہی گھر ہے یہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سالے غلام بنے رہتے تھے ساس منہ

چومتی رہتی تھی بیوی پوجا کرتی تھی ،تب اس کے پاس روپیہ تھا جائیداد تھی اب وہ مفلس ہے،اس کی ساری جائیداد کوان ہی لوگوں نے برباد کردیا اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہیں اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کی خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا پڑے پڑے بولا ''مجھے بھوک نہیں ہے آج نہیں کھاؤں گا''

گمانی نے کہا، ''نہ کھاؤ گے میری بلا سے !ہاں نہیں تو! کھاؤ گے تو تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا''

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا، یہ میری بیوی ہے جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ سواہا کردیا مجھے الو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں ۔وہ اب کہاں جائے کیا کرے؟

اس کی ساس آ کر بولی ''چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی روٹھتے کس سے ہو؟ یہاں تمہارے نخرے اٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے جو دیتے ہو وہ نہ دینا، اور کیا کرو گے تم کو بیٹی بیاہی ہے، کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔''

ہری دھن نے پیچ وتاب کھا کر کہا ''ہاں اماں میری غلطی تھی میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکا لوگی جب میرے پاس روپیہ تھا میں سب کچھ تھا اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھوگی''

بوڑھی ساس منہ پھلائے ہوئے چلی گئی۔

بچوں کے لیے باپ ایک فالتو سی چیز، ایک تکلف ہے۔ جیسے گائے کے لیے کھلی یا بابوؤں کے لیے چٹنی ماں دال روٹی ہے چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھیے کیا حال ہوتا ہے باپ کا درشن کبھی کبھی، شام مل جاتا ہے وہ بچہ وک اچھالتا ہے، پیار کرتا ہے اور کبھی سے گود میں لے کر انگلی پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے۔ یہ بھی اس کے فرائض کی حد ہے، وہ پردیس چلا جائے بچہ کو پروا نہیں ہوتی مگر ماں تو بچے کے لیے سبھی کچھ ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ باپ کہیں ہوا سے پروا نہیں اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہئے مگر ماں تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہئے۔ سولہ آنے اپنی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ ہے مگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے پھر تو وہ شیو جی کا ناریل ہے جس پر پھول چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دہن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا وہ سولہ سال کا تھا، مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں جیسے گھر پر اس کا حق ہی نہ رہا ہو۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں بھائی کوئی نہ تھا، بیچارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا ماں کے لیے روتا تھا، مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا جس کوٹھری میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا گھر میں بوا تھی، جو ہری دہن کو بہت چاہتی تھی اسے اب دودھ زیادہ ملتا تھا کام کم کرنا پڑتا تھا بوا بار بار پوچھتی بیٹا کیا کھاؤ گے؟ باپ بھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے، مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے

جس نے دل کو مجروح کر دیا تھا یہ لاڈ پیار بار بار اس کی ماں کی یاد دلاتا ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا، وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا، مانگ مانگ کر کھاتا تھا لڑلڑ کر کھاتا تھا اب وہ بیمار تھا اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں، مگر اسے بھوک نہیں ہے۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا، پھر تغیر واقع ہوا ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے، اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھاگئی ساری ہریالی، سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی، اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا جس دن باپ کے انتقال کی خبر اسے ملی ایک حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دنیا میں آ کر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی محبت کا سا سکھ ملا اس کی ساس نے کسی وردان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا اس میں ہریالی پیدا ہوگئی سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں، اس کی شفقت میں، سالوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بیویوں کی شکایت کرتی۔ وہ دل میں سمجھتا تھا کہ ساس مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہے باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا۔ اور اپنے حصہ کی

جائیداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے پھر واپس آ گیا اس کی دوگنی قدر و منزلت ہونے لگی۔ اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے کو خوش نصیب سمجھا۔ اب تک اسے گھر کی یاد آ جاتی تھی اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا وہ سب سے زیادہ کام کرتا اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی خاطر داری میں کمی واقع ہوتی گئی وہ پہلے دیوتا تھا، پھر گھر کا آدمی اور بالآخر گھر کا غلام ہو کر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا۔ توہین ہونے لگی، اگر گھر کے لوگ بھوکے مرتے اور ان کے ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی لیکن جب وہ دیکھتا کہ لوگ تو مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں صرف میں ہی دودھ میں مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے آہ سرد نکل جاتی ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا، اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں، اس کی مصیبت کا سب سے زیادہ دردناک پہلو تھا۔

(3)

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور بہوؤں، سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں گمانی ہاں میں ہاں ملاتی

جاتی تھی، بڑے سالے نے کہا ''ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکا تھوڑا ہی لیا ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے؟''

چھوٹا سالا بولا ''مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی، ڈانٹے بھی، اب انہیں کوئی کیا کہے نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے انہیں دے رکھے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار روپے کب کے صاف ہو گئے سوا سیر تو ایک جیو کو چاہئے''

ساس نے متانت سے کہا ''بھائی بھاری خوراک ہے''

گمانی ماں کے سر سے جوں نکال رہی تھی ''بولی نکھے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے''

بڑا سالا ''کھانے کی کوئی بات نہیں ہے جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہئے یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کٹے ہیں''

چھوٹا سالا: ''میں ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ اپنی راہ لیجئے آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے''

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس کی گھر میں کتنی آؤ بھگت ہوتی وہ بھی رانی بن کر رہتی، نہ جانے کیوں نہیں باہر جا کر کماتے ان کی نانی مر گئی ہے۔

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی طفلانہ تھے اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا اسی گھر کے نفع و نقصان کا خیال اسے بھی نہ تھا۔ وہ بھی اسی مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور

انہیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا کہ ان کے گھر والے ''سچ تو یہ ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لیں گے دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو نہ کھائیں گے پھر کپڑے تھے لگی سبھی کچھ تو ہے دس سال ہو گئے ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا گھر سے نکلتے تو جیسے ان کے پران جاتے ہیں جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی، یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے، تو اس کا کتنا جائم ہوتا ہے ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں گاؤں محلّہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے، اچھا پہننے کو کوئی کام نہیں لیا جاتا لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ وہ گھر کی لونڈی ہو جاتی ہے ان کے گھر میں میری بھی تو وہی درگت ہوگی، پھر رونا کا ہے کا جو کہو کہ کام کرتا ہے تو یہ تمہاری بھول ہے مجبوری کی اور بات ہے آدمی ڈانٹتا بھی ہے، مارتا ہے، جب چاہتا ہے رکھتا ہے جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے، کس کر کام لیتا ہے، یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔''

ہری ابھی پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہو گا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے سالے بولے ''بھیا اٹھو تیسرا پہل ڈھل گیا کب تک سوتے رہو گے؟''

ہری دھن فوراً اٹھا اور تیز لہجہ میں کہا ''کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے''

دونوں ششدر رہ گئے ''جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا اور آج یکا یک اتنا خوددار ہو جائے، یوں آستین چڑھا کر

کھڑا ہو جائے یہ انہیں ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا، کچھ جواب نہ سوجھا''

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا اسی طرح بولا میرے بھی آنکھیں ہیں اندھا نہیں ہوں نہ بہرا ہوں چھاتی پھاڑ کر کام کرتا ہوں پھر بھی کتا سمجھا جاؤں ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے

اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے ''تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔''

ہری دھن لاجواب ہو گیا کوئی بات نہ سوجھی

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا'' اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہاری ویسا ہی ہوتا رہے، تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے''

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا'' کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں؟''

بڑے: ''یہ کون کہتا ہے''

ہری: ''یہ تو تمہارے گھر کی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔''

بڑے: ''تم خود کھانے نہیں گئے کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا''

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا'' میں خود کھانے نہیں گیا کہتے تمہیں لاج نہیں آتی؟''

بڑے نے کہا'' بہن تمہیں بلانے نہیں آئی''

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا ''اماں بھی تو آئی تھیں، تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟''

ساس بھی اندر سے لپکی آ رہی تھی سن کر بولی ''کتنا کہہ ہار گئی''

''تو نہ اٹھے تو میں کیا کروں؟''

ہری دہن نے خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا

''تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لیے ہوں میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو'' بڑھیا نے اینٹھ کر کہا ''تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟''

ہری دہن شکست کھا گیا بڑھیا نے ایک جملہ کیوار سے اس کا کام تمام کر دیا اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی، پھڑ کتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے، کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟ یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اس کے دل میں چبھا جا رہا تھا نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

(5)

کل گھر نے کھانا کھایا مگر ہری دہن نہ اٹھا ساس نے منایا، سالیوں نے منایا، حسر نے منایا، دونوں سالے منا کر رہ گئے، مگر ہری دہن نہ اٹھا وہیں۔۔۔۔ دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا، اسے اٹھا کر الگ کنوئیں پر لے گیا اور

جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہو چکی تھی آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے کوئی ناچتا تھا، کوئی کودتا تھا کوئی ہنستا تھا کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع میدان کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھپ جاتا۔ ہری کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی وہ اس کا چھوٹا اپنا گھر، وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا وہ میدان جہاں کبڈی کھیلا کرتا سب اسے یاد آنے لگے پھر ممتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ان کی آنکھوں میں کتنا درد تھا کتنا رحم تھا اسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینے سے لگا لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آ رہی ہے وہ اسی دلکش تصور میں محو ہو کر رہ گیا گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگا لیا ہے اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے وہ رونے لگا، زار و قطار رونے لگا اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، اماں تم نے مجھے بھلا دیا دیکھو تمہارے پیارے لال کی کیا درگت بن رہی ہے کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لیے جگہ نہیں ہے'' دفعتاً گمانی نے آ کر پکارا، سو گئے تم، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے کب تک کوئی تمہارے لیے بیٹھا رہے؟''

ہری اٹھ بیٹھا اور تلوار سی نیام سے نکال کر بولا ''بھلا تمہیں میری سدھ آئی تو میں نے تو کہہ دیا تھا، مجھے بھوک نہیں ہے''

گمانی ''تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے؟''

ہری: ''اس گھر کا پانی نہ پیوں گا تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟''

ان مصمم ارادوں سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اٹھی بولی ''کہاں جا رہے ہو؟'' ہری نے گویا نشے میں کہا، تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں، پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا

گمانی معترض لہجہ میں بولی ''تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جا رہے ہو؟''

''تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟''

''جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی''

''تو یہ مجھے معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا، گمانی ''سنو تو'' پکارتی رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(6)

تین میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر اس کا دل بے قرار ناچنے لگا مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گیا کہ ایک جست میں وہ اوپر جا پہنچا۔ وہ

تیزی سے دوڑا جا رہا تھا، گویا اس کی ماں آغوش کھولے بلا رہی ہو جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا، جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا جہاں کے کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی لذت تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا وہاں کی ہوا میں، وہاں کی روشنی میں، گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت بس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا، جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر امنگوں سے بھر دیا وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کھانے لگا ساس کی وہ سخت کلامی بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا اس کے پاؤں پھول رہے تھے، تلوے جل رہے تھے، مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

یکا یک باغ کے رکھوالے نے پکارا ''یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے رے؟ اترا ابھی نہیں تو ایسا پتھر کھینچ ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا''

اس نے گالیاں بھی دیں مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دہن کو بڑا لطف آ رہا تھا وہ ڈالیوں میں چھپ گیا اس نے کئی آم کاٹ کر گرائے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی مگر ہری دہن یہاں کہاں؟ وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے کیسا ہنسوڑ تھا، کتنا چلبلا، نہ جانے بچارے کا کیا حال

ہو؟ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟

ڈانٹ کر بولا ''وہاں بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو ساری ہنسی نکال دوں گا نہیں تو سیدھے اتر آؤ۔''

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آ کر اس کے سر پر لگی وہ سر سہلاتا ہوا بولا یہ کون شیطان ہے نہیں مانتا ٹھہرو میں آ کر خبر لیتا ہوں'' اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے متحیر ہو کر بولا ''ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو؟

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے

''یہاں کب آئے؟ چلو گھر چلو، بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے''

ہری دھن نے مسکرا کر کہا ''منگرو ان آموں میں جو سواد اور لذت ہے اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے''

منگرو: ''سب چین ہے بھیا، تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا۔ اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے جب سے تمہارے دادا مرے ساری گرہستی چوپٹ ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے کیا ہوتا ہے''

ہری دھن: ''مجھے اب گرہستی سے کیا واسطہ؟ بھائی میں تو اپنا لے دے چکا مجوری تو ملے گی نا تمہاری گیا (گائیں) میں ہی چرایا کروں گا مجھے کھانے کو دے دینا''

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا ''ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لیے جان تک حاضر ہے، کیا سسرال میں نہ ہوگے؟ کوئی چنتا نہیں، پہلے تو تمہارا ہی گھر ہے اسے سنبھالو چھوٹے بچے ہیں ان کو پالو تم نئی اماں سے ناحق (ناحق) ڈرتے تھے۔ بڑی سیدھی ہیں بیچاری، بس اپنی ماں ہی سمجھو، تمہیں پا کر تو نہال ہو جائیں گی، اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟''

ہری دہن: ''اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا میرے لیے وہ مر گئی''

منگرو: ''تو دوسری سگائی ہو جائے گی اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو کر پیو گے پر کہیں پہلی آ گئی تو؟''

ہری دہن: ''وہ نہ آئے گی''

(7)

ہری دہن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی بھائی کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر دی اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہرم دہن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے اتنے دن ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا جہاں پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی، وہاں اب مایوسی تھی، شکست تھی اور طلب تھی، مرض کا زور گھٹ چلا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے، اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کے لیے

تیار تھا بے یار و مددگار ہری دھن اس سہارے کو پا کر بالکل مطمئن ہو گیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا ''بیٹا تم گھر آ گئے ہمارا دھنیہ بھاگ، اب ان بچوں کو پالو، ماں کا ناتا نہ سہی، باپ کا ناتا تو ہے مجھے ایک روٹی دے دینا کھا کر ایک کونے میں پڑی رہوں گی تمہاری اماں سے بہن کا ناتا ہے۔ اس ناتے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو''

ماں کے لیے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا، اس کے چہرے پر خوشی تھی اور آنکھوں میں غرور تھا اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارا دینے والا تھا کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا وہ ماں سے بولا ''تم نے سنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر بسا لیا''

کاکی نے کہا: ''گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے برادری میں ایسا اندھیر، پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔''

ہری نے کہا ''نہیں کاکی بہت اچھا ہوا، لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے گلے نہ آ پڑے، بھگوان نے میری سن لی، میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔''

☆☆☆☆☆☆

گھاس والی

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری'' دسمبر 1929ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1930ء (پریم چالیسی، دوم)

مایا ہری ہری گھاس کا گٹھا لے کر لوٹی تو اس کا گیہواں رنگ کچھ سرخ ہو گیا تھا اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں کچھ سہمی ہوئی تھیں مہابیر نے پوچھا کیا ہے مایا؟ آج کیسا جی ہے مایا نے کچھ جواب نہ دیا اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور منہ پھیر لیا۔

مہابیر نے قریب آ کر پوچھا کیا ہوا ہے؟ بتاتی کیوں نہیں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ اماں نے ڈانٹا ہے؟ کیوں اتنی اداس ہے؟

مایا نے سسک کر کہا کچھ نہیں ہوا کیا ہے اچھی تو ہوں

مہابیر نے مایا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا چپ چاپ روتی رہے گی بتائے گی نہیں۔

مایا نے سرزنش کے انداز سے کہا کوئی بات بھی ہو کیا بتا دوں

مایا اس خارزار میں گل صد برگ تھی گیہواں رنگ تھا غنچہ کا سا منہ، بیضاوی چہرہ، ٹھوڑی کھچی ہوئی، رخساروں پر دل آویز سرخی، بڑی بڑی نکیلی پلکیں، آنکھوں میں ایک عجیب التجا، ایک دلفریب معصومیت، ساتھ ہی ایک عجیب کشش معلوم نہیں چماروں کے اس گھر میں یہ اپسرا کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا اس کا نازک پھول سا جسم اس قابل تھا کہ وہ سر پر گھاس کی ٹوکری رکھ کر بیچنے جاتی اس گاؤں میں بھی

ایسے لوگ موجود تھے جو اس کے تلوؤں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس کی چتونوں کے لیے ترستے تھے جن سے اگر وہ ایک بات بھی کرتی تو نہال ہو جاتے لیکن مایا کو آئے سال بھر سے زائد ہو گیا۔ کسی نے اسے مردوں کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ وہ گھاس لینے نکلتی تو اس کا گندمی رنگ طلوع کی سنہری کرنوں سے کندن کی طرح دمک اٹھتا۔ گویا بسنت اپنی ساری شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی جاتی ہو کوئی غزلیں گاتا کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھتا پر مایا آنکھیں نیچی کیے اپنی راہ چلی جاتی تھی لوگ حیران ہو کر کہتے اتنا غرور اتنی بے نیازی مہابیر میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں ایسا جوان بھی تو نہیں نہ جانے کیسے اس کے ساتھ رہتی ہے چاند میں گہن لگ جاتا ہو گا۔

مگر آج ایک ایسی بات ہو گئی جو چاہے اس ذات کی دوسری نازنینوں کے لیے دعوت کا پیغام ہوتی مایا کے لیے زخم جگر سے کم نہ تھی صبح کا وقت تھا ہوا آم کے بور کی خوشبو سے متوالی ہو رہی تھی آسمان زمین پر سونے کی بارش کر رہا تھا مایا سر پر ٹوکری رکھے گھاس چھیلنے جا رہی تھی کہ دفعتاً نوجوان چین سنگھ سامنے سے آتا دکھائی دیا مایا نے چاہا کہ کترا کر نکل جائے مگر چین سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا مایا کیا تجھے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔

مایا کا وہ پھول سا چہرہ شعلہ کی طرح دہک اٹھا وہ ذرا بھی نہیں ڈری ذرا بھی نہیں جھجکی جھوا زمین پر گرا دیا اور بولی مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں چیختی ہو۔

چین سنگھ کو آج زندگی میں یہ نیا تجربہ ہوا۔ نیچی ذاتوں میں حسن کا اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کا کھلونا بنے ایسے کتنے ہی معرکے اس

نے جیتے تھے پر آج مایا کے چہرے کا وہ رنگ، وہ غصہ، وہ غرور، وہ تمکنت دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے اس نے خفیف ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا مایا تیزی سے آگے بڑھ گئی چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیس ہونے لگتی ہے مایا جب کچھ دور نکل گئی تو غصہ اور خوف اور اپنی بے کسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے کچھ دیر تک تو ضبط کیا پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اگر وہ اتنی غریب نہ ہوتی تو کسی کی مجال تھی کہ اس طرح کی آبرو لوٹ لیتا وہ روتی جاتی تھی اور گھاس چھیلتی جاتی تھی مہابیر کا غصہ وہ جانتی تھی اگر اس سے کہہ دے تو وہ اس ٹھاکر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا پھر نہ جانے کیا ہو اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اسی لیے اس نے مہابیر کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

دوسرے دن مایا گھاس کے لیے نہ گئی ساس نے پوچھا تو کیوں نہیں جاتی اور سب تو چلی گئیں مایا نے سر جھکا کر کہا میں اکیلی نہ جاؤں گی۔

ساس نے کہا اکیلے کیا تجھے باگھ اٹھا لے جائے گا کیوں اوروں کے ساتھ نہیں چلی گئی

مایا نے اور بھی سر جھکا لیا اور نہایت دبی ہوئی آواز میں بولی میں اوروں کے ساتھ نہ جاؤں گی۔

ساس نے ڈانٹ کر کہا نہ تو اوروں کیساتھ جائے گی، نہ اکیلی جائے گی، تو پھر کیسے جائے گی؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں نہ جاؤں گی۔ تو یہاں میرے گھر میں رانی بن کر نباہ نہ ہو گا کسی کو چام نہیں پیارا ہوتا کام پیارا ہوتا ہے تو

بڑی سندر ہے تو تیری سندرتا لے کر چاٹوں۔ اٹھا جھوا اور جا گھاس لا۔

دروازہ پر نیم کے درخت کے سایہ میں کھڑا مہابیر گھوڑے کو مل رہا تھا اس نے ملیا کو روئی صورت بنائے جاتے دیکھا پر کچھ بول نہ سکا اس کا بس چلتا تو ملیا کو کلیجہ میں بٹھا لیتا۔ آنکھوں میں چھپا لیتا لیکن گھوڑے کا پیٹ بھرنا تو ضروری تھا گھاس مول لے کر کھلائے تو بارہ آنے سے کم خرچ نہ ہوں اسے مزدوری ہی کیا ملتی ہے مشکل سے ڈیڑھ دو روپے وہ بھی کبھی ملے کبھی نہ ملے۔

برا ہوا ان موٹر لاریوں کا اب یکے کو کون پوچھتا ہے مہاجن سے ڈیڑھ سو روپے قرض لے کر یکہ اور گھوڑا خریدا تھا اس کے سود کے بھی نہیں پہنچتے اصل کا ذکر ہی کیا ظاہر داری کی نہ جی چاہتا ہو نہ جا، دیکھی جائے گی۔

ملیا نہال ہو گئی آب گوں آنکھوں میں محبت کا سرور جھلک اٹھا بولی گھوڑا کھائے گا کیا؟

آج اس نے کل کا راستہ چھوڑ دیا اور کھیتوں کی مینڈھوں سے ہوتی ہوئی چلی بار بار خائف نظروں سے ادھر ادھر تاکتی جاتی تھی دونوں طرف اوکھ کے کھیت کھڑے تھے ذرا بھی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو اس کا جی سن سے ہو جاتا کوئی اوکھ میں چھپا بیٹھا نہ ہو مگر کوئی نئی بات نہ ہوئی اوکھ کے کھیت نکل گئے آموں کا باغ نکل گیا، سینچے ہوئے کھیت نظر آنے لگے دور ایک کنویں پر پر چل رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہری ہری گھاس جمی ہوئی تھی ملیا کا جی للچایا یہاں آدھ گھنٹہ میں جتنی گھاس چھل سکتی ہے اتنی خشک میدان میں دوپہر تک بھی نہ چھل سکے گی۔ یہاں دیکھتا ہی کون ہے؟ کوئی پکارے تو چپکے سے سرک جاؤں گی وہ بیٹھ کر گھاس چھیلنے لگی اور ایک گھنٹہ

میں اس کا جھابا آدھے سے زیادہ بھر گیا اپنے کام میں اتنی محو ہو گئی کہ اسے چین سنگھ کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی یکا یک آہٹ پا کر سر اٹھایا تو چین سنگھ کھڑا تھا۔

مایا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا جی میں آیا کہ بھاگ جائے جھابا وہیں الٹ دے اور خالی جھابا لے کر چلی جائے پر چین سنگھ نے کئی گز کے فاصلہ پر ہی رک کر کہا ڈر مت، ڈر مت، بھگوان جانے میں منہ سے کچھ نہ بولوں گا خوب چھیل لے میرا ہی کھیت ہے۔

مایا کے ہاتھ مفلوج سے ہو گئے کھرپی ہاتھ میں جم سی گئی گھاس نظر ہی نہ آتی تھی جی چاہتا تھا دھرتی پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں، زمین آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔

چین سنگھ نے دلاسا دیا چھیلتی کیوں نہیں، میں منہ سے کچھ کہتا تھوڑے ہی ہوں یہیں روز چلی آیا کر میں چھیل دیا کروں گا۔

مایا بت بنی بیٹھی رہی اس کے سینے میں اب اتنی دھڑکن نہ تھی

چین سنگھ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بولا تو مجھ سے اتنا کیوں ڈرتی ہے کیا تو سمجھتی ہے میں تجھے ستانے آیا ہوں ایشور جانتا ہے کل بھی تجھے ستانے کے لیے تیرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا تجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہاتھ بڑھ گئے مجھے کچھ سدھ ہی نہ رہی تو چلی گئی تو میں وہیں بیٹھ کر گھنٹوں روتا رہا جی میں آتا تھا اس ہاتھ کو کاٹ ڈالوں، کبھی جی چاہتا زہر کھا لوں تبھی سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں آج تو ادھر سے چلی آئی میں سارے بار میں مارا مارا پھرا کیا اب جو سزا تیرے جی میں آوے دے اگر تو میرا سر بھی کاٹ لے تو گردن نہ ہلاؤں گا میں شہدا ہوں، لچا ہوں، لیکن جب

سے تجھے دیکھا ہے نہ جانے کیوں میرے من کی کھوٹ مٹ گئی اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ تیرا کتا ہوتا اور تیرے پیچھے پیچھے چلتا تیرا گھوڑا ہوتا تب تو تو کبھی کبھی میرے منہ پر ہاتھ پھیرتی تو مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں کسی طرح یہ چولا تیرے کام آوے۔ میرے من کی یہی سب سے بڑی لالسا ہے، روپیہ، پیسہ، اناج، پانی بھگوان کا دیا سب گھر میں ہے بس تیری دیا چاہتا ہوں میری جوانی کام نہ آوے اگر میں کسی کھوٹ سے یہ باتیں کر رہا ہوں بڑا بھاگوان تیرا مہابیرہ ایسی دیوی اسے ملی۔

ملیا چپ چاپ سنتی رہی پھر سر نیچا کر کے بھولے پن سے بولی تو تم مجھے کیا کرنے کہتے ہو؟

چین سنگھ اور قریب آ کر کہا بس تیری دیا چاہتا ہوں

ملیا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کا شرمیلا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا چبھتے ہوئے لفظوں میں بولی تم سے ایک بات پوچھوں برا تو نہ مانو گے؟ تمہارا بیاہ ہو گیا ہے یا نہیں؟

چین سنگھ نے دبی زبان سے کہا بیاہ تو ہو گیا ہے ملیا لیکن بیاہ کیا ہے کھلواڑ ہے

ملیا کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہو گیا بولی اگر اسی طرح مہابیر تمہاری عورت کو چھیڑتا تو تمہیں کیسا لگتا؟ تم اس کی گردن کاٹنے پر تیار ہو جاتے کہ نہیں؟

بولو کیا سمجھتے ہو مہابیر چمار ہے تو اس کے بدن میں لہو نہیں ہے شرم نہیں آتی ہے، اپنی اجت آبرو کا کھیال نہیں ہے میرا روپ رنگ تمہیں بھاتا ہے کیا مجھ سے

بہت سندر عورتیں، شہر میں ندی کے گھاٹ پر نہیں گھوما کرتیں میرا منہ ان کی تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتا تم ان میں سے کسی سے کیوں دیا نہیں مانگتے کیا ان کے پاس دیا نہیں ہے مگر تم وہاں نہ جاؤ گے کیونکہ وہاں جاتے تمہاری چھاتی دہلتی ہے مجھ سے دیا مانگتے ہو اسی لیے تو کہ میں چمارن ہوں، نیچ جات ہوں اور نیچ جات کی عورت ذرا سی آرزو منتی، یا ذرا سے لالچ یا ذرا سی گھڑکی دھمکی سے قابو میں آ جاتی ہے کتنا سستا سودا ہے ٹھاکر ہو نہ ایسا سستا سودا کیوں چھوڑنے لگے۔

چین سنگھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا بلکہ سینکڑوں جوتے پڑ گئے خفت آمیز لہجہ میں بولا یہ بات نہیں ہے ملیا میں سچ کہتی ہوں اس میں اونچ نیچ کی بات نہیں ہے سب آدمی برابر ہیں میں تو تیرے چرنوں پر سر رکھنے کو تیار ہوں۔

ملیا طنز سے بولی اسی لیے تو کہ جانتے ہو میں کچھ نہیں سکتی جا کر کسی کھترانی یا ٹھکرائن کے چرنوں پر سر رکھو تو معلوم ہو کہ چرنوں پر سر رکھنے کا کیا پھل ملتا ہے پھر یہ تمہاری گردن پر نہ رہے گا۔

چین سنگھ مارے شرم کے زمین پر گڑا جاتا تھا اس کا منہ خشک ہو گیا تھا کہ جیسے مہینوں کی بیماری کے بعد اٹھا ہو منہ سے بات نہ نکلتی تھی ملیا اتنی ذی فہم ہے اس کا گمان بھی نہ تھا۔

ملیا نے پھر کہا میں بھی روز بجار جاتی ہوں بڑے بڑے گھروں کا حال جانتی ہوں، مجھے کسی بڑے گھر کا نام بتا دو۔ جس میں کوئی سائیس، کوئی کوچوان، کوئی کہار، کوئی پنڈا، کوئی مہراج نہ گھسا بیٹھا ہو یہ سب بڑے گھروں کی لیلا ہے اور وہ عورتیں جو کچھ کرتی ہیں ٹھیک کرتی ہیں ان کے مرد بھی تو چمارنوں اور کہارنوں پر

جان دیتے پھرتے ہیں لینا دینا برابر ہو جاتا ہے بیچارے گریب آدمیوں کے لیے یہ راگ رنگ کہاں؟ مہابیر کے لیے سنسار میں جو کچھ ہوں میں ہوں وہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا سنجوگ کی بات ہے کہ میں جرا سندر ہوں لیکن میں کالی کلوٹی ہوتی تب بھی مہابیر مجھے اسی طرح رکھتا۔ اس کا مجھے بھروسا ہے میں چمارن ہو کر بھی اتنی کمینی نہیں ہوں کہ جو اپنے اوپر بھروسے کرے اس کے ساتھ دگا کروں ہاں مہابیر اپنے من کی کرنے لگے میری چھاتی پر مونگ دلے تو میں بھی اس کی چھاتی پر مونگ دلوں گی تم میرے روپ ہی کے دیوانے ہو نہ؟ آج مجھے ماتا نکل آئے کافی ہو جاؤں تو میری طرف تاکو گے بھی نہیں بولو جھوٹ کہتی ہوں؟

چین سنگھ انکار نہ کر سکا

ملیا نے اسی ملامت آمیز لہجہ میں کہا لیکن میری ایک نہیں، دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں تب بھی مہابرے کی آنکھ نہ پھرے گی مجھے اٹھاوے گا بٹھاوے گا، کھلاوے گا، سلاوے گا، کوئی ایسی سیوا نہیں ہے جو وہ اٹھا رکھے تم چاہتے ہو میں ایسے آدمی سے دگا کروں، جاؤ اب مجھے کبھی نہ چھیڑنا نہیں اچھا نہ ہوگا۔

جوانی کا جوش ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے، قوت ہے اور وہ سب کچھ زندگی کو روشن، پاکیزہ اور مکمل بنا دیتا ہے جوانی کا نشہ ہے، نفس پروری ہے رعونت ہے، ہوس پرستی ہے، خود مطلبی ہے اور وہ سب کچھ جو زندگی کو بہمیت، زوال اور بدی کی جانب لے جاتا ہے چین سنگھ پر جوانی کا نشہ تھا ملیا نے ٹھنڈے چھینٹوں سے نشہ اتار دیا عورت جتنی آسانی سے دین اور ایمان کو غارت کر سکتی ہے اتنی ہی آسانی

سے ان کو قوت بھی عطا کر سکتی ہے وہی چین سنگھ جو بات بات پر مزدوروں کو گالیاں دیتا تھا اسامیوں کو پیٹتا تھا اب اتنا خلیق اتنا متحمل، اتنا منکسر ہو گیا تھا کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔

کئی دن گزر گئے ایک دن شام کو چین سنگھ کھیت دیکھنے گیا پر چل رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک جگہ نالی ٹوٹ گئی ہے اور سارا پانی بہا چلا جا رہا ہے کیاری میں بالکل پانی نہ پہنچتا تھا مگر کیاری بنانے والی عورت چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اسے اس کی ذرا بھی فکر نہیں تھی کہ پانی کیوں نہیں آتا پہلے یہ لاپروائی دیکھ کر چین سنگھ آپے سے باہر ہو جاتا اس عورت کی پورے دن کی مزدور کاٹ لیتا اور پر چلانے والوں کو گھڑکیاں جماتا پر آج اسے غصہ نہیں آیا اس نے مٹی لے کر نالی باندھ دی اور بڑھیا کے پاس جا کر بولا تو یہاں بیٹھی ہے اور پانی سب بہا جا رہا ہے۔

بڑھیا کو تھر تھر کانپتے دیکھ کر چین سنگھ نے اس کی دل جمعی کرتے ہوئے کہا بھاگ مت میں نے نالی بند کر دی ہے بڑھو کئی دن سے نہیں دکھائی دیے کہیں کام دھندھا کرنے جاتے ہیں کہ نہیں؟

بڑھیا کا سکڑا ہو چہرہ چکنا ہو گیا بولی آج کل تو ٹھالی ہی بیٹھے ہیں بھیا کہیں کام نہیں لگتا۔

چین سنگھ نے نرمی سے کہا تو ہمارے یہاں لگا دے تھوڑا سا سن رکھا ہے کات دیں یہ کہتا ہوا وہ کنویں کی جانب چلا گیا وہاں چار پر چل رہے تھے پر اس وقت دو ہکولے بیر کھانے گئے ہوئے تھے چین سنگھ کو دیکھتے ہی باقی مزدوروں کے ہوش اڑ گئے اگر ٹھاکر نے پوچھا دو آدمی کہاں گئے تو کیا جواب دیں گے سب کے سب

ڈانٹے جائیں گے بیچارے دل میں سہمے جا رہے تھے کہ دیکھ سر پر کون آفت آتی ہے

چین سنگھ نے پوچھا وہ دونوں کہاں گئے؟

ایک مزدور نے ڈرتے ڈرتے کہا دونوں کسی کام سے ابھی چلے گئے ہیں بھیا

دفعتاً دونوں مزدور دھوتی کے ایک کونے میں بیر بھرے آتے دکھائی دیے دونوں خوش خوش چلے آرہے تھے چین سنگھ پر نگاہ پڑی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے اب نہ آتے بنتا ہے نہ جاتے دونوں سمجھ گئے کہ آج بے طرح مار پڑی، شاید مزدوری بھی کٹ جائے، شش و پنج کی حالت میں کھڑے تھے کہ چین سنگھ نے پکارا آؤ، بڑھ آؤ، کیسے بیر ہیں؟ ذرا مجھے بھی دکھاؤ میرے ہی باغ کے ہیں نہ؟

دونوں اور بھی تھرا اٹھے آج ٹھاکر جیتا نہ چھوڑے گا شاید سر کے بال بھی نہ بچیں بھگو بھگو کر لگائے گا۔

چین سنگھ نے پھر کہا جلدی آؤ جی، کھڑے کیا ہو، مگر پکی پکی سب میں لے لوں گا کہے دیتا ہوں ذرا ایک آدمی لپک کر گھر سے تھوڑا سا نمک تو لے لو (مزدوروں) چھوڑ دوپہر، آؤ بیر کھاؤ اس باغ کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں کام تو کرنا ہی ہے۔

دونوں خطاواروں کو اب کچھ تشفی ہوئی آکر سارے بیر چین سنگھ کے سامنے رکھ دیے ایک مزدور نمک لانے دوڑا ایک نے کنوئیں سے لٹیا ڈور سے پانی نکالا چین سنگھ چرسے کیا پانی نہ پیتا تھا آدھ گھنٹہ تک چاروں پر بندھ رہے سبھوں نے خوب بیر کھائے جب سب بیر اڑ گئے تو ایک مجرم نے ہاتھ جوڑ کر کہا بھاجی آج جان بکسی ہو جائے بڑی بھوک لگی تھی نہیں تو کام چھوڑ کر نہ جاتے۔

چین سنگھ نے ہمدردانہ انداز سے کہا تو اس میں برائی کیا ہوئی میں نے بھی تو بیر کھائے آدھ گھنٹہ کا ہرج ہوا اتنا ہی تو تم چاہو گے تو گھنٹہ بھر کا کام آدھ گھنٹہ میں کرلو گے نہ چاہو گے تو دن بھر میں بھی گھنٹہ بھر کا کام نہ ہو گا۔

چین سنگھ چلا گیا تو چاروں باتیں کرنے لگے۔

ایک نے کہا مالک اس طرح رہے تو کام کرنے میں جی لگتا ہے یہ نہیں کہ ہر دم چھاتی پر سوار۔

دوسرا: میں نے تو سمجھا آج کچا ہی کھا جائے گا

چوتھا: سانجھ کو پوری مجوری ملے تو کہنا

پہلا: تم تو ہو گوبر گنیں آدمی کا رکھ نہیں پہچانتے

دوسرا: اب خوب دل لگا کر کام کریں گے

تیسرا: جب انہوں نے ہمارے اوپر چھوڑ دیا تو ہمارا بھی دھرم ہے کہ اپنا کام سمجھ کر کام کریں۔

چوتھا: مجھے تو بھیا ٹھاکر پر اب بھی بسواس نہیں آتا

ایک دن چین سنگھ کو کسی کام سے کچہری جانا تھا پانچ میل کا سفر تھا یوں تو وہ برابر اپنے گھوڑے پر جایا کرتا تھا پر آج دھوپ تیز تھی سوچا یکے پر چلا چلوں مہابیر کو کہلا بھیجا مجھے بھی لیتے جانا۔ کوئی نو بجے مہابیر نے پکارا، چین سنگھ تیار بیٹھا تھا چٹ پٹ یکے پر بیٹ گیا مگر گھوڑا اتنا دبلا ہو رہا تھا یکے کی گدی اتنی میلی اور پھٹی ہوئیں ارا سامان اتنا بوسیدہ کہ چین سنگھ کو یکے پر بیٹھتے شرم آتی تھی پوچھا یہ سامان کیوں بگڑا ہوا ہے مہابیر، تمہارا گھوڑا تو کبھی اتنا دبلا نہ تھا کیا آج کل سواریاں کم ہیں؟

مہابیر نے کہا مالک سواریاں کم نہیں ہیں مگر لاریوں کے سامنے یکے کو کون پوچھتا ہے کہاں دو ڈھائی، تین کی مجوری کر کے گھر لوٹتا تھا کہاں اب بیس آنے کے پیسے بھی نہیں ملتے کیا جانور کو کھلاؤں، کیا آپ کھاؤں، بڑی بپت میں پڑا ہوا ہوں سوچتا ہوں کہ یکہ، گھوڑا بیچ کر آپ لوگوں کی مجوری کروں پر کوئی گاہک نہیں لگتا جیادہ نہیں تو بارہ آنے تو گھوڑے ہی کو چاہئے گھاس اوپر سے جب اپنا ہی پیٹ نہیں چلتا تو جانور کو کون پوچھے۔

چین سنگھ نے اس کے پھٹے ہوئے کرتے کی طرف دیکھ کر کہا دو چار بیگھے کی کھیتی کیوں نہیں کر لیتے کھیت مجھ سے لے لو۔

مہابیر نے معذوری کے انداز سے سر جھکا کر کہا کھیتی کے لیے بڑی ہمت چاہیے مالک میں نے بھی سوچا ہے کوئی گاہک لگ جائے تو یکے کو اونے پونے نکال دوں پھر گھاس چھیل کر بجار لے جایا کروں آج کل ساس بہو دونوں گھاس چھیلتی ہیں تب جا کر دس بارہ آنے پیسے نصیب ہوتے ہیں۔

چین سنگھ نے پوچھا تو بڑھیا بجار جاتی ہوگی؟

مہابیر شرماتا ہوا بولا نہیں راجہ وہ اتنی دور کہاں چل سکتی ہے گھر والی چلی جاتی ہے دوپہر تک گھاس چھیلتی ہے تیسرے پہر بجار جاتی ہے وہاں سے گھڑی رات گئے لوٹتی ہے ہلکان ہو جاتی ہے بھیا مگر کیا کروں تکدیر سے کیا جور۔

چین سنگھ کچہری پہنچ گیا مہابیر سواریوں کی ٹوہ میں شہر کی طرف چلا گیا چین سنگھ نے اسے پانچ بجے آنے کو کہہ دیا۔

کوئی چار بجے چین سنگھ کچہری سے فرصت پا کر باہر نکلا احاطے میں پان کی

دکان تھی احاطے کے باہر پھاٹک سے ملا ہوا ایک برگد کا درخت تھا اس کے سایہ میں بیسیوں ہی یکے تانگے بگھیا کھڑی تھیں۔ گھوڑے کھول دیے گئے تھے وکیلوں، مختاروں اور افسروں کی سواریاں یہیں کھڑی رہتی تھیں۔ چین سنگھ نے پانی پیا، پان کھایا اور سوچنے لگا کوئی لاری مل جائے تو ذرا شہر کی سیر کر آؤں کہ یکا یک اس کی نگاہ ایک گھاس والی پر پڑی سر پر گھاس کا جھابا رکھے سائیسوں سے مول بھاؤ کر رہی تھی چین سنگھ کا دل اچھل پڑا یہ تو ملیا ہے کتنی بنی ٹھنی کئی کوچبان جمع ہو گئے تھے کوئی اس سے مذاق کرتا تھا کوئی گھورتا تھا کوئی ہنستا تھا۔

ایک کالے کلوٹے کوچبان نے کہا ملیا گھاس تو اڑ کے چھ آنے کی ہے۔

ملیا نے نشہ خیز آنکھوں سے دیکھ کر کہا چھ آنے پر لینا ہے تو وہ سامنے گھسیارنیں بیٹھی ہیں چلے جاؤ دو چار پیسے کم میں پا جاؤ گے میری گھاس تو بارہ آنے ہی میں جائے گی۔

ایک ادھیڑ عمر کوچبان نے فٹن کے اوپر سے کہا تیرا جمانا ہے بارہ آنے نہیں ایک روپیہ مانگ بھائی لینے والے جھک ماریں گے اور لیں گے نکلنے دے وکیلوں کو اب دیر نہیں ہے

ایک تانگے والے نے جو گلابی پگڑی باندھے ہوئے تھا کہا بڈھو کے منہ میں بھی پانی بھر آیا اب ملیا کا مجاج کاہے کو ملے گا۔

چین سنگھ کو ایسا غصہ آرہا تھا کہ ان بدمعاشوں کی جوتوں سے خبر لے سب کے سب اس کی طرف کیسا ٹکٹکی لگائے تاک رہے ہیں گویا آنکھوں سے پی جائیں گے اور ملیا بھی یہاں کتنی خوش ہے نہ لجاتی ہے نہ جھجکتی ہے نہ بگڑتی ہے، کیسا مسکرا مسکرا کر رسیلی چتونوں سے دیکھ دیکھ کر سر کا آنچل کھسکا کھسکا کر، منہ موڑ موڑ کر

باتیں کر رہی ہے۔ وہی ملیا جو شیرنی کی طرح تڑپ اٹھتی تھی۔

ذرا دیر میں وکیل مختاروں کا ایک میلا سائکل پڑا کوچبان نے بھی چٹ پٹ گھوڑے جوتے ملیا پر چاروں طرف عینک بازوں کی مشتاق، مستانہ، قدرانہ، ہوسناک نظریں پڑنے لگیں، ایک انگریزی فیشن کے بھلے آدمی آ کر اس فٹن پر بیٹھ گئے اور ملیا کو اشارے سے بلایا کچھ باتیں ہوئیں ملیا نے گھاس پائدان پر رکھی ہاتھ پھیلا کر اور منہ موڑ کر کچھ لیا پھر مسکرا کر چل دی فٹن بھی روانہ ہوگئی۔

چین سنگھ پان والے کی دکان پر خود فراموشی کی حالت میں کھڑا تھا پان والے نے دکان بڑھائی کپڑے پہنے اور کیبن کا دراوزہ بند کر کے نیچے اترا تو چین سنگھ کو ہوش آیا پوچھا کیا دکان بند کر دی؟

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے کہا اس کی دوا کرو ٹھا کر صاحب یہ بیماری اچھی نہیں ہے۔

چین سنگھ نے استعجاب سے پوچھا کیسی بیماری؟

پان والا بولا کیسی بیماری؟ آدھ گھنٹہ سے یہاں کھڑے ہو جیسے بدن میں جان ہی نہیں ہے ساری کچہری خالی ہوگئی مہتر تک جھاڑو لگا کر چل دیے تمہیں کچھ خبر ہوئی؟ جلدی دوا کر ڈالو۔

چین سنگھ نے چھڑی سنبھالی اور پھاٹک کی طرف چلا کہ مہابیر کا یکہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

یکہ کچھ دور نکل گیا تو چین سنگھ نے پوچھا آج کتنے پیسے کمائے مہابیر؟

مہابیر نے ہنس کر کہا آج تو مالک دن بھر کھڑا ہی رہ گیا کسی نے بیگار میں بھی

نہ پکڑا اوپر سے چار پیسے کی بیڑیاں پی گیا۔

چین سنگھ نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا میری ایک صلاح مانو عزت ہماری اور تمہاری ایک ہے تم مجھ سے ایک روپیہ روزانہ لے لیا کرو بس، جب بلاؤں تو یکہ لے کر آ جاؤ تب تو تمہاری گھر والی کو گھاس کو لے کر بازار نہ آنا پڑے گا بولو منظور ہے؟

مہابیر نے مشکور نظروں سے دیکھ کر کہا "مالک آپ ہی کا تو کھاتا ہوں پر جا بھی آپ ہی کا ہوں جب مرجی ہو بلوا لیجئے۔۔۔۔۔آپ سے روپے۔۔۔۔"

چین سنگھ نے بات کاٹ کر کہا نہیں میں تم سے بیگار نہیں لینی چاہتا تم مجھ سے ایک ایک روپیہ روز لے جایا کرو گھر والی کو گھاس لے کر بازار مت بھیجا کرو ہاں دیکھو، مایا سے بھول کر بھی اس کی چرچا نہ کرنا نہ اور کسی سے کچھ کہنا۔

کئی دنوں کے بعد شام کو مایا کی ملاقات چین سنگھ سے ہوئی وہ اسامیوں سے لگان وصول کر کے گھر کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ اسی جگہ جہاں اس نے مایا کی بانہہ پکڑی تھی مایا کی آواز اس کے کانوں میں آئی اس نے ٹھٹک کر دیکھا تو مایا دوڑی چلی آ رہی تھی بولا: کیا ہے مایا؟ دوڑ مت دوڑ مت میں تو کھڑا ہوں۔

مایا نے ہانپتے ہوئے کہا: اب میں گھاس بیچنے نہیں جاتی کئی دن سے تم سے ملنا چاہتی تھی پر تم کہیں ملتے نہ تھے اور تمہارے گھر جا نہ سکتی تھی آج تمہیں دیکھ کر دوڑی اس پیپل کے پاس سے دوڑی آ رہی ہوں۔۔۔۔

چین سنگھ نے پیپل کی طرف دیکھ کر معذرت کے انداز سے کہا ناحق اتنی دور دوڑی پسینے پسینے ہو رہی ہے تو نے بڑا اچھا کیا کہ بازار جانا چھوڑ دیا۔

مایا نے پوچھا: تم نے مجھے کبھی گھاس بیچتے دیکھا ہے کیا؟

چین سنگھ :ہاں ایک دن دیکھا تھا کیا مہابیر نے تجھ سے سب کچھ کہہ ڈالا؟ میں نے تو منع کیا تھا

مایا:وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا

دونوں ایک لمحہ تک خاموش کھڑے رہے یکا یک مایا نے مسکرا کر کہا یہیں تم نے میری بانہہ پکڑی تھی۔

چین سنگھ شرمندہ ہو کر بولا ''اس کو بھول جاؤ مولا دیوی مجھ پر نہ جانے کون بھوت سوار تھا۔''

مایا نے بھرائی آواز میں کہا:اسے کیوں بھول جاؤں اسی ہاتھ پکڑنے کی لاج تو نبھار ہے ہو گریبی آدمی سے جو چاہے کرا دے تم نے مجھے ڈوبنے سے بچالیا۔

پھر دونوں چپ ہو گئے

ذرا دیر بعد مایا نے شرارت آمیز انداز سے پوچھا تم نے سمجھا ہو گا میں ہنسنے بولنے میں مگن ہو رہی تھی؟ کیوں؟

چین سنگھ نے زور دے کر کہا نہیں مایا مجھے ایسا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں آیا اتنا کمینہ نہ سمجھ۔

مایا مسکرا کر بولی مجھے تم سے یہی آسا تھی

ہوا سینچے ہوئے کھیتوں میں آرام کرنے جا رہی تھی آفتاب افق کی گود میں آرام کرنے جا رہا تھا اور اس دھندلی روشنی میں کھڑا چین سنگھ مایا کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

مریدی

پہلی بار: کتابی صورت میں 1929ء (فردوس خیال)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کی اطلاع نہیں ہے

گھر کے جھگڑوں اور عورتوں کے فقدان سے پنڈت چنتا سن کے دل میں ترک وغنا کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے سنیاس لے لیا اس وقت ان کے دلی دوست پنڈت موٹے رام جی شاستری نے انہیں یوں نصیحت کی۔

''دوست! ہمارا اچھے اچھے سادھو مہاتماؤں سے ساتھ رہا ہے۔ وہ جب کسی بھلے مانس کے دروازے پر جاتے ہیں تو گڑ گڑا کر ہاتھ نہیں پھیلاتے اور جھوٹ موٹ آشیر باد نہیں دینے لگتے کہ نارائن تمہارا چولا مست رکھے اور تم سدا سکھی رہو۔ یہ تو بھکاریوں کا دستور ہے سنت لوگ دروازے پر جاتے ہی ہانک لگاتے ہیں جس میں گھر کے لوگ چونک پڑیں اور شوق سے باہر دوڑیں مجھے ایسی دو چار بانیاں (فقرے) معلوم ہیں، جی چاہے تو سیکھ لو گدڑی بابا کہا کرتے تھے ''مریں تو پانچوں مریں'' یہ ہانک سنتے ہی لوگ ان کے پیروں پر گر پڑتے تھے سدھ بھگت کی ہانک بہت بڑھیا تھی'' کھاؤ پیو چین کرو، پہنو گہنا، پر بابا جی کے ڈنڈے سے ڈرتے رہنا'' ننگا بابا کہا کرتے تھے دے تو دے، نہیں تو دلا دے، کھلا دے پلا دے، سلا دے'' یہ سمجھ لو کہ تمہارا آدر اور تمہاری خاطر داری بہت کچھ تمہاری ہانک کے اوپر ہے اور کیا کہوں؟ بھولنا مت! ہم اور تم بہت دنوں ساتھ رہے، سینکڑوں

بھوج ساتھ کھائے، جس نیوتے میں ہم اور تم دونوں پہنچتے تھے تو لاک ڈانٹ سے ایک دو چپتل اور اڑا جاتے تمہارے بنا اب میرا رنگ نہ جمے گا ایشور تمہیں سدا سگندھ والی چیزیں کھلائے۔

چنتامن کو ان فقروں میں سے ایک بھی پسند نہ آیا بولے ''میرے لئے کوئی بانی سوچو''

موٹے رام: ''اچھا، یہ بانی کیسی ہے کہ نہ دو گے تو ہم چڑھ بیٹھیں گے؟''

چنتامن ''ہاں مجھے پسند ہے، کہو تو اس میں کچھ کاٹ چھانٹ کروں''

موٹے رام ''ہاں ہاں کرو''

چنتامن اچھا تو اس کو اس طرح رکھو''نہ دے گا تو ہم چڑھ بیٹھیں گے''

موٹے رام (اچھل کر) نارائن جانتا ہے یہ بانی اپنے رنگ میں نرالی ہے بھگتی نے تمہارے گیان کو چمکا دیا ہے بھلا ایک بار للکار کر کہو تو دیکھیں کیسا کہتے ہو۔

چنتامن نے دونوں کان انگلیوں سے بند کر لیے اور اپنی پوری طاقت سے چلا کر بولے ''نہ دے گا تو چڑھ بیٹھوں گا'' یہ آواز ایسے زور شور کی تھی کہ موٹے رام بھی دفعتاً چونک پڑے چمگادڑ گھبرا کر درختوں پر سے اڑ گئے کتے بھونکنے لگے۔

موٹے رام ''یار تمہاری بانی سن کر تو میرا کلیجہ کانپ اٹھا ایسی للکار کہیں سننے میں نہیں آتی تم سنگھ کی طرح گرجتے ہو بانی تو ٹھیک ہو گئی اب کچھ دوسری باتیں بتاتا ہوں کان دے کر سنو سادھوؤں کی بھاشا ہماری بول چال سے الگ ہوتی ہے ہم کسی کو آپ کہتے ہیں، کسی کو تم سادھو لوگ چھوٹے بڑے، امیر غریب، بوڑھے جوان سب کو ''تو'' کہہ کر پکارتے ہیں مائی اور بابا سدا بولتے رہنا یہ بھی یاد رکھنا کہ

سیدھی ہندی کبھی مت بولنا نہیں تو بھرم کھل جائے گا ٹیڑھی ہندی بولنا یہ کہنا کہ مائی مجھے کچھ کھلا دے سادھو لوگوں کی بولی ٹھیک نہیں ہے پکا سادھو اسی بولی کو یوں کہے گا'' مائی! میرے کو بھوجن کرا دے تیرے کو بڑا اپن ہوگا۔

چنتا من ''یار، ہم تیرے کہاں تک گن گائیں تیرے نے میرے ساتھ بڑا سلوک کیا ہے۔''

اس طرح نصیحت کر کے موٹے رام رخصت ہوئے چنتا من جی آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گانجہ بھنگ کی دکان کے سامنے کئی جٹا دھاری سادھو بیٹھے ہوئے گانجہ کے دم لگا رہے ہیں چنتا من کو دیکھ کر ایک مہاتما نے اپنی جے کار سنائی چل چل جلدی لے کر چل، نہیں تو کرتا ہوں بے کل۔

ایک دوسرے سادھو نے کڑک کر کہا'' ارارارا دھم، اب کیا ہے گم (غم)''

ابھی یہ کڑاکا آسمان میں گونج رہا تھا کہ تیسرے مہاتما نے گرج کر اپنی بانی سنائی'' دیس بنگلہ، جس کو دیکھا نہ بھالا چٹ پٹ بھر دے پیالہ''

چنتا من جی سے اب نہ رہا گیا انہوں نے بھی کڑک کر کہا'' نہ دے گا تو چڑھ بیٹھوں گا''

یہ سن کر سادھوؤں نے چنتا من کی آؤ بھگت کی فوراً گانجے کی چلم بھر گئی اور اسے ساگانے کا بار پنڈت جی پر ڈالا گیا بچارے بڑے پس و پیش میں پڑے سوچا کہ اگر چلم نہیں لیتا تو ابھی ساری قلعی کھل جائے گی مجبوراً چلم لے لی، تسکین جس نے کبھی گانجہ نہ پیا ہو وہ بہت کوشش کرنے پر دم نہیں لگا سکتا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے اپنی سمجھ میں تو بڑے زور سے دم لگائی چلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی،

آنکھیں نکل آئیں، سینہ سے کف بہنے لگا مگر نہ تو منہ سے دھوئیں کا بادل نکلا اور نہ چلم ہی سلگی ان کی یہ خامی انہیں سادھوؤں کی جماعت سے بدر کر دینے کو کافی تھی دو تین سادھو جھلا کر آگے بڑھے اور بڑی بے رحمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

ایک مہاتما "تیرے کو دھکار ہے"

دوسرا مہاتما "تیرے کو لاج نہیں آتی، سادھو بنا ہے مورکھ"

پنڈت جی شرمندہ ہو کر سامنے کے ایک حلوائی کی دکان پر جا بیٹھے اور سادھوؤں نے کھنجری بجا بجا کر یہ بھجن گانا شروع کیا۔

مایا ہے سنسار سنو لیا، مایا ہے سنسار
دھرم ادھرم سبھی کچھ جھوٹا یہی گیان بیوپار
سنو لیا، مایا ہے سنسار
گانجے بھنگ کو برجت کرتے، ہے ان پر دھکار
سنو لیا، مایا ہے سنسار

☆☆☆☆☆

پوس کی رات

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے ''مادھوری'' 1930ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں 1930ء (پریم چالیسی، دوم)

ہلکو نے آکر اپنی بیوی سے کہا ''شہنا آیا ہے لاؤ جو روپے رکھے ہیں اسے دے دو کسی طرح گردن تو چھوٹے۔''

منی بہو جھاڑو لگا رہی تھی، پیچھے پھر کر بولی ''تین ہی تو روپے ہیں دیدوں، تو کمبل کہاں سے آئے گا، ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی اس سے کہہ دو فصل پر روپے دے دیں گے ابھی نہیں ہے۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا پوس سر پر آگیا ہے بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں، گھڑکیاں دے گا یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے (جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا) اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوشامد کر کے بولا ''لا دے دے گردن تو کسی طرح سے بچے کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔''

منی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی ہوئی بولی ''کر چکے دوسری تدبیر ذرا سنوں کون تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو۔ پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو چلو چھٹی ہوئی

قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے میں روپے نہ دوں گی نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا ''تو کیا گالیاں کھاؤں''

منی نے کہا گالی کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟ مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی صداقت تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی کسی کی دھونس تو نہ رہے گی اچھی کھیتی ہے مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا معلوم ہوتا تھا وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے وہ آج نکلے جا رہے ہیں ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

پوس کی اندھیری رات آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا ''جبرا'' پیدا میں منہ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا'' کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے کہا تو

تھا گھر میں پیال پر لیٹ رہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا! اب کھا سردی میں کیا کروں جانتا تھا میں حلوہ پوری کھانے آ رہا ہوں دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے اب روؤ بی نانی کے نام کو'' جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں ،کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔اٹھوں پھر ایک چلم بھروں کسی طرح رات تو کٹے۔آٹھ چلم تو پی چکا یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک بھاگوان ایسے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے موٹے گدے لحاف کمبل مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے تقدیر کی خوبی ہے مزدوری ہم کریں مزہ دوسرے لوٹیں۔

ہلکو اٹھا اور گڈھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری جبرا بھی اٹھ بیٹھا ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا پیے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا ہلکو نے کہا ''آج اور جاڑا کھا لے کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔''

جبرا نے اگلے پنجے اس کی گھٹنوں پر رکھ دیے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی ،چلم پی کر ہلکو، پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو اب کی سو جاؤں گا لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اس کروٹ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی پر اسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اسے کتے سے بالکل نفرت نہ تھی وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیے تھے اور اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی اس کے مالک کی اس خاص روحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپری سے باہر آ کر بھونکنے لگا ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکار کر بلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا پھر بھی سردی کم نہ ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے اس نے اٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا ابھی کتنی رات باقی ہے وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے جب وہ اوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہو گا ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دیر کے فاصلہ پر ایک باغ تھا پت جھڑ شروع ہو گئی تھی

باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں رات کو کوئی مجھے پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اپلہ لیے باغ کی طرف چلا جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا اب تو نہیں رہا جاتا جبرو، چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آ کر سوئیں گے ابھی تو رات بہت ہے۔

جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں یکا یک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا کیسی اچھی مہک آئی جبرا تمہاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟

جبرا نے کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی وہ اسے چوس رہا تھا۔

ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے ننگے پاؤں گلے جاتے تھے اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے

کہ وہ اس لا انتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا ''تیرے جی میں آئے وہ کر'' سردی کی اس بے پایاں قاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا یوں جبرا اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟

جبرا نے کوں کوں کر کے گویا کہا اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی

''پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی نہیں اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟''

جبرا نے دم ہلائی

''اچھا آؤ، اس الاؤ کو کود کر پار کریں دیکھیں کون نکل جائے ہے اگر جل گئے بچہ تو میں دوانہ کروں گا۔''

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا

''منی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات ٹھنڈ لگی اور تاپ تاپ کر رات کاٹی ورنہ لڑائی کرے گی۔''

یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی پر وہ کوئی مات نہ تھی جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا چلو چلو، اس کی سہی نہیں، اوپر سے کود کر آؤ وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

پتیاں جل چکی تھیں باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اسے سستی دبا لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گائے کا جھنڈ تھا ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھی پھر ایسا معلوم ہوا کہ کھیت میں چر رہی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اس نے دل میں کہا بہن جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے، مجھے وہم ہو رہا ہے کہاں اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا۔

اس نے زور سے آواز لگائی جبرا، جبرا

جبرا بھونکتا رہا اس کے پاس نہ آیا

جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر سنائی دینے لگی ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا ہوا تھا اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانوروں کو بھگانا ان کا تعاقب کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا اپنی جگہ سے نہ ہلا بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلانے لگا لہو لہو، ہو ہو، ہاہا۔

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا نہیں بھاگے ابھی تک چر رہے ہیں شاید وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیدھا ہے جوان کے پیچھے دوڑے گا فصل تیار ہے کیسی اچھی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا اسے یہ بھاگے تباہ کیے ڈالتے ہیں۔

اب ہلکو سے نہ رہا گیا وہ پکا ارادہ کر کے اٹھا اور دو تین قدم چلا پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا چبھنے والا، بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا افسردگی نے اسے چاروں طرف سے رسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

آخر وہیں چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اس کی نیند کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے اور منی کھڑی کہہ رہی ہے کیا آج سوتے ہی رہو گے تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا سارا کھیت کا ستیا ناس ہو گیا بھلا کوئی ایسا بھی ہوتا ہے تمہارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔

ہلکو نے بات بنائی میں مرتے مرتے بچا تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے گویا بدن میں جان نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے منی کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی پر ہلکو خوش تھا۔

منی نے فکرمند ہو کر کہا اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔

''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی یہ کہے دیتی ہوں جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں مرنے کے لیے نہیں کرتے۔''

''جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا''

''آج جا کر شہنا سے کہہ دے، کھیت جانور چر گئے ہم ایک پیسہ نہ دیں گے''

''رات بڑے گجب کی سردی تھی''

''میں کیا کہتی ہوں تم کیا سنتے ہو''

''تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے شہنا کو ان باتوں سے کیا سروکار تمہارا کھیت چاہے جانور کھائیں چاہے آگ لگ جائے چاہے اولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔''

''تو چھوڑ دو کھیتی، میں ایسی کھیتی سے باز آئی''

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں منی تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے کھیتی کا مرو جاد نہیں بگاڑوں گا جبرا، جبرا، کیا سوتا ہی رہے گا، چل گھر چلیں۔

☆☆☆☆☆☆

بند دروازہ

پہلی بار: کتابی صورت میں 1930ء (پریم چالیسی، دوم)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

آفتاب افق کی گود سے نکلا بچہ پالنے سے وہی ملاحت، وہی سرخی، وہی خمار، وہی ضیا
میں برآمدہ میں بیٹھا تھا بچے نے دروازے سے جھانکا میں نے مسکرا کر پکارا وہ میری گود میں آ کر بیٹھ گیا۔
اس کی شرارتیں شروع ہو گئیں کبھی قلم پر ہاتھ بڑھایا کبھی کاغذ پر دست درازی کی میں نے گود سے اتار دیا وہ میز کا پایہ پکڑے کھڑا رہا گھر میں نہ گیا دروازہ کھلا ہوا تھا ایک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور سامنے کے صحن میں بیٹھ گئی بچہ کے لیے تفریح کا یہ نیا سامان تھا وہ اس کی طرف لپکا چڑیا ذرا بھی نہ ڈری بچہ نے سمجھا اب یہ پردار کھلونا ہاتھ آ گیا بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چڑیا کو بلانے لگا چڑیا اڑ گئی مایوس بچہ رونے لگا مگر اندر کے دروزہ کی طرف تاکا بھی نہیں دروازہ کھلا ہوا تھا۔
گرم حلوے کی خوش آیند صدا آئی بچہ کا چہرہ اشتیاق سے کھل اٹھا خوانچے والا سامنے سے گزرا بچے نے میری طرف التجا کی نظروں سے دیکھا جوں جوں خوانچے والا دور ہوتا گیا۔ نگاہ التجا احتجاج میں تبدیل ہوتی گئی یہاں تک کہ جب موڑ آ گیا اور خوانچے والا نظروں سے غائب ہو گیا تو احتجاج نے فریاد پر شور کی صورت اختیار

کی مگر میں بازار کی چیزیں بچوں کو نہیں کھانے دیتا بچہ کی فریاد نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ میں نے آئندہ ر اختیار کے خیال سے اور بھی اکڑ کر لی۔ کہہ نہیں سکتا بچے نے اپنی ماں کی عدالت میں اپیل کرنے کی ضرورت سمجھی یا نہیں۔ عام بچے ایسی افتادوں کے موقع پر ماں سے اپیل کرتے ہیں دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے اشک شوئی کے خیال سے اپنا فاؤنٹین پن اس کے ہاتھ میں رکھ دیا بچہ کو کائنات کی دولت مل گئی اس کے سارے قوائے ذہنی اس نئے عقدے کو حل کرنے میں منہمک ہو گئے دفعتاً دروازہ ہوا سے خود بخود بند ہو گیا۔ پٹ، کی آواز بچہ کے کانوں میں آئی اس نے دروازہ کی طرف دیکھا اس کا وہ انہاک فی الفور غائب ہو گیا اس نے فاؤنٹین پن پھینک دیا اور روتا ہوا دروازہ کی طرف چلا کیونکہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

جیل

پہلی بار: ''چندن'' لاہور، جنوری 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1934ء (آخری تحفہ)

آنند کے گدے دار کرسی پر بیٹھ کر سگار جلاتے ہوئے کہا ''آج وشومبھر نے کیسی حماقت کی امتحان قریب ہے اور آپ آج والنٹیر بن بیٹھے کہیں پکڑے گئے تو امتحان سے ہاتھ دھولیں گے میرا تو خیال ہے وظیفہ بھی بند ہو جائے گا۔''

سامنے دوسرے کوچ پر روپ متی بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اخبار کی طرف تھیں مگر کان آنند کی طرف لگے ہوئے تھے، بولی ''یہ تو بہت برا ہوا تم نے سمجھایا نہیں''

آنند نے منہ بنا کر کہا ''جب کوئی اپنے کو دوسرا گاندھی سمجھ لے تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے، وہ الٹا مجھے سمجھانے لگتا ہے''

روپ متی نے اخبار لپیٹ کر زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا ''تم نے مجھے بھی تو نہیں بتایا شاید میں اسے روک سکتی''

آنند نے کچھ چڑھ کر کہا ''تو ابھی کیا بگڑا ہے ابھی تو شاید کانگرس آفس میں ہی ہوگا جا کر روک لو۔''

آنند اور وشومبھر دونوں ہی یونیورسٹی کے طالب علم تھے آنند کے حصے میں لکشمی بھی پڑی تھی، سرسوتی بھی وشومبھر چھوٹی تقدیر لے کر آیا تھا پروفیسروں نے مہربانی

کر کے ایک چھوٹا سا وظیفہ دے دیا تھا بس یہی اس کے گزارے کی سبیل تھی روپ متی بھی ایک سال قبل انہی کی جماعت میں پڑھتی تھی مگر اس سال اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی، اس لیے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دونوں نوجوان کبھی کبھی اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ آنند آتا تھا اس کا دل لینے کے لیے وشومبھر آتا تھا، یوں ہی دل بہلانے کے لیے طبیعت پڑھنے میں نہ لگتی تھی یا جی گھبراتا تو یہاں آ بیٹھتا تھا۔ شاید اس سے اپنی داستان کہہ کر اس کا دل سکون پا جاتا تھا۔ آنند کے سامنے کچھ اظہار درد کی اس میں ہمت نہ تھی۔ آنند کے پاس اس کے لیے ہمدردی کا ایک کلمہ شیریں بھی نہ تھا۔ وہ اسے پھٹکارتا، ذلیل کرتا اور بناتا تھا۔ وشومبھر میں اس سے بحث کرنے کی قابلیت نہ تھی آفتاب کے روبرو چراغ کی ہستی ہی کیا؟ آنند اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس دماغی غلبہ کو پرے پھینکا اور اسی کی شکایت لے کر روپ متی کے پاس آیا تھا مہینوں وشومبھر نے اپنے اندرونی خیالات کو آنند کے خیالات میں جذب کرنے کی سعی کی لیکن دلائل کی دنیا میں شکست کھا کر بھی اس کا دل بغاوت کرتا رہا۔ بلا شبہ اس کا ایک سال ضائع ہو جائے گا ممکن ہے اس کی کالج کی زندگی کا سدا کے لیے خاتمہ ہو جائے پھر چودہ پندرہ سالوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا نہ خدا ہی ملے گا نہ وصال صنم نصیب ہو گا آگ میں کودنے سے کیا حاصل؟ یونیورسٹی میں رہ کر بھی تو بہت کچھ **ملک** کا کام کیا جا سکتا ہے آنند مہینے میں کچھ نہ کچھ چندہ جمع کر دیتا تھا کچھ طلبا سے سودیشی کا عہد کرا لیا تھا وشومبھر کو بھی آنند نے یہی مشورہ دیا تھا اس کی دلیلوں نے وشومبھر کی عقل کو جیت لیا لیکن اس کے دل کو جیت نہ سکا آج جب آنند کالج گیا، تو وشومبھر کا

خط ملا

''پیارے آنند''

مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں، وہ میرے لیے فائدہ بخش نہیں۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت مجھے کھینچے لیے جا رہی ہے میں جانا نہیں چاہتا لیکن جاتا ہوں جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے اوکھلی میں سر ڈال چکے تو میرے لیے بھی اب کوئی دوسرا رستہ نہیں ہے۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے، لیکن یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔

تمہارا وشومبھر

خط پڑھ کر آنند کے جی میں آیا کہ وشومبھر کو سمجھا بجھا کر لوٹا لائے، مگر پھر اس کی حماقت پر غصہ آیا وہ اسی طیش میں روپ متی کے پاس جا پہنچا اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی ''جا کر اسے لوٹا لاؤ'' تو شاید وہ چلا جاتا پر اس کا یہ کہنا کہ میں اسے روک لیتی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا اس کے جواب میں سرد مہری تھی اور شاید کسی قدر حسد بھی تھا۔

روپ متی نے ادائے غرور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی ''اچھی بات ہے میں چلی جاتی ہوں'' پھر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''تم کیوں نہیں چلتے؟''

پھر وہی غلطی، اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی تو آنند ضرور اس کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن اس کے سوال میں پہلے ہی یہ اندیشہ چھپا تھا کہ آنند جانا نہیں

چاہتا۔مغرور آننداس طرح نہیں جاسکتا۔اس نے اداس ہوکر جواب دیا ”میرا جانا لاحاصل ہے۔تمہاری باتوں کا زیادہ اثر ہوگا۔وہ میری میز پر یہ خط چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ روح اور فرض اور معراج کی بڑی بڑی باتوں پر سوچ رہا ہے اور اپنے آپ کو آسمان کا باشندہ تصور کرتا ہے،تو میرا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا“

اس نے جیب سے خط نکال کر روپ متی کے سامنے رکھ دیا ان الفاظ میں جو اشارہ اور طعن تھا، اس نے ایک لمحے تک روپ متی کو اس کی طرف دیکھنے نہ دیا۔ آنند کے اس ظالمانہ حملے نے اسے جیسے ہلاک کر دیا۔پھر ایک ہی لمحے میں سرکشی کی ایک چنگاری سی اس کے اندر جا گھسی اس نے نہایت سکون سے خط کھول کر پڑھا پڑھا صرف آنند کے حملہ کا جواب دینے کے لیے لیکن پڑھتے پڑھتے اس کا چہرہ جیسے چمکنے لگ گیا۔گردن تن گئی آنکھوں میں ایثار کی سرخی آگئی۔

اس نے خط کو میز پر رکھ دیا اور بولی ”نہیں اب میرا جانا بھی بیکار ہے“

آنند نے اپنی جیت پر خوش ہو کر کہا ”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار ہے اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا جب سال بھر جیل میں چکی پیس لے گا اور وہاں سے تپ دق لے کر نکلے گا یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوا لے گا،تو عقل ٹھکانے آئے گی ابھی تو جے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہوگا“

روپ متی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی، کمزور دبلی پتی، برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی، چکنا سر، پوپلا منہ، عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت۔

آنند نے پھر کہا ''اگر مجھے یقین ہو کہ میرے خون سے ملک بیدار ہو جائے گا تو میں اپنا خون آج دینے کو تیار ہوں، لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل آئے تو کیا ہو گا جان دے دینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا''

روپ متی اب بھی وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھی اس کا وہ تبسم، وہ سادہ دلفریب مسکراہٹ، جس نے کائنات کو جیت لیا ہے آنند پھر بولا ''جن حضرات کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے انہیں خدمت وطن کی سوجھتی ہے کوئی پوچھے آپ اپنی خدمت تو کر نہیں سکتے، وطن کی خدمت کیا کریں گے۔ ادھر کے ڈنڈے بھی ہیں۔''

روپ متی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آنند نے جیسے چونک کر کہا، ''ہاں بڑا پر لطف فلم ہے چلتی ہو، پہلے شو میں دیکھ آئیں''

روپ متی نے گویا آسمان سے اتر کر جواب دیا ''نہیں، میرا نہیں چاہتا''

آنند نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''کیوں طبیعت تو اچھی ہے؟''

روپ متی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی بولی ''ہاں طبیعت کو کیا ہوا ہے؟''

آنند ''تو چلتی کیوں نہیں؟''

روپ متی ''آج جی نہیں چاہتا''

آنند ''تو پھر میں بھی جاؤں گا''

روپ متی ''نہایت نیک خیال ہے ٹکٹ کے دام کسی کار خیر میں دے دو''

آنند ''یہ تو ٹیڑھی شرط ہے مگر منظور''

روپ متی: کل رسید مجھے دکھا دینا

آنند: ''تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں''

وہ کچھ بے دل ہو کر ہوسٹل چلا گیا، ذرا دیر بعد روپ متی سوراج بھون کی طرف چلی۔

(2)

روپ متی سوراج بھون پہنچی تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیشی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا دوسری جماعت شراب کی دکانوں پر جانے کو تیار تھی وشومبھر اس میں بھی نہ تھا روپ متی نے سیکرٹری کے پاس جا کر پوچھا ''آپ بتا سکتے ہیں وشومبھر کہاں ہے؟''

سیکرٹری: ''کون وشومبھر؟ جو آج ہی بھرتی ہوئے ہیں؟''

روپ متی: ''جی ہاں، وہی''

سیکرٹری: ''بڑا دلیر آدمی ہے اس نے دیہات میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے، اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے''

روپ متی: ''تو ابھی اسٹیشن پر ہوں گے؟''

سیکرٹری نے گھڑی پر نظر ڈال کر جواب دیا ''ہاں شاید ابھی اسٹیشن پر مل جائیں''

روپ متی نے باہر نکل کر سائیکل تیز کی سٹیشن پر پہنچی، تو وشومبھر پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔

روپ متی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا اور بولا

''تم یہاں کیسے آ گئیں؟ آج آنند سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟''

روپ متی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا ''یہ تم نے کیا صورت بنالی ہے کیا پاؤں میں جوتا پہننا بھی حب وطن کے خلاف ہے؟''

وشمبھر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''آنند بابو نے تم سے کچھ کہا تو نہیں؟''

روپ متی نے جواب دیا ''جی ہاں کہا ہے لیکن تمہیں یہ کیا سوجھی؟ دو سال سے کم کے لیے نہ جاؤ گے، اتنا سوچ لو''

وشمبھر کا منہ اتر گیا بولا ''جب یہ جانتی ہو، تو کیا تمہارے پاس میری ہمت بڑھانے کے لیے دو لفظ بھی نہیں ہیں؟''

روپ متی کا دل مسوس اٹھا، مگر اس نے ظاہر نہ کیا، بولی ''تم مجھے دشمن سمجھتے ہو، یا دوست؟''

وشمبھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ''تم ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو روپ متی؟ اس کا جواب میرے منہ سے سنے بغیر بھی تم کہہ سکتی ہو، کہ میرا جواب کیا ہو گا''

روپ متی ''تو میرا مشورہ یہ ہے کہ مت جاؤ، اب بھی لوٹ چلو''

وشمبھر ''یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے روپ متی، مجھے یقین ہے، یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو، میری جان کی قیمت کیا ہے؟ ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت بہت بڑھا، تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا، جانتی ہو؟ سارے **ملک** کے لیے سوراج اتنے عظیم

مقصد کے لیے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے اب جاؤ گاڑی آ رہی ہے آنند بابو سے کہنا مجھ سے ناراض نہ ہوں''

روپ متی نے آج تک اس کند ذہن نوجوان پر رحم کیا تھا اس وقت اسے اس سے عقیدت ہو چلی تھی ایثار میں دل کو کھینچنے کی جو طاقت ہے روپ متی کو اس نے زور سے کھینچا پھر ناموافق حالات کا تفاوت مٹ سا گیا وشومبھر میں جس قدر خامیاں تھیں، وہ سب خوبیاں بن کر چمک اٹھیں اس کے دل کی وسعتوں میں وہ کسی پنچھی کی مانند اڑ کر گوشہ عافیت تلاش کرنے لگیں۔

روپ متی نے اس کی طرف عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا ''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

وشومبھر کو جیسے گھڑوں نشہ چڑھ گیا بولا ''تم کو!؟ آنند بابو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے''

روپ متی ''میں آنند بابو کے ہاتھ بکی نہیں ہوں''

وشومبھر ''آنند بابو تو تمہارے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں''

روپ متی نے سرکش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پر کچھ بولی نہیں ماحول اس وقت اسے پاؤں کی بیڑیاں معلوم ہو رہا تھا کاش، وہ بھی وشومبھر کی مانند آزاد ہوتی امیر والدین کی اکلوتی بیٹی، ناز و نعمت میں پلی ہوئی اس وقت اپنے آپ کو مقید سمجھ رہی تھی اس کی روح ان بندشوں کو توڑنے کے لیے پھڑپھڑانے لگی۔

گاڑی آ گئی روپ متی نے آبدیدہ ہو کر کہا ''تم مجھے نہیں لے چلو گے؟''

روپ متی ''کیوں؟''

وشومبھر ’’میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا‘‘

روپ متی ’’کیا تم سمجھتے ہو، کہ میں دیہات میں نہ رہ سکوں گی؟‘‘

وشومبھر نادم ہو گیا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، مگر اس نے انکار کر دیا ’’نہیں یہ بات تو نہیں ہے روپ متی‘‘

روپ متی ’’تو پھر کیا بات ہے؟ کیا اندیشہ ہے کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے۔‘‘

وشومبھر ’’اگر یہ اندیشہ ہو تو کیا یہ کم ہے؟‘‘

روپ متی ’’میں اس کی ذرا پروا نہیں کرتی ایک تنکے برابر بھی نہیں‘‘

وشومبھر نے دیکھا، روپ متی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی ہے وہ اس کے ارادے کے سامنے کانپ اٹھا بولا ’’میری درخواست قبول کر لو روپ متی، میں تم سے منت کرتا ہوں۔‘‘

روپ متی سوچنے لگی

وشومبھر نے کہا ’’میری خاطر تمہیں یہ ارادہ ترک کر دینا ہو گا‘‘

روپ متی سر جھکا کر بولی ’’اگر یہ تمہارا حکم ہے تو میں اس کی تعمیل کروں گی وشومبھر تم شاید دل میں سمجھتے ہو گے یہ عارضی جوش میں آ کر اس وقت مستقبل کو غارت کرنے جا رہی ہے۔ میں ثابت کر دوں گی یہ میرا عارضی جوش نہیں بلکہ مصیبتوں میں بھی قائم رہنے والا عزم ہے، جاؤ، مگر میری ایک بات یاد رکھنا قانون کے پنجے میں اسی وقت آنا جب تمہاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو میں تمہاری کامیابی کے لیے پرارتھنا کرتی رہوں گی۔‘‘

گاڑی نے سیٹی دی وشومبھر اندر جا بیٹھا گاڑی چلی گئی روپ متی گویا کائنات کی دولت آنچل میں لیے کھڑی رہی۔

(3)

روپ متی کے پاس وشومبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا آج اسٹیشن سے لوٹ کر اس نے اسے نکالا اور اسے ایک خوب صورت فریم میں لگا کر میز پر رکھ دیا آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

وشومبھر نے تعطیلوں میں اسے دو چار خط لکھے تھے روپ متی نے انہیں پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا آج اس نے ان خطوں کو نکالا اور انہیں دوبارہ پڑھا ان خطوں میں آج حلاوت تھی روپ متی نے انہیں نہایت حفاظت سے رائٹنگ بکس میں بند کر دیا۔

دوسرے دن اخبار آیا تو روپ متی اس پر ٹوٹ پڑی۔ وشومبھر کا نام دیکھ کر وہ مسرت سے پھول اٹھی دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون جانا اس کا معمول ہو گیا جلسوں میں برابر شریک ہوتی عیش و آرام کی تمام اشیا ایک ایک کر کے پھینک دیں ریشمی ساڑھیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑھیاں آئیں چرخا بھی آیا وہ گھنٹوں بیٹھی سوت کاتا کرتی اس کا سوت روز بروز باریک ہوتا جاتا تھا اسی سوت سے وہ وشومبھر کے کرتے بنائے گی۔

اسی زمانے میں امتحان کی تیاریاں تھیں آنند کو پھر اس سے ملنے کی فرصت نہ ملی

وہ ایک مرتبہ آیا لیکن زیادہ دیر بیٹھا نہیں شاید روپ متی کی سرد مہری نے اسے بیٹھنے نہ دیا ہو۔

ایک مہینہ بیت گیا

ایک دن شام کو آنند آیا روپ متی سوراج بھون جانے کو تیار تھی آنند نے بھویں سکوڑ کر کہا ''تم سے تو اب بات کرنا بھی دشوار ہے''

روپ متی نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا ''تمہیں بھی تو کتابوں سے چھٹی نہیں ملتی آج کی تازہ خبر نہیں ملی، سوراج بھون میں روز بروز کی خبریں مل جاتی ہیں۔''

آنند نے فلاسفروں کی سی افسردگی سے کہا ''وشوبھر نے تو، سنا ہے دیہات میں خوب شور وغل مچا رکھا ہے، جو کام اس کے لائق تھا اسے مل گیا یہاں اس کی زبان نہ کھلتی تھی وہاں دیہات میں خوب گرجتا ہوگا آدمی منچلا ہے۔''

روپ متی نے اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں، تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں اور بولی'' آدمی میں اگر یہ خوبی ہے، تو دوسرے سارے عیب مٹ جاتے ہیں۔ قومی خبریں پڑھنے کو کب فرصت ملتی ہو گی وشوبھر نے گاؤں میں ایسی بیداری پیدا کر دی ہے کہ بدیشی کپڑے کا ایک تار بھی نہیں بکنے پاتا۔ نہ کوئی نشہ کی دکانوں پر جاتا ہے، اور مزہ یہ ہے کہ پکٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، اب قومی پنچایتیں کھول رہے ہیں۔''

آنندے نے بے پروائی سے کہا ''تو سمجھ لو اب اس کے چلنے کے دن بھی آ گئے''

روپ متی نے جوش سے جواب دیا'' اتنا کام کر کے جانا بہت سستا نہیں کل تو

وہاں ایک بڑا جلسہ ہونے والا تھا پرگنہ بھر کے لوگ وہاں جمع ہوئے ہوں گے سنا ہے، آج کل دیہات سے کوئی مقدمہ نہیں آتا وکیلوں کی نانی مری جارہی ہے۔"

آنندے نے قدرے جوش سے کہا "یہی تو سوراج کا مزہ ہے کہ زمیندار، وکیل اور بیوپاری سب مریں صرف مزدور اور کسان رہ جائیں"

روپ متی نے سمجھ لیا آج آنند تل کر آیا ہے اس نے بھی جیسے آستین چڑھاتے ہوئے کہا "تو کیا چاہتے ہو کہ زمیندار اور وکیل اور بیوپاری غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جائیں اور کوئی زبان نہ کھولے"

آنند گرم ہو کر بولا "علم اور دولت کی حکمرانی ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی ہاں اس کی صورت بدل سکتی ہے"

روپ متی نے جوش سے کہا "اگر سوراج ملنے پر بھی دولت ہی کو جگہ ملے اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائٹی میں اسی طرح غرض کے اندھے بنے رہیں تو سوراج نہ ملنا اچھا امراء کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا جن برائیوں کو رفع کرنے کے لیے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لیے ہیں انہی برائیوں کو کیا ہم اس لیے سر پر چڑھالیں گے کہ وہ بدیشی نہیں ہیں، سودیشی ہیں کم از کم میرے لیے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے میں سوسائٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں، جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر آ سکے۔"

آنند "یہ تمہاری ذاتی رائے ہوگی؟"

روپ متی "تم نے ابھی اس تحریک کا لٹریچر پڑھا ہی نہیں ہے"

آنند ''نہ پڑھا ہے، نہ پڑھنا چاہتا ہوں''

روپ متی ''نہ پڑھو اس سے ملک کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے''

آنند ''تم تو جیسے وہ رہی ہی نہیں، بالکل کایا پلٹ ہو گئی''

اتنے میں چٹھی رساں نے اخبار لا کر میز پر رکھ دیا روپ متی نے بے صبری سے اسے کھولا پہلے عنوان پر نظر پڑتے ہی جیسے اس کی آنکھوں میں سرور چھا گیا گردن خود بخود تن گئی اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔

اس نے جوش سے کھڑے ہو کر کہا وشومبھر گرفتار ہو کر دو سال کے لیے جیل چلے گئے۔

آنند نے افسردگی سے کہا ''کس معاملے میں؟''

روپ متی نے وشومبھر کے فوٹو کی طرف تاکتے ہوئے کہا ''رانی گنج میں جلسہ تھا، وہیں پکڑے گئے ہیں''

آنند ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ دو سال کے لیے جائیں گے زندگی خراب کر لی''

روپ متی نے سرد مہری سے کہا ''کیا کبھی ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے؟ کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہے؟ میرا خیال ہے انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشومبھر کو دو سال میں ہو جائے گا اتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے تمہیں دس سال میں بھی نہ ہو گا اگر تعلیم کا مقصد کیرکٹر ہے تو ملکی تحریک میں اس کے جس قدر ذرائع ہیں، وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہمارے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے، تو میں مان لوں گی لیکن ملک

اور قوم کی خدمت کرنے والوں کو بے وقوف بنانا میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔"

آنند "آج وشومبھر کو مبارک باد دینے کے لیے جلسہ ہوگا، جاؤ گی؟"

روپ متی نے خودسرانہ انداز میں کہا ضرور جاؤں گی میں تو لیکچر بھی دوں گی کل رانی گنج چلی جاؤں گی اور وشومبھر نے جو چراغ روشن کیا ہے، میری زندگی میں نہ بجھنے پائے گا۔

آنند نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کا سہارا لے کر کہا "تم نے اپنے والدین سے بھی پوچھا"

روپ متی "پوچھ لوں گی"

آنند "اور وہ تمھیں اجازت دے دیں گے؟"

روپ متی "اصول کے سامنے کسی کی اجازت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی"

آنند "اچھا، یہ نئی بات معلوم ہوئی"

یہ کہتا ہوا آنند اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کے پیر اس طرح لڑکھڑا رہے تھے، جیسے اب گرا۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

آشیاں برباد

پہلی بار :ہندی میں ''جیل'' کے عنوان سے ''ہنس'' فروری 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں 1936ء (زادراہ)

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانہ جیل میں واپس آئی تو اس کا چہرہ شگفتہ تھا بری ہو جانے کی گلابی امید اس کے رخساروں پر چمک رہی تھی اسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے گروہ نے اسے گھیر لیا اور پوچھنے لگیں ''کتنے کی ہوئی بہن؟''

مردلا نے فاتحانہ انداز میں کہا ''میں نے تو صاف صاف کہہ دیا میں نے دھرنا نہیں دیا، یوں آپ زبردست ہیں، جو چاہیں فیصلہ کریں، نہ میں نے کسی کو روکا، نہ پکڑا، نہ دھوکا دیا، نہ کسی سے آرزو منت کی، کوئی خریدار میرے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہاں میں دکان پر کھڑی ضرور تھی وہاں کئی والنٹیر گرفتار کر لیے گئے تھے خلقت جمع ہو گئی تھی میں بھی کھڑی ہو گئی بس تھانیدار نے آکر مجھے گرفتار کر لیا۔''

چمپا دیوی کچھ قانون جانتی تھی بولی ''یہ تو ایک طرح سے اپنی صفائی دینے کے برابر ہے۔''

مردلا نے فوراً تردید کی ''میں مقدمہ کی کسی کارروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی تھی لیکن جب میں نے ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے ان جرح کرنا شروع کی میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے۔ تھوڑا سا قانون جانتی ہوں پولیس والوں نے سمجھا ہو گا یہ کچھ بولے گی تو ہے

نہیں ہم جو بیان چاہیں گے دے دیں گے۔ جب میں نے جرح شروع کی، سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے میں نے تینوں گواہوں کے بیان کو فرضی ثابت کر دیا اس وقت جانے مجھے کیوں کر نکتے سوجھتے گئے مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار پھٹکار بھی بتائی وہ میرے سوالوں کا اول جلول جواب دیتا تو مجسٹریٹ بول اٹھتا تھا، وہ کچھ پوچھتی ہیں، اس کا جواب دیجئے فضول کی باتیں کیوں کرتے ہو، تب حضرت کا چہرہ زرد سا نکل آتا تھا۔ میں نے سبھوں کو لا جواب کر دیا۔ ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ نہیں سنایا، لیکن مجھے یقین ہے، بری ہو جاؤں گی میں جیل سے نہیں ڈرتی، لیکن بے وقوف بھی نہیں بننا چاہتی وہاں سیکرٹری صاحب بھی تھے اور بہت سی بہنیں تھیں سب یہی کہتے تھے کہ تم چھوٹ جاؤ گی''

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کر کے چلی گئیں ان میں سے کسی کی معیاد سال بھر کی تھی، کسی کی چھ مہینے کی، کسی نے بھی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا مردلا پولیس نے جرح کر کے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جا کر ایک دیوی نے کہا ''اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید نہیں''

دوسری خاتون بولیں ''یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے گئی تھیں دھرنا دینے، ورنہ دکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، والینٹر گرفتار ہوئے تھے آپ کی بلا سے آپ وہاں کیوں گئیں؟ مگر اب کہتی ہیں، میں دھرنا دینے گئی ہی نہیں، یہ تو معافی مانگنا ہوا۔''

تیسری دیوی نے فرمایا ''جیل میں رہنے کے لیے کلیجہ چاہئے، اس وقت تو واہ واہ کہلانے کے لئے آ گئیں ایسی عورتوں کو تو قومی کاموں کے نزدیک نہ آنا چاہیے تحریک کو بدنام کرنے سے فائدہ؟''

(2)

صرف چھما دیوی اب تک مردلا کے پاس متفکر کھڑی تھی اس نے ایک تقریر کرنے کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر ایک مہینہ ہوا یہاں آئی تھی۔ ابھی میعاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے یہاں کے پندرہ میں سے کسی سے اس کا دل نہ ملتا تھا ذرا ذرا سی باتوں کے لیے ان کا آپس میں جھگڑا، آرائش اور شوق کی چیزوں کے لیے لیڈی وارڈوں کی خوشامدیں کرنا، گھر والوں سے ملنے کے لیے ان کا اضطراب اسے پسند نہ تھا، وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہئے کسی میں بھی نہ تھی ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات کے چرچا میں صرف ہوتا تھا چھما ان سے اعتراض کرتی تھی اس کو قوم کا فدایانہ جوش تھا اور سچا درد۔ مگر دوسری دیویاں اسے مغرور سمجھتی تھیں اور اعتراض کا جواب اعتراض سے دیتی تھیں مگر مردلا کو حراست میں آئے آٹھ دن ہوئے تھے اتنے ہی دنوں میں چھما کو خاص انس ہو گیا تھا مردلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی، نہ کوئی بدگوئی کی عادت نہ آرائش کا خبط، نہ بیہودہ مذاق، اس نے مہر پذیر دل پایا تھا جوش خدمت

سے پر، ہمدردی سے لبریز چھما نے سوچا تھا اس کے ساتھ چھ مہینے آرام سے گزر جائیں گے لیکن تقدیر اسے یہاں بھی پامال کرنے پر آمادہ تھی کل مردلا یہاں سے چلی جائے گی یہاں ایسا کون ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر کے لیے بیٹھ کر دل کی باتیں کہے گی، **ملک** اور قوم کا پرچار کرے گی، جس کی صحبت میں مغائرت یا ہمدردی کی بو نہ آئے۔

مردلا نے پوچھا ’’تمہیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں بہن بڑی مشکل سے گزریں گے؟‘‘

چھما نے حسرت ناک لہجے میں کہا ’’کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن، مگر تمہاری یاد بہت ستایا کرے گی۔ اس ایک ہفتے کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا کر دیا جب سے تم آئی ہو، مجھے یہ جیل خانہ نہ معلوم ہوتا تھا کبھی کبھی ملتی رہنا۔‘‘

مردلا نے دیکھا چھما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے تشفی کے انداز سے بولی ’’ضرور ملوں گی بہن! مجھے خود بغیر تم سے ملے چین نہ آئے گا بھان کو بھی لاؤں گی کہوں گی تیری موسیٰ آئی ہے، تجھے بلا رہی ہے، دوڑا ہوا آئے گا اب تم سے آج کہتی ہوں بہن یہاں کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی، بے چارہ اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا۔ اور روتا ہوگا مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا تم کہاں چلی گئی تھیں جاؤ میں تم سے نہیں بولتا تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔ بڑا شیطان ہے بہن دم بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا صبح اٹھتے ہی گاتا ہے ’جھنڈا اونتا رہے امالا‘ ’’جھولاج کا مندیل ریل میں ہے‘‘ (جھنڈا اونچا رہے ہمارا سوراج کا مندر جیل میں ہے) ایک

جھنڈی کندھے پر رکھ کر کہتا ہے نالی چھلاپ پینا حرام ہے تو دیکھتے ہی بنتا ہے باپ کو تو کہتا ہے تم گلام ہو ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں بار بار سوچتے ہیں استعفےٰ دے دوں لیکن گزر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو کیسے چھوڑیں وہ اب چھوڑ بیٹھے ہوتے بہن! تم سے سچ کہتی ہوں نوکری سے انہیں نفرت ہے لیکن میں ہی منع کرتی رہتی ہوں بے چارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں وہ بے چاری بوڑھی اس کے ساتھ کہاں کہاں دوڑیں چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا۔ اماں بہت بگڑیں گی، بس یہی ڈر لگ رہا ہے مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں۔ کل بابو جی کہتے تھے، تم سے بہت ناراض ہیں تین دن تو دانہ پانی چھوڑ دیا تھا اس چھوکری نے کل کی مرجاوا ڈبا دی خاندان میں داغ لگا دیا کل موہنی کلچھنی، نہ جانے کیا کیا بکتی رہیں میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی بہن پرانے زمانے کی ہیں، ان سے کوئی چاہے کہ تم لوگوں میں آ کر مل جائیں تو یہ اس کی زیادتی ہے کل چل کر منانا پڑے گا بڑی منتوں سے مانیں گی کل ہی کتھا ہو گی دیکھ لینا، براہمن کھائیں گے جیل خانہ کا پرائشچت تو کرنا ہی پڑے گا تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب جانا بہن! میں تمہیں آ کر لے جاؤں گی۔

چھما کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہ تھی وہ اکیلی بیوہ تھی جلیانوالہ باغ میں اس کا آشیانہ برباد ہو گیا تھا۔ شوہر مارا گیا، لڑکے مارے گئے۔ اب کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی اور ان دس برسوں سے اس کا حرماں نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون کی تلاش کر رہا تھا۔ جن اسباب نے اس کے لیے ہوئے

گھر کو ویران کر دیا اس کے سہاگ کو لوٹا، اس کی گردن سونی کر دی ان اسباب کو مٹانے کے لیے مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی اب اس کے پاس اپنے دل و دماغ کو قربان کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا، اوروں کے لیے خدمت قوم، تہذیب کا ایک تقاضا ہو یا نمود کا ایک ذریعہ اس کے لیے تو یہ عبادت تھی اور وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجا لائی تھی لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانے کی یاد تو آتی ہی ہے چھما کا یہ آشیانہ کہاں تھا یہی تو وہ موقع تھا جب اس کا دل ہمدردی کے لیے فرار ہو جاتا تھا یہاں پر دردشناس مردلا کو پا کر وہ اپنی قسمت کی تعریف کر رہی تھی۔ مگر یہ صحبت بھی اتنی جلد برہم ہو گئی۔

چھما حسرت ناک انداز سے بولی ''یہاں سے جا کر بھول جاؤ گی مردلا تمہارے لیے یہ ریل گاڑی کی ملاقات ہے اور میرے لیے تمہارے وعدے اس ملاقات کے وعدے ہیں کبھی ملاقات ہو جائے گی تو، یا پہچانو گی ہی نہیں، یا ذرا مسکرا کر نمستے کہتی ہوئی اپنی راہ چلی جاؤ گی یہی دنیا کا دستور ہے، اپنے رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے کے لیے کیونکر روئے تمہارے لیے تو میں کچھ نہیں تھی، میرے لیے تم سب کچھ تھیں اپنے پیاروں میں بیٹھ کر کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا بھکاری کے لیے چٹکی بھر آٹا ہی بہت ہے۔''

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا مردلا رہا ہو گئی شام کو وہ سب بہنوں سے گلے مل کر رو کر رلا کر رخصت ہو گئی گویا میکے سے بدائی ہو۔

(3)

تین مہینے گزر گئے، مگر مردلا ایک بار بھی نہ آئی، اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے بعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آتی رہتیں لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا ہر مہینے کے آخری اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی جب ملاقات کا وقت گزر جاتا تو ذرا دیر رو کر دل کو سمجھا لیتی زمانے کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کر کے اٹھی تھی کہ دیکھا سامنے مردلا چلی آ رہی ہے نہ وہ چہرہ ہے، نہ وہ رونق، دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی ''یہ تیری کیا حالت ہے مردلا صورت ہی بدل گئی تم بیمار ہو گیا؟''

مردلا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بولی'' بیمار تو نہیں ہوں بہن ۔۔۔۔۔۔۔! مصیبت زدہ ہوں تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہوگی ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں اور ساری فکروں سے آزاد ہو کر آئی ہوں''

چھما کا دل کانپ اٹھا، سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی'' خیر تو ہے؟ اتنی جلدی تم پھر یہاں کیوں آ گئیں؟ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے''

مردلا زرد تبسم کے ساتھ بولی'' اب سب خیریت ہے بہن ہمیشہ کے لیے خیریت ہو گئی کوئی فکر نہیں رہی اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے تیار ہوں تمہاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ''تمھیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی پرسوں شہر میں گولیاں چلیں دیہاتوں میں آج کل لگان ادا کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بہ دن بھاؤ گرتا جا رہا ہے پونے دو روپے من بھر گیہوں آتا ہے میری عمر ہی کیا ہے اماں بھی کہتی ہیں اتنا سستا غلہ کبھی نہ تھا کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں آتے۔ سینچائی اور محنت سب اوپر غریب کہاں سے دیں سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال و اسباب نیلام کر لو، قرق کر لو، اپنی زمین لے لو، مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ بھیروی گنج کا علاقہ پیسا جا رہا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک کسان کے گھر میں آ کر کئی کانسٹیبلوں نے اسے پیٹا، بےچارہ بیٹھا مار کھاتا رہا۔ اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹیلوں کو گالیاں دینے لگی بس ایک کانسٹیبل نے اسے برہنہ کر دیا اور اب بہن کیا کہوں۔ ہمارے بھائی اتنی بے رحمی کریں اس سے زیادہ شرم ناک اور کیا ہو گا۔ اب کسان سے ضبط نہ ہوا کبھی پیٹ بھر غریبوں کو کھانے کو ملتا نہیں۔ اس پر اتنی بڑی مشقت جسم میں نہ طاقت باقی رہی ہے نہ ہمت، مگر انسان کا دل ہی تو ٹھہرا بےچارہ بےدم پڑا ہوا تھا بیوی کا چلانا سن کر اٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹیبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا ایک کسان کسی پولیس کے آدمی سے اتنی بے ادبی کرے، اسے بھلا وہ کہیں برداشت کر سکتا ہے۔ سب کانسٹیبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔''

چھما: ''گاؤں کے اور لوگ تماشہ دیکھتے رہے ہوں گے؟''

مردلا: ''اس میں بھی آفت ہے اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے تو پولیس سمجھتی کہ مزاحمت کرنے آئے ہیں شاید ڈنڈا چلانا شروع کر دیتی اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیتی۔ دو چار آدمی بھن جاتے اسی لیے لوگ جمع نہیں ہوئے، لیکن جب وہ کسان مر گیا تو گاؤں والے طیش میں آئے لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور کانسٹیبلوں کو گھیر لیا ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں کانسٹیبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں، دو کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئیں، اس کے بدلے میں دس بارہ آدمیوں کی جانیں لی گئیں چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کا بے جا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹیبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا غریب ہیں، بیکس ہیں، بے زبان ہیں، جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو۔ حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی امید چھوڑ دی۔ سوچتے ہیں آخر اسی سرکار نے تو کانسٹیبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی، مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کیے نہیں مانتا گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پبلک اور کچھ نہیں کر سکتی، ہمدردی تو کرتی ہے غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے مظلوم کے لیے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے اگر پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کی تشفی ہو جاتی، مگر پولیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا تھا۔ چاروں سرحدوں پر کانسٹیبل کھڑے کر دیے گئے تھے۔ یہ زخم پر نمک تھا، مارتے بھی ہو اور رونے بھی نہیں دیتے۔ آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں

اورشہر والوں کو اپنی مصیبت کی کہانی سنانے آئے ہنگامے کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی۔ ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال ہو گیا۔ اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھلائے، بہت بڑا مجمع ہو گیا۔ میرے بابو جی بھی اس مجمع میں تھے میں سمجھاتی رہی، مت جاؤ، آج کا رنگ اچھا نہیں، کہنے لگے میں کوئی لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں پچاس ہزار آدمی جنازے کے ساتھ تھے، اور پانچ سو مسلح پولیس روکے ہوئے تھی، سوار اور پیادے پوری فوج تھی جب پولیس کی بار بار دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہو گیا۔ فائر ہونے لگے، کتنے گھائل ہوئے، کون جانتا ہے میرا مکان لب سڑک ہے میں اپنے چھجے پر کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی ہزاروں آدمی بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ بہن وہ نظارہ یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی وحشت، ایسی سراسیمگی کہ تم سے کیا کہوں مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سر فروش جانبازوں کی ایک جماعت تھی، جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھی۔ اور ہر ایک دھائیں دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی، اس صدا میں کتنی کشش تھی کتنا جوش! بس یہی جی چاہتا تھا کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں، اور ہنستے ہنستے مر جاؤں اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مر جانا کوئی کھیل ہے اماں جی کمرے میں بھان کو لیے چھجے پر آ گئیں اسی وقت دس بارہ آدمی ایک سٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لیے ہوئے دروازے پر آئے اماں کی ان پر نظر پڑی تو سمجھ گئیں مجھے تو سکتہ سا ہو گیا اماں نے جا کر ایک بار لاش

وک دیکھا، اسے چھاتی سے لگایا اس کا بوسہ لیا اور سیدھی چوراہے کی طرف چلیں، جہاں سے اب بھی دھائیں اور جے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نقش دیوار بنی لاش کو دیکھتی تھی، کبھی اماں جی کو، نہ کچھ بولی، نہ جگہ سے ہلی، نہ روئی نہ بے قرار ہوئی، احساس کی مجھ میں قوت نہ رہی تھی۔ اماں جی جاں بازوں کی صف میں جا کر کھڑی ہو گئیں اور ایک منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی ان کے گرتے ہی جانبازوں کا ضبط بھی رخصت ہو گیا۔ نہتے تھے مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر کی قوت محسوس کر رہا تھا سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے جان لے کر بھاگے، کوئی ادھر کوئی ادھر مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے تھے بھان چھجے پر جھکا کھڑا تھا نہ جانے کدھر سے آ کر ایک گولی اس کے سینے میں لگی۔ میرا لال وہیں گر پڑا سانس تک نہ لی مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان کو گود میں اٹھا لیا اس کے سینے سے خون جاری تھا میں نے اسے دودھ پلایا تھا، اسے وہ خون سے ادا کر رہا تھا۔ اس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے مجھے ایسا فتح مندانہ غرور ہو رہا تھا، جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا لڑکپن، جوانی اور موت ساری منزلیں ایک ہی ہچکی میں تمام ہو گئیں۔"

میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا اتنے میں اماں جی کا جنازہ بھی آ پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں مجھے تو روکتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں گویا وہی سورگ کا راستہ ہو جب ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں لاشیں رکھی گئیں، تب میرا سکتہ ٹوٹا، ہوش آیا، ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لیے جاتی ہے، جنہیں نازوں سے پالا انہیں چھوڑ کیسے جاتی؟ وہ تو وہاں بیٹے اور

پوتے کے ساتھ گئیں میرے لیے کیا چھوڑا۔ ایک بار جی میں آیا میں بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے لیکن پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے جس کا معاوضہ یہ ملے بہن! اس چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لیے بیٹھی مسکرا رہی ہیں اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں تم جاؤ اور بے فکر ہو کر کام کرو۔ ان کے چہروں پر کتنا جلال تھا خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں دور سے یہ جلتی ہوئے چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں جیسے دریا کے پل پر جلتی ہوئی لالٹینوں کی قطار ہو اس پل پر ہو کر شہادت کی منزل ہے اور یہی مشعلیں بقائے دوام کی طرف لے جاتی ہیں، یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں جل کر راکھ ہو گئیں تو ہم لوگ لوٹے لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی میرے لیے اب وہ گھر نہ تھا، میرا گھر اب یہ ہے جہاں میں بیٹھی ہوں، یا پھر وہی چتا میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا مہلا آشرام چلی گئی کل کی گولیوں میں کانگریس کمیٹی کا صفایا ہو چکا تھا کانگریس باغی انجمن قرار دے گئی تھی اس کے دفتر پر پولیس نے چھاپہ مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا۔ مہلا آشرم پر بھی حملہ ہوا اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور اپنا کام کرتے رہے شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور خوشی اور مبارک باد میں جلوس نکالنا ضروری تھا لوگ کہتے ہیں

جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں میدان سے ہٹے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا شاید پبلک کا دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعے سے سرکار کو اخلاقی احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے پبلک کے وہم کو دور کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا وہ یہ دکھانا چاہتی تھی ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے تمہاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پروا بھی نہیں جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ پبلک کو ہدایت اور تنبیہہ کر دی گئی کہ خبردار جلوس میں نہ آنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے، مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس رتبہ پر پہنچ گئی تھی، جو بڑے بڑے سرکاری افسروں کو بھی، جو بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں یہ دلوں کی حکومت تھی یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا، یا اسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی، یا نقصان کا خوف۔ ہرگز نہیں، پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو بسر و چشم ماننے کو تیار تھے اسی لیے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بے چینی کی زندہ مثال تھی جلوس روانہ ہوا اسی وقت پولیس نے

میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی پہلے تمہیں میری ضرورت تھی اب مجھے تمہاری ضرورت ہے پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں، اب میں تمہاری ہمدردی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوں اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لیے تیار ہوں اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بے جا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی کیوں کہ میں جانتی ہوں آزاد رہ کر جو کچھ کر سکتی ہوں جیل میں رہ کر اس سے کہیں زیادہ کر سکتی ہوں آزادی میں غلطی کا امکان ہے، بہکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے، رقابت کی فکر ہے، جیل عقیدت اور احترام کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا میدان میں جلتا ہوا الاؤ، ہوا میں اپنی حرارت کھو دیتا ہے لیکن انجمن میں بند رہ کر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔

اور دیویوں کو بھی خبر ملی، سب کی سب مردلا سے ملنے آ پہنچیں پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔

☆☆☆☆☆☆

اختتام ۔۔۔۔۔۔ حصہ سوئم

فہرست

فریب	03
آخری حیلہ	20
ڈیمانسٹریشن	30
آخری تحفہ	43
مالکن	62
دو بیل	85
ادیب کی عزت	102
نجات	117
طلوع محبت	129
زیور کا ڈبہ	146
شکوہ شکایت	166
نئی بیوی	183
ستی	204
ڈامل کا قیدی	216
بدنصیب ماں	237
کسم	258
وفا کا دیوتا	282
معصوم بچہ	301
عیدگاہ	314
اکسیر	332

فریب

پہلی بار: ہندی میں ''لانچھن'' کے عنوان سے ''مادھوری'' فروری 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1936ء (زادِ راہ)

دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا ہوتا جس کی نگاہ لوگوں کے دلوں میں اندر گھس سکتی تو، ایسے بہت کم لوگ ہوتے جو اس کے سامنے سیدھی آنکھیں کر کے دیکھ سکتے مہلا آشرم کی جگنو بائی کے متعلق لوگوں کو ایسی ہی نگاہ رکھنے کا گمان تھا۔ وہ ناخواندہ غریب بوڑھی عورت تھی مسکین صورت، لیکن جیسے کسی ہوشیار پروف ریڈر کی نگاہ غلطیوں پر ہی جاتی ہے، اس کی آنکھیں بھی باطن کے داغوں پر جا پڑتی تھیں شہر میں ایسی کوئی سربرآوردہ خاتون نہ تھی، جس کے متعلق دو چار راز کی باتیں اسے نہ معلوم ہوں اس کا پست قد، نحیف جسم سفید بال اور پر شکن چہرہ اس کی جانب سے حسن ظن پیدا کرتے تھے مہلائیں اسے اپنا کرم راز بنا لیتی تھیں اور ہمیشہ کے لیے اس کے دام میں پھنس جاتی تھیں جس پر وہ ایک بار قابو پا لیتی، اس پر سختی سے حکومت کرتی۔ اس کا کام مہلا آشرم میں عورت کی خدمت تواضع کرنا تھا، جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن دیویاں اس کی صورت سے کانپتی تھیں اس کا ایسا رعب تھا کہ جوں ہی وہ کمرے میں قدم رکھتی لبوں پر آئی ہوئی ہنسی جیسے رو پڑتی تھی چہکنے والی آوازیں خاموش ہو جاتی تھیں گویا اس کے چہرے پر دیویوں کو اپنے پچھلے کارناموں کو کسی خونخوار درندے کی طرح پنجرے میں بند کر کے رکھنا چاہتا ہو

وہ راز جو پہلے ایک کیڑے کی طرح حقیر اور کم بضاعت تھا۔ دونوں کے ساتھ جسیم اور خوفناک ہو جاتا تھا یہاں تک کہ ہم اس کی یاد ہی سے کانپ اٹھتے ہیں اور اگر اپنے ہی کارناموں کی بات ہوتی تو زیادہ تر عورتیں جگنو سے اجتناب کرتیں، مگر یہاں تو سسرال اور ننھیال چاروں طرف کی حفاظت کرنا پڑتی اور جس قلعہ میں اس قدر دروازے ہوں اس کی حفاظت کون کرسکتا ہے؟ وہاں کے حملہ آور کے سامنے سر جھکا دینے ہی میں خیریت ہے جگنو کے دل میں ہزاروں مردے دفن تھے جب ضرورت پڑتی، اکھاڑ لیتی، جہاں کسی عورت نے اپنی شان دکھلائی وہیں جگنو کی تیوریاں بدلیں اس کی کڑی نگاہ اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیا کرتی تھی، مگر مستورات اس سے نفرت کرتی ہوں یہ بات نہ تھی، سبھی بڑے چاؤ سے اس سے ملتیں اور اس طرح آؤ بھگت کرتیں۔ اپنے ہمسایوں کی بدنامی ہمیشہ لوگوں کی دلچسپی کا سامان ہی رہا ہے اور جگنو کے پاس اس کی کمی نہ تھی۔

(2)

شہر میں اندومتی مہلا پاٹھ شالا اور ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا حال میں مس خورشید اس کی ہیڈ مسٹرس ہو کر آئی تھیں شہر میں مستورات کا دوسرا کلب نہ تھا، مس خورشید ایک دن آشرم میں تشریف لائیں ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ کوئی دوسری عورت آشرم میں نہ تھی۔ ان کی بڑی مدارت ہوئی پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ مس خورشید کی آمد سے آشرم میں جان سی پڑ گئی تھی۔ کچھ اس طرح دل کھول کر ہر ایک

سے ملیں، کچھ ایسی دلچسپ باتیں کہیں کہ تمام عورتیں فریفتہ ہو گئیں۔ گانے میں ہوشیار تھیں تقریر بھی خوب کرتی تھیں اور ناٹک کے پارٹ ادا کرنے میں تو انہوں نے لون میں خاص نام پیدا کیا تھا ایسی ہمہ صفت موصوف خاتون کی آمد آشرم کی خوش قسمتی تھی گلابی رنگ نازک اندام، نرگسی آنکھیں، نئے فیشن کے کٹے ہوئے بال، ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا خوبصورت کی اس سے اچھی تصویر کسی نے نہیں دیکھی ہو گی۔

چلتے وقت مس خورشید نے مسز ٹنڈن سے جو آشرم کی انچارج تھیں بلا کر پوچھا ''وہ بڑھیا کون ہے؟''

جگنو کئی دفعہ کمرے میں آ کر مس خورشید کو متجسس نگاہوں سے دیکھ چکی تھی، جیسے کوئی شہسوار نئی گھوڑی کو دیکھ رہا ہو۔

مسز ٹنڈن نے مسکرا کر جواب دیا ''یہ اوپر کا کام کرنے پر نوکر ہے کوئی کام ہو تو بلاؤں''

مس خورشید نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''جی نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے مجھے چالباز معلوم ہوتی ہے، یہ بھی دیکھ رہی ہوں پر وہ نوکر نہیں مالکہ ہے''

مسز ٹنڈن تو جگنو سے جلی بیٹھی تھیں، اب تو بیوگی کا داغ لگانے کے لیے وہ سدا سہاگن کہا کرتی تھی مس خورشید سے جتنی اس کی برائی ہو سکی وہ کی اور اسے خبر دار رہنے کا مشورہ دیا۔

مس خورشید نے سنجیدگی سے کہا ''تب تو خوفناک عورت ہے جبھی سبھی عورتیں اس سے کانپتی ہیں آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں؟ ایسی چڑیل کو ایک دن بھی نہ

رکھنا چاہیے‘‘

مسز ٹنڈن نے اپنی مجبوری ظاہر کی ’’نکال کیسے دوں، زندگی مشکل ہو جائے ہماری قسمت اس کی مٹھی میں ہے اور آپ پر چار دنوں میں اس کے جوہر کھلیں گے میں تو ڈرتی ہوں کہیں آپ بھی اس کے پنجے میں نہ پھنس جائیں اس کے سامنے بھول کر بھی کسی مرد سے بات نہ کیجئے گا اس کے مخبر نہ جانے کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں نوکروں سے مل کر بھید یہ لے ڈاکیوں سے مل کر خط یہ دیکھے لڑکیوں کو پھسلا کر گھر کا حال یہ پوچھے اس رانڈ کو تو خفیہ پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا یہاں نہ جانے کیوں آمری۔‘‘

مس خورشید فکر میں ڈوب گئی، گویا اس عقدہ کے حل کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہوں۔ ایک لمحہ بعد بولیں ’’اچھا میں اسے ٹھیک کروں گی‘‘

مسز ٹنڈن ’’نکال دینے سے کیا ہوگا اس کی زبان تو بند نہ ہوگی تب اور بھی نڈر ہو کر کیچڑ اچھالے گی۔‘‘

مس خورشید نے اطمینان کے لہجہ میں کہا ’’میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی بہن آپ دیکھ لیجئے گا ٹکے کی عورت یہاں راج کر رہی ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتی‘‘

وہ چلی گئیں تو مسز ٹنڈن نے جگنو کو بلا کر کہا ’’ان نئی مس صاحبہ کو دیکھا یہاں پرنسپل ہیں‘‘

جگنو نے بغض بھرے ہوئے لہجہ میں کہا آپ دیکھیں ہیں ایسی سینکڑوں چھوکریاں دیکھ چکی ہوں آنکھ کا پانی جیسے مر گیا ہو۔

مسز ٹنڈن: ’’آہستہ بولو تمہیں کچا ہی چبا جائیں گی ان سے ڈرتی رہنا کہہ گئی ہیں میں اسے ٹھیک کر کے چھوڑوں گی میں نے سوچا تمہیں خبردار کر دوں، ایسا نہ ہو اس کے سامنے کچھ ایسی ویسی بات کہہ بیٹھو۔‘‘

جگنو نے گویا تلوار کھینچ کر کہا ’’مجھے خبردار رہنے کی ضرورت نہیں، انہیں خبردار کر دیجئے گا، یہاں آنا نہ بند کروں تو اپنے باپ کی نہیں، وہ گھوم کر دیکھ آئی ہوں تو یہاں گھر بیٹھے بیٹھے دنیا دیکھ چکی ہوں۔‘‘

مسز ٹنڈن نے پیٹھ ٹھونکی ’’میں نے سمجھا دیا بھئی آگے تم جانو تمہارا کام‘‘

جگنو ’’آپ چپ چاپ دیکھی جایئے کیا تگنی کا ناچ نچاتی ہوں، اس نے اب تک بیاہ کیوں نہیں کیوں؟ عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی‘‘

مسز ٹنڈن نے ردا جمایا ’’کہتی ہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتی کسی مرد کے ہاتھوں میں اپنی آزادی کیوں بیچوں‘‘

جگنو نے آنکھ نچا کر کہا ’’کوئی پوچھتا ہی نہ ہوگا ایسی بہت سی کنواریاں دیکھ چکی ہوں، ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی‘‘

اتنے میں اور کوئی مستورات آگئیں اور بات کا سلسلہ بند ہو گیا۔

(3)

دوسرے دن جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی، اتفاق سے مس خورشید ہوا کھانے کو گئی ہوئی تھیں خانساماں نے پوچھا ’’کہاں سے آئی ہو؟‘‘

جگنو ''یہیں رہتی ہوں بیٹا، میم صاحبہ کہاں سے آئی ہیں تم تو ان کے پرانے نوکر ہو گے''

خانساماں: ''ناگپور سے آئی ہیں، میرا گھر وہیں ہے اس سال سے ان کے ساتھ ہوں''

جگنو: ''کسی اونچے خاندان کی ہوں گی وہ تو رنگ ڈھنگ سے ہی معلوم ہوتا ہے''

خانساماں: ''خاندان تو کچھ ایسا اونچا نہیں ہے ہاں تقدیر کی اچھی ہیں ان کی ماں ابھی تک مشن میں تیس روپے پاتی ہیں۔ یہ پڑھنے میں تیز تھیں وظیفہ مل گیا ولایت چلی گئیں، بس تقدیر کھل گئی اب تو اپنی ماں کو بلانے والی ہیں لیکن وہ بڑھیا شاید ہی آوے یہ گرجے درجے نہیں جاتی ان دونوں میں پٹتی نہیں''

جگنو: ''مزاج کی تیز معلوم ہوتی ہیں؟''

خانساماں ''نہیں مائی بہت نیک ہیں ہاں گرجے نہیں جاتیں تم کیا نوکری کی تلاش میں ہو کرنا چاہتی ہو تو کرلو ایک آیا رکھنا چاہتی ہیں''

جگنو: ''نہیں بیٹا اب میں نوکری کیا کروں گی اس بنگلہ میں پہلے جو میم صاحبہ رہتی تھیں وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں میں نے سمجھا چلو نئی میم صاحبہ کو دعا دے آؤں''

خانساماں: ''یہ دعا دینے والی میم صاحبہ نہیں ہیں ایسوں سے بہت چڑتی ہیں کوئی مانگنے والا آیا اور اسے ڈانٹ بتائی کہتی ہیں بنا کام کیے کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے بھلا چاہتی ہو تو چپکے سے راہ لو۔''

جگنو: ''یہ کہو ان کا کوئی دھرم نہیں ہے پھر بھلا ہم غریبوں پر کیوں رحم کرنے

لگیں۔''

جگنو کو اپنی دیوار کھڑی کرنے کے لیے کافی مصالحہ مل گیا نیچ خاندان کی ہیں، ماں سے نہیں بنتی، دھرم کرم سے خالی ہیں پہلے دھارے میں اتنی کامیابی کچھ کم نہ تھی۔ چلتے چلتے خانساماں سے اتنا اور پوچھا ''ان کے صاحب کیا کرتے ہیں؟''

خانساماں نے مسکرا کر کہا ''ان کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی، صاحب کہاں ہوں گے؟''

جگنو نے حیرت مصنوعی سے کہا ''ارے اب تک بیاہ نہیں ہوا ہمارے یہاں تو دنیا ہنسنے لگے۔''

خانساماں: ''اپنا اپنا رواج ہے ان کے ہاں کتنی ہی عورتیں عمر بھر بیاہ نہیں کرتیں''

جگنو نے افسردہ دلی سے کہا ''ایسی کنواریاں تو میں بہت دیکھ چکی ہوں، ہماری برادری میں کوئی اس طرح رہے تو تھڑی بڑی ہو جائے لیکن ان کے ہاں جو جی میں آئے کرو کوئی نہیں پوچھتا۔''

اتنے میں مس خورشید آ پہنچیں گلابی جاڑہ پڑنے لگا تھا مس صاحبہ ساڑی کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہوئے تھیں، ایک ہاتھ میں چھاتا تھا، دوسرے میں کتے کی زنجیر، نسیم سحری میں ورزش نے گالوں کو تازہ سرخ بنا دیا تھا۔ جگنو نے جھک کر سلام کیا پر انہوں نے اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا اندر جا کر خانساماں کو بلا کر پوچھا ''یہ عورت کاے کرنے آئی ہے''

خانساماں نے جوتے کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا ''بھکارن ہے حضور، پر عورت

سمجھ دار ہے۔ میں نے کہا، یہاں نوکری کرو گی تو راضی نہیں ہوئی پوچھنے لگی، ان کے صاحب کیا کرتے ہیں جب میں نے بتا دیا تو اسے بڑا تعجب ہوا اور ہونا ہی چاہیے ہندوؤں میں تو دودھ پیتی بچی تک کا بیاہ ہو جاتا ہے۔''

خورشید نے سوال کیا ''اور کیا کہتی تھی''

''اور تو کوئی بات نہیں حضور''

''اچھا اسے میرے پاس بھیج دو''

(4)

جگنو نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا مس خورشید نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا'' آیئے ماں جی۔۔۔۔۔۔میں ذرا سیر کرنے چلی گئی تھی آپ کے آشرم میں تو سب خیریت ہے۔''

جگنو ایک کرسی کا تکیہ پکڑ کر کھڑے کھڑے بولی ''سب خیریت ہے، مس صاحبہ میں نے کہا آپ کوئی دعائیں دے آؤں میں آپ کی لونڈی ہوں، جب کوئی کام پڑے مجھے یاد کیجئے گا، یہاں اکیلے تو حضور اچھا نہ لگتا ہو گا''

''مجھے اپنی اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ بڑا لطف حاصل ہوتا ہے وہ سب ہی میری لڑکیاں ہیں۔''

جگنو نے مادرانہ انداز سے سر ہلا کر کہا ''یہ ٹھیک ہے مس صاحبہ پر اپنا اپنا ہی ہے دوسرا اپنا ہو جائے تو اپنوں کے لیے کیوں روئے''

اچانک ایک خوبصورت نوجوان ریشمی سوٹ پہنے اندر داخل ہوا مس خورشید نے اس طرح دوڑ کر اس کا استقبال کیا، گویا جامہ میں پھولی نہ ساتی تھی جگنو اسے دیکھ کر کونے میں دبک گئی۔

خورشید نے نوجوان سے گلے ملتے ہوئے کہا ''پیارے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں (جگنو سے) جی آپ جائیں، پھر کبھی آنا، یہ میرے پیارے دوست ولیم کنگ ہیں ہم اور یہ دونوں بہت دنوں تک ساتھ ساتھ پڑھے ہیں''

جگنو چپکے سے نکل کر باہر چلی آئیں خانساماں کھڑا تھا پوچھا ''یہ لونڈا کون ہے؟''

خانساماں نے سر ہلایا ''میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے، شاید کنوار پن سے دل بھر گیا اچھا طرحدار جوان ہے''

جگنو: ''دونوں اس طرح ٹوٹ کر گلے ملے ہیں کہ میں شرم کے مارے گڑ گئی دونوں لپٹ گئے، لونڈا مجھے دیکھ کر جھجکا بھی تھا پر تمہاری مس صاحبہ تو جیسے متوالی ہو گئی تھیں، خانساماں نے کہا'' مجھے تو کچھ بے ڈھب معاملہ نظر آتا ہے۔

جگنو تو یہاں سے سیدھی مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی، ادھر مس خورشید اور نوجوان میں باتیں ہونے لگی۔

مس خورشید نے قہقہہ لگا کر کہا ''تم نے اپنا پاٹ خوب کھیلا، لیلا، بڑھیا سچ مچ چندھیا گئی۔''

لیلا: ''میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں بھانپ نہ جائے''

مس خورشید: ''مجھے یقین تھا وہ آج ضرور آئے گی میں نے اسے برآمدے

میں دیکھا اور تمہیں اطلاع دی آج آشرم میں بڑے مزے رہیں گے جی چاہتا ہے عورتوں کی کانا پھوسیاں سنوں، دیکھ لینا سب ہی اس کی باتوں پر یقین کر لیں گی۔"

لیلا: "تم بھی تو جان بوجھ کر دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہو"

مس خورشید: مجھے ناٹک کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے بہن ذرا دل لگی رہے گی، بڑھیا نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے ذرا اسے سبق دینا چاہتی ہوں کل تم اسی وقت اسی ٹھاٹھ سے پھر آ جانا بڑھیا کل پھر آئے گی اس کے پیٹ میں پانی نہ ہضم ہوگا، جس وقت وہ آئے گی تمہیں خبر کر دوں گی بس تم چھیلا بنی ہوئی پہنچ جانا۔

(5)

آشرم میں اس دن جگنو کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی اس نے سارا حال مسز ٹنڈن سے کہا۔ مسز ٹنڈن دوڑی ہوئی آشرم میں پہنچی اور دوسری عورتوں کو خبر سنائی جگنو اس کی تصدیق کرنے کے لیے بلائی گئی جو عورت آتی وہ جگنو کے منہ سے یہ کہانی سنتی ہر ایک ریہرسل میں کچھ نہ کچھ رنگ چڑھ جاتا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے سارے شہر کے مہذب حلقہ میں یہ خبر پھیل گئی۔

ایک عورت نے پوچھا "یہ آدمی کون ہے؟"

مسز ٹنڈن: "سنا ہے ان کے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے دونوں میں پہلے سے کچھ بات چیت رہی ہوگی، وہی تو میں کہتی تھی کہ اتنی عمر ہوگئی یہ کنواری کیسے بیٹھی ہے اب

قلعی کھلی؟''

جگنو: ''اور کچھ ہو یا نہ ہو جوان تو بانکا ہے''

مسز ٹنڈن: ''یہ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا حال ہے''

جگنو: ''میں تو ان کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی، دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں''

مسز ٹنڈن: ''کل پھر جانا''

جگنو: ''کل نہیں میں آج رات ہی کو جاؤں گی'' لیکن رات کو جانے کے لیے بہانا ضروری تھا۔مسز ٹنڈن نے آشرم کے لیے ایک کتاب منگوا بھیجی رات 9 بجے جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر جا پہنچی اتفاق سے اس وقت لیلاوتی وہاں موجود تھی ''یہ بڑھیا بے طرح پیچھے پڑی ہے''

خورشید: ''میں نے تم سے کہا تھا اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا تم جا کر روپ بھر آؤ تب تک میں اسے باتوں میں لگاتی ہوں شرابیوں کی طرح اول جلول بکنا شروع کر دینا بس یوں بن جانا جیسے اپنے ہوش میں نہیں ہو۔''

لیلا مشن میں ڈاکٹر تھی اس کا بنگلہ بھی پاس ہی تھا وہ چلی گئی تو مس خورشید نے جگنو کو بلایا۔

جگنو نے ایک پرزہ دے کر کہا ''مسز ٹنڈن نے یہ کتاب مانگی ہے مجھے آنے میں دیر ہوگئی، میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی پر سویرے ہی وہ مجھ سے مانگے گی ہزاروں روپے کی آمدنی ہے مس صاحبہ ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتی ہے، ان کے دروازے پر بھکاری کو بھیک تک نہیں ملتی۔ مس خورشید نے پرزہ دیکھ کر کہا

اس وقت تو یہ کتاب نہیں مل سکتی، صبح لے جانا، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں" وہ پردہ اٹھا کر نیچے کے کمرے میں چلی گئی وہاں سے کوئی پندرہ منٹ میں ایک خوبصورت ریشمی ساڑھی پہنے عطر میں بسی ہوئی منہ پر پاوڈر لگائے نکلی، جگنو نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، اوہو، یہ سنگھار، شاید اس وقت وہ لونڈا آنے والا ہوگا تب ہی یہ سب تیاریاں ہیں، ورنہ سونے کے وقت کنواریوں کو بناؤ سنگھار کی کیا ضرورت جگنو کی رائے میں عورتوں کے بناؤ سنگھار کا صرف ایک مدعا تھا، خاوند کو لبھانا اس لیے سہاگنوں کے سوا سنگار سب کے لیے منع تھا ابھی خورشید کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جوتے کی چرمر سنائی دی اور ایک منٹ میں ولیم کنگ نے کمرہ میں قدم رکھا، اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کپڑوں سے شراب کی بو آرہی تھی وہ مس خورشید سے لپٹ گیا۔

مس خورشید نے اپنے کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "چلو ہٹو شراب پی کر آئے ہو"

کنگ نے شرابیوں کی طرح کہا "آج تمہیں بھی پلاؤں گا"

مس خورشید نے جگنو کی موجودگی کا اشارہ کیا کہ جگنو کی نظر پڑ جائے گی، پر کنگ نشہ میں مست تھا جگنو کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔

مس خورشید نے غصہ سے اپنے کو الگ کرکے کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے چلو ہٹو"

کنگ: "اتنے دنوں سے چوروں کی طرح آتا ہوں آج سے کھلے خزانہ آؤں گا"

خورشید: تم پاگل ہو رہے ہو دیکھتے نہیں کمرے میں کون بیٹھا ہوا ہے

کنگ نے حیران ہو کر جگنو کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا "یہ بڑھیا کب آئی بڈھی شیطان کی بچی، یہاں بھید لینے آئی ہے ہم کو بدنام کرنا چاہتی ہے میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا"

جگنو بلی کی طرح کمرہ سے نکلی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگی ادھر کمرے سے قہقہے اٹھ اٹھ کر کمرہ کی چھت کو ہلانے لگے۔

جگنو اس وقت مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی، اس کے پیٹ میں بلبلے اٹھ رہے تھے مگر مسز ٹنڈن سو گئی تھیں، وہاں سے نا امید ہو کر اس نے کئی دوسرے گھروں کی کنڈیا کھٹکھٹائیں، پر کوئی دروازہ نہ کھلا اور غریب کو ساری رات اسی طرح کاٹنی پڑی جیسے کوئی روتا ہوا بچہ گود میں ہو۔ صبح وہ آشرم میں جا کر کود ی، کوئی آدھے گھنٹے میں مسز ٹنڈن بھی آئیں، انہیں دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا مسز ٹنڈن نے پوچھا "رات کیا تم میرے گھر گئی تھیں اس وقت مجھے مہاراج نے کہا"

جگنو نے بے پروائی سے کہا: "پیاسا تو کنویں کے پاس جاتا ہے مجھے آگ میں جھونک کر آپ دور ہٹ گئیں، بھگوان نے حفاظت کی نہیں تو کل جان ہی گئی تھی مسز ٹنڈن نے بے قراری سے کہا "کیا ہوا؟ کچھ تو کہو مجھے تم نے جگا کیوں نہ لیا" تم جانتی ہو میری عادت سویرے سو جانے کی ہے۔"

جگنو: "مہاراج نے گھر میں گھسنے نہ دیا جگا کیسے لیتی آپ کو اتنا تو سوچنا ہی چاہے تھا کہ وہ وہاں گئی ہے تو آتی ہی ہوگی گھڑی بھر بعد سوتیں تو کیا بگڑتا پر آپ کو کسی کی کیا پروا؟"

مسز ٹنڈن: "تو کیا ہوا؟ مس خورشید مار نے دوڑیں کیا"

جگنو: ''وہ مارنے نہیں دوڑیں ان کا وہ خصم مارنے دوڑا لال لال آنکھیں نکالے آیا اور مجھ سے کہا، نکل جا۔ جب تک میں نکلوں نکلوں تب تک ہنٹر کھینچ کر دوڑ ہی تو پڑا۔ میں سر میں پاؤں رکھ کر نہ بھاگتی تو کھل ادھیڑ ڈالتا۔ ادھر وہ رانڈ بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی دونوں میں پہلے سے سازباز ہو گی ایسی فاحشہ عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے، بازاری عورت بھی اتنی بے شرم نہیں ہوتی۔''

ذرا دیر میں مستورات بھی آ پہنچیں یہ حال سننے کے لیے سب ہی بے قرار تھیں جگنو کی قینچی لگاتار چلتی رہی، مستورات کو اس پریم کتھا سے اتنا لطف حاصل ہو رہا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک ایک بات کو کرید کرید کر پوچھتی تھیں گھر کے کام دھندے بھول گئیں کھانے پینے کی سدھ نہ رہی، اور ایک بار سن کر ان کا جی نہ بھرتا تھا بار بار وہی سنتی تھیں اور نیا چٹخارہ لیتی تھیں۔

مسز ٹنڈہ نے آخر کہا ''اس آشرم میں ایسی عورتوں کا لانا غیر واجب ہے آپ لوگ اس سوال پر غور کریں''

مسز پانڈیا نے تائید کی ''ہم آشرم کو اپنے معیار سے گرانا نہیں چاہتے میں تو کہتی ہوں ایسی عورت کسی بھی اسکول کی پرنسپل بننے کے لائق نہیں''

مسز بانگڑا نے فرمایا: ''جگنو بائی نے ٹھیک کہا تھا ایسی عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔ اس سے صاف کہہ دینا چاہیے آپ یہاں تشریف نہ لائیں''

ابھی یہی کھچڑی پک رہی تھی کہ آشرم کے سامنے ایک موٹر رکی اور عورتوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو موٹر میں مس خورشید اور ولیک کنگ بیٹھے ہوئے تھے۔

جگنو نے منہ پھیلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا ''وہی لونڈا ہے، عورتوں کا سارا جھنڈ

چک کے سامنے آنے کے لیے بے چین ہو گیا۔''

مس خورشید نے موٹر سے اتر کر پٹ بند کر دیا اور آشرم کی طرف چلیں، مستورات بھاگ بھاگ کر اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھیں۔

مس خورشید نے کمرہ میں قدم رکھا کسی نے استقبال نہ کیا مس خورشید نے جگنو کی طرف بے جھجک آنکھوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ''کہیے بائی جی! رات آپ کو چوٹ تو نہیں آئی!'' جگنو نے بہتیری دلیر عورتیں دیکھی تھیں پر اس دیدہ دلیری نے اسے حیران کر دیا چور ہاتھ میں چوری کا مال لیے شاہ کو پکار رہا تھا۔

جگنو نے اینٹھ کر کہا ''جی نہ بھرا ہو تو اب پٹوا دو، سامنے ہی تو ہیں''

خورشید: ''وہ تو اس وقت اپنا قصور معاف کرانے آئے ہیں رات وہ نشے میں تھے، جگنو نے مسز ٹنڈن کی طرف دیکھ کر کہا'' اور آپ بھی تو کچھ کم نشہ میں نہ تھیں۔

خورشید نے سمجھ کر کہا ''میں نے آج تک کبھی نہیں پی مجھ پر جھوٹا الزام مت لگاؤ جگنو نے لاٹھی ماری شراب بھی بڑے نشے کی چیز ہے کوئی وہ اسی کا نشہ ہوگا''

''ان صاحب کو کیوں پردہ میں ڈھانک دیا یہ بھی تو ان کی صورت دیکھتیں''

مس خورشید نے شرارت کی ''صورت تو ان کی لاکھوں میں ایک ہے''

مسز ٹنڈن نے صاف کہا ''نہیں ان کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں آشرم کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔''

مس خورشید نے ضد کی ''معاملے کو صاف کر لینے کے لیے ان کا آپ لوگوں کے سامنے آنا ضروری ہے یک طرفہ آپ فیصلہ کیوں کرتی ہیں۔''

مسز ٹنڈن نے ٹالنے کے لیے کہا ''یہاں کوئی مقدمہ تھوڑا ہی پیش ہے''

مس خورشید ''واہ میری عزت پر بٹہ لگایا جارہا ہے اور آپ کہتی ہیں کوئی مقدمہ نہیں ہے مسٹر کنگ آئیں گے اور آپ کو ان کا بیان سننا ہوگا''

سوائے مسز ٹنڈن کے سب ہی عورتیں کنگ کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں کسی نے اختلاف نہ کیا۔

خورشید نے دروازہ پر آکر آوازہ دے کر کہا۔۔۔۔۔۔۔۔''تم ذرا یہاں چلے آؤ''

پٹ کھلا اور مس لیلا وتی ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے مسکراتی ہوئی نکل آئیں۔۔۔۔۔۔آشرم میں سناٹا چھا گیا عورتیں حیران ہوکر دیوی لیلا وتی کو دیکھنے لگیں۔

جگنو نے آنکھیں چمکا کر کہا ''انہیں کہاں چھپا دیا آپ نے؟''

خورشید: ''وہ چھومنتر سے اڑ گئے جا کر گاڑی دیکھو''

جگنو لپک کر گاڑی کے پاس گئی اور خوب دیکھ بھال کر منہ لٹکائے ہوئے لوٹی

مس خورشید نے پوچھا ''کیا ہوا ملا کوئی''

جگنو: ''میں یہ تریا چرتر کیا جانوں؟ لیلاوتی کو غور سے دیکھ کر، مردوں کو ساڑھی پہنا کر آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو یہی تو ہیں وہ رات والے صاحب''

خورشید: ''خوب پہچانتی ہو؟''

جگنو: ''ہاں ہاں کیا اندھی ہوں''

مسز ٹنڈن۔۔۔۔۔۔۔۔''کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ جگنو یہ تو ڈاکٹر لیلاوتی ہیں۔''

جگنو (انگلی چمکا کر) ''ارے جاؤ لیلاوتی، ساڑی پہن کر عورت بنتے لاج بھی نہیں آتی تم رات کو ان کے گھر تھے''

لیلاوتی نے مذاق کے لہجہ میں کہا ''میں کب انکار کر رہی ہوں، رات کو ولیم کنگ بھی بن جاتی ہوں اس میں بات ہی کیا ہے''

مستورات کو سچائی کی روشنی دکھائی دی چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے کوئی تالیاں بجاتی تھی، کوئی ڈاکٹر لیلاوتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی کوئی مس خورشید کی پیٹھ پر تھپکیاں دیتی تھیں۔ کئی منٹ تک ہو حق مچا رہا تھا۔ جگنو کا منہ اس روشنی میں ذرا سا نکل آیا زبان بند ہو گئی ایسا چرکا اس نے کبھی نہ کھایا تھا اتنی ذلیل کبھی نہیں ہوئی تھی۔

مسز مہرا نے ڈانٹ بتائی ''اب بولو دائی! لگی منہ پر سیاہی کہ نہیں؟''

مسز بانگڑا: ''اسی طرح یہ سب کو بدنام کرتی ہے''

لیلاوتی: ''آپ لوگ تو جو یہ کہتی ہیں اس پر یقین کر لیتی ہیں''

مس خورشید نے کہا: ''ذرا اس سے پوچھو میرے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی''

مسز ٹنڈن نے پکارا ''جگنو کہاں ہو'' تلاش ہونے لگی جگنو غائب

اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ آشرم کی تاریخ میں یہ معاملہ آج بھی مایۂ تفریح بنا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخری حیلہ

پہلی بار: ''چندن'' فروری 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: مارچ 1934ء (آخری تحفہ)

اگر چہ میرا حافظہ بہت قوی نہیں تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہو گئیں وہ ساری تاریخیں جنہیں راتوں کو جاگ کر، جبر ڈال کر یاد کیا تھا۔ مگر شادی کی تاریخ اس ہموار میدان میں ایک ستون کی طرح اٹل ہے۔ نہ بھولتا ہوں، نہ بھول سکتا ہوں، اس سے قبل و مابعد کے سارے واقعات دل سے محو ہو گئے ان کا نشان تک باقی نہیں وہ ساری کثرت ایک وحدت میں مضمر ہو گئی۔ اور وہ میری شادی کی تاریخ ہے چاہتا ہوں اسے بھول جاؤں مگر جس تاریخ کو روزانہ یاد کیا جاتا ہو، وہ کیسے بھول جائے؟ اور یاد کیوں کرتا ہوں؟ یہ اس مبتلائے غم سے پوچھے، جسے نام خدا کے سوا زندگی سے نجات کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا ہو۔

لیکن کیا میں تاہل سے اس لیے بھاگتا ہوں کہ میں زاہد خشک ہوں اور صنف لطیف کی دل ربائیوں سے بے اثر؟ کیا میں نہیں چاہتا کہ جب میں سیر کرنے نکلوں تو اہلیہ بھی جلوہ افروز ہوں تکلفات کی دکانوں پر ان کے ساتھ جا کر تھوڑی دیر کے لیے معشوقانہ التجا کا لطف اٹھاؤں۔ میں اس شان و مسرت اور غرور کا اندازہ کر سکتا ہوں جو میرے دوسرے بھائیوں کی طرح میرے دل میں بھی تموج پذیر ہو گا۔ لیکن میری تقدیر میں وہ خوشیاں اور رنگ رلیاں نہیں۔ کیوں کہ تصویر کا دوسرا

رخ بھی تو دیکھتا ہوں۔ ایک رخ جتنا ہی دلفریب اور خوشنما ہے، دوسرا اتنا ہی دل شکن اور ہیبت ناک شام ہوئی اور آپ آتے کی پوٹلی بغل میں دبائے گلیوں میں یوں قدم بڑھاتے ہوئے نکل جاتے ہیں، گویا چوری کی ہے صبح ہوئی اور بچوں کو گود میں لیے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی دکان میں ٹوٹی کرسی پر رونق افروز ہیں کسی خوانچے والے کی صدائے خوش آئند سن کر بچے نے نالہ فلک رسا بلند کیا اور آپ کی روح قبض ہوئی۔ ایسے باپوں کو بھی دیکھا ہے، جو دفتر سے لوٹتے ہوئے پیسے دو پیسے کی مونگ پھلی یا ریوڑیاں لے کر بہ سرعت تمام منہ میں رکھتے چلے جاتے ہیں، کہ گھر پہنچتے پہنچتے بچوں کی یورش سے قبل وہ ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کتنا مایوس کن ہوتا ہے وہ نظارہ، جب دیکھتا ہوں کہ میلے میں بچہ کسی کھلونے کی دکان کے سامنے مچل رہا ہے اور قبلہ گاہی صاحب واعظانہ سرگرمی سے کھلونوں کی بے حقیقی کا راگ الاپ رہے ہیں۔

تصور کا پہلا رخ تو میرے لیے ایک شیریں خواب ہے دوسرا رخ روح فرسا حقیقت اس حقیقت کے سامنے میرا سارا ذوق تاہل فنا ہو جاتا ہے۔ میری ساری قوت ایجاد، میری ساری فکر رسا اسی تاہل کے پھندوں سے بچنے میں صرف ہوتی ہے دانہ تہ دام ہے یہ جانتا ہوں، مگر گراں، کتنا مہلک دام خوش رنگ ہے۔ بالکل سنہرے تاروں کا بنا ہوا اس میں طائروں کو تڑپتے اور پھڑ پھڑاتے دیکھتا ہوں

لیکن ادھر کچھ دنوں سے اہلیہ نے پیہم تقاضے کرنے شروع کیے کہ مجھے بلا لو پہلے چھٹیوں میں جاتا تھا، تو میرا محض ''کہاں چلو گی'' کہہ دینا اس کے اطمینان قلب کے لیے کافی ہوتا تھا پھر میں نے ''فضول ہے'' کہہ کر اسے تسکین دینا

شروع کی اس کے بعد خانہ داریوں کی پریشانیوں سے تخویف کی مگر اب کچھ دنوں سے اس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے اب میں نے چھٹیوں میں بھی اس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کر دیا ہے کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو اور انواع واقسام کے حیلوں سے اسے ڈراتا رہتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات سے متعلق تھا۔ بے انتہا تکلیف وہ کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے، کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دوا دوش، وہی ہنگامہ آرائی، اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو جائے خفیہ پولیس کی ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہتے ہیں وہ جا رہا ہے اخبار والا۔ دنیا میں جتنی آفات ارضی وسماوی، نسلی و مذہبی، ملکی وقومی ہیں ان کا ذمہ دار میں ہوں گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں گھڑنے کا کارخانہ ہے سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گزر جاتا ہے۔ کانسٹیبلوں کو دیکھا اور روح فنا ہوئی کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں میری تو یہ حالت اور حکام ہیں کہ میری صورت سے ہراساں ایک دن شامت اعمال سے کسی انگریز کے بنگلے کی طرف جا نکلا صاحب نے پوچھا کیا کام کرتا ہے میں نے ایک شان کے ساتھ کہا اخبار کا ایڈیٹر ہوں صاحب فوراً اندر گھس گئے اور دروازہ بند کر لیا پھر میں نے میم صاحبہ اور باوا لوگوں کو کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا۔ گویا کوئی خطرناک جانور ہیں ایک بار ریل گاڑی میں سفر کا اتفاق ہوا۔ ساتھ اور بھی کئی دوست تھے اس لیے اپنے پیشے کا وقار قائم رکھنے کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا

پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا تو ایک صاحب نے میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پیشہ دیکھتے ہی فوراً اپنا صندوق کھولا اور ریوالور نکال کر میرے روبرو اس میں گولیاں بھریں، تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں۔

میں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا کیوں کہ میں جنس لطیف سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شان مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ اہلیہ اس خط کے بعد پھر یہاں آنے کے لیے اصرار نہ کریں گی مگر یہ خیال غلط نکلا اور ان کے تقاضے بدستور قائم رہے۔

تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے ہر ایک کھانے پینے کی چیز میں سمیت کا اندیشہ، دودھ میں سمیت، گھی پھلوں میں سمیت، سبزی میں سمیت، ہوا میں سمیت، پانی میں سمیت، یہاں انسان کی زندگی نقش بر آب ہے جسے آج دیکھو وہ کل غائب اچھے خاصے بیٹھے ہیں دل کی حرکت بند، گھر سے سیر کرنے نکلے، موٹر سے ٹکرا کر راہی عدم اگر کوئی شام کو زندہ سلامت گھر آ جائے تو اسے خوش نصیب سمجھو۔ مچھر کی آواز کان میں آئی اور دل بیٹھا مکھی نظر آئی تو ہاتھ پاؤں پھولے چوہا بل سے نکلا اور جان نکل گئی جدھر دیکھئے ملک الموت اگر موٹر اور ٹرام سے بچ کر آ گئے تو مچھر اور مکھی کے شکار ہوں کہاں بچ کر جاؤ گے بس سمجھ لو موت ہر دم سر پر کھیلتی رہتی ہے ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے گزرتی ہے دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں ننھی سی جان کو کن کن دشمنوں سے بچاؤں سانس بھی مشکل سے لیتا ہوں کہ کہیں کوئی تپ کا کیڑا پھیپھڑے میں نہ داخل ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔

بیوی کو پھر یقین نہ آیا، دوسرے خط میں وہی اصرار موجود تھا لکھا تھا ’’تمہارے خط نے ایک اور فکر پیدا کر دی اب ہر روز خط لکھا کرنا، ورنہ میں ایک نہ سنوں گی اور سیدھی چلی آؤں گی‘‘ میں نے دل میں کہا چلو سستے چھوٹے، مگر یہ فکر لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب انہیں شہر آنے کی سنک سوار ہو جائے۔ اس لیے میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا یہاں دوستوں کے مارے جان عذاب میں رہتی ہے احباب آکر بیٹھ جاتے ہیں، تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے گویا اپنا گھر بیچ کر آئے ہیں اگر گھر سے ٹل جاؤ تو آکر بے محابا کمرہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور نوکر سے سگریٹ، ناشتہ ادھار منگوا کر کھاتے ہیں، دینا مجھے پڑتا ہے بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے روزانہ ان کی خاطر ومدارات کرو شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ، رات کو ایک دو بجے تک تاش یا شطرنج کھیلو اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اکثر تو بیمار ہو کر آتے ہیں بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ، تیمارداری کرو، رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ اکثر آکر دیکھتا ہوں تو خدمت گار غائب ہے گھنٹوں اس کی تلاش میں گھومتا ہوں تب پتہ چلتا ہے کہ ایک دوست نے اسے ذرا ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔ میری گھڑی مہینوں سے میری کلائی پر نہیں آتی دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہی ہے۔ اچکن ہے تو وہ ایک صاحب کے پاس کوٹ دوسرے صاحب لے گئے جوتے ایک اور بابو لے اڑے میں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا پہن کر دفتر جاتا ہوں احباب تاڑتے رہتے ہیں کہ کون سی نئی چیز لایا کوئی چیز لاتا ہوں تو وہ صندوق میں بند پڑی رہتی ہے استعمال کروں تو کسی نہ کسی صاحب کی فرمائش ہو پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی

ہے تو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں کہ کہیں کوئی صاحب اس لیے میرے منتظر نہ بیٹھے ہوں کہ آج ضرورت ہے کچھ روپے دے دو معلوم نہیں ان کی ضرورتیں پہلی تاریخ کو منتظر کیوں رہتی ہیں ایک دن تنخواہ لے کر بارہ بجے رات کو گھر لوٹا، مگر دیکھا اس وقت بھی دو اصحاب رونق افروز تھے تقدیر ٹھونک لی کتنے ہی بہانے کروں ان کے سامنے ایک بھی پیش نہیں جاتی میں کہتا ہوں گھر سے خط آیا ہے، والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں وہ جواب دیتے ہیں اجی بوڑھے اتنی جلد نہیں مرتے مرنا ہی ہوتا، تو اتنے زندہ کیوں رہتیں؟ دیکھ لینا دو چار روز میں اچھی ہو جائیں گی کہتا ہوں، ارے یار گھر سے بہت ضروری خط آیا ہے، مال گزاری کا سخت تقاضا ہو رہا ہے جواب ملتا ہے آج کل تو لگان بند ہو رہی ہے اور تمہیں بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اگر کسی تقریب کا حیلہ کرتا ہوں تو فرماتے ہیں تم بھی کیا عجیب الخلقت انسان ہوان بے ہودہ مراسم کی پابندی کرنا تمہاری شان کے خلاف ہے اگر تم ان مراسم کی بیخ کنی نہ کرو گے، تو وہ لوگ کیا آسمان سے آئیں گے؟ خاموش ہو جاتا ہوں کہ یہ کسی طرح گلا نہ چھوڑیں گے پھر کیوں مفت میں سر پچی کروں؟

مجھے یقین تھا کہ اس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام لے گی، مگر اب کی پھر وہ خیال غلط نکلا جواب میں وہی تقاضا تھا خیریت اتنی ہوئی کہ انہوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کی۔

تب میں نے سوچا، یہاں کے مکان ہیں، کہ خدا کی پناہ نہ ہوا، نہ روشنی، نہ وسعت، اعراض ثلاثہ کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ غضب کا تعفن، کہ دماغ پھٹا جاتا ہے کتنوں کو تو اسی تعفن کے باعث مالیخولیا، اختلاج قلب، ضیق النفس یا ٹائیفائیڈ ہو

جاتا ہے۔ بارش ہوئی اور مکان ٹپکنا شروع ہوا۔ پانی آدھ گھنٹہ برسے، مکان رات بھر برستا رہتا ہے رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے۔ صبح کو اٹھو تو کوئی یہاں ملبہ میں مدفون ہے، کوئی وہاں رات کو وحشت ہوتی ہے ایسے بہت کم مکان ہوں گے جن میں پلید ارواح کا گزر نہ ہو ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں لوگ رات کو رو پڑتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں، کتنے ہی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج گھر میں آئے، کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہوگئی کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا جا رہا ہے، کوئی آ رہا ہے، بس جدھر دیکھئے ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں اگر کوئی رات خیریت سے گزر ہو جائے، تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے پھٹے یا جوتے یا دست پناہ، یا چہل قدمی کی چھڑی لیے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی چور اتنے شاطر ہیں اگر کوئی رات خیریت سے گزر ہو جائے، تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے پھٹے یا جوتے یا دست پناہ، یا چہل قدمی کی چھڑی لیے کھڑے رہتے ہیں پھر بھی چور اتنے شاطر ہیں، کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے بے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے تو میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا تو وہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا اور بولے ''میں تجھے چکمہ دینا چاہتا تھا'' میں نے دل میں سمجھ لیا کہ اگر نکل جائے تو برتن آپ کے رتھے جاگ آ گئی تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے

تھے؟ یہ معمہ ہے غالباً رات کو تاش کھیل کر چلے، تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھری میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامت اعمال کمرہ میں قلم دوات نہ تھی اوپر کے کمرے سے لانے گیا لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ حضرت غائب ہیں اور ان کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر میری بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہوا ہے، کہ میرا کوئی حیلہ اسے خائف نہیں کرتا اس خط کے جواب میں اس نے لکھا کہ "تم مجھ سے یہ بہانے کرتے ہو اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اٹھاتے ہو میں ہرگز نہ مانوں گی، آ کر مجھے لے جاؤ۔"

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا ابھی بستر سے اٹھنے کی نوبت نہ آئی کہ کانوں میں عجیب وغریب صدائیں آنے لگیں شاید بابل کے مینار کی تعمیر کے وقت بھی ایسی ہی گوناگوں مہمل صدائیں آتی ہوں گی یہ خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب نغمہ و چنگ کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج میں چار پانچ سال اس ہنر کو حاصل کرتے۔ مگر ان اوندھی عقل والوں کو یہ کیا سوجھتی ہے اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جائیں میں بھی تو اکثر راتوں کو چونک پڑتا ہوں ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا۔ گیارہ بجے تھے کوئی خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی خوانچے والے کی صدائے مہیب کانوں میں

آئی تو چیخ مار کر چلا اٹھیں اور پھر بے ہوش ہو گئیں مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی اب رات کو کانوں میں روئی ڈال کر سوتی ہیں ہر چند کہا گیا کہ خوانچے والے کی صدا تھی، پر انہیں یقین نہیں آتا اور ایسے سانحے آئے دن ہوتے رہتے ہیں کئی اصحاب اپنی بیویوں کو لائے مگر بے چاریاں دوسرے ہی دن ان صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی میرا حیلہ ہی سمجھا "تم سمجھتے ہو کہ میں خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی یہاں گیدڑوں کا ہوا ہوا اور الوؤں کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں، خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرائیے۔"

آخر میں نے اب کی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی جو اس خوف کا یک لخت خاتمہ کر دے اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر کے لیے نفرت ہو جائے کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا اگرچہ اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا مگر رسوائی ہو جانے کا کچھ علم نہیں وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے۔

میں نے لکھا کہ یہ شریف زادیوں کے رہنے کی جگہ نہیں یہاں کی مہریاں اتنی بد زبان ہیں کہ باتوں کا جواب گالیاں سے دیتی ہیں اور ان کی وضع قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیوں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی سامنے سے نکل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے خوشبو کی لپٹ نکل گئی کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے گی۔ اسے تو اور بھی سینکڑوں فکروں ہیں۔ انہیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں روز نئی سج

دھج بنت نئی ادا اور شوخ تو اس غضب کی ہیں کہ خواہ مخواہ گھر میں گھس پڑتی ہیں کہیں کسی دوست کے گھر سے کوئی چیز لے کر کبھی کسی دوسرے بہانے سے، کوئی کتنا ہی چاہے کہ ان سے آنکھیں چار نہ ہوں، مگر غیر ممکن، جدھر دیکھو، ان کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ اجی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے گھروں میں آ جاتی ہیں، اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔

معلوم نہیں اس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی، کہ تیسرے ہی دن اہلیہ محترمہ ایک بوڑھے کہار کے ساتھ میرا پتہ پوچھتی ہوئی اپنے تینوں بچوں کو لیے ایک بلائے بے درماں کی طرح وارد ہو گئیں۔

میں نے بدحواس ہو کر پوچھا۔۔۔۔۔۔۔ ''کیوں خیریت تو ہے؟''

اہلیہ نے چادر اتارتے ہوئے کہا'' گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے یہاں کسی نے قدم رکھا تو ناک ہی کاٹ لوں گی ہاں جو تمہاری شہ نہ ہو۔''

اچھا، تو اب عقدہ کھلا میں نے سر پیٹ لیا، کیا جانتا تھا کہ اپنا طمانچہ اپنے ہی منہ پر، پڑے گا۔

☆☆☆☆☆

ڈیمانسٹریشن

پہلی بار: ہندی میں ماہنامہ ''پریما'' اپریل 1931ء میں شائع ہوا

اردو میں ماہنامہ ''ہمایوں'' جنوری 1930ء میں

کتابی صورت میں: 1934ء (آخری تحفہ)

تمہید

مہاشے گورو پرشاد سنگھ نہایت رنگین مزاج شخص ہیں گانے بجانے کے رسیا ہیں سیر و سیاحت سے دلچسپی ہے۔ کھانے کھلانے میں نہایت سیر چشم ہیں یوں تو کسی کے محتاج نہیں شریف آدمیوں کی طرح رہتے ہیں، اور ہیں بھی بھلے آدمی، لیکن کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ گڑ ہو کر بھی ان میں لیس نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں، جس میں جھٹ پٹ قارون کا خزانہ مل جائے اور وہ ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو جائیں۔ بینک سے ششماہی سود چلا آئے کھائیں اور مزے سے پڑے رہیں۔ ایک دن بات بات میں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ کوئی ناٹک کمپنی کھولو بات معقول تھی سمجھ میں آ گئی دوستوں کو لکھا میں بہت جلد ایک ڈرامیٹک کمپنی کھولنے جا رہا ہوں آپ لوگ ڈرامے کو لکھنا شروع کیجئے کمپنی کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے کئی مہینے خوب گرم بازاری رہی کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں نے حصے خریدنے کے وعدے کیے لیکن نہ حصے بکے، نہ کمپنی کھڑی ہوئی، ہاں اسی دھن میں گورو پرشاد نے ایک ناٹک ضرور تصنیف کر ڈالا اور یہ فکر ہوئی کہ اسے کمپنی کو دیا

جائے لیکن یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں، پھر جس کمپنی میں کسی غیر شخص کا داخلہ ہو وہ تو اس تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالے گا اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دے گا بالآخر یہ ترکیب سوچی گئی کہ احباب کمپنی کے مالکوں پر کچھ ایسا رعب غالب کریں، کہ کمپنی کے ڈراماٹسٹ کی دال ہی نہ گل سکے چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اس میں تمام پروگرام پر تبادلہ خیالات ہوا اور دوسرے دن گورو پرشاد جی مع اپنے رفقا کے ناٹک دکھانے چلے ٹانگے آ گئے ہارمونیم، طبلہ وغیرہ سب ان پر لاد دیے گئے، کیونکہ ناٹک کے ڈیمانسٹریشن Demonstration کا فیصلہ ہوا تھا۔

یکا یک ونود بہاری نے کہا ''یار تانگے پر جانے میں کچھ بے رعبی سی ہوگی۔ مالک خیال کرے گا یہ مہاشے تو یوں ہی ہیں اس وقت دس پانچ روپے کا منہ نہ دیکھنا چاہیے میں تو مغربی اشتہار بازی کا قائل ہوں، کہ روپے میں پندرہ آنے اسی میں لگا کر صرف ایک آنہ میں تجارت کرتے ہیں کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہئیں''

رسک لال نے کہا ''لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہوگی جو آپ چہاتے ہیں کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہئیں ماریسن ہوں یا نئے فیشن کی آسٹن''

بات سچی تھی، بھیس سے بھیک ملتی ہے قیاس آرائیاں ہونے لگیں کسی رئیس سے درخواست کرنی چاہیے اجی وہ مہا کھوسٹ ہے صبح صبح اس کا نام لے لو تو دن بھر پانی نہ ملے۔ اچھا سیٹھ جی کے پاس چلیں تو کیسے؟ منہ دھو رکھیے۔ اس کی موٹریں

افسروں کے لیے ریزرو ہیں اپنے لڑکے تک کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا آپ کو دے دیتا ہے تو چلو کپور صاحب کے پاس چلیں ابھی انہوں نے نئی موٹر لی ہے اجی اس کا نام مت لو کوئی نہ کوئی بہانہ کرے گا ڈرائیور نہیں ہے زیر مرمت ہے'' اس قسم کی باتیں بناتے کیا اسے دیر لگتی ہے؟''

گورو پرشاد نے مایوس ہو کر کہا''تم لوگوں نے خواہ مخواہ بکھیڑا کر دیا تانگوں پر چلنے سے کیا حرج تھا؟''

ونود بہاری نے کہا'' آپ تو گھاس کھا گئے ہیں ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے اور معاملہ کرنا دوسری بات میری بات سنیے فی صفحہ ایک روپیہ سنا دے گا، اپنا سا منہ لے کر رہ جایئے گا۔''

امرناتھ نے کہا''میں سمجھتا ہوں، موٹر کے لیے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بے کار ہے تعریف تو جب ہے کہ پیدل چلیں اور وہاں ایسا رنگ جمائیں کہ موٹر سے زیادہ شان رہ جائے۔''

ونود بہاری اچھل پڑے سب لوگ پیدل چلے وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہوں کس طرح تعریفوں کے پل باندھے جائیں کس طرح ڈراماٹسٹ صاحب کو خوش کیا جائے تمام راستہ اسی پر گفتگو اور بحث کا بازار گرم رہا۔

آخر یہ لوگ کمپنی کے کیمپ میں پہنچے تقریباً دو بجے کا وقت تھا پروپرائٹر صاحب مع اپنے ایکٹر اور ڈراماٹسٹ کے پہلے ہی انتظار میں تھے پان الائچی، سگریٹ وغیرہ پہلے ہی منگوا لیے گئے تھے۔

اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا''معاف فرمایئے گا، ہم لوگوں کو

یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوگئی ،موٹر سے نہیں بلکہ پا پیادہ آئے ہیں ۔سب لوگوں کی یہی صلاح ہوئی کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتے ہوئے چلیں گورو پرشاد جی تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں اگر ان کا بس چلتا ہوتو آج چمٹا لیے ہوئے ،یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوئے یا کسی پہاڑ کی کھوہ ،یا کسی گاؤں میں برگد کے سایہ میں بیٹھے خوش نوا پرندوں کے وجد انگیز نغموں سے محظوظ ہوتے ۔‘‘

ونود نے کہا’’ اور آپ بھی تو سیدھے راستے سے نہیں نہ معلوم کہ کہاں کہاں کا چکر کاٹتے ،خاک چھانتے یہاں تک پہنچے ہیں ۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پاؤں میں سنیچر ہے‘‘

امر نے کچھ اور ہی رنگ جمایا’’ پورے ست جگی آدمی ہیں نوکر چاکر تو موٹروں پر سیر کرتے ہیں اور آپ گلی گلی مارے پھرتے ہیں جب اور رئیس خواب راحت کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں تو آپ ندی کے کنارے افق کی جلوہ نمائیوں میں محو رہتے ہیں ۔‘‘

مست رام نے فرمایا’’ شاعر ہونے کے معنی دین دنیا سے بے گانہ ہو جانا ہے گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اس میں نہ معلوم گھنٹوں کیا دیکھا کرتے ہیں قدرت کے مشاہدے نے ہی یورپ کے بڑے بڑے شعرا کو آسمان پر پہنچا دیا ہے کاش ،یہ یورپ میں ہوتے تو ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتا ایک دن ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ بھی رونے لگے ہر چند پوچھتا ہوں بھئی کیوں روتے ہو،مگر جواب نہیں دیتے ،بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں منہ سے آواز نہیں نکلتی بڑی مشکل سے آواز نکلی ۔‘‘

ونود ''جناب شاعر کا دل نازک اور لطیف جذبات کا سرچشمہ ہے نغمہ لطیف کی کان ہے وسعت کا آئینہ ہے''

''واہ واہ! آپ نے کیا بات کہی وسعت کا آئینہ واہ! شاعر کی صحبت میں رہ کر آپ پر بھی شاعری کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔''

گورو پرشاد نے عاجزانہ انداز سے کہا ''میں شاعر نہیں اور نہ مجھے شاعری کا دعویٰ ہے آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں شاعر قدرت کی وہ عجیب و غریب تخلیق ہے، جو عناصر خمسہ کی جگہ نوروں سے ترکیب پاتی ہے۔''

مست رام ''آپ کی یہی ایک بات ایسی ہے جس پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں رسک لال جی شاعر کی عظمت ذہن نشین ہوئی یا نہیں یاد کر لیجئے''

رسک لال ''کہاں تک یاد کروں؟ یہ تو تشبیہات اور استعارات میں گفتگو کرتے ہیں اور انکسار کا یہ حال ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں قابلیت و ذہانت کی یہی علامت ہے، جس نے اپنے آپ کو سمجھا، بس وہ رہ گیا (کمپنی کے مالک سے) آپ تو سب کچھ خود ہی سن لیں گے اس ڈرامہ میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے شاعروں میں جو عام طور پر خود نمائی ہوتی ہے، اس کی آپ میں کہیں بو بھی نہیں اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہزار بڑے بڑے پوتھوں کا مطالعہ کیا ہو گا۔ واجد علی شاہ کو خود غرض وقائع نگاروں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ آپ سے پوشیدہ نہیں اس طومار میں سے حقیقت کا انتخاب کرنا انہی کا کام ہے۔''

ونود ''اسی لیے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے اور وہاں متواتر چھ ماہ تک مٹیا برج

کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کا قلمی نسخہ تلاش کیا اس ڈراما کی تکمیل کے لیے اس کتاب کی بڑی ضرورت تھی اس میں انہوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرنے پر چھ مہینے میں جا کر کتاب ملی۔"

امرناتھ "کتاب نہیں جواہرات کی کان ہے"

مست رام "اس وقت تو اس کی حالت کوئلے کی سی تھی گورو پرشاد جی نے اس پر مہر لگا کر اشرفی بنا دیا ڈراما ایسا ہونا چاہیے۔ کہ جو سنے دل ہاتھوں سے تھام لے ایک ایک نکتہ دل میں تیرو نشتر کی طرح اتر جائے۔"

امرناتھ "لٹریچر کے تمام ناٹکوں کو آپ نے چاٹ ڈالا، اور فن ڈراما پر سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔"

ونود "جب ہی تو چیز بھی لاثانی ہوئی ہے"

امرناتھ "لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا پیروں پڑا کہ، یہ ناٹک مجھے دے دیجیے لیکن آپ نے نہ دیا جب ایکٹر ہی اچھے نہیں تو ان سے اپنا ڈرامہ کھلوانا اس کی مٹی خراب کرنا تھا۔ اس کمپنی کے ایکٹر ماشاءاللہ اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کے ڈراما نویس کی سارے زمانہ میں دھوم ہے آپ لوگوں میں پڑ کر یہ ڈراما دھوم مچا دے گا۔"

ونود "ایک تو مصنف صاحب بذات خود شیطان سے مشہور ہیں اس پر ایکٹروں کا اسلوب بیان، ساز و سامان، یہ تمام باتیں مل کر قیامت برپا کر دیں گی"

مست رام "روز ہی تو کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے، مگر بابو صاحب

جب کسی سے سیدھے منہ سے بات ہی نہیں کرتے"

ونود "بس ایک یہ کمپنی ہے، جس کے تماشا کے لیے دل بے قرار رہتا ہے نہیں تو جتنے اور ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، دو کوڑی کے ہوتے ہیں میں نے تماشا دیکھنا ہی چھوڑ دیا"

گورو پرشاد "ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں خون جگر پینا پڑتا ہے میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لیے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے یوں قلم گھسانا دوسری بات ہے بڑے بڑے زبردست مبصروں کا یہی فیصلہ ہے کہ ڈرامہ زندگی میں صرف ایک ہی لکھا جا سکتا ہے روس، فرانس، جرمنی، تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے، مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے کسی میں جذبات ہیں تو زبان نہیں، زبان ہے تو جذبات نہیں مذاق ہے تو گانا نہیں، گانا ہے تو مذاق نہیں جب تک جذبات، زبان، مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پر موجود نہ ہوں اسے ڈراما کہنا ہی غلطی ہے میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شد بد کر لیتا ہوں میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا لیکن اگر پرماتما نے چاہا تو اس ڈرامے میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملیں گے۔"

ونود "جب آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے تو نقائص رہ کیسے سکتے ہیں"

رسک لال "دس سال تک آپ نے صرف نغمہ کی ہی مشق کی ہے ہزاروں روپے استادوں کی نذ ر کر دیے اگر اتنے پر بھی نقص رہ جائے تو بد قسمتی!"

ریہرسل

ریہرسل شروع ہوئی اور واہ وا، اور ہائے ہائے کا تار بندھا۔ کورس سنتے ہی ایکٹر، پروا پرٹٹر اور ناٹک نویس جیسے کسی خواب گراں سے بیدار ہو اٹھے تمہید نے انہیں زیادہ متاثر نہیں کیا لیکن اصلی چیز سامنے آتے ہی آنکھیں کھلیں، سماں بندھ گیا۔ پہلا سین آیا آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر کھنچ گئی درباریوں کی حاضر جوابی اور لطیفے واہ وا کیا کہنا، کیا طرز ادا تھی اور کیا شوکت الفاظ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام رس ایک ہی جگہ پر مجتمع ہو کر اپنی کیفیت دکھا رہے ہیں۔

تیسرا نظارہ مذاقیہ، ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں چوتھا سین نہایت سنجیدہ اور تڑپا دینے والا تھا۔ مذاق کے بعد افسردگی، آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ ونود آنکھوں پر ہاتھ رکھے، سر جھکائے رو رہے تھے مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں کھینچ رہے تھے اور رامناتھ پیہم سسکیاں بھر رہے تھے اسی طرح سین پر سین اور باب پر باب ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب ریہرسل ختم ہوا تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔

سیٹھ جی اب تک سونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ ڈرامہ ختم ہو گیا، لیکن ان کی زبان پر ان کی مبارک رائے کے عکس کا شائبہ تک نہ تھا جڑ بھرت کی طرح بیٹھے تھے نہ مسکراہٹ تھی، نہ داد، نہ اشک، نہ کچھ۔

آخر ونود بہاری نے معاملے کی بات پوچھی کہ اس ڈرامے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

سیٹھ جی نے اسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا ''اس کے متعلق کل عرض کروں گا کل یہیں کھانا بھی کھایئے گا آپ لوگوں کے لائق کھانا تو کیا ہو سکے گا

اسے صرف بدر کا ساگ سمجھ کر قبول فرمائیے گا''

جیسے ہی پانچوں باہر نکلے مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھل جاتی تھیں ونود نے کہا ''پانچ ہزار کی تھیلی ہے، ناک ناک بد سکتا ہوں''

امرناتھ ''پانچ ہزار ہے کہ دس، یہ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن رنگ خوب جما''

رسک لال ''میرا اندازہ تو چار ہزار تک ہے''

مست رام ''میرا تو یقین یہ ہے کہ دس ہزار سے کم کے گاہی نہیں میں تو سیٹھ کے چہرے کی طرف یکسوئی سے دیکھ رہا تھا آج ہی کہہ دیتا لیکن مست خوب ہو رہا تھا''

گورو پرشاد ''میں نے پوچھا بھی تو جی تو ڑ کر''

ونود ''ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے گلے میں سرسوتی بیٹھ گئی ہو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔''

رسک لال ''مجھے اس کی خاموشی سے ذرا اشتباہ ہوتا ہے''

امر ''ڈراماٹسٹ بھی خوب خوش ہو رہا تھا دس بارہ ہزار کا وارا نیارا ہے بھئی آج اسی خوشی میں دعوت ہونی چاہیے''

گورو پرشاد ''ارے تو کچھ بتا بھی تو جائے''

مست ''جی نہیں بتب تو جلسہ ہو گا آج دعوت ہو گی''

ونود ''ہو تم خوش قسمت''

رسک لال ''میری رائے میں تو اس ڈراماٹسٹ کو گانٹھ لیا جائے اس کی خاموشی مجھے خوف زدہ کر رہی ہے''

مست ''آپ کو تو خفقان ہو گیا ہے وہ ناک رگڑ کر رہ جائے تب بھی یہ سودا ہو

کرہی رہے گا سیٹھ جی اب بچ کر نہیں نکل سکتے''

ونود ''ہم لوگوں کی تمہید بھی ذمہ دار تھی''

امر ''اسی نے یہ رنگ جما دیا اب کوئی چھوٹی رقم کہنے کا اسے حوصلہ ہی نہ ہوگا''

تماشا

رات کو گورو پرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت ہوئی دوسرے دن چھ بجے پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس پہنچے شام کا وقت ہوا خوری کا تھا آج موٹر پر نہ آنے کے لیے بنا بنایا بہانہ تھا۔ سیٹھ جی آج بے حد خوش نظر آرہے تھے کل کی وہ محترمی صورت غائب ہوگئی تھی بات بات پر چہکتے تھے، ہنستے تھے، فقرے کستے تھے، جیسے لکھنو کا کوئی رئیس ہو دعوت کا سامان تیار تھا میز پر کھانا چنا جانے لگا، انگور، سنگترے، کیلے، خشک میوے، مختلف قسم کی مٹھائیاں، کئی طرح کے مربے، شراب وغیرہ سجائے گئے اور یاروں نے خوب مزے سے دعوت کھائی سیٹھ جی مہمان نوازی کے پتلے بنے ہوئے ہر ایک مہمان کے پاس آ آ کر پوچھتے ''کچھ اور منگواؤں؟ کچھ تو اور لیجئے آپ لوگوں کے لائق کھانا یہاں کہاں بن سکتا ہے؟''

کھانے کے بعد لوگ بیٹھے تو معاملہ کی بات چیت ہونے لگی گورو پرشاد کا دل امید وبیم سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

سیٹھ جی ''حضور نے نہایت پایہ کا ڈرامہ لکھا ہے، کیا بات ہے؟''

ڈراماٹسٹ ''یہاں کی پبلک اچھے ڈرامے کی قدر نہیں کرتی ورنہ ڈرامہ لاجواب ہوتا''

سیٹھ جی ’’پبلک قدر نہیں کرتی نہ کرے ہمیں اس کی بالکل پروانہیں، رتی بھر پروانہیں میں تو اس کی تیاری میں صرف پچاس ہزار بابو صاحب کی خاطر جمع کر دوں گا آپ نے جب اتنی محنت سے ایک چیز لکھی ہے تو میں اس کی اشاعت میں بھی اسی حوصلے سے کروں گا ہمارے لیے یہ کیا کم خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے معزز اصحاب اس میدان میں اتر آئے یہ تماشا حضور کو زندہ جاوید بنا دے گا۔‘‘

ڈراماٹسٹ ’’ایسا ڈراما میں نے آج تک نہیں دیکھا لکھتا میں بھی ہوں اور لوگ بھی لکھتے ہیں لیکن آپ کی پرواز تک کس کی رسائی ہو سکی ہے، کہیں تو آپ نے شیکسپیئر کو بھی مات کر دیا ہے۔‘‘

سیٹھ جی ’’ہاں جناب جو چیز دل کی امنگ سے لکھی جاتی ہے، وہ ایسی ہی اچھوتی اور لاجواب ہوتی ہے شیکسپیئر نے جو کچھ لکھا، وہ روپے کے لالچ سے لکھا، ہمارے دوسرے ڈرامہ نویس بھی دولت کے لیے ہی لکھتے ہیں ان میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو بے غرضانہ لکھنے والوں میں ہو سکتی ہے گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے؟ اس لیے کہ وہ بھگتی اور پریم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے سعدی کی گلستاں بوستاں، ہومر کی تصنیفات اس لیے مقبول عام ہیں کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے جو امنگ ہے وہ ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک ترکیب پر مہینوں کاوش کرتا ہے، مگر بندہ، دولت کو تو ایک کام ختم کر کے دوسرے کام کو شروع کرنے کا فکر ہوتا ہے۔‘‘

ڈراماٹسٹ ’’آپ بجا فرماتے ہیں ہمارے ادب کی تنزلی کا باعث بھی یہی ہے کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لیے لکھتے ہیں‘‘

سیٹھ جی ''سوچیے، آپ نے دس ہزار صرف فن موسیقی کی تحصیل میں صرف کر دیے۔ لاکھوں روپے گولیوں اور اہل ہنر کی نذر کیے کہاں کہاں سے اور کتنی کتنی جہد وجہد سے اس ناٹک کا مصالحہ جمع کیا نہ جانے کتنے والیان ریاست کو سنایا اس جدوجہد اور جانفشانی کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟''

ڈراماٹسٹ ''ممکن ہی نہیں ایسی تصنیف کے معاوضے کا تصور کرنا ہی ان کی توہین ہے ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ اپنی روح کی تشفی ہے، اور وہ قناعت جو آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔''

سیٹھ جی ''آپ نے سچ کہا ایسی تصنیف کا معاوضہ تسکین روح ہے معاوضی تو ایسی تصانیف کا بھی مل جاتا ہے جو صحافت پر بدنما داغ ہیں آپ ڈرامہ لے لیجیے اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کر دیجیے تین مہینے کے اندر اسے کھیل ڈالنا ہوگا۔''

میز پر مسودہ پڑا ہوا تھا ڈراماٹسٹ نے اسے اٹھا لیا گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے ونود کی طرف دیکھا ونود نے امر کی جانب، امر نے رسک کی طرف لیکن لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلا جیسے سیٹھ جی نے سب کے منہ سی دیے ہوں ڈراماٹسٹ صاحب کتاب لے کر چل دیے۔

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا ''حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی ڈراما کا ریہرسل شروع ہونے پر آپ کو تھوڑے دنوں کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے گی ہمارے ایکٹر بیشتر گجراتی ہیں یہ ہندی زبان کے تلفظ کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے کہیں کہیں الفاظ پر بلا ضرورت زور دے دیتے ہیں آپ کی نگرانی سے یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی اگر ایکٹروں نے پارٹ اچھا ادا نہ کیا تو آپ

کی تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔‘‘

یہ کہتے کہتے اس نے لڑکے کو آواز دی ’’بوائے آپ لوگوں کے لیے سگار لاؤ‘‘

سگار آ گئے سیٹھ جی اٹھ کھڑے ہوئے یہ دوستوں کی انجمن کو رخصت ہو جانے کا اشارہ تھا پانچوں دست بھی اٹھے سیٹھ جی دروازے تک آئے، پھر سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

’’آج اس غریب کمپنی کا تماشا دیکھ لیجئے پھر خدا جانے کب اتفاق ہو‘‘

گورو پرشاد نے جیسے کسی قبر کے نیچے سے کہا ہو ’’ہو سکا تو آ جاؤں گا‘‘

سڑک پر آ کر پانچوں دوست ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے تب پانچوں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے

ونود نے کہا ’’یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹال نکلا‘‘

امر ’’آنکھوں میں صاف دھول جھونک دی‘‘

رسک ’’میں اس کی خاموشی دیکھ کر پہلے ہی سے ڈر رہا تھا، کہ یہ کوئی اول درجہ کا گھاگھ ہے۔‘‘

مست ’’مان گیا اس کی کھوپڑی کو یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی‘‘

گورو پرشاد ان چہ میگوئیوں میں شامل نہ ہو سکے وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے گویا وہ ان کے خیالات کی تہ تک ہی نہیں پہنچ سکے۔

☆☆☆☆☆☆

آخری تحفہ

پہلی بار: ''چندن'' لاہور، اگست 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1934ء (آخری تحفہ)

سارے شہر میں صرف ایک ایسی دکان تھی، جہاں ولایتی ریشمی ساڑھی مل سکتی تھی اور سبھی دکانداروں نے ولایتی کپڑے پر کانگریس کی مہر لگوائی تھی مگر امرناتھ کی محبوبہ کی فرمائش تھی اس کی تعمیل ضروری تھی وہ کئی دن تک شہر کی دکانوں کا چکر لگاتے رہے۔ دوگنا دام دینے پر تیار تھے لیکن کہیں مقصد پورا نہ ہوا، اور اس کے تقاضے شدید تر ہوتے جاتے تھے ہولی آ رہی تھی آخر وہ ہولی کے دن کونسی ساڑھی زیب تن کرے گی اس کے روبرو اپنی معذوری کا اظہار امرناتھ کی مردانہ خودداری کے لیے محال تھا اس کے اشارے سے وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کے لیے بھی آمادہ وہ جاتے۔ آخر جب کہیں مقصد برآری نہ ہوئی تو انہوں نے اسی خاص دکان پر جانے کا ارادہ کیا انہیں یہ معلوم تھا، کہ اس دکان پر دھرنا دیا جا رہا ہے۔ صبح سے شام تک رضا کار تعینات رہتے ہیں اور تماشائیوں کا بھی ہر دم خاصا مجمع رہتا تھا اس لیے اس دکان میں جانے کے لیے ایک خاص صنف کی اخلاقی ہمت درکار تھی اور یہ ہمت امرناتھ میں ضرورت سے کم تھی تعلیم یافتہ آدمی تھے قومی جذبات سے بھی عاری نہ تھے حتیٰ الامکان سودیشی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے مگر اس معاملہ میں بہت راسخ نہ تھے سودیشی مل جائے تو بہتر ورنہ بدیشی

ہی سہی اس اصول کے پیرو تھے اور خاص کر جب اس کی فرمائش تھی تب تو کوئی مضر ہی نہ تھا اپنی ضرورت کوتو وہ شاید کچھ دنوں کے لیے ملتوی بھی کر دیتے مگر اس کی فرمائش تو مرگ بے ہنگام ہے اس سے نجات کہاں ممکن؟ طے کرلیا، کہ آج ساڑھی ضرور لائیں گے کوئی کیوں روکے؟ کسی کو روکنے کا کیا مجاز ہے؟ مانا سودیشی کا استعمال احسن ہے لیکن کسی کو جبر کرنے کا کیا حق؟ اچھی جنگ آزادی ہے جس میں شخصی آزادی کا اتنی بے دردی سے خون ہو۔

یوں دل کو مضبوط کر کے وہ شام کو دکان پر پہنچے دیکھا تو پانچ رضا کار پکٹنگ کر رہے ہیں اور دکان کے سامنے سڑک پر ہزارہا تماشائی کھڑے ہیں، سوچنے لگے دکان میں کیسے جائیں کئی بار کلیجہ مضبوط کیا اور چلے مگر برآمدہ تک جاتے ہمت نے جواب دے دیا۔

اتفاق سے ایک جان پہچان کے پنڈت جی مل گئے، ان سے پوچھا ''کیوں جناب یہ دھرنا کب تک رہے گا؟ شام تو ہوگئی''

پنڈت جی نے فرمایا ''ان سرپھروں کو صبح اور شام سے کیا مطلب؟ جب تک دکان بند نہ ہو جائے گی یہاں سے نہ ٹلیں گے کہئے کچھ خریدنے کا ارادہ ہے؟ آپ تو ریشمی کپڑا نہیں خریدتے۔''

امرناتھ نے معذوری کے انداز سے کہا ''میں تو نہیں خریدتا مگر مستورات کی فرمائش کو کیسے ٹالوں؟''

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا ''واہ اس سے زیادہ آسان تو کوئی بات نہیں عورتوں کو بھی چکمہ نہیں دے سکتے سو حیلے اور ہزار بہانے ہیں''

امرناتھ: ’’آپ ہی کوئی حیلہ سوچیے‘‘

پنڈت جی: ’’سوچنا کیا ہے یہاں رات دن یہی کیا کرتے ہیں سو پچاس حیلے ہمیشہ جیبوں میں پڑے رہتے ہیں عورت نے کہا ہار بنوا دو کہا آج ہی لو دو چار روز کے بعد کہا سنار مال لے کر چمپت ہو گیا یہ تو روز کا دھندا ہے بھائی جان، مستورات کا کام فرمائش کرنا ہے اور مردوں کا کام اسے خوب صورتی سے ٹالنا‘‘

امرناتھ ’’آپ تو اس کے ماہر معلوم ہوتے ہیں‘‘

پنڈت جی ’’کیا کریں بھائی صاحب آبرو تو بچانی ہی پڑتی ہے، سوکھا جواب دیں تو شرمندگی الگ ہو خفگی الگ وہ سمجھیں ہماری پرواہی نہیں کرتے آبرو کا معاملہ ہے آپ ایک کام کیجئے یہ تو آپ نے کہا ہی ہوگا، کہ آج کل پکٹنگ ہے۔‘‘

امرناتھ ’’ہاں، یہ تو عذر کر چکا برادر مگر وہ سنتی ہی نہیں، کہتی ہیں کیا ولائتی کپڑے دنیا سے اٹھ گئے مجھ سے چلے ہو اڑنے‘‘

پنڈت جی ’’تو معلوم ہوتا ہے، کوئی دھن کی پکی عورت ہے تو میں ایک ترکیب بتاؤں ایک خالی کارڈ کا بکس لے لو اس میں پرانے کپڑے جلا کر بھر لو جا کر کہہ دینا میں کپڑے لئے آتا تھا والنیٹر وں نے چھین کر جلا دیئے کیوں کیسی رہے گی؟‘‘

امرناتھ ’’کچھ جچتی نہیں اجی بیس اعتراض کریں گی کہیں پردہ فاش ہو جائے، تو مفت کی خفت ہو۔‘‘

پنڈت جی ’’تو معلوم ہو گیا، آپ بودے آدمی ہیں اور ہیں بھی آپ کچھ ایسے ہی یہاں تو کچھ اس شان سے حیلے کرتے ہیں، کہ حقیقت بھی اس کے سامنے گرد ہو جائے زندگی بھر یہی بہانے کرتے گزری اور کبھی گرفتار نہ ہوئے ایک ترکیب

اور ہے اسی نمونے کا دیسی مال لے جائیے اور کہہ دیجئے کہ ولایتی ہے۔"

امرناتھ "دیسی اور ولایتی کی تمیز انہیں مجھ سے اور آپ سے کہیں زیادہ ہے ولایتی پر تو جلد ولایتی کا یقین نہ آئے گا دیسی کی تو بات ہی کیا ہے"

ایک کھدر پوش صاحب قریب ہی کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے بول اٹھے" اے صاحب، سیدھی سی تو بات ہے جا کر صاف کہہ دیجئے، کہ میں بدیشی کپڑے نہ لاؤں گا اگر ضد کرے، تو دن بھر کھانا نہ کھائیے آپ راہ راست پر آ جائیں گی"

امرناتھ نے ان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں، آپ اس کوچہ سے ناآشنا ہیں اور بولے "یہ آپ ہی کر سکتے ہیں میں نہیں کر سکتا"

کھدر پوش "کر تو آپ بھی سکتے ہیں لیکن کرنا نہیں چاہتے یہاں تو ان لوگوں میں سے ہیں کہ اگر بدیشی دعا سے نجات ملتی ہو تو اسے بھی ٹھکرا دیں"

امرناتھ "تو شاید آپ گھر میں پکٹنگ کرتے ہوں گے؟"

کھدر پوش "پہلے گھر میں کر کے تب باہر کرتے ہیں بھائی صاحب"

کھدر پوش صاحب چلے گئے تو پنڈت جی بولے "یہ صاحب تو تیس مار خاں سے بھی تیز نکلے اچھا، تو آپ ایک کام کیجئے اس دکان کی پشت پر ایک دوسرا دروازہ ہے ذرا اندھیرا ہو جائے تو ادھر سے چلے جائیے گا دائیں بائیں کسی طرف نہ دیکھئے گا۔"

امرناتھ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو دکان کی پشت کی جانب جا پہنچے ڈر رہے تھے کہیں یہاں بھی محاصرہ نہ ہو لیکن میدان خالی تھا لپک کر اندر آ گئے ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی اور باہر نکلے، تو ایک دیوی جی زعفرانی

ساڑھی پہنے کھڑی تھی ان کی روح فنا ہوگئی دروازہ سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی ایک منٹ تک تو کواڑ کی آڑ میں چھپے کھڑے رہے پھر دیوی جی کا رخ دوسری طرف دیکھ کر تیزی سے نکل پڑے اور کوئی سو قدم بھاگتے ہوئے چلے گئے شامت اعمال سامنے سے ایک بڑھیا لٹھیا ٹیکتی چلی آرہی تھی آپ اس سے لڑ گئے بڑھیا گر پڑی اور لگی بد دعائیں دینے ''ارے مردودے! یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی آنکھوں میں چربی چھا گئی ہے دھکے دیتا چلتا ہے''

امرناتھ اس کی خوشامدیں کرنے لگے ''ماتا، معاف کرو مجھے رات کو کچھ کم نظر آتا ہے عینک گھر بھول آیا''

بڑھیا کا مزاج ٹھنڈا ہوا آگے بڑھی، اور آپ بھی چلے دفعتاً کانوں میں آواز آئی ''بابو صاحب، ذرا ٹھہریئے گا'' اور وہ یہ زعفرانی کپڑوں والی دیوی جی آتی ہوئی دکھائی دیں۔

امرناتھ کے پاؤں بندھ گئے اس طرح کلیجہ مضبوط کر کے کھڑے ہو گئے جیسے کوئی طالب علم ماسٹر کی بید کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

دیوی جی نے قریب آکر کہا ''آپ تو ایسے بھاگے کہ میں گویا آپ کو کاٹ کھاؤں گی آپ جب پڑھے لکھے آدمی ہو کر اپنا فرض نہیں پہچانتے تو افسوس ہوتا ہے ملک کی کیا حالت ہے لوگوں کو کھدر نہیں ملتا آپ ریشمی ساڑھیاں خرید رہے ہیں''

امرناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا ''میں سچ کہتا ہوں دیوی جی میں نے اپنے لیے نہیں خریدی ایک صاحب کی فرمائش تھی''

دیوی جی نے جھولی سے ایک چوڑی نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''ایسے حیلے روز ہی سنا کرتی ہوں یا تو آپ اسے واپس کر دیجئے یا لائیے ہاتھ میں آپ کو چوڑی پہنادوں۔''

امرناتھ ''شوق سے پہنا دیجئے میں اسے بڑے فخر سے پہنوں گا چوڑی اس قربانی کی ایک علامت ہے جو دیویوں کی زندگی کے لیے مخصوص ہے چوڑیاں ان دیویوں کے ہاتھ میں بھی تھیں جن کے نام سن کر آج بھی ہم تعظیم سے سر جھکاتے ہیں میں تو اسے شرم کی بات نہیں سمجھتا حقارت کی چیز نہیں اگر عورت، جو قوم کو پیدا کرتی ہے، چوڑی پہننا باعث فخر سمجھتی ہے، تو مردوں کے لیے چوڑی پہننا باعث شرم کیوں ہو؟''

دیوی جی کو ان کی اس بے غیرتی پر حیرت تو ہوئی مگر وہ اتنی آسانی سے امرناتھ کو چھوڑنے والی نہ تھی بولی'' آپ باتوں کے شیر معلوم ہوتے ہیں اگر آپ دل سے عورت کو پرستش کی چیز مانتے ہیں، تو میری یہ استدعا کیوں نہیں مان جاتے؟''

امرناتھ:''اس لیے کہ یہ ساڑھی بھی ایک عورت کی فرمائش ہے''

دیوی ''اچھا چلئے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی ذرا دیکھوں آپ کی دیوی جی کس مزاج کی عورت ہے۔''

امرناتھ کا دل بیٹھ گیا غریب ابھی تک بن بیاہا تھا اس لیے نہیں کہ ان کی شادی نہ ہوتی تھی بلکہ اس لیے کہ شادی کو وہ ایک قید زیست سمجھتے تھے مگر آدمی رنگین مزاج تھے تاہل اس مخزرہ کر بھی تاہل کی دل فریبیوں سے بے نیاز نہ تھے کسی ایسے وجود کی ضرورت ان کے لیے لازمی تھی جس پر وہ محبتوں کو نثار کر سکیں جس کی طراوت

سے وہ اپنی خشک زندگی کو تروتازہ کرسکیں جس کے سایہ الفت میں وہ ذرا دیر کے لیے ٹھنڈک پاسکیں۔جس کے دل میں وہ اپنی امنڈی ہوئی جوانی کے جذبات بکھیر کران کا اگنا دیکھ سکیں۔ان کی نظر انتخاب مالتی پر پڑی تھی جس کی شہر میں دھوم تھی ادھر ڈیڑھ دو سال سے وہ اسی خرمن کے خوشہ چیں بنے ہوئے تھے دیوی جی کے اصرار نے انہیں ذرا دیر کے لئے چپقلش میں ڈال دیا ایسی ندامت انہیں زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھے بولے ’’آج تو وہ ایک تقریب میں گئی ہیں گھر میں نہ ہوں گی‘‘

دیوی جی نے بے اعتباری سے ہنس کر کہا ’’تو میں سمجھ گئی، یہ آپ کی دیوی جی کا قصور نہیں، آپ کا قصور ہے۔‘‘

امرناتھ نے خفیف ہو کر کہا ’’میں آپ سے سچ کہتا ہوں آج وہ گھر پر نہیں ہیں‘‘

دیوی نے پوچھا ’’کل آجائیں گی؟‘‘

امرناتھ بولے ’’ہاں کل آجائیں گی‘‘

دیوی ’’تو آپ یہ ساڑھی مجھے دی دیجئے اور کل یہیں آجائیے گا میں آپ کے ساتھ چلوں گی میرے ساتھ دو چار بہنیں بھی ہوں گی‘‘

امرناتھ نے بے عذر وہ ساڑھی دیوی جی کو دے دی اور بولے ’’بہت خوب میں کل آجاؤں گا مگر کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں جو ساڑھی کی ضمانت درکار ہے؟‘‘

دیوی جی نے مسکرا کر کہا ’’سچی بات تو یہی ہے، کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں‘‘

امرناتھ نے خودداری کے ساتھ کہا ’’اچھی بات ہے آپ اسے لے جائیں‘‘

دیوی نے ایک لمحہ کے بعد کہا ’’شاید آپ کو ناگوار گزر رہا ہو، کہ کہیں ساڑھی گم

نہ ہو جائے اسے آپ لیتے جائیے مگر کل آئیے ضرور‘‘

امرناتھ کو ایسی غیرت آئی، کہ بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چل دیئے دیوی جی ’’لیتے جائیے لیتے جائیے‘‘ کرتی رہ گئی۔

(2)

امرناتھ گھر جا کر ایک کھدر کی دکان پر گئے اور دو سوٹوں کا کھدر خریدا پھر اپنے درزی کے پاس لے جا کر بولے ’’خلیفہ اسے راتوں رات تیار کر دو منہ مانگی سلائی دوں گا‘‘

درزی نے کہا ’’بابو صاحب، آج کل تو ہولی کی بھیڑ ہے، ہولی سے پہلے تیار نہ ہوسکیں گے‘‘

امرناتھ نے اصرار کے ساتھ کہا ’’میں منہ مانگی سلائی دوں گا مگر کل دوپہر تک مل جائیں مجھے کل ایک جگہ جانا ہے اگر دوپہر تک نہ ملے، تو پھر میرے کسی مصرف کے نہ ہوں گے۔‘‘

درزی نے آدھی سلائی پیشگی لے لی اور کل تیار کر دینے کا وعدہ کیا۔

امرناتھ یہاں سے مطمئن ہو کر مالتی کی طرف چلے قدم آگے بڑھتے تھے لیکن دل پیچھے رہا جاتا تھا کاش وہ ان کی اتنی التجا قبول کرلے کہ کل دو گھنٹہ کے لیے ان کے خانہ ویران کو روشن کرے لیکن یقیناً وہ انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر منہ پھیر لے گی سیدھے منہ بات نہیں کرے گی، آنے کا ذکر ہی کیا۔ ایک ہی بے مروت ہے تو کل

آ کر دیوی جی سے اپنی ساری شرمناک داستان بیان کر دوں۔ اس معصوم چہرہ کی بے لوث سرگرمی ان کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھی ان آنکھوں میں متانت تھی کتنا سچا جذبہ درد، کتنا خلوص! اس کے سیدھے سادے الفاظ میں کل ایسی تحریک عمل تھی، کہ امرناتھ کو اپنی نفس پرورانہ زندگی پر شرم آ رہی تھی اب بھی کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے آج انہیں معلوم ہوا، ہیرا کسے کہتے ہیں اس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہو رہا تھا مالتی کی وہ جادو بھری چتون، اس کی وہ شیریں ادائیں اس کی شوخیاں اور سحر طرازیاں، سب گویا ملمع اڑ جانے کے بعد اپنی اصلی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ اور امرناتھ کے دل میں نفرت پیدا کر رہی تھیں وہ مالتی کی طرف جا رہے تھے اس کے دیدار کے لیے نہیں، بلکہ اس کے ہاتھوں سے اپنا دل چھین لینے کے لیے محبت کا گداگر آج اپنے اندر ایک عجیب استغنا کا احساس کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی، کہ اب تک وہ کیوں اتنا بے خبر تھا وہ طلسم، جو مالتی نے برسوں کے عشوہ وفریب سے باندھا تھا آج کسی چھومنتر سے تار تار ہو گیا تھا۔

مالتی نے انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو کر کہا ''ساڑھی لائے یا نہیں؟''

امرناتھ نے بے نیازی کی شان سے جواب دیا ''نہ''

مالتی نے استعجاب سے ان کی طرف دیکھا ''نہ!'' وہ ان کے منہ سے یہ لفظ سننے کی عادی نہ تھی یہاں اس نے کامل تسلیم پائی تھی اس کا اشارہ امرناتھ کے لیے نوشتۂ تقدیر تھا بولی ''کیوں؟''

امرناتھ ''کیوں کیا نہیں لائے''

مالتی ''بازار میں مل نہ ہوگی تمہیں کیوں ملنے لگی اور میرے لیے''

امرناتھ ''نہیں صاحب ملی، مگر لایا نہیں''

مالتی ''آخر کوئی وجہ؟ روپے مجھ سے لے جاتے''

امرناتھ ''تم خواہ مخواہ جلاتی ہو تمہارے لیے میں جان دینے کو حاضر رہا''

مالتی ''تو شاید تمہیں روپے جان سے بھی پیارے ہوں گے''

امرناتھ ''تم مجھے بیٹھنے دوگی یا نہیں، اگر میری صورت سے نفرت ہو تو چلا جاؤں''

مالتی ''تمہیں آج ہو کیا گیا ہے تم تو اتنے تیز مزاج نہ تھے؟''

امرناتھ ''تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو''

مالتی ''تو آخر میری چیز کیوں نہیں لائے؟''

امرناتھ نے اس کی طرف دلیرانہ انداز سے دیکھ کر کہا'' دکان پر گیا ذلت اٹھائی اور ساڑھی لے کر چلا تو ایک عورت نے چھین لی میں نے کہا''میری بیوی کی فرمائش ہے تو بولی میں انہیں کو دوں گی کل تمہارے گھر آؤں گی۔

مالتی نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا''تو یہ کہیے آپ دل ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے ایک نازنین کو دیکھا، اور اس کے قدموں پر نثار کر دیا۔''

امرناتھ ''وہ ان عورتوں میں نہیں، جو دلوں کی گھات میں رہتی ہیں''

مالتی ''تو کوئی دیوی ہوگی؟''

امرناتھ ''میں اسے دیوی ہی سمجھتا ہوں''

مالتی ''تو آپ اس دیوی کی پوجا کیجئے گا''

امرناتھ ’’مجھ جیسے آوارہ نوجوان کے لیے اس مندر کے دروازے بند ہیں‘‘

مالتی ’’بہت حسین ہوگی‘‘

امرناتھ ’’نہ حسین ہے نہ جمیل، نہ خوش ادا ہے نہ شیریں گفتار، اور نہ نازک بدن بالکل ایک معمولی معصوم لڑکی ہے لیکن جب میرے ہاتھ سے اس نے ساڑھی چھین لی تو میں کیا کرسکتا تھا؟ میری غیرت نے تو تقاضا نہ کیا، کہ اس کے ہاتھ سے ساڑھی چھین لوں‘‘ تمہیں انصاف کرو وہ دل میں کیا کہتی؟

مالتی ’’تو تمہیں اس کی زیادہ پروا ہے کہ وہ اپنے دل میں کیا کہے گیا میں کیا کہوں گی اس کی مطلق پروا نہ تھی میرے ہاتھ سے کوئی مرد میری کوئی چیز چھین لے، تو دیکھوں چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو‘‘

امرناتھ ’’اب اسے چاہے میری بزدلی سمجھو، چاہے کم ہمتی چاہے شرافت، میں اس کے ہاتھ سے نہ چھین سکا‘‘

مالتی ’’تو کل وہ ساڑھی لے کر آئے گی کیوں؟‘‘

امرناتھ ’’ضرور آئے گی‘‘

مالتی ’’تو جا کر منہ دھو آؤ تم اتنے سادہ لوح ہو مجھے معلوم نہ تھا ساڑھی دے کر چلے آئے اب کل وہ آپ کو دینے آئے گی کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟‘‘

امرناتھ ’’خیر، اس کا امتحان کل ہو ہی جائے گا ابھی سے کیوں بدگمانی کرتی ہو تم شام کو ذرا دیر کے لیے میرے گھر تک چلی چلنا‘‘

مالتی ’’جس سے آپ کہیں کہ یہ میری بیوی ہے‘‘

امرناتھ ’’مجھے کیا خبر تھی، کہ وہ میرے گھر آنے کے لیے تیار ہو جائے گی نہیں تو

کوئی اور بہانہ کر دیتا۔‘‘

مالتی ’’تو آپ کی ساڑھی آپ کو مبارک ہو، میں نہیں جاتی‘‘

امرناتھ ’’میں تو روز تمہارے گھر آتا ہوں تم ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتیں‘‘

مالتی نے سنگدلی سے کہا ’’اگر موقع آ جائے تو تم اپنے کو میرا شوہر کہلانا پسند کرو گے؟ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا‘‘

امرناتھ دل میں کٹ گئے بات بناتے ہوئے بولی ’’مالتی‘‘ ’’تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو برا نہ ماننا میرے اور تمہارے درمیان باوجود پیار اور محبت کے اظہار کے ایک مغائرت کا پردہ حائل تھا ہم دونوں ایک دوسرے کی حالت کو سمجھتے تھے اور اس پردہ کو ہٹانے کی کوشش نہ کرتے تھے یہ پردہ ہمارے تعلقات کی لازمی شرط تھا ہمارے درمیان ایک تاجرانہ سمجھوتہ سا ہو گیا ہم دونوں اس کی گہرائی میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے نہیں! بلکہ میں ڈرتا تھا اور تم ارادۃ نہ جانا چاہتی تھی اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ تمہیں رفیق حیات بنا کر میں وہ سب کچھ پا جاؤں گا جس کا میں اپنے کو مستحق سمجھتا ہوں تو میں اب تک کبھی کا تم سے اس کی التجا کر چکا ہوتا لیکن تم نے کبھی میرے دل میں یہ اعتبار پیدا کرنے کی پروا نہ کی میری نسبت بھی تمہیں یہ شک ہے میں نہیں کہہ سکتا تمہیں یہ شک کرنے کا میں نے کوئی موقع نہ دیا اور میں کہہ سکتا ہوں، کہ میں اس سے کہیں بہتر شوہر بن سکتا ہوں جتنی تم بیوی بن سکتی ہو میرے لیے صرف اعتبار کی ضرورت ہے اور تمہارے لیے زیادہ وزنی اور زیادہ مادی چیزوں کی میری مستقل آمدنی پانسو سے زیادہ نہیں تم اس پر قناعت نہ کرو گی

میرے لیے صرف اس اطمینان کی ضرورت ہے کہ تم میری اور صرف میری ہو بولو منظور ہے؟

مالتی کو امر ناتھ پر رحم آ گیا اس کی باتوں میں جو صداقت بھری ہوئی تھی اس سے وہ انکار نہ کر سکی اسے یہ بھی یقین و گیا، کہ امر ناتھ کی وفا میں لغزش نہ ہو گی اسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا، کہ وہ اسے رسی سے مضبوط جکڑ سکتی ہے لیکن خود جکڑے جانے پر وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکی اس کی زندگی محبت کی بازی گری میں الفت کی نمائش میں گزری تھی وہ کبھی اس کبھی اس شاخ پر چہکتی پھرتی تھی بے قید، آزاد، بے بند، کیا وہ طائر کنج قفس میں خوش رہ سکتا ہے جس کی زبان انواع و اقسام کے مزوں کی عادی ہو گئی ہو، کیا وہ نان خشک پر آسودہ ہو سکتا ہے؟ اس احساس نے اسے زم کر دیا بولی:

”آج تم بڑی علمیت بگھار رہے ہو؟“

امر ناتھ ”میں نے تو صرف واقعات بیان کیے ہیں“

مالتی ”اچھا میں کل چلوں گی مگر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں نہ رہوں گی“

امر ناتھ کا دل شکریہ سے لبریز ہو گیا بولا

”میں تمہارا بے حد مشکور ہوں مالتی“ اب میری آبرو بچ جائے گی، نہیں تو میرے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنا پارٹ کتنی خوبصورت سے ادا کرتی ہو۔

مالتی ”اس کی طرف سے تم اطمینان رکھو بیاہ نہیں کیا مگر براتیں دیکھی ہیں مگر میں ڈرتی ہوں، کہیں تم مجھ سے دغا نہ کر رہے ہو مردوں کا کیا اعتبار؟“

امرناتھ نے خلوص دل سے کہا

''نہیں مالتی تمہارا شبہ بے بنیاد ہے اگر یہ زنجیر پیروں میں ڈالنے کا آرزومند ہوتا تو کبھی کا ڈال چکا ہوتا پھر مجھ سے نفس کے بندوں کا وہاں گزر ہی کہاں؟''

(3)

دوسرے دن امرناتھ دس بجے ہی درزی کی دکان پر جا پہنچے اور سر پر سوار ہو کر کپڑے تیار کرائے پھر گھر آ کر نئے کپڑے پہنے، اور مالتی کو بلانے چلے وہاں دیر ہو گئی اس کے ایسا بناؤ سنگار کیا گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔

امرناتھ نے کہا ''وہ حسین نہیں جو تم اتنی تیاریاں کر رہی ہو''

مالتی نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا ''تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے، چپ چاپ بیٹھے رہو۔''

امرناتھ ''لیکن دیر جو ہو رہی ہے''

مالتی ''کوئی مضائقہ نہیں''

خطرہ کے اس فطری احتمال نے جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے مالتی کو زیادہ محتاط کر دیا تھا اب تک اس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصوصیت کے ساتھ التفات نہ کیا تھا اس سے بے پروائی سے سلوک کرتی تھی لیکن کل امرناتھ کے بشرہ سے اسے ایک خطرہ کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس خطرہ کا اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی دشمن کو حقیر اور بے چارا سمجھنا صنف نازک کے لیے مشکل ہے آج

امرناتھ کو اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی اگر اس طرح اس کی چیزیں ایک ایک کر کے نکل گئیں تو پھر وہ اپنا وقار کب تک قائم رکھ سکے گی؟ جس چیز پر اس کا قبضہ ہے اس کی طرف کوئی آنکھ ہی کیوں اٹھائے؟ راجہ بھی تو ایک ایک انگلی زمین کے پیچھے جان دیتا ہے، وہ اس نئے شکاری کو ہمیشہ کے لیے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی اس کے جادو کو توڑ دینا چاہتی تھی۔

شام کو وہ غیرت حور بن کر اپنی خادمہ اور نوکر کو ساتھ لے امرناتھ کے گھر چلی۔ امرناتھ نے صبح دس بجے تک مردانے گھر کو زنانے پن کا رنگ دینے میں صرف کیا تھا۔ ایسی تیاریاں کر رکھی تھیں، گویا کوئی افسر معائنہ کرنے والا ہے مالتی نے گھر میں قدم رکھا، تو اس کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئی زنانے حصہ میں کئی کرسیاں رکھی تھیں بولی:

"اب لاؤ اپنی دیوی جی کو مگر جلد آنا ورنہ میں چلی جاؤں گی"

امرناتھ لپکے ہوئے ولایتی کپڑے کی دکان پر گئے، آج بھی دھرنا تھا تماشائیوں کا وہی ہجوم وہاں دیوی جی نہ تھیں، پشت کی جانب گئے، دیوی جی ایک لڑکی کے ساتھ اسی بھیس میں کھڑی تھیں۔

امرناتھ نے کہا "معاف کیجئے گا مجھے دیر ہوگئی، میں آپ کے وعدہ کی یاد دلانے آیا ہوں"

دیوی جی نے کہا "میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی چلو سمترا ذرا آپ کے گھر ہو آئیں کتنی دور ہے؟"

امرناتھ "بہت قریب ہے ایک تانگہ کر لوں گا"

پندرہ منٹ میں امرناتھ دونوں کو لیے گھر پہنچا مالتی نے دیوی جی کو دیکھا اور دیوی جی نے مالتی کو ایک کسی رئیس کا محل تھا عالی شان دوسرا کسی فقیر کی کٹیا تھی مختصر اور حقیر رئیس کے محل میں تکلف اور نمائش تھی فقیر کی کٹیا میں سادگی اور صفائی، مالتی نے دیکھا معصوم دوشیزہ ہے جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے۔ پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی اس سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکی دیوی جی نے بھی دیکھا، ایک تکلف پسند، بے باک اور مغرور عورت ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بے گانہ سی معلوم ہو رہی ہے جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں آ گیا ہو۔

امرناتھ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے اور ایشور سے دعا کر رہے تھے، کہ کسی طرح آج پردہ رہ جائے۔

دیوی نے آتے ہی کہا "بہن! آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیشی کپڑے پہنے ہوئی ہیں؟"

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا "میں بدیشی اور دیسی کے پھیر میں نہیں پڑتی جو یہ لا کر دیتے ہیں وہ پہنتی ہوں لانے والے ہیں یہ میں تھوڑی بازار جاتی ہوں"

دیوی نے گلہ آمیز نظروں سے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا "آپ تو کہتے تھے، یہ ان کی فرمائش ہے مگر آپ ہی کا قصور نکل آیا۔"

مالتی "تو میرے سامنے ان سے کچھ نہ کہو تم بازار میں بھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو جب وہ باہر چلے جائیں، تو جتنا جی چاہے کہہ سن لینا میں اپنے

کانوں سے نہیں سننا چاہتی؟''

دیوی جی ''میں کچھ کہتی نہیں، اور بہن جی میں کہہ ہی کیا سکتی ہوں کوئی زبردستی تو ہے نہیں صرف عرض کرسکتی ہوں''

مالتی ''اس کے معنی یہ ہیں، کہ انہیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں اس کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے پڑھے لکھے آدمی ہیں، دس آدمی عزت کرتے ہیں، اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے ہیں، تمہیں مجاز نہیں کہ انہیں اپدیش دینے بیٹھو یا سب سے زیادہ عقلمند تمہیں ہو؟''

دیوی جی: ''آپ میرا منشا غلط سمجھ رہی ہیں بہن''

مالتی ''ہاں غلط تو سمجھوں گی ہی اتنی تمیز کہاں سے لاؤں، کہ آپ کی باتوں کا مطلب سمجھوں، کھدر کی ساڑھی پہن لی، جھولی لٹکائی، ایک بلا لگا لیا، بس اب اختیار ہے جہاں چاہیں آئیں جائیں، جس سے چاہیں ہنسیں بولیں، گھر میں کوئی پوچھتا نہیں، تو جیل خانے کا بھی کیا ڈر؟ میں اسے ہڑوں گا پن سمجھتی ہوں جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لیے جائز نہیں''

امرناتھ دل میں کٹے جارہے تھے چھپنے کے لیے بل ڈھونڈ رہے تھے دیوی کی پیشانی پر ذرا بل نہ تھا لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

امرناتھ نے ذرا تیز لہجہ میں کہا'' کیوں خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتی ہو۔ یہ دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کر رہی ہیں کیا تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں؟''

مالتی: ''رہنے دو بہت تعریف نہ کرو، زمانہ کا رنگ ہی بدلا جارہا ہے، میں کیا کروں گی اور تم کیا کرو گے، تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بری طرح قید کیا،

کہ آج وہ رسم و رواج، شرم و حیا کو چھوڑ کر نکل آئی ہیں اور کچھ دنوں میں تم لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے ولایتی اور بدیشی تو دکھانے کے لیے ہے۔ اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے جو تمہیں حاصل ہے، تم اگر دو چار شادیاں کر سکتے ہو، تو عورت کیوں نہ کرے۔ یہ ہے حقیقت، اگر آنکھیں ہیں، تو اب کھول کر دیکھو، مجھے وہ آزادی نہ چاہیے۔ یہاں تو لاج دھوتے ہیں، اور میں شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہوں۔''

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف فریادی آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھالی ہے۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑے گا۔''

امرناتھ نے وہ ساڑھی اسے دیتے ہوئے کہا ''نہیں بالکل ناکام تو آپ نہیں جائیں گی ہاں متوقع کامیابی نہ ہوگی''

مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا ''وہ میری ساڑھی ہے تم اسے نہیں دے سکتے''

امرناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا ''اچھی بات ہے نہ دوں گا دیوی جی ایسی حالت میں تو شاید آپ مجھے معاف کریں گی۔''

دیوی جی چلی گئیں تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا ''یہ تم نے آج میرے منہ میں کالکھ لگادی تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو مجھے معلوم نہ تھا۔''

مالتی نے تند لہجہ میں کہا ''تو اپنی ساڑھی اسے دے دیتی؟ میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں اب تو بدتمیز بھی ہوں، بدزبان بھی، اس دن ان برائیوں میں سے ایک بھی نہ تھی، جب میری جوتیاں سیدھی کرتے تھے اس چھوکری نے موہنی ڈال

دی،جیسی روح،ویسے فرشتے،مبارک ہو۔"

یہ کہتی ہوئی مالتی باہر نکلی اس نے سمجھا تھا چرب زبانی اور حسن کی طاقت سے وہ اس دوشیزہ کو اکھاڑ پھینکے گی لیکن جب معلوم ہوا کہ امرناتھ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تو اس نے پھٹکار بتائی اس داموں اگر امرناتھ مل سکتا تھا تو برا نہ تھا۔ اس سے زیادہ قیمت وہ ان کے لیے دے نہ سکتی تھی۔

امرناتھ اس کے ساتھ دروازے تک آئے جب وہ تانگہ پر بیٹھی تو منت کر کے بولے

"یہ ساڑھی دے دو مالتی، میں تمہیں کل اس سے بدر جہا بہتر ساڑھی لا دوں گا"

مگر مالتی نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا "یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپے پر بھی نہیں دے سکتی۔"

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا "اچھی بات ہے، لے جاؤ،مگر یہ سمجھ لو، یہ میرا آخری تحفہ ہے۔"

مالتی نے ہونٹ چبا کر کہا "اس کی پروا نہیں، تمہارے بغیر میں مر نہ جاؤں گی، اس کا تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆

مالکن

پہلی بار: ہندی میں ''سوامنی'' کے عنوان سے ''وشال بھارت'' ستمبر 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں فروری 1938ء (واردات)

شیو داس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ''بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمے ہے میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا کام کرنے والا تو کوئی چاہیے۔ اب ہل توڑ دوں تو گزر نہ ہو گی، اس لیے برجو کا ہل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا، رکھنے اٹھانے والا تمہارے سوا دوسرا کون ہے؟ رو مت بیٹا! بھگوان کی جو مرضی تھی وہ ہوا اور جو مرضی ہو گی وہ ہو گا۔ ہمارا تمہارا کیا اختیار ہے میرے جیتے جی تمہیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا تم کسی بات کی فکر نہ کرو جو گیا تو میں تو ابھی بیٹھا ہی ہوں''

رام پیاری اور رام دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو دو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور آرام سے رہنے لگیں۔ شیو داس کو فرصت ملی، دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا آباد گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل

ہونے لگی لیکن خدا کی مرضی بڑا لڑکا بر جو بیمار پڑا اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہو گئے۔آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی اور شیو داس نے سچے بہادر کی طرح کار راز حیات کے لیے کمر باندھ لی دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو، اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا، آج اپنی بہو کو دیکھ کر ایک آن کے لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگا۔شاید اس نے سوچا تھا کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پچھ جائیں گے کم سے کم اسے اتنی محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقت آمیز لہجے میں کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے دادا! تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن بیٹھوں کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا بیٹھے بیٹھے رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔''

شیو داس نے سمجھایا: ''بیٹا! بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں رونے دھونے سے ہلکان ہونے کے سوا اور کیا ہاتھ آئے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں کوئی سادھو سنت آجائے کوئی مہمان آپہنچے اس کی خاطر مدارات کے لیے کسی کو تو گھر پر رہنا ہی پڑے گا''

بہو نے بہت حیلے کیے پر شیو داس نے ایک نہ سنی۔

(2)

شیو داس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اٹھالی تو اس کے دل میں

اختیار اور ذمہ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے شوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہو گیا، اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔ شیوداس باہر تھا، گھر بالکل خالی تھا اس وقت وہ بے فکر ہو کر بھنڈار کو کھول سکتی ہے۔ اس میں کیا کیا سامان ہے کیا کیا چیز ہے، یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے تاب ہو گیا۔ اس مکان میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیوداس آ کر اس کوٹھری کو کھولتا۔ پھر اسے بند کر کے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے گھر کے لیے وہ کوٹھری ایک طلسم یا راز تھی، جس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کر دیا کہ اسے کوئی بھنڈار کھولتے نہ دیکھ لے نہیں تو سوچے گا بے ضرورت اس نے کیوں کھولا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر پانو رکھا تو اسے اسی طرح کی، لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی پٹاری کے کھولنے میں ہوتی تھی۔ مٹکوں میں گڑ، شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے، جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے رکھے ہوئے تھے۔ کوٹھری پر شان و شوکت چھائی ہوئی تھی اسی کے سایے میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے دل پر نشہ طاری ہوتا گیا۔ جب وہ اس کوٹھری سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بدلی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔

اسی وقت دروازے پر کسی آدمی نے آواز دی اس نے فوراً بھنڈارے کا دروازہ بند کیا اور جا کر صدر دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو پڑوسن چھینا کھڑی ایک روپیا قرض مانگ رہی ہے۔

رام پیاری نے بے رخی سے کہا "ابھی تو ایک پیسا بھی گھر میں نہیں ہے۔ بہن کام کاج میں سب خرچ ہو گیا"

چھینا حیران رہ گئی چودھری کے گھر میں اس وقت ایک روپیا بھی نہیں ہے۔ یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی جس کے یہاں سینکڑوں کا لین دین ہے اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صرف نہیں ہو سکتا۔ اگر شیو داس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو اسے تعجب نہ ہوتا۔ رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لیے گانو میں مشہور تھی۔ اکثر شیو داس کی نگاہیں بچا کر ہمسایوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی، ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دے دیا تھا یہاں تک کہ اپنے گہنے تک مانگے دے دیا کرتی تھی۔ بخیل شیو داس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

چھینا نے متعجب ہو کر کہا "ایسا نہ کہو بہن بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں نہیں تو تم جانتی ہو کہ میری عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیا دینا ہے پیادہ دروازے پر کھڑا بک جھک رہا ہے۔ روپیا دے تو کسی طرح مصیبت ٹلے میں آج کے آٹھویں روز آ کر دے جاؤں گی گانو میں اور کون گھر ہے، جہاں مانگنے جاؤں۔"

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی پہلے چاول،

دال چنا وبال معلوم ہوتا تھا اور رسوئی میں جانا سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی، آخر میں شیوداس آ کر کہتا کہ آج کیا کھانا نہ پکے گا؟ اس وقت دونوں میں سے ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑ پکا کر رکھ دیتی۔ جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ دروازہ ایسا صاف ہونا چاہیے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جائے، یہ نہیں کہ ابکائی آنے لگے۔ ابھی کہہ دوں تو تنک اٹھیں اچھا! یہ منی ناند سے الگ کیوں کھڑی ہے۔

اس نے منی گائے کے پاس جا کر ناند میں جھانکا، بدبو آ رہی تھی۔ ٹھیک ہے، معلوم ہوتا ہے مہینوں سے پانی نہیں بدلا گیا ہے اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا چھٹی ہوئی اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے وہ بھی تین کوڑی کا کھانے کو ڈیڑھ سیر کام کرتے ۶ ے نانی مرتی ہے۔ آئے تو پوچھتی ہوں ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا؟ رہنا ہو رہے یا جائے، آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔

آخر اس سے نہ رہا گیا گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا: ''پانی کیا ہوگا بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے''

پیاری نے کہا ''ناند کا پانی سڑ گیا ہے منی بھوسے میں منہ نہیں ڈالتی دیکھتے ہو کوس بھر پر کھڑی ہے۔''

شیو داس مسکرایا دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

(3)

کئی مہینے گزر گئے پیاری کے اختیار میں آ کر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھیے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے، گھی زیادہ ہوتا ہے، پیاری نہ خود آرام کرتی ہے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے، کسی کو گہنے کی دھن سوار ہے ہاں اگر کوئی متردد فکر مند اور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے، پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھے شیو داس بھی کبھی کبھی اس کی بد گوئی کرتے ہیں، کسی کو پہر رات رہنے اٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، محنت سے سب جی چراتے ہیں، پھر بھی اتنا سب ہی مانتے ہیں کہ پیاری نہ ہو تو گھر کا کام نہ چلے اور تو اور اب دونوں بہنوں میں اتنا میل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لا کر

پیاری کے سامنے پٹک دیے اور بگڑ کر بولی ''لے کپڑے بھی بھنڈار میں بند کر دے۔''

پیاری نے کپڑے اٹھا لیے اور نرم لہجے میں کہا: ''کہہ تو دیا، ہاتھ میں روپے آنے دے بنوا دوں گی ابھی تو ایسے گھس نہیں گئے ہیں کہ آج ہی اتار کر پھینک دیے جائیں''

دلاری لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی، بولی: ''تیرے ہاتھ میں کاہے کو کبھی روپے آئیں گے اور کاہے کو کپڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزہ آتا ہے''

پیاری نے ہنس کر کہا: ''جوڑ جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لیے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں میرا بازو بند کب کا ٹوٹا پڑا ہے۔''

دلاری: ''تم نہ کھاؤ پہنو، نیک نامی تو ہوتی ہے تمہاری یہاں کھانے اور پہننے کے سوا اور کیا ہے؟ میں تمہارا حساب کتاب نہیں جانتی میرے کپڑے آج بننے کو بھیج دو۔''

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز میں پوچھا: ''روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاؤں؟''

دلاری نے چیخ کر کہا: ''مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں میں تو کپڑے چاہتی ہوں''

اسی طرح گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت و سست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ

فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرلے اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طعن وطنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا، وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔

گانو میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن تمام گھر کو سنبھالے ہوئے ہے چاہتی تو دوسرا گھر کرکے چین کرتی اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹارہی ہے کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں جیسے کایا پلٹ ہوگئی۔

چند روز بعد دلاری کے کپڑے بن کر آگئے۔ پیاری خود سنار کے گھر دوڑ دوڑ گئی۔

شام ہوگئی تھی دلاری اور متھرا دونوں کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کپڑے دلاری کو دیے دلاری نہال ہوگئی، چٹ پٹ کپڑے پہنے اور دوڑی ہوئی جا کر کوٹھری میں متھرا کو کپڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھری کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ دلاری اس سے کل تین ہی سال تو چھوٹی ہے، لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اسی منظر پر جم گئیں۔ متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت، ان کی وہ محبت آگیں محویت ان کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہاں تک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہوگئے۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ

نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ نا گہاں شیو داس نے پکارا: ''بڑی بہو ایک پیسا دو تمبا کو منگاؤں''

پیاری کا سلسلہ تصور شکست ہو گیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈار میں پیسا لینے چلی گئی۔

(4)

ایک ایک کر کے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گانو میں سب سے خوش حال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔ کبھی مکان کی مرمت کے لیے، کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور جب بہت توڑ جوڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی اور وہ چیز ایک بار ہاتھ سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان میں سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی لیکن جہاں عزت کی بات آ پڑتی وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی اگر گانو میں ہیٹی ہو گئی تو کیا بات رہی۔ اسی کی تو بدنامی ہو گی! دلاری کے پاس بھی گہنے تھے ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں لیکن پیاری ان کی چیزیں نہ چھوتی۔ ان کے کھانے پہننے کے دن ہیں، وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسیں۔ دلاری کے لڑکا پیدا ہوا تو پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ کیا۔

شیو داس نے مخالفت کی: کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا

موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی: ''کیسی بات کرتے ہو دادا! پہلونٹی کے لڑکے کے لیے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہو گی؟ دل تو نہیں مانتا پر دنیا کیا کہے گی؟ نام بڑے درشن تھوڑے میں تم سے کچھ نہیں مانگتی، اپنا تمام سامان کر لوں گی''

''گہنے کے سر جائے گی اور کیا؟'' شیو داس نے فکر مند ہو کر کہا ''اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا کتنا سمجھایا بیٹا! بھائی بھاوج کسی کے نہیں ہوتے اپنے پاس دو چیزیں رہیں گی تو سب منہ تکیں گے نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گا''

پیاری نے ایسا منہ بنایا گویا وہ ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے بولی: ''جو اپنے ہیں وہ اپنے ہیں وہ بات بھی نہ پوچھیں جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں میرا دھرم میرے ساتھ ہے ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے مر جاؤں گی تو کیا سینے پر لاد کے لے جاؤں گی''

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی برھی کی روز ساری برادری کا کھانا ہوا لوگ کھا پی کر چلے گئے تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکرا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا۔ نو مولود بچے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ دلاری زچہ خانے سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اتر گیا تھا لیکن آج چہرے پر صحت کی سرخی چھائی ہوئی تھی مادرانہ غرور و ناز نے اعضا میں ایک نئی

روح پیدا کر دی تھی۔ زچہ خانے کی احتیاط اور مقوی چیزوں کے استعمال نے بدن کو چکنا دیا تھا متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے، بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔

آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے پر لطف تماشا دیکھنے لگی۔ ماں اور باپ دونوں باری باری سے بچے کو چومتے اور گلے لگاتے اور اس کے منہ وک تکتے تھے کیسی پر کیف مسرت تھی پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لیے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔ جس طرح لگام سے منہ بند، بوجھ سے لدا ہوا، ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ دوڑتے دوڑتے بے دم گھوڑا ہنہناہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہو گئی۔ اس کی مادریت جو پنجرے میں بند خاموش بے جان پڑی ہوئی تھی، قریب سے گزرنے والی مادریت کی چہکار سے بیدار ہو گئی اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لیے باز پھڑ پھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا: ''یہ میرا لڑکا ہے''

دلاری نے بچے کو سینے سے چمٹا کر کہا ''ہاں، ہے کیوں نہیں تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے مصیبت تو میں نے بھگتی، باپ کہلانے کے لیے تم آ گئے۔''

متھرا: ''میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت وشکل سب میری سی ہے کہ نہیں۔''

دلاری: ''اس سے کیا ہوتا ہے بیج بنیے کے گھر سے آتا ہے کھیت کسان کا ہوتا

ہے پیداوار بنیے کی نہیں ہوتی کسان کی ہوتی ہے''

متھرا: ''باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا، میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کروں گا''

دلاری: ''میرا لڑکا پڑھے لکھے گا۔ کوئی بڑا عہدہ حاصل کرے گا، تمہاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلے گا، مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوا دیں''

متھرا: ''اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا اور کلیجہ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا''

دلاری: ''یہ مہارانی جینے دے گی''

متھرا: ''مجھے تو اس بے چاری پر ترس آتا ہے اس کے کون بیٹھا ہے ہمیں لوگوں کے لیے تو مرتی ہے بھیا ہوتے تو اب تک دو تین لڑکوں کی ماں ہو گئی ہوتی''

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایک ایسا سیلاب امنڈا کہ اس کے روکنے میں اس کا تمام جسم کانپ اٹھا۔

اس کی بیوگی کا سونا پن کسی خوف ناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔ تصور اس بنجر زمین میں ہرا بھرا باغ لگانے لگا۔

یکا یک شیو داس نے اندر آ کر کہا: ''بڑی بہو کیا سو گئی! باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا کیا کہہ دوں؟''

(5)

کچھ دنوں بعد شیو داس بھی مر گیا ادھر دلاری کے دو بچے ہوئے وہ بھی زیادہ تر

بچوں کی پرورش و پرداخت میں رہنے لگی کھیتی کا کام مزدوروں پر آپڑا متھرا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع نہ ملا تھا خود پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا۔ بعد کو باپ کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔ کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا۔ وہی مزدور اس کے یہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے اس لیے اب پیاری کو دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے تھے کہنے کو تو وہ اب بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت گزار تھی مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمین دار کا پیادہ بھی اس پر دھونس جماتا، کھانے میں بھی کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیے، دلاری بچوں والی تھی، اسے بھی پوری خوراک چاہیے، متھرا گھر کا سردار تھا۔ اس حق کو اس سے کون چھین سکتا۔ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے تھے۔ ساری کسر بے چاری پیاری پر نکلتی تھی۔ اس کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر جھک گئی، آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی۔ مگر وہ خوش تھی مالک ہونے کا احسان ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا: ’’بھابی! اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں، کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہیں، وہ بھی رو دھو کر کئی آدمی پورب سے آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہاں دو تین روپے روز کی مزدوری ہوتی ہے چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤں گا۔ اب لڑکے بالے ہوئے ان کے لیے تو کچھ کرنا ہی چاہیے۔‘‘

دلاری نے تائید کی: ''ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے لڑکوں کو پڑھائیں گے لکھائیں گے ہماری تو کسی طرح کٹ گئی لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔''

پیاری یہ رائے سن کر حیران رہ گئی ان کا منہ تکنے لگی اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی انہیں یہ دھن کیسے سوار ہو گئی۔ اسے شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

بولی: ''تو میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمہاری جیسی خوشی ہو لڑکوں کے پڑھانے لکھانے کے لیے یہاں بھی اسکول ہیں پھر کیا ہمیشہ ہی ایسا وقت رہے گا دو تین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

متھرا: ''اتنے زور کھیتی کرتے ہو گئے جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بن جائے گی۔ اسی طرح ایک روز چل دیں گے دل کی دل میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پانو بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا لڑکوں کو اس چکی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔''

پیاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: ''بھیا، گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لیے نہ دوڑنا چاہیے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو مجھے ایک ٹکڑا دے دینا پڑی رہوں گی۔''

متھرا گلوگیر آواز سے بولا: ''بھابی، یہ تم کیا کہتی ہو تمہارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھلا ہے نہیں تو ختم ہو چکا ہوتا اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا اپنا جسم تک گلا ڈالا میں اندھا نہیں ہوں سب کچھ سمجھتا ہوں ہم لوگوں کو جانے دو بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا تمہارے لیے ہم برابر خرچ بھیجتے

رہیں گے‘‘

پیاری نے کہا: ’’اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ بال بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھرو گے؟‘‘

دلاری بولی: ’’یہ کیسے ہو سکتا ہے بہن، یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں گے بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا دوڑ دوڑ کر گھر آئیں گے اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی پردیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا اتنے میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔‘‘

پیاری بولی: ’’تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو‘‘

دلاری اسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی کچھ روز زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی تھی اگر پردیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی: ’’بہن تو چلتی تو کیا بات تھی، پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا تم تو کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی‘‘

روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوا پوری پکائی، جب سے اس گھر میں آئی کبھی تو ایک روز کے لیے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ آج اس ہولناک موقع پر سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے۔ لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں، تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے، محبت و ہمدردی کو پیروں سے کچل ڈالے لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کھا کر پلی تھی اسے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بے قرار ہونے سے نہ

روک سکی۔ دلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی جیسے کوئی میلا دکھانے جا رہی تھی۔ نئی چیزوں کے دیکھنے، نئی دنیا کی سیر کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پیاری کے سر انتظام کا بار تھا۔ دھوبی سے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں۔ کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے۔ سفر خرچ کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی۔ ایک بچے کو کھانسی آ رہی تھی، دوسرے کو کئی روز سے دست آ رہے تھے ان دونوں کی دواؤں کو لوٹنا پیسا وغیرہ سینکڑوں کام اسے مصروف کیے ہوئے تھے۔ لاولد ہو کر بھی وہ بچوں کی داشت و پرداخت میں دلاری سے ہوشیار تھی ''دیکھو بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت، مارنے سے بچے ضدی اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بن جانا پڑتا ہے کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے کبھی ہنسنا پڑتا ہے اگر تم چاہو تو ہم آرام سے پڑے رہیں ورنہ بچے چپ بیٹھے رہیں ہاتھ پانو نہ ہلائیں تو یہ نہیں ہو سکتا بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں انہیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔ دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھڑکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔''

دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔

رخصت کا روز پیاری کے لیے امتحان کا دن تھا اس کے جی میں آتا تھا کہ کہیں چلی جائے تاکہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سونا ہو جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی، کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل لرز جاتا، جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے حواس معطل ہوتے جاتے تھے وہ کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی

کہ یہ لوگ اپنے ہوتے تو کیا اس طرح جاتے۔ یہ مانا کہنا تا ہے مگر کسی پر کوئی زور تو نہیں۔ دوسرے کے لیے کتنا ہی مرو پھر بھی اپنے نہیں ہوتے، پانی تیل میں کتنا ہی ملے، پھر بھی الگ ہی رہے گا۔ بچے نئے نئے کپڑے پہنے تو نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انہیں پیار کرنے کے لیے گود میں لینا چاہتی تھی تو رونے کا سا منہ بنا کر چھڑا کر بھاگ جاتے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر اکثر بچے بھی ایسے ہی بے مروت ہو جاتے ہیں۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے اس پر جا بیٹھے۔ گانو کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اس وقت ان کا آنا برا معلوم ہو رہا تھا وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل کر رونا چاہتی تھی متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا، تمہارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے؟ لیکن گڑبڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا متھرا اور دلاری دونوں گاڑیوں میں جا بیٹھے اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہ گئی وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ اسے گانو کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(6)

کئی روز تک پیاری بے ہوش سی پڑی رہی۔ نہ گھر سے نکلی، نہ چولہا جلایا نہ ہاتھ منہ دھویا اس کا بلایا جوکھو بار بار آ کر کہتا: ”مالکن، اٹھو، منہ ہاتھ دھولو، کچھ کھاؤ پیو، کب تک اس طرح پڑی رہو گی؟“

اس طرح کا تسلی گانو کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں لیکن ان کی تسلی میں ایک قسم

کے بغض کا انداز پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی ہمدردی جھلکتی تھی جوکھو کام چور باتونی اور نشہ باز تھا پیاری اسے برابر ڈانٹتی رہتی تھی دو ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جھنجھلائی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی پھل کانٹے دار درخت میں بھی ملیں تو کیا انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی زندگی کا کاروبار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو اور کھیتوں کو اٹھا دو لیکن پیاری کی وضع داری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کر سکتی تھی تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ ادھر متھرا کے خط و کتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے بھروسے بیٹھی ہوں یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعوا رکھتی ہوں اس کے بھیجنے سے مجھے کوئی خزانہ مل جاتا اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اس کی کب پروا کرتی ہوں گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی خربوزے بوئے تھے وہ خوب پھلے اور خوب بکے پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا اب بکنے لگا پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی زیوروں کا بھی شوق ہوا روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں

تالاب میں پانی جمع ہونے لگا اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں، کھلے ہوئے کمل بھی تھے ایک روز جوکھو کنویں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا پیاری نے پوچھا ''اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟''

جوکھو نے کہا: ''چار کیاریاں بچ رہی تھیں میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں کل کا جھنجھٹ کون رکھے۔''

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا پیاری سارے دن کنویں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی۔ اس لیے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا پیاری نے پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے کہا ''اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو''

''آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے کیا جلدی تھی؟''

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگزاری کی تھی اور وہ سمجھا تھا تعریف ہوگی یہاں اعتراض ہوا چڑ کر بولا ''مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو۔ جو بات نہیں سمجھتی ہو، اس میں کیوں کودتی ہو کل کے لیے تو اونچے کے کھیتے پڑے سوکھ رہے ہیں آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے، سویرے میں نہ پہنچتا تو کوئی اور آ کر ڈٹ جاتا پھر ہفتہ بھر تک راہ دیکھنی پڑتی تب تک تو سب اوکھ بدا ہو جاتی۔''

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی: ''ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر کہیں بیمار پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ

جائیں گے''

جوکھو: ''کون بیمار پڑ جائے گا بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا آئندہ کی نہیں جانتا کھورات بھر کام کرتا رہوں''

پیاری: ''میں کیا جانوں تمہیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے اور پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا پیٹ میں درد تھا''

جوکھو جھینپتا ہوا بولا: ''وہ باتیں جب تمہیں جب ملک لوگ چاہتے تھے اسے پیس ڈالیں اب تو جانتا ہوں میرے ہی سر ہے میں نہ کروں گا تو چوپٹ ہو جائے گا''

پیاری: ''میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی؟''

جوکھو: ''تم بہت کرو گی تو دو وقت چلی جاؤ گی تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتیں'' پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا بولی: ''اتنی رات گئے چولہا جلاؤ گے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟''

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا: ''تم بھی خوب کہتی ہو مالکن! اپنے پیٹ بھر کو تو ہوتا نہیں بیاہ کر لوں! سوا سیر کھاتا ہوں ایک وقت پورا سوا سیر دونوں وقت کے لیے ڈھائی سیر چاہیے۔''

پیاری: ''اچھا آج میری رسوئی میں کھاؤ دیکھو کتنا کھاتے ہو؟''

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا: ''نہیں مالکن! تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی۔ ہاں آدھ آدھ سیر کی دو روٹیاں پکا دو تو کھا لوں، میں تو یہی کرتا ہوں بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنا لیتا ہوں اور اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی میٹھے سے، کبھی پیاز سے کھا

لیتا ہوں اور آ کر پڑ رہتا ہوں''

پیاری: ''میں تمہیں آج پھلکے کھلاؤں گی''

جوکھو: ''تب تو ساری رات کھاتے ہی گزر جائے گی''

پیاری: ''بکو مت جلدی آ کر بیٹھ جاؤ''

جوکھو: ''ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں''

(7)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا: ''میں کہتی ہوں کہ دھان روپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جھڑی لگ جائے تو کھیت ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے، جوار، باجرا، سن، ارہر تو ہیں، دھان نہ سہی۔''

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا ''جب سب کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا، سب کا ڈوب جائے گا تو میرا بھی ڈوب جائے گا، میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں؟ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں روپا جاتا تھا برجو بھیا نے اس میں ایک دو بیگھے اور بڑھا دیے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت روپے تو کیا میں سب سے گیا گزرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤں گا۔''

''تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے''

''میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں دونوں کے برابر کام کیوں نہ کروں

گا؟‘‘

’’چل جھوٹا، کہیں کا، کہتا تھا دو سیر کھاتا ہوں، چار سیر کھاتا ہوں، آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔‘‘

’’کسی روز تولو تو معلوم ہو‘‘

’’تولا ہے، بڑے کھانے والے! میں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو، مزدور ملیں گے نہیں، تمھیں ہلکان ہونا پڑے گا‘‘

’’تمہاری بلا سے میں ہلکان ہوں گا نا! یہ بدن کس روز کام آئے گا‘‘

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی ’’پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہو گے نہ، میرا دل گھبرائے گا‘‘

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑ کر سو رہے، دل کیوں گھبرائے گا بولا: ’’جی گھبرائے تو سو رہنا میں گھر رہوں گا تب تو اور جی گھبرائے گا میں بیکار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے باتوں میں دیر ہو رہی ہے اور بادل گھرے آتے ہیں۔‘‘

پیاری نے کہا: ’’اچھا کل جانا آج بیٹھو‘‘

جوکھو نے گویا مجبور ہو کر کہا: ’’اچھا بیٹھ گیا کہو کیا کہتی ہو‘‘

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا ’’کہنا کیا ہے میں تم سے پوچھتی ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے میں اکیلی مرا کرتی ہوں تب ایک سے دو تو ہو جائیں گے‘‘

جوکھو شرماتا ہوا بولا: ’’تم نے پھر وہی بات چھیڑ دی مالکن! کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے‘‘

پیاری: ''یہ میں تھوڑا ہی کہتی ہوں کہ گہنا نہ مانگے ہاں میری جان نہ کھائے تم نے تو کبھی گہنے کے لیے ضد نہیں کی بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیے۔''

پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آ گیا بولی: ''اچھا اور کیا چاہتے ہو''

جوکھو: ''میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی''

پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی بولی ''بگڑنے کی بات ہو گی تو ضرور بگڑوں گی۔''

جوکھو: ''تو میں نہ کہوں گا''

پیاری نے پیچھے کی طرف ڈھیلتے ہوئے کہا ''کہو گے کیسے نہیں میں کہلا کر چھوڑوں گی۔''

جوکھو: ''اچھا تو سنو میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو، ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو، ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی کفایت شعار ہو، ایسی ہی ہنس مکھ ہو، بس ایسی مورت ملے گی تو بیاہ کروں گا، نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔''

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی ''تم بڑے دل لگی باز ہو''

☆☆☆☆☆☆

دو بیل

پہلی بار: ہندی میں ''دو بیلوں کی کتھا'' کے عنوان سے ''ہنس''

اکتوبر 1931ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1934ء (آخری تحفہ)

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے جب ہم کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بیوقوف ہے۔ یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوت برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتابی بھی غریب جانور ہے لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی آجاتا ہے مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا جتنا جی چاہے مارلو۔ چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو۔ پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا اس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے سکھ دکھ، نفع نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی منیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں۔ سب اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن آدمی اسے بیوقوف کہتا ہے۔ اعلا خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دنیا میں سیدھے پن کے لیے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے جس اس سے کچھ کم ہی گدھا ہے اور وہ

ہے بیل جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو بیل کو بیوقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں مگر ہمارا خیال ایسا نہیں بیل کبھی کبھی مارتا ہے کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے لہذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے ایک کا نام ہیرا تھا دوسرے کا موتی دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت کام میں چوکس ڈیل ڈول میں اونچے بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ہوگئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں کر سمجھ جاتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابل فہم قوت تھی جس کے سمجھے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے وک چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے محض ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتا ہے اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند

میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے۔ ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹالیتا تو دوسرا بھی ہٹالیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لیے اپنے سسرال بھیجے، بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں پسینہ آ گیا پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کے زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا تو اور کام لے لیتے ہم کو انکار نہ تھا ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا قبول تھا ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھالیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا؟

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں میں جا پہنچے دن بھر کے بھوکے تھے لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا یہ نیا گھر نیا گاؤں نئے آدمی سب انہیں بے گانے لگتے تھے دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔

جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لیے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے مضبوط تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے

پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باؤلا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا مگر اہم ضرور تھا بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گڑ کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا ''ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے''

دوسرے نے تائید کی ''اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے''

تیسرا بولا ''پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے''

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی سب نے کہا

''ہاں بھائی ضرور ہوں گے''

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی اور بولی:

کیسے نمک حرام بیل ہیں ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا بولا ''نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہو گیا کیا کرتے؟''

عورت نے تنگ آ کر کہا ''بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔''

جھوری نے چڑھا دچارہ ملتا، تو کیوں بھاگتے؟

عورت چڑھی ''بھاگے اس لیے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں کھلاتے ہیں، تو، توڑ کر جوتتے بھی ہیں، یہ دونوں ٹھہرے کام چور، بھاگ نکلے، اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے، خشک بھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہے مریں۔''

وہی ہوا مزدور کو تاکید کر دی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکناہٹ نہ رس کیا کھائیں؟ پر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا ''تھوڑی سے کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے؟''

مزدور ''مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی''

جھوری ''ڈال دے تھوڑی سی''

مزدور ''نہ دادا بعد میں تم بھی انہی کی سی کہو گے''

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا مگر ہیرا نے سنبھال لیا اس وقت دونوں میں قوت برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب

کچھ کھلایا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے یہاں مار پڑی اس پر خشک بھوسہ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی وہ مارتے مارتے تھک گیا مگر انہوں نے قدم نہ اٹھایا ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے بھاگا، ہل رسی اور جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں تو دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا ''بھاگنا مشکل ہے''

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا ''تمہاری تو اس نے جان لے لی تھی اب کے بڑی مار پڑے گی''

ہیرا ''پڑنے دو بیل کا جنم لیا ہے، تو مار سے کہاں بچیں گے''

گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی ''کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزا؟''

ہیرا ''نہیں بھائی کھڑے ہو جاؤ''

موتی ''مجھے مارے گا، تو میں ایک آدم کو گرا دوں گا''

ہیرا ''یہ ہمارا دھرم نہیں ہے''

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا اتنے میں گیا آپہنچا اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا

خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی نہیں تو موتی بھی تیار تھا اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا اور اس کے ساتھ سمجھ گئے کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسا لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لیے نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحب دل رکھتا ہے یہ لڑکی گیا کی تھی اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اسے مارتی تھی اس لیے ان بیلوں سے اسے ہمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے، اڑے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیے جاتے اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا ''اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا''

ہیرا کیا کرنا چاہیے؟

موتی ''گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں؟''

ہیرا ''مگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے اسے مار کر گراؤ گے تو وہ یتیم ہو جائے گی''

موتی ''تو مالکن کو پھینک دوں، وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے''

ہیرا ''عورت کو مارو گے بڑے بہادر ہو''

موتی ''تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں''

ہیرا ''ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر؟''

موتی ''پہلے رسی کو چبا لو پھر جھٹکا دے کر تڑا لو''

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی دونوں رسیاں چبانے لگے پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی بیچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی نکلی دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے دونوں کی دمیں کھڑی ہو گئیں۔اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی۔

کھول دیتی ہوں، بھاگ جاؤ، نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے، آج گھر میں مشہور رہو رہا ہے کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں۔

اس نے دونوں کے رسے کھول دیے پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا ''اب چلتے کیوں نہیں؟''

ہیرا نے جواب دیا ''اس غریب پر آفت آجائے گی سب اسی پر شبہہ کریں گے''

یکا یک لڑکی چلائی اور دادا او دادا دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں دوڑو، دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا بیل بھاگے گیا نے پیچھا کیا وہ اور بھی تیز ہو گئے گیا نے شور مچایا پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کے لیے لوٹا، دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا سیدھے دوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ راستہ کا خیال نہ رہا جس راہ سے یہاں آئے تھے اس کا پتہ نہ تھا نئے نئے گاؤں

ملنے لگے تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا ''معلوم ہوتا ہے راستہ بھول گئے''

موتی ''تم بھی بے تحاشا بھاگے وہیں اسے مار گراتے''

ہیرا '' اسے مار گراتے تو دنیا کیا کہتی وہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن ہم اپنا دھرم کیونکر چھوڑ دیں۔''

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے کھیت میں مٹر کھڑی تھی چرنے لگے۔ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے کہ کوئی آتو نہیں رہا جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا تو اچھلنے کودنے لگے پہلے ڈکار لی پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا تب اسے بھی غصہ آیا سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا موتی نے دیکھا کہ کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے تو ایک طرف ہٹ گیا۔

ارے یہ کیا کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے ہاں سانڈ ہی تو ہے وہ سامنے آ پہنچا دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔

سانڈ بھی پورا ہاتھی اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی انہیں کی طرف آ رہا تھا کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا ''برے پھنسے جان کیسے بچے گی؟ کوئی طریقہ سوچو''

ہیرا نے کہا ''غرور سے اندھا ہو رہا ہے منت ساجت کبھی نہ سنے گا''

موتی ''بھاگ کیوں نہ چلیں؟''

ہیرا ''بھاگنا پست ہمتی ہے''

موتی ''تو تم یہیں مرو بندہ تو دو گیارہ ہوتا ہے''

ہیرا ''اور جو دوڑ آئے تو پھر؟''

موتی کوئی طریقہ بتاؤ لیکن ذرا جلدی وہ تو آپہنچا

ہیرا طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہو گا جونہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا جونہی ہیرا پر جھپٹا موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کیا سانڈ چاہتا تھا ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے پر یہ بھی استاد تھے اسے یہ موقع ہی نہ دیتے تھے ایک مرتبہ سانڈ جھلا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا تو موتی نے بغل سے آ کر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیے بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا اور دونوں فتح یاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا ''میرا جی تو چاہتا تھا کہ بچہ جی کو مار ہی ڈالوں''

ہیرا ''گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے''

موتی ''یہ سب فضول ہے اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا''

ہیرا ''اب کیسے گھر پہنچو گے؟ یہ سوچو؟''

موتی ''پہلے کچھ کھالیں تو سوچیں ابھی تو عقل کام نہیں کرتی''

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا لیکن اس نے ایک نہ سنی، ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لیے آ گئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا ہیرا تو مینڈ پر تھا نکل گیا موتی کھیت میں تھا اس کے کھر کیچڑ میں دھنسنے لگے نہ بھاگ سکا پکڑا گیا ہیرا نے دیکھا دوست تکلیف میں ہے تو لوٹ پڑا پھنسیں گے، تو اکٹھے رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گذر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیسا مالک ہے اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے سارا دن دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر چارہ لے کر نہ آیا تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی؟

جب رات کو بھی کھانا نہ ملا، تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے موتی سے بولا ''مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے''

موتی ''اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو''

ہیرا ''آؤ دیوار توڑ ڈالیں''

موتی ''مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا''

ہیرا ''بس اسی بوتے پر اکڑتے تھے''

موتی ''ساری اکڑ نکل گئی بھائی''

باڑے کی دیوار کچی تھی ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیے اور زور مارا تو مٹ کا ایک چپڑ نکل آیا اسے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں ہر ٹکر میں تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آ نکلا ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کیے اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا گویا زبان حال سے کہا آخر مار کھا لی کیا ملا

ہیرا ''زور تو آزما لیا''

موتی ''ایسا زور کس کام کا اور بندھن میں پڑ گئے''

ہیرا ''اس سے باز نہ آؤں گا خواہ بندھن بڑھتے جائیں''

موتی ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''

ہیرا ''اس کی مجھے پروا نہیں یوں بھی تو مرنا ہے ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی، تو کتنی جانیں بچ جاتیں اتنے بھائی یہاں بند ہیں کسی کے جسم میں جان بھی نہیں دو چار دن یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے۔''

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا تھوڑی سی مٹی گری اور ہمت بڑھی تو

وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو آخر کوئی دو گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اٹھ کھڑے ہوئے تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں بھیڑ بکریاں نکلیں اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا ''تم کیوں نہیں جاتے؟''

ایک گدھے نے کہا ''کہیں پھر پکڑ لیے جائیں تو؟''

ہیرا ''پکڑ لیے جاؤ تو پھر دیکھا جائے گا اس وقت تو موقع ہے''

گدھا ''ہمیں ڈر لگتا ہے ہم نہ بھاگیں گے''

آدھی رات گذر چکی تھی دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے بھاگیں یا نہ بھاگیں موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ''تم مجھے خود غرض سمجھتے ہو ہیرا، ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں''

ہیرا ''بہت مار پڑے گی سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے''

موتی ''جس قصور کے لیے تمہارے گلے میں رسا پڑا، اس کے لیے اگر مجھ پر مار پڑے گی تو کیا بات ہے اتنا تو ہو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی''

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست

کے پاس آکر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسی سے باندھ دیا گیا۔

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے خدا جانے اسے کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے، کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا یہی ان کی خوراک تھی دونوں اتنے کمزور ہو گئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی لوگ آ آ کر ان کی صورت دیکھتے اور چلے جاتے تھے ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا؟

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرہ پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اٹھے۔وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے؟ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا ''گیا کے گھر سے ناحق بھاگے اب جان نہ بچے گی''

موتی نے جواب دیا '' کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں'' انہیں

ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟

ہیرا ’’بھگوان کے لیے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہیں‘‘

موتی ’’چلو اچھا ہے کچھ دن ان کے پاس رہیں گے‘‘

ہیرا ’’ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا کیا اب نہ بچائیں گے‘‘

موتی ’’یہ آدمی چھری چلائے گا دیکھ لینا‘‘

ہیرا ’’معمولی بات ہے مر کر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے‘‘

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی بیچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے کوئی اچھلتا تھا کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا کیسی پرمسرت زندگی تھی لیکن وہ کیسے خودغرض تھے کسی کو ان کی پروانہ تھی کسی کو خیال نہ تھا، کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً نہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ راستہ دیکھا ہوا ہے ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا وہ کھیت ہیں وہی باغ وہی گاؤں اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہوگئی ارے، یہ تو اپنا کھیت آ گیا، یہ اپنا کنواں ہے جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا ’’ہمارا گھر نزدیک آ گیا‘‘

ہیرا بولا ’’بھگوان کی مہربانی ہے‘‘

موتی ’’میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں‘‘

ہیرا ’’یہ جانے بھی دے گا اتنا سوچ لو‘‘

موتی ’’اسے مار گراتا ہوں جب تک سنبھلے تب تک گھر جا پہنچیں گے‘‘

ہیرا ’’نہیں دوڑ کر تھان تک چلو وہاں سے آگے نہ چلیں گے‘‘

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انہیں پیار کرنے لگا بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا دوسرا پیر،

اس آدمی نے آ کر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں جھوری نے کہا ’’یہ بیل میرے ہیں‘‘

’’تمہارے کیسے ہیں میں نے نیلام میں لیے ہیں‘‘

جھوری ’’میرا خیال ہے چرا کر لائے ہو چپکے سے چلے جاؤ بیل میرے ہیں میں بیچوں گا تو بکیں گے، کسی کو میرے بیل کو بیچنے کا کیا حق ہے؟‘‘

میں نے تو خریدے ہیں

’’خریدے ہوں گے‘‘

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا اسی وقت موتی نے سینگ چلایا وہ آدمی پیچھے ہٹا موتی نے تعاقب کیا اور اسے ریلتا ہوا گاؤں کے

باہر تک لے گیا اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا وہ آدمی دوڑ کھڑا دھمکیاں دیتا تھا گالیاں دیتا تھا پتھر پھینکتا تھا اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا ''میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو''

موتی ''اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا''

ہیرا ''اب نہ آئے گا''

موتی ''آئے گا تو دور ہی سے خبر لوں گا دیکھوں کیسے لے جاتا ہے''

ذرا دیر میں ناند میں کھلی بھسو چوکر دانہ سب کچھ بھر دیا گیا دونوں بیل کھانے لگے۔

جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا اور خوش ہوتا تھا بیسوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے سارا گاؤں مسکراتا معلوم ہوتا تھا۔

اسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لیے۔

☆☆☆☆☆☆

ادیب کی عزت

پہلی بار: ہندی میں ''لیکھک'' کے عنوان سے ''ہنس'' نومبر 1931ء میں شائع ہوا
اردو میں ماہنامہ ''چندن'' دسمبر 1931ء میں
کتابی صورت میں: 1934ء (آخری تحفہ)

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ ابالی ہوئی چائے کا پیالہ تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتہ تھا دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریات زندگی میں نہ تھی گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں پر اسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا چپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انہوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے۔ جو ان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی جس کی اشاعت ان کی قعر گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دے گی آدھ گھنٹہ کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آ کر بولی

''چائے پی چکے؟''

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا ''ہاں پی چکا، بہت اچھی بنی تھی''

''مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے؟''

''آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں یہ تو ہمارے ہاں کے چینی نواز رئیسوں کی ایجاد ہے۔''

''نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے مجھے جگا کیوں نہ لیا پیسے رکھے تھے۔''

قمر نے جواب نہ دیا اور پھر لکھنے لگے جوانی ہی میں انہیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے اس بے نیازی کی شان سے، جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے انہوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیر لیا۔ مگر یہ مرض لا علاج ہے طلوع آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے دل تو ایک ہی تھا۔ دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیوں کر خوش کرتے اور لکشمی کی ناراضی صرف افلاس کی شکل و صورت ہی میں ظاہر نہ ہوتی تھی، بلکہ اس کی سب سے بھیانک صورت یہ تھی، کہ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر بھی دل کھول کر داد نہ دیتے تھے جیسے ساری دنیا نے ان کے خلاف سازش کر لی ہو۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے اوپر مطلق اعتماد نہ تھا، اور اب انہیں یہ شبہہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تا۔ یہ عمر عزیز یوں ہی تلف ہو گئی۔ یہ تسکین بھی نہیں، کہ دنیا نے ناقدری کی ہو۔ مگر ان کا کارنامہ حیات حقیر نہیں ضروریات

زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں اگر کوئی تسکین تھی ،تو محض یہ کہ ان کی رفیقہ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی۔اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔

سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا۔

''تو جا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے جب معلوم ہو گیا ،کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بیکار کیوں سر کھپاتے ہو؟''

قمر نے بغیر قلم اٹھائے ہوئے کہا'' لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے''

''یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی جو ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟''

''مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے میں تو مل کا مزدور ہوں م نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے جنہیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے جنہیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے''

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے اور اندر

چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا اس تپ کا پھل ایک دن انہیں ضرور ملے گا، دولت حاصل ہو یا نہ ہو لیکن قمر صاحب یاس کی اس حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمت مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(2)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں محو رہے راجہ صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے کن مضامین پر گفتگو ہو گی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا سارا دن وہ انہیں خیالات کے لطف اٹھاتے رہے اس موقع کے لیے انہوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں انہوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی سراب ہستی ان کے زور طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی۔ مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انہوں نے تیاریاں شروع کیوں حجامت بنائی، صابن سے نہائے، سر میں تیل ڈالا دقت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری، جب انہوں نے ایک اچکن بنوائی تھی، اس کی حالت بھی ان کی سی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انہیں زکام یا سر درد ہو جاتا تھا اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی اسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا ''تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا، لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی برا ہے۔''

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا ''جنہیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے ان کے ہنر دیکھتے ہیں آخر کچھ بات تو ہے کہ راجہ صاحب نے مدعو کیا ہے میں کوئی عہدے دار نہیں زمیندار نہیں، جاگیر دار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں اس نقطہ نگاہ سے مجھے کسی شاعر کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں''

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی ''تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بے گانہ ہو گئے ہو میں کہتی ہوں راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔''

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہل نظر کی طرح انہیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس وپیش نہ ہوتا تھا بولے:

''میرا خیال ہے چراغ جل جانے کے بعد جاؤں''

''میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟''

''اب تم کو کیسے سمجھاؤں ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے اس لیے جاہ و رفعت علم و فضل

کی جانب ہمارا فطری میلان ہے میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ہاں چونکہ دل میں ضعف ہے اہل دنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامنگیر ہو جاتا ہے۔''

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لیے کہا'' اچھا بھئی جاؤ میں تم سے بحث نہیں کرتی لیکن کل کے لیے کوئی سبیل سوچتے جاؤ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جس سے لیا اسے دینے کی نوبت نہیں آئی مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا'' دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے شاید کل تک آجائے اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے ہمارا فرض کام کرنا ہے ہم کام کرتے ہیں اور دل وجان سے کرتے ہیں اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے ،تو میرا قصور نہیں۔مر ہی تو جاؤں گا ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔میں تو کبیر پنھتیوں کا قائل ہوں۔جو گاتے بجاتے ہوئے جنازے کو لے جاتے ہیں میں موت سے نہیں ڈرتا۔تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے بیٹھا رہتا ہوں لوگ سیر وتفریح کرتے ہیں کھیلتے کودتے ہیں میرے لیے سب کچھ حرام ہے یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی بیمار ہوتا ہوں جب بھی لکھتا ہوں سوچو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں چراغ کا کام جلنا ہے اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے اسے اس سے

مطلب نہیں میرا ابھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندہ احسان نہیں یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بد نیت تصور نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں مگر انہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔''

پھر معاًان پر نشہ سا چھا گیا غرور سے بولے:

نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا میرا افلاس رسوا کی حد تک پہنچ چکا ہے اس کی پردہ پوشی بیکار ہے میں اسی وقت جاؤں گا جسے راجہ لوگ مدعو کریں وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا راجہ صاحب معمولی رئیس نہیں وہ اسی شہر کے نہیں ہندوستان بھر کے مشہور آدمی ہیں اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے تو اس کا عقل کا فتور ہے۔

(3)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن، اور سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اچکے سے معلوم ہوتے تھے ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود ایک بارعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں لوچ نہیں، دل نہیں، پھر بھی اکڑے جاتے تھے ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اتار کر رکھ دیں حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا پر جی نہ بھرا تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے بہت دن ہوئے قمر کو دیکھ کر بولے واہ حضرت، ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں تو دیوالہ نکل جائے اب تو دن بہت ہو گئے۔

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں دل کی مراد پوری ہوئی بولے ''میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا روپیہ تو ہاتھ نہیں آتا پر آپ کی دعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں زندگی وبال ہے اس وقت بھی راجہ صاحب۔۔۔۔۔۔اجی وہی جو ٹکڑے والے بنگلے میں رہتے ہیں انہیں کے یہاں جا رہا ہوں، روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقعہ آتا رہتا ہے۔''

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے۔۔۔۔''اچھا، آپ راجا صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ٹھیک ہے آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں اور کون کرے گا سبحان اللہ! آپ اس وقت یکتا ہیں، اگر کوئی موقع ہاتھ آئے تو

غریب کو بھول نہ جایئے گا۔ راجہ صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھا، ایک پورا بساط خانہ تو ان ہی کے لیے درکار ہے، ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔''

قمر صاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے'' ڈھائی تین لاکھ تو آپ انہیں گالیاں دیتے ہیں ان کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے مکان ہے، دکانیں ہیں، ٹھیکہ ہے امانتی روپے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔''

حافظ نے بڑے عجز سے کہا یہ دکان آپ کی ہے جناب بس اتنی ہی عرض ہے، اے مرادی، ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوالا آپ کے لیے، آیئے دو منٹ بیٹھیے، کوئی چیز دکھاؤں گا آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا'' اس وقت تو معاف رکھیے وہاں دیر ہوگی، پھر کبھی حاضر ہوگا۔''

یہاں سے اٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رکے منوہر داس نام تھا انہیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے سمجھا روپے دینے آئے ہیں بولا۔

بھائی، آپ نے تو بہت دن سے درشن ہی نہیں دیے۔ کئی بار رقعہ بھیجا، مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتہ نہ تھا منیم جی ذرا دیکھو تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی، لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے

جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا بولے ”ذرا راجہ صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بے فکر ہو کر بیٹھوں اس وقت نہیں جلدی میں ہوں“

راجہ صاحب پر منوہر داس کے کئی سو روپے نکلتے تھے پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا ایک کے تین وصول کرتا اس نے قمر کو بھی اسی جماعت میں رکھ لیا جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے بولا:

”پان تو کھاتے جایئے جناب! راجہ صاحب ایک دن کے ہیں، ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جایئے، عید آ رہی ہے موقع ملے تو راجہ صاحب کے خزانچی سے کہنا“ پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے، اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کونسا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔

قمر بولے ”اس وقت تو پان وان رہنے دو بھائی دیر ہو جائے گی جب انہیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انہیں تکلیف نہ ہونے دوں ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں، دولت کے بھوکے نہیں کوئی ہمیں چاہے تو ہم اس کے غلام ہیں کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔“

(4)

حضرت قمر راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے

تھے ایک صاحب مہمان کا استقبال کر رہے تھے قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے، پھر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے ''آپ کے پاس کارڈ ہے؟''

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا، مگر اس مطالبے پر انہیں غصہ آ گیا، انہی سے کیوں کارڈ مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں بولے

''میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں، اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا، قمر آیا تھا، لوٹ گیا۔''

وہ بولے ''نہیں نہیں جناب، اندر چلیے، آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمایئے، آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے، خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!''

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہر ایک مصنف، ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی ادیب اس داد سے مستثنٰی نہیں۔

قمر اندر پہنچے تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطے میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری پری کے سر پر فوارہ فوارے کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے قوس قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں میزوں پر سفید میز پوش ان پر خوبصورت گلدستے۔

قمر کو دیکھتے ہی راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا'' آیئے آیئے، اب کے انیس

ہند میں آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔''

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے ''آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے، کیا تخیل ہے؟ کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کرنا چنے لگتا ہے۔''

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور رہو اور بولے ''آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا، بائرن، شیلے، ٹینیسن وغیرہ؟''

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا ''جی ہاں تھوڑا بہت دیکھا ہے''

''آپ ان استادان فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔''

قمر اپنے آپ کو بائرن شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے بولے ''ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کے بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔''

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا راجہ صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں ذرا موقع ومحل دیکھ کر باتیں کرو اور بولے ''انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔''

انگریزی پوش ''ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے کیا معنی ہیں وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں''

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ''میرا خیال ہے، آپ نے ہندوستانی شعراء کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں''

راجہ صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کیا اور بولے '' آپ مسٹر پرنچے ہیں، آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں چھپتے ہیں اور لوگ انہیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں''

اس کے معنے یہ ہیں، کہ اب آپ زیادہ نہ بہکیے غریب قمر کو پرنچے کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ ایک اور دیسی صاحب آئے راجہ صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا '' آیئے ڈاکٹر چڈھا مزاج تو اچھے ہیں؟''

چڈھا صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا اور قمر کی طرف دیکھ کر بولے '' آپ کی تعریف؟''

راجہ صاحب نے قمر کا تعارف کرایا '' آپ حضرت قمر شاعر ہیں''

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا '' اچھا! آپ شاعر ہیں'' اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشہ کئی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی '' اچھا آپ شاعر ہیں''

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا ان عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا '' تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو پکاؤ یہاں تمہارا کیا کام؟ تمہارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ''

قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت

سے کم نہ تھا انہوں نے اپنے آپ کو طعن کی ''تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ وکیل، بیرسٹر تمہارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے موکل نہیں ہو سکتے ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں؟ انہیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں تم لکھنے کے لیے بنے ہو لکھتے جاؤ۔ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں۔''

یکا یک لوگوں میں ہل چل مچ گئی آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا، وہ آ گئے۔ یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے

راجہ صاحب نے لپک کر ان سے ہاتھ ملایا اور قمر سے بولے ''آپ اپنی نظم تو لکھ ہی لائے ہوں گے؟''

قمر نے جواب دیا ''میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی''

سچ اب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا ارے بھلے آدمی، تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقع پر ایک آدھ نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔

''میں اس قدر جلد کوئی چیز نہیں لکھ سکتا''

''میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا''

''بالکل بیکار''

''ارے بھائی جان، کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجیے یہاں کون جانتا ہے''

''جی نہیں، معاف فرمایئے میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں'' یہ کہتے کہتے

حضرت قمر وہاں سے چل دیے۔

گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا

''اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟''

''میری وہاں ضرورت نہ تھی''

''چہرہ کھلا ہوا ہے، خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی؟''

''ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی''

''خوب خوش ہو رہے ہو؟''

''اس لیے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے بنا ہوں میں یہ بات بھول گیا تھا مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لیے جنت ہے میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔''

☆☆☆☆☆☆

نجات

پہلی بار: ہندری میں ''سدگئی'' کے عنوان سے ''وشال بھارت'' 1931ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: ''اردو میں، 1934ء (آخری تحفہ)''

دکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا، اور اس کی بیوی جھریا گھر کو لیپ کر رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے، تو چمارن نے کہا

''تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ، ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں''

دکھی ''ہاں جاتا ہوں، لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟''

جھریا ''کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی ٹھکرانی سے مانگ لانا''

دکھی ''تو تو کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگوں، تو نہ ملے بھلا کھٹیا کون دے گا ہمارے اوپلے ایندھن، بھوسا، لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھا لے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے گی گرمی کے تو دن ہیں ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی''

جھریا ''ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے دیکھتے نہیں، کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں''

دکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا ''ہاں، یہ بات تو ہے مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنا لوں، تو ٹھیک ہو جائے۔ پتل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں وہ پاک

ہے، لاتو لاٹھی، پتے توڑلوں۔"

جھریا" پتل میں بنالونگی تم جاؤ لیکن ہاں انہیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی چھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں غصہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے پتل میں سیدھا بھی دے دینا، مگر چھونا مت، بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور، سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، ہلدی، نمک اور پتل میں ایک کنارے چار آنے کے پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے، تو پھر جن کے ہاتھ جوڑ کر لے آنا تم کچھ نہ چھونا ورنہ غجب ہو جائے گا۔"

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اٹھالی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا اسے خالی دیکھ کر تو بابا جی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

(2)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے نیند کھلتے ہی ایشور کی اپاسنا میں لگ جاتے۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے آٹھ بجتے۔ تب اصلی پوجا شروع ہوتی، جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے

کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا، پھر سینہ پر دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے، اور گھنٹی بجاتے، دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار ججمان دروازے پر آ جاتے۔ اشیور اپاسنا کافی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت آداب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی، چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی تھی، دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے ''آج کیسے چلا آیا رے دکھیا؟''

دکھی نے سر جھکا کر کہا ''بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے کب مرجی ہو گی؟''

گھاسی ''آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے شام تک آ جاؤں گا''

دکھی ''نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے سب ٹھیک کر آیا ہوں یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟''

گھاسی ''اس گائے کے سامنے ڈال دے اور ذرا جھاڑو لے کر دروازہ تو صاف کر دے یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی اسے بھی گوبر سے لیپ دے

تب تک میں بھوجن کرلوں، پھر ذرا آرام کر کے چلوں گاہاں، یہ لکڑی بھی چیر دینا۔

کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے اسے بھی اٹھالانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا''

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا دروازے پر جھاڑو لگائی بیٹھک کو گوبر سے لیپا اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی، لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بیچارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرم تھی جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزمالیا تھا وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار تھی دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا ہے لڑکی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی یہاں کس کس کی کلہاڑی کا ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا تھا کلہاڑی اچٹ جاتی، پسینہ سے تر تھا ہانپتا تھا تھک کر بیٹھ جاتا تھا پھر اٹھتا تھا، ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے ہوائیاں اڑ رہی تھیں، پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا، تو شاید کچھ طاقت آجاتی، اس نے سوچا، یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا برہمنوں کا گاؤں ہے برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا خیر محنت سپھل ہوئی اس نے تمباکو اور چلم دی لیکن آگ وہاں نہ تھی دکھی نے کہا۔

'' آگ کی فکر نہ کرو بھائی پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا وہاں تو

ابھی رسوئی بن رہی تھی‘‘

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازے پر کھڑا ہو کر بولا ’’مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں‘‘

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے پنڈتانی نے پوچھا ’’یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟‘‘

’’ارے وہی سسرا دکھیا چمار ہے کہا ہے تھوڑی سی لکڑی چیر دے آگ ہے تو دے دو‘‘

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا ’’تمہیں تو جیسے پوتھی پڑے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی چمار ہو، دھوبی ہو، پاسی ہو، منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا کوئی سرائے ہوئی کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے، ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔‘‘

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا ’’اندر آ گیا تو کیا ہوا تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی زمین پاک ہے ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑتا، تو کم از کم چار آنے لیتا‘‘

پنڈتانی نے گرج کر کہا ’’وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟‘‘

پنڈت نے ہار کر کہا ’’سسرے کی بدقسمتی تھی‘‘

پنڈتانی ’’اچھا، اس وقت تو آگ دیے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی‘‘

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی بے چارا پچھتا رہا تھا ناحق

آیا سچ تو کہتی ہیں، پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں، تبھی تو اتنا مان ہے، چر چمار تھوڑے ہی ہیں، اسی گاؤں میں بوڑھا ہوگیا مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی اسی لیے جب پنڈتانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔

''پنڈتانی ماتا، مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر سے چلا آیا، چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟''

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی انہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلے پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی ایک بڑی سے چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا اس کے دل نے کہا یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں، برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے، گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آ کر اس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہوگیا کھٹ کھٹ کر آوازیں آنے لگیں سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈتانی کو کچھ رحم آ گیا پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے بھوکا ہو گا۔

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا

''روٹیاں ہیں؟''

پنڈتانی ''دو چار بچ جائیں گی''

پنڈت ''دو چار روٹیوں سے کیا ہوگا؟ یہ چمار ہے، کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا''

پنڈتانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں ''ارے باپ رے! سیر بھر! تو پھر رہنے دو''

پنڈت جی نے اب شیر بن کر کہا'' کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا انہیں تو جوار کا ٹکر چاہئے''

پنڈتانی نے کہا ''اب جانے بھی دو دھوپ میں مرے''

(3)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی تقریباً آدھ گھنٹے تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اتنے میں وہی گونڈ آ گیا بولا ''بوڑھے دادا، جان کیوں دیتے ہو، تمہارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی ناحق ہلکان ہوتے ہو۔''

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا'' بھائی! ابھی گاڑی پر بھوسہ ڈھونا ہے''

گونڈ'' کچھ کھانے کو بھی دیا، یا کام ہی کروانا جانتے ہیں، جا کے مانگتے کیوں

نہیں؟''

دکھی ''تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو بھلا باہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟''

گونڈ ''پچنے کوتو پچ جائے گی، مگر ملےتو، خود مونچھوں پرتا ؤدے کر کھانا کھایا اور آرام سے سورہے ہیں تمہارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا زمیندار بھی کھانے کو دیتا ہے حاکم بھی بیگار لیتا ہے،تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے یہ ان سے بھی بڑھ گئے اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔''

دکھی نے کہا ''بھائی آہستہ بولو کہیں سن لیں گےتو بس''

یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا گونڈ کو اس پر رحم آگیا کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا،لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہوا بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا ''یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے''

دکھی سوچنے لگا یہ گانٹھ انہوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں کام کاج والا گھر ہے، ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے مگر انہیں ان کی کیا فکر، چلو، جب تک بھوسہ ہی اٹھالاؤں۔ کہہ دوں گا، آج تو لکڑی نہیں پھٹی کل آکر پھاڑوں گا۔

اس نے ٹوکرا اٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا اگر ٹوکرا خوب خوب بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا مگر سر پر اٹھاتا کون خود اس سے نہ اٹھ سکتا تھا، اس لیے تھوڑا تھوڑا لانا پڑا۔ چار بجے کہیں بھوسا ختم ہوا پنڈت جی کی نیند بھی کھلی منہ ہاتھ دھوئے، پان کھایا اور باہر نکلے دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر

رکھے سو رہا ہے زور سے بولے۔

''ارے دکھیا! تو سو رہا ہے لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے اتنی دیر تو کیا کرتا رہا۔ مٹھی بھر بھوسہ اٹھانے میں شام کر دی اس پر سو رہا ہے، کلہاڑی اٹھا لے اور لکڑی پھاڑ ڈال تجھ سے ذرا بھر لکڑی بھی نہیں پھٹی پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی مجھے دوش مت دینا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جہاں نیچ کے گھر کھانے کو ہوا اس کی آنکھ بدل جاتی ہے۔''

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھالی جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں، وہ سب بھول گیا پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا فرصت ہی نہ ملی اٹھنا بیٹھنا تک پہاڑ معلوم ہوتا تھا دل ڈوبا جاتا تھا پر دل کو سمجھا کر اٹھا پنڈت ہیں، کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں، تو پھر ستیہ ناس ہو جائے، جب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے جسے چاہیں بنا دیں جسے چاہیں بگاڑ دیں پنڈت جی گانٹھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

''ہاں مار کس کے اور کس کے مارا بے زور سے مار تیرے ہاتھ میں تو جیسے دم ہی نہیں لگا کس کے، کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے اس سوراخ میں''

دکھی اپنے ہوش میں تھا نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تکان، بھوک، پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں اسے اپنے قوت بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی آدھ گھنٹے تک وہ اسی بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی

کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔
بھوکا، پیاسا، تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی نے پکارا

اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے پتلی پتلی چپلیاں ہو جائیں

دکھی نہ اٹھا۔

پنڈت جی نے اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا اندر جا کر بوٹی چھانی حاجات ضروری سے فارغ ہوئے۔نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے دکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا زور سے پکارا ارے دکھی، کیا پڑے ہی رہو گے؟ چلو تمہارے ہی گھر چل رہا ہوں سب سامان ٹھیک ہے نا؟

دکھی پھر بھی نہ اٹھا

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوا پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔بدحواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے ''دکھیا تو جیسے مر گیا''

پنڈتانی جی ''تعجب انگیز لہجہ میں بولیں'' ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا!

''ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا اب کیا ہو گا؟''

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا ''ہو گا کیا چمروے میں کہلا بھیجو، مردہ اٹھا لے جائیں''

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے صرف ایک گھر گونڈ کا تھا لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا کنوئیں کا راستہ ادھر ہی سے تھا پانی کیونکر بھرا جائے چمار کی لاش کے پاس سے ہو کر پانی بھرنے کون جائے ایک

بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا ''اب مردہ کیوں نہیں اٹھواتے کوئی گاؤں میں پانی پیے گا یا نہیں؟''

ادھر گونڈ نے چمروے میں جا کر سب سے کہہ دیا خبردار! مردہ اٹھانے مت جانا ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے لاش اٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے پر چمروے میں کوئی آدمی لاش اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آ کر سر پیٹ کر رونے لگیں ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی، پر چمار ایک بھی نہ تھا پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا، کہ ایک بھی مَن نہ سکا آخر نا امید ہو کر لوٹ آئے۔

(4)

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا مگر لاش اٹھانے کو کوئی چمار نہ آیا اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھائے بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہے، کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا ''ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔''

پنڈت نے کہا ''چڑیلوں کو رونے دو کب تک روئیں گی، جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا، مر گیا تو شور وغل مچانے کے لیے سب کی سب آ پہنچیں۔''

پنڈتانی ''چماروں کا رونا منحوس ہے''

پنڈت ''ہاں بہت منحوس''

پنڈتانی ''ابھی سے بو آنے لگی''

پنڈت ''چمار تھا سسرا کہیں کا ان سبھوں کو کھانے پینے کا کوئی بچار نہیں ہوتا''

پنڈتانی ''ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی''

پنڈت ''سب کے سب بھرشٹ ہیں''

رات تو کسی طرح کٹی، مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا، چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی بدبو پھیلنے لگی۔

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا، اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔

وہاں سے آ کر فوراً نہائے، درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

☆☆☆☆☆☆

طلوع محبت

پہلی بار: ہندی میں ''پریم کا ادے'' کے عنوان سے ''ہنس'' 1931ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: اردو میں، 1934ء، (آخری تحفہ)

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑیوں کا گٹھا سر پر لیے آیا اور اسے زمین پر پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا، گویا زبان حال سے پوچھ رہا تھا ''کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا؟''

شام ہو گئی تھی پھر بھی لو چلتی تھی اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی اور سمجھا تھا اس تپسیا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔ لیکن آکر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا ''ایک پانی کا لوٹا دے دے بڑی پیاس لگی ہے، مر گیا سارے دن میں، بجار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے''

بنٹی نے سرکی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا ''دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی، منہ دھو رکھو!!''

بھوندو نے بھنویں سکوڑ کر جواب دیا ''کیا دھرم دھرم بکتی ہے، دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں، دھرم وہ کرتا ہے، جس پر بھگوان کی مہربانی ہو، ہم دھرم کھاک کریں

گے، پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں، دھرم کیا کریں گے؟''

بنٹی نے اپنا وار او چھا پڑتے دیکھ کر چوٹ پر چوٹ کی

''دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں، جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں، مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں، ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے، ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دھرم چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا''

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں، پیشانی پر بل پڑ گئے، بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا جس کی طاقت کے سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی، جو تن تنہا سو پچاس جوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا

''جورو دھرم گنوانے کے لیے نہیں لائی جاتی دھرم کمانے کے لیے لائی جاتی ہے۔''

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے تھے، سارے باغ میں سرکیاں ہی سرکیاں دکھائی دیتی تھیں، ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے اندر ایک گھرانہ زندگی کی تمام مصروفیتوں، تمام بے نوائیوں کے ساتھ گزر اوقات کر رہا تھا، ایک طرف چکی تھی، ایک طرف باورچی خانہ کی اشیا ایک طرف اناج کے مٹکے، دروازہ پر ایک کھٹولی، بچوں کے لیے پڑی تھی، ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا، تو سارا ساز و سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی

زندگی تھی، ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی، ایک ساتھ ٹھہرتی تھی ان کی دنیا اسی بستی کے اندر تھی، آپس ہی میں شادی بیاہ، لیکن دین جھگڑے قضیے ہوتے رہتے تھے، اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لیے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آ کر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی، پڑاؤ کے اردگرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے، تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے، رات کو ان کی حاضری لی جاتی، پھر بھی گردونواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے، اور ان کے ہاتھ میں جا کر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے، چوکیداران سے ڈرتے تھے کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے، ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے تھے۔

ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا ہی شخص تھا، جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی، کہ وہ ناجائز طریقہ سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو اپنے شوہر کی یہ پاکدامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں، تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا، آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا، کچھ مل جاتا، تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شے نہ

ملی، نہ کوئی جانور، نہ خس نہ جڑی بوٹی۔

بنٹی نے کہا جن سے کچھ نہیں ہوسکتا، وہی دھرماتما بن جاتے ہیں، رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے۔

بھوندو نے کہا ''تو میں نکھٹو ہوں؟''

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا میں کیا جانوں، تم کیا ہو، میں تو یہ جانتی ہوں، کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے یہاں جتنی عورتیں ہیں، سب کھاتی ہیں۔ ہنستی کھیلتی ہیں، پہنتی اوڑھتی ہیں کیا میرے ہی دل نہیں ہے، تمہارے ساتھ بیاہ کرکے جندگی کھراب ہوگئی۔

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا'' جانتی ہے، پکڑا گیا تو تین سال سے کم کی سجا نہ ہوگی۔''

بنٹی پر اثر نہ ہوا بولی ''جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤگے؟''

بھوندو'' اور لوگ پولیس کی کھوسامدیں کرتے ہیں چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں، تو چاہتی ہے میں بھی یہ کرم کروں؟''

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی، بولی، ''میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہ آئی! پھر تمہارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں ڈرے، جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا، تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں گھستا ہے میں تو آدمی ہوں۔''

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کرلے گی یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا، آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی اب تک

بھوندو اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی۔ وہ اعتماد نہیں رہا، مضبوط دیوار کو ٹکا دنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جب دیوار ہلنے لگتی ہے تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی، وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا اس کی طرف سے بھی فکر تھا وہ جس طرح خود رہتا تھا اسی طرح اس کو رکھتا تھا جو خود کھاتا تھا وہی اسے کھلاتا تھا اس کی خاص فکر نہ تھی، پر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی اپنی نہیں، اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہوگی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا آج اس نے باہر آ کر اسے پچکارا، اس کی پیٹھ سہلائی اور اسے پانی پلانے کے ڈول اور رسی لے کر کنویں پر چلا گیا۔

(2)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا

''کل جنگل سے نہیں لوٹا''

صبح کے وقت بھوندو آ پہنچا۔ اس کی کمر میں روپیوں کی تھیلی تھی، کچھ سونے کے گہنے تھے، بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیے، روپیوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا "اگر کوئی پوچھے اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟"

بنٹی نے آنکھیں نیچا کر کے کہا "کہہ دوں گی کیوں بتاؤں، دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے، ہم اپنا حساب کیوں دیں؟"

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا

"یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا، بنٹی، تو کہہ دینا، میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے بچاتی رہی ہوں، ہمارا خرچ ہی کون بڑا لمبا ہے"

دونوں نے مل کر کوئی جواب سوچ لیے، جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں، ایک ایک جڑی کے لیے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ کھس، گھاس جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے، بنٹی نے اپنے لیے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں، بندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائی لی پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے، خوب شراب پی، اور دو بوتلیں رات کے لیے لے کر گھومتے پھرتے، گاتے بجاتے، گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے، بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے، آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانا پکانے لگی تو پڑوسنوں نے تنقید کرنی

شروع کردی

''کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے''

''بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے''

''بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑ رہی تھی''

''آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے، ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی دینے بھی نہ اٹھتی تھی۔''

اس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا کچھ خود داری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی، ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی، اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے، بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے، اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ لوگوں سے اپنی چوری پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو خبر نہ دی، یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا

''اب کھانے کے بکھت کہاں چلے؟''

''مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے''

بھوندو نے محبت کے اس اظہار پر خوش ہو کر کہا مجھے دیر نہ لگے گی ہاتو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے۔

اس نے گنڈا سا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا اور باہر نکلا، مگر بکرا کہاں ملے، آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقہ سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے، اس نے سوچا وہیں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں، دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے، یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا، اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(3)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی، آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی، مسرت سے کھلی جاتی تھی، آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا، اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا، آج وہ نیا آئینہ لائی تھی، اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے، ابٹن ملا، صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو اتنے گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا تو اس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی، لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا، کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی اور روز اس سے منہ دھوئے گی، بال سنوار کر اس نے ماتھے پر السی کا لعاب لگایا۔ کہ بال ادھر ادھر منتشر نہ ہو جائیں پھر پان لگائے، چونا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے منہ میں

چھالے پڑ گئے لیکن اس نے سمجھا شاید پان کھانے کا یہی مزہ ہے، آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے لے لے کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی، تو اس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی، افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے ہنسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی جب دیر ہو گئی، اور وہ نہ آیا، تو اس پر جھنجھلا اٹھی ''روج تو سانجھ سے درواجے پر پڑے رہتے تھے، آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے۔''

بنٹی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑے ہی اس کی نسائیت اگ آئی تھی۔ خفگی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا، اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ بھوندو آ رہا ہے وہ دوسری مرتبہ سر کی کے اندر دوڑ آئی اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن، ایسی الجھن اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی، اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے، آج ہی اس کی پرلطف زندگی کا آغاز ہوا تھا، آج ہی یہ حال!

صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا، اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا، آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی، حلق خشک ہو رہا تھا، معاً کسی نے آ کر کہا

''اری بنٹی رات بھوندو پکڑا گیا۔''

(4)

بنٹی تھانے پہنچی، تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی، اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا، غصہ آتا تھا، سارا زمانہ کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے، انہوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا تو چوک گئے، شعور نہ تھا، تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا، میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانے دار نے دھونس جمائی ''یہی تو ہے بھوندو کی عورت، اسے بھی پکڑلو۔''

بنٹی نے اکڑ کر کہا ''ہاں ہاں پکڑ لو یہاں کسی سے نہیں ڈرتے، جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے، تو ڈریں کیوں؟''

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا ''دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا''

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا

''ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو، جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے مگر اس پھیر میں نہ رہنا، میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لیے بھجوا دوں

گا، تین سال کے لیے صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو، اسی میں خیریت ہے۔''

بھوندو نے بیٹھے بیٹھے کہا ''کیا کہہ دوں جو لوگوں کو لوٹتے ہیں ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں ان گلا کاٹنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا ''ہاں ہاں سکھا پڑھا دے بیوی کو، کہ کہیں کچھ بھید نہ کھول دے لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لیے جائے گا میرا کیا بگڑتا ہے ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دے۔''

بھوندو نے بے پروائی سے کہا ''دارا گا ساب بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا آپ کی دھمکیوں کے سامنے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں مگر میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔''

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس فولاد کو جھکانا دشوار ہے بھوندو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانے دار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی، کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لیے چلا جائے جان پر کھیل کر بولی ''داروگا جی تم سمجھتے ہو گے ان گریبوں کی پیٹھ پر

کوئی نہیں لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں بھلا چاہو،تو ان کو چھوڑ دو،کید ہو گئے، تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔''

تھانے دار نے مسکرا کر کہا'' تجھے کیا یہ مر جائے گا کسی اور سے بیاہ کر لینا جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا وہ تو تیرے ہی پاس ہو گا کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی میں وعدہ کرتا ہوں مقدمہ نہ چلاؤں گا سب مال لوٹا دے تو نے ہی منتر دیا ہو گا گلابی ساڑی اور پان اور خوشبودار تیل کے لیے تو ہی بے قرار ہو رہی ہو گی۔اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔اور سامنے کھڑی دیکھ رہی عجیب عورت ہے۔''

بنٹی نے چند لمحے غور کیا اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

''اچھا داروگا ساب میں سب کچھ دے دوں گی ان پر حرف نہ آنے پائے''

(5)

بھوندو کو باہر نکالا گیا تو اس نے خائف ہو کر پوچھا'' کیوں کیا بات ہے''

ایک چوکیدار نے کہا''تیری عورت نے اقبال کر لیا''

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا اس کا سر چکر کھا رہا تھا آواز بندی ہو گئی تھی لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے وہ بیدار ہو گیا اس نے دونوں مٹّھیاں کس لیں اور بولا'' کیا کہا؟''

''کیا کہا چوری کھل گئی،داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں''

''رات ہی اقبال کر لیتے،تو یہ نوبت کاہے کو آتی؟''

بھوندو نے گرج کر کہا ''وہ جھوٹ بولتی ہے!''

''وہاں مال بھی برآمد ہو گیا، تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو''

اپنے آبا ؤ اجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکا یک بنٹی آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگ گی۔

کسی دیوتا کے آہنی، ہتھیاروں کی مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا اب کہاں جاؤں؟ بھوندو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پڑوسنوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی لیکن اب وہ اکیلی تھی اس کے لیے گھر جانا ناممکن تھا اور بھوندو کی وہ دو انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیارا سے ڈھیرے کی طرف کھینچنے لگا شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی

ہیں، اسے کھینچ کر ڈیرہ کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا وہ پڑاؤ پر پہنچی، تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینی حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی، اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا سب نے سمجھ لیا کہ بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں صرف اس کی سرکی اس ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی بنٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا تو اس کی وہی حالت ہوئی جو خالی گھر دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے، کون کون سی چیز اٹھائے، اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے لیکن آج اسے اس سے وہ محبت ہو گئی تھی، جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیا ادھر ادھر ہو گئی تھیں اس نے انہیں اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلوڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی بنٹی کو شبہ ہوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا پھلوڑیاں کسی نے چھیڑی تھیں پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا ہوا تھا وہ خشک ہو گیا تھا اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھوندو آ رہا ہے اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے بھندو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا کیوں مارے گا؟ کچھ سنے گا سوال جواب کرے گا یا یوں ہی گنڈاسا چلا دے گا؟ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی اسے آفت سے بچایا ہے کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے لے گا؟

اس نے سرکی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا بھوندو نہ تھا اس کا گدھا آ رہا تھا۔ بنٹی آج اس بد بخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لیے تھکا ماندہ چلا آ رہا ہو اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی اور اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا وہ اسے پھوٹی آنکھوں سے نہ بھاتا تھا پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے پھر سوچا کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی کیا تب بھی نہ چھوڑے گا، اس کی آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا؟ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی اور پھلوڑیاں کھائیں جب اسے مرنا ہی ہے تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے دوسرا پیالہ بھرا، اور وہ بھی پی گئی۔ زہریلا ٹھرا جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولانے لگا بوتل آدھی رہ گئی۔

اس نے سوچا بھوندو پوچھے گا تو نے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی کہہ دے گی ہاں پی، کیوں نہ پیئے، اسی کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا وہ ایک بوند بھی نہ چھوڑے گی جو ہونا ہے ہو جائے، بھوندو اسے مار نہ سکے گا وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے اس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی پانچ برس کی گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں سینکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی بے چارا جو کچھ کماتا ہے اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے اپنے لیے

ایک پیسہ کا تمبا کو بھی لیتا ہے،تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے جو کام اس سے نہیں ہوتا ،اسے کیونکر کرے۔

معاً ایک کانسٹیبل نے آ کر کہا''ارے بنٹی کہاں ہے چل دیکھ بھوندو کا حال بے حال ہو رہا ہے ابھی تک تو چپ چاپ بیٹھا تھا پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر پر سر پٹک دیا سر سے لہو بہہ رہا ہے ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے ،تو جان ہی دے دی تھی۔''

(6)

ایک ہفتہ گزر گیا شام کا وقت تھا کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی بھوندو کی سرکی اب بھی اس ویرانے میں کھڑی تھی بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا وہ فکرمندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے چاہتا ہے اٹھ کر باہر دیکھوں مگر اٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی ایک گٹھری لیے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔وہی گلابی ساڑھی ہے مگر تار تار لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے چال ایسی مستانہ ہے اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں، کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا''تو اتنی بھیگ رہی ہے کہیں بیمار پڑ گئی،تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا میں کہتا ہوں،تو اتنا کیوں مرتی ہے،دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی یہ ہانڈی

میں کیا لائی ہے؟‘‘

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا’’ کچھ بھی تو نہیں ہے کیسی ہانڈی؟‘‘

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھولی اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا’’ابھی لوٹا نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا‘‘

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا’’ذرا آئینہ میں صورت دیکھو، گھی، دودھ کچھ نہ ملے گا تو کیسے اٹھو گے؟ ہمیشہ چارپائی پر ہی پڑے رہنے کا ارادہ ہے؟‘‘

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا’’اپنے لیے تو ایک ساڑی بھی نہیں لائی میرے لیے گھی اور دودھ سب چاہیے میں گھی نہ کھاؤں گا‘‘

بنٹی نے مسکرا کر کہا’’اس لیے تو گھی کھلاتی ہوں، کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو اور میرے لیے ساڑی لاؤ‘‘

بھوندو بولا’’تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں کیوں؟‘‘

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا’’پہلے میرا گلا کاٹ دینا، پھر جانا‘‘

☆☆☆☆☆

زیور کا ڈبہ

پہلی بار: ہندی میں "چمتکار" کے عنوان سے "مادھوری" مارچ 1932ء میں شائع ہوا

اردو میں، ماہنامہ "چندن" اگست 1932ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1936ء (زادِ راہ)

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا، وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی، مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی ہے والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے ملا ہوا تھا، پختہ ہوادار صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ، ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا کام صرف دو گھنٹے کا تھا لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی

عزت کرتے تھے، بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے گویا ملازم نہیں، گھر کا آدمی تھا، اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(2)

شام کا وقت تھا، پرکاش نے اپنے شاگرد ویریندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا، ''ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے''

پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے جو ویریندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔ پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اما دیوی نے کہا، ''تمہاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے''

پرکاش نے مسکرا کر کہا ''یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے''

''نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں''

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا'' میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں؟ ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا''

''تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے''

''جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں، میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں''

''تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا''

''میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے

کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی یہ سمجھ لو'

''تو میں کب انکار کرتا ہوں''

''روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے، جو انہیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔''

بات پکی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا، دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی، دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار مینجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے کہیں محلّہ کا بنیا گھیرے ہوئے ہے کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا، لیکن اتنا کمینہ نہ تھا پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجہ میں سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آ کر چمپا سے بولا، ''ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں، اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی''

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی ''اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے جنہیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں''

چندر پرکاش، ''یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں، نہ کمانا نہ دھمانا باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں اسی لیے کہتا ہوں ایشور بڑا غیر منصف ہے۔''

چمپا ''اپنا اپنا مقدر ہے ایشور کا کیا قصور ہے تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے یہاں تو روزمرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے گہنے کپڑے کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں پرکاش نے تسلی دی ''ساڑی تمہارے لیے ضرور لاؤں گا، یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے، زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی''

چمپا مسکرا کر بولی ''چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گزر ہوتی جائے یہی بہت ہے۔''

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا چمپا سے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(3)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے ''اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں مجھے اس کی امید نہ تھی''

چمپا نے کہا ''کوئی اور بات کرو، زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے''

''ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو''

''زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے، میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں، جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہے''

ٹھاکر صاحب۔۔۔۔۔۔مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے

''تم اس میں سے کوئی چمپا کے لیے لیتے جاؤ''

''تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا''

''میں نے سخی کوئی نہیں دیکھا، جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے''

''میں غیر نہیں ہوں، ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں، اگر سو دو سو کی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی''

یکا یک پرکاش چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے اسے چمپا پر رحم آگیا یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بیچاری کو ہر ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے وہ دبے پاؤں گھر

سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی وہ دیوار پر چڑھ گیا اور ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا، گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں، اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا، کیا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا، میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے؟ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں سب نوکروں پر شبہ کریں گے میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے، میں نلوہ نکل جاؤں گا شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔

پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(4)

دھوپ نکل آئی تھی پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا ''بڑا غضب ہو گیا رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی، چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے''

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا ''کسی نے پکڑا نہیں چور کو''

''کسی کو خبر نہیں، وہی ڈبے لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے نہ

جانے کیسے چابی اڑا لی اور انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔''

''نوکروں کی کارستانی ہوگی، باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے''

''نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں''

''نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اڑا لیے گئے''

''تم جا کر ان کو تسلی دو ٹھکرائن بے چاری رو رہی تھی تمہارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارا مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا''

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا ''یہ تو بڑا غضب ہو گیا ماتا جی، مجھے تو ابھی چمپا نے بتلایا''

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے، بولے کہیں سیندھ نہیں کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری سمجھ میں نہیں آیا کہ چور کدھر سے آیا؟

ٹھکرائن نے رو کر کہا ''میں تو لٹ گئی بھیا، بیاہ سر پر ہے، کیا ہوگا، بھگوان تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔''

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا ''مجھے تو نوکروں کی شرارت معلوم ہوتی ہے''

ٹھکرائن نے مخالفت کی ''ارے نہیں بھیا نوکروں میں کوئی نہیں دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا''

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا ''تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا کہیں مال اڑا دیا ہو گا جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے''

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا بولے ''پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے''

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا ''تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا تم زدوکوب بھی نہیں کر سکتے، ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے، مال چلا گیا، اب کیا ملے گا''

پرکاش ''لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا''

ٹھاکر ''کوئی فصدہ نہیں، ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا''

پرکاش '' آپ بیٹھ رہیے۔ لیکن میں بیٹھنے والا نہیں، میں انہیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا''

ٹھکرائن: ''نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے چاہے جدھر سے آیا ہو پر چور آیا باہر سے تمہارے کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے۔''

ٹھاکر: ''ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟''

پرکاش کا دل دھڑ کنے لگا ''بولا میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں ہاں کوئی پہلے سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو وہاں چھپا بیٹھا ہو تو دوسری بات ہے''

تینوں آدمی چھت پر گئے، تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا، وہاں کا چونہ لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی ''اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا''

ٹھاکر صاحب نے کہا ''ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا مال تو جاتا تھا، وہ گیا، اب چلو آرام سے بیٹھو، آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہو گی''

پرکاش: ''میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا''

ٹھاکر: ''کیوں ہمیں تمہارا۔۔۔''

پرکاش: '' آپ نہ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی، میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے چور نے راستہ دیکھ لیا ہے ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے گھر میں اکیلی ایک عورت ہے سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر

چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھوم کر کبھی 9 بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی ادھر کا راستہ بند ہی ہو جانا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری ساری میرے سر ہے۔''

ٹھکرائن ڈریں، ''تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا''

پرکاش: '' کچھ بھی ہو ماتا جی مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا میری غفلت سے چوری ہوگئی اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا''

پرکاش چلا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا 'بڑا لائق آدمی ہے چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھائے''

''مار ہی ڈالے''

''دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا''

''اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا کتنا ہی سمجھاؤ''

''کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے''

''ہم کیوں کرایہ دیں، وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں، ہم تو کچھ کہتے نہیں''

''کرایہ تو دینا ہی پڑے گا، ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا''

''میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں''

''تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی''

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا، لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا، ''ایک سیٹھ جی کے ہاں 50 روپیہ ماہوار کا کام مل گیا ہے، مگر وہ روپیہ انہیں کے پاس جمع کرتا جاؤں گا، وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہو گی اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا'' خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پا کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا دیوتاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں، مگر جب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا اس کی چابی کہاں؟ اس کا چمپا کو پتہ نہیں، وہ پوچھتی ہے، اس صندوق میں کیا ہے؟ تو وہ کہہ دیتے ہیں ''کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں ماری ماری پھرتی تھیں اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں'' چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انہیں پان دینے گئی، تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہو گیا شبہے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی بہہ کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے، پرکاش کے لیے ناممکن تھا وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا جون کا مہینہ تھا گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا چمپا نے باہر سونے کے لیے کہا مگر

پرکاش نہ مانا، اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا ''چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی، چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں یہاں کیا رکھا ہے''

پرکاش نے غصہ سے کہا '' کچھ نہیں، برتن تو ہیں، غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔''

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا ''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں بولی ''میں کیوں ہٹانے لگی''

''پھر کس نے ہٹایا''

''گھر میں تم رہتی ہو جانے کون''

''اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''

'' کچھ یوں ہی پوچھا تھا''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں پرکاش کو پکوڑیاں پسند بہت تھیں اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لیے بولا'' طشتری میں کیا لائیں، آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی پیٹ میں گرانی

معلوم ہوتی ہے۔''

''اچھا پکوڑیاں ہیں''

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھواہ جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا پر کاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا، ارے یہ تو زیور ہیں اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا یہ کہاں سے آئے مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی معاً اس کے دل میں خیال گزرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اسے اب کوئی شک نہ رہا لیکن اتنی بڑی شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انہیں تنگ نہیں کیا اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں چوری زیوروں کے لیے ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

(6)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی پر کاش سے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی، پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے

تھے مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے شہر کے ایک بنک میں اسسٹنٹ مینجر کی جگہ خالی ہوئی پرکاش نے اکونٹینٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔اتنی رقم کہاں سے آئے، پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چیت چل پڑی ٹھاکر صاحب نے کہا،"تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟"

پرکاش نے سر جھکا کر کہا" دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں"

اجی درخواست تو دو، اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی اس کی فکر نہ کرو

پرکاش نے حیران ہو کر کہا،" آپ زرضمانت داخل کر دیں گے؟"

"ہاں ہاں یہ کونسی بڑی بات ہے"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی، مگر پھر بھی خوش نہیں ہے ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوشخبری سنائی چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا، پھر ایک منٹ بعد بولی،"ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ جگہ نہ ملتی نہ سہی روٹیاں

تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں‘‘

’’یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہوگی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟‘‘

چمپا نے کہا ’’آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی‘‘

پرکاش سناٹے میں آ گیا اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا، مگر ایسی خوشخبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا کھٹکنے لگا اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے، چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا، اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا ’’تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟‘‘ جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا ’’کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی‘‘

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی، اس نے پوچھا

’’کیا جتنے آدمی بنک میں ملازم ہیں، ان کی نیت بدلتی رہتی ہے‘‘

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا ’’تم تو زبان پکڑتے ہو، ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تو تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی‘‘

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا مسکرا کر بولا ’’اچھا تمہارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں نے کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں‘‘

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا، جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں تمہاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے جا کر ان کے حوالے کر دیتے ان چھ مہینوں میں انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے کچھ دیا ہی ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ بیس روپے ماہوار دیے جاتے ہیں علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے، تمہارے ہاں ضروری بھیجتے ہیں، تمہارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمہیں دے دی تمہاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انہوں نے ادا کی اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں تمہاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو آ، تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربانی کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔

پرکاش کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا، اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی

جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے کہ افسوس

چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لا دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں

(7)

کئی روز گزر گئے پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ ویندرا اور اس کی نئی دلہن بھی آئے ہوئے ہیں باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا ''آج آپ کو یہاں رہنا ہو گا دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا''

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں پرکاش جاگ رہا تھا ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا

ہوا تھا پرکاش نے گچھا اٹھالیا، پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا آج کانٹا نکلنے کا تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت اضطراب اور خلش سے پر، اب بخار کا اتار تھا۔ سکون وفرحت اور امنگ سے بھرا ہوا تب قدم پیچھے ہٹتا تھا آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرندو کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا، پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے، ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے اوپر اوپر اور اوپر

وہ گھر پہنچا تو ویرو سو رہا تھا، چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(8)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا

دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویریندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ’’بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔‘‘

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے ’’بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری، پورا کا پورا ڈبہ مل گیا ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو‘‘

پرکاش کو ان کی باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا، تعجب کی بات ہے میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

’’ٹھاکر کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں‘‘ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا

پرکاش: ’’اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا‘‘

ٹھاکر: ’’آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی‘‘

پرکاش: ’’آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوالیا کسی سے‘‘

ٹھاکر: ’’کئی پنڈتوں سے‘‘

پرکاش: ’’تو بس یہ اسی کی برکت ہے‘‘

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوشخبری سنائی وہ دوڑ کر ان کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے

بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ’’آج ان کے ہاں میری دعوت ہے‘‘

’’میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی‘‘

’’تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو‘‘

’’مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا‘‘

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆☆☆

شکوہ شکایت

پہلی بار: ہندی میں ''گلہ'' کے عنوان سے اپریل 1932ء میں شائع ہوا

اردو میں: ''جامعہ'' جنوری 1938ء

کتابی صورت میں: فروری 1938ء (واردات)

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے، لیکن جس پر گزرتی ہے وہ ہی جانتا ہے دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزا آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں، باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے نہ دام ہی مناسب یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دکان بدنام ہی کیوں ہوتی انہیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو، وہاں مال زیادہ کھپتا ہے اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے مگر نہیں ٹٹ پونجیوں

سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انہیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے دال میں کنکر بھرے ہوئے منوں لکڑی جلا ڈال، و کیا مجال کہ گلے، گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلا درجے کے چنبیلی کے تیل کے، چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے روز روز کی یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی ہیں کہتی ہوں آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں خوب! ذرا انہیں بلا لیا اور خوشامند کے دو چار الفاظ سنا دیے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انہیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا میں تو حضرت کو جانتی تھی ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں

میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا، تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے، اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی، برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انہیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلاّ نچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے کیا مر گئے تمہارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا خیر سوکھا جواب نہ دو میں یہ بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو مگر ٹال تو سکتے ہو کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو؟ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بےچارے کیسے انکار کریں آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں دنیا انہیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گروی رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک

ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کر لے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو تو چارپائیاں، اوڑھنا، بچھونا بھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لیے انہیں چارپائی بھی چاہیے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے، جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں، گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اب میں بچوں کے لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں، جو ضرورت کے وقت ان کے دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے، ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے، وہ آپ کا دوست ہے، شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے، امرا مغرور ہیں،

مدمغ ہیں، خوشامد پسند ہیں، ان کے پاس کیسے جائیں، دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک باگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز، خیر میں نے رکھ لیا میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آ جاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی کسی کام کی تمیز نہیں بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول نمبر کا، بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے کم بخت دکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی ایک روپیا دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے میرا خون کھولنے لگتا لیکن انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال

دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز ادھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے گویا کوئی بات ہی نہیں ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا ''اگر کل سے تو نے سلیقے سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی'' سویرے سو کر اٹھتی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے گرد و غبار کا کہیں نام نہیں آپ نے فوراً ہنس کر کہا ''دیکھتی کیا ہو آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے میں نے سمجھا دیا تم طریقہ تو بتلاتی نہیں ہو، الٹی ڈانٹنے لگتی ہو'' لیجئے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی، خیر، میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی، اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود مابدولت بڑی تن دہی سے جھاڑ دے رہے ہیں مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی آپ فرمانے لگائے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے اس پر تنخواہ بھی دے دوں میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں، شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی نہیں۔ حضرت علی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی اس کا مجھے خود احساس تھا غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب روسا اور امرا کے پاس ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذا جھیلیں، خیر، میں نے تو اسے جواب دے دیا آپ نے کیا کیا، اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا، یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی، آخر کئی دن سردی کھاتے رہے صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا مگر دل بھی قدرت نے انہیں عجیب قسم کا دیا ہے! پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں آپ کو مطلق احساس نہیں کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے، آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انہیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں شاید انہیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انہیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں یہ سادہ لوحی ہے

سیدھی سادی حماقت، جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔گھر والوں کے اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے؟ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انہیں کلام نہیں، مطلق عذر نہیں مگر روپیا بھی دے دوں یہ شرط ہے۔انہیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے، اور مردوں کو دیکھتی ہوں، گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور، کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے بچوں کے لیے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔قسم سی کھالی ہے اس لیے میں تو انہیں بخیل کہوں گی، مردہ دل ہی کہوں گی۔فیاض نہیں کہہ سکتی دوسرے کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص ونمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے نذر یا ڈالی کی بات تو الگ ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی

تنخواہ کٹتی ہے۔اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں کوئی پیچیدہ، مشکل کام آ جائے تو انہیں کے سر منڈھا جاتا ہے انہیں مطلق عذر نہیں دفتر میں انہیں گھسو اور پسو وغیرہ خطابات بھی ملے ہوئے ہیں۔مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے، اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے، جس پر اعتبار ہوتا ہے اس ک الحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں گھر کی جائیداد انہیں کی نگرانی میں ہے، وہ شان سے رہتے ہیں، موٹر خرید لی ہے، کئی نوکر ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں

لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی، میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے کہنے لگے کیوں انہیں پریشان کروں آخر انہیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی میں نے بہت مجبور کا ے، تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے، کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا ''کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟'' آپ نے ترش ہو کر کہا ''ابھی ایک ہفتہ تو خط بھیجے ہوا ابھی کیا جواب آسکتا ہے ایک ہفتہ اور گزرا اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے، میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں سارے ملکی، مالی، اخلاقی تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ تنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کیا چوکنے والی تھی، جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائیداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا، اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہ ملی موٹے حساب سے ہمیں

دو ہزار ملنا چاہیے دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے، رشوتیں بھی لیتے ہیں، تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے آپ ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انہیں پر ہے خوب! گویا جائیداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا یا چوری ہو گئی چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا گھاٹے سے بیچنا پڑا یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی اس میں دیوالیہ پٹ گیا آپ کو سوجھی بھی تو لچر سی بات اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی پڑوس کی بی بی سے قرض لیے تب جا کر کہیں کام چلا پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے۔"

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں، سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے میں گھبرا رہی ہوں آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں "جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا

نہیں، تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی آج آئے تو خوب ڈانٹنا'' تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں ''ابھی تک نہیں آیا، بڑا شیطان ہے، آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں، مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کو تلاش کرنے نکلتے ہیں اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں، ادھر لڑکا آجاتا ہے میں کہتی ہوں کدھر سے آ گیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی دانت پیس رہے تھے آتے ہی ہوں گے چھڑی بھی ہاتھ میں ہے، تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے آج قدرو عافیت معلوم ہو گی لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس، گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے'' آیا کہ نہیں؟

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں'' آکر بیٹھا تو ہے جا کر پوچھتے کیوں نہیں، پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا کچھ بولتا ہی نہیں''

آپ گرج پڑتے ہیں ''منو یہاں آؤ''

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے آپ جامے سے باہر ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے میں بھی وہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصے سے کہتے ہیں ''تم کہاں گئے تھے جی!

منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو خبردار جواب اتنی دیر کی آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے؟''

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہدے ہے قصیدہ اب شروع ہوگا، گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں ''تم تو جیسے ڈر گئے، بھلا دو چار تمانچے تو لگائے ہوتے اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو بجے کی خبر لائے گا اس نے بھی دل میں کیا سوچا ہوگا''

آپ فرماتے ہیں ''تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا بچے کی روح ہی فنا گئی دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے''

''تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دیے''

آپ نے ایک اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں، آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے کبھی گولیاں، کبھی کنکوے، حضرت بھی انہیں کے ساتھ کھیلتے ہیں چالیس سال سے تو متجاوز آپ عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے خون پی جاتے، صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے

پھر لے بیٹھتے۔بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے رات کو پھر کام میں جو دیتے یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں کبھی آپ بھی سینک کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں ایسے باپ لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی انہوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے تو ابا جان کی صحت ہی کونسی بہت اچھی تھی بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انہوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحب زادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو، ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ سہی لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجئے، برے برے شوق نہ پیدا کیجئے اگر آپ انہیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیے مت، لگے باتیں بنانے، ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ جاتے تھے لڑکا سر ٹپک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمیوں کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتش

بازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے ولایتی چرخیاں بھی ہیں ان پر مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوف ناک ہوتے ہیں کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ایک سے ایک مہلک گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے کوئی لڑکا میچ جیت کر آجاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں، گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ ہاتھ پانو ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشم بصریت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا الزام حالات پر کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس برس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی میں نے جہاں جہاں پیغام دیے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی جب اس طرح ایک سال پورا گزر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی حالانکہ دل میں انہیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے

کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی یہ رسم بے ہودہ ہے یہ رسم بے معنی ہے، یہاں روپے کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا یہ کیوں، وہ کیوں، یہ تو صاف بیس ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگا دی، میری آبرو مٹا دی ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردوقدح ہو رہی ہے شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں میں نے بھی برت رکھا لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا خیرات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں لڑکی دان کی چیز نہیں دان روپے پیسے کا ہوتا ہے جانور بھی دان دیے جا سکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے کتنا سمجھاتی ہوں ''صاحب پرانا رواج ہے، شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے مگر آپ کان ہی نہیں دھرتے پیروں پڑی، یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہو گا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی آخر مجھے رونا آ گیا باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی آپ گھر جھانکے

تک نہیں اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔"

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انہیں پیار کرتی ہوں ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے ہرگز نہیں، یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں، اس کے نشیب وفراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے، ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

نئی بیوی

پہلی بار: ہندی میں ''نیا وواہ'' کے عنوان سے ''سرسوتی'' مئی 1932ء میں شائع ہوا

اردو میں ''افسانہ'' لاہور مئی 1933ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (واردات)

ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے اس نئے خون پر زندگی قائم ہے۔ دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیا پن اس کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرے میں، تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگا مل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی از سر نو عود کر آئی ہے جب پہلی بیوی بقید حیات تھی وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک تو پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے تھے۔ پھر کھانا کھا کر دکان چلے جاتے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سو جاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آ جایا کرو تو بگڑ جاتے ''تمہارے لیے کیا دکان بند کر دوں یا روزگار چھوڑ دوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ ایک لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوش کر لیا جائے آج کل لکشمی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے تب بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہوتا'' لیلا بے چاری خاموش ہو جاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے لیلا کو زور کا بخار تھا لالہ جی دکان پر چلنے لگے تو لیلا

نے ڈرتے ڈرتے کہا۔۔"دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے ذرا سویرے آجانا"

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے۔۔۔"اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمہارا جی اچھا ہو جائے تو میں دکان نہ جاؤں گا۔"

لیلا رنجیدہ ہو کر بولی "میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دکان نہ جاؤ میں تو ذرا سویرے آجانے کو کہتی ہوں"

"تو کیا میں دکان پر بیٹھا موج کرتا ہوں؟"

لیلا کچھ نہ بولی شوہر کی یہ بے اعتنائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی ادھر کئی دن سے اس کا دل دوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس کا کیا قصور تھا کس کی جوانی ہمیشہ رہتی ہے لازم تو یہ تھا کہ پچپن سال کی رفاقت اب ایک گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہو جاتی جو ظاہر سے بے نیاز رہتی ہے۔ جو عیب کو بھی حسن دیکھنے لگتی ہے، جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں زیادہ خوشنما ہو جاتی ہے۔لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو نہ بچے تو اس کے لیے گئو شالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ان کے خیال میں لیلا کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بنی رہے، آرام سے کھائے پہنے پڑی رہے۔ اسے اختیار ہے چاہے جتنے زیور بنوائے چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے روزے رکھے،صرف ان سے دور رہے فطرت انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دلجوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے خود اسی کے لیے ابلہانہ سرگرمی سے متلاشی رہتے تھے لیلا چالیس کی ہو کر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی مگر وہ پینتالیس سال کے ہو کر ابھی

جوان تھے جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بے قرار لیلا سے اب انہیں ایک طرح کی کراہیت ہوتی تھی اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرتناک احساس کی وجہ سے فطری بے رحمیوں کے ازالے کے لیے رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بو الہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے ''چہ خوش سات لڑکوں کی تو ماں ہو گئیں، بال کھچڑی ہو گئے چہرہ ڈھلے ہوئے فلالین کی طرح پر شکن ہو گیا مگر آپ کو ابھی مہادر اور سیندور مہندی اور ابٹن کی ہوس باقی ہے عورتوں کی بھی کیا فطرت ہے نہ جانے کیوں آرائش پر اس قدر جان دیتی ہیں پوچھو اب تمہیں اور کیا چاہیے؟ کیوں نہیں دل کو سمجھا لیتیں کہ جوانی رخصت ہو گئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جا سکتا''، لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوتی جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے ہفتہ میں دو بار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدودوں کے استعمال سے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔

لیلا نے انہیں شش و پنج کی حالت میں کھڑا دیکھ کر مایوسانہ انداز سے کہا'' کچھ بتلا سکتے ہو کے بجے آؤ گے؟''

لالہ جی نے ملائم لہجے میں کہا۔۔۔۔۔۔ ''تمہاری طبیعت آج کیسی ہے؟''

لیلا کیا جواب دے؟ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے تو شاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں اگر کہتی ہے اچھی ہوں تو بے فکر ہو کر دو بجے رات کی خبر لائیں ڈرتے ڈرتے بولی۔۔۔ ''اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ بھاری ہو رہی ہے لیکن تم جاؤ دکان پر لوگ تمہارے منتظر ہوں گے مگر

ایشور کے لیے ایک دو نہ بجا دینا، لڑکے سو جاتے ہیں، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، طبیعت گھبراتی ہے۔''

سیٹھ جی نے لہجے میں محبت کی چاشنی دے کر کہا''بارہ بجے تک آ جاؤں گا، ضرور''

لیلا کا چہرہ اتر گیا''دس بجے تک نہیں آ سکتے؟''

''ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے کسی طرح نہیں''

''ساڑھے دس بھی نہیں''

''اچھا گیارہ بجے''

گیارہ پر مصالحت ہوگئی لالہ جی وعدہ کر کے چلے گئے لیکن شام کو ایک دوست نے مجرا سننے کی دعوت دی اب بیچارے اس دعوت کو کیسے رد کرتے جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کر دیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں، آپ سے کسی طرح کی رعایت کا خواستگار نہیں، محض دوستانہ بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا ہے آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہے ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہے کبھی مہمان آئے ہیں کبھی پوجا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ، اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع کر لینے پڑیں گے۔ اسے شاید ہی گھر سے کبھی فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے آتے ہی اپنے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر دیں لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ کی گنجائش کسی

طرح نہ نکال سکے دو کو ایک تو کہہ سکتے ہیں گھڑی کی تیزی کے سر الزام رکھا جاتا ہے لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے آ کر نوکر کو جگایا کھانا کھا کر آئے تھے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی، ہر لمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب سو گئی تھی۔ اس کو جگانا سوئے فتنہ کو جگانا تھا۔

غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام سے لڑکیوں کے لیے پانچ وظیفے قائم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا وہ نہیں مریں صاحب میں مر گیا۔ زندگی کی شمع ہدایت گل ہو گئی۔ اب تو جینا اور رونا ہے میں تو ایک حقیر انسان تھا نہ جانے کس کار خیر کے صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئی تھی میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگ امل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کر لی آخر غریب کیا کرتے زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہو گئی تھی لکڑی کی ضرورت تو جب ہی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی۔

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے

دکان سے اب انہیں اس قدر انہاک نہیں ہے متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت جوان میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی اب یہ ترشح پا کر پھر سرسبز ہوگئی ہے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ موٹر نیا آ گیا ہے کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کر دیے گئے ہیں نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوگیا ہے ریڈیو بھی لگا دیا گیا ہے لالہ جی کی بوڑھی جوانی جوانوں سے بھی زیادہ پرجوش اور ولولہ انگیز ہو رہی ہے اسی طرح جیسے بجلی کی روشنی چاند کی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے لالہ جی کو ان کے احباب ان کی اس جوان طبعی پر مبارک باد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز سے کہتے ہیں ''بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اور ہمیشہ جوان رہیں گے بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منہ پر سیاہی لگا کر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہر بدر کر دوں جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے، روپے کا ایمانداری سے، حسن کا آرائش سے آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں، ارے صاحب میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے ایک گھنٹہ سے نہ تبدیل کروں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں کوئی شوق ہی نہیں، زندگی کیا ہے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔'' یہی الفاظ وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشا دیوی کے لوح دل پر نقش کرتے رہتے ہیں اس سے ہمیشہ سینما، تھیٹر، سیر دریا کے لیے اصرار کرتے ہیں لیکن آشا نہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں، وہ جاتی تو ہے مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آ کر کہا ''چلو آج بجرے پر دریا کے سیر کر آئیں''

بارش کے دن تھے، دریا چڑھا ہوا تھا۔ ابر کی قطاریں بین الاقوامی فوجوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں، سڑک پر لوگ ملہار اور بارہ ماسے گاتے چلے جا رہے تھے باغوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔

آشا نے بے دلی سے کہا ''میرا تو جی نہیں چاہتا''

لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا۔۔۔۔ ''تمہاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی''

''آپ جائیں، مجھے اور کئی کام کرنے ہیں''

'' کام کرنے کو ایشور نے آدمی دے دیے ہیں، تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا، آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اٹھ جائیں گے''

آشا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی، کسی سے سن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذت زبان رہ جاتی ہے لالہ جی کے دل کی کلی کھل گئی آشا کو ان سے کس قدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کر رہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار، پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے، خواہ مخواہ سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا مزہ کرکرا کر دیتی تھی۔

بولے، ''تمہاری بھی عجیب طبیعت ہے اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو

ایسا کیا طوفان آ جائے گا تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہو گی تو مجھے بالکل آرام طلب بنا دو گی اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گا''

آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا'' آپ بھی تو مجھے ادھر ادھر گھما کر میرا مزاج بگاڑے دیتے ہیں یہ عادت پڑ جائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟''

لالہ جی نے فیاضانہ لہجے میں کہا،'' مجھے گھر کے دھندوں کی ذرا برابر پروا نہیں ہے، بال کی نوک برابر بھی نہیں میں چاہتا ہوں کہ تمہارا مزاج بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو اور تم مجھے بار بار، آپ کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے تم، کہو محبت کی گالیاں دو غصے کی صلواتیں سناؤ۔ لیکن تم مجھے آپ کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہو، میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں شریر چھوکرا بن کر رہنا چاہتا ہوں۔''

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔۔۔۔۔۔'' اے نوج، بھلا میں آپ کو''تم'' کہوں گی۔ تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے یا بڑوں کو؟''

منیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پر ملال خبر سنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا کہ آشا کے ان بھولے بھولے الفاظ سے ہوا ان کا سارا جوش سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا جیسے برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ سر پر باقی رکھی ہوئی رنگین پھول دار ٹوپی گلے میں پڑی ہوئی جوگیے رنگ کی ریشمی چادر، وہ تن زیب کا بیل دار کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ یہ سارا ٹھاٹ جیسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ جیسے سارا نشہ کسی منتر سے اتر گیا ہو۔

دل شکستہ ہو کر بولے ''تو تمہیں چلنا ہے یا نہیں؟''

''میرا جی نہیں چاہتا''

''تو میں بھی نہ جاؤں؟''

''میں آپ کو کب منع کرتی ہوں''

''پھر آپ، کہا''

آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر کہا ''تم'' اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

''ہاں اسی طرح تم کہا کرو تو تم نہیں چل رہی ہو؟ اگر میں کہوں کہ تمہیں چلنا پڑے گا تب؟''

''تب چلوں گی آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے''

لالہ جی حکم نہ دے سکے فرض اور حکم جیسے لفظ سے ان کے کانوں میں خراش سی ہونے لگی کھسیانے ہو کر باہر چلے اس وقت آشا کو ان پر رحم آ گیا بولی ''تو کب تک لوٹو گے؟''

''میں نہیں جا رہا ہوں''

''اچھا تو میں بھی چلتی ہوں''

جس طرح کوئی ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پا کر اسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے اسی طرح لالہ جی نے رونا منہ بنا کر کہا ''تمہارا جی نہیں چاہتا تو نہ چلو میں مجبور نہیں کرتا''

''آپ ۔۔۔۔ نہیں تم برا مان جاؤ گے''

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں جو معمولی ساری پہنے ہوئے تھی، وہی

پہنے چپل کھڑی ہوئی۔ نہ کوئی نفیس ساڑی نہ کوئی مرصع زیور، نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجھلا اٹھتے تھے۔ شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے روشن کرنے کے لیے اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اس قدر خشک اور افسردہ ہے، جیسے کوئی اوسر کا درخت ہو۔ کہ کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے جڑاؤں زیوروں کے بھرے ہوئے صندوق رکھے ہیں، کہاں کہاں سے منگوائے، دہلی سے، کلکتے سے، فرانس سے، کیسی کیسی بیش قیمت ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں ایک سینکڑوں مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے غریب خاندان کی لڑکیوں میں یہی عیب ہوتا ہے ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے، نہ کھا سکیں نہ پہن سکیں، نہ دے سکیں، انہیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں۔

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہ آیا

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھ لیا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں گراموفون اگر بگڑ گیا ہے، گاتا نہیں یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی۔ اسے اٹھا کر رکھ دینا یہ تو حماقت ہے۔

ادھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سترہ سال کا لڑکا آ گیا تھا، کچھ عجیب مسخرا سا، بالکل اجڑ اور دہقانی، کوئی بات ہی نہ سمجھتا اس کے پھلکے اقلیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہو جاتے بیچ میں موٹے، کنارے پتلے، دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے اور کبھی اتنی گاڑی جیسے دہی، کبھی نمک اتنا کم کہ بالکل پھیکا کبھی تو اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار آشا سویرے ہی سے رسوئی میں پہنچ جاتی اور اس بدسلیقے مہراج کو کھانا پکانا سکھاتی ''تم کتنے نالائق آدمی ہو جگل؟ اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے یا بھاڑ جھونکتے رہے کہ پھلکے تک نہیں بنا سکتے۔''

جگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا ''بہو جی ابھی میری عمر ہی کیا ہے سترا ہوں ہی سال تو ہے۔''

آشا ہنس پڑی ''تو روٹیاں پکانا کیا دس بیس سال میں آتا ہے؟''

''آپ ایک مہینہ سکھا دیں بہو جی، پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پھلکے کھلاتا ہوں۔ کہ جی خوش ہو جائے۔ جس دن مجھے پھلکے بنانے آ جائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لوں گا سالن تو اب میں کچھ پکانے لگا ہوں نا؟''

آشا حوصلہ افزا تبسم سے بولی ''سالن نہیں'' وہ پکانا آتا ہے ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا۔

''میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں؟''

''اچھا تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمہارا سالن لذیذ پکے گا؟''

''آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے''

''اور میں نہیں رہتی تب؟''

''تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے''

''تمہارے دادا آجائیں گے تو تم چلے جاؤ گے؟''

''نہیں جی کسی اور کام میں لگا دیجئے گا مجھے موٹر چلوانا سکھوا دیجئے گا نہیں نہیں آپ ہٹ جائیے میں پتیلی اتار لوں گا ایسی اچھی ساڑی آپ کی کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو؟''

''دور ہو، پھوہڑ تو تم ہی ہو کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلو گے''

جگل افسردہ ہو گیا نحیف چہرہ اور بھی خشک ہو گیا

آشا نے مسکرا کر پوچھا ''کیوں منہ کیوں لٹک گیا سرکار کا؟''

'' آپ ڈانٹ دیتی ہیں بہو جی، تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے سیٹھ جی کتنا ہی گھڑکیں دیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہو جاتا ہے''

آشا نے تشفی دی ''میں نے تمہیں ڈانٹا نہیں صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی تمہارے پاؤں پر گر پڑے تو کیا ہوگا''

''ہاتھ تو آپ کا بھی ہے کہیں آپ کے ہاتھ سے ہی چھوٹ پڑے تب؟''

سیٹھ جی نے رسوئیں کے دروازے پر آ کر کہا'' آشا ذرا یہاں آنا دیکھو تمہارے لیے کتنے خوش نما گملے لایا ہوں تمہارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہو رہی ہو لونڈے کو کہہ دو کہ مہراج کو بلائے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کرلوں گا۔ مہراج کی کمی نہیں ہے آخر کب تک کوئی

رعایت کرے اس گدھے کو ذرا بھی تو تمیز نہ آئی'' سنتا ہے جگل، آج لکھ دے اپنے باپ کو'' چولھے پر توا رکھا ہوا تھا، آشا روٹیاں بیل رہی تھی، جگل توے کو لیے روٹیوں کا انتظار کر رہا تھا ایسی حالت میں بھلا وہ کیسے گملے دیکھنے جاتی؟ کہنے لگی'' ابھی آتی ہوں ذرا روٹی بیل رہی ہوں چھوڑ دوں گی تو جگل ٹیڑھی میڑھی بیلے گا۔''

لالہ جی نے کچھ چڑھ کر کہا'' اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائے گا''

آشا ان سنی کر کے بولی'' دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا نکالنے کی کیا ضرورت ہے''

''تم چل کر بتا دو گملے کہاں رکھے جائیں گے؟''

''کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آئی جاتی ہوں''

''نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو''

''تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو''

لالہ جی سناٹے میں آ گئے آشا نے کبھی اتنی بے التفاتی سے انہیں جواب نہ دیا تھا اور یہ محض بے التفاتی نہ تھی اس میں ترشی بھی تھی خفیف ہو کر چلے گئے انہیں غصہ ایسا آ رہا تھا کہ ان گملوں کو توڑ کر پھینک دیں اور سارے پودوں کو چولھے میں ڈال دیں۔

جگل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا'' آپ چلی جاتیں بہو جی سرکار ناراض ہوں گے''

''بکو مت جلدی روٹیاں سینکو نہیں تو نکال دیے جاؤ گے۔ اور آج مجھ سے

روپے لے کر اپنے لیے کپڑے بنوالو بھک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں تمہیں نائی بھی نہیں جڑتا؟''

''کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیا حساب دوں گا؟''

''ارے بےوقوف میں حساب میں نہیں دینے کو کہتی مجھ سے لے جانا''

''آپ بنوائیں گی تو اچھے کپڑے لوں گا میں کھدر کا کرتا کھدر کی دھوتی ریشمی چادر اور اچھا سا چپل''

آشا نے مٹھاس بھرے تبسم سے کہا ''اور اگر اپنے دام سے بنوانا پڑے تو''

''تب کپڑے بنواؤں گا ہی نہیں''

''بڑے چالاک ہو تم''

''آدمی اپنے گھر پر روکھی روٹی کھا کر سو رہتا ہے لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔''

''یہ سب میں نہیں جانتی ایک گاڑھے کا کرتہ بنوالو اور ایک ٹوپی حجامت کے لیے دو آنے پیسے لے لو''

''رہنے دیجیے، میں نہیں لیتا، اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی۔ سڑیل کپڑے ہوئے تو جی جلے گا''

''تم بڑے خود غرض ہو، مفت کے کپڑے لوگے اور اعلیٰ درجے کے''

''جب یہاں سے جانے لگوں گا تو آپ مجھے اپنی تصویر دے دیجیے گا''

''میری تصویر لے کر کیا کرو گے؟''

''اپنی کوٹھری میں لگا دوں گا اور دیکھا کروں گا بس وہی ساڑی پہن کر کھنچوانا

جو کل پہنی تھی اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی آپ کے پاس تو بہت گہنے ہوں گے آپ پہنتی کیوں نہیں؟''

''تو تمہیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟''

''بہت''

لالہ جی نے خفت آمیز لہجے میں کہا ''ابھی تک تمہاری روٹیاں نہیں پکیں جگل اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں، تو میں تمہیں نکال دوں گا؟''

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جا کر گملوں کو دیکھنے لگی آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آ رہی تھی اس کے انداز گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی لالہ جی کی ساری خفت غائب ہو گئی آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں بولی ''میں ان میں سے کوئی گملا نہ جانے دوں گی، سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا سب کتنے سندر پودے ہیں، واہ ان کے ہندی نام بھی بتا دینا''

لالہ جی نے چھیڑا ''سب لے کر کیا کرو گی؟ دس پانچ پسند کر لو باقی باہر باغیچے میں رکھوا دوں گا''

''جی نہیں میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی سب یہیں رکھیں جائیں گے''

''بڑی حریص ہو تم''

''حریص سہی، میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی''

''دس پانچ تو دے دو اتنی محنت سے لایا ہوں''

''جی نہیں ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا''

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے ضرور، ورنہ ان کے بار بار تقاضا کرنے پر منت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی وہ بھی بے دلی سے آج ان زیوروں سے مرصع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی اتراتی جاتی تھی، گویا کہتی ہے دیکھو میں کتنی حسین ہوں پہلے جو کلی تھی وہ آج کھل گئی ہے۔

لالہ صاحب پر گھڑوں کا نشہ چڑھا ہوا ہے، وہ چاہتے ہیں ان کے احباب و اعزہ آکر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی رپ لطف ہے جو انواع و اقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد، رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کر دیا ہے۔

انہوں نے تجویز کی "چلو کہیں سیر کر آئیں بڑی مزیدار ہوا چل رہی ہے"

آشا اس وقت کیسے آسکتی ہے ابھی اسے رسوئیں جانا ہے وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے تک فرصت ملے گی پھر گھر کے کام دھندے سر پر سوار ہو جائیں گے اسے کہاں فرصت ہے پھر کل سے اس کے کلیجے میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے، رہ رہ کر درد اٹھتا ہے ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا۔ رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچ کر دل ہی دل میں پھول اٹھے وہ گالیاں رنگ لا رہی ہیں راج وید نے آخر کہا بھی تھا کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کا استعمال کیجئے گا کیوں نہ ہو خاندانی وید ہے۔ اس کا باپ مہاراجہ بنارس کا معالج تھا پرانے مجرب نسخے ہیں

اس کے پاس۔

چہرے پر سراسیمگی کا رنگ بھر کر پوچھا ''تو رات ہی سے درد ہو رہا ہے تم نے مجھ سے کہا نہیں ورنہ وید جی سے کوئی دوا منگوا دیتا''

''میں نے سمجھا تھا کہ آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا مگر اب بڑھ رہا ہے''

''کہاں درد ہو رہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو کچھ آماس تو نہیں ہے؟''

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرما کر سر جھکا لے اور بولی ''یہی تمہاری شرارت مجھے اچھی نہیں لگتی جا کر کوئی دوا لا دو''

سیٹھ جی اپنی جواں مردی کا یہ ڈپلوما پا کر اس سے کہیں زیادہ محظوظ ہوئے جتنا شاید رائے بہادری کا خطاب پا کر ہوتے، اپنے اس کارنمایاں کی داد لیے بغیر انہیں کیسے چین ہو جاتا۔ جو لوگ ان کی شادی سے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے انہیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہنچے اور با دل دردمند بولے ''میں تو بھئی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا کل سے ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے کچھ عقل کام نہیں کرتی کہتی ہیں ایسا درد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔''

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بولے ''ہوا لگ گئی ہو گی، اور کیا؟''

سیٹھ جی نے ان سے اختلاف کیا ''پنڈت جی ہوا کا فساد نہیں ہے کوئی اندرونی شکایت ہے ابھی کمشن ہیں نہ؟ راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں''

''میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا''

''آپ بات نہیں سمجھتے یہی آپ میں نقص ہے''

"آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے مگر خیر دوا لا کر دیجئے اور اپنے لیے بھی دوا لیتے آیئے گا۔"

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے دوست لالہ پھاگ مل کے پاس پہنچے اور ان سے بھی قریب انہیں الفاظ میں پر ملال خبر کہی پھاگ مل بڑا شہدہ تھا مسکرا کر بولا "مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں "میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں اور تمہیں مذاق سوجھتا ہے ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں بھلا اس میں مذاق کی کیا بات ہے وہ ہیں کم سن، نازک اندام آپ ٹھہرے آزمودہ کار، مرد میدان بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈوا ڈالوں"

سیٹھ جی نے متین صورت بنائی "میں تو بھی بڑی احتیاط کرتا ہوں، تمہارے سر کی قسم"

"جی رہنے دیجئے میرے سر کی قسم نہ کھایئے میرے بھی ۔۔۔۔ بال بچے ہیں گھر کا اکیلا آدمی ہوں کسی قاطع دوا کا استعمال کیجئے"

"انہیں راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں"

"اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں آپ کے پاس ہے"

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا، شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آ گئی، سینہ جیسے کچھ فراخ ہو گیا۔ چلتے وقت ان کے پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگے اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج

ہو گئی۔ بشرے سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی راج وید نے مژدہ جانفزا سنایا تو بولے ''میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجئے گا آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی ذرا مہینے دو مہینے ان کا استعمال کیجئے اور پرہیز کے ساتھ رہیے، پھر دیکھیے ان کا اعجاز اب گولیاں بہت کم رہی ہیں لوٹ مچی رہتی ہے لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور وقت طلب ہے کہ ایک بار ختم ہو جانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں ہزاروں بوٹیاں ہیں۔ کیلاش نیپال اور تبت سے منگانی پڑتی ہیں، اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں کتنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔۔۔۔ آپ احتیاطاً ایک شیشی لیتے جایئے۔''

جگل نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کر کہا ''بس بہو جی آپ اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔ آج میں آپ کو چولہے کے پاس نہ آنے دوں گا''

آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا کیوں آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا۔

''آج کی بات دوسری ہے''

''ذرا سنوں تو کیا بات ہے''

''میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں''

''نہیں نہیں کہو میں ناراض نہ ہوں گی''

''آج آپ بہت سندر لگ رہی ہیں''

لالہ ڈنگامل نے سینکڑوں ہی بار آشا کے حسن و انداز کی تعریف کی تھی، مگر ان کی تعریف میں اسے تصنع کی بو آتی تھی۔ وہ الفاظ ان کے منہ سے کچھ اس طرح

سے لگتے تھے جیسے کوئی ہیجڑا تلوار لے کر چلے۔ جگل کے ان الفاظ میں ایک کیف تھا، ایک سرور تھا۔ ایک ہیجان تھا، ایک اضطراب تھا۔ آشا کے سارے جسم میں رعشہ آ گیا آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

''تم مجھے نظر لگا دو گے، اس طرح کیوں گھورتے ہو؟''

''جب یہاں سے چلا جاؤں گا تو تب آپ کی بہت یاد آئے گی''

''روٹی بنا کر تم کیا کرتے ہو؟ دکھائی نہیں دیتے''

''سرکار رہتے ہیں اسی لیے نہیں آتا پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے، دیکھیے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں۔''

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا ''کون تمہیں جواب دیتا ہے''

''سرکار ہی تو کہتے ہیں تجھے نکال دوں گا''

''اپنا کام کیے جاؤ کوئی نہیں نکالے گا اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے''

''سرکار ہیں بڑے گسہ ور''

''دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کیے دیتی ہوں''

''آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں''

''تم بڑے بدمعاش ہو خبردار، زبان سنبھال کر باتیں کرو''

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا وہ روشنی کی طرح کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جگل نے اسی بیباکی سے کہا ''میری زبان کوئی بند کر لے یہاں تو سبھی کہتے ہیں میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کر دے تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں، یا خود زہر کھا لوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں پھانسی ہی تو ہو گی۔''

آشا مصنوعی غصہ قائم نہ رکھ سکی جگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایک ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت مضبوط کرنے پر بھی درد دل باہر نکل ہی آیا ”قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”ایسی قسمت جائے جہنم میں“

”تمہاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی، دیکھ لینا“

”تو میں بھی زہر کھالوں گا، دیکھ لیجئے گا“

”کیوں؟ بڑھیا تمہیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی زیادہ خدمت کرے گی تمہیں سیدھے راستے پر رکھے گی“

”یہ سب ماں کا کام ہے بیوی جس کام کے لیے ہے اسی کے لیے ہے“

”آخر بیوی کس کام کے لیے ہے“

”آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا دیتا کس کام کے لیے ہے“

موٹر کی آواز آئی نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آ گیا تھا اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی ”لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے تم ذرا آ جانا“

☆☆☆☆☆☆

ستی

پہلی بار: ''چندن'' لاہور، مئی 1932ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1934ء (آخری تحفہ)

مایا کو دیکھتے ہوئے اس کا شوکلو کچھ بھی نہیں ہے پھر کیا وجہ ہے کہ مایا خوش و خرم ہے اور کلو مغموم اور متفکر؟ مایا کو کوڑی ملی ہے اسے دوسرا کون پوچھے گا کلو کو جواہر ملا ہے اس کے سینکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں خاص کر اسے اپنے چچا زاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا راجہ خوب صورت ہے اور رنگین مزاج باتیں کرنے میں چالاک ہے اور عورتوں کو رجھانا خوب جانتا ہے اس لیے کلو مایا کو باہر نہیں نکلنے دیتا اس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے، یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اب شب و روز محنت کرتا ہے تا کہ مایا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔ اسے نہ جانے کس جزائے خیر میں یہ عورت ملی ہے اور وہ اس پر دل و جان قربان کر دینا چاہتا ہے مایا کا کبھی سر بھی دکھتا ہے تو اس کی جان نکل جاتی ہے مایا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کلو گھر واپس نہیں آتا ماہی بے آب بنی رہتی ہے گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں جو مایا سے چھیڑ کیا کرتے ہیں، مگر اس کی نظر میں بدصورت کلو دنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا ''بھائی بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں''

مایا نے فوراً جواب دیا ''قسمت میں تو وہی لکھتے ہیں، تمہیں کیونکر پاتی؟''

راجہ نے دل میں سوچا اب مار لیا ''بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے''

مایا مسکرا کر بولی ''اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کرے گا''

راجہ خوش ہو گیا

(2)

تیج کے دن کلو مایا کے لیے لٹھے کی ساڑھی لایا جی تو چاہتا تھا کہ کوئی عمدہ سی ساڑھی لے، مگر روپے نہ تھے اور بزاز نے ادھار نہ مانا

راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا ایک عمدہ سی چندری لا کر مایا کی نذر کی

مایا نے کہا ''میرے لیے تو ساڑھی آ گئی ہے''

راجہ نے کہا ''میں نے دیکھی ہے جبھی تو اسے لایا ہوں وہ تمہارے لائق نہیں بھیا کو کنایت بھی سوجھتی ہے تو ایسی باتوں میں''

مایا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''تم سمجھا کیوں نہیں دیتے''

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا بولا ''بڈھا طوطا کہیں پڑھتا ہے''

مایا ''مجھے تو لٹھے کی ساڑھی پسند ہے''

راجہ ''ذرا یہ چندری پہن کو تو دیکھو کیسی کھلتی ہے''

مایا ''جو لٹھا پہنا کر خوش ہوتا ہے وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہو گا اسے چندری پسند ہوتی تو وہ چندری ہی لاتا''

راجہ ''انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے''

مایا نے تعجب سے کہا ''تو کیا میں اس سے بغیر پوچھے لے لوں گی؟''

راجہ ''اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟ جب وہ کام پر چلے جائیں، تب پہن لینا میں بھی دیکھ لوں گا''

مایا قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولی'' یہ نہ ہو گا دیور جی، کہیں دیکھ لیں تو میری شامت ہی آ جائے اسے تم لیتے جاؤ''

راجہ نے بضد ہو کر کہا'' ایسے نہ لو گی بھابی تو میں زہر کھا کر سو رہوں گا''

مایا نے ساڑھی اٹھا کر طاق پر رکھ دی اور بولی یہ لو اب تو خوش ہو

راجہ نے انگلی پکڑی'' ابھی تو بھیا نہیں ہیں، ذرا پہن لو''

مایا نے اندر جا کر چندری پہن لی اور پھول کی طرح مہکتی دمکتی باہر آئی

راجہ نے بازو پکڑنے کو ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ایسا جی چاہتا ہے، کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔

مایا نے اسی سرور انگیز انداز سے جواب دیا'' جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہو گا؟''

یہ کہہ کر مایا نے کواڑ بند کر لیے

راجہ کو ایسا معلوم ہوا، گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اٹھا لی گئی ہو۔

(3)

مایا کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ چندری کلو کو دکھا دے، مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی اس نے چندری رکھ کیوں لی؟ اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا ہے، لیکن راجہ کو کتنا رنج

ہوتا؟ کیا ہوا اس کی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اسے متھ رہا تھا۔ اس نے کیوں چندری رکھ لی؟ کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا، دغا کیوں ہوئی؟ اس میں دغا کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ راجہ سے بولی، ذرا سا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

کلو نے پوچھا ''آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟''

مایا کا بدن کانپنے لگا بہانہ کر کے بولی ''تمباکو مانگنے آئے تھے''

کلو نے ناک سکوڑ کر کہا'' اسے اندر مت آنے دیا کرو اچھا آدمی نہیں ہے''

مایا ''میں نے کہہ دیا تمباکو نہیں ہے تو چلے گئے''

کلو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا'' کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ وہ تمباکو مانگنے نہیں آیا''

مایا ''تو اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

کلو'' اور کسی کام سے آیا ہو، مگر تمباکو کو مانگے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا میرے گھر میں تمباکو نہیں ہے میں تمباکو کے لیے خود ہی اس کے گھر گیا تھا۔''

مایا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں چہرے کا رنگ اڑ گیا سر جھکا کر بولی ''میں کسی کے من کا حال کیا جانوں؟''

آج تیج کا برت تھا مایا پوجا کا سامان کر رہی تھی پر اس طرح گویا اس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد و ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا اس کے منہ میں کالکھ پت گئی ہو اور وہ کلو کی آنکھوں سے گر گئی ہے اسے اپنی زندگی ویران

نظر آتی ہے۔

سوچنے لگی، بھگوان نے مجھے یہ حسن کیوں دیا؟ یہ روپ نہ ہوتا تو، راجہ کیوں میرے پیچھے پڑتا اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی میں کالی اور بدصورت ہو کر اس سے کہیں زیادہ سکھی ہوتی تب تو دل اتنا چنچل نہ ہوتا۔ جنہیں روپ کی کمائی کھانی ہو وہ روپ کو لے جائیں۔ یہاں اس نے زندگی برباد کر دی۔

نہ جانے کب اسے نیند آ گئی دیکھتی ہے کلو مر گیا اور راجہ مر گیا اور راجہ گھر میں گھس کر اسے پکڑنا چاہتا ہے اسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آ کر اسے گود میں لے لیتی ہے اور کہتی ہے تو نے کلو کو کیوں مار ڈالا؟

مایا رو رو کر جواب دیتی ہے میں نے انہیں نہیں مارا

بڑھیا جواب میں کہتی ہے ''ہاں تو نے اسے چھری کٹارے نہیں مارا لیکن تیری دغا کٹارے سے زیادہ قاتل تھی۔''

مایا رو دی

مایا نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے صحن میں کلو سو رہا تھا وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلو نے گھبرا کر پوچھا ''کون ہے؟ مولا کیوں روتی ہو؟ کیا ڈر گئیں میں تو جاگ ہی رہا تھا۔''

مایا نے سسکی لے کر کہا ''مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی، اسے معاف کر دو''

کلو اٹھ بیٹھا اور بولا ''کیا بات ہے؟ کہو تو کیوں روتی ہو؟''

مایا ''راجہ تمباکو مانگنے نہیں آیا تھا میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا''

کلو ہنس کر بولا ''وہ تو میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا''

مایا ''وہ میرے لیے ایک چندری لایا تھا''

''تم نے لوٹا دی نا؟''

مایا کانپتے ہوئے بولی ''میں نے لے لی کہتے تھے، میں زہر کھالوں گا''

کلو لمبی سانس لے کر چارپائی پر گر پڑا اور بولا ''روپ تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔'' بھگوان نے بدصورت بنا دیا تو سندر کہاں سے ہو جاؤں۔

کلو نے اگر مایا کو کھولتے ہی تیل میں ڈال دیا ہوتا تو بھی اسے اتنا درد نہ ہوتا۔

(4)

کلو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ زندگی میں نہ وہ شوق رہا، نہ مزا، ہنسنا بولنا گویا بھول گیا۔ مایا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی، اس سے کہیں زیادہ اس نے سمجھ لیا اور یہی شبہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا۔ وہ گھر اب اس کے لیے صرف اٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی اور مایا صرف کھانا پکانے والی مشین، حظ نفس کے لیے وہ کبھی کبھی تاڑی خانے چلا جاتا یا چرس کے دم لگاتا۔

مایا اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی۔ وہ اس شبہ کو اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی، اس لیے دل و جان سے اس کی خدمت کرتی، اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی، مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتی اتنا ہی دور وہ اس سے کھنچتا تھا۔ گویا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔ غنیمت یہ ہوئی کہ راجہ جس

انگریز کے یہاں نوکر تھا اس کا تبادلہ ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ نہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا اس طرح سال بھر اور گزر گیا۔

ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا تو اس کو بخار تھا دوسرے دن اس کے جسم میں دانے نکل آئے۔ ملیا نے خیال کیا ماتا ہے مان منوتی کرنے لگی مگر چار پانچ دن میں ہی انے بڑھ کر آبلے ہو گئے، اور معلوم ہوا یہ ماتا نہیں، گرمی ہے، کلو کی خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔

بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔ آبلوں میں مواد پڑ گیا اور ران میں سے ایسی بدبو نکلنے لگی کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔ دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا وہ ملیا کرتی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ علاج کے لیے پیسے کی بھی ضرورت اور ملیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی کلو ادھر اپنے کیے کا پھل بھوگ رہا تھا، ملیا ادھر دوا دارو میں مری جا رہی تھی اگر کچھ صبر تھا تو یہی کہ کلو کا اندیشہ اور شبہ اس کی خدمت گزاری سے دور ہوتا جاتا تھا اسے اب یقین ہو رہا تھا کہ ملیا اب بھی اسی کی ہے وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا ہے تو پھر اسے دل میں رکھتا اور اس کی پرستش کرتا۔

صبح کا سہانا وقت تھا ملیا نے کلو کا ہاتھ منہ دھلا کر دوا پلائی اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی کہ کلو نے آنکھ میں آنسو بھر کر کہا ''ملا میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا کہ تم مجھے مل گئیں اگر تمہاری جگہ مجھے دنیا کا راج بھی ملے تو نہ لوں''

ملیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر لیا اور بولی ''اگر اس طرح کی باتیں

کرو گے تو میں رونے لگوں گی میں بڑی قسمت ور ہوں کہ تم جیسا شوہر پایا''

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دیئے اور بولی''

بھگوان نے مجھے میرے پاپوں کا بدلہ دیا ہے۔''

کلو نے پر خلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا'' سچ کہو مولا، راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا؟''

مایا نے حیرت میں آ کر کہا''میرے اور راجہ کے درمیان اگر کوئی اور معاملہ ہو تو بھگوان میری اس سے بری حالت کریں اس نے مجھے چندری دی تھی، وہ میں نے لے لی، پھر میں نے اسے آگ میں جلا دیا تب سے میں اس کے ساتھ نہیں بولی''

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا''میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی تمہیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا اور اب اس کا پھل بھوگ رہا ہوں''

اس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کر دیا اور مایا آنسوؤں کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی، اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی تو اس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد راجہ چھٹی لے کر آیا اور کلو کی مہلک بیماری کا حال سنا تو بہت خوش ہوا۔ تیمارداری کے بہانے سے کلو کے گھر آنے جانے لگا کلوا سے دیکھ کر منہ پھیر لیتا، لیکن وہ دن میں دو ایک بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن مایا کھانا پکا رہی تھی کہ راجہ نے رسوئی خانے کے دروازے پر آ کر کہا بھابی، کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہو گی؟ کتنی بے رحم ہو تم؟ کئی دن سے میں

تمہیں تلاش کر رہا ہوں مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو بھیا اب اچھے نہ ہوں گے، انہیں گرمی ہوگئی ہے، ان کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو تمہارا گلاب سا بدن سوکھ گیا ہے میرے ساتھ چلو، کچھ زندگی کے مزے اڑائیں، یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی یہ دیکھو تمہارے لیے ایک کرن پھول لایا ہوں ذرا پہن کر مجھے دکھا دو۔

اس نے کرن پھول مایا کی طرف بڑھا دیا مایا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، چولہے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی

''لالہ تمہارے پیروں پڑتی ہوں، مجھے مت چھیڑو، یہ ساری مصیبت تمہاری ہی لائی ہوئی ہے تم ہی میرے دشمن ہو، پھر بھی تمہیں شرم نہیں آتی کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں تب میں نہ ہوتی تو وہ دوسری لگائی کر لیتے اپنے ہاتھوں ٹھونک کھاتے۔آج میں ہی ان کا سہارا ہوں وہ میرے سہارے زندہ ہیں اگر مصیبت میں میں ان سے دغا کروں تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہوگا اور جب میں جانتی ہوں کہ اس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔''

راجہ نے ہنس کر کہا''یہ تو وہی ہوا جیسے کسی کی دال گر گئی تو اس نے کہا کہ مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے۔''

مایا نے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا''تم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو۔ بکتے کیا ہو، اجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا۔میری آنکھوں میں تو اب ان کے سامنے کوئی جچتا ہی نہیں''

کلو نے پکارا ''مولا تھوڑا پانی دے''

مایا پانی لے کر دوڑی چلتے چلتے کرن پھول ایسا ٹھکرایا کہ صحن میں جا گرا راجہ نے جلدی سے کرن پھول اٹھالیا اور غصہ میں چلا گیا۔

(5)

کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی معقول علاج ہوتا تو شاید اچھا ہو جاتا مگر اکیلی مایا کیا کیا کرتی غریبی میں کوڑھ میں کھاج ہے

آخر ایک دن **ملک الموت** کا پیغام آ ہی گیا مایا گھر کا کام کاج کر کے آئی تو دیکھا کلو کی سانس زور زور سے چل رہی ہے گھبرا کر بولی

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑے اور سر نیچا کر لیا یہ دم واپسیں تھا۔

مایا اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی اور ہذیان کے عالم میں بولی

''تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھوا، اور اس پر دیا لو کہاتے ہو اسی لیے مجھے پیدا کیا تھا، یہی تماشا دکھانے کے لیے! اے میرے سرتاج، تم تو اتنے بے درد نہ تھے، مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جا رہے ہو ہائے اب کون مولا کہہ کر پکارے گا؟ اب کس کے لیے کنوئیں سے پانی بھر کر لاؤں گی؟ کسے بٹھا کر کھلاؤں گی، کسے پنکھا دلاؤں گی؟ بھگوان نے سب کچھ لیا تو، مجھے کیوں نہیں لے چلتے۔''

سارا گاؤں جمع ہو گیا سبھی سمجھا رہے تھا، مایا کو صبر نہ ہوتا تھا یہ سب میری وجہ

سے ہوا یہ بات اسے نہ بھولتی تھی۔

(6)

کلوکو مرے چھ مہینے ہو گئے مایا کماتی ہے، کھاتی ہے اور اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی ہاں رات کو اکیلے میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے۔

ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے لگا اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا اب وہ بھی نہیں رہا، اب کے نوکری سے لوٹا، تو سیدھا مایا کے گھر پہنچا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولا۔

''بھابی اب تو میری امید پوری کرو گی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے اور ادھر میرے گھر والی بھی مر گئی میں نے تو اس کا غم بھلا دیا تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہو گی۔''

مایا نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''بھیا نہیں رہے تو کیا ہوا؟ بھیا کی یاد تو ہے، ان کی محبت تو ہے، ان کی صورت تو دل میں ہے، ان کی باتیں تو کانوں میں ہیں، میرے لیے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں، میں اب بھی انہیں ویسا ہی بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں۔ پہلے تو بدن کا بیچ تھا، اب تو وہ اور بھی مجھ سے قریب ہو گئے۔ اور جیوں جیوں دن گزریں گے اور بھی قریب ہوتے جائیں گے بھرے

پرے گھر میں دانے کی قدر کون کرتا ہے جب گھر خالی ہو جاتا ہے تب معلوم ہوتا ہے دانا کیا چیز ہے، پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں؟ پیسے کی قدر تب ہوتی ہے جب ہاتھ خالی ہوتا ہے، اس وقت آدمی ایک ایک کوڑی کو دانت سے اٹھاتا ہے۔ تمہیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا، تم کیا جانو، محبت کیا چیز ہے گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو تم مر گئے ہوتے تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ مگر جانتی ہوں میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا۔ ایسے ہی مردوں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جھوٹا کھانا ہی بدا ہے۔ کھاؤ، مگر خبردار! آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے نکل جاؤ میرے گھر سے۔''

اس کے چہرے پر اتنا جلال اور لہجے میں اتنی تندی تھی کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی، چپکے سے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

اسی عنوان کی ایک اور کہانی جس کے پس منظر میں بندملیکھنڈ ہے اور ہیروئن کا نام چنتا دیوی ہے وہ مارچ 1928ء میں ہندی ''مادھوری'' میں شائع ہوئی

اور

1928ء میں اردو میں ''خواب وخیال'' میں کتابی صورت میں شائع ہوئی

☆☆☆☆☆☆

ڈامل کا قیدی

پہلی بار:ہندی میں ''ہنس'' اکتوبر،نومبر 1932ء میں شائع ہوا
اردو میں شاہکار نومبر 1935ء میں
کتابی صورت میں:1936ء (زادِراہ)

(1)

دس بجے رات کا وقت، ایک عالیشان محل میں ایک سجا ہوا کمرہ صاف شفاف فرش،مسند تکیے بجلی کی انگیٹھی بجلی کی روشنی کرسمس کے ایام ہیں شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔

سیٹھ خوب چند افسروں کی خدمت میں ڈالیاں بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں پھلوں، میووں، کیلوں، مٹھائیوں اور کھلونوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے سامنے کھڑی ہیں بغل میں ایک بوڑھے منحنی منیم جی افسروں کے نام بولتے جاتے ہیں اور سیٹھ جی اپنے ہاتھوں سے حسب حیثیت ڈالیاں لگائے جاتے ہیں،چکنی چاند،دوہرا بدن، بنگلر کا کوٹ پہنے ہوئے۔

خوب چند ایک مل کے مالک ہیں اور بمبئی کے بڑے کنٹریکٹر،ایک بار شہر کے میئر بھی رہ چکے ہیں اس وقت بھی کئی تجارتی انجمنوں کے سیکرٹری اور صدر ہیں، یہ شہرت،اعزاز وثروت کس حد تک ڈالیوں کا طفیل ہے،کون جانے مگر اس میں اس کے دس پانچ ہزار ضرور بگڑ جاتے ہیں اور سیٹھ نیکی کر دریا میں ڈال والے انسان

نہیں ہیں ان کے چہرے سے ان کے کار پرواز صاف جھلک رہی ہے اگر دنیا انہیں خوشامدی، ٹوڈی، جی حضوری کہتی ہے تو کہے اور اپنا دل خوش کرے سیٹھ جی تاجر ہیں، اور تاجر کا کام نفع حاصل کرنا ہے جیسے بھی ملے۔

پجاری نے آ کر عرض کی "سرکار بڑی دیر ہو گئی ٹھا کر جی کا بھوگ ٹھنڈا ہو رہا ہے"

عام اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی مندر بنوایا تھا۔ ٹھا کر جی کی پوجا کرنے کے لیے ایک پجاری نوکر رکھ لیا اور روزانہ درشن کیا کرتے تھے، رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر۔

پجاری کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر بولے دیکھتے نہیں کیا ہو رہا ہے یہ بھی ایک کام ہے کہ کھیل نہیں ہے تمہارے ٹھا کر جی ہی سب کچھ نہ دیں گے پیٹ بھرنے پر ہی پوجا پاٹ بھی سوجھتی ہے، گھنٹے دو گھنٹے کی دیر ہو جانے سے ٹھا کر جی بھوکوں نہ مر جائیں گے اور نہ ٹھنڈا بھوک انہیں بدہضمی کرے گا۔

پجاری اپنا سا منہ لے کر چلا گیا اور سیٹھ جی پھر ڈالیاں سجانے میں مصروف ہو گئے ایک ہی منٹ بعد ان کے خاص دوست لالہ کیشو رام تشریف لائے، چند اٹھ کر ان کے گلے لپٹ گئے اور پوچھا کدھر سے؟ میں تو ابھی تمہیں بلانے والا تھا

کیشو رام نے مسکرا کر کہا اتنی رات تک ڈالیاں لگ رہی ہیں، بھلے آدمی اب تو سمیٹو، کل کا سارا دن پڑا ہے لگا لینا اور ان ڈالیاں سے ہوتا کیا ہے مفت کی زحمت آج کیا پروگرام ہے یاد ہے؟

خوب چند نے گردن اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی کیا کوئی خاص پروگرام تھا۔

یکا یک حافظہ بیدار ہو جاتا ہے

''اچھا وہ بات ہاں یاد آ گیا، ابھی تو دیر نہیں ہوئی''

''تو چلو پھر میں نے تو سمجھا تھا تم وہاں پہنچ گئے ہو گے''

''لیلا ناراض تو نہ ہو گی''

''یہ تو وہاں پہنچنے پر معلوم ہو گا''

''تم میری طرف سے معذرت کر دینا''

(2)

سیٹھ جی کا سدیشی مل ممتاز ملوں میں ہے جس سے سدیشی تحریک شروع ہوئی ہے مال کی کھپت دونی ہو گئی ہے اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان بھی کر دیا ہے کیونکہ غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے بمبئی چلے آ رہے ہیں تخفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ تھا۔

صبح کا وقت ہے مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے، پھاٹک پر کانسٹیبلوں کا پہرہ مل میں پوری ہڑتال ہے مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی مگر سیٹھ جی نہ دبے۔

اس وقت بھی سرغنہ سیٹھ جی کے پاس آخری شرطیں لے گیا لوگ اس کی واپسی

کا انتظار کر رہے ہیں ایک نوجوان سا مزدور سائیکل پر دوڑا ہوا احاطہ کے سامنے آیا۔

مزدوروں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی یہی لمبا دبلا، سانولا، نوجوان مزدوروں کا سرغنہ ہے۔

اس نے مایوسانہ انداز سے کہا ''سیٹھ جی بالکل ساعت نہیں کرتے تو پھر ہم کیوں ان کی خوشامد کریں ہڑتال سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور ہم مر مٹیں گے لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کے لیے راستہ صاف کر دیں گے! ہم خود مریں گے تاکہ دوسرے جئیں دوستو! زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں جب مرجانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہوگئی ہے آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل میں نہ گھسنے دیں گے چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں گولیاں برسیں بھائیو!۔۔۔۔''

ایک طرف سے آواز آئی ،سیٹھ جی آگئے ،سیٹھ جی آگئے۔

سبھی پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں کتنے ہی بدحواس ہو کر کانسٹیبلوں سے مل کر انہیں جانے کے لیے منت کرنے لگے کچھ لوگ روئی کی گانٹھوں کی آڑ میں جا چھپے جو ذرا دیر پہلے سے آئی تھیں اور مزدوروں کے ہجوم کے باعث اندر نہ جاسکی تھیں صرف مٹھی بھر آدمی سہمے ہوئے نوجوان سرغنہ کے ساتھ رہے گویا اپنی جان ہتھیلیوں پر لیے ہوئے۔

سیٹھ جی نے کار سے اترتے ہی کانسٹیبلوں کو حکم دیا ''ان بدمعاشوں کو مار بھگا دو''

فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے پڑنے لگے دس پانچ تو گر پڑے باقی اپنی جانیں لے کر بھاگے تو نوجوانس رغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا تھا۔

ثروت میں اتنا تحمل کہاں سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے کانسٹیبلوں نے ان تینوں آدمیوں کی گردن ناپی، حراست میں لے لیا اور لاڑی کی طرف لے چلے جو اسی لیے لائی گئی تھی۔

ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آ پہنچا اور انہیں رہا کرنے کے لیے مصر ہوا کانسٹیبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا انہیں چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے سیٹھ جی نے دانت پیس لیے ایک لمحہ میں صورت حال میں اتنا تغیر ہو جائے گا اس کا انہیں گمان نہ تھا اب وہ تنہا ہیں اور ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ صرف ریوالور ان کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا سیٹھ جی کے اوسان خطا ہو گئے موقع و محل کا امتیاز نہ رہا سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آ رہے ہیں نوجوان کی طرف نشانہ کیا اور ریوالور داغ دیا۔۔۔۔وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مزدوروں پر جیسے خون سوار ہو گیا۔اس کے قبل تک ان میں اہنسا و تشدد کا شائبہ تک بھی نہ تھا وہ منظم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے آپ ہماری مزدوری کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے لیکن انہوں نے اہنسا کو مشتعل کر دیا سب کے سب قاتلانہ ارادہ سے سیٹھ جی کی طرف لپکے گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اسے ملے سیٹھ جی نے دیکھا ہموار زمین پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے مگر بھاگنے کا کہیں راستہ نہ تھا جب کچھ نہ سوجھا تو روئی کی

گانٹھوں پر چڑھ گئے اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے والوں کو اوپر چڑھانے سے روکتے گئے نیچے پانچ چھ سو آدمیوں کا محاصرہ ہے اوپر سیٹھ جی تنہا ریوالور لیے کھڑے ہیں کہیں سے کوئی مدد نہیں آ رہی ہے ہر لمحہ زندگی کی امید نفی میں ڈوبتی جاتی ہے پچھتا رہے ہیں کہ بندوق کیوں نہ لیتا آیا ایک ایک کو بھون کر رکھ دیتا مگر کیا معلوم تھا اس مصیبت کا سامنا ہو گا دفعتاً زخمی نوجوان پیچھے سے آ کر سامنے کھڑا ہو گیا اس کے پاؤں میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور خون جاری تھا اس کا چہرہ زرد۔۔۔۔۔ہو گیا تھا اور آثار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بے چین ہے اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا اسے بچانا سیٹھ جی کو قتل کرنے سے زیادہ اہم تھا اس اہنسا کے جنون میں بھی اپنے سردار کو جیتا جاگتا دیکھ کر ان کے دل تشکر سے پر ہو گئے ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا "گوپی ناتھ کی جے" زخمی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کر کے ضعیف آواز میں کہا میں اب چند لمحوں کا مہمان ہوں بھائیو، شاید پھر مجھے نہ دیکھو اس لیے میری تم سے یہ آخری درخواست ہے کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو میرا کہنا مانو اگر سیٹھ جی کا بال بیکا ہوا تو میری آتما کو وہاں چین نہ آئے گا۔

لوگوں نے اعتراض کیے سرگوشیاں کیں، مخالفانہ آوازے بھی کسے، لیکن گوپی ناتھ کا حکم کیسے ٹالیں جس نے انہیں کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔

میدان صاف ہونے لگا صرف تھوڑے سے جاں نثار باقی رہ گئے تھے تو گوپی ناتھ نے سیٹھ جی سے عاجزی سے کہا

"سرکار آپ چلے جائیں میں جانتا ہوں آپ نے گھبراہٹ میں مجھے مارا ہے میں اس وقت بھی آپ سے یہی کہنے جا رہا تھا جو اب کہہ رہا ہوں مگر بھگوان کی

مرضی"

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے کچھ عقیدت ہوگئی نیچے اترنے میں کچھ اندیشہ ضرور تھا لیکن اوپر بھی تو جان بچنے کی کوئی امید نہ تھی ادھر ادھر نظروں سے تاکتے ہوئے وہ اترے اب بھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے ہیں ہر ایک آنکھ میں اشتعال ہے کچھ لوگ فحش کلامی کر رہے ہیں مگر کوئی ان سے بول نہیں سکتا شہید کی تحریک میں یہ اثر ہے۔

سیٹھ جی کار میں بیٹھے اور گوپی ناتھ زمین پر گر پڑا اور پھر نہ اٹھا

(3)

سیٹھ جی کی کار جتنی تیزی سے چل رہی تھی اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے گوپی ناتھ کی تصویر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے دوڑی چلی آتی تھی اگر گوپی ان کا دشمن تھا تو اس نے ان کی جان کیوں بچائی اور ایسی حالت میں جبکہ وہ خود مر رہا تھا اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا بے گناہ جیسے ہاتھ باندھے ہوئے تھے ان کے روبرو کھڑا کہہ رہا تھا آپ نے مجھے بے گناہ کیوں مارا؟ نفس کے بندے بالعموم لطیف احساسات سے محروم ہو جاتے ہیں لیکن سیٹھ جی کا ہردا بے حس نہ ہوا تھا کہ ایک بے گناہ کا خون کر کے انہیں افسوس نہ ہوتا وہ گھر پہنچے تو ان کے چہرہ پر وحشت چھائی ہوئی تھی مسند پر لیٹ گئے اور ایک لمبی سانس کھینچ کر پرمیلا سے بولے بڑا غضب ہو گیا پرمیلا میں نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا، وہی گوپی جا

مزدوروں کا سردار تھا معلوم نہیں کیوں مزدوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور گوپی پر ریوالور چھوڑ دیا حالانکہ اس غریب نے آخر دم تک مجھے بچانے کی کوشش کی اور اس کے سمجھانے کا یہ اثر ہے مزدوروں نے مجھے یہاں تک آنے دیا مجھے تو معلوم ہوتا ہے وہ کوئی دیوتا تھا ضرور مر گیا ہو گا حالانکہ زخم پاؤں میں تھا مگر وہ بچے گا نہیں میں کار میں بیٹھا ہوں تو میں نے اسے گرتے دیکھا میں نے اسے قتل کر دیا مجھے سمجھانے آ رہا تھا۔

سیٹھ کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھیں مشتعل ہو گئیں زور زور سے سانس کھینچنے لگے پیشانی پر عرق کے قطرے جھلک رہے تھے۔ بولے ذرا پنکھا کھول دو، پرمیلا گرمی لگ رہی ہے جسم پھنکا جاتا ہے اب مجھ سے نہیں رہا جاتا میں جا کر پولیس میں اپنے جرم کا اقبال کروں گا میں نے گوپی کو بے گناہ مارا۔۔۔۔۔۔بالکل بے گناہ۔

باہر شور ہو رہا تھا گوپی کے مرتے ہی مزدوروں نے اس کا جلوس نکالا تھا اور سیٹھ جی کے دروازہ پر مظاہرہ کرنے آ رہے تھے سیٹھ جی نے شور سنا اور اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔

پرمیلا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں بھیتر آ جاؤ مزدور تمہیں دیکھ لیں گے تو اور بھی طوفان مچائیں گے۔

سیٹھ جی نے ہاتھ چھڑا لیا اور بولے میں چھپنا نہیں چاہتا میں نے ایک بے گناہ کو قتل کیا ہے اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے اس لیے جان بچاؤں کہ میں نے دولت جمع کی ہے اور عزت حاصل کی ہے گوپی مجھ سے زیادہ دولت مند تھا مجھ سے زیادہ معزز تھا میں نے اس کا خون کیا ہے دیکھو پولیس مزدوروں کے پیچھے ہے مسلح

پولیس،مزدور دروازہ پر آ کر ماتم کریں گے شاید میرے دفتر میں آگ لگا دیں۔ لوٹ مچا دیں پولیس ان پر گولی چلائے گی نہیں میں اپنی جان بچانے کے لیے بے شمار جانیں نہ لوں گا مزدور میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے پولیس کے ہاتھوں دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا شاید تم سے پھر ملاقات نہ ہو مجھے معاف کرنا، تمہیں ایشور کو سونپا۔۔۔۔

وہ زینہ کی طرف چلے پرمیلا ان کے پیچھے دوڑی مگر سیٹھ جی نکل گئے اور پرمیلا وہیں کھڑی رہ گئی۔

(4)

مجرم خود اپنے جرم کا اقبال کر رہا ہو تو وکیل اور بیرسٹر کیا کرے سارا شہر عدالت میں آتا تھا اور سیٹھ جی کا بیان سن کر دانتوں میں انگلی دیتا تھا کچھ لوگ ان کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے تھے زیادہ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں خلل دماغ ہو گیا ہے۔

صفائی کے بیرسٹر نے ہر چند کوشش کی سیٹھ جی سے کہلائیں کہ انہوں نے اپنی حفاظت میں ریوالور چلایا لیکن سیٹھ جی نے یہ کسی طرح تسلیم نہ کیا ایک ماہر نفسیات نے لکھا ہے کہ زاہد اور گنہگار دونوں ہی دماغی توازن کے اختلال ہیں جب کوئی مشین بگڑ جاتی ہے تو وہ بالکل بند ہو جاتی ہے یا سوگنی رفتار سے چلنے لگتی ہے سرسام کا مریض اس اختلال کی ایک مثال ہے یا تو وہ دیوار پھاند جائے گا یا حرکت بھی نہ کر

سکے گا وغیرہ عدالت کو اب سزا دینے کے سوا چارہ نہ رہا اور سیٹھ جی کو حبس دوام کی سزا ملی۔

سیٹھ جی کے جاتے ہی تمول اور ثروت کی دیوی بھی روٹھ گئی مل تو پہلے بند ہو چکا تھا لینا دینا چکانے کے بعد معلوم ہوا یہ شان و شکوہ محض طلسم تھا ان طلسموں میں سے ایک جو بڑے بڑے مہاجن آئے دن باندھے رہتے ہیں جس کی بدولت وہ ہوا میں محل کھڑا کر دیتے ہیں پانی پر نقش بنا دیتے ہیں ساری دنیا کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر تاریک کو روشن دکھا سکتے ہیں مگر خوب چند کا یہ طلسم ٹوٹا تو گھر بھی سلامت نہ بچا پرمیلا کے پاس اب بھی ہزاروں کے زیور تھے اسی کے گزارہ کے لیے یہ اثاثہ بھی کافی تھا مگر شوہر کے نام کی لاج تو رکھنی ہی تھی کسی کو انگشت نمائی کا موقع کیوں ملے اس نے زیور بھی بیچ ڈالے اور سب قرضے چکا دیے وہ حاملہ تھی جب پرماتما نے اس پر اتنا رحم کیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دی تو وہ کیوں نہ خوش معاملہ بنے کیوں نہ سب کچھ پرماتما کے قدموں پر ہی نثار کر دے ساتویں مہینے جب روز سعید آیا تو پرمیلا ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں تھی وہ اپنی کشتی کنارے پر پہنچا دے گی جس نیک نیتی سے اس نے شوہر کے قرضے ادا کیے اس سے لوگوں کو اس کے ساتھ حسن اعتقاد ہو گیا تھا کچھ لوگ تو اسے ماہوار وثیقہ دینے پر بھی آمادہ تھے لیکن پرمیلا نے کسی کا احسان نہ لیا شریف گھرانوں میں اس کی رسائی تھی ہی وہ ان گھروں میں سدیشی چیزیں مہیا کر کے اپنے گزر بھر کو کما لیتی جب تک بچہ دودھ پیتا تھا اسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد وہ آزاد ہو گئی۔ بچے کو دائی کے سپرد کر

کے وہ معاش کی فکر میں نکل جاتی اور دن بھر کی دوا دوش کے بعد جب وہ شام کو گھر آتی اور بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی تو اس کا دل مسرت سے پھول اٹھتا اور عالم خیال میں وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاتی اسے دولت کے لٹ جانے کا ذرا بھر غم نہیں ہے ایشور نے اس کی تلافی کر دی ہے اب اس کی اتنی ہی آرزو ہے کہ سیٹھ جی زندہ و سلامت لوٹ آئیں اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں، پھر تو اس بے نوائی میں بھی شاکر رہے گی، وہ روز ٹھاکر جی کے قدموں پر سر جھکا کر اپنے شوہر کے لیے دعا مانگتی ہے اسے یقین ہے کہ ایشور اس پر مہربان ہیں عبودیت میں اسے صبر اور ہمت اور سکون کا القا ساہوتا رہتا ہے۔۔۔۔۔دعا ہی اب اس کی امید کا مرکز ہے۔

(5)

ایام معصیت امید کے سائے میں کٹ گئے پورے چودہ سال شام کا وقت ہے ہونہار کرشن چندر اپنی ماں کے پاس اداس بیٹھا ہے وہ نہ ماں کو پڑا ہے نہ باپ کو۔

پرمیلا نے اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے بالوں کو سلجھا کر پوچھا کیوں بیٹا تمہارا امتحان تو ختم ہوگیا۔

کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا ہاں امتحان تو ہوگیا ہے لیکن میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے میری طبیعت پڑھنے میں نہیں لگتی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں پرمیلا نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا مجھے یہ سن کر رنج ہوا ہے۔

کرشن چندر نے قصوروارانہ نظروں سے دیکھا، مجھے بار بار بابو جی کی یاد آتی ہے اماں وہ تو اب بوڑھے ہو گئے ہوں گے میں سوچا کرتا ہوں وہ آئیں گے تو دل وجان سے ان کی خدمت کروں گا اتنی عظیم الشان قربانی کس کی ہوگی اماں اس پر بھی کچھ لوگ انہیں بے رحم کہتے ہیں میں کئی بار گوپی ناتھ کے گھر گیا ہوں اماں ان کی بیوی ہے اور لڑکی ہے جو مجھ سے دو سال بڑی ہے ماں بیٹی دونوں اسی مل میں کام کرتی ہیں دادی بہت بوڑھی ہوگئی ہیں پرمیلا نے تعجب سے پوچھا تجھے ان کے گھر کا پتہ کیسے لگا۔

کرشن چندر خوش ہو کر بولا میں ایک دن مل میں گیا تھا میں جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں مزدوروں نے بابو جی کو گھیر لیا تھا اور وہ جگہ جہاں گوپی ناتھ گولی کھا کر گرا تھا مگر ان جگہوں کا اب وہاں پر نشان تک نہیں ہے عمارتیں بن گئی ہیں مل کا کام زوروں سے چل رہا ہے مجھے دیکھتے ہی بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا سب کہتے تھے تم بھیا جی گوپی ناتھ کا روپ بھر کر آئے ہو لوگوں نے وہاں شہید گوپی ناتھ کی تصویر لٹکا رکھی ہے میں اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا جیسے میری تصویر ہو، ہو بہو میری بس مونچھوں کا فرق ہے جب میں نے گوپی ناتھ کے گھر والوں کا حال پوچھا تو ایک آدمی دوڑ کر ان کی بیوی کو بلا لایا وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی اور نہ جانے کیوں مجھے رونا آ گیا عورتیں بڑی تکلیف اٹھا رہی ہیں اماں مجھے ان پر ترس آتا ہے ہم ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اماں۔

پرمیلا ڈری ان جھگڑوں میں پڑ کر لڑکا کہیں پڑھنا نہ چھوڑ بیٹھے بولی ابھی ہم ان کی کیامدد کر سکتے ہیں بیٹا دولت ہوتی تو کہتی دس پانچ روپے دیا دیا کرو لیکن گھر کا حال تو تم جانتے ہی ہو ابھی جی لگا کر پڑھو جب تمہارے بابو جی آ جائیں تب شاید ہمارے اچھے دن آ جائیں۔

اس وقت کرشن چندر خاموش ہو گیا، لیکن آج سے اس کا یہ معمول ہو گیا کہ اسکول سے لوٹ کر ایک بار گوپی ناتھ کے ہاں ضرور جاتا۔ پرمیلا اسے خرچ کے لیے جو پیسے دیتی ان سے ان بے کسوں کی مدد کرتا کبھی پھل کے لیے کبھی سبزی لے لی، کبھی کچھ

ایک دن کرشن کو گھر آنے میں دیر ہوئی تو پرمیلا بہت گھبرائی پوچھتی پاچھتی گوپی کے گھر پہنچی تو دیکھا ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ میلے متعفن گھر کے اندر گوپی ناتھ کی بیوہ ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہوئی ہے اور کرشن چندر کھڑا اسے پنکھا جھل رہا ہے بولی آج تم یہاں کب تک رہو گے بیٹا۔ دیا بتی کا وقت آ گیا چلو اب دیر نہ کرو۔

کرشن چندر کو ماں کا آنا ناگوار ہوا بولا، میں تو ابھی نہ جاؤں گا، اماں دیکھو کا کی کتنی بیمار ہے دادی کو کچھ سوجھتا نہیں بنی کھانا بنا ہی ہے ماں کے پاس کون بیٹھے۔

لیکن یہاں پھر بھی تین ہیں آدمی ہیں میں تو اکیلی ہوں اس وقت چلو، سویرے آجانا۔

مریضہ نے پرمیلا کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور ضعیف آواز میں بولی'' آؤ ماتا جی بیٹھو میں تو بھیا سے کہہ رہی تھی دیر ہو رہی ہے اب گھر جاؤ مگر یہ گئے ہی

نہیں مجھ ابھاگن پر نہ جانے کیوں اتنی دیا آتی ہے“

مکان میں دم گھٹ رہا تھا ہوا کا کہیں گزر نہیں لیکن کرشن چندر ایسا خوش تھا گویا کوئی پردیسی چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر اپنے گھر آ گیا ہو۔

پرمیلا نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک دیوار پر اسے ایک تصویر نظر آئی اس نے قریب جا کر تصویر دیکھی تو اس کا سینہ دھک سے ہو گا بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی

”تو نے یہ تصویر کب کھنچوائی تھی، کرشنا نے مجھ سے کہا بھی نہیں“

کرشن مسکرا کر بولا ”یہ میری تصویر نہیں ہے اماں گوپی ناتھ کی تصویر ہے“

پرمیلا کو یقین نہ آیا چل جھوٹا کہیں کا

مریضہ نے حسرت ناک لہجہ میں کہا ”بھیا ٹھیک کہتے ہیں، ماتا جی میرے آدمی ہی کی تصویر ہے بھگوان کی لیلا کون نہیں جانتا مگر بھیا کی صورت ان سے ملتی ہے کہ مجھے اچرج ہوتا ہے اور سبھاؤ بالکل وہی ہے۔“

پرمیلا پر ایک نامعلوم دہشت کا غلبہ ہوا جیسے اس نے کوئی برا خواب دیکھا ہو اس نے کوئی جواب نہ دیا کرشن چندر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دروازہ کی طرف چلی گویا کوئی اسے اس کے ہاتھوں سے چھینے لیے جاتا ہو۔

مریضہ نے صرف اتنا کہا ماتا جی کبھی کبھی انہیں میرے پاس آنے دیا کرو نہیں تو میں مر جاؤں گی۔

پندرہ سال کے بعد سیٹھ خوب چند اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے ہرا بھرا درخت ٹھونٹھ ہو کر رہ گیا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں سر کے بال سن ڈاڑھی

جنگل کی طرح بڑھی ہوئی داڑھی گویا کہیں کھو گئے مگر مکان ،ٹھونٹھ دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے یہ وہی تناور درخت ہے جس کی گھنی ٹہنیوں میں چڑیاں بسیرا کر لیتی ہیں۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر وہ سوچنے لگے کہاں جائیں، اپنا نام لیتے شرم آتی تھی بے حیا ابھی زندہ ہے عاقبت کے بورئیے بٹورنے کے لیے کس سے پوچھیں، پرمیلا جیتی ہے یا مر گئی ہے اگر ہے تو کہاں ہے انہیں دیکھ کر خوش ہو گی یا منہ پھیر لے گی۔

خوب چند کی کوٹھی ابھی تک خوب چند کی کوٹھی کہلاتی تھی زبان خلق قانون کے الٹ پھیر کیا جانے اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک پان والے سے پوچھا کیوں بھیا یہی تو خوب چند کی کوٹھی ہے؟

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے پان لگاتے ہوئے کہا سیٹھ خوب چند کی جب تھی تب تھی اب تو لالہ دیسراج کی ہے۔

’’اچھا مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے ،سیٹھ جی کے یہاں نوکر تھا سنا سیٹھ جی کو کالا پانی ہو گیا تھا،‘‘

ہاں بچارہ بھل مانسی میں مارا گیا چاہتے تو بے داغ بچ جاتے مگر نصیب سارا گھر مٹی میں مل گیا۔

’’سیٹھانی تو ابھی ہوں گی‘‘

’’ہاں سیٹھانی کیوں نہیں ہیں سیٹھ جی کا ایک لڑکا بھی ہے‘‘

سیٹھ جی کے چہرہ پر جوانی ناچ اٹھی زندہ کا وہ جوش اور ولولہ جو آج پندرہ سال سے کنبھ کرن کی طرح پڑا سو رہا تھا گویا نئی زندگی پا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور اس وقت تو

وہ استخوان میں سما نہیں رہا ہے۔

انہوں نے اس بے تکلفی سے پان والے کا ہاتھ پکڑ لیا گویا پرانی دوستی ہے اور بولے اچھا ان کا لڑکا بھی ہے کہاں رہتی ہیں۔ سیٹھانی ذرا بتا تو دو جا کر سلام کر آؤں بہت دنوں ان کا نمک کھایا ہے۔

تنبولی نے پرمیلا کے مکان کا پتہ دیا وہ اسی محلّہ میں رہتی تھی سیٹھ جی گویا آسمان میں اڑتے ہوئے یہاں سے چلے پرمیلا کے گھر کی طرف۔

راستے میں ٹھاکر جی کا مندر نظر آیا سیٹھ جی نے مندر میں جا کر مورتی کے سامنے سر جھکا دیا ان کے لیے ایک ایک روئیں سے عقیدت اور استحسان کے نغمے سے نکل رہے تھے اس طولانی کوفت اور یاس کے عالم میں ان کی مجروح اور مجبور آتما کو اگر عافیت ملتی تھی تو وہ یہی عبادت اور حبہ سائی تھی دن بھر ایکھ کے کولھو میں جتے رہنے یا پھاوڑے چلانے کے بعد جب وہ رات کو زمین کی آغوش میں سوتے تو ان کی روح کی گہرائیوں سے درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی صدا نکلتی تھی ''ایشور مجھ پر رحم کرو'' جب ان کے پاس ثروت تھی عیش کے سامان تھے جوانی تھی اختیار تھا انہیں عبادت کے لیے موقع نہ ملتا تھا دل وسواہی کی طرف لپکتا تھا اب محروم اور پامال ہو کر انہیں خدا کے سوا اور کہیں سایہ نہیں ملتا تھا پانی جب تک کائی کا پردہ ہے اس میں روشنی کا گزر کہاں۔

سیٹھ جی مندر سے نکلے ہی تھے کہ ایک عورت نے مندر میں قدم رکھا خوب چند کا دل اچھل پڑا خون کا ایک ایک قطرہ ناچ اٹھا اور ایک از خود رفتگی کی حالت میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے معلوم ہوا دل کی مسرت آنکھوں سے نکل پڑی

ہے یہ پرمیلا تھی۔

ان پندرہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہیں پرمیلا کی یاد نہ آئی ہو وہ حسن اور شباب کی تصویر ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی آج اس تصویر اور حقیقت میں کتنا فرق نظر آیا تصویر زمانہ کے اثرات سے مامون تھی اس پر دکھ سکھ کا کوئی نشان نہ تھا وہ ہی شرمیلی نگاہیں تھیں وہی دلفریب تبسم اس حقیقت میں انہیں عامل کامل جلال نظر آیا اور ان کا دل وجد میں ڈوبے ہوئے ترنم کی طرح تھرتھرا اٹھا ایک ولولہ سا اٹھا کہ اس کے قدموں میں گر پڑوں اور کہوں اس بدنصیب کو اپنے آنچل میں پناہ دو مگر اس ہیبت کذائی میں اس کے روبرو جاتے انہیں شرم دامنگیر ہوئی۔

پرمیلا نے ٹھاکر جی کی پوجا کر کے تلسی جل لیا اور مندر کے باہر نکلی خوب چند بھی اس کے پیچھے چلے کچھ دور آگے چل کر ایک کئی منزل کا چال ملا پرمیلا چال میں داخل ہوئی سیٹھ بھی اندر گھسے مگر وہ تو ایک پوری بستی تھی پرمیلا کدھر گئی کیا خبر، دفعتاً ایک نوعمر لڑکے کو اندر سے نکلتے دیکھ وہ پکار اٹھے ذرا سنو تو بیٹا تم سے کچھ پوچھنا ہے۔

لڑکا آہستہ سے ان کی طرف آیا۔۔۔ ایک لمحہ غائر نظروں سے ان کی طرف دیکھا پھر چشم پرآب ہو کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا سیٹھ جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا یہ تو گوپی ہے صرف عمر میں کچھ کم وہی صورت، وہی قد و قامت، وہی خدو خال وہ عالم بالا سے اتر آیا اور تازہ جوان ہو کر انہیں رعشہ سا آ گیا ہیئت ان کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔

کرشن چندر نے ایک لمحہ میں اٹھ کر کہا۔۔۔۔۔ہم کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں اندر آیئے میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔۔۔۔۔کہیں بھی دیکھ کر پہچان جاتا۔

خوب چند اس کے ساتھ اندر چلے تو مگر ان کا دل جیسے خیالات کے بھنور میں پڑا ہوا تھا۔گوپی کی صورت کیا کبھی ذہن سے اتر سکھتی تھی اس کے چہرہ کو انہوں نے کتنی بار خواب میں دیکھا تھا وہ سانحہ ان کی زندگی کا سب سے یادگاری وقوعہ تھا۔ گوپی کی وہ صورت بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

کرشن چندر زینے کے پاس رک کر بولا جا کر اماں سے کہہ آؤں آپ کے لیے نئے نئے کپڑے بنے رکھے ہیں۔

خوب چند نے لڑکے کو گود میں لے کر اس طرح کا بوسہ لیا جیسے وہ بچہ ہو اور اسے گود میں لیے ہوئے زینے پر چڑھے اور بے تکان چڑھتے چلے گئے۔

(7)

آج سیٹھ جی کو آئے ساتواں دن ہے صبح کا وقت ہے سیٹھ جی سندھیا کرنے جا رہے ہیں کہ گوپی ناتھ کی بیٹی نے آ کر پرمیلا سے کہا" ماتا جی اماں کا جی اچھا نہیں ہے بھیا کو بلا رہی ہیں۔"

"آج وہ نہ آ سکے گا۔اس کے پتا جی آ گئے ہیں۔ان سے باتیں کر رہا ہے"

کرشن چندر نے کمرہ سے ان کی باتیں سن لیں فوراً برآمدہ میں آ کر بولا نہیں

اماں میں دادا سے پوچھ کر ذرا دیر کے لیے چلا جاؤں گا۔

پرمیلا نے خفا ہو کر کہا تو وہاں جاتا ہے تو تجھے گھر کی سدھ نہیں رہتی نہ جانے ان سبھوں نے تجھے کیا بوٹی سنگھادی ہے۔

"میں بہت جلد چلا آؤں گا ماں تمہارے پیروں پڑتا ہوں"

"تو بھی عجیب لڑکا ہے وہ بچارے اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں جانے کی پڑی ہے سیٹھ جی نے یہ باتیں سنیں آ کر بولے کیا ہرج ہے جلدی آنے کو کہہ رہے ہیں تو جانے دو، کرشن چندر خوش ہو کر بنی کے ساتھ چلا گیا پرمیلا بولی"

"جب سے میں نے گوپی کی تصویر دیکھی ہے مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بھگوان نہ جانے کیا کرنے والے ہیں بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کی تصویر ہے"

سیٹھ جی نے بھی تشویش ظاہر کی میں تو پہلی بار اسے دیکھ کر چونک گیا تھا معلوم ہوا گوپی ناتھ ہی کھڑا ہے۔

"گوپی ناتھ کی گھر والی کہتی ہے کہ اس کی چال ڈھال بھی گوپی جیسی ہے"

"بھگوان کی لیلا ہے کہ جس کی میں نے جان لی وہ میرے بیٹے کے روپ میں جنم لے"

دو گھنٹے گزر گئے اور کرشن چندر گھر نہیں آیا ماں بیتاب ہونے لگی سیٹھ جی کو بھی تشویش ہوئی کیا کرنے لگا اس کی عادت ہے گوپی کے گھر جاتا ہے تو اسے کھانے پینے کی سدھ نہیں رہتی۔

دوپہر ہوا شہر میں خبریں اڑنے لگیں کہ مل میں ہڑتال ہوگئی پولیس لاریوں میں

دوڑی جا رہی ہے پرمیلا دہشت سے گرزنے لگی بار بار کھڑکی سے دیکھتی ابھی نہیں آیا کہیں ہڑتالیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔

اچھا یہ مجمع کیسا چلا آ رہا ہے اسی طرف آتا ہے کوئی ایک ہزار آدمی ہوں گے کوئی ارتھی معلوم ہوتی ہے ارتھی ہے، سیٹھ جی جھانکنے لگے ضرور کوئی بڑا رئیس مر گیا ہے وہ جلوس پرمیلا کے مکان کے پیچھے رک گیا اور آواز آئی۔

''شہید کرشن زندہ باد''

پرمیلا کا خون جیسے خشک ہو گیا وہ مدہوشی کے عالم میں زینے کی طرف دوڑی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی سیٹھ جی نے بھی نعرہ سنا مگر ان کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔

صبر اور سکون کے ساتھ نیچے آئے لاش کو گلے سے لگا لیا اس کا بوسہ لیا دریافت کیا معلوم ہوا مل میں آج ہڑتال تھی مینجر نے حاضری کے متعلق کچھ نئے قاعدے نافذ کیے تھے مزدوروں نے اسے منظور نہ کیا، مل میں ہڑتال ہوئی کرشن چندر کو مزدوروں نے اپنا سرغنہ بنایا اس کی کم عمری کے باوجود مزدوروں کو اس پر کامل اعتماد تھا ان کو یقین تھا کہ یہ گوپی کا اوتار ہے گوپی کی بیوی نے اس معاملہ میں مشورہ کرنے کے لیے آج کرشنا کو بلایا تھا کرشنا مزدوروں کا نمائندہ بن کر آدمیوں کے ساتھ پولیس کی مزاحمت کے باوجود مینجر سے ملنے جا رہا تھا ہنگامہ ہو گیا پولیس نے گولیاں چلائیں اور کرشن چندر ان کی بندوق کا نشانہ بن گیا سیٹھ جی اسی اطمینان کے ساتھ اوپر گئے اور پرمیلا کو سنبھال کر نیچے لائے پرمیلا بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی اور بین کرنے لگی رونے لگی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔

کئی منٹ گزر گئے پرمیلا لاش کو سینے سے لگائے روتی رہی جس نعمت کو پا کر

اس نے مصیبت کو راحت سمجھا تھا اس سے آج وہ محروم ہوگئی یا اس کی تاریکی میں جس شمع سے امید اور صبر کی روشنی پا رہی تھی وہ شمع بجھ گئی۔

سیٹھ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کیا کرتی ہو پرمیلا جس کی موت پر ایشور کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اس کی موت پر روتی ہو ظلم کے سامنے سینہ سپر ہو جانے سے بہتر موت کس کو نصیب ہوتی ہے۔

پرمیلا نے دہشت زدہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی تم سمجھتے ہو گے کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے میں ایسا نہیں سمجھتی کیوں سمجھوں ہائے میرا لال، میرا راجہ، میرا سورج، میرا چندا، میری زندگی کے سہارے تجھے کھو کر کیسے صبر کروں جسے گود میں دیکھ کر نہال ہوگئی تھی اسے زمین پر پڑا دیکھ کر دل کو کیسے سنبھالوں۔

اسی رات کو وہ غم نصیب ماں دنیا سے رخصت ہوگئی چڑیا اپنے بچے کی تلاش میں پنجرے سے نکل گئی اور سیٹھ خوب چند آج بھی مزدوروں کے محلّہ میں ان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بدنصیب ماں

پہلی بار: ہندی میں ''بیٹی والی ودھوا'' کے عنوان سے ''چاند'' نومبر 1932ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں: فروری 1938ء (واردات)

پنڈت اجودھیا ناتھ کا انتقال ہوا تھا تو سب نے کہا ''ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے'' چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی، اثاثہ بھی کافی، پختہ مکان دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد، بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا تو لازمی تھا اور وہ کئی دن تک بے حال رہی۔ لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اسے تشفی ہوئی چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہوئیں ایک سے ایک فرماں بردار جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پانو دباتیں وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساری دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا بڑا لڑکا کامتا ناتھ ایک دفتر میں پچاس روپے کا نوکر تھا دوسرا اماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا تیسرا دیاناتھ بی اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہن اور ہونہار تھا اور امسال بی اے اول درجے میں پاس کر کے ایم اے کی تیاری میں مصروف تھا کسی میں وہ لاابالیاں نہ تھیں۔ نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں

بڑھیا گھر کی مالکن تھی اگر چہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا پنڈت جی کو مرے آج بارھواں دن تھا کل تیرھویں ہے برہم بھوج ہوگا برادری کی دعوت ہوگی اسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں پھول متی حجرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ پلے دار بوروں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں گھی کے ٹین آ رہے ہیں سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مسکیاں سب چلی آ رہی ہیں۔ مہا برہمن کے لیے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن، پلنگ، بستر، کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی حسب ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہیے تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی، انہیں پسند کرتی، ان کی مقدار میں کمی بیشی کرتی تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی اچھا! اور آٹا تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا گھی کے پانچ کنستر آئے اس نے دس کنستر منگوائے تھے شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہوگی کس نے اس کے حکم میں مداخلت کی جب اس نے بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا اس نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے ایک کہا تو ایک کسی نے مین میکھ نہ کی، یہاں تک کہ پنڈت اجودھیا ناتھ سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے وہ اسے کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کیے بیٹھی رہی پر آخر اس سے رہا نہ گیا خود پروری اس کی فطرت ثانی بن گئی تھی غصے میں بھری ہوئی آئی اور کامتاناتھ سے بولی کیا آٹا تین بورے لائے، میں نے پانچ بوروں کے لیے کہا تھا اور گھی بھی پانچ کنستر تمہیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے کفایت کو میں برا نہیں کہتی لیکن جس نے یہ کنواں کھودا اس کی آتما پانی کو ترسے تو کتنے شرم کی بات ہے۔

کامتاناتھ نے معذرت نہیں کی عذر گناہ نہیں کیا، نادم بھی نہیں ہوا فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا پھر بولا ''ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوروں کی ہوئی اور تین بوروں کے لیے پانچ کنستر گھی کافی تھا اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کردی گئیں''

پھول متی تیز ہو کر بولی ''کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟''

''ہم لوگوں کی رائے سے''

''تو میری رائے کوئی چیز نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم بھی سمجھتے ہیں''

پھول متی ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگی اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا، اپنا نفع نقصان یہ ''اپنا'' کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس گھر کے نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے دوسروں کو خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لونڈا اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے اس نے مر مر کر یہ گرہستی جمع کی ہے میں تو غیر ہوں ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا ''میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو مجھے اختیار ہے میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں ابھی جا کر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔''

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہہ کر دی تھی اور اب وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرے میں چلی آئی حالاں کہ کامتا ناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے ایسا مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی اتنی تنبیہہ پر بھی کسی کو اس کی نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے یہ اس کے ذہن میں نہ آیا مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی رشتہ داروں کے یہاں سے نوید میں گھی، شکر مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو ان چیزوں کو خاص انداز سے سنبھال کر رکھ رہی تھی تینوں چھوٹی بہویں بھی بھنڈارے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے پوچھنے نہیں آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتا ناتھ سے یا بڑی بہو سے، کامتا ناتھ کہاں کا بڑا مہتمم ہے دن بھر بھنگ پیے پڑا رہتا ہے اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہو گی اور کیا سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے، وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی تب ادھر ادھر بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لیے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہیے کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی، کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتل پر پہنچے گی کسی پر نہیں آخر ان سبھوں کو کیا ہو گیا ہے اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے، وہ

سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے کنجی اس کے پاس ضرور، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی، آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے میں کچھ ہوں ہی نہیں، اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا ''سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کیا''

بڑی بہو نے بے باکانہ انداز سے کہا ''بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیا جائے گا؟''

کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے مجھے کچھ معلوم نہیں جب تک حساب کتاب نہ ہو جائے روپے کیسے دیے جائیں؟

''حساب کتاب سب ہو گیا ہے''

''کس نے کیا؟''

''اب میں کیا جانو جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو''

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی تو کہیں گے کہ پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے جب مہمان رخصت ہو جائیں تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی دیکھے گی اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں اس عرصے میں وہ کارپردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی بارہ بجتے بجتے دعوت شروع ہوئی ساری برادری کے لوگ یک بارگی کھانے کے لیے بلا لیے گئے پھول متی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی صحن میں مشکل سے ڈھائی

سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی دو پنگوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا یہی تو ہوتا دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتاً شور مچا ''ترکاریوں میں نمک نہیں''

بڑی بہو جلدی سے نمک پینے گئی پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی بارے نمک پسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

یکا یک پھر شور مچا ''پانی گرم ہے''

گھر میں برف نہ تھی آدمی بازار دوڑا گیا بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں، آدمی ناکام لوٹ آیا، مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی ایسی بدانتظامی اس کے گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی کسی کو بھی سدھ نہ رہی سدھ کہاں سے آئے جب کسی کو گپ مارنے سے فرصت نہ ملے مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں اچھا پھر کیوں گھر میں ہل چل مچی؟ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری چوہیا نکل آئی یا بھگوان؟ اب تمہیں آبرو رکھیو چھی! اس پھوہڑ پن کی بھی کوئی حد ہے سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں نہ اٹھیں تو کیا کریں آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا پھول متی کے دل میں ایسا ابال اٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا لے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا بدنامی ہوئی وہ الگ، اب

اس سے ضبط نہ ہو سکا مہمان اٹھ چکے تھے پتلوں میں کھانا جوں کا توں پڑا تھا چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھیں۔ اس وقت پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں؟ یا ابھی کچھ کسر ہے ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلو بھر پانی میں شہر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا مذاق اڑایا جائے گا تم لوگوں کو کچھ شرم وحیا تو ہے نہیں تمہیں کیا، آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا۔

کامتا ناتھ کچھ دیر تو کھڑا استا رہا آخر جھنجھلا کر بولا ''اچھا اب رہنے دو اماں غلطی ہوئی، ہم سب مانتے ہیں بہت بڑی غلطی ہوئی لیکن اب کیا اس کے لیے آدمیوں کو حلال کر ڈالو گی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں، پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کرتا ہے کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا ''ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہو گا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہو گی انہوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاو میں ڈال دیا۔''

کامتا ناتھ نے بیوی کو ڈانٹا ''اس میں نہ کملا کا قصور ہے، نہ تمہارا نہ میرا، اتفاق ہے، اتنے بڑے بھوج میں ایک ایک مٹھی ترکاری کڑھاو میں نہیں ڈالی جاتی ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیے جاتے ہیں اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نک کٹائی تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔''

پھول متی ''شرماتے تو نہیں الٹے اور بے حیائی کی باتیں کرتے ہو''

کامتا ''شرماؤں کیوں، کسی کی چوری کی ہے؟ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے ہماری نگاہ نہ پڑی بس یہی بات بگڑ گئی ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔''

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی ''کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا''

کامتا ناتھ ماں کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر بولا ''کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا یہ دھر ماتما لوگ جو پتل سے اٹھ کر گئے ہیں ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہوتا اب کے کچھوے اور گھونگھے تک تو کسی سے بچتے نہیں کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے۔''

پھول متی کے پاس ایسی کٹھ حجتیوں کا جواب نہ تھا اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

(2)

دو مہینے گزر گئے رات کا وقت ہے چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتا ناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا ''میں تو کمد کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔''

اماناتھ: تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں، پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک

کے حصے میں آتے ہیں مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔

دیاناتھ: مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے، پانچ ہزار اپنے ہوں گے، تو پانچ ہزار کا کوئی ساجھی اور مل جائے گا میں تو اپنے روپے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔

کامتا نہ دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو، لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی رہ سکتی ہے بدنصیب ہو تو راجا کے گھر میں روتی رہے گی، یہ تو نصیبوں کا کھیل ہے۔

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا ''یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے ان سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے میں اپنے حصے کے سب روپے دے دوں گا۔''

کامتا ناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا ''سنتے ہو اس کی باتیں''

اما: جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی

کامتا: اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمہاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں

سیتا: جی ہاں یاد ہے

اما: اور جو کہیں تمہیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے کل وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیا کہاں سے لاؤ گے؟ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟

کامتا: او روظیفہ تمہیں ملے گا کہو میں آج لکھ دوں

اس دلیل سے سیتا ناتھ کو بھی توڑ لیا فی الواقعہ اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے کمد کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کرسکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کرے۔

بولا ''ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی''

کامتا: تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کمد کی شادی کم سے کم خرچ میں کردی جائے ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کرسکتے۔

''پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم اے، بی اے نہ سہی، ججمانی سے ان کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں، عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے مجھے یقین ہے وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے۔''

اما: وہاں جہیز کا کوئی سوال نہیں تیسری شادی ہے۔

کامتا: یہ نہ کہو وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پاسکتے ہیں مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے تو یہی صلاح کہ مراری لال کو جواب دیا جائے اور دین دیال کے ساتھ سگائی کی جائے۔

دیا: اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔

کامتا: اماں سے پوچھا بے کار ہے ان کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے وہی پرانے وقتوں کی باتیں! مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔

اما: وہ مانیں گی نہیں اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی دیکھ لیجئے گا

کامتا: ہاں یہ ممکن ہے زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے یہ ان کا استری دھن ہے وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں۔

دیا ناتھ: استری دھن ہے تو کیا اسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے

کامتا: کسی کی کمائی ہو استری دھن عورت کی چیز ہے

اما: یہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں استری دھن کوئی چیز نہیں گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہے اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آ جائیں تو صاف صاف کہہ دو تب کیا کر لیں گی۔

دیا: ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔

کامتا: مجھے دھوکے کی چال مناسب نہیں معلوم ہوتی جس پر ہمارا حق ہے اس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔

دیا ناتھ: تو آپ الگ بیٹھیے میں جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجئے گا۔

کامتا: نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا

سیتا: میرا بھی استعفیٰ ہے۔

اما: ان لوگوں کو جانے دو جی ہم اور تم مل کر رنگ جمالیں گے یہ دھرماتما لوگ ہیں، بھیا نوکر ہی ہیں سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے ضرورت تو ہمیں اور تمہیں ہے۔

بڑی بہو نے فرمایا "پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ اتنے دن مجھے آئے ہو گئے پیتل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا توفیق ہی نہ ہوئی آج دھرماتما بنے ہیں۔"

اما: اماں کے زیور مل جائیں گے تو ان کا ہار تمہیں دے دوں گا بھائی خاطر جمع رکھو۔

بڑی بہو: مل چکے وہ گڑ نہیں جو چیونٹے کھا جائیں۔

دیا: اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں زیور لے کر نہ آؤں تو منہ نہ دکھاؤں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیاناتھ کی کوڑی چت پڑی ماں کا ممتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باولی ہوگئی اس پر اما ناتھ نے اور بھی رد جمایا "اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے تو ابھی مل نہیں سکتے مہینوں خط و کتابت ہوگی وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا تب کہیں جا کر روپے ملیں گے پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں سارے زیور نکال کر دیاناتھ کو دے دیے۔ اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔"

(3)

دو تین مہینے اور گزر گئے زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے چاروں کرتے اپنے دل کی مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ ان کی باتوں میں آ جاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گزرتا تھا، لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اسے بیع کرنے پر راضی ہو گئی، ہاں کمد کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا وہ کہتی تھی کہ شادی مراری لال کے لڑکے سے ہی ہو گی چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آ گئی۔

پھول متی نے کہا ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے؟ تمہیں دس ہزار کا ایک باغ ملا پچیس ہزار کا مکان بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کمد کا حصہ نہیں ہے؟''

کامتا ناتھ نے نرمی سے کہا ''اماں کمد ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کمد کا حصہ کچھ نہیں ہے دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی جو کام ایک ہزار سے ہو جائے اس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

امانا تھ نے تصحیح کی ''پانچ ہزار کیوں صاحب دس ہزار کہیے، دعوت، ضیافت، رسم، رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہوں گے''

کامتا: ہاں ٹھیک ہے، دس ہزار ہی سمجھو، دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے۔

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا ''شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہو گی چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں، چاہے دس ہزار میرے شوہر کی کمائی ہے میں نے مر مر کو جوڑا ہے اپنی مرضی سے خرچ کروں گی تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا''

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا بولے ''اماں تم خواہ مخواہ بڑھاتی ہو جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمہارا نہیں ہے وہ ہمارا ہے ایک ایک پائی ہماری ہے تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے خرچ نہیں کر سکتیں۔''

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا بولی ''کیا کہا پھر تو کہنا میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی؟''

کامتا: وہ روپے تمہارے نہیں ہمارے ہیں؟

پھول متی: تمہارے ہوں گے لیکن میرے مرنے کے بعد

کامتا: نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا

اما: اماں قانون تو جانتی نہیں خواہ مخواہ الجھتی ہیں

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دھک اٹھیں چہرہ لال ہو گیا بولی '' تمہارا قانون بھاڑ میں جائے ایسے قانون میں آگ لگے میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے تمہارے دادا ایسے کوئی دھنا سیٹھ نہ تھے

میں نے پیٹ اور تن کاٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں نہیں تو آج اس گھر میں دھول اڑتی ہوتی گھر ہی کہاں ہوتا میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے میں نے تم چاروں کی شادی میں دس دس ہزار خرچ کیے ہیں، تمہاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے کمد بھی تو میرے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی ہے اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی جو کچھ بچے گا وہ تم لے لینا''

اما ناتھ نے جھلا کر کہا'' بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے تمہارے ہاں شادی نہ ہوگی دین دیال کے پاس آج ہی پیغام بھیج دیجیے۔ اماں کو بکنے دیجیے یہ قانون قاعدہ تو جانتی نہیں بیکار بحث کرتی ہیں۔''

پھول متی نے ضبط کر کے کہا'' اچھا کے قانون ہے، ذرا میں بھی سنوں''

اما: قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائیداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا ہے۔

پھول متی نے پوچھا'' کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟''

اما: ہمارے رشیوں نے، مہاراج منو نے اور کس نے؟

پھول متی ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی'' تو میں اس گھر میں تمہارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں۔''

اما: تم جیسا سمجھو

پھول متی: گھر میں نے بنوایا ہے روپے میں نے جوڑے، باغ میں نے خریدا، اور آج اس گھر میں میں غیر ہوں؟ منو نے یہی قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے اپنا

گھر بار لو میری جان چھوڑو، اس طرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں اس سے کہیں اچھا ہے کہ مر جاؤں واہ رے اندھیر! میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتا نہیں توڑ سکتی میں نے گھر بنوایا میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائیداد اپنے نام کرا لیتی۔

چاروں نوجوان پر ماں اس کی تندی کا کوئی اثر نہ ہوا قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا اس کے پتوں میں بھی حس نہ تھی رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

(4)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائیں گے اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا جن لڑکوں کو اس نے خون جگر پلا پلا کر پالا، جن پر اسے اتنا غرور تھا وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں واہ رے! زمانے کی خوبی! اب اس گھر میں رہنا اسے عذاب معلوم ہوتا تھا جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے یہ اس کی خوددار طبیعت

کے لیے حد درجہ گراں تھا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا۔ بدنامی تو اس کی ہے دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہوئی مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جس نے اسے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس بے کسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی اب اسے اپنے آپ کو ایک نئے طرز عمل کا عادی بنانا پڑے گا اب زمانہ بدل گیا ہے اسے اب نئے ماحول کے انداز زندگی بسر کرنی ہوگی اب تک مالکن رہی اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا ایشور کی یہی مرضی ہے اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں، غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپے اپنی اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات اسی روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پودے سے نکلی جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو پھول متی آج معمول کے خلاف تڑکے ہی اٹھی رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی پنڈت زندہ تھے۔ تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈا سے بہت مضر تھی مگر اب وہ دن نہیں رہے جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی رفتہ رفتہ لڑکے جاگے بہوئیں اٹھیں سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سکڑتے ہوئے کام کرتے دیکھا پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔

آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا اس کے چہرے پر جو ایک خودداری کی جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرت ناک بےبسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی جہاں بجلی جلتی تھی وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا جس کے بجھانے کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔ بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو انکاری خط لکھ بھیجا دین دیال سے کمد کی شادی ہو گئی دین دیال کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے لیکن روٹی دال سے خوش تھے بغیر کسی قرار کے شادی منظور کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی، بارات آئی، شادی ہوئی، کمد رخصت ہو گئی، پھول متی کے دل پر کیا گزر رہی تھی اسے کون جان سکتا ہے کمد کے دل پر کیا گزر رہی تھی اسے بھی کون جان سکتا ہے لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہو گا آرام کرے گی، تکلیف لکھی ہو گی تکلیف اٹھائے گی، گھر والوں نے جس سے شادی کر دی اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک، انحراف اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا، کمد کو کیا دیا گیا، مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی گئی کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا، اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا، اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ ”بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔“

جب کمد کے لیے دروازے پر ڈولی آ گئی اور کمد ماں کے گلے لپٹ کر رونے

لگی تو وہ اسے اپنی کوٹھری میں لے گئی اور جو کچھ پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے بیٹی میں آنچل میں ڈال کر بولی "بیٹی میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی نہیں تو آج کیا تمہاری شادی اس طرح ہوتی اور تم اس طرح بدا کی جاتیں۔"

کمد نے زیور اور روپے آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں میں رکھ دیے اور بولی "اماں میرے لیے تمہاری آشیرباد لاکھوں روپے کے برابر ہے تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو نہیں معلوم ابھی تمہیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے" پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ امانا تھ نے آ کر کہا "کیا کر رہی ہو، کمد چلی جلدی کر، ساعت ٹلی جاتی ہے، وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں پھر تو دو چار مہینے میں آئے گی ہی جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا میرے پاس اب کیا ہے بیٹا، جو میں اسے دوں گی، جاؤ بیٹی، بھگوان تمہارا سہاگ امر کریں۔"

کمد رخصت ہو گئی پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(5)

ایک سال گزر گیا پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا اس نے اسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اسے اب کوئی تعلق نہ تھا وہ اب گھر کی لونڈی تھی، گھر کے کسی فرد سے، کسی معاملے سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی، خوشی اور رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا امانا تھ کا

مطب کھلا، احباب کی دعوت ہوئی، دیانا تھ نے اخبار جاری کیا، پھر جلسہ ہوا، سیتا ناتھ کو وظیفہ ملا، وہ ولایت پڑھنے گیا، پھر جشن ہوا کامتا ناتھ کے بڑے لڑکے کا یگیوپت ہوا، خوب دھوم دھام ہوئی، پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی اماناتھ ٹائیفائیڈ میں مہینہ بھر بیمار رہے دیانا تھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ 144 میں چھ مہینے کے لیے جیل چلے گئے اماناتھ نے ایک معاملہ میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لیے معطل کر دیئے گئے پر پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیاں تک نہ پڑی۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو کوئی فکر نہ تھی بس چوپاؤں کی طرح کام کرنا اور کھانا یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے جانور مارنے سے کام کرتا ہے، مگر کھاتا ہے دل سے، وہ بے کہے کام کرتی تھی مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح، مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا، مہینوں کپڑے نہ دھلتے کچھ پروا نہیں، اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی ملیریا پھیل رہا تھا آسمان پر مٹیالے بادل، زمین پر مٹیالا پانی، نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے، پانی میں بھیگ بھیگ کا سارا کام کیا۔ آگ جلائی پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی کامتا ناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے، نل کا پانی انہیں موافق نہ تھا۔

کامتا ناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا ''رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا، کہار اور مہری آج دونوں غائب ہیں''

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ''تم بھیگ جاؤ گے بیٹا، سردی

ہو جائے گی۔''

''تم بھیگ رہی ہو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ''

''میں بیمار نہیں پڑوں گی مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے''

امانا تھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا، اس لیے بہت پریشان رہتا تھا ''جانے بھی دو بھیا بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے اس کا خمیازہ اٹھانے دو۔''

گنگا بڑھی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا سمندر ہے افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری۔ پانو پھسلا، سنبھل نہ سکی پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پانو چلائے پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں کنارے پر دو چار پنڈے چلائے ''ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے'' دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں جنہیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا تھا ایک نے پوچھا ''یہ کون بڑھیا تھی''

''ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے''

''اجودھیا ناتھ تو بہت بڑے آدمی تھے''

''ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا''

''اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں''

''ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔''

☆☆☆☆☆☆

کسم

پہلی بار: ''عصمت'' کے سالگرہ نمبر 1932ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

سال بھر کی بات ہے ایک دن شام کو ہوا خوری کے لئے جا رہا تھا کہ مسٹر شاطر سے ملاقات ہو گئی میرے پرانے دوست ہیں، نہایت بے تکلف اور زندہ دل، آگرہ میں قیام رکھتے ہیں، خوش گو شاعر ہیں، ان کی بزم سخن میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں ایسا فنافی الشعر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ پیشہ تو وکالت ہے مگر غرق رہتے ہیں فکر سخن میں چونکہ ذہین آدمی ہیں معاملہ کی تہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں کبھی کبھی مقدمات مل جاتے ہیں کچہری کے باہر عدالت یا مقدمہ کا ذکر ان کے لیے ممنوع ہے۔ عدالت کی چار دیواری کیا اندر پانچ گھنٹے وہ وکیل ہوتے ہیں چار دیواری کے باہر نکلتے ہی وہ شاعر ہیں۔ جب دیکھئے شعر و سخن کے چرچے ہو رہے ہیں اشعار سن رہے ہیں، داد دے رہے ہیں، جھوم رہے ہیں، اور اپنا کلام سناتے وقت تو ان پر بلا مبالغہ وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لہجہ بھی اتنا دل پذیر ہے کہ بے اختیار اشعار جگر میں چبھ جاتے ہیں روحانیت میں شعریت پیدا کرنا، تصوف میں گل و چمن کی بہار دکھانا ان کے کلام کی خصوصیت ہے، وہ جب لکھنو آئے مجھے پہلے اطلاع دے دیا کرتے تھے آج انہیں لکھنو میں غیر متوقع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا ''خیریت تو ہے، آپ یکا یک یہاں کیسے نمودار

ہوئے، مجھے اطلاع تک نہ دی۔"

بولے "بھائی جان بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں آپ کو اطلاع دینے کا موقع نہ تھا پھر آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ آپ میرے لیے کوئی خاص اہتمام کریں میں ایک اشد ضروری معاملہ میں۔۔۔۔۔آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں اس وقت ہوا خوری ملتوی کیجئے اور چل کر میرا قصہ غم سنیئے۔"

"آپ نے تو مجھے وحشت میں ڈال دیا آپ اور قصہ غم؟ مجھے تو وحشت ہوتی ہے"

"چلئے اطمینان سے بیٹھوں تو سناؤں"

ہم دونوں گھر کی طرف چلے

منہ ہاتھ دھوکر، شربت پانی اور پان الائچی کے بعد مسٹر شاطر نے اپنی داستان سنانی شروع کی۔

"کسم کی شادی میں تو آپ تشریف لے گئے تھے۔ اس کے قبل بھی آپ نے اسے دیکھا تھا میرا خیال ہے کہ ایک سلیم الطبع نوجوان کی کشش کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے وہ سب اس میں کافی زیادہ موجود ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے گرم جوشی سے کہا، "میں آپ سے زیادہ کسم کا مداح ہوں ایسی سلیقہ شعار باحیا، متین، خوش مزاج اور حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی"

شاطر صاحب نے مایوسانہ تبسم کے ساتھ فرمایا "وہی کسم اپنے شوہر کی بے اعتنائی کے باعث رو رو کر مری جاتی ہے اس کی رخصتی ہوئے ایک سال ہو رہا ہے

اس دوران میں دو تین بار سسرال گئی لیکن اس کا شوہر اس سے مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ اس کی صورت سے بیزار ہے میں نے ہر چند چاہا اسے بلا کر دریافت حال کروں مگر میرے خطوط کا جواب دیتا ہے نہ آتا ہے نہ جانے ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ اس نے یہ روش اختیار کی اب سنتا ہوں اس کی دوسری شادی ہونے والی ہے کسم کا برا حال ہو رہا ہے آپ شائد اسے دیکھ کر پہچان بھی نہ سکیں۔ شب و روز رونے کے سوا اسے کوئی کام نہیں ہے اس سے آپ ہماری پریشانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ زندگی کی پیاری آرزوئیں پامال ہوئی جاتی ہیں۔ ہمیں پرماتما نے کوئی لڑکا نہ دیا مگر ہم اپنی کسم کو پا کر اس کا شکر کرتے تھے، اسے کتنی نعمت سے پالا کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اس نے بی اے پاس نہیں کیا لیکن خیال کی وسعت اور معلومات میں وہ کسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت سے کم نہیں آپ نے اس کے مضامین دیکھے ہیں اس نے مباحثہ کیے ہیں خانہ داری میں وہ اتنی ہوشیار ہے کہ میرے گھر کا قریب قریب سارا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ اپنے شوہر کی نظر میں دنیا کی بدترین عورت ہے۔ بار بار پوچھتا ہے تو نے اسے کچھ کہہ دیا ہے یا کیا بات ہے؟‘‘

’’آخر وہ تجھ سے کیوں برگشتہ خاطر ہے؟‘‘ کسم اس کے جواب میں رو کر یہی کہتی ہے کہ مجھ سے تو انہوں نے کبھی کوئی بات چیت ہی نہیں کی وہ پہلے دن ذرا دیر کے لیے کسم کے پاس آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کسم سے کوئی سوال کیا ہو گا۔ اس نے شرم کے باعث کوئی جواب نہ دیا ہو گا۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ اس نے دو چار بار وہی سوال کیا ہو گا۔ کسم نے سر نہ اٹھایا ہو گا آپ جانتے ہی ہیں

وہ کتنی شرمیلی ہے بس حضرت روٹھ گئے ہوں گے میں تو گمان ہی نہیں کر سکتا کہ کسم جیسی لڑکی سے کوئی مرد بے اثر رہ سکتا ہے لیکن طبیعت کی افتادہ کا کوئی کیا کرے؟ غریب نے اپنے شوہر کے نام متعدد خطوط درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے لکھے، مگر اس ظالم نے اس کے خطوط کا کوئی جواب نہ دیا سب ہی خطوط واپس کر دیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سنگدل کو کیسے رام کروں میری غیرت تو تقاضہ نہیں کرتی کہ خود اس کے پاس کچھ لکھوں اب آپ سے یہی التجا ہے کہ اس معاملہ میں میری امداد کیجئے ورنہ غریب کسم مر جائے گی اور اس کے بعد ہم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس کی کوفت اب نہیں دیکھی جاتی۔

شاطر کی آنکھیں پر آب ہو گئیں میں بھی بہت متاثر ہوا سر گرمی سے بولا ”میں آج ہی مراد آباد جاؤں گا اور اس خرد ماغ لونڈے کی بری طرح خبر لوں گا کہ وہ بھی یاد کرے گا بچہ کو زبردستی گھسیٹ کر لاؤں گا اور کسم کے پیروں پر گرا دوں گا۔“

شاطر صاحب میری اس خود اعتمادی پر مسکرا کر بولے ”کیا کہیں گے اس سے؟“

”یہ نہ پوچھیے! تالیف قلب کے جتنے نسخے ہیں ان سبھی کی آزمائش کروں گا“

”تو آپ کو مطلق کامیابی نہ ہو گی۔ وہ اتنا خلیق، اتنا خندہ رو اتنا منکسر المزاج اتنا شیریں زبان ہے کہ آپ وہاں سے اس کے مداح ہو کر لوٹیں گے۔ وہ ہر وقت دست بستہ آپ کے روبرو کھڑا ہو گا۔ آپ کی ساری تندی اور تیزی فرو ہو جائے گی۔ آپ کے قلم کو خدا نے کمال عطا کیا ہے۔ آپ نے نوجوانوں کے قلب کی تالیف کی ہے دل میں درد پیدا کرنا آپ کا حصہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کسم

کی جانب سے ایک ایسا دل ہلا دینے والا خط لکھیں کہ وہ نادم ہو جائے اور اس کے دل میں سویا ہوا انسان جاگ پڑے میں آپ کا تا زیست ممنون رہوں گا۔''

مسٹر شاطر شاعر ہی تو ٹھہرے اس تجویز میں بھی شعریت کا عنصر غالب تھا۔ آپ میرے کئی قصے پڑھ کر رو پڑے ہیں۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ میں جس دل کو چاہوں متاثر کر سکتا ہوں آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا اور نہ یکساں رقیق القلب۔ جن قصوں کو پڑھ کر شاطر صاحب روئے ہیں ان ہی قصوں کو سنتے ہی بعض حضرات نے سٹی سنبھال کر کتاب پھینک دی ہے، مگر اس وقت ان نکتہ چینیوں کا موقع نہ تھا۔ وہ سمجھے میں اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں اس لیے میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا آپ کی تجویز سے مجھے پورا اتفاق ہے اور اگرچہ میرے خیال میں آپ نے امکانات کا مبالغہ آمیز اندازہ کیا ہے لیکن میں خط لکھ دوں گا اور جہاں تک ہو سکے گا اظہار درد کے ساتھ اس کے جذبہ انصاف کو متحرک کرنے کی بھی کوشش کروں گا لیکن آپ غیر مناسب نہ سمجھیں تو مجھے وہ خطوط دکھا دیں جو کسم نے اپنے شوہر کے نام لکھے اس نے خطوط تو لوٹا ہی دیے تھے۔ اگر کسم نے پھاڑ نہ ڈالے ہوں گے تو وہ چٹھیاں ضرور اس کے پاس ہوں گی۔ ان خطوط سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کن پہلوؤں پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔

مسٹر شاطر نے جیب سے خطوط کا ایک پلندہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولے'' میں سارے خطوط لیتا آیا ہوں میں جانتا تھا کہ آپ ان خطوط کو دیکھنا چاہیں گے آپ انہیں شوق سے دیکھیں کسم جیسی میری لڑکی ویسی ہی آپ کی بھی لڑکی ہے۔ آپ سے کیا پردہ ہے؟''

میں نے خطوط کو پڑھنا شروع کیا گلابی کاغذوں پر بہت خوشخط لکھے ہوئے خطوط تھے۔ پہلا خط۔۔۔۔۔۔

میرے آقا! مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا لیکن آنکھیں نہیں جھپکیں۔ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے بار بار سوچتی ہوں مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ آپ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں آپ مجھے جھڑکیں کوسیں مزاج چاہے تو میری گوشمالی بھی کریں میں ہر ایک سزا برداشت کر لوں گی، لیکن بے اعتنائی مارے ڈالتی ہے میں آپ کے یہاں ایک ہفتہ رہی میرا پر ماتما جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا کیا ارمان تھے میں کیسے عذاب سے دن بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھی کتنی بار کوشش کی کہ آپ سے کچھ پوچھوں آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی کی التجا کروں، لیکن آپ میرے سائے سے بھی دور ہو گئے تھے۔ مجھے کوئی موقع ہاتھ نہ آیا آپ کو یاد ہوگا کہ جب دوپہر کو سارا گھر سو جاتا تھا تو میں آپ کے کمرہ میں ہوتی اور گھنٹوں سر جھکائے کھڑی رہتی تھی، مگر آپ نے کبھی التفات نہ کیا۔آپ نے مجھے نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوتی تھی، اس کا شائد آپ اندازہ نہ کرسکیں گے میری جیسی بدنصیب عورتیں اس درد کا اندازہ کرسکتی ہیں میں نے سہیلیوں سے ان کی عروسی کے تذکرے سن سن کر جو خیالی جنت بنائی تھی اسے آپ نے کتنی بے دردی سے منہدم کر دیا کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟ عدالت بھی کسی مجرم کو سزا دیتی ہے تو اس پر فرد جرم لگا دیتی ہے آپ نے اتنی عنایت بھی نہ کی مجھے خطا معلوم ہو جاتی تو آئندہ کے لیے سنبھل جاتی۔ میں آپ کے پیروں پر گر کر اپنی خطائیں معاف کراتی ہوں میں

آپ سے حلفاً کہتی ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم کہ مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے ممکن ہے آپ نے اپنی بیوی میں جن اوصاف کے دیکھنے کی تمنا کی ہو وہ مجھ میں نہ ہوں۔ بیشک میں انگریزی بہت کم پڑھی ہوں میں انگریزی سوسائٹی کے آداب و قواعد سے واقف نہیں۔ میں اپنی خامیوں سے ناواقف نہیں ہوں میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں آپ کے لائق نہ تھی آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ حسین، باسلیقہ اور روشن طبع نازنین ملنی چاہیے تھی لیکن سزا خطاؤں کی ملنی چاہیے نہ کہ خامیوں کی پھر میں تو آپ کے اشارے رپ چلنے کو تیار ہوں آپ میری دلجوئی کریں پھر دیکھئے میں اپنی خامیوں کو کتنی جلدی پورا کر لیتی ہوں آپ کی نگاہ محبت مجھے چمکا دے گی میرے ذہن کی جلا کر دے گی مجھ میں قوت بیان پیدا کر دے گی میرے لیے نگاہ معجزہ ثابت ہو گی، مگر میرے پیارے آقا! آپ کی یہ بے رحمی میرے دل و دماغ کو فنا کیے ڈالتی ہے میرا دل بہت کمزور ہے میں اس عتاب کی متحمل نہیں ہو سکتی اور کیا عرض کروں براہ کرم ایک روز کے لیے چلے آیئے ایک بے گناہ کو رلا کر آپ کو حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا مجھ میں سو عیب ہوں مگر مجھے دعویٰ ہے کہ آپ کی جو خدمت میں کر سکتی ہوں حقیقی پرستش میں کر سکتی ہوں وہ کوئی دوسری عورت نہیں کر سکتی آپ عالم فاضل ہیں طبائع انسانی کے ماہر ہیں بیدار مغز ہیں آپ کی لونڈی آپ کے روبرو کھڑی نگاہ کرم کی بھیک مانگ رہی ہے کیا اس کے سوال کو ٹھکرا دیجیے گا۔

آپ کی خطاوار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کسم

میں یہ خط پڑھ کر بے حد متاثر ہوا مجھے اس خیال سے اشتعال پیدا ہوا کہ ایک

حسینہ اپنے شوہر کے روبرو اتنا عجز و انکسار کیوں کرے؟ مرد کو اگر عتاب کی آزادی ہے تو عورت کو وہ آزادی کیوں نہیں؟ یہ ظالم سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے، کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی دوسری تیسری شادی کر سکتا ہے عورت سے کوئی تعلق نہ رکھ کر اس پر سختی سے حکومت کر سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں محض تھپڑ سے دے سکتی ہے تو اسے کبھی اس بدمزاجی کی جرأت نہ ہوتی غریب عورت کتنی مجبور ہے شائد میں کسم کی جگہ ہوتا تو اس کی بے اعتنائی کا جواب اس سے دو چند بے نیازی سے دیتا۔ میں اس کی چھاتی پر مونگ ولتا، زمانہ کے ہنسنے کی مطلق پروانہ کرتا۔ جو زمانہ اتنا ظلم روا رکھ سکتا ہے اور زبان احتجاج نہیں کھولتا اس کے ہنسنے اور رونے کی مجھے مطلق پروانہ ہوتی۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کی یاد شیریں زندگی میں مٹھاس پیدا کر دیتی ہے۔ جس کے ایک دن پر ایک ایک عمر قربان کی جاسکتی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب مرد عورت پر نثار ہوتا ہے اس کی پرستش کرتا ہے اور عورت کے دل پر اتنا پائیدار نقش مرتسم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے مظالم کو ہنس کر برداشت کرتی ہوئی اس کی خدمت میں گزار دیتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب الفت کی بہار آتی ہے اور دلوں میں نئی نئی کونپلیں جنم لینے لگتی ہیں اس موسم میں کون ایسا بے رحم ہے کہ درخت پر تیر چلائے گا یہ اخلاقی جرم ہے یہ وہ زمانہ ہے جب صیاد طائر کو اس کے نشیمن سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ کیا وہ اس کی گردن پر چھری چلا کر اس کا نغمۂ شیریں

بننے کی ہوس رکھتا ہے؟ ہاں! یہ وہ زمانہ ہے جب دو مسافر منزل حیات میں باہم رفیق بن جاتے ہیں ایک دوسرے کو آسائش پہنچانے کی ذمہ داری دونوں پر برابر ہے اگر ایک جو زیادہ طاقتور ہے اپنے کمزور رفیق پر رفاقت کے پہلے ہی چند لمحوں میں رعب جمانا شروع کرے تو منزل کا خدا ہی حافظ ہے۔

پھر میں نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا۔

دوسرا خط۔۔۔۔۔۔

میرے سرتاج! دو ہفتہ تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد آج پھر یہ شکوہ نامہ لکھنے بیٹھی ہوں جس وقت میں نے وہ خط لکھا تھا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کا جواب ضرور آئے گا امید کے خلاف امید کر رہی تھی میرا دل اب بھی اسے قبول نہیں کرتا کہ آپ نے عمداً جواب نہیں دیا غالباً آپ کو فرصت نہیں ملی یا خدانخواستہ طبیعت تو ناساز نہیں ہے کس سے پوچھوں؟ اس خیال سے ہی میرا دل کانپتا ہے میری ایشور سے یہی التجا ہے کہ آپ خوش وخرم ہوں مجھے خط نہ لکھیں نہ ہی میں رو کر خاموش ہی تو ہو جاؤں گی آپ کو خدا کا واسطہ ہے اگر آپ کی طبیعت ذرا بھی مضمحل ہو تو مجھے فوراً خدا لکھنے میں کسی کو ہمراہ لے کر آؤں گی تکلف اور رواج سے میری طبیعت گھبراتی ہے ایسی حالت میں بھی اگر آپ مجھے اپنی خدمت سے محروم رکھتے ہیں تو آپ میرا وہ حق مجھ سے چھین رہے ہیں جو میری زندگی کی سب سے عزیز چیز ہے میں آپ سے کوئی اور درخواست نہیں کرتی آپ مجھے موٹے سے موٹا کھلایئے۔ موٹے سے موٹا پہنایئے مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی آپ کے ساتھ میں بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی خوش رہوں گی مجھے زیور کی ہوش نہیں، محل میں

رہنے کی تمنا نہیں، سیر تماشہ کا شوق نہیں میری زندگی کا منشاء آپ کی خدمت ہے یہی اس کا ماحصل ہے میرا دنیا میں کوئی دیوتا نہیں کوئی گورو نہیں، کوئی حاکم نہیں میرے دیوتا آپ ہیں۔ میرے گورو آپ ہیں، میرے حاکم آپ ہیں مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے مجھے ٹھکرایئے نہیں میں محبت اور خدمت کے پھول لیے عصمت اور وفا کی نذر دامن میں بھرے پجارن کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مجھے ان پھولوں کی اس نذر کو اپنے قدموں پر رکھنے دیجئے۔ پجارن کا کام تو پوجا کرنا ہے دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں، یہ سوچنے کی اسے فرصت کہاں ہے؟ میرے آقا! شاید آپ کو معلوم نہیں میری آج کل کیا کیفیت ہے اگر معلوم ہوتا تو آپ ہرگز اس سرد مہری کا برتاؤ نہ کرتے آپ مرد ہیں آپ کے دل میں رحم ہے، وسعت ہے، رواداری ہے، میں یہ باور نہیں کرسکتی کہ آپ مجھ جیسی نا چیز پر غصہ کرسکتے ہیں میں آپ کے رحم کے لائق ہوں کتنی نحیف، کتنی بے زبان، کتنی حقیر آپ آفتاب ہیں میں ذرہ ہوں، آپ شعلہ میں خرمن ہوں، آپ راجہ ہیں میں بھکارن ہوں غصہ تو برابر والوں پر آتا ہے آپ کے غصہ کی متحمل نہیں ہوں اگر آپ سمجھتے ہیں میری آپ کو ضرورت نہیں ہے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ دے دیجئے میں اسے آب حیات کی طرح سر اور آنکھوں سے لگاؤں گی اور آنکھیں بند کرکے پی جاؤں گی مجھے یہ تسکین کافی ہے کہ میری موت سے آپ کو بے فکری ہوئی زندگی جب آپ کی نذر ہوگئی تو اسے ماریں یا زندہ رکھیں یہ آپ کی خوشی ہے میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی اس جنم میں ہی نہیں آئندہ جنموں میں بھی، بلکہ ابد تک۔

آپ کی بدنصیب۔۔۔۔۔کسم

مجھے یہ خط پڑھ کر کسم پر غصہ آنے لگا اور اس لونڈے سے نفرت ہوگئی مانا کہ تم عورت ہو اور حال کے رواج کے مطابق مرد کو تمہارے اوپر ہر طرح کا اختیار ہے لیکن اس حد تک انکسار کیا معنی؟ عورت کو خوددار ہونا چاہیے۔ اگر مرد اس سے بے اعتنائی کرتا ہے تو اسے بھی چاہیے کہ اس کی بات نہ پوچھے عورتوں کو دھرم، فرض اور تیاگ کا سبق پڑھا پڑھا کر ہم نے ان کی خودداری اور خوداعتمادی دونوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اگر مرد عورت کا محتاج نہیں تو عورت مرد کی محتاج کیوں ہو؟ ایشور نے مرد کو ہاتھ دیے ہیں تو کیا عورت کو ان سے محروم رکھا ہے؟ مرد کے دماغ ہے تو کیا عورت خالی الذہن ہے؟ اس انکسار نے تو مردوں کا مزاج آسمان پر پہنچا دیا ہے مرد روٹھ گیا تو گویا قیامت آگئی میں تو سمجھتا ہوں عورت نہیں وہ مرد رحم کے قابل ہے جو کسم جیسی وفا کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا شک ہونے لگا کہ اس لونڈے نے کوئی دوسرا مرض پال رکھا ہے کسی صیاد کے رنگین جال میں گرفتار ہو گیا ہو گا خیر میں نے تیسرا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

تیسرا خط۔۔۔۔۔

میرے دل و جان کے مالک! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا زندہ رہنا بے سود ہے جس پھول کو دیکھنے والا، چننے والا، کوئی نہیں وہ کھل کر کیا کرے۔ میں آپ کے ایک مہینہ رہ کر دوبارہ آئی ہوں۔ سسر جی نے مجھے بلایا، انہوں نے ہی مجھے رخصت کر دیا۔ اس دوران میں آپ نے ایک بار بھی مجھے درشن نہ دیے۔ آپ دن میں بیسیوں ہی مرتبہ گھر آتے تھے اپنے بہن بھائیوں سے ہنستے بولتے تھے یار

دوستوں کے ساتھ سیر کرتے تھے، لیکن میرے پاس آنے کی آپ نے قسم کھالی تھی۔ میں نے کتنی بار آپ کے پاس کتنے رقعے بھیجے کتنی منتیں کیں کتنی بار بے شرمی کرکے آپ کے کمرے میں گئی، لیکن آپ نے مجھے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں تو قیاس بھی نہیں کرسکتی کہ کوئی انسان اتنا سنگدل ہوسکتا ہے۔ میں محبت کے قابل نہیں اعتبار کے قابل نہیں، خدمت کے قابل نہیں، کیا رحم کے قابل بھی نہیں میں نے اس دن کتنی محبت سے آپ کے لیے رس گلے بنائے تھے آپ نے انہیں چھوا بھی نہیں جب آپ مجھ سے اس قدر برداشتہ خاطر ہیں تو میں نہیں سمجھتی کہ زندہ رہ کر کیا کروں؟ نہ جانے وہ کونسی امید ہے جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے؟ کیا ستم ہے کہ آپ سزا دیتے ہیں مگر جرم نہیں بتلاتے یہ کونسا آئین انصاف ہے آپ کو معلوم ہے کہ اس ایک ماہ کے قیام میں میں نے مشکل سے آپ کے یہاں دس دن کھانا کھایا ہوگا میں اتنی کمزور ہوگئی ہوں کہ چلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے آنکھوں میں گویا بینائی نہیں رہی دل میں گویا خون کی گردش ہی نہیں رہی خیر ستا لیجیے، جتنا جی چاہے رلا لیجیے اس ستم کی بھی ایک دن انتہا ہو جائے گی۔ اب تو موت پر ہی ساری امیدیں قائم ہیں میں جانتی ہوں کہ میری موت کی خبر پا کر آپ مسکرائیں گے آپ کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گرے گی مگر آپ کی کوئی خطا نہیں یہ میری بدنصیبی ہے میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اس جنم میں کوئی بہت بڑا گناہ کیا تھا میں چاہتی ہوں میں بھی آپ کی پروا نہ کروں آپ ہی کی طرح بے التفاتی کروں لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے میں وہ طاقت نہیں پاتی لتا درخت کی طرح کھڑی نہیں رہ سکتی ہے درخت کے لیے کسی سہارے کی ضرورت

نہیں، وہ قوت کہاں سے لائے، وہ تو درخت سے لپٹنے کے لیے پیدا کی گئی ہے اسے درخت سے الگ کردو تو وہ خشک ہو جائے گی، میں آپ سے علیحدہ اپنی ہستی کا خیال ہی نہیں کر سکتی میری زندگی کے ہر فعل، ہر خیال، ہر آرزو میں آپ موجود ہوتے ہیں میری زندگی ایک دائرہ ہے جس کے مرکز آپ ہیں میں وہ ہار ہوں جس کے ہر پھول میں آپ ہی دھاگے کی طرح پیوست ہو گئے ہیں اس دھاگے کے بغیر ہار کے پھول بکھر جائیں گے اور خاک میں مل جائیں گے۔

میری ایک سہیلی کی اس سال ہی شادی ہوئی ہے اس کا شوہر جس وقت سسرال آتا ہے شنو کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے۔ دن میں کتنے روپ بدلتی ہے، کہہ نہیں سکتی۔ چہرے کھل جاتا ہے مسرت سنبھالنے میں نہیں آتی اسے بکھیرتی، لٹاتی ہم جیسے بدنصیبوں کے آکر گلے سے لپٹ جاتی ہے اور اس کے منہ سے خوشیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اخلاص و وفا میں متوالے ہو رہے۔ ان کے پاس دولت نہیں ہے جائیداد نہیں ہے مگر اپنی بے سرو سامانی میں خوش ہیں اس لازوال محبت کا ایک لمحہ ساری دنیا کی دولت سے بیش قیمت ہے میں جانتی ہوں یہ بے فکریاں اور رنگ رلیاں بہت دن نہ رہیں گی۔ افکار و حوادث روزگار ان کی زندگی کو بھی پامال کر دیں گے مگر اس دور محبت کی یادگاریں ان کے دل کو ہمیشہ تقویت دیتی رہیں گی محبت میں بھیگی ہوئی روکھی روٹیاں اور محبت میں رنگے ہوئے موٹے کپڑے اور محبت کی روشنی سے نورانی چھوٹا سا حجرہ اپنی بے نوری میں بھی وہ حلاوت اور وہ برکت اور وہ زیبائش رکھتا ہے جو شائد دیوتاؤں کی جنت میں بھی نصیب نہیں جب شنو کا شوہر اپنے گھر چلا جاتا ہے تو وہ دکھیا کس طرح

پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے اس کے خطوط آ جاتے ہیں تو گویا اسے کہیں کی نعمت مل جاتی ہے اس کے آنسو اشتیاق اور اضطراب کے آنسو ہیں میرے آنسو مایوسی اور غم کے آنسو ہیں اس کی بیتابیاں انتظار وشوق کی بیتابیاں ہیں، میری بیتابیاں پامالی اور کس مپرسی کی بیتابیاں ہیں اس کے شکوہ میں قبضہ اور اپناپن ہے، میرے شکوہ میں دل کی شکستگی اور بے دست و پائی ہے اس شوق اور انتظار اور درد کی کیفیتوں میں ان کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے میں ان کیفیتوں سے محروم ہوں۔

خط لمبا ہوا جاتا ہے اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا بڑی شدت کی گرمی پڑ رہی ہے دادا مجھے منصوری لے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں میری لاغری اور خستہ حالی سے انہیں شائد شک ہو رہا ہے کہ میں ٹی بی کا شکار ہوں میرے لیے منصوری ہی نہیں جنت بھی وادی غم ہے آپ کی حسرت زدہ۔۔۔ کسم۔

چوتھا خط۔۔۔۔۔۔۔

میرے پتھر کے دیوتا! کل میں منصوری سے لوٹ آئی لوگ کہتے ہیں بڑی پر فضا جگہ ہے ہوگی، میں تو ایک دن بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی مردہ دلوں کی دنیا ویران ہے میں نے رات کو ایک پرنشاط خواب دیکھا بتاؤں؟ مگر کیا فائدہ، نہ جانے کیوں میں اب بھی موت سے ڈرتی ہوں امید کا کچا دھاگہ مجھے اب بھی زندگی سے باندھے ہوئے ہے باغ زندگی کے دروازے پر آ کر بغیر سیر کیے لوٹ جانا کتنا حسرتناک ہے اندر کیا کیا بہاریں ہیں کیا کیا نغمے ہیں، کیا کیا دل فریبیاں ہیں، میرے لیے دروازے بند ہے کتنی آرزوؤں سے سیر کا لطف اٹھانے چلی تھی کتنی تیاریوں سے، مگر میرے پہنچتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

اچھا بتلاؤ! میں مر جاؤں گی تو میری میت پر دو بوندیں آنسو گراؤ گے جس کی زندگی بھر کی ذمہ داری لی تھی، جس کی ہمیشہ کے لیے بانہہ پکڑی تھی، کیا اس کے ساتھ اتنی فیاضی نہ کرو گے۔ مرنے والوں کی خطائیں سب معاف کر دیا کرتے ہیں۔تم بھی معاف کر دینا، آ کر میری لاش کو اپنے ہاتھوں سے نہلانا، اپنے ہاتھ سے سہاگ کا سیندور لگانا اپنے ہاتھ سے سہاگ کی چوڑیاں پہنانا، اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں گنگا جل ڈالنا چار قدم کے لیے کندھا دے دینا میری روح خوش ہو جائے گی اور تمہیں دعائیں دے گی میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایشور کے دربار میں تمہارا یش گاؤں گی کیا یہ بھی مہنگا سودا ہے؟ اتنی سی ظاہر داری کر کے تم اپنے سارے فرائض شوہری سے سبکدوش ہوئے جاتے ہو کاش مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں کتنی خوشی سے مرتی خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتی، لیکن میں تمہارے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کروں گی، تم ہزار سنگدل ہو اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے میں جانتی ہوں تم خبر پا کر آؤ گے اور شائد ایک لمحہ کے لئے میری مرگ حسرت پر تمہاری آنکھیں رو پڑیں آہ کاش میں اپنی زندگی میں وہ نظارہ دیکھ سکتی۔

اچھا! کیا میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں، ناراض نہ ہونا کیا میری جگہ کسی اور نے لے لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو مبارک! ذرا اس کی تصویر میرے پاس بھیج دینا میں اس کی پوجا کروں گی اس کے قدموں کو بوسہ دوں گی میں جس پتھر کے دیوتا کو نہ پگھلا سکی اس سے اس نے بردان پایا ایسی خوش نصیب عورت کے قدم دھو دھو کر پیو گی میری دلی دعا ہے کہ تم اس کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ کاش میں اس کی خدمت کر سکتی، بے واسطہ نہیں بالواسطہ۔ تمہارے ساتھ کچھ اپنا فرض ادا کر دیتی۔ تم مجھے

صرف اس کا نام اور پتہ بتا دو میں سر کے بل دوڑتی ہوئی اس کے پاس جاؤں گی اور کہوں گی دیوی میں تمہاری کنیز ہوں اس لیے کہ تم میرے مالک کی منظور نظر ہو مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو میں تمہارے لیے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی، تمہارے گیسوؤں کو موتیوں سے گوندھوں گی، تمہارے ماتھے پر سہاگ کا ٹیکہ لگاؤں گی، تمہارے ایڑیوں پر مہندی رچوں گی یہی میرا مقصد حیات ہوگا یہ نہ سمجھنا کہ میں جلوں گی یا اکڑ رہوں گی جلن اس وقت ہوتی ہے جب کوئی مجھ سے میری چیز چھین رہا ہو جس چیز کو اپنا سمجھنے کا کبھی موقع ہی نہ ملا اس کے لیے مجھے کیوں جلن ہو ابھی بہت کچھ لکھنا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں غریب مرض کو ٹی بی سمجھ رہا ہے۔

آپ کی حسرت نصیب۔۔۔۔۔۔کسم

ان دونوں خطوں نے ذرا دیر کے لیے مجھ پر جنون کا عالم طاری کر دیا میں بھی سلامت پسند آدمی ہوں۔ میرے جذبات جلد پہچان میں نہیں آتے۔ اکثر ادیبوں کی طرح میں بھی الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیا چیز دل سے نکلی ہے، کیا چیز محض تاثیر کے لیے لکھی گئی ہے، اس کا لطف اکثر انسانوں میں خارج ہوتا ہے لیکن ان خطوط نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا ایک جگہ تو میری آنکھیں واقعی اب گوں ہو گئیں یہ خیال کتنا روح فرسا تھا کہ ناز و نعمت میں پلی ہوئی کسم جسے ماں باپ دونوں اپنی آنکھوں سے زیادہ پیار کرتے تھے شادی ہوتے ہی یکا یک اتنی بے کس و مجبور ہو۔ شادی کیا ہوئی اس کی چتا تیار ہوئی یا اس کے قتل کا پروانہ لکھا گیا اس میں شک نہیں کہ ایسے دردناک سانحے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان کا امکان تو رہتا ہے جب تک ہر دو فریق کے حقوق و فرائض و اختیار مساوی نہ ہوں ایسے سانحے ہمیشہ ہوتے

رہیں گے۔ زبردست کو ستانا شائد انسانی خاصہ ہے۔ کاٹنے والے کتے سے لوگ دور بھاگتے ہیں سیدھے کتے پر لونڈے تفریح کے لیے پتھر پھینکتے ہیں لیکن آج ان میں سے ایک کو افسر اور دوسرے کو اس کا ماتحت بنا دو پھر دیکھو افسر صاحب اپنے ماتحت پر کتنا رعب جماتے ہیں موجودہ حالات میں بیوی بننا غلامی نہ سہی مرد سے کمتر درجہ قبول کرنا ہے محبت تو مساوات نامہ کا نام ہے اس ناہمواری میں محبت کا وجود ہو سکتا ہے؟ مجھے تو اس میں بھی شک ہے ہم آج جسے محبت کہتے ہیں وہ فی الواقع وہی محبت ہے جو جانور کو اپنے آقا سے ہو سکتی ہے جانور سر جھکائے کام کیے چلا جائے مالک اسے بھوسا اور کھلی بھی دے گا، اس کا بدن بھی سہلائے گا، اس کو زیورات سے آراستہ بھی کرے گا لیکن جانور نے ذرا رفتار سست کی، ذرا گردن ٹیڑھی کی اور مالک کی قمچی پیٹھ پر پڑی، یہ محبت نہیں ہے ہرگز نہیں۔

خیر میں نے پانچواں خط کھولا۔

پانچواں خط ۔۔۔۔۔

جیسے مجھے یقین تھا آپ نے میرے پچھلے خط کا بھی جواب نہ دیا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے مجھے ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جیسی آپ کی مرضی مردوں کے لیے بیوی پیر کی جوتی ہے۔ عورت کے لیے مرد دیوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طلوع شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے جس وقت میں گڑیاں کھیلتی تھی اس وقت گڈے کے روپ میں آپ نے میرے خانہ دل میں قدم رکھا تھا۔ میں نے آپ کے قدموں کو چوما اور پھول مالا اور بتاشے سے آپ کی تواضع کی پھر آپ کہانیوں کے راجہ کے روپ میں میرے گھر آئے میں نے آپ کو دل

میں جگہ دی آپ کے خوں ریز معرکوں میں آپ کے ہیبت زارہ نوردیوں میں آپ کے ساتھ رہی ایام طفلی سے اب تک آپ کسی نہ کسی صورت میں میرے دل میں موجود تھے۔وہ جذبات میرے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں میرے وجود کا ایک ذرہ ان کی پرورش کرتا رہا ہے انہیں دل سے نکال دینا آسان نہیں ہے اس کے ساتھ میری ہستی کے ریزے بھی منتشر ہو جائیں گے،لیکن آپ کی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں آپ کی خدمت کرنے میں سب کچھ کرنے کو آمادہ تھی عسرت اور تنگی کا تو ذکر ہی کیا۔ میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کو آمادہ تھی۔آپ کی خدمت میں فنا ہو جانا ہی میری زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ میں نے شرم و حیا کو خیر باد کہا،خودداری کو پیروں سے کچلا،لیکن آپ کو منظور نہیں ہے۔مجبور ہوں،آپ کو کوئی خطا نہیں، ضرور مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہے جسے آپ زبان پر نہیں لانا چاہتے میں اس بے اعتنائی کے سوا اور ہر ایک سزا جھیلنے کو تیار تھی آپ کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ لے کر پی جانے میں بھی مجھے کوئی تامل نہ ہوتا۔مگر نوشتہ تقدیر سے کیا چارہ آپ میرے خطوط واپس کر دیں یہی میری آخری التجا ہے یہ زیور اور بیش قیمت جوڑے میرے کس کام کے انہیں اپنے پاس رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں آپ انہیں جس وقت چاہیں واپس منگوالیں، میں نے انہیں ایک صندوق میں بند کر کے الگ رکھ دیا ہے ان کی فہرست بھی صندوق میں ہے،ملا لیجیے گا۔آج سے آپ میری زبان اور قلم سے کوئی شکایت نہ سنیں گے اس خیال کو بھول کر بھی دل میں جگہ نہ دیجئے گا کہ میں آپ سے بے وفائی کروں گی میں اسی گھر میں کڑھ کڑھ کر مر جاؤں گی مگر آپ کی جانب سے خیال فاسد میرے دل میں نہ آئے گا میں آپ کے ناموس کی

امین ہوں اس امانت میں تادم زیست خیانت نہ ہوگی اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے واپس کر دیتی لیکن میں بھی مجبور ہوں اور آپ بھی مجبور ہیں میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ زندگی میں مجھے سب جگر سوز یہی تجربہ ہوا ہے کہ عورت کی زندگی لعنت ہے اپنے لیے اپنے والدین کے لیے، اپنے خاندان کے لیے اس کی قدر نہ والدین کے گھر میں ہے نہ شوہر کے گھر میں میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے اماں رو رہی ہیں دادا رو رہے ہیں عزیز بیگانے رو رہے ہیں ساری دنیا ایک طرف ہو جائے آپ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی یہاں آپ کا فیصلہ ناطق ہے اس کی کہیں اپیل نہیں، کہیں فریاد نہیں خیر آج سے یہ قصہ زندگی تمام ہوا اب میں ہوں اور میرا پامال دل حسرت یہی ہے کہ آپ کی خدمت نہ کر سکی۔

بدنصیب۔۔۔۔۔کسم

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک عالم سکوت میں بیٹھا رہا کہ حضرت شاطر نے فرمایا ''آپ ان خطوط کو پڑھ کیا رائے قائم کی۔''

میں نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا اگر ان خطوط نے اس ظالم کے دل پر اثر نہیں کیا تو میرا خط بھلا اس پر کیا اثر کرے گا ان سے دردناک اور پرتاثیر تحریر پر میرے امکان سے باہر ہے ایسا کونسا انسانی جذبہ ہے جسے ان خطوط میں متحرک نہ کیا گیا ہو۔ غیرت، رحم اور میرے خیال میں اس نے کوئی پہلو نہیں چھوڑا میرے لیے تو آخری تدبیر یہی ہے کہ اس شیطان کے سر پر سوا ہو جاؤں اور اس سے دو بدو گفتگو کروں۔ معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں اگر اس نے مجھے کوئی قابل اطمینان جواب نہ دیا تو میں اپنا اور اس کا خون ایک کرونگا یا تو مجھے پھانسی ہوگی یا وہ کالے

پائی جائے گا کسم نے جتنا تحمل کیا ہے اس پر مجھے حیرت ہے آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، اطمینان سے گھر واپس جائیں میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گا اور پرسوں تک صورت حال ہوگی اس کی آپ کو اطلاع دوں گا مجھے یہ کوئی انتہا درجہ کا خبیث النفس آدمی معلوم ہوتا ہے صورت اور سیرت میں اتنا تو تفاوت میں نے پہلی بار دیکھا ہے ظالم سمجھتا ہوگا کسم اس کے قابل نہیں کیونکہ وہ نمائش اور تصنع نہیں جانتی میں ایسے ایسے ایک ہزار ظاہری اس پر نثار کروں۔

میں بہک گیا اور نہ جانے کیا بکتا رہا اس کے بعد ہم دونوں کھانا کھا کر اسٹیشن چلے آگرہ گئے اور میں نے مراد آباد کا راستہ لیا شاطر صاحب کی روح اس وقت بھی فنا ہو رہی تھی کہ کہیں جا کر میں کوئی بے عنوانی نہ کر بیٹھوں۔ بارے میرے بہت اطمینان دلانے پر انہیں تشفی ہوئی۔

میں علی الصباح مراد آباد پہنچا اور تفتیش شروع کر دی۔ ان حضرت کے اطوار کے متعلق مجھے جو شبہ تھا۔ وہ غلط نکلا محلّہ میں، کالج میں، اس کے دوستوں میں بھی اس کے مداح تھے۔ معاملہ زیادہ پیچیدہ ہوتا ہوا معلوم ہوا آخر شام کو میں اس کے گھر جا پہنچا اور اس کے والد سے ملنا بے سود سمجھ کر براہ راست اس سے ملا۔ جس سعادت مندی سے وہ مجھ سے ملا، میں اسے بھول نہیں سکتا۔ نہایت شائستہ انداز کلام تھا۔ مزاج میں حد درجہ انکسار، میں نے دو چار تمہیدی جملوں کے بعد کہا ''تم سے مل کر مجھے کمال مسرت ہوئی لیکن آخر کسم نے کیا خطا کی ہے جس کی تم اسے ایسی سخت سزا دے رہے ہو۔ اس غریب نے تمہارے پاس کئی خط لکھے، تم نے ایک بھی جواب نہ دیا۔ وہ دو تین بار یہاں بھی آئی مگر تم اس سے مخاطب نہ ہوئے۔

کیا یہ اس معصوم کے ساتھ تمہاری بے انصافی نہیں ہے۔''

نوجوان نے ندامت آمیز انداز میں کہا یہ بہتر ہوتا کہ آپ نے اس مسئلہ کو نہ چھیڑا ہوتا اس کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل ہے میں نے تو اسے آپ صاحبوں کے قیافہ پر چھوڑ دیا تھا۔اور سمجھتا تھا کہ اظہار حال کی ضرورت نہ پڑے گی، لیکن غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔اس لیے اب مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے آپ مجھے انتہا درجہ خواہش پرور، کمینہ اور حریص سمجھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں شادی کرنے پر رضامند نہ تھا۔اپنے پیروں میں زنجیر ڈالنا نہ چاہتا تھا لیکن جب جناب شاطر صاحب بہت درپے ہوئے اور ان کی باتوں سے مجھے یہ گمان کرنے کا موقع ملا کہ وہ میری ہر ممکن صورت سے امداد کرنے پر آمادہ ہیں تو میں رضامند ہو گیا، مگر انہوں نے میری مطلق امداد نہ، ان کی بے اعتنائی نے میری زندگی کے سارے خواب پریشان کر دیے۔میرے لیے سوا اس کے اور کیا ہے کہ ایل ایل بی پاس کرلوں اور عدالت میں جوتیاں چٹخاتا پھروں۔

میں نے پوچھا،''تو تم حضرت شاطر سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو داد و دہش میں تو انہوں نے شکایت کا موقع نہ دیا''

نوجوان نے سر جھکا کر کہا''اس داد و دہش سے میرا ذاتی فائدہ کیا ہوا، طرفین کے دس بارہ ہزار روپے خاک میں مل گئے اور انہیں کے ساتھ میری آرزوئیں بھی خاک میں مل گئیں۔والد صاحب تو مقروض ہو گئے ہیں اور اب مری تعلیم کے بار کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے میں بیگار کے طور پر ایل ایل بی کلاس میں شریک ہو گیا ہوں کیا سسر صاحب مجھے انگلینڈ نہ بھیج سکتے تھے ان کے لیے دس پانچ ہزار روپے

کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔‘‘

میں سکتہ میں آ گیا میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا، لا حول ولا قوۃ ان صاحبزادے کا جتنا وقار میری نظروں میں قائم ہو گیا تھا وہ جھوٹے رنگ کی طرح اڑ گیا، واہ ری دنیا واہ رے سماج! تیرے یہاں ایسے دنیا پرست پڑے ہیں جو ایسے ظالمانہ وحشیانہ دباؤ ڈال کر ایک معصوم زندگی تباہ کر کے منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تحصیل علم کے لیے انگلینڈ یا امریکہ جانا برا نہیں۔ خدا توفیق دے تو شوق سے جاؤ مگر بیوی کو ترک کر کے سسر پر اس کا بار ڈالنا بے غیرتی کی انتہا ہے تعریف کی بات تو یہ تھی کہ تم اپنے قوت بازو سے جاتے حالانکہ خود غرضانہ محبت بہت ہی معیوب ہے اور کوئی غیرت مند آدمی محبت میں غرض کو شامل نہ کرے گا لیکن اس وحشیانہ طرز عمل کے مقابلہ میں پھر بھی غنیمت ہے کسم کو ایک فرضی فروگزاشت کے لیے قابل گردن زدنی ٹھہرا دینا چھچھورے پن کی انتہا ہے اس ظالم کی نظر میں کسم کی کوئی حقیقت نہیں کسم محض آلہ ہے اس کی دنیا طلبی کا ایسے پست خیال آدمی سے کچھ بحث کرنا بے کار ہے میں نے سوچا اس وقت دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ والی پالیسی ہی موزوں ہے۔

دوسری گاڑی سے میں آگرہ جا پہنچا اور مسٹر شاطر سے یہ سرگزشت کہی ان غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہاں ساری ذمہ داری انہیں کے سر ڈال دی گئی ہے۔ اگرچہ اس عالم سرد بازاری نے ان کی وکالت بھی ٹھنڈی کر رکھی ہے اور وہ دس ہزار کا خرچہ بے تکلف برداشت نہیں کر سکتے، لیکن اگر ان صاحبزادے نے کنایۃً بھی ان سے کہا ہوتا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ کسم کے سوا دوسرا ان کا کون

بیٹھا ہوا ہے اس غریب کو تو حقیقت کا علم ہی نہ تھا چنانچہ میں نے جونہی یہ قصہ کہا وہ بولے ''چھی! اس ذرا سے معاملہ کو اس شخص نے خواہ مخواہ طول دے دیا آج ہی آپ اسے لکھ دیں کہ وہ جس وقت جہاں تحصیل علم کے لیے جانا چاہے شوق سے جا سکتا ہے میں اس کی ساری ذمہ داری قبول کرتا ہوں سال بھر تک ظالم نے کسم کو رلا رلا کر مار ڈالا غرض حال کا اس کے سوا اسے کوئی طریقہ ہی نہ سوجھا''

گھر میں اس کا چرچا ہوا کسم نے بھی ماں سے سنا معلوم ہوا کہ ایک ہزار کا چیک اس کے شوہر کے نام بھیجا جا رہا ہے مگر اس طرح جیسے کوئی آئی بلا کو ٹالنے کے لیے نیاز چڑھائی جا رہی ہو۔

کسم نے بھویں سکیڑ کر ماں سے کہا ''روپیہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں اماں دادا سے کہہ دو'' ماں نے حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھا ''کیسے روپیہ اچھا وہ کیوں؟ کیا حرج ہے، لڑکے کا دل ہے تو جائے اور یوں بھی اسی کا ہے ہمیں کون چھاتی پر لاد کر لے جانا ہے۔''

''نہیں آپ دادا سے کہہ دیجئے ایک پائی بھی نہ بھیجیں''

''آخر اس میں برائی کیا ہے؟''

''اس لیے کہ یہ اس طرح کی ڈاکہ زنی ہے جیسے بدمعاش کیا کرتے ہیں کسی آدمی کو پکڑ لے گئے اور اس کے بہی خواہوں سے اس کی آزادی کے لیے اچھی رقم وصول کر لی۔''

ماں نے تنبیہ کی آنکھوں سے دیکھا ''کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی اتنے دنوں کے بعد تو جا کے دیوتا سیدھے ہوئے ہیں اور تم انہیں پھر چڑھائے دیتی ہو''

کسم نے جھلا کر کہا ’’ایسے دیوتا کا روٹھے رہنا ہی اچھا ہے، جو شخص اتنا دنیا پرست، خودغرض اور حریص ہے اس کے ساتھ میرا نباہ نہ ہو گا میں کہے دیتی ہوں کہ اگر روپے وہاں گئے تو میں زہر کھالوں گی اسے مذاق نہ سمجھنا میں ایسے آدمی کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تم دادا سے کہہ دینا اور اگر تمہیں ڈر لگتا ہو تو میں خود کہہ دوں گی میں نے تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔‘‘

ماں نے دیکھا لڑکی کا چہرہ تمتما اٹھا ہے۔۔۔۔ گویا اس مسئلے پر وہ اب نہ کچھ کہنا چاہتی ہے نہ سننا۔

دوسرے دن شاطر صاحب نے یہ قصہ مجھ سے کہا تو میں ایک بے خودی کے عالم میں دوڑا ہوا کسم کے پاس گیا اور اسے گلے لگا لیا۔

سال بھر ہو گیا کسم نے شوہر کے پاس ایک خط بھی نہ بھیجا اور نہ اس کا ذکر ہی کرتی ہے شاطر صاحب نے کئی بار داماد کو منانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر کسم اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی اس میں خود اعتمادی کی ایسی اسپرٹ پیدا ہو گئی کہ حیرت ہوتی ہے اس کے چہرہ پر مایوسی اور حسرت کی زردی اور بے رونقی کی جگہ خودداری اور آزادی کی سرخی نمودار ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

وفا کا دیوتا

پہلی بار: ''عصمت'' سالگرہ نمبر 1932ء میں شائع ہوا
کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

منشی ہوری لال کی بیوی کا جب انتقال ہوا، وہ ایک طرح دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ یوں روزانہ کچہری جاتے ہیں اب بھی ان کی وکالت بری نہیں ہے یار دوستوں سے مراسم بھی رکھتے ہیں میلوں تماشوں میں بھی جاتے ہیں، مگر اس لیے نہیں کہ ان مشاغل سے انہیں کوئی خاص دلچسپی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور انسان ایک مجلسی حیوان ہے جب ان کی بیوی بقید حیات تھی، اس وقت کچھ اور ہی عالم تھا۔ کسی نہ کسی بہانے سے آئے دن احباب کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں کبھی گارڈن پارٹی ہے، کبھی جنم اشمٹی ہے، کبھی ہولی مہمان نوازی میں گویا ان کو مزا آتا تھا۔ آپ سے محض رسمی ملاقات ہے، لیکن ان کے گھر چلے جایئے تو چائے اور پھلوں سے آپ کی خاطر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ دوستوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار اور زندہ دل ان کے قہقہے گراموفون میں بھرنے کے قابل ہوتے تھے اولاد سے محرومت ھے، لیکن کسی نے انہیں ملول نہیں دیکھا محلے کے سارے بچے ان کے بچے تھے، اور بیوی بھی بالکل ہم مزاج آپ کتنے ہی دل گرفتہ ہوں اس دیوی سے ملاقات ہوتے ہی آپ کے خون میں ایک تازہ روانی آ جائے گی۔ خدا جانے اتنے لطیفے اور ضرب المثل کہاں سے یاد کر لیے تھے بات بات پر کہاوتیں کہتی تھی اور

جب کسی کو بنانے پر آتیں تو رلا کر چھوڑتی تھی خانہ داری میں تو اس کا ثانی نہ تھا دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے عاشق تھے ان کی محبت کی تازگی میں زمانے کے اثرات سے کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کچہری سے چھٹی مارتے ہی وہ شخص دیوانوں کی طرح گھر کی طرف بھاگتا تھا۔ آپ کتنا ہی اصرار کریں مگر اس وقت ایک منٹ کے لیے بھی راستے میں نہ رکتا تھا اور اگر کبھی منشی جی کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو وہ جاں نثار بیوی چھجے پر کھڑی ان کی راہ دیکھتی رہتی تھی۔ تیس سال تک یہی کیفیت رہی۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ان کی محبت روز بروز زیادہ جاذب اور لطیف ہوتی جاتی تھی۔ دونوں کی طبیعتیں اس قدر مل گئی تھیں کہ جو بات ایک کے دل میں آتی دوسرے کے دل میں وہی منعکس ہو جاتی تھی یہ نہیں کہ ان میں اختلاف نہیں ہوتا بہت سے مسائل میں ان کے خیالات مختلف تھے اور اپنے دعوے کی تائید اور دوسرے کے دعوے کی تردید میں ان میں خوب مباحثے ہوتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی سنے تو سمجھے کہ دونوں لڑ رہے ہیں اور اب معاملہ میدان عمل میں آنے والا ہے، مگر ان کے مباحثے دماغ سے ہوتے تھے دل دونوں کے ایک تھے۔ دونوں سیر چشم، دونوں خندہ رو، صاف گو، بے لوث، غیبت یا عیب جوئی سے کوسوں دور بھاگنے والے، گویا عالم علوی کے باشی ہوں۔ چنانچہ بیوی کا انتقال ہوا تو کئی مہینے لوگوں کو اندیشہ رہا کہ یہ حضرت خودکشی نہ کر بیٹھیں ہم لوگ ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتے رہتے کہیں انہیں تنہا نہ بیٹھنے دیتے رات کو بھی کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ رہتا دیوانوں کا غم کھانے والے دوسرے نکل ہی آتے ہیں۔ احباب کی بیویاں تو ان پر جان دیتی تھیں ان کی نظروں میں تو وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھے ان کی مثال

دے دے کراپنے شوہروں سے کہتیں ''اسے کہتے ہیں محبت ایسا مرد ہو تب عورت اس کی کیوں نہ غلامی کرے جب سے بیوی مری ہے غریب نے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا، کبھی نیند بھر نہیں سویا ایک تم ہو، دل سے کہتے ہو گے مر جائے گی تو دوسری شادی رچائیں دل میں خوش ہو گے، اچھا ہوا مر گئی روگ ٹلا، اب نئی بیوی لائیں گے۔''

اور اس وقت منشی جی کا پینتالیسواں سال تھا قوی، مضبوط، صحت اچھی، خوش رو، خوش مزاج، با حیثیت، چاہتے تو دوسری شادی کر لیتے ان کے ہاں کرنے کی دیر تھی غرض مند لڑکی والوں نے سلسلہ جنبانیاں کیں دوستوں نے بھی اجڑا گھر بسانا چاہا مگر اس دلدادہ وفا نے محبت کے نام کو داغ نہ لگایا اسی کے ساتھ ساری تمنائیں اور خواہشیں فنا ہو گئیں اب ہفتوں خط نہیں بنتا، بال ڑھے ہوئے ہیں کچھ پروا نہیں کہاں تو منہ اندھیرے اٹھتے تھے اور چار میل کا چکر لگا آتے تھے کبھی رک جائے تو دیوی جی گھڑکیاں جمائیں اور انہیں باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتیں کہاں اب آٹھ بجے تک چارپائی پر کروٹیں بدل رہے ہیں اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ خدمت گار نے حقہ لا کر رکھ دیا، دو چار کش لگا لیے نہ لائے تو غم نہیں۔ چائے آئی، پی لی، نہ آئے تو پروا نہیں، دوستوں نے بہت اصرار کیا تو سینما دیکھنے چلے گئے لیکن کیا دیکھا، کیا سنا، خبر نہیں، کہاں تو اچھے اچھے سوٹوں کا خبط تھا۔ کوئی خوشنما ڈیزائن کا کپڑا بازار میں آ جائے منشی جی بیوی کے لیے ایک سوٹ ضرور بنوائیں گے ان کے لیے ان کی بیوی ضروری بنوائے گی کہاں اب وہ ہی پرانے دھرانے پر شکن، بدرنگ کپڑے جسم پر لٹکائے چلے جا رہے ہیں۔ جواب لاغری کے باعث اتارے کے لگتے ہیں اور

جنہیں اب کسی طرح سوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ مہینوں بازار جانے کی نوبت نہیں آتی
اب کی کڑاکے کا جاڑا پڑا تو آپ نے ایک روئی دار نیچا لبادہ کوٹ بنوالیا، جسے پہن
کر بالکل بھگت جی بن گئے۔ صرف کنٹوپ کی کسر تھی بیوی ہوتی تو یہ لبادہ چھین کر
کسی فقیر کو دے دیتی، مگر اب کون دیکھنے والا ہے؟ کسے پروا ہے کہ وہ کیا پہنتے ہیں
اور کیسے رہتے ہیں پینتالیس کی عمر میں جو شخص پینتیس کا جچتا تھا، وہ اب پچاس کی عمر
میں ستر کا معلوم ہوتا ہے کمر میں کچھ خم بھی آ گیا ہے بال سفید ہو گئے ہیں دانت بھی
غائب ہو گئے ہیں، جس نے تب دیکھا ہو، آج پہچان بھی نہ سکے۔

مزا یہ کہ اس وقت جن مسئلوں پر لڑا کرتے تھے وہی اب ان کے جزو ایمان بن گئے ہیں۔ معلوم نہیں ان کے خیالات میں انقلاب ہو گیا ہے یا مرحومہ نے ان کی روح میں ملہم ہو کر اختلافات کا خاتمہ کر دیا ہے بیوی بدھوا واہ کو ناپسند کرتی تھی میاں اس کے پکے موید تھے، لیکن اب وہ بدھوا واہ کو معیوب سمجھتے تھے پہلے نئی تہذیب کے شیدائی تھے اب اس تہذیب کا ان سے بہتر نکتہ چیں مشکل سے ملے گا۔ ایک بار یوں ہی انگریزوں کی پابندی اوقات کا ذکر آ گیا میں نے کہا ''اس معاملے میں ہمیں انگریزوں سے سبق لینا چاہیے'' بس آپ اٹھ بیٹھے اور روا لہانہ انداز سے بولے ''ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں میں اس پابندی کو خود غرضی کا قطب، رعونت کا ہمالیہ اور کج خلقی کا صحرا سمجھتا ہوں۔ ایک شخص مصیبت کا مارا آپ کے پاس آتا ہے معلوم نہیں کون سی ضرورت اسے آپ کے پاس کھینچ لائی ہے، لیکن آپ فرماتے ہیں میرے پاس وقت نہیں یہ طرز عمل ان ہی لوگوں کا ہے جو وقت کو روپیہ سمجھتے ہیں اور اپنا ایک ایک منٹ کسب زر کی نذر کرنا چاہتے ہیں جو شخص

انسانیت کا والدہ ہے وہ کبھی اس طرز عمل کو پسند نہیں کرسکتا ہم اپنا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہتے ہیں جسے جب ضرورت ہو ہمارے پاس آئے ہم پوری توجہ سے اس کا حال سنیں گے اور اس کے غم یا مسرت میں شریک ہوں گے اچھی تہذیب ہے! یہ تہذیب ہے یا بد تہذیبی جس تہذیب کی اسپرٹ خودغرضی پر مبنی ہو، وہ دنیا کے لیے لعنت ہے عذاب ہے اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی میاں بیوی میں رد و کد ہوتی رہتی تھی۔ مرحومہ ہندو دھرم کو سب سے بڑھ کر سمجھتی تھیں آپ اسلام کے اصولوں کے قائل تھے مگر اب آپ پکے ہندو ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ لا مذہب ہو گئے ہیں ایک دن بولے ”میری کسوٹی تو ہے انسانیت جس دھرم میں انسانیت کو فضیلت دی گئی ہے بس اسی دھرم کو میں افضل سمجھتا ہوں کوئی دیوتا ہو یا منی، یا پیغمبر اگر وہ انسانیت کے خلاف اصولوں کی تلقین کرتا ہے تو میرا اسے دور سے سلام ہے اسلام کا میں اس لیے قائل تھا کہ وہ اخوت اور مساوات کا علمبردار ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ اخوت اور مساوات عالمگیر نہیں، صرف مذہب کے دائرے تک محدود ہے دوسرے لفظوں میں دیگر مذاہب کی طرح یہ بھی محض غول بندی ہے اس کے آئین وقوانین محض غول کے استحکام و انضباط کے لیے بنائے گئے ہیں گائے یا اونٹ کی قربانی کرنا عین ثواب ہے۔ آج بھی کہیں کہیں اس فرقے کے نام لیوا موجود ہیں تو کیا گورنمنٹ نے انسانی قربانی کو جرم نہیں قرار دیا اور ایسے مذہبی دیوانوں کو پھانسی نہیں دی۔ نفس کے لیے آپ بھیڑ کو ذبح کیجئے یا گائے کو یا اونٹ کو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مذہب کے نام پر قربانی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آج جانوروں کے ہاتھ میں حکومت آجائے تو فرمایئے وہ ان

قربانیوں کے جواب میں ہمیں اور آپ کو قربان کر دیں گے یا نہیں؟ مگر ہم جانتے ہیں جانوروں کو کبھی وہ قدرت حاصل نہ ہوگی اس لیے ہم غل وغش قربانیاں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہم بڑے مذہب پرور ہیں خوض غرضی اور ہوس پرستی کے لیے ہم چوبیسوں گھنٹے مذہبی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن قربانی کا ثواب لوٹے بغیر ہم سے نہیں رہا جاتا۔ تو جناب میں ایسے خون آشام مذہب کا قائل نہیں۔ یہاں تو انسانیت کے پجاری ہیں چاہے اسلام میں ہو یا ہندو دھرم میں، یا عیسائیت میں، ورنہ لامذہب ہی بھلا مجھے کسی انسان سے اس لیے بغض یا نفرت نہیں ہے کہ وہ میرا ہم مشرب نہیں ہے کسی کا خون تو نہیں بہاتا، اس لیے کہ مجھے ثواب ہوگا۔

اسی طرح کتنے ہی انقلابات منشی جی کے خیالات میں آ گئے ہیں اور ان کے پاس گفتگو کا ایک موضوع ہے جس سے وہ کبھی نہیں تھکتے اور وہ ہے اس جنت نصیب کا ذکر خیر کوئی مہمان آ جائے، آپ باؤلے سے ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں کچھ نہیں سوجھتا کیسے اس کی خاطر کریں معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈتے پھرتے ہیں بھائی میں آپ کی کیا خاطر کروں؟ جو آپ کی سچی خاطر کرتا، وہ نہیں رہا اس وقت تک آپ ناشتہ کے انتظار میں نہ رہتے۔ منہ اندھیرے چائے اور ٹوسٹ حاضر ہو جاتا۔ اس وقت بادام کا حلوہ، سنترے اور سیب آ جاتے میں تو نرا احمق ہوا، بھائی صاحب! مجھ میں جو کچھ اچھا تھا وہ سب اس کا فیض تھا اسی کی ذہانت سے میں ذہین تھا اسی کی فیاضی سے فیاض، اسی کی شرافت سے شریف اب تو لاشہ بے جان ہوں بھائی صاحب بالکل مردہ ہوں میں اس دیوی کے لائق نہ تھا نہ جانے

کن اعمال خیر کے صلے میں وہ مجھے ملی تھی آیئے آپ کو اس کی تصویر دکھا دوں۔ معلوم ہوتا، ابھی ابھی اٹھ کر چلی گئی ہے۔ بھائی صاحب! آپ سے حلفاً کہتا ہوں میں نے ایسی ماہ رو نہیں دیکھی۔ اس کے چہرے پر حسن کا رعب ہی نہ تھا، حسن کی لطافت بھی تھی اور دل کشی بھی۔

آپ مشتاق نظروں سے وہ تصویر دیکھتے ہیں آپ کو اس میں حسن کی کوئی خاص دل کشی نظر نہیں آتی فربہ جسم ہے، چوڑا سا منہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں انداز میں دہقانیت نمایاں ہے، مگر اس تصویر کے محاسن آپ کے سامنے کچھ اس شد و مد اور انہماک سے بیان کیے جاتے ہیں کہ آپ کو سچ مچ اس تصویر میں اس حسن کا احساس ہونے لگتا ہے اس ذکر خیر میں جتنا وقت گزرتا ہے وہی منشی جی کی زندگی کے بہترین لمحے ہیں اتنی ہی دیر زندہ رہتے ہیں باقی اوقات میں زندہ درگور۔

پہلے کچھ دنوں تک تو وہ ہمارے ساتھ صبح کی ہوا خوری کے لیے جاتے رہے۔ وہ کیا جاتے رہے، میں زبردستی انہیں ساتھ لے جاتا تھا، لیکن روز آدھ گھنٹے تک ان کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کسی طرح گھر سے نکلتے بھی تو چکوری چال سے چلتے اور آدھ میل میں ہی ہمت ہار جاتے، اور لوٹ چلنے کا تقاضا کرنے لگتے۔ آخر میں نے انہیں ساتھ لے جانا چھوڑ دیا اور تب سے ان کی چہل قدمی چالیس قدم کی رہ گئی ہے سیر کیا ہے بیگار ہے اور وہ بھی اس لیے کہ مرحومہ کے سامنے ان کا یہ معمول تھا۔

ایک دن حسب معلوم ان کے دروازے سے نکلا تو دیکھا کہ اوپر کے دروازے کی کھڑکیاں جو برسوں سے بند پڑی تھیں کھلی ہوئی ہیں تعجب ہوا

دروازے پر خدمت گار بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ حضرت گھومنے گئے ہوئے ہیں مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ آج نئی بات کیوں؟ اتنے سویرے تو کبھی نہیں اٹھتے جس طرف وہ گئے تھے، ادھر میں نے بھی قدم بڑھائے، ایک ہفتہ سے مجھے آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، ایک قرابت داری میں گیا تھا، اس دوران میں کیا انقلاب ہو گیا؟ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے دریافت حال کے لیے دل بے قرار ہو گیا کوئی دو میل جا کر آپ ملے جبکہ میں مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا تعجب ہو رہا تھا کہ راستے میں کہاں رہ گئے راستے میں کسی سے ملاقات ہی نہیں ہے جہاں ٹھہر گئے ہوں کچھ تشویش ہو رہی تھی حضرت کہیں کسی کنوئیں میں تو نہیں کود پڑے دور سے انہیں آتا دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا آج تو کینڈا ہی اور تھا بال نئے فیشن سے تراشے ہوئے، مونچھیں صاف اور ڈاڑھی چکنی، چہرے پر بشاشت، رفتار میں پھرتی سوٹ پر انا مگر برش کیا ہوا، اور شاید استری بھی کی ہو بوٹ پر پالش، مسکراتے چلے آرہے تھے مجھے دیکھتے ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے

"آج کئی دن بعد نظر آئے کہیں گئے تھے کیا؟"

میں نے اپنی غیر حاضری کا سبب بتا کر کہا "میں ڈرتا ہوں کہ آج کہیں تمہیں نظر نہ لگ جائے ،چشم بد دور اب میں روزانہ تمہارے ساتھ گھومنے آیا کروں گا آج بہت دنوں بعد تم نے آدمی کا چولا بدلہ ہے۔"

جھینپ گئے اور بولے "نہیں بھئی، مجھے اکیلا ہی رہنے دو۔ تم لگو گے دوڑانے اور اوپر سے گھڑکیاں جماؤ گے میں اپنے ہولے ہولے چلا جاتا ہوں جب تھک جاتا ہوں کہیں بیٹھ جاتا ہوں۔"

''تمہاری یہ وضع تو ایک ہفتہ پہلے تک تھی، آج تو تم بالکل اپٹوڈیٹ ہو اس رفتار سے تو شاید میں تم سے پیچھے ہی رہوں گا''

''تم تو بنانے لگے''

''میں کل سے آؤں گا اور تمہارے ساتھ سیر کو چلوں گا میرا انتظار کرنا''

''نہیں بھئی مجھے دق مت کرو میں آج کل بہت سویرے اٹھ جاتا ہوں رات کو نیند نہیں آتی سوچتا ہوں، لاؤ ٹہل ہی آؤں، تم میرے ساتھ کیوں پریشان ہو گے؟''

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ حضرت ہمیشہ میرے پیروں پڑتے تھے کہ مجھے ساتھ لے لیا کرو جب میں نے ان کی سست روی سے مجبور ہو کر تنہا ٹہلنا شروع کیا تو ان کی بہت دل شکنی ہوئی دو ایک بار مجھ سے شکایت بھی کی ''ہاں بھئی، اب کیوں ساتھ دو گے، بدنصیبوں کا ساتھ کس نے دیا ہے یا تم کوئی نئی تہذیب نکالو گے؟ زمانے کا دستور ہے جو لنگڑا ہوتا ہے اسے ڈھکیل دو، جو بیمار ہوا اسے زہر دے دو یہی نئے زمانے کی روش ہے'' لیکن میں نے ان کی طعن وطنز کی پروانہ کی تھی اور آج وہی شخص مجھ سے پیچھا چھڑا رہا ہے۔ یہ کیا راز ہے؟ یہ چستی، تیزی اور بشاشت کہاں سے آ گئی کہیں حضرت نے بندر کی گلٹی تو نہیں لگوائی ضرور یہی بات ہے یہ نیا سول سرجن غدود کے فن میں ماہر ہے ممکن ہے انہیں کسی نے سوجھایا ہو اور حضرت نے ہزار پانچ سو روپیہ خرچ کر کے گلٹی بدلوالی ہو اس معمہ کو حل کیے بغیر مجھے چین کہاں ان کے ساتھ ہی لوٹ پڑا۔

دو چار قدم چلنے کے بعد پوچھا ''سچ کہنا برادر! گلٹی ولٹی تو نہیں لگوائی؟''

انھوں نے استفسار کی نظروں سے دیکھا ''کیسی گلٹی، میں سمجھا نہیں''

''مجھے شک ہو رہا ہے کہ تم نے بندر کے غدود لگوائے ہیں ورنہ تم میں یہ جانداری کہاں سے آ گئی۔''

''ارے یار کیوں کوستے ہو، بندر کے غدود کیوں لگواتا، میرے تو ذہن میں یہ بات کبھی آئی ہی نہیں۔''

''تو کیا کوئی برقی آلہ منگوالیا ہے۔''

''تم آج میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے، بیوہ عورت بھی تو کبھی سنگار کر لیتی ہے۔ انسان کی طبیعت ہی تو ہے، ایک دن مجھے اپنی پست ہمتی اور کاہلی پر افسوس ہوا جب دنیا میں رہنا ہے تو زندوں کی طرح کیوں نہ رہوں مردوں کی طرح رہنے سے کیا فائدہ، بس اور کوئی بات نہیں۔''

مجھے تاویل سے تشفی نہ ہوئی دوسرے دن ذرا سویرے آیا اور منشی جی کے دروازے پر آواز دی معلوم ہوا چلے گئے میں ان کے پیچھے بھاگا۔ ضد پڑ گئی، اسے اکیلا نہ جانے دوں گا دیکھوں کب تک مجھ سے بھاگتا ہے آدھی رات آ کر بستر سے نہ اٹھاؤں تو سہی۔ دوڑ نہ سکا، لیکن جس قدر تیز چل سکتا تھا چلا بارے ایک میل کے بعد آپ نظر آئے، بھاگے جا رہے تھے اب میں بار بار پکار رہا ہوں کہ حضرت ذرا ٹھہریے خدا کے لیے ٹھہر جائیے میری سانس پھول رہی ہے مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں آخر جب میں نے اپنے سر کی قسم دلائی تب جا کر رکے میں لپک کر آپ کے پاس پہنچا تو چیں بہ جبیں ہو کر فرماتے ہیں ''میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میرے گھر مت آنا پھر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو، اب تم

اپنا راستہ لو۔''

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کہا ''دیکھو ہوری لال مجھ سے اڑو نہیں، ورنہ مجھے جانتے ہو کتنا بے مروت آدمی ہوں تم یہ دھیرے دھیرے ٹہل رہے ہو، یا ڈبل مارچ کر رہے ہو۔ میرے درد ہونے لگا اور پسلیاں دکھ رہی ہیں سانس پھول گئی اور آپ فرماتے ہیں مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو ڈاک کا ہرکارہ بھی تو اس رفتار سے نہیں دوڑتا۔ اس پر غضب یہ کہ تم تھکتے نہیں ہو اب بھی اسی دم خم سے چلے جا رہے ہو اب تم ڈنڈے سے بھگاؤ تو بھی تمہارا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے ساتھ دو میل چلوں گا تو بھی خاصی ورزش ہو جائے گی مگر اب صاف بتلاؤ راز کیا ہے؟ تم میں یہ جوانی کہاں سے آ گئی۔ اگر کسی اکسیر کا استعمال کر رہے ہو تو مجھے بھی دو۔ کم سے کم پتہ بتا دو، میں منگوا لوں گا۔ اگر کسی دعا، تعویذ کی کرامت ہے تو مجھے بھی اس کے پاس لے چلو۔''

مسکرا کر بولے ''تم تو پاگل ہو خواہ مخواہ مجھے دق کر رہے ہو بوڑھے ہو گئے مگر لڑکپن نہ گیا کیا تم چاہتے ہو میں اسی طرح زندہ در گور پڑا رہوں اتنا بھی تم سے نہیں دیکھا جاتا جب تو تمہارے مزاج ہی نہ ملتے تھے کتنی منت کی کہ بھائی جان مجھ خستہ جان کو بھی ساتھ لے لیا کرو تمہارے طفیل کچھ ہوا خوری ہو جائے گی، مگر آپ نخرے دکھانے لگے اب کیوں میرے پیچھے پڑے ہو بھائی جان جو اپنی مدد آپ کرتا ہے، اس کی مدد پر ماتما بھی کرتے ہیں، احباب و اعزا کی مروت بھی خوب دیکھ لی۔ اب اپنے بوتے پر چلوں گا''

وہ اسی طرح مجھے صلواتیں سناتے جا رہے ہیں اور میں انہیں چھیڑ چھیڑ کر اور

بھی اشتعال دلا رہا تھا کہ دفعتاً انہوں نے انگلی لب پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ذرا قد سیدھا کر کے اور چہرے پر بشاشت اور خودداری کا رنگ بھر کر مستانہ چال چلنے لگا۔

میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ یہ رازداری اور بہروپ کس لیے، وہاں تو کوئی دوسرا تھا بھی نہیں، مگر ہاں سامنے سے ایک عورت ضرور چلی آ رہی تھی۔ مگر اس کے سامنے اس پردہ داری کی کیا ضرورت؟ میں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا آسمانی رنگ کی ساڑھی جس پر زردلیس ٹکا ہوا تھا، اس پر خوب کھل رہی تھی حسین ہرگز نہ تھی مگر ضمن سے زیادہ دلکش اس کی شگفتگی نہ تھی اور بھولا پن، انداز میں خودداری اور متانت، لباس میں حسن مذاق، بشرہ سے شرافت اور وجاہت عیاں، ایک بہت ہی معمولی شکل وصورت کی عورت اتنی جاذب نظر ہو سکتی ہے، یہ میں نہ سمجھ سکتا تھا۔

اس نے ہوری لال کے برابر آ کر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا ہوری لال نے کسی قدر بے اعتنائی سے سر کو جنبش دی اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ اس نے کوئل کی سی آواز میں کہا ''لوجیے گا نہیں آپ اپنی حد سے آگے بڑھے جا رہے ہیں اور ہاں آج تو آپ نے دیوی جی کی تصویر دینے کا وعدہ کیا تھا شاید آپ بھول گئے کہیے تو آپ کے ساتھ چلوں؟''

منشی جی پر ایسی مصیبت طاری تھی کہ معمولی اخلاق کا اظہار بھی نہ کر سکے یوں تو وہ بہت ہی مہذب آدمی ہیں اور آداب مجلس بڑے ماہر، لیکن اس وقت جیسے ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولے:

''معاف کیجئے گا، ذرا مجھے ایک ضرورت ہے۔''

عورت نے کسی قدر شکستہ خاطر ہو کر کہا ''تو مجھے وہ تصویر کب دیجیے گا آپ تو آج جیسے بھاگے جا رہے ہیں۔''

منشی جی نے میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھا اور بولے ''تلاش کروں گا''

عورت نے چشم فریاد سے دیکھ کر کہا'' آپ نے تو فرمایا تھا کہ وہ ہمیشہ آپ کی میز پر رہتی ہے اس وقت کہتے ہیں تلاش کروں گا آپ کی طبیعت تو اچھی ہے جب سے آپ نے ان کے اوصاف بیان کیے ہیں، میں ان کے درشنوں کے لیے بیقرار ہوں، اور اگر یوں نہ دیں گے تو میں اسے آپ کی میز پر سے اٹھا لاؤں گی (میری طرف دیکھ کر) آپ میری مدد کیجئے گا جناب! حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آپ منشی جی کے دوست ہیں اور ان کے ساتھ دغا نہ کریں گے آپ کو تعجب ہو رہا ہو گا کہ یہ کون عورت منشی جی سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہے۔ ان سے میری ملاقات بازار میں ہوئی میں سبزی منڈی گئی ہوئی تھی میں اپنی سبزی خود لاتی ہوں نوکروں پر اتنا اہم کام چھوڑنا نہیں چاہتی جس پر زندگی کا قیام ہے سبزی لے کر دام دینے کے لیے روپیہ نکالا تو کنجڑے نے اسے ٹھنکا کر کہا۔ دوسرا روپیہ دو، یہ خراب ہے، اب جو میں نے خود ٹھنکایا تو معلوم ہوا واقعی روپے کی آواز میں کچھ ثقالت ہے، اب کیا کروں؟ میرے پاس دوسرا روپیہ نہ تھا، حالانکہ اس طرح کے تلخ تجربے مجھے بارہا ہو چکے ہیں، مگر گھر سے روپیہ لے کر چلتے وقت مجھے اسے پرکھ لینے کی یاد نہیں رہتی۔ نہ کسی سے روپیہ لیتے وقت ہی پرکھتی ہوں اس وقت میرے صندوق میں زیادہ نہیں بیس پچیس کھوٹے روپے ہوں گے اور ریزگاریاں تو سینکڑوں ہوں گی میرے لیے اس کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا کہ سبزی واپس کر کے

گھر لوٹ آؤں اتفاق سے منشی جی بھی اسی دکان پر سبزی خریدنے آئے تھے۔اس طرح میرا آپ سے تعارف ہوا۔۔۔''

منشی جی نے بات کاٹ کر کہا''تو اس وقت آپ وہ سارا قصہ کیوں بیان کررہی ہیں۔ہم دونوں ضروری کام سے جارہے ہیں خواہ مخواہ دیر ہورہی ہے۔''

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا

مجھے ان کی کج خلقی حد درجہ ناگوار گزری، کچھ اس کا راز بھی سمجھ میں آ گیا مجھ سے پردہ کیا جارہا ہے، بولا:''تو آپ جائیے مجھے کوئی ایسا ضروری کام نہیں ہے میں بھی اب لوٹنا چاہتا ہوں۔''

منشی جی نے دانت پیس لیے اگر وہ عوت اس وقت وہاں نہ ہوتی تو معلوم نہیں میری کیا درگت کرتے۔ایک سیکنڈ تک میری طرف غضبناک نظروں سے دیکھتے رہے۔گویا کہہ رہے ہوں''اچھا بچہ! اس کا انتقام نہ لیا ہو تو کہنا،اور چل دیے میں عورت کے ساتھ گھر کی طرف چلا۔''

یکایک اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا''مگر نہیں، آپ جائے، میں ان کے ساتھ گھوموں گی شاید وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں آج ایک ہفتہ سے میرا اور ان کا روز ساتھ ہو جاتا ہے وہ اپنا قصہ سنایا کرتے ہیں کیسی خوش نصیب تھی وہ عورت جس کا شوہر آج بھی اس کے نام کی پرستش کرتا ہے آپ نے تو انہیں دیکھا ہوگا کیا وہ سچ مچ بڑی جاں نثار عورت تھی؟''

میں نے پرجوش لہجہ میں کہا''دونوں میں محبت تھی''

''اور جب سے ان کا انتقال ہو گیا یہ تارک الدنیا ہو گئے؟''

''اس سے بھی زیادہ زندگی میں بجز اس کی یاد کے انہیں اور کوئی دلچسپی نہیں رہی''

''بہت حسین تھی؟''

''ان کی نظروں میں تو اس سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی''

اس نے ایک منٹ تک خیال میں رہنے کے بعد کہا

''اچھا اب جائیں میں ان کے ساتھ جا کر کچھ دیر واک کروں گی ایسے وفا پرور انسان کی مجھ سے جو خدمت ہو سکتی ہے، اس میں کیوں دریغ کروں مجھے تو ان کی سرگذشت نے پاگل بنا دیا ہے۔''

میں اپنا سا منہ لے کر گھر چلا آیا اتفاق سے اسی دن مجھے ایک ضروری کام سے دہلی جانا پڑا وہاں سے ایک ماہ میں لوٹا، اور سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ منشی ہوری لال کی پرشش حال تھی کہ معاملات نے اس دوران میں کیا رنگت اختیار کی یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا دہلی سے انہیں خط لکھا تھا مگر اس شخص کی یہ خبیث عادت ہے کہ خطوں کا جواب نہیں دیتا اس عورت سے ان کے تعلقات نے کیا صورت اختیار کی؟ آمد و رفت جاری ہے یا قطع ہو گئی اس نے ہوری لال کی وفا پروری کا صلہ کس صورت میں ادا کیا یا کرنے والی ہے اسی طرح کے کتنے ہی سوال مجھ میں ہیجان پیدا کر رہے تھے میں منشی جی کے مکان پر پہنچا تو آٹھ بجے ہوں گے کھڑکیوں کے دروازے بند تھے سامنے برآمدے میں بھی خس و خاشاک کے انبار تھے۔ بعینہ وہی حالت تھی جو اس چند روزہ انہماک سے پہلے نظر آتی تھی انتشار اور بڑھا اوپر گیا تو دیکھا کہ آپ اسی فرش پر پڑے ہونے ہیں جو بے ترتیبی اور بد

سلیقگی کا نمونہ ہے، ایک اخبار پڑھ رہے ہیں شاید ایک ہفتہ سے خط نہیں بنا تھا چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا ''آپ سیر کرکے لوٹ آئے کیا؟''

نیم شرمندگی سے جواب دیا ''اجی سیر سپاٹے کی کہاں فرصت ہے بھئی، اور فرصت بھی ہو تو وہ دل کہاں ہے؟''

تم تو کہیں باہر گئے تھے؟

''ہاں، ذرا دہلی گیا تھا، کیا اس دیوی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوتی''

''ادھر تو عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی''

''کہاں چلی گئی؟''

''مجھے کیا خبر''

''مگر آپ تو اس پر بری طرح ریجھے ہوئے تھے''

''میں اس پر ریجھا تھا! آپ کو جنون ہو گیا ہے کیا، جس پر ریجھا تھا، جب اسی نے رفاقت کا حق ادا نہ کیا تو اب دوسروں پر کیا ریجھوں گا''

''دیکھو ہوری لال، مجھے چکمہ نہ دو، پہلے میں تمہیں ضرور زاہد سمجھتا تھا، لیکن تمہاری رنگین مزاجیاں دیکھ کر جس کا دورہ تمہارے اوپر ایک ماہ قبل ہوا تھا میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم نے اپنی آرزوؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا تمہیں اس دوران کی ساری روداد مجھ سے بے کم و کاست بیان کرنی ہوگی ورنہ سمجھ لو کہ میری اور تمہاری دوستی کا خاتمہ ہے۔''

ہوری لال کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں اور چند سیکنڈ بعد بولے:

''میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو بھائی! اگر تم ہی میرے اوپر شبہ کرنے لگو گے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا اس کا نام مس اندرا ہے یہاں جو لڑکیوں کا ہائی اسکول ہے اسی کی ہیڈ مسٹریس ہو کر آئی ہے، میری اس سے کیوں کر ملاقات ہوئی یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے اس کی ہمدردی نے مجھے اس کا مداح بنا دیا۔ اس عمر میں اس کے غم کا بوجھ سر پر رکھے ہوئے مجھے اس کی جانب جس چیز نے کھینچا، وہ اس کی ہمدردی تھی، میں صرف اپنا قصہ غم سنانے کے لیے روز ان کے پاس جایا کرتا تھا وہ حسین ہے، خوش مزاج ہے، دردمند ہے، سلیقہ شعار ہے، لیکن تمہاری فرشتہ صفت بھابی کی کچھ اور ہی بات تھی۔ اس نے مجھ پر جو رنگ جما دیا اس پر اب دوسرا رنگ کیا جمے گا؟ میں اسی کی حرارت سے زندہ تھا اور اسی حرارت کے ساتھ زندگی ختم بھی ہو گئی۔ اب تم میں اس روضے کا مجاور رہوں جو میرے دل میں ہے۔ کسی ہمدرد کی صورت دیکھتا ہوں تو دل کو خوشی ہوتی ہے اور اپنا قصہ غم سنانے لگتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ کمزوری ہے اور تم اور دیگر احباب اسی وجہ سے مجھ سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن کیا کروں بھیا، مجھ سے اپنا قصہ غم سنائے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، میرا دم گھٹ جائے گا۔۔۔۔ اس لیے جب مس اندرا میری جانب ملتفت ہوئیں تو میں نے اسے امداد غیب سمجھا اور اس دھن میں جسے میرے بہت سے احباب میری بدقسمتی سے جنون سمجھتے ہیں، وہ سب کچھ کہہ گیا جو میرے دل میں تھا اور ہے میں تو اب بھی اسی دنیا اور زمانے میں بستا ہوں، مس اندرا کو غالباً مجھ پر رحم آ گیا، ایک دن انہوں نے میری دعوت کی اور کتنی ہی لذیز چیزیں اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائیں دوسرے دن خود آئیں اور یہاں کی ہر چیز ترتیب سے سجا گئیں

تیسرے دن کچھ کپڑے لائیں اور میرے لیے خود ایک سوٹ تیار کیا ان کی ہمدردیاں اسی طرح روز بروز وسیع ہوتی گئیں آخر ایک دن کوئنس پارک میں انہوں نے مجھ سے کہا۔"

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے"

میں نے ہنس کر کہا "اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا، دنیا کیا کہے گی؟"

مس اندرا بولی "آپ کی عمر ابھی ایسی کیا زیادہ ہے آپ چالیس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔"

میں نے تصحیح کی "میرا پچاسواں سال ہے"

"عمر کا حساب سالوں سے نہیں ہوتا ہے آپ کی صحت کچھ توجہ کی محتاج ہے کوئی آپ کو پان کی طرح پھیرنے والا چاہیے آپ کی یہ افسردہ دلی دور ہو سکتی ہے۔"

میرا دل دھڑکنے لگا گویا اختلاج ہو گیا ہو میں نے دیکھا مس اندرا کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ گئی ہے ان کی آنکھیں شرم سے جھک گئی ہیں اور کوئی بات بار بار ان کے لبوں تک آ کر لوٹ جاتی ہے آخر انہوں نے نظریں اٹھا کر کہا۔

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی کچھ خدمت کر سکتی ہوں تو میں ہر طرح حاضر ہوں"

میں نے معذرت آمیز لہجہ میں جواب دیا "میں تمہاری اس ہمدردی کا کہاں تک شکریہ ادا کروں مس اندرا! مگر مجھے افسوس ہے کہ میں زندہ نہیں ہوں، مردہ یادگاروں کا مجسمہ ہوں"

اس کے بعد میں نے ان کی محبت، رحمدلی اور فیاضی کی دل کھول کر داد دی مگر وہ

میری گفتگو سے کچھ ایسی متاثر ہوئیں کہ اسی وقت یہاں سے چلی گئیں، اور پھر تب سے نظر نہ آئیں۔ نہ ہی مجھے ہمت پڑی کہ ان کی تلاش کرتا، حالانکہ چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا، جب کبھی آپ کو کوئی تکلیف ہو اور آپ میری ضرورت محسوس کریں تو مجھے بلا لیجئے گا۔

ہوری لال نے اپنی سرگذشت ختم کر کے مجھے داد خواہانہ انداز سے دیکھا میں نے اس کا جواب ملامت سے دیا۔

''کتنے بدنصیب ہو تم ہوری لال، مجھے تمہاری حالت پر رحم بھی آتا ہے اور غصہ بھی، کم بخت! تیری زندگی سنور جاتی، تو نے زریں موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ یہ عورت نہیں، ایشور کی بھیجی ہوئی کوئی دیوی تھی جو تیری اندھیری زندگی کو دوبارہ روشن کرنے کے لیے آئی تھی جی چاہتا ہے تمہیں اوپر سے دھکیل دوں، نامعقول''

ہوری لال نے اپنی بیوی کی تصویر کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز سے بولے

''میں نے اسی کا ہوں بھائی جان اور اسی کا رہوں گا۔''

☆☆☆☆☆☆

معصوم بچہ

پہلی بار: ہندی میں ''بالک'' کے عنوان سے ''ہنس اپریل 1933 ء میں شائع ہوا''
کتابی صورت میں: فروری 1938ء (واردات)

(1)

گنگو کو لوگ برہمن کہتے ہیں اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے میرے سائیس اور خدمت گار مجھے زور سے سلام کرتے ہیں گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا وہ شاید مجھ سے پالاگن کی توقع رکھتا ہے، میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ کبھی میری اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں، تیز مزاج آدمی ہے، بات کی مطلق برداشت نہیں، ایسے بہت کم آدمی ہیں جن سے اس کی دوستی ہو سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسر شان سمجھتا ہے میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا، نہ میلے تماشے میں جاتے دیکھا حیرت یہ ہے کہ اسے بھنگ بوٹی سے بھی شوق نہیں جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے، وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور نہ اسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے بالکل ناحرف شناس آدمی ہے، لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی

تعظیم اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اسی شان سے قابض ہیں گویا انہوں نے خود پیدا کی ہو، تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا یہی اس کا تزکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے بہت کم بولتا ہوں میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں، مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا لیمپ جلا لینا یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا اس سے کہیں زیادہ آرام وہ معلوم ہوتا ہے کہ ہینگن اور میکو کو پکاروں اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اختیاری کا احساس ہوتا ہے نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں اس لیے ایک دن علی الصبح جب گنگو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گزرا یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لیے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لیے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں اور بیچ میں جب کوئی مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ کون دو دو، چار چار روپے کا حساب رکھتا پھرے۔ پھر جب کسی کو منہ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے اور شکایتوں سے مجھے سخت نفرت ہے میں نے شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یہ خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا ''کیا معاملہ ہے میں نے تو تمہیں بلایا نہیں''

گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت، کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا ''آخر بات کیا ہے؟ کہتے کیوں نہیں تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے مجھے دیر ہو رہی ہے''

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا ''تو آپ ہوا کھانے جائیں میں پھر آ جاؤں گا''

یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی اس رواروی میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگذشت کہہ سنائے گا وہ اتنا جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں دوسرے موقع پر تو کمبخت گھنٹوں روئے گا میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہوں لیکن غور و خوض کو جو میرے لیے انتہائی مصروفیت ہے وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے یقیناً یہ اسی وقت آ کر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔

میں نے تلخی کے ساتھ کہا ''کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو میں پیشگی نہیں دیتا''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی''

''کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی''

''تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟''

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گویا

کوئی جست لگانے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے آخر اس نے کہا'' مجھے اب آپ چھٹی دے دیں میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا'' یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں، اپنے ملازموں سے سخت کلامی نہیں کرتا اپنی آقائیت کو حتیٰ الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا تحکم کے لہجے میں پوچھا'' کیوں کیا شکایت ہے؟''

آپ نے تو ہجور جیسی نیک طبیعت پائی ہے ویسی کیا کوئی پائے گا لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ کی آبرو میں بٹا لگے۔

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا ہوا خوری کا نشہ اتر گیا تو کل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا'' تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کیا معاملہ ہے؟''

گنگو نے مجسم معذرت بن کر کہا'' بات یہ ہے کہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے وہی گومتی دیو۔۔۔۔''

وہ خاموش ہو گیا میں نے بے صبر ہو کر کہا'' ہاں نکال دی گئی ہے تو پھر؟ تمہاری نوکری کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

'' میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ہجور!''

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا یہ پرانے خیال کا بونگا برہمن جسے نئی تہذیب

کی ہوا تک نہیں لگی، اس عورت سے شادی کرے گا جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دے گا گومتی نے محلے کی پرسکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کردی تھی کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کردی مگر ہر بار وہ ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی یہاں تک کہ آشرم کے سیکرٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا وہ اسی محلے میں ایک کوٹھری لے کر رہتی تھی اور سارے محلے کے شہدوں کے لیے دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی، اس بے وقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جا رہا ہے، جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی تو اس کے پاس کتنے دنوں رہے گی کوئی گانٹھ کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی شاید سال چھ مہینے ٹک جاتی یہ تو محض آنکھ کا اندھا ہے ایک ہفتہ بھی تو نباہ نہ ہوگا۔

میں نے تنبیہہ آمیز لہجہ میں پوچھا ”تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟“

گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا سب جھوٹ ہے سرکار لوگوں نے اس کو ناحق بدنام کیا ہے۔

”کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟“

”ان لوگوں نے اسے نکال دیا تو کیا کرتی؟“

”کیسے احمق آدمی ہو کوئی اتنی دور سے آکر شادی کر کے لے جاتا ہے ہزاروں

روپے خرچ کرتا ہے اس لیے کہ عورت کو نکال دے؟''

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا ''جہاں محبت نہیں ہوتی ہے ہجور، وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی ہے کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے بدھوا سے بیاہ کر کے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے چاہتے تھے کہ وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے پہلے آپ کو اس کا بن جانا پڑتا ہے، ہجور۔ یہ بات ہے، پھر اسے ایک بیاری بھی ہے اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

''اور تم ایسی عورت سے شادی کرو گے؟ میں نے شبہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا'' سمجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی۔

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا ''میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائے گی آگے بھگوان کی مرجی۔''

میں نے زور دے کر کہا ''تو تم نے طے کر لیا ہے؟''

''ہاں ہجور''

''تو میں تمہارا استعفیٰ منظور کرتا ہوں''

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں لیکن جو آدمی ایک فاحشہ سے شادی کر لے اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا۔ آئے دن قضیے ہوں گے نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں گنگو بھو کے

آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے۔ روٹی خشک ہے، بد مزہ ہے اس کی اسے پروا نہیں اس کا عقل سلیم سے کام لینا محال تھا۔ میں نے اس کے علاحدہ کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

(2)

پانچ مہینے گزر گئے گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اسی محلے میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گزر بسر کرتا تھا مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا میں اس سے فوراً استفسار حال کرتا مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلے کی آزمائش تھی معاشرتی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے میں گنگو کو ہمیشہ خوش وخرم دیکھتا فراغت اور بے فکری سے چہرہ پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خودداری پیدا ہو جاتی ہے وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی۔ روپے بیس آنے کی بکری ہو جاتی تھی اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس آنے بچ جاتے تھے یہی اس کی معاش تھی مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی کیوں کہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سروسامانی، جو بے غیرتی نظر آتی ہے ان سے وہ پاک تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی جھلک تھی جو سکون قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے

اطمینان اور پر عافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رسوا کن سانحے، کسی دل نگار اور تباہ کن تغیر کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح منہ دکھاتا ہے اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہوگا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کتنے نیک نیت تھے اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے، گویا نجات کا دروازہ کھل گیا ہے لوگوں نے کتنا سمجھایا، کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں، کتنوں کو دغا دے چکی ہے، تمہارے ساتھ بھی دغا کرے گی مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا، اب اس ابلہانہ ضد کا خمیازہ اٹھاؤ۔ ملیں تو ذرا مزاج پرسی کروں۔ کہو" کیوں مہراج، دیوی جی کا یہ پروان پا کر خوش ہوئے یا نہیں تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں اب بتاؤں کون غلطی پر تھا اب آ گیا خیال شریف میں کہ حسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔"

اسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہوگئی، بدحواس تھا، بالکل کھویا ہوا گم گشتہ، کشتی شکستہ، مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں، درد سے میرے پاس آ کر بولا" بابو جی، گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کی۔"

میں نے حاسدانہ مسرت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کر کے کہا" تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا، لیکن تم مانے ہی نہیں اب صبر کرو اس کے سوا اور کیا چارہ ہے روپے پیسے صاف کر لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟"

گنگو نے سینے پر ہاتھ رکھا ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

ارے بابو جی ایسا نہ کہیے اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی اپنا جو کچھ تھا وہ بھی چھوڑ گئی نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی میں اس کے لائق نہ تھا بس اور کیا کہوں وہ پڑھی لکھی میں کریا اچھر بھینس برابر میرے ساتھ اتنے دن رہی یہی بہت تھا کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کا آپ سے کہاں تک بکھان کروں بابو جی اوروں کے لیے وہ چاہے کچھ رہی ہو میرے لیے کسی دیوتا کا آشیرباد تھی کیا جانے مجھ سے ایسی کیا کھتا ہوگئی مگر کسم لے لیجئے جو اس نے بھول کر بھی شکایت کی ہو میری اوکات ہی کیا ہے بابو جی دس بارہ آنے روز کا مجور رہوں مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بے وفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کروں گا مگر اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی ''تو وہ تمہارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟''

''کچھ نہیں بابو جی، دھیلے کی چیز بھی نہیں''

''اور تم سے محبت بھی بہت کرتی تھی؟''

''اب آپ سے کیا کہوں بابو جی، وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہے گی''

''پھر بھی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی؟''

''یہی تو تعجب ہے بابو جی''

''تریا چلتر کا نام کبھی سنا ہے؟''

''ارے بابو جی! ایسا نہ کہئے میری گردن پر کوئی چھری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاؤں گا''

''تو پھر ڈھونڈ نکالو''

''ہاں مالک؟ جب تک اسے ڈھونڈ نہ لاؤں، مجھے چین نہ آئے گا مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے پھر تو میں اسے لے ہی آؤں گا اور بابو جی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے گی جرور، دیکھ لیجئے گا وہ مجھ سے خفا نہیں تھی لیکن دل نہیں مانتا جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھانوں گا۔ جیتا رہا تو پھر آپ کے درسن کروں گا'' یہ کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

(3)

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا تفریح کے لیے ایک مہینے کے بعد لوٹا اور ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لیے کھڑا ہے شاید کرشن کو پا کر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہوں گے معلوم ہوتا تھا مسرت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے چہرے اور آنکھوں سے

تشکر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ کچھ وہی کیفیت تھی جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہو جانے کے بعد نظر آتی ہے۔

میں نے پوچھا ''کہو مہراج، گومتی دیوی کا کچھ سراغ ملا؟ تم تو باہر گئے تھے''

گنگو نے جامے میں پھولے نہ ساتے ہوئے جواب دیا ''ہاں بابو جی آپ کی دعا سے ڈھونڈ لایا لکھنو کے زنانے ہسپتال میں ملی یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بہت بے قرار ہوں تو بتلا دینا میں سنتے ہی لکھنو بھاگا اور انہیں لے آیا گھاتے میں یہ بچہ بھی مل گیا۔''

اس نے بچے کو گود میں میری طرف بڑھایا گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پا کر اسے دکھا رہا ہو۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں پھر بھی یہ بچے کو کتنی بے حیائی سے دکھا رہا ہے میں نے تمسخر کے انداز سے پوچھا'' اچھا یہ لڑکا بھی مل گیا شاید اس لیے وہ یہاں سے بھاگی تھی ہے تمہارا ہی لڑکا نہ۔''

''میرا کاہے کو ہے بابو جی، آپ کا ہے بھگوان کا ہے''

''تو لکھنو میں پیدا ہوا؟''

''ہاں بابو جی ابھی تو کل ایک مہینے کا ہے''

''تمہاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے؟''

''یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے''

''شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا؟''

''اور کیا بابو جی''

''پھر بھی تمہارا لڑکا ہے''

''ہاں جی''

کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو؟

معلوم نہیں وہ میرا منشا سمجھ رہا تھا اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا ''گھر میں مرتے مرتے بچی بابو جی یہ نیا جنم ہوا تین دن تین رات چھٹ پٹاتی رہی، کچھ نہ پوچھیے''

میں نے اب کی ذرا طنز کے ساتھ کہا ''لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سنا''

یہ کنایہ نشانہ پر جا بیٹھا معذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا ''مجھے تو بابو جی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی میں نے کہا'' گومتی اگر تمہارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہے تو مجھے چھوڑ دو میں اسی دم چلا جاؤں گا اور پھر کبھی تمہارے پاس نہ آؤں گا تمہیں جب کسی چیز کی جروت ہو مجھے لکھنا میں بھر سک تمہاری مدد کروں گا مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے تم میری نجر میں اب بھی اتنی ہی بھلی ہو اب بھی میں تمہیں اتنا ہی چاہتا ہوں نہیں اب میں تمہیں اور زیادہ چاہتا ہوں، لیکن اگر تمہارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو گنگو جیتے جی تم سے بے وپھائی نہیں کرے گا میں نے تم سے اس لیے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی وہ یہ بچہ میرا ہے میرا اپنا بچہ ہے میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کی پھسل کو اس لیے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی کسی دوسرے نے بویا تھا'' یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا۔''

میں کپڑے اتارنا بھول گیا کہہ نہیں سکتا کہ کیوں میری آنکھیں پرآب ہوگئیں نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھادیا۔ میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لےاوراس پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کو کبھی نہ لیا ہوگا۔

گنگو بولا بابو جی آپ بڑے شریف ہیں میں گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں کہتا ہوں چل ایک باران کے درسن کرآ لیکن مارے سرم کے آتی ہی نہیں۔

میں اور شریف! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا میں نے عقیدت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''نہیں جی، وہ میرے جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گی۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں تم مجھے شریف سمجھتے ہو میں ظاہر میں شریف مگر دل کا کمینہ ہوں اصلی شرافت تم میں ہے اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمہاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔''

میں بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

☆☆☆☆☆☆

عیدگاہ

پہلی بار: ''عصمت'' سالگرہ نمبر 1933ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے بچہ کی طرح پر تبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے، کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے، آج کا آفتاب دیکھ کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے، گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تو گا لینے دوڑا جا رہا ہے کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں کسی نے ایک روزہ رکھا وہ بھی دوپہر تک کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عید گاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے، روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے بچوں کے لیے تو عید ہے روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عید گاہ کیوں نہیں چلتے انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیویوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انہیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر

دوڑے جارہے ہیں ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے۔۔۔۔۔۔ کہتی کس کو، کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں اس لیے خاموش ہے حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیاہ ہو گیا ہے پھر بھی وہ خوش ہے جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن، آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں دنیا میں مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے "تم ڈرنا نہیں اماں میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا بالکل نہ ڈرنا لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں حامد کیا اکیلا ہی جائے گا اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی ننھی سی جان تین کوس چلے گا پاؤں میں

چھالے نہ پڑ جائیں گے۔"

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سیویاں کون پکائے گا، بھوکا پیا سا دوپہر کو لوٹے گا، کیا اس وقت سیویاں پکانے بیٹھے گی رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں اس نے فہمین کے کپڑے سیے تھے آٹھ آنے پیسے ملے تھے اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے، لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے دینے پڑے حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے اللہ ہی بیڑا پار کرے گا دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی سب کو سیویاں چاہئیں کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے زندگی خیریت سے رہے ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچوں کے ساتھ تھا۔ سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں خوب ہنس رہے ہیں مالی کو خوب الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے،

اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے ہیں آج چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کوڑن جیسے کام سے جی چرانے والے یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی اور کیا نہیں کیا اب تک پڑھتے ہوتے وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتے ہیں اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں سچ ہماری اماں کر و دے دو کیا کہلاتا ہے ''بیٹ'' اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا ''ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں ہاتھ کانپنے لگیں اللہ قسم''

حامد نے اس سے اختلاف کیا ''چلو'' منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگے گا سینکڑوں گھڑے اپنی روز نکالتی ہیں کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے آنکھوں تلے اندھیرا آجائے۔

محسن لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں۔

حامد کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں ابھی اس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں کتنی تیزی سے دوڑتی تھیں ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔

پھر آگے چلے حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں آج خوب سجی ہوئی تھیں اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی سنا ہے رات گئے ایک جنات ہر ایک دکان پر جاتا ہے جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا ایسے روپے جناب کو کہاں سے مل جائیں گے۔

محسن ’’جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب آپ ہیں کس خیال میں ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔‘‘

حامد ’’جناب بہت بڑے ہوتے ہوں گے‘‘

محسن ’’اور کیا ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے‘‘

سمیع ’’سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں، کوئی چیز چوری چلی جائے چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا جنات آ کر انہیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔‘‘

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں جنات آ کر

انہیں روپے دے جاتے ہیں آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں رائٹ لپ، پھام پھو۔

نوری نے تصحیح کی ''یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں جب ہی تو انہیں بے خبر ہے اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں رات کو سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں اور دوسرے محلّہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپے آپ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔''

حامد نے تعجب سے پوچھا ''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں''

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا ''ارے احمق انہیں کون پکڑے پکڑنے والے تو یہ خود ہیں لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے تھوڑے دن ہوئے ماموں میں آگ لگ گئی سارا مال متاع جل گیا، ایک برتن تک نہ بچا کئی دن تک درخت کے سائے کے نیچے سوئے، اللہ قسم پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے''

بستی گھنی ہونے لگی عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں

مگر صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عید گاہ نظر آئی جماعت شروع ہوگئی اور املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں آگے اب جگہ نہیں رہی یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں دہقاؤں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے، لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں ایک ساتھ دو زانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں کتنا پر احترام رعب انگیز نظارہ ہے جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہیں۔

نماز ختم ہوگئی ہے لوگ باہم گلے مل رہے ہیں کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم نہیں ہیں یہ دیکھو ہنڈولا ہے ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے کبھی زمین پر گرتے ہیں یہ چرخی ہے لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی منجوں سے

لٹکے ہوئے ہیں ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں حامد دور کھڑا ہے تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں ذرا سا چکر کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے۔ لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں، عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔ سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہوئے ہیں دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں واہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے، خاکی وردی اور پگڑی لال کندھے پر بندوق معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے، محسن کو بھشتی پسند آیا کمر جھکی ہوئی ہے اس پر مشک کا دھانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے، دوسرے ہاتھ میں رسی ہے کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے نوری کو وکیل سے مناسبت ہے کتنی عالمانہ صورت ہے سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا نہیں کھولنے فضول ہیں نہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا

کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے ''میرا بھشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام''

محمود ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے مٹی کے ہی تو ہیں گریں تو چکنا چور ہو جائیں لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے، طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر بچھی ہوئی ہے، گیند، سیٹیاں، بگل، بھنورے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں محسن ایک سیٹی لیتا ہے محمود گیند، نوری ربڑ کا بت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری اسے وہ بجا بجا کر گائے گا حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگتا ہے لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا کسی نے ریوڑیاں لی ہیں کسی نے گلاب جامن کسی نے سوہن حلوہ مزہ سے کھا رہے ہیں ان کی برادری سے خارج ہے، کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا پھر بھی وہ اس کے پاس گیا محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں حامد کی طرف بڑھائیں حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے حامد کھسیانہ ہو گیا محسن نے کہا ''اچھا اب ضرور دیں گے یہ لے جاؤ اللہ قسم''

حامد نے کہا ''رکھے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا ''تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے؟''

محمود ''تم اس سے مت بولو حامد میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو''

حامد ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں''

محسن ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔''

محمود ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا دست پناہ رکھے ہوئے تھے وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی، گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی کھلونوں سے کیا

فائدہ مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عید گاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے روٹیاں توے سے اتار لو، چولہے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں روز ہاتھ جلا لیتی ہیں اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو میری تختی دھلاؤ اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا، کھائیں مٹھائیاں آپ منہ سڑے گا پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی، تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے میری زبان کیوں خراب ہو گی اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے ہزاروں دعائیں دیں گی پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں، میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ

دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا، اور کتابیں دے دوں گا، یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگیں۔

دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے احمق تو ہیں ہی سب اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا ''یہ دست پناہ بیچو گے؟''

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں''

''تو بتلاتے کیوں نہیں کے پیسے کا دو گے؟''

چھ پیسے لگے گا

حامد کا دل بیٹھ گیا کلیجہ مضبوط کر کے بولا ''تین پیسے لو گے؟'' اور آگے بڑھا کر دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ دست پناہ لایا ہے احمق اسے کیا کرو گے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا ''ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی''

محمود ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد ''کھلونا کیوں نہیں ہے ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا، ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں، ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے میرا بہادر شیر ہے۔ یہ دست پناہ''

سمیع متاثر ہو کر بولا ''میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے۔''

حامد نے خنجرے کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی ڈھب ڈھب بولنے لگی ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں پانی میں آندھی میں طوفان میں برابر اڈٹا رہے گا۔ میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے، حامد ہے بڑا ہوشیار اب دو فریق ہو گئے محمود، محسن اور نوری ایک طرف حامد یکہ و تنہا دوسری طرف سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف ہو جائے گا مناظرہ شروع ہو گیا، آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی ربڑ اور لکڑی کی چیزیں دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے وہ روئیں تن ہے صف شکن ہے اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بھشتی کی اوسان خطا ہو جائے۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا

سارا قانون پیٹ میں سما جائے چغے منہ میں چھپا کر لیٹ جائیں مگر بہادر، یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔''

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا ''اچھا تمہارا دوست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔ حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ یہ بھشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا جناب اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر لو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا نوری نے کمک پہنچائی ''بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب''

حامد ے پاس اس وار کا دفیعہ اتنا آسان نہ تھا دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا ''یہ سپاہی بندوق والا''

حامد نے منہ چڑھا کر کہا یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑ لیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی پکڑیں گے کیا بے چارے؟

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا ''تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلا کرے گا''

حامد کے پاس جواب تیار تھا ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بھشتی ڈرپوک ہیں سب گھر میں گھس جائیں گے آگ میں کودنا

وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔''

نوری نے انتہائی جدت سے کام لیا ''تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی سمیع بھی جیت گیا۔'' بے شک بڑے معرکے کی بات کہی'' دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔''

حامد نے دھاندلی کی میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے حامد نے میدان جیت لیا، گوثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور بت ریزرو تھے مگران مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کوچوں و چرا کی گنجائش نہیں ۔

فاتح کو مفتوحوں سے تمہارا اور خوشامد کا مزاج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جمالیا کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا'' ذرا اپنا چمٹا دو ہم بھی دیکھیں تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو حامد ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے وہ فیاض طبع فاتح ہے دست پناہ باری باری

سے محمود، محسن، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری حامد کے ہاتھ میں آئے کتنے خوبصورت کھلونے ہیں معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں، مگر ان کھلونوں کے لئے انہیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دست پناہ تو ہے اور سب کا بادشاہ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو خراج ملا یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔''

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی میلے والے آ گئے محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اچھلی تو میاں بھشتی نیچے آ رہے۔ اور عالم جاودانی کو سدھارے اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں ان پر چیڑ کا ایک پرانا پڑا رکھا گیا پڑے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو منزلہ قالین کے تھا وکیل صاحب عالم بالا پہ جلوہ افروز ہوئے یہیں سے قانونی بحث کریں گے نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آ رہے اور ان کی مجسمہ خاکی کے پرزے ہوئے پھر بڑے زور کا ماتم ہوا اور

وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی تا کہ بے کار نہ جا کر زاغ وزغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی محترم اور ذی رعب ہستی ہے اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے تھونے والے داگتے لہو''پکارتے چلتے تھے معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے ایک ٹانگ مضروب ہوگئی مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آناً فاناً میں جوڑ دے گا صرف گولر کا دودھ چاہیے گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملی جراہی ناکام ہو جاتی ہے تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا۔ نہ بیٹھ سکتا تھا اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔''

اب میاں حامد کا قصہ سنیے امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا

لایا کیا یہ دست پناہ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا اور شفقت بھی وہ نہیں جو منہ پر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے یہ بے زبان شفقت تھی درد التجا میں ڈوبی ہوئی اف کتنی نفس کشی ہے کتنی جانسوزی ہے، غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی وہ رونے لگی دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

اکسیر

پہلی بار: ''عصمت'' 1933ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

بیوہ ہو جانے کے بعد بوٹی کے مزاج میں کچھ تلخی آ گئی تھی جب خانہ داری کی پریشانیوں سے بہت جی جلتا تو اپنے جنت نصیب کو صلواتیں سناتی ''آپ تو سدھار گئے میرے لیے یہ سارا جنجال چھوڑ گئے'' جب اتنی جلدی جانا تھا تو شادی نہ جانے کس لیے کی تھی ''گھر میں بھونی بھنگ نہ تھی چلے تھے شادی کرنے'' بوٹی چاہتی تو دوسری سگائی کر لیتی اہیروں میں اس کا رواج ہے اس وقت وہ دیکھنے سننے میں بھی بری نہ تھی دو ایک اس کے خواستگار بھی تھے لیکن بوٹی عفت پروری کے خیال کو نہ روک سکی اور یہ سارا غصہ اترتا تھا اس کے بڑے لڑکے موہن پر جس کا سولہواں سال تھا سوہن ابھی چھوٹا تھا اور مینا لڑکی تھی یہ دونوں ابھی کس لائق تھے اگر یہ تین بچے اس کی چھاتی پر سوار نہ ہوتے تو کیوں اتنی تکلیف ہوتی۔ جس کے گھر میں تھوڑا سا کام کر دیتی وہ روٹی کپڑا دے دیتا۔ جب چاہتی کسی کے گھر بیٹھ جاتی اب اگر کہیں چیخ جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بچوں کے ہوتے ہوئے یہ اسے کیا سوجھی موہن اپنی بساط کے مطابق اس کا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا جانوروں کو سانی پانی ڈھونا، متھنا یہ سب وہ کر لیتا لیکن بوٹی کا منہ سیدھا نہ ہوتا تھا روز نہ ایک نہ ایک بات نکالتی رہتی۔ اور موہن نے بھی عاجز ہو کر اس کی تلخ

نوائیوں کی پروا کرنا چھوڑ دیا تھا بوٹی کو شوہر سے یہی گلہ تھا کہ وہ اس کے گلے پر گرہستی کا جنجال چھوڑ کر چلا گیا اس غریب کی زندگی ہی تباہ کر دی۔ نہ کھانے کا سکھ میسر ہوا نہ پہننے کا۔ نہ اور کسی بات کا، وہ اس گھر میں کیا آئی گویا بھٹی میں پڑ گئی اس کے ارمانوں کی تشنہ کامی اور بیوگی کے قیود میں ہمیشہ ایک جنگ سی چھڑی رہتی تھی اور جلن میں ساری مٹھاس جل کر خاک ہوگئی تھی۔ اور شوہر کی وفات کے بعد بوٹی کے پاس اور کچھ نہیں تو چار پانچ سو کے زیور تھے لیکن ایک ایک کر کے وہ سب اس کے ہاتھ سے نکل گئے اس کے محلے اس کی برادری میں کتنی ہی عورتیں ہیں جو عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود گہنے جھمکا کر، آنکھوں میں کاجل لگا کر، مانگ میں سندور کی موٹی سی لکیر ڈال کر گویا اسے جلاتی رہتی ہیں اس لیے جب اس میں سے کوئی بیوہ ہو جاتی ہے تو بوٹی کو ایک حاسدانہ مسرت ہوتی۔ وہ شاید ساری دنیا کی عورتوں کو اپنی ہی جیسی دیکھنا چاہتی تھی اور اس کی محروم آرزوؤں کو اپنی پاکدامنی کی تعریف اور دوسروں کی پردہ داری اور حرف گیری کے سوا سکون قلب کا اور کیا ذریعہ تھا کیسے اپنے آنسو پونچھتی۔ وہ چاہتی تھی اس کا خاندان حسن سیرت کا نمونہ ہو اس کے لڑکے ترغیبات سے بے اثر رہیں یہ نیک نامی بھی اس کی پاکدامنی کے غرور کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

اس لیے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ موہن کے متعلق کوئی شکایت سنے اور ضبط کر جائے تردید کی گنجائش نہ تھی۔ غیبت کی اس دنیا میں رہتے رہتے وہ ایک خاص قسم کی باتوں میں بے انتہا سہل اعتقاد ہوگئی گویا وہ کوئی ایسا سہارا ڈھونڈتی رہتی تھی جس پر چڑھ کر وہ اپنے کو دوسروں سے اونچی دکھا سکے۔ آج اس کے غرور کو ٹھیس لگی

موہن جونہی دودھ بیچ کر گھر آیا بوٹی نے اسے قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''دیکھتی ہوں اب تجھے ہوا لگ رہی ہے''

موہن اشارہ نہ سمجھ سکا پر سوال نظروں سے دیکھتا ہوا بولا

''میں کچھ سمجھا نہیں، کیا بات ہے؟''

''شرمائے گا تو نہیں الٹا مجھی سے پوچھتا ہے تو روپا سے چھپ چھپ کر نہیں ہنستا بولتا تجھے شرم نہیں آتی کہ گھر میں پیسے پیسے کی تنگی ہے اور ان کے لیے پان لائے جاتے ہیں کپڑے رنگائے جاتے ہیں۔''

موہن نے عذر گناہ کیا جو گناہ سے بھی بدتر تھا۔

''تو میں نے کون سا گناہ کر ڈالا اگر اس نے مجھ سے چار پیسے کے پان مانگے تو کیا کرتا کہتا کہ پیسے دے تو پان لاؤں گا اپنی ساڑھی رنگانے کو دے دی تو اس سے رنگائی مانگتا۔''

''محلے میں ایک تو ہی بڑھا دھنا سیٹھ ہے اس نے اور کسی سے کیوں نہ کہا؟''

''یہ وہ جانے میں کیا بتاؤں؟''

''کبھی گھر میں بھی دھیلے کے پان لایا یا ساری خاطر داری دوسروں کے لیے ہی رکھ چھوڑی ہے؟''

''یہاں کس کے لیے پان لاتا؟''

''تیرے لیے کیا گھر کے سارے آدمی مر گئے؟''

''میں نہ جانتا تھا تم بھی پان کھانا چاہتی ہو؟''

''سنسار میں ایک روپا ہی کھانے کے لائق ہے''

''شوق شنگار کی بھی تو ایک عمر ہوتی ہے''

بوٹی جل اٹھی اسے بڑھیا کہہ دینا اس کے تقوے وطہار کو خاک میں ملا دینا تھا بڑھاپے میں ان پابندیوں کی وقعت ہی کیا جب نفس کشی کے بل پر وہ سب عورتوں کے سامنے سر اٹھا کر چلتی تھی اس کی یہ ناقدری انہیں لڑکوں کے پیچھے اس نے اپنی ساری جوانی خاک میں ملا دی اس کے شوہر کو گزرے آج پانچ سال ہوئے تب اس کی چڑھتی جوانی تھی یہ تین چینٹے پوت اس کے گلے منڈھ دیے ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے چاہتی تو آج وہ بھی ہونٹ سرخ کیے پاؤں میں مہندی رچائے، الوٹ، بچھوے، پہنے مٹکتی پھرتی یہ سب کچھ اس نے لڑکوں کے کارن تیاگ دیا اور بوٹی بڑھیا ہے ''بولی'' ہاں اور کیا میرے لیے تو اب چیتھڑے پہننے کے دن ہیں جب تیرا باپ مرا تو میں روپا سے دو ہی چار سال بڑی تھی اس وقت کوئی گھر کر لیتی تو تم لوگوں کا کہیں پتہ نہ لگتا گلی گلی بھیک مانگتے پھرتے لیکن میں کہے دیتی ہوں اگر تو پھر اس سے بولا تو یا تو ہی اس گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گی۔

موہن نے ڈرتے ڈرتے کہا ''میں اسے بات دے چکا ہوں اماں''

''کیسی بات؟''

''سگائی''

''اگر روپا میرے گھر میں آئی تو جھاڑو مار کر نکال دوں گی یہ سب اس کی ماں کی مایا ہے وہی کٹنی میرے لڑکے کو مجھ سے چھینے لیتی ہے۔ رانڈ سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا چاہتی ہے کہ اسے سوت بنا کر میری چھاتی پر مونگ دے۔''

موہن نے دردناک لہجہ میں کہا ''اماں ایشور کے لیے چپ رہو کیوں اپنا پانی

کھو رہی ہو میں نے تو سمجھا تھا چار دن میں مینا اپنے گھر چلی جائے گی تم اکیلی رہ جاؤ گی اسی لیے اسے لانے کا خیال ہوا اگر تمھیں برا لگتا ہے تو جانے دو"

بوٹی نے شبہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا "تم آج سے یہیں آنگن میں سویا کرو"

"اور گائے بھینس باہر ہی پڑی رہیں؟"

"پڑی رہنے دو کوئی ڈاکہ نہیں پڑا جاتا"

"مجھ پر تجھے اتنا شبہ ہے؟"

"ہاں"

موہن نے خودداری کی شان سے کہا "میں یہاں نہ سوؤں گا"

"تو نکل جا میرے گھر سے"

"ہاں تیری یہی مرضی ہے تو نکل جاؤں گا"

مینا نے کھانا پکایا موہن نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے"

بوٹی اسے منانے نہیں گئی موہن کا سرکش دل ماں کے اس جابرانہ حکم کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ ماں کا گھر ہے لے لے، اپنے لیے وہ کوئی دوسرا ڈھونڈ لے گا روپا نے اس کی بے لطف، بے کیف زندگی میں ایک مسرت پیدا کر دی تھی۔ جب وہ اپنے دل میں ایک نا قابل بیان شورش کا احساس کر رہا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کی معمولی پر مشقت، رفتار سے بیزار ہو رہا تھا۔ جب دنیا اسے سونی سونی دلچسپیوں سے خالی نظر آ رہی تھی اس وقت روپا نے اس کی زندگی میں بہار کی طرح رونما ہو کر اسے سرخ کونپلوں اور طیور کے نغموں سے حلاوت پیدا کر دی اب اس کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی کام کرنا ہوتا تو دل روپا کی طرف لگا ہوتا یہی ارمان تھا کہ اسے

کیا چیز دے کہ وہ خوش ہو جائے۔ بڑی ہمت کر کے اس نے اسے اپنا درد دل کہا۔ اب آج وہ کس منہ سے اس کے پاس جائے۔ کیا اس سے کہے کہ اماں نے تم سے ملنے کی ممانعت کی ہے ابھی تو کل چراگاہ میں برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے دونوں میں کیسے اخلاق کی باتیں ہو رہی تھیں موہن نے کہا تھا ''روپا تم اتنی سندر ہو کہ تمہارے سو گاہک نکل آئیں گے تم جس گھر میں جاؤ گی وہ روشن ہو جائے گا میرے گھر میں تمہارے لیے کیا رکھا ہے'' اس پر روپا نے جواب دیا تھا'' وہ ایک نغمہ لطیف کی طرح اس کے جسم کی ایک ایک رگ میں، اس کی روح کے ایک ایک ذرہ میں بسا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا میں تو تم کو چاہتی ہوں موہن تم پر گنے کے چودھری ہو جاؤ تب بھی موہن ہو مزدوری کرنے لگو تب بھی موہن ہو۔'' وہ اپنے موہن کے افلاس، رسوائی اور رفاقہ کشی سب کچھ جھیل لے گی اسی روپا سے اب وہ جا کر کہے ''مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے''

نہیں یہ غیر ممکن ہے اسے گھر کی پروا نہیں ہے وہ روپا کے ساتھ ماں سے الگ رہے گا۔ یہاں نہ سہی کسی دوسرے محلے میں سہی، اس وقت بھی روپا اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ کیسے اچھے بیڑے لگاتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے جیسے بیڑوں میں پریم گھول دیتی ہے لیکن جاؤ گے کیسے؟ اماں سے وعدہ نہیں کیا ہے کہیں اماں سن لیں کہ یہ رات کو روپا کے پاس گیا تھا تو جان ہی دے دے۔ تو میرا کیا نقصان؟ دے دیں جان اپنی تقدیر کو تو نہیں بکھانتیں کہ ایسی دیوی جو انہیں پان کی طرح پھیرے گی۔ الٹے اور اس سے جلتی ہیں نہ جانے کیوں روپا سے اسے اتنی چڑھ ہے۔ وہ ذرا پان کھا لیتی ہے، ذرا رنگین ساڑھی پہن لیتی ہے، بس یہی تو اس کی عمر

کھانے پہننے کی ہے کیا برا کرتی ہے۔

چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی روپا آ رہی ہے شاید، ہاں وہی ہے، موہن کے ساز جسم کے سارے تار جھنکار اٹھے اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ناچنے لگا روپا اس کے دروازے پر آئی شیریں ادا روپا کیسے اس کا خیر مقدم کرے کیا کرے؟ جا کر اس کے قدموں پر سر رکھ دے۔

روپا اس کے سرہانے آ کر بولی ”کیا سو گئے موہن؟ اتنی جلدی گھڑی بھر سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں آئے کیوں نہیں؟“

موہن نیند کا بہانہ کیے پڑا رہا

روپا نے اس کا سر ہلا کر کہا ”کیا سو گئے موہن ابھی سے، اپنا پان کھالو“

اس کی انگلیوں میں کیا اعجاز تھا کون جانے ،موہن کی روح میں شایانے بجنے لگے اس کی جان روپا کے قدموں پر سر رکھنے کے لیے گویا اچھل پڑی دیوی برکتوں کا تھال لیے اس کے سامنے کھڑی ہے ساری کائنات مسرت سے رقص کر رہی ہے اسے معلوم ہوا جیسے اس کا جسم لطیف ہو گیا ہے اور وہ کسی صدائے مضطرب کی طرح فضا کی گود سے چمٹا ہوا اس کے ساتھ رقص کر رہا ہے ”میں جاتی ہوں نہیں جاگتے نہ جاگو ہاں نہیں تو“

موہن اب ضبط نہ کر سکا ”ہاں ذرا نیند آ گئی تھی تم اس وقت کیا کرنے آئیں اماں دیکھ لیں تو مجھے مار ہی ڈالیں“

روپا نے اس کے منہ میں پان کا بیڑا رکھ کر کہا ”تم آئے کیوں نہیں؟“

”آج اماں سے لڑائی ہو گئی“

''کیا کہتی تھیں؟''

''کہتی تھیں روپا سے بولو گے تو جان دے دوں گی''

''تم نے پوچھا نہیں روپا سے کیوں اتنی چڑھتی ہو؟''

''اب ان کی بات کیا کہوں روپا وہ کسی کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتیں''

''یہ بات نہیں ہے موہن، انہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے میں چنچل تھی نہ لیکن اب تو میں کسی سے نہیں ہنستی''

''اماں کو کیسے سمجھاؤں؟''

تم میرے پاس ایک بار روز آجایا کرو بس اور میں کچھ نہیں چاہتی

دفعتاً موہن کے گھر کا دروازہ کھلا شاید بوٹی آ رہی ہے روپا سرک گئی موہن بھیگی بلی بن گیا۔

موہن دوسرے دن سو کر اٹھا تو اس کے دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا اس کی خلقی خشونت اور تندی غائب ہوگئی تھی گویا بچے کو مٹھائی مل گئی ہو وہ سوہن کو ہمیشہ ڈانٹتا تھا سوہن آرام طلب اور کاہل تھا گھر کے کام دھندے سے جی چراتا تھا آج بھی وہ آنگن میں بیٹھا اپنی دھوتی میں صابن لگا رہا تھا۔ غازی میاں کے میلے کی تیاری کر رہا تھا۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے صابن چھپا دیا اور بھاگ جانے کے لیے موقع ڈھونڈنے لگا۔

موہن نے مخلصانہ تبسم کے ساتھ کہا ''کیا دھوتی بہت میلی ہوگئی ہے دھوبن کو کیوں نہیں دے دیتے؟''

''دھوبن پیسے نہ مانگے گی؟''

''تو پیسے اماں سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟''

''اماں پیسے دے چکیں اٹی گھڑکیاں دیں گی''

''تو مجھ سے لے لو''

یہ کہہ کر اس نے ایک اکنی اس کی طرف پھینک دی سوہن باغ باغ ہو گیا بھائی اور ماں دونوں اس کو ملامت کرتے رہتے تھے بہت دنوں کے بعد اسے محبت کی شیرینی کا مزہ ملا اکنی اٹھالی اور دھوتی وہیں چھوڑ گائے کو کھولنے چلا۔

موہن نے کہا ''تم رہنے دو میں اس لیے جاتا ہوں''

سوہن نے گائے کو کھونٹے سے کھول کر ناند پر باندھ آیا اور اندر آ کر بھائی سے بولا ''تمہارے لیے چلم رکھلاؤں؟''

آج پہلی بار سوہن نے بڑے بھائی کی جانب ایسے حسن عقیدت کا اظہار کیا اس میں کیا راز ہے یہ موہن کی سمجھ میں نہ آیا برادرانہ خلوص سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا بولا آگ ہو تو رکھلاؤ۔

مینا سر کے بال کھولے آنگن میں گھروندا بنا رہی تھی۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے گھروندا بگاڑ دیا اور آنچل سے سر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی رسوئی گھر کی طرف برتن اٹھانے چلی موہن کے غصے سے سب ہی ڈرتے تھے۔

موہن نے پیار سے پوچھا ''کیا کھیل رہی تھی مینا؟''

مینا تھر تھر کانپتی ہوئی بولی ''کچھ نہیں''

''تو تو بہت اچھے گھروندے بنا لیتی ہے ذرا بنا تو دیکھوں''

موہن کے مزاج میں آج یہ پر لطف انقلاب دیکھ کر مینا کو یکا یک یقین نہ آیا

لیکن پھر بھی اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا پیار کے ایک لفظ میں کتنا جادو ہے منہ سے نکلتے ہی جیسے ایک دلکشی سی پھیل گئی جس نے سنا اس کی دل کھل اٹھا جہاں خوف اور بد گمانی تھی وہاں اعتبار اور خلوص چمک اٹھا۔ جہاں بیگانگی تھی وہاں اپنا پن چھلک پڑا چاروں طرف انہماک چھا گیا۔ کہیں بے دلی نہیں کہیں بے نیازی نہیں لوگوں کی ترقیاں ہوتی ہیں خطاب ملتے ہیں مقدمات میں فتح ہوتی ہے لیکن ان چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے واقعات میں جو شیرنی ہے وہ ان اوکھ اور گنے کے کھیتوں میں کہاں موہن کے سینے میں آج محبت کا سوتا سا کھل گیا تھا۔ اس میں مسرت ہمدردی اور خلوص کی دھاریں نکل رہی تھیں۔

مینا گھروندا بنانے بیٹھ گئی۔

موہن نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا کر کہا ''تیری گڑیا کا بیاہ کب ہو گا؟ جلد نیوتا دے کچھ مٹھائی کھانے کو ملے''

مینا آسمان میں اڑ رہی تھی بیا کتنے اچھے ہیں اب بھیا پانی مانگیں گے تو وہ لوٹے کو راکھ سے خوب چما چم کر کے پانی لے جائے گی۔

''اماں پیسے نہیں دیتیں گڈا تو ٹھیک ہو گیا ہے لیکن ٹیکا کیسے بھیجوں؟''

''کتنے پیسے لگیں گے؟''

''ایک پیسے کے بتاشے لوں گی اور ایک پیسہ کا گلابی رنگ، جوڑے تو رنگے جائیں گے کہ نہیں۔''

''تو دو پیسے میں تمہاری گڑیا کا بیاہ ہو جائے گا کیوں؟''

''ہاں تم دو پیسے دے دو تو میری گڑیا کا دھوم دھام سے بیاہ ہو جائے''

موہن نے دو پیسے ہاتھ میں لے کر مینا کو دکھائے مینا لپکی موہن نے ہاتھ اوپر اٹھایا مینا نے ہاتھ پکڑ کر نیچے کھینچنا شروع کیا جب یوں نہ پا سکی تو موہن کی گود میں چڑھ گئی اور پیسے لے لیے پھر نیچے آ کر ناچنے لگی تب اپنی سہیلیوں کو شادی کا نوید سنانے دوڑی۔

اس وقت بوٹی گوبر کا جھوا لیے سارکے گھر سے نکلی موہن کو کھڑے دیکھ کر تند لہجے میں بولی ''ابھی تک مٹر گشت ہی ہو رہے بھینس کب دوہی جائیں گی؟''

آج موہن نے بوٹی کو سخت جواب نہ دیا ماں کو بوجھ سے دبے ہوئے دیکھ کر اس نے اضطراری طور پر اس کے سر سے جھوا لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

بوٹی نے کہا ''رہنے دے جا کر بھینسیں دوہ لے گوبر تو میں لیے جاتی ہوں''

''تم اتنا بھاری بوجھ کیوں اٹھا لیتی ہو ماں مجھے کیوں نہیں بلا لیتی؟''

ماں کا دل مامتا سے رقیق ہو گیا

''تو جا اپنا کام دیکھ میرے پیچھے کیوں پڑتا ہے؟''

گوبر نکالنے کا کام میرا ہے

''دودھ کون دوہے گا؟''

''وہ بھی میں کر لوں گا''

''تو اتنا کہاں کا جودھا ہے کہ سارے کام کر لے گا''

''جتنا کہتا ہوں اتنا کر لوں گا''

''تو میں کیا کروں گی؟''

''تم لڑکوں سے کام لو جو بے راہ چلے اسے سمجھاؤ جو غلطی دیکھو اسے ٹھیک کرو

بس یہی تمہارا کام ہے۔''

''میری سنتا کون ہے؟''

آج موہن بازار سے دودھ پہنچا کر لوٹا تو ایک چھوٹا سا پاندان، پان کتھا، چھالیہ اورتھوڑی سی مٹھائی لایا۔ بوٹی بگڑ کر بولی '' آج روپے کہیں فالتو مل گئے تھے کیا اس طرح تو پیسے اڑائے گا تو کیسے دن نباہ ہوگا؟''

''میں نے تو ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہیں کیا اماں میں سمجھتا تھا تم پان کھاتی ہی نہیں اسی لیے نہ لاتا تھا''

''تو اب میں پان کھانے بیٹھوں گی؟''

''کیوں اس میں ہرج کیا ہے؟ جس کے دو دو جوان بیٹے ہوں کیا وہ اتنا شوق بھی نہ کرے۔''

بوٹی کے خزاں رسیدہ دل میں کہیں سے ہریالی نکل آئی، ایک ننھی سی کوئل تھی لیکن اس کے اندر کتنی طراوت، کتنی رطوبت، کتنی جاں بخشی بھری ہوئی تھی جیسے اس کے چہرے کی جھریاں چکنی ہوگئیں آنکھوں میں نور آ گیا دل مایوس میں ایک ترنم سا ہونے لگا اس نے ایک مٹھائی سوہن کو دی ایک مینا کو اور ایک موہن کو دینے لگی موہن نے کہا۔

''مٹھائی تو میں لڑکوں کے لیے لایا تھا، اماں''

''اور تو بوڑھا ہو گیا کیوں؟''

''ان لڑکوں کے سامنے تو بوڑھا ہی ہوں''

موہن نے مٹھائی لے لی مینا نے مٹھائی کے پاتے ہی گپ منہ میں ڈال لی تھی

اور وہ زبان پر مٹھاس کی لذت کب کی معدہ میں جا چکی تھی موہن کی مٹھائی کو للچائی آنکھوں سے دیکھنے لگی موہن نے وہ مٹھائی بینا کو دے دی ایک مٹھائی اور بچ رہی تھی بوٹی نے اسے موہن کی طرف بڑھا کر کہا۔

''لا یا بھی تو ذرا سی مٹھائی''

موہن نے کہا ''وہ تم کھا جانا اماں''

''تمہیں کھاتے دیکھ کر مجھے خوشی وہ گی اس میں مٹھاس سے زیادہ مزہ ہے''

موہن نے مٹھائی کھا لی اور باہر چلا گیا بوٹی پاندان کھول کر دیکھنے لگی آج زندگی میں پہلی بار اسے یہ خوشی نصیب ہوئی ہے۔ زہے نصیب کہ شوہر کے راج میں جو نعمت میسر نہ ہوئی وہ بیٹے کے راج میں ملی، پاندان میں کئی کلیاں ہیں، اس میں چونا رہے گا اس میں کتھا اس میں چھالیہ اس میں تمباکو واہ یہاں تو دو چھوٹی چھوٹی چمچیاں بھی ہیں مزے سے چونا کتھا لگا لو۔ انگلی میں داغ تک نہ لگے ڈھکنے میں کڑا لگا ہوا ہے جہاں چاہو لٹکا کر لیے چلے جاؤ اوپر کی طشتری میں پان رکھے جائیں گے مگر سروتے کے لیے جگہ نہیں ہے نہ سہی۔ اس نے پاندان کو مانجھ دھو کر اس میں چونا کتھا رکھا چھالیہ کاٹ کر رکھی پان بھگو کر طشتری میں رکھے تب ایک بیڑا لگا کر کھایا اس کے عرق نے جیسے اس کی بیوی کی کرختگی کو ملائم کر دیا۔ دل کی مسرت عنایت و کرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اب بوٹی کیسے بیٹھ رہے اس کا دل اتنا گہرا نہیں ہے کہ یہ دلی قسمت اس میں گم ہو جائے گھر میں ایک پرانا آئینہ پڑا ہوا تھا بوٹی نے اس میں اپنا منہ دیکھا ہونٹوں پر سرخی نہیں ہے منہ لال کرنے کے لیے اس نے تھوڑا ہی پان کھایا ہے سرخی ہوتی تو وہ کلی کر لیتی گاؤں کی ایک عورت دھنیا

نے آ کر کہا ''کاکی جوا، رسی دے دو، رسی ٹوٹ گئی ہے''

کل بوٹی نے صاف کہہ دیا تھا میری رسی گاؤں کے لیے ہی نہیں میری رسی ٹوٹ گئی ہے تو بنوا کیوں نہیں لیتی۔ لیکن آج اس نے اس کی رسی سے کام نہیں لیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے رسی نکال کر دھنیا کو دے دی اور ہمدردانہ انداز سے پوچھا لڑکے کے دست بند ہو گئے یا نہیں دھنیا؟

دھنیا نے کہا ''نہیں آج تو دن بھر دست آئے، ہر وقت آ رہے ہیں''

''پانی بھر لے تو چل ذرا دیکھوں دانت ہی ہے کہ کوئی اور فساد ہے کسی کی نجر وجر تو نہیں لگی؟''

''کیا جانوں کاکی کون جانے کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوں''

''چونچال لڑکوں کا نجر کا بڑا ڈر رہتا ہے جس نے چمکار کر بلایا اسی کی گود میں چلا جاتا ہے۔''

''کاکی ایسا ہمدوں کی طرح ہنستا تھا کہ تم سے کیا کہوں''

''کبھی کبھی ماں کی نجر لگ جاتی ہے بچے کو''

''اے نوج، کاکی بھلا کوئی اپنے بچے کو نجر لگائے گا؟''

''یہی تو تو سمجھتی نہیں نجر کوئی لگاتا نہیں آپ ہی آپ لگ جاتی ہے''

دھنیا پانی لے کر آئی تو بوٹی اس کے ساتھ بچے کو دیکھنے چلی

''تو اکیلی ہے آج کل تو گھر کے کام دھندے میں بڑا اپھجتا ہوگا؟''

''نہیں کاکی روپا آجاتی ہے اس سے بڑی مدد ملتی ہے نہیں تو میں اکیلی کیا کرتی؟''

بوٹی کو تعجب ہوا روپا کو اس نے محض تتلی سمجھ رکھا تھا جس کا کام پھولوں پر بیٹھنا اور پھر اڑ جانا تھا حیرت انگیز لہجہ میں بولی ''روپا''

''ہاں کا کی بے چاری بڑی بھلی ہے جھاڑو لگا لیتی ہے چوکا برتن کر دیتی ہے لڑکے کو سنبھالتی ہے گاڑھے سے کون کسی کی بات پوچھتا ہے کا کی؟''

''اسے تو اپنے مسی کاجل سے ہی چھٹی نہ ملتی ہوگی''

''یہ تو اپنی اپنی رج ہے کا کی مجھے تو مسی کاجل والی نے جتنا سہارا دیا اسے ہی پوجا پاٹ کرنے والی نے نہ دیا۔ کل بے چاری رات بھر جاگتی رہی میں نے اسے کچھ دے تو نہیں دیا ہاں جب تک جیوؤں گی اس کا گن گاؤں گی۔''

''تو اس کے گن ابھی تک نہیں جانتی دھنیا پان کے پیسے کہاں سے آتے ہیں رنگین ساڑھیاں کون لاتا ہے کچھ سمجھتی ہے؟''

''میں تو ان باتوں میں نہیں پڑتی کا کی پھر شوق سنگار کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا کھاؤ پہننے کی یہی عمر ہے''

دنیا کا گھر آیا آنگن میں روپا بچے کو گود میں لیے تھپکیاں دے رہی تھی بچہ سو گیا تھا دھنیا نے بچہ کو اس سے لے کر کھٹولے پر سلا دیا۔ بوٹی نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا پیٹ میں آہستہ آہستہ انگلی گڑو کر دیکھا ناف پر ہینگ کا لیپ کرنے کی تاکید کی روپا پنکھا لا کر اسے جھلنے لگی۔

بوٹی نے کہا ''لا پنکھا مجھے دے دے''

''میں جھلوں گی تو کیا چھوٹی ہو جاؤں گی؟''

''تو دن بھر یہاں کام دھندا کرتی رہتی ہے تھک گئی ہوگی''

''تم اتنی بھلی مانس ہو اور یہاں لوگ کہتے ہیں بغیر گالی کے کسی سے بات نہیں کرتی''

''اس لیے تمہارے پاس آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی''

بوٹی مسکرائی ''لوگ جھوٹ تو نہیں کہتے''

''اپنی آنکھوں کی دیکھی مانوں یا کانوں کی سنی'' آج بھی روپا آنکھوں میں کاجل لگائے پان کھائے رنگین ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ مگر آج بوٹی کو معلوم ہوا کہ پھول میں محض رنگ نہیں بو بھی ہے اسے روپا سے جو ایک طرح کا للٰہی بغض تھا وہ آئینہ پر جمے ہوئے گرد کی طرح صاف ہو گیا تھا کتنی نیک سیرت، کتنی سگھڑ اور شرمیلی لڑکی ہے آواز کتنی پیاری ہے آج کل کی لڑکیاں اپنے بچوں کی تو پروا نہیں کرتیں دوسرے کے لیے کون مرتا ہے ساری رات دھنیا کے بچے کو لیے جاگتی رہی۔ موہن نے کل کی باتیں اس سے کہہ تو دی ہوں گی دوسری لڑکی ہوتی تو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اسے تو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں ممکن ہے موہن نے اس سے کچھ کہا ہی نہ ہو ضرور یہی بات ہے۔

آج روپا اسے بہت حسین معلوم ہوئی ٹھیک تو ہے ابھی شوق سنگار نہ کرے گی تو کب کرے گی شوق سنگار اس لیے برا لگتا ہے کہ ایسے آدمی اپنے ہی عیش و آرام میں مست رہتے ہیں کسی کے گھر میں آگ لگ جائے۔ ان سے مطلب نہیں ان کا کام تو صرف دوسروں کو رجھانا ہے۔ جیسے اپنے روپ کو بجھائے راہ چلتوں کو بلاتے ہوئے کہ ذرا اس دکان کی سیر بھی کرتے جایئے۔ ایسے نیک دل آدمیوں کا سنگار برا نہیں لگتا۔ بلکہ اور اچھا لگتا ہے کون نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے رنگ روپ کی

تعریف کریں کون دوسروں کی نظر میں کھپ جانا نہیں چاہتا بوٹی کا شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا پھر بھی یہ تمنا اس کے دل میں موجود تھی زمین پر پاؤں نہیں پڑتے پھر روپا تو ابھی جوان ہے۔

روپا اب قریب قریب روز دو ایک بار بوٹی کے گھر آتی بوٹی نے موہن سے تقاضا کر کے اس کے لیے اچھی ساڑھی منگوا دی۔ اگر روپا بغیر کاجل لگائے یا محض سفید ساڑھی میں آ جاتی تو بوٹی کہتی "بہو بیٹیوں کو یہ جوگیا بھیس اچھا نہیں لگتا یہ بھیس تو ہم بوڑھیوں کے لیے ہے"

روپا کہتی "تم بوڑھی کس طرح ہو گئیں اماں مردوں کو اشارہ مل جائے تو بھوروں کی طرح منڈلانے لگیں میرے دادا تو تمہارے دروازے پر دھرنا دینے لگیں"

بوٹی لطف آمیز ملامت کے ساتھ کہتی "چل میں تیری ماں کی سوت بن کر جاؤں گی"

"اماں تو بوڑھی ہو گئیں"

"تو کیا تیرے دادا جوان بیٹھے ہیں؟"

"ہاں اماں بڑی اچھی کاٹھی ہے ان کی"

آج موہن بازار سے دودھ بیچ کر لوٹا تو بوٹی نے کہا "کچھ روپے پیسے کی فکر کر بھائی میں روپا کی ماں سے روپا کے لیے تیری بات چیت پکی کر رہی ہوں۔"

اختتام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حصہ چہارم

فہرست

ریاست کا دیوان	03
دودھ کی قیمت	27
مفت کرم داشتن	38
قہر خدا کا	47
انصاف کی پولیس	62
بڑے بھائی صاحب	80
وفا کی دیوی	91
قاتل	112
سوانگ	129
لعنت	145
کفن	167
دو بہنیں	179
مس پدما	198
حقیقت	217
ہولی کی چھٹی	229
زادِ راہ	250
قاتل کی ماں	280
غم نداری بز بخر	291
روشنی	307
شانتی	319

www.IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved
©2002-2006

ریاست کا دیوان

پہلی بار: ہندی میں اسی عنوان سے "ہنس" مئی 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1938ء (دودھ کی قیمت)

مسٹر مہتہ ان بدنصیبوں میں سے تھے جو اپنے آقا کو خوش نہیں رکھ سکتے وہ دل سے اپنا کام کرتے تھے بڑی یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ اور یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کام کے تو نوکر ہیں ہی اپنے آقا کے نوکر بھی ہیں۔ جب ان کے دوسرے بھائی دربار میں بیٹھے خوش گپیاں کرتے وہ دفتر میں بیٹھے کاغذوں سے سر مارتے اور اس کا نتیجہ تھا کہ جو آقا پرور تھے ان کی ترقیاں ہوتی تھیں۔ انعام و اکرام پاتے تھے اور یہ حضرت جو فرض پرور تھے راندہ درگاہ سمجھے جاتے تھے اور کسی نہ کسی الزام میں نکال لیے جاتے تھے زندگی میں تلخ تجربے انہیں کئی بار ہوئے تھے۔ اس لیے جب اب کی راجہ صاحب ستیا نے اپنے ہاں ایک معزز عہدہ دے دیا تو انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ اب میں بھی آقا کا رخ دیکھ کر کام کروں گا اور ان کی مزاج داری کو اپنا شعار بناؤں گا لگن کے ساتھ کام کرنے کا پھل پا چکا۔ اب ایسی غلطی نہ کروں گا دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ راجہ صاحب نے انہیں اپنا دیوان بنا لیا۔ ایک مختار ریاست کی دیوانی کا کیا کہنا تنخواہ تو بہت کم تھی مگر اختیارات غیر محدود، راجہ صاحب اپنے سیر و شکار اور عیش و نشاط میں مصروف رہتے تھے ساری ذمہ داری مسٹر مہتہ پر تھی۔ ریاست کے حکام ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے روسا نذرانے دیتے تجار

سجدے بجالاتے یہاں تک کہ رانیاں بھی ان کی خوشامد کرتی تھیں راجہ صاحب بھی بدمزاج آدمی تھے۔ اور بدزبان بھی کبھی کبھی سخت سست کہہ بیٹھتے مگر مہتہ نے اپنا وطیرہ بنالیا تھا کہ صفائی یا عذر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتے سب کچھ سر جھکا کر سن لیتے راجہ صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا۔

گرمیوں کے دن تھے پولیٹکل ایجنٹ کا دورہ تھا ریاست میں ان کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے مسٹر مہتہ کو بلا کر کہا ''میں چاہتا ہوں کہ صاحب بہادر یہاں سے میرا کلمہ پڑھتے ہوئے جائیں'' مہتہ نے سر اٹھا کر کہا'' کوشش تو ایسی ہی کر رہا ہوں ان داتا''

''میں کوشش نہیں چاہتا جس میں ناکامی کا پہلو بھی شامل ہے قطعی وعدہ چاہتا ہوں''

''ایسا ہی ہوگا''

''روپیہ کی پرواہ مت کیجئے''

''جو حکم''

''کسی کی فریاد یا شکایت پر کان نہ دیجئے''

''جو حکم''

''ریاست میں جو چیز ہے وہ ریاست کی ہے آپ اس کا بے دریغ استعمال کر سکتے ہیں''

''جو حکم''

ادھر تو پولیٹکل ایجنٹ کی آمد تھی ادھر مسٹر مہتہ کا لڑکا جے کرشن گرمیوں کی تعطیل

میں گھر آیا الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا ایک بار 1932ء میں کوئی تقریر کرنے کے جرم میں چھ مہینے جیل ہو آیا تھا اور تب سے کسی قدر خودسر ہو گیا تھا۔مسٹر مہتہ کے تقرر کے بعد جب ریاست میں وہ پہلی بار آیا تھا تو راجہ صاحب نے بڑی بے تکلفی سے باتیں کی تھیں اسے اپنے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے گئے تھے۔اور روزانہ اس کے ساتھ کھیلتے تھے جے کرشن راجہ صاحب کے قوم پرورانہ خیالات سے متاثر ہوا تھا۔اسے معلوم ہوا تھا کہ راجہ صاحب سچے محبِ وطن ہی نہیں انقلاب کے حامیوں میں سے ہیں روس اور فرانس کے انقلاب پر دونوں میں خوب مباحثے ہوئے لیکن اب کی یہاں اس نے کچھ اور ہی رنگ دیکھا علاقہ کے ہر ایک کاشتکار اور زمیندار سے اس تقریب کے لیے جبراً چندہ وصول کیا جا رہا ہے۔رقم کا تعین دیوان صاحب کرتے وصول کرنا پولیس کا کام تھا فریاد اور احتجاج کی مطلق سنوائی نہ ہوتی تھی ہزاروں مزدور سرکاری عمارتوں کی صفائی سجاوٹ اور سڑکوں کی مرمت میں بے گار تھے بنیوں سے رسد جمع کی جا رہی تھی ساری ریاست میں واویلا مچا ہوا تھا جے کرشن کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے راجہ صاحب کے مزاج میں اتنا تغیر کیسے ہو گیا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ راجہ صاحب کو ان زبردستیوں کی خبر نہ ہو اور انہوں نے جن تیاریوں کا حکم دیا ہو اس کی تعمیل میں کارپرواڑیوں کی جانب سے اس سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہو رات بھر تو اس نے ضبط کیا اور دوسرے دن صبح ہی اس نے دیوان صاحب سے پوچھا آپ نے راجہ صاحب کو ان زیادتیوں کی اطلاع نہیں دی؟

مسٹر مہتہ رعایا پرور آدمی تھے انہیں خود ان بے عنوانیوں سے کوفت ہو رہی تھی

مگر حالات سے مجبور تھے بے کسانہ انداز سے بولے ''راجہ صاحب کا یہی حکم ہے تو کیا کیا جائے؟''

''اب تو آپ کو ایسی حالت میں کنارہ کش ہو جانا چاہیے تھا آپ جانتے ہیں یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری آپ کے اوپر عائد ہو رہی ہے رعایا آپ ہی کو مجرم سمجھتی ہے''

''میں مجبور ہوں میں نے اہلکاروں سے بار بار کنایتہً کہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی نہ کی جائے لیکن ہر ایک موقع پر میں موجود تو نہیں رہ سکتا اگر زیادہ مداخلت کروں تو شاید اہلکار میری شکایت راجہ صاحب سے کردیں اہلکار ایسے ہی موقعوں کے منتظر رہتے ہیں انہیں تو عوام کو لوٹنے کا کوئی بہانہ چاہیے جتنا سرکاری خزانہ میں داخل کرتے ہو اس سے زیادہ اپنے گھر میں رکھتے ہیں میں کچھ نہیں کر سکتا''

جے کرشن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ''تو آپ استعفے کیوں نہیں دے دیتے''

مسٹر مہتہ ہمدردانہ لہجہ میں بولے ''بے شک میرے لیے مناسب تو یہی تھا لیکن زندگی میں اتنے دھکے کھا چکا ہوں کہ اب برداشت کی طاقت نہیں رہی میں نے طے کر لیا ہے کہ ملازمت میں ضمیر کو بے داغ نہیں رکھ سکتا نیک و بد فرض اور ایمانداری کے جھمیلوں میں پڑ کر میں نے بہت سے تلخ تجربات حاصل کیے میں نے دیکھا کہ دنیا، دنیاداروں کے لیے ہے جو موقع و محل دیکھ کر کام کرتے ہیں اصول پرستوں کے لیے دنیا مناسب جگہ نہیں ہے''

''جگے کرشن نے پوچھا'' میں راجہ صاحب کے پاس جاؤں؟

مہتہ نے اس سوال کا جواب نہ دے کر پوچھا ”کیا تمہارا خیال ہے راجہ صاحب کا ان واقعات کا علم نہیں ہے؟“

”کم سے کم ان پر حقیقت تو روشن ہو جائے گی“

”مجھے خوف ہے تمہارے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکل جائے جو مہاراج کی ناراضگی کا باعث ہو“

جے کرشن نے انہیں یقین دلایا کہ اس کی جانب سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو گی مگر اسے کیا خبر تھی کہ آج کے مہاراج صاحب وہ نہیں ہیں جو آج سے ایک سال قبل تھے ممکن ہے پولیٹکل ایجنٹ کے رخصت ہو جانے کے بعد ہو جائیں۔ ان کے لیے آزادی اور انقلاب کی گفتگو بھی اسی طرح تفریح کا باعث تھی جیسے قتل اور ڈاکہ کی وارداتیں یا بازار حسن کی دل آویز خبریں اس لیے جب اس نے مہاراج کی خدمت میں اطلاع کرائی تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت اس وقت ناساز ہے لیکن وہ لوٹ ہی رہا تھا کہ مہاراج کو خیال آیا شاید اس سے فلمی دنیا کی تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں اسے بلا لیا اور مسکرا کر بولے ”تم خوب آئے بھئی کہو تم نے ایم سی سی کا میچ دیکھا نہیں میں تو ان پریشانیوں میں کچھ گرفتار ہوا کہ ہل نہ سکا اب تو یہی دعا کر رہا ہوں کہ کسی طرح ایجنٹ صاحب خوش خوش رخصت ہو جائیں میں نے جو تقریر تیار کروائی ہے وہ ذرا تم بھی دیکھ لو میں نے ان قومی تحریکوں کی خوب خبر لی اور بریجن تحریک کے بھی چھینٹے اڑا دیئے ہیں۔“

جے کرشن نے اعتراض کیا لیکن بریجن تحریک سے سرکار کو بھی اتفاق ہے اسی لیے اس نے مہاتما جی کو رہا کر دیا اور جیل میں بھی انہیں اس تحریک کے متعلق لکھنے

پڑھنے کی کامل آزادی دے رکھی ہے۔

راجہ صاحب نے عازماً تبسم کے ساتھ کہا ''تم ان رموز سے واقف نہیں ہو یہ بھی سرکار کی ایک مصلحت ہے دل میں گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ بالآخر یہ تحریک بھی قوم میں ہیجان پیدا کرے گی اور ایسی تحریکوں سے فطرتاً کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ سرکار اس کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ الٹی میں جتنی سرگرمی کا اظہار کرو، چاہے وہ حماقت کے درجہ تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے سرکار کبھی برا نہ مانے گی اسی طرح جیسے شعراء کی مبالغہ آمیز مداح سرائیاں ہماری خوشی کا باعث ہوتی ہیں چاہے ان میں تضحیک کا پہلو کیوں نہ ہم ایسے شاعر سمجھیں احمق بھی سمجھ سکتے ہیں مگر ان سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ وہ جتنا بھی مبالغہ کرے اتنا ہی ہمارے قریب آجاتا ہے۔''

راجہ صاحب نے اپنے خطبہ کی ایک خوبصورت کاپی میز کی دراز سے نکال کر جے کرشن کے ہاتھ میں رکھ دی مگر جے کرشن کے لیے اب اس تقریر میں کوئی دلچسپی نہ تھی اگر وہ موقع شناس ہوتا تو ظاہر داری کے لیے ہی اس تقریر کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اس عبارت آرائیوں کی داد دیتا اس کا موازنہ مہاراجہ صاحب بیکانیر یا پٹیالہ کی تقریروں سے کرتا مگر ابھی وہ ان کوچوں سے نا آشنا تھا جس چیز کو برا سمجھتا تھا اسے برا کہتا تھا جس چیز کو اچھا سے اچھا برے کو اچھا اور اچھے کو برا کہنا ابھی اسے نہ آیا تھا۔ اس نے تقریر پر سرسری نگاہ ڈالی اور میز پر رکھ دیا اور اپنی آزادی کا بگل بجاتے ہوئے بولا۔

''میں ان عقدوں کو کیا سمجھوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ حکام کے نبض شناس

ہوتے ہیں اور تصنع سے مطلق متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے انسان ان کی نظروں میں اور بھی گر جاتا ہے اگر پولیٹکل ایجنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خیر مقدم کے لیے رعایا پر کتنے ظلم کیے جا رہے ہیں تو شاید یہاں سے خوش ہو کر نہ جائے گا پھر ایجنٹ کی خوشنودی آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے رعایا کو اس سے نقصان ہی ہو گا"

راجہ صاحب دیگر فرماراؤں کی طرح اپنے سے زیادہ طاقتوروں کے سامنے تو انکسار کے پتلے تھے لیکن کمزوروں کی جانب سے نکتہ چینی انہیں مطلق برداشت نہ تھی ان کے غصے کی ابتدائی صورت جرح ہوتی تھی پھر استدلال کا درجہ آتا تھا جو فوراً تردید کی صورت اختیار کر لیتا تھا اس کے بعد وہ زلزلہ کی حرکتوں میں نمودار ہوتا سرخ ترچھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا نقصان ہو گا؟ ذرا سنوں"

جے کرشن سمجھ گیا کہ غصہ کی مشین گن گردش میں آ گئی سنبھل کر بولا

"اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں"

"نہیں میں اتنا زود فہم نہیں ہوں"

"آپ برا مان جائیں گے"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بارود کا ڈھیر ہوں"

"بہتر ہو اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ کریں"

"تمہیں بتلانا پڑے گا اور اضطرابی طور پر ان کی مٹھیاں بندھ گئیں فوراً اسی وقت"

بے کرشن پر رعب کیوں طاری ہونے لگا بولا ''آپ ابھی پولیٹکل ایجنٹ سے ڈرتے ہیں جب وہ آپ کا ممنون ہو جائے گا تب آپ مطلق العنان ہو جائیں گے اور رعایا کی فریاد سننے والا کوئی نہ رہے گا۔''

راجہ صاحب شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے ''میں ایجنٹ کا غلام نہیں ہوں کہ اس سے ڈروں بالکل کوئی وجہ نہیں ہے میں ایجنٹ کی محض اس لیے خاطر کرتا ہوں کہ وہ شہنشاہ کا قائم مقام ہے میرے اور شہنشاہ کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں محض آئین سلطنت کی پابندی کر رہا ہوں میں ولایت جاؤں تو اسی طرح ہر میجسٹی بھی میری تواضع و تکریم کریں گے میں ڈروں کیوں میں اپنی ریاست کا خود مختار راجہ ہوں جسے چاہوں پھانسی دے سکتا ہوں میں کسی سے کیوں ڈرنے لگا ڈرنا بزدلوں کا کام ہے میں خدا سے بھی نہیں ڈرتا ڈر کیا چیز ہے یہ میں آج تک نہ جان سکا میں تمہاری طرح کالج کا غیر ذمہ دار طالب علم نہیں ہوں کہ انقلاب اور آزادی کی صدا لگاتا پھروں حالاں کہ تم نے ان چیزوں کا محض ابھی نام سنا ہے اس کے خونی مناظر آنکھوں سے نہیں دیکھے تم خوش ہو گے اگر میں ایجنٹ سے پنجہ آزمائی کروں میں اتنا احمق نہیں ہوں اندھا نہیں ہوں رعایا کی حالت کا مجھے تم سے کہیں زیادہ علم ہے میں شادی و غم میں ان کا شریک اور ہمدرد رہا ہوں ان سے جو محبت مجھے ہو سکتی ہے وہ تمہیں کبھی نہیں ہو سکتی تم میری رعایا کو انقلاب کے خواب دکھا کر گمراہ نہیں کر سکتے تم میری ریاست میں فساد اور شورش کے بیج نہیں بو سکتے تمہیں اپنی زبان پر خاموشی کی مہر لگانی ہو گی۔''

آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنیں محرام کے رنگین شیشوں سے

گرز کر راجہ کے چہرہ کو اور غضبناک بنا رہی تھیں ان کے بال نیلے ہو گئے تھے آنکھیں زرد تھیں چہرہ سرخ اور جسم سبز ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ دوسری دنیا کی ہیبت ناک مخلوق ہے جے کرشن کی ساری انقلاب پسندی غائب ہوگئی راجہ صاحب کو اتنے طیش میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا مردانہ وقار اس للکار کا جواب دینے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا جیسے علم کا جواب علم ہے ویسے ہی غصہ ہے جب وہ رعب، خوف، لحاظ اور ادب کی بندشوں کو توڑ کر بدمست ہو کر نکلتا ہے پھر چاہے وہ اس بدمستی میں سرنگوں ہی کیوں نہ ہو جائے اس نے بھی راجہ صاحب کو مجروح نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''میں اپنی آنکھوں سے یہ ظلم وستم دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا''

راجہ صاحب نے دانت پیس کر کہا ''تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے''

''ہر ذی ہوش انسان کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے آپ مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتے۔''

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں میں تمہیں ابھی جیل میں بند کر سکتا ہوں''

''آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا میں آپ کی رعایا نہیں ہوں''

اسی وقت مسٹر مہتہ نے ایک وحشت کے عالم میں کمرے میں قدم رکھا اور جے کرشن کی طرف قہر کی آنکھوں سے دیکھ کر بولے ''کرشنا نکل جا یہاں سے نا خلف تجھے خبر ہے تو کس سے زبان درازی کر رہا ہے ابھی میری نظروں سے دور ہو جا احسان فراموش کہیں کے جس تھال میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے دیوانہ اگر اب زبان کھولی تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔''

جے کرشن ایک لمحہ تک غضبناک چہرے کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا اور تب فاتحانہ غرور سے اکڑتا ہوا دیوان خانہ سے نکل گیا۔

راجہ صاحب نے کوچ پر لیٹ کر کہا ''چغدار آدمی ہے انتہا درجہ کا چغد میں نہیں چاہتا کہ ایسا خطرناک آدمی میری ریاست میں ایک لمحہ بھی رہے تم اس سے جا کر کہہ دو کہ اسی وقت یہاں سے نکل جائے ورنہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا میں خود سر کی گوشمالی کرنا جانتا ہوں میں محض آپ کی مروت سے اتنا تحمل کر گیا ورنہ اسی وقت اس کی فتنہ انگیزیوں کا خاتمہ کر سکتا تھا آپ کو اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا یہاں رہنا ہے کہ نہیں اگر رہنا ہے منظور ہے تو طلوع سحر سے قبل اسے میرے قلم رو سے باہر نکل جانا چاہیے ورنہ آپ حراست میں ہوں گے اور آپ کا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔''

مسٹر مہتہ نے خطاوارانہ انداز سے کہا ''آج ہی ارشاد کی تعمیل کروں گا''

راجہ صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا ''آج نہیں اسی وقت''

مہتہ نے ذلت کو نگل کر جواب دیا ''اسی وقت نکال دوں گا''

راجہ صاحب بولے ''اچھی بات ہے تشریف لے جایئے اور آدھ گھنٹہ کے اندر مجھے اطلاع دیجیے'' مسٹر مہتہ گھر چلے تو انہیں جے کرشن پر بے انتہا طیش آرہا تھا حمق چلا ہے آزادی کا راگ الاپنے اب بچہ کو معلوم ہوگا یہ راجے کس آب و گل کے بنے ہوتے ہیں میں اس کے پیچھے دنیا میں رسوا و ذلیل نہیں ہو سکتا وہ خود اپنے فعل کا خمیازہ اٹھائے یہ بے عنوانیاں مجھے بری لگتی ہیں جس کسی بات کا علاج میرے امکان میں نہیں تو اسی ایک معاملہ کے پیچھے کیوں اپنی زندگی خراب کر دوں۔

گھر میں قدم رکھتے ہی انہوں نے کرخت لہجہ میں پکارا ''جے کرشن''

جے کرشن ابھی تک گھر نہ آیا تھا سجاتا نے کہا ''وہ تو تم سے پہلے ہی راجہ صاحب سے ملنے گیا تھا تب سے کب آیا بیٹھا گپ شپ کر رہا ہوگا''

اسی وقت ایک سپاہی نے ایک رقعہ لا کران کے ہاتھ پر رکھ دیا مہتہ نے پڑھا

اس ذلت کے بعد میں اس ریاست میں ایک لمحہ بھی گوارا نہیں کرسکتا میں جانتا ہوں آپ کو اپنا عہدہ اور اعزاز اپنے ضمیر سے زیادہ عزیز ہے آپ شوق سے رہیں میں پھر اس ریاست میں قدم نہ رکھوں گا اماں جی سے میرا پرنام کہیے گا۔

مسٹر مہتہ نے پرزہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مایوسانہ انداز سے بولے اس لونڈے کو نہ جانے کب عقل آئے گی جا کر مہاراجہ صاحب سے الجھ پڑا وہ تو یہ کہو میں پہنچ گے اور نہ راجہ اسی وقت اسے حراست میں لے لیتے یہ خود مختار راجے ہیں انہیں کسی کا خوف نہیں انگریزی سرکار بھی تو انہیں کی سنتی ہے مگر بہت اچھا ہوا بچہ کو سبق مل گیا اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے میں یہ تماشہ بہت دیکھ چکا اور ان خرافات کے پیچھے اپنی زندگی نہیں برباد کرنا چاہتا۔

اسی وقت وہ راجہ صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دینے چلے۔

ایک لمحہ میں ساری ریاست میں یہ خبر مشہور ہوگئی جے کرشن اپنی غریب دوستی کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا لوگ بازاروں میں اور چورستوں پر کھڑے ہو کر اس واقعہ پر رائے زنی کرنے لگے اجی وہ آدمی نہیں تھا بھائی میرے کسی دیوتا کا اوتار سمجھو اسے مہاراجہ صاحب سے جا کر بولا ابھی بیگار بند کیجئے ورنہ شہر میں آفت آ

جائے گی راجہ صاحب کی تو اس کے سامنے زبان بند ہو گئی صاحب بغلیں جھانکنے لگے شیر ہے شیر، اور وہ بیگار بند کرا کے رہتا راجہ صاحب کو بھاگنے کی راہ نہ ملی سنا ہے گھگھیا نے لگے تھے مگر اسی بیچ میں دیوان صاحب نے جا کر اس کے دیس نکالے کا حکم دے دیا یہ سن کر آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن باپ کی بے عزتی کیسے کرتا۔

''ایسے باپ کو تو گولی مار دینی چاہیے یہ باپ ہے یا دشمن''

''وہ کچھ بھی ہے ہے تو باپ ہی''

جے کرشن کی ماں کا نام سجاتا تھا بیٹے کی جلاوطنی اس کے جگر میں برچھیاں چبھونے لگی ابھی تو جی کھول کر اس سے باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی سوچا تھا اس سال بیاہ رچائیں گے چنی منی بہو گھر میں آئے گی ادھر یہ بجلی پڑی نہ جانے بے چارہ کہاں گیا رات کو کہاں سوئے گا اس کے پاس روپے بھی تو نہیں ہیں غریب پاؤں پاؤں بھاگتا چلا جاتا تھا دل میں ایسا طوفان اٹھا کہ گھر اور شہر چھوڑ چھاڑ کر ریاست سے نکل جائے انہیں اپنا عہدہ پیارا ہے لے کر رہیں وہ اپنے لخت جگر کے ساتھ فاقے کرے گی اسے آنکھوں سے دیکھتی رہے گی لیکن وہ جا کر فریاد کرے گی انہیں بھی ایشور نے بچے دیے ہیں۔ ماں کا درد بھی ماں ہی سمجھ سکتی ہے اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مہارانی کے قدم بوس ہو چکی تھی فوراً سواری منگوائی اور مہارانی کے پاس جا پہنچی۔

مہارانی کے تیور آج بدلے ہوئے تھے منہ لٹکا ہوا تھا۔ راجہ صاحب کے اقلیم دل پر طوفان کا راج نہ تھا مگر وہ ولی عہد کی ماں تھیں اور یہ غرور انہیں مہاراجہ سے بے نیاز رکھنے کے لیے کافی تھا بولیں بہن تمہارا لڑکا بڑا بد زبان ہے ذرا بھی ادب

نہیں کس سے کس طرح بات کرنی چاہیے اس کا اسے ذرا سلیقہ بھی نہیں مہاراج نے پہلی بار ذرا اسے منہ لگایا تو اب کی سر چڑھ گیا کہنے لگا بیگار بند کر دیجئے اور ایجنٹ صاحب کے استقبال اور مہمانداری کی کوئی تیاری نہ کیجئے اتنی سمجھ اسے نہیں ہے کہ اس طرح ہیکڑی جتا کر ہم کے گھنٹے گدی پر رہ سکتے ہیں پھر یہ خیال بھی تو ہونا چاہیے کہ ایجنٹ کا رتبہ کیا ہے ایجنٹ بادشاہ سلامت کا قائم مقام ہے اس کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے یہ بیگار آخر کس کام آئیں گے اسی موقع کے لیے ریاست سے ان کو جاگیریں مقرر ہیں رعایا میں ایسی بغاوت پھیلانا کوئی بھلے آدمی کا کام ہے جس تھال میں کھاؤ اسی میں سوراخ کرو مہاراجہ صاحب نے دیوان صاحب کا لحاظ کیا ورنہ اسی وقت اسے حراست میں ڈال دیتے وہ اب کوئی بچہ نہیں ہے خاصا جوان ہے سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہے سوچو! حاکموں سے بیر کریں تو کے دن نباہ ہوگا اس کا کیا بگڑتا ہے سو پچاس کی نوکری پا ہی جائے گا۔ یہاں تو ریاست تباہ ہو جائے گی۔

سجاتا نے آنچل پھیلا کر کہا'' مہارانی بجا فرماتی ہیں مگر اب تو اس کی خطا معاف کیجئے بے چارہ شرم اور خوف سے گھر نہیں گیا نہ جانے کدھر نکل گیا ہماری زندگی کا یہی ایک سہارا ہے مہارانی ہم دونوں رو رو کے مر جائیں گے آنچل پھیلا کر آپ سے بھیک مانگتی ہوں اس کی خطا معاف کیجئے ماں کے درد کو آپ سے زیادہ کون سمجھے گا آپ ہی میرے رنج کا اندازہ کرسکتی ہیں آپ مہاراج سے سفارش کر دیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔''

مہارانی نے بات کاٹ کر کہا'' کیا کہتی ہو سجاتا دیوی مہاراج سے اس کی

سفارش کروں آستین میں سانپ پالوں تم کس منہ سے ایسی درخواست کرتی ہو اور مہاراج مجھے کیا کہیں گے میں تو ایسے لڑکے کا منہ نہ دیکھتی اور تم ایسے کپوت بیٹے کی سفارش کے لیے آئی ہو۔''

''ایک بدنصیب ماں کیا مہارانی کے دربار سے مایوس ہو کر جائے گی؟''

یہ کہتے کہتے سجاتا کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں مہارانی کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا مگر وہ مہاراجہ کے مزاج سے واقف تھیں اس وقت وہ کوئی سفارش نہ سنیں گے اس لیے مہارانی کوئی وعدہ کر کے شرمندگی کی ذلت نہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

''میں کچھ نہیں کر سکتی سجاتا دیوی''

''سفارش کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتیں''

''میں مجبور ہوں''

سجاتا آنکھوں میں غصہ لا کر بولی ''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مظلوموں کے لیے فریاد کی کوئی جگہ نہیں ہے''

مہارانی کو رحم دیر میں آتا تھا۔ غصہ ناک پر رہتا تھا گرم ہو کر بولیں ''اگر تم نے سوچا تھا کہ میں تمہارے آنسو پونچھوں گی تو تم نے غلطی کی تھی جو قاتل ہماری جان لینے پر آمادہ ہو اس کی سفارش لے کے آنا اس کے علاوہ اور کیا کہنا ہے کہ تم اس جرم کو خفیف سمجھتی ہو اگر تم نے اس کی ہمت کا اندازہ کیا ہوتا تو ہرگز میرے پاس نہ آتیں جس نے ریاست کا نمک کھایا ہے وہ ریاست کے ایک بدخواہ سے ہمدردی کرے یہ خود بہت بڑا جرم ہے''

سجاتا بھی گرم ہوئی جذبہ مادری مصلحت پر غالب آ گئی راجہ کا کام محض اپنے

حکام کو خوش کرنا نہیں رعایا پوری کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہے یہ اس کا مقدم فرض ہے۔

اسی وقت مہاراج نے کمرے میں قدم رکھا رانی نے اٹھ کران کی تعظیم کی سجاتا گھونگھٹ نکال کر سر جھکائے دم بخود کھڑی رہ گئی کہیں مہاراجہ صاحب نے تو اس کی بات نہیں سن لی۔

راجہ نے کہا ''یہ کون عورت تمہیں راجوں کے فرائض کی تعلیم دے رہی تھی؟''

رانی نے کہا ''یہ دیوان صاحب کی بیوی ہیں''

راجہ نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا ''جب اماں ایسی زبان دراز ہے تو لڑکا کیوں نہ گستاخ اور باغی ہو دیوی جی میں تم سے یہ تعلیم نہیں لینا چاہتا بہتر ہو کر تم کسی سے یہ تعلیم حاصل کرلو کہ آقا کی جانب اس کے نمک خواروں کے کیا فرائض ہیں اور جو نمک حرام ہے ان کے سامنے اسے کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔''

راجہ صاحب طیش کے عالم میں باہر چلے گئے مسٹر مہتہ جا ہی رہے تھے کہ راجہ صاحب نے تند لہجہ میں پکارا ''سنیے مسٹر مہتہ آپ کے صاحبزادے تو رخصت ہو گئے لیکن مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ غداری کے میدان میں آپ کی دیوی جی ان سے بھی دو قدم آگے ہیں بلکہ میں تو محض کہوں گا کہ وہ ریکارڈ ہے جس میں دیوی کی آواز بول رہی ہے میں نہیں چاہتا کہ جو شخص ریاست کی ذمہ داریوں کا مرکز ہے اس کے سایہ میں ریاست کے ایسے بدخواہوں کو پناہ ملے آپ خود اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے یہ ہرگز بے انصافی نہ ہوگی اگر میں یہ خیال کرلوں کہ آپ کی چشم پوشی نے ہی یہ حالات پیدا کیے ہیں میں یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں

کہ آپ نے صریحاً نہیں تو کنایتاً ضرور ان خیالات کی تحریک کی ہے۔''

مسٹر مہتہ اپنی ذمہ داری اور آقا پروری پر یہ حملہ برداشت نہ کر سکے فوراً مردانہ تردید کی یہ میں کس زبان سے کہوں کہ اس معاملہ میں حضور بے انصافی کر رہے ہیں لیکن میں بے قصور ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر ملال ہوتا ہے کہ میری وفاداری پر یوں شبہہ کیا جاوے۔

مہاراج نے تحکمانہ لہجہ میں کہا ''اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے دیوان صاحب''

''کیا ابھی ثبوت کی ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے میں ثبوت دے چکا''

''نہیں نئے انکشافات کے لیے نئے ثبوت کی ضرورت ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی دیوی جی کو ہمیشہ کے لیے ریاست سے رخصت کر دیں میں اس میں کسی طرح کا عذر نہیں سننا چاہتا۔''

''لیکن مہاراج''

''میں ایک حرف نہیں سننا چاہتا''

''میں کچھ عرض نہیں کر سکتا؟''

''ایک لفظ بھی نہیں''

مسٹر مہتہ یہاں سے چلے تو انہیں سجاتا پر بے حد غصہ آ رہا تھا ان سب کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خبط سا گیا ہے جے کرشن تو خیر لڑکا ہے آزمودہ کار اس بڑھیا کو کیا حماقت سوجھی نہ جانے رانی سے کیا کیا کہہ آئی میرے ہی گھر میں کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں سب اپنی اپنی دھن میں مست ہیں کس مصیبت سے میں اپنی

زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کتنی پریشانیوں اور ناکامیوں کے بعد ذرا اطمینان سے سانس لینے پایا تھا کہ ان سب نے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی حق اور انصاف کا ٹھیکہ کیا ہم نے لے لیا ہے یہاں بھی وہی ہے جو ساری دنیا میں غریب اور کمزور ہونا جرم ہے اس کی سزا سے کوئی نہیں بچ سکتا باز کبوتر پر کبھی رحم نہیں کرتا حق اور انصاف کی حمایت انسان کی شرافت کا جزو ہے بے شک اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن جس طرح اور سب لوگ صرف زبان سے اس کی حمایت کرتے میں کیا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اور جن لوگوں کی حمایت کی جائے ان کی نگاہ میں کچھ اس حمایت کی قدر بھی تو ہو آج راجہ انہیں مظلوم مزدوروں سے ذرا ہنس کر باتیں کر لیں تو یہ لوگ ساری شکایتیں بھول جائیں اور ہماری ہی گردن کشی پر آمادہ ہو جائیں گے سجاتا کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں ضرور اس نے مہارانی صاحبہ سے بد زبانی کی ہو گی خوب اپنے دل کا غبار نکالا ہو گا یہ نہ سمجھیں کہ دنیا میں کس طرح عزت اور آبرو کے ساتھ بیٹھا جائے اس کے سوا اور ہمیں کیا چاہیے۔ اگر تقدیر میں نیک نامی لکھی ہوتی تو اس طرح دوسروں کی غلامی کیوں کرتا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو بھیجوں کہاں؟ میکے میں کوئی نہیں ہے میرے گھر میں کوئی نہیں اونہہ اب میں اس کی کہاں تک فکر کروں جہاں جی چاہے جائے۔

وہ اس غم و غصہ کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے سجاتا ابھی ابھی آئی تھی کہ مہتہ نے پہنچ کر دل شکن انداز سے کہا آخر تمہیں بھی وہی حماقت سوجھی جو اس لونڈے کو سوجھی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ آخر تم لوگ کو عقل کبھی ــــــــ آئے گی یا نہیں ساری دنیا کی اصلاح کا بیڑا ہم ہی نے اٹھالیا ہے؟ کون راجہ ہے جو اپنی

رعایا پر ظلم نہ کرتا ہو؟ ان کے حقوق نہ پامال کرتا ہو راجہ ہی کیوں؟ ہم تم دوسروں کے حقوق پر دست اندازی کر رہے ہیں تمہیں کیا حق ہے کہ تم درجنوں خدمت گار رکھو اور انہیں ذرا ذرا سے قصور پر سزائیں دو حق اور انصاف مہمل لفظ ہیں جن مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں گو چند عقل مندوں کو شہادت کا درجہ ملے اور بہت سے احمقوں کو ذلت و رسوائی کا تم اپنے ساتھ دمائے دیتی ہو حالانکہ میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں مہاراجہ سے پرخاش نہ کروں گا۔ حق کی حمایت کر کے دیکھ لیا پشیمانی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا میں صاف کہتا ہوں کہ میں تمہاری حماقتوں کا خمیازہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

سجاتا نے خودداری کی شان سے کہا ''میں یہاں سے چلی جاؤں یہی تو تمہارا منشا ہے میں بڑی خوشی سے جانے کے لیے تیار ہوں میں ایسے ظالم کی عملداری میں پانی پینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔''

''اس کے سوا مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آئی میں پوشیدہ طور پر تمہارے اخراجات کے لیے روپیہ بھیجتا رہوں گا''

''نہیں مجھے تمہارے روپوں کی ضرورت نہیں ہے تم اپنے روپے جمع کرنا اور بینک کا اکاؤنٹ دیکھ دیکھ کر خوش ہونا کون جانے کہیں راز فاش ہو جائے تو آقائے نامدار کا قہر تمہارے اوپر نازل ہو جائے میرا لڑکا اور کچھ نہ کر سکے گا تو شام تک نمک روٹی لے ہی آئے گا میں اسی میں خوش ہوں گی میں بھی دیکھوں گی کہ تمہاری آقا پروری کب تک نبھتی ہے اور تم کہاں تک اپنے ضمیر کا خون کرتے ہو۔''

مہتہ نے ہاتھ مل کر کہا

''تم کیا چاہتی ہو کہ پھر اسی طرح چاروں طرف ٹھوکریں کھاتا پھروں؟''

سجاتا نے طنز کے ساتھ کہا ''ہرگز نہیں اب تک میرا خیال تھا کہ عہدے اور روپے سے عزیز تر بھی تمہارے پاس کوئی چیز ہے جس کے لیے تم ٹھوکریں کھانا اچھا سمجھتے ہو اب معلوم ہوا تمہیں عہدہ اور مروت اپنے ضمیر سے بھی زیادہ عزیز ہے پھر کیوں ٹھوکریں کھاؤ کبھی کبھی اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہنا یا اس کے لیے بھی راجہ صاحب کی اجازت لینی پڑے گی۔''

مہتہ نے آقا پروری کے جوش میں کہا ''راجہ صاحب اتنے ظالم نہیں ہیں کہ میرے جائز حق میں دست اندازی کریں''

''اچھا راجہ صاحب میں اتنی انسانیت ہے مجھے تو اعتبار نہیں آتا''

''تم نے کہا جانے کا ارادہ کیا ہے''

''جہنم میں''

جس وقت سجاتا گھر سے رخصت ہونے لگی تو میاں بیوی دونوں خوب روئے اور ایک طرح سے سجاتا نے اپنی غلطی تسلیم کر لی کہ واقعی اس بے کاری کے زمانہ میں مہتہ کا یہی طرز عمل مناسب تھا سچ مچ بے چارے کہاں کہاں مارے مارے پھریں۔

اس طرح شوہر سے علیحدہ ہونے سے اسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا اور اگر مہتہ نے جھوٹوں اصرار کر لیا ہوتا تو وہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتی مگر ادھر راجہ صاحب پل پل بھر بعد دریافت کر رہے تھے کہ دیوی جی گئیں یا نہیں؟ اور اب قدم پیچھے ہٹانے کے لیے کوئی بہانہ نہ تھا۔

پولیٹکل ایجنٹ صاحب تشریف لائے خوب دعوتیں کھائیں خوب شکار کھیلے اور خوب سیریں کیں مہاراجہ نے ان کی تعریف کی انہوں نے مہاراجہ صاحب کی تعریف کی اور ان کے انصاف اور رعایا پروری اور تنظیم کی خوب دل کھول کر داد دی مسٹر مہتہ کی کارگزاری نے بھی تحسین کا خراج وصول کیا ایسا وفا شعار اور کارگزار افسر اس ریاست میں کبھی نہیں آیا تھا ایجنٹ صاحب نے ایک گھڑی انہیں انعام میں دی۔

اب راجہ صاحب کو کم از کم تین سال کے لیے فراغت تھی ایجنٹ ان سے خوش تھا اب کس بات کا غم اور کس کا خوف عیاشی کا دور دورہ انہماک کے ساتھ شروع ہوا۔نت نئے حسینوں کی بہم رسانی کے لیے خفیہ خبر رسانی کا ایک محکمہ قائم کیا گیا اور اسے زنانہ تعلیم کا نام دیا گیا۔نئی نئی چڑیاں آنے لگیں کہیں تخویف کام کرتی تھی کہیں تحریص اور کہیں تالیف لیکن ایسا موقع بھی آیا جب اس تثلیف کی ساری انفرادی اور اجتماعی کوششیں ناکام ہوئیں اور خفیہ محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس نازنین کو اس کے گھر سے بہ جبر اٹھالایا جائے اور اس خدمت کے لیے مہتہ صاحب کا انتخاب ہوا جس سے زیادہ جاں نثار خادم ریاست میں دوسرا نہ تھا ان کی جانب سے مہاراجہ صاحب کو کامل اطمینان تھا کم تر درجہ کے اہلکار ممکن ہے رشوت لے کر شکار چھوڑ دیں۔۔۔۔۔یا افشا راز کر بیٹھیں یا امانت میں خیانت ،مسٹر مہتہ کی جانب سے کسی قسم کی بے عنوانی کا اندیشہ نہ تھا رات کو نو بجے چوبدار نے ان کو اطلاع دی۔

''ان داتا نے یاد کیا ہے''

مہتہ صاحب جب ڈیوڑھی پر پہنچے تو راجہ صاحب باغیچے میں چہل قدمی کر رہے

تھے مہتہ کو دیکھتے ہی بولے

’’آیئے مسٹر مہتہ آپ سے اس اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ آپ کا مجسمہ اس باغ کے وسط میں نصب کیا جائے جس سے آپ کی یادگار ہمیشہ قائم رہے آپ کو غالباً اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا‘‘

مہتہ نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا ’’یہ ان داتا کی غلام نوازی ہے میں تو ایک ذرہ ناچیز ہوں۔‘‘

’’میں نے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ اس کے لیے فنڈ جمع کریں ایجنٹ صاحب نے اب کی جو خط لکھا ہے اس میں آپ کو خاص طور سے لکھا ہے‘‘

’’یہ ان کی غریب پروری ہے، میں تو ادنیٰ خادم ہوں‘‘

راجہ صاحب ایک لمحہ تک سگار پیتے رہے تب اس انداز سے بولے گویا کوئی بھولی بات یاد آ گئی۔

’’تحصیل خاص میں ایک موضع جگن پور ہے آپ وہاں کبھی گئے ہیں؟‘‘

مہتہ نے مستعدی سے جواب دیا ’’ہاں ان داتا ایک بار گیا ہوں وہاں ساتھ شروع ہوا نت نئے حسینوں کی بہم رسانی کے لیے خفیہ خبر رسانی کا ایک محکمہ‘‘

ہاں ظاہر میں تو بہت اچھا آدمی ہے مگر دل کا نہایت خبیث آپ کو معلوم ہے مہارانی صاحبہ کی صحت بہت خراب ہوتی جاتی ہے اور اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں دوسری شادی کرلوں راجاؤں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے روز نئی نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں میں نے اس ہوس پروری سے ہمیشہ اعتراض کیا ہے اور اب تک بڑی تندہی سے رانی صاحبہ کا علاج کراتا رہا لیکن

ان کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور اب میں مجبور ہو گیا ہوں ایک لڑکی بھی تجویز کی ہے جو ہر اعتبار سے رانی صاحبہ بننے کے قابل ہے وہ اسی ساہوکار کی لڑکی ہے میں ایک بار ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے اسے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا مجھے معاً خیال آیا کہ اگر یہ حسینہ رنواس میں آ جائے تو میری عمر دراز ہو جائے۔ میں نے خاندان کے آدمیوں سے اس بارے میں صلاح کی اور اس ساہوکار کے پاس پیغام بھیج دیا مگر اسے مفسدوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتا کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے مجھے یہاں تک معلوم ہوا ہے یہ اس کی بہانہ سازی ہے لیکن بالفرض اس کی شادی بھی ہو چکی ہو تو راجہ ہونے کی حیثیت سے میرا حق ناتک ہے اور پھر میں ہر قسم کا تاوان بھی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ مفسد برابر انکار کیے جاتا ہے۔ مجھے اس لڑکی کا ہر وقت خیال رہتا ہے مجھے ایسا اندیشہ وہ رہا ہے کہ اگر ناکام رہا تو شاید جاں بر نہ ہو سکوں اندیشہ ہی نہیں یہ اس قسم کا یقینی امر ہے آپ کو بھی شاید اس قسم کا بھی تجربہ ہوا ہو نہیں یہ سمجھیے کہ خواب حرام ہے ہمیشہ اسی کی یاد میں محو رہتا ہے اور ایسی حالت میں مجھے آپ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آیا جو اس مسئلہ کو حل کر سکے آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے میں چاہتا ہوں آپ تھوڑے سے معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں اور اس حسینہ کو راضی کر کے لائیں خوشی سے آئے خوشی سے جبر سے آئے جبر سے اس کی پروا نہیں میں ریاست کا مالک ہوں اس میں جس چیز پر میری نظر ہو اس پر کسی دوسرے شخص کا قانونی یا اخلاقی حق نہیں ہو سکتا بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے اور

آپ کی خوش تدبیری سے میری زندگی بچ گئی تو آپ ہمیشہ ریاست کے محسنوں میں شمار کیے جائیں گے اور۔۔۔۔۔۔

مسٹر مہتہ کے مدت سے منجمد خون میں یکا یک ابال آیا بولے ''آپ کا منشا ہے میں اسے کڈ نیپ کرلاؤں؟''

راجہ صاحب نے ان کے تیور دیکھ کر تبسم کے ساتھ کہا ''ہرگز نہیں میں تو آپ کو اپنا معتمد سفیر بنا کر بھیجتا ہوں حصول مقصد کے لیے آپ کو ہر ممکن تدبیر سے کام لینے کا اختیار ہے۔''

مسٹر مہتہ کا چہرہ سرخ ہو گیا ''مجھ سے یہ کمینہ فعل نہیں ہو سکتا''

''کسی حسینہ سے شادی کی درخواست کمینہ فعل ہے؟''

''جبری اغوا بے شک کمینہ فعل ہے''

''آپ اپنی ہوش میں ہیں؟''

''خوب اچھی طرح''

''میں آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں''

''اگر آپ مجھے خاک میں ملا سکتے ہیں تو میں بھی آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں''

''میری نیکیوں کا یہی صلہ ہے نمک حرام۔۔۔۔''

''آپ اب احترام کی حد سے آگے بڑھتے جاتے ہیں راجہ صاحب میں نے اب تک ضمیر کا خون کیا ہے اور آپ کے ہر ایک جا اور بے جا حکم کی تعمیل کی ہے لیکن ضمیر فروشی کی بھی حد ہوتی ہے جس کے آگے کوئی بھی ذی ہوش آدمی نہیں جا سکتا

آپ کا فعل ایک راجہ کے شایان شان نہیں ہے اور اس میں جو شخص اعانت کرے وہ قابل گردن زنی ہے اور میں ایسے فعل پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر آئے اور راتوں رات سامان سفر درست کر کے ریاست سے نکل گئے مگر اس سے قبل اس معاملہ کا کچا چٹھا ایجنٹ کے نام بھیج دیا۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

دودھ کی قیمت

پہلی بار ہندی میں ’’دودھ کا دام‘‘ کے عنوان سے ’’ہنس‘‘ جولائی 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں سبھی نظر آتی ہیں لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچہ خانہ روش قدیم کی طرح بھنگنوں کے ہی دائرہ اقتدار میں ہے اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے تعلیم یافتہ بھی تھے زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کے چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ہمت ہی کیونکر ہوسکتی ان حق الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نسبت ملکیت بیع ہونے پر بھی پورا ہوتا آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گودڑ کی بہو، بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گودڑ گودڑ کی ہانک لگائی چماروں کی ٹولی جاگ اٹھی۔

گودڑ کے گھر میں اس روز سعید کی مہینوں سے تیاری تھی خدشہ تھا یوں یہی کہ کہیں بیٹی ہو جائے نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا روپیہ اور وہی ایک ساڑھی مل کر رہ جائے گی اس مسئلہ میاں بیوی میں بار بار تبادلہ خیالات ہو چکا تھا شرطیں لگ چکی

تھیں گودڑ کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہوا تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں، ہاں، منہ نہ دکھاؤں اور گودڑ کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گیا اور بیچ کھیت بیٹی پیدا ہو گی۔ بیٹا پیدا ہو گا تو مونچھیں منڈ والوں گا شاید گودڑ سمجھتا تھا کہ اس طرح بھنگن میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لیے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگن بولی اب منڈ والے مونچھیں ڈاڑھی جا کہتی تھی بیٹا ہو گا پر سنتے ہی نہیں اپنی رٹ لگائے کھد تیری مونچھیں مونڈوں گی کھونٹ تو رکھوں نہیں۔

گودڑ نے کہا ''اچھا مونڈ لینا بھلی مانس، مونچھیں پھر نکلیں ہی نہیں تیسرے دن پھر دیکھے جوں کی توں ہیں مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا، رکھ لوں گا کہے دیتا ہوں''

بھنگن نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گودڑ کے سپرد کر سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گودڑ نے پکارا ''اری سن تو کہاں بھاگی جاتی ہے مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا۔''

بھنگن نے دور سے ہی کہا ''تو کون بڑی مشکل ہے وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا میں آ کر دودھ پلا دیا کروں گی''

مہین ناتھ کے یہاں اب کے بھنگن کی خوب خاطر کی گئی صبح کو حریرہ ملتا، دوپہر کو پوریاں اور حلوا، تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر اور گودڑ کو بھی بھر پور پر سا ملتا تھا بھنگن اپنے بچے کو دن بھر میں دو بار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی اس کے لیے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگن کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا اور یہ سلسلہ بارھویں دن بھی بند نہ ہوا مالکن موٹی تازی عورت تھی مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق کہ دودھ ہی

نہیں تینوں لڑکیوں کی بار اتنے افراط سے دودھ ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی اب کی ایک بوند نہیں بھنگن جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا "بھنگن ہمارے بچے کو پال دے پھر جب تک جیے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوا دوں گی تیرے پوتے تک کھائیں گے"

اور بھنگن کالاڈلا اوپر کا دودھ ہضم نہ کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا بھنگن کہتی "اور مونڈن میں جوڑے لوں گی بہو جی کہے دیتی ہوں بہو جی"

"ہاں ہاں جوڑے لینا بھائی دھمکاتی کیوں ہے چاندی کے لے گی یا سونے کے"

"واہ بہو جی واہ چاندی کے جوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی"

"اچھا سونے کے لینا بھئی کہتی تو ہوں"

"اور بیاہ میں کنٹھا لوں گی اور چودھری (گوڑ کے لیے ہاتھوں کے توڑے" بہو جی") وہ بھی لینا وہ دن تو بھگوان دکھائیں"

گھر میں مالکن کے بعد بھنگن کی حکومت تھی مہریاں مہراجن، مزدورنیں سب اس کا رعب مانتی تھیں یہاں تک کہ خود بہو جی اس سے دب جاتی تھیں ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا ہنس کر ٹال گئے بات چلی تھی بھنگیوں کی مہیش ناتھ نے کہا تھا دنیا میں اور چاہے کچھ ہو جائے بھنگی بھنگی رہیں گے انہیں آدمی بنانا مشکل ہے۔

اس پر بھنگن نے کہا تھا" مالک بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں انہیں

کون، کوئی آدمی بنائے گا۔"

یہ گستاخی کر کے دوسرے موقع پر بھلا بھنگن سلامت رہتی سر کے بال اکھاڑ لیے جاتے لیکن آج بابو صاحب ہنسے اور قہقہہ مار کر بولے

"بھنگن بات بڑے پتے کی کہتی ہے"

بھنگن کی حکومت سال بھر تک قائم رہی پھر چھن گئی بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے پھٹکار بتائی پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا اب پرائشچت کرنا چاہیے واہ۔

شاستری جی بولے "بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا گوشت کھا کر پلا یہ بھی کہہ سکتے ہو لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے جگن ناتھ پور میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے، کھچڑی تک کھا لیتے ہیں بابو جی اور کیا کہیں پوری تک نہیں رہ جاتے لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ"

"اور کیا راجہ کا دھرم الگ، پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ، غریب کا دھرم الگ، راجا مہاراجے جو چاہیں کھائیں جس کے ساتھ چاہیں کھائیں جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں ان کے لیے کوئی قید نہیں، راجہ ہیں مگر ہمارے اور تمہارے لیے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں اس کا دھرم ہے پرائشچت تو نہ ہوا لیکن بھنگن سے اس کی سلطنت چھین لی گئی برتن کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ

وہ اکیلی نہ لے جاسکی اور سونے کے جوڑے بھی ملے۔اور ایک دوئی اور خوبصورت ساڑھیاں معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔''

اسی سال چیچک کا زور ہوا گودڑ پہلے ہی زد میں آ گیا بھنگن اکیلی ہی رہ گئی مگر کام جوں کا توں چلتا رہا بھنگن کے لیے گودڑ اتنا ضروری نہ تھا جتنا گودڑ کے لیے بھنگن، لوگ منتظر تھے کہ بھنگن اب گئی اب گئی فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی، فلاں چودھر آئے لیکن بھنگن کہیں نہ گئی یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے اور منگل دبلا، کمزور اور دائم المرض رہنے پر دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا دائم المرض کیوں نہ ہوتا۔

ایک دن بھنگن مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی مہینوں سے غلاظت جمع ہوگئی تھی آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا پرنالے میں ایک لمبا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکایک اس نے چلا کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا۔لیکن بھنگن کو نہ بچا سکے خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے زیادہ زہریلا نہ ہوگا اس لیے پہلے کچھ غفلت کی گئی جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا گھر میں اتنا جوٹھا بچتا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور رہتے تھے یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی سب لوگ اچھے اچھے برتنوں

میں کھاتے ہیں اس کے لیے مٹی کے سکورے یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے کہ اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی جاڑا گرمی برسات ہر موسم کے لیے وہ ایک ہی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی اور سخت جان منگل جھلتی ہوئی لو اور کڑاکے کے جاڑے اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا اور تندرست تھا بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتا جو اپنے ہم چشموں کو بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے تنگ آ کر منگل کے زیر سایہ آ پڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے، منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگریزی کتے کا نام تھا اس لیے اس کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

ذرا اور کھسک کر سوؤ، آخر میں کہاں لیٹوں سارا ٹاٹ کو تم نے گھیر لیا ٹامی کوں کوں کرتا اور دم ہلاتا بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا پہلے سال پھوس کا چھپر گرا دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی دیواریں کھڑی تھیں جس کا اوپر کا حصہ نوک دار ہو گیا تھا یہیں اسے محبت کی دولت ملی تھی وہی مزا وہی یاد وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گزشتہ خواب دیکھنے لگتا اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا سریش کو اس پر رحم آیا یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی کچھ ہی ہوا اس نے تجویز کی کہ آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا کیوں رے کھیلے گا؟

منگل بولا ''کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا؟''

سریش نے کہا ''اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں اور تم ٹٹو بن جاؤ ہم لوگ تمہارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے''

منگل نے پوچھا ''میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا''

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا، سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا ''تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں''

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا ''میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا۔''

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا ''تجھے گھوڑا بننا پڑے گا اس نے منگل کو پکڑنا چاہا منگل بھاگا سریش بھی دوڑا منگل نے قدم اور تیز کیا سریش نے بھی زور لگایا مگر سیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا آخر سریش نے رک کر کہا'' آکر گھوڑا بنو ورنہ کبھی پاؤں گا تو بری طرح پیٹوں گا۔

''تمہیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا''

''اچھا ہم بھی بن جائیں گے''

''تم بعد میں بھاگ جاؤ گے اس لیے پہلے تم بن جاؤ میں سواری کر لوں پھر میں بنوں گا۔''

سریش نے چکمہ دیا منگل نے اس کے مطلب کو برہم کر دیا ساتھیوں سے بولا ''دیکھو اس کی بد معاشی، بھنگی ہے'' تینوں نے اب کے منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک کر کے بولا ''چل گھوڑے چل'' مگر اس کے بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لیے ہلنا بھی مشکل تھا دوڑنا تو دور کی بات تھی ایک لمحہ تو وہ ضبط کیے چوپایہ بنا کھڑا رہا لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا سریش گدے گر پڑے اور بھونپو بجانے لگے ماں نے سنا سریش کیوں رو رہا ہے گاؤں میں کہیں سریش روئے ان کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز جاتی تھی اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے ماں چپ کرانے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی آپ تھے تو آٹھ سال کے مگر بہت بے وقوف حد سے زیادہ پیارے ماں نے پوچھا کیوں رو رہا ہے سریش؟ کس نے مارا؟ سریش نے روتے ہوئے کہا ''منگل نے چھو دیا''

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا، اس نے منگل کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولی، کیوں رے منگلو اب تجھے بدمعاشی

سوجھنے لگی میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں یاد ہے کہ نہیں بول، منگل نے دبی آواز سے کہا ''یاد ہے''

''تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا؟ ۔۔۔۔۔۔تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟''

''یہ گر پڑے اس لیے رونے لگے''

''چوری اور سینہ زوری'' دیوی دانت پیس کر رہ گئیں ماریں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا قمچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رو قمچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی اس لیے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ اسی وقت یہاں سے نکل جا پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون پی جاؤں گی مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا چپکے سے اپنے سکورے اٹھائے ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا یہی تو ہوگا کہ بھوکوں مر جاؤں گا کیا ہرج ہے اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا گاؤں میں اور کہاں جاتا بھنگی کو کون پناہ دیتا وہی اپنے بے درو دیوار کی آڑتھی جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں وہیں جا کر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آپہنچا۔

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی اس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا گیا۔بچپن کی بے تاب کرنے والی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اٹھ جاتیں اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا کھاؤ گے

کیا؟ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا ٹامی نے کوں کوں کر کے شاید کہا اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی سہی ہیں پھر ذرا دیر میں دم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا ہماری زندگی اسی لیے ہے بھائی۔

منگل بولا تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھا لو میری پروا نہ کرو ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا اکیلا نہیں جاتا تمہیں ساتھ لے چلوں گا ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا مالکن تلاش کر رہی ہوں گی کیوں ٹامی اور کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے کہار نے ان کی تھالی کا جوٹھا نکال لیا ہو گا اور ہمیں پکار رہا ہو گا۔۔۔بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور میٹھی میٹھی چیزیں ہاں ملائی ہماری آواز نہ سنائی دے گی تو سب کا سب گھورے پر ڈال دیں گے ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں پوچھنے آتا ہے یہاں کون پوچھنے آئے گا کوئی برہمن ہو۔

''اچھا تو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا یہ سمجھ لو۔''

دونوں وہاں سے نکلے اور آ کر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے ٹامی شاید ادھر ادھر کی خبر لانے چلا گیا، مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے، نوکر آپس میں بات چیت کر رہے تھے ایک نے کہا ''آج منگلو نہیں دکھائی دیتا بھوکا ہو گا بے چارہ، مالکن نے ڈانٹا تھا اسی لیے بھاگا تھا شاید''منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے دوسرے نے جواب دیا اچھا ہوا نکالا گیا نہیں تو سبیرے سبیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا'' منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا اب کیا امید کی جا سکتی تھی مہیش اور سریش تھالی سے اٹھ گئے نوکر ہاتھ منہ

دھلا رہا ہے اب بابو جی حقہ پئیں گے سریش سوئے گا غریب منگل کی کسے فکر ہے اتنی دیر ہوگئی کسی نے نہیں پکارا کون پکارے گا منگل آدھ گھنٹے تک وہاں دبکا رہا کسی نے اس کا نام نہ لیا اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جوٹھا کھانا لے جاتے دیکھا شاید گھوڑے پر ڈالنے جا رہا تھا منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا اب صبر نہ ہوسکتا تھا کہار نے کہا ارے تو یہاں تھا ہم نے کہا کہیں چلا گیا لے کھا لے میں پھینکنے لے جا رہا تھا'' منگل نے کہا میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا کہار نے کہا تو بولا کیوں نہیں'' منگل بولا'' ڈر لگتا تھا منگل نے کہار کے ہاتھ سے تھالی لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسان مندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا'' دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے؟'' ٹامی نے دم ہلائی سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی۔

ٹامی نے پھر دم ہلا دی لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا ٹامی نے پھر دم ہلا دی'' اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے'' ٹامی نے پھر دم ہلا دی۔

☆☆☆☆☆

مفت کرم داشتن

پہلی بار: ہندی میں ''مفت کا یش'' کے عنوان سے ''ہنس'' اگست 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، فروری، 1938ء (واردات)

ان دنوں حسن اتفاق سے حاکم ضلع ایک صاحب ذوق بزرگ تھے جنہوں نے تاریخ اور قدیم سکہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انہیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مداح تھا لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکام جوئی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا میں تو حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں بھی مدعو کرنے کا مخالف ہوں اور جب کبھی سنتا ہوں کسی افسر کو کسی رفاہ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفاخانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادران وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں مگر جب ایک دن حاکم ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے بنگلے میں تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، کیا جواب دوں؟ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا انہوں نے کہا صاف کہہ دیجئے مجھے فرصت نہیں، وہ حاکم ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے، کوئی سرکاری یا

ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے اس سے کیا ان کی شان میں بٹہ لگا جاتا تھا، اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکم ضلع ہیں ان احمق ہندوستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے انہیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں ہندوستانی افسروں کے کئی پر مذاق تذکرے سنائے ''ایک افسر صاحب سسرال گئے شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا جیسا عام رواج ہے خسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کہا کہا: ''بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے تین مہینے بھی نہیں ہوئے بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا ''ابھی میں جانا نہیں چاہتی آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے کچھ تمہارے ہاتھ بک تھوڑی ہی گئی ہوں'' میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے جامے سے باہر ہو گئے خسر پر سمن جاری کر دیا بے چارا بڈھا آدمی دوسرے دن صاحب زادی کو لے کر داماد کی خدمت میں حاضر ہوئے تب جا کے اس کی جان بچی یہ لوگ ایسے خر دماغ ہوتے ہیں، اور پھر تمہیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے تو فوراً گرفتار ہو جاؤ گے مطلق رعایت نہ کی جائے گی اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی، نائب تحصیل داری کی فکر تمہیں ہے نہیں پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار بیرا ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا ایک

شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے تنگ ظرفی ہے بے شک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا، لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے انگلینڈ یا امریکہ میں افسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیر اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے لیکن یہ ہندوستان ہے، جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا اور اب بھی تاجپوشی کے موقع پر ہمارے اہل قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ قصیدہ پیش کرتے ہیں انعام پاتے ہیں تو تم ایسے کہاں کے ہو کہ حاکم ضلع تمہارے گھر پر چلا آئے وہ افسر ہے تم مضمون نگار ہو جب تم میں اس قدر لڑکپن اور تنگ مزاجی ہے تو پھر وہ تو ضلع کا بادشاہ ہے اگر اسے غرور بھی ہو تو جائز ہے کمزوری کہو، جہالت کہو خر دماغی کہو، لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افیسر صاحب تمہارے گھر نہیں آئے، ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمہارے یہاں کہاں تھا؟ گت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے، تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو ہے توفیق روپے کی دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے اس کا کیا نام ہے اس کی خبر ہے تمہیں؟ اپنی تقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے تمہیں بلا لیا چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی خدانخواستہ اور تمہاری شامت اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی ان کی مہمان نوازی تم یا تمہاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمہارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمہارے لیے موت کا سامان ہوتا تم اپنے گھر میں

پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن کوئی بھی خوددار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایہ تفریح ہو ان لیڈی صاحبہ کے سامنے تو تمہاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجودیکہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا کم سے کم انہوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے انہوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی میں نے اس واقعہ کا ذرا اہمیت نہ دی گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے نہ جانے کیسے اس کی خبر لگا لی خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں مبالغے نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اہل غرض باولے ہوتے ہیں، تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں انہیں اس کا یقین دلانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب براری ہو سکتی ہے لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس

آئے کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی، کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختی سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو ترقیاں مل رہی ہیں اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا علی ہذا اس قسم کی کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا ''مجھ سے کوئی مطلب نہیں''

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے کوئی 45 سال پرانی بات ہے میری عمر 98 سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب اسی عمر کے مگر مجھ سے کہیں توانا اور فربہ تھے میں ذہین تھا وہ حد درجہ کے غبی مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انہیں سبق پڑھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال دی تھی میں اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی قمچی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہو گئی بلدیو چل نکلا اور خالق باری تک آ پہنچا مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہو گئے تب سے بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار رات میں دیکھا (میں اب بھی وہی منحنی ہوں وہ اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے، میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا'' آؤ بھئی بلدیو مزے میں تو ہو کیسے یاد کیا، کیا کرتے ہو آج کل؟''

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا: ''زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا، تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے

پڑھایا کرتے تھے تمہاری بدولت چار حرف پڑھ لیا اور اپنی زمین داری کا کام سنبھال لیتا ہوں نہیں تو مورکھ بنا رہتا تم میرے گرو ہو بھائی، سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمہارا ہی کام تھا نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف، کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے پر عزت نظروں سے دیکھا میں نے باچشم تر کہا ''میں تو جب تمہیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمہارے گلے سے لپٹ جاؤں 45 سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے، وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔''

بلدیو نے بھی رقت آمیز لہجے میں جواب دیا ''میں نے تو بھی تمہیں ہمیشہ اپنا مربی اور رہنما سمجھا ہے جب تمہیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑنے پر کبھی دغا نہ دے گا تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں، سوکھتے کیوں جاتے ہو، گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے خوب ڈٹ کر کھایا کرو اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اڑائے جاتا ہوں ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں عمر بھر بال بچوں کے لیے مرے کوئی پوچھتا ہے، تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹا پانی کو نہ پوچھے اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے اچھا خاصا پہلوان ہے کسی سے دبتا نہیں،

داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہو گئی تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے ادھر گانو میں ایک ڈاکہ پڑ گیا داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا ایک ہفتے سے حراست میں ہے مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ کی گہری دوستی ہے ضرور سزا ہو جائے گی اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے سزا تو ہو گی ہی عزت خاک میں مل جائے گی تم جا کر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے آپ خود تحقیقات کریں بس دیکھ بچپن کے ساتھی ہو انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسر ضلع سے تمہاری دوسری طرح کی ملاقات ہے تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے، اتنا سمجھ لو اور بالکل جھوٹا ہے نہیں میں تمہارے پاس نہیں آتا لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیے ڈالتی ہے، بیوی نے دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے، سات دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا میں دودھ پی لیتا ہوں لیکن دونوں ساس بہو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں اگر سزا ہوئی تو دونوں مر جائیں گی، میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس دی ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

میں بڑی مشکل میں پڑا میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا اگر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو سر ہو جائے گا گلہ نہ چھوڑے گا کوئی جواب نہ سوجھا آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا مگر مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔

''تم جا کر کہہ دو تقدیر میں جو ہے وہ تو ہو گا ہی''

''اچھی بات ہے''

''تو کل جاؤ گے''

''کل ہی جاؤ گا''

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لیٹا میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسا دیا تھا میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ عام طور سے پولیس کا اعتبار کرتے ہیں یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

میں اس واقعہ کو بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا بلدیو سنگھ بولے ''بالکل بری ہو گیا بھائی صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیے جاؤ گے داروغہ بہت پشیمان ہوئے جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا بچارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمہاری سفارش کی برکت ہے برادر اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی میں تمہارے پاس ڈرتے ڈرتے آیا تھا لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو وہ بڑا بے مروت آدمی ہے اس کی ذات سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے

ضرورت مندوں کا کام نکلے وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنے ہی نہیں یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سنی میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا ہے تم چاہے کتنے ہی روکھے بے مروت ہو لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے''

یہ کہہ کر بلدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھر اٹھا لایا جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں حالاں کہ میں برابر کہے جاتا تھا ''کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں''

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا نہیں جو کچھ ہوا خود بخود ہوا مفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

☆☆☆☆☆

قہر خدا کا

پہلی بار: ہندی میں ''باسی بھات میں خدا کا ساجھا'' کے عنوان سے ''ہنس''

اکتوبر 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1936ء (زادِ راہ)

شام کو جب دینا ناتھ نے گھر آ کر گوری سے کہا ''مجھے ایک دفتر میں پچاس روپے کی جگہ مل گئی ہے تو گوری کا ایک ایک عضو شگفتہ ہو گیا، آنکھیں چمکیں، ہونٹ کھلے چہرہ دمک اٹھا دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور مضبوط ہو گیا ادھر ایک سال سے ان غریبوں کا برا حال تھا نہ کوئی روزی نہ روزگار گھر میں جو تھوڑے بہت گہنے پاتے تھے، وہ کب کے بک چکے تھے جن دوستوں سے قرض مل سکتا تھا سب سے لے چکے تھے جن بنیوں سے ادھار چیزیں مل سکتی تھیں ان سے آنکھیں چراتے تھے اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ کئی مہینہ کا کرایہ سر پر لدا ہوا تھا۔ گوالے نے تقاضے سے تنگ آ کر دودھ بند کر دیا، اور بچہ دن بھر دودھ سے بلکتا رہتا۔ ایک وقت کسی طرح کھانا میسر ہو جاتا تو اسے کھینچ تان کر دو تین وقت چلاتے تقاضوں کے مارے دینا ناتھ کا گھر سے نکلنا مشکل تھا گھر سے نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے چھتار مچ جاتی واہ بابو جی واہ دو دن کا وعدہ کر کے سودا لے گئے اور آج دو مہینہ سے صورت نہیں دکھائی ایسے دس پانچ گاہک اور مل جائیں تو دیوالیہ ہی نکل جائے! واہ بھائی صاحب یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اپنی ضرورتوں کا تو آپ کو خیال رہے، لیکن دوسروں کی

ضرورت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے، دشمن کو چاہے قرض دو مگر دوستوں کو کبھی مت دو، قرض دو اور دشمن ہوا دینا ناتھ کو یہ فقرے تیروں سے زیادہ لگتے تھے اور اس کا جی چاہتا کہ اس زندگی کا خاتمہ کر دے، مگر بے زبان عورت اور بچہ کا منہ دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتا تھا بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا اور مصیبت کے ایام کٹ گئے۔''

گوری نے خوش ہو کر کہا ''میں کہتی نہ تھی کہ ایشور سب کی سدھ لیتا ہے اور کبھی نہ کبھی ہماری بھی سدھ لے گا، مگر تمہیں یقین نہ آتا اب تو ایشور کی رحیمی کے قائل ہوئے۔''

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا ''یہ میری دوا دوش کا نتیجہ ہے ایشور نے کیا کیا؟ ایشور کو تو جب مانتا کہ کہیں سے چھپڑ پھاڑ کر بھیج دیتے''

''ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے سنا ہے'' حیلہ روزی بہانے موت

''جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے مجھے ایشور پر وشواش نہیں آئے گا''

لیکن منہ سے چاہے جو کہے اس میں شک نہیں کہ اس کے کفر میں بھی اعتقاد کے بیج پڑ چکے تھے اور اس میں اکھوے بھی نکل آئے تھے۔

(2)

دینا ناتھ کا آقا نہایت کج خلق آدمی تھا اور کام میں بڑا چست اس کی عمر پچاس

سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہو چکی تھی سا گودانہ اس کے سوا اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی، پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے، یا ایک منٹ بھی وقت معین سے پہلے چلا جائے۔ خود نہ جانے کب آتا تھا اور نہ جانے کب جاتا تھا عملے والے جب دفتر آتے تھے تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا جب جاتے تب بھی اپنی جگہ پر موجود رہتا لوگ اس کے سامنے جاتے ڈرتے تھے گویا کاٹ کھائے گا دس منٹ تک کلیجہ مضبوط کرتے اور فراغت پاتے ہی ایسا کٹ بھاگتے گویا قید سے چھوٹے ہوں ہنسنے کی تو کسی کو مہلت نہ تھی بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے۔ نہ جانے اس کے کتنے نئے نام رکھ لیے گئے تھے اس کی حرکات وسکنات کی تضحیک کرنا دلچسپی کا مشغلہ تھا صرف ایک بجے عملے کو پندرہ منٹ کا وقفہ ملتا تھا اس میں جس کا جی چاہے پان کھائے، سگریٹ پئے یا چائے، اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور حالانکہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی تعطیلوں میں دفتر بند رہتا اور معینہ اوقات سے زیادہ ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا تھا۔ سب کو بونس ملتا تھا اور پراویڈنٹ فنڈ کو بھی سہولت تھی، پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ تھا کام کی کثرت سے یا پابندی اوقات کی کسی کو شکایت نہ تھی شکایت تھی صرف مالک کے تھوتھے پن کی کتنا دل لگا کر کام کرو، جان بھی کیوں نہ دے دو، شکریہ کا لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص کے منہ سے نہ نکلتا مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں، دینا ناتھ کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی اس فاقہ کشی کے مقابلے میں اس روکھے پن اور ترش روئی کی کیا حقیقت تھی۔ وہ گھڑکیاں اور

پھٹکار پا کر حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ تضحیک و تنقیح میں بھی وہ شریک نہ ہوتا، احسان سے اس کا ایک ایک رواں گراں بار ہو رہا تھا۔ سال بھر میں اپنی کفایت شعاری کی بدولت اس نے قرضے چکا دیے اور کچھ پس انداز بھی کر لیا وہ ان لوگوں میں تھا جو تھوڑے میں بھی خوش رہ سکتے ہیں اگر معین وقت پر ملتا جائے چار روپے روز میں وہ برکت نہ ہوتی جو پچاس روپے ماہوار میں تھی ضروری مصارف کی مدیں قائم ہو گئی تھیں، زندگی کی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کر کے بے کھٹکے چلا جاتا تھا غیر معین آمدنی میں وہ بجٹ کیسے بناتا؟ کیسے اس کی پابندی کرتا؟ کبھی ایک چیز آتی تو دوسری چیز کم پڑ جاتی دوسری آتی تو تیسری کا رونا ہوتا۔ کمرے میں مستقل روشنی چاہے دھندلی ہو اس بجلی کے لیمپ سے بہتر ہے جو کبھی جلے اور کبھی بجھ جائے کبھی منی ہنا، کبھی مٹی بھر چنا والی زندگی اسے مطلق پسند نہ تھی مقررہ خرچ کے علاوہ ایک روپیہ بھی کسی خاص کام کے لیے خرچ کرنا پڑتا تو میاں بیوی میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوتی اور بڑی جھاؤں جھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی تھی۔ بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا گوری اس کا بخیہ ادھیڑتی، بل کو پاس کرا لینا مجوز کی لیاقت اور وکالت پر منحصر تھا سر ٹیفائی کرنے والی کوئی تیسری طاقت نہ تھی۔

دینانا تھ اب پکا خدا پرست بن گیا تھا ایشور کے رحم و انصاف میں اب اسے کوئی شک نہ تھا روز سندھیا کرتا اور بلا ناغہ گیتا پڑھتا ایک دن اس کے منکر دوست نے جب ایشور کی مذمت کی تو اس نے کہا ''بھائی صاحب اس کا تو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں منکر اور موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں لیکن میرے خیا میں موحد ہو کر رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت

آمیز ہے اگر ایشور کا وجود ہے تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کہیں کا ٹھکانہ نہیں موحد کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے اس کے لیے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے ایشور نہیں تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے؟ دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے منکر دوست اس کی دوزخی دلیل پر منہ بنا کر چلا گیا۔ایسوں کے لیے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔''

دیوالی کا دن تھا گوری نے اب کے ایک ہزار چراغ جلانے کا بندوبست کیا دس سیر تیل لیا اور سارے دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی شام کو جب دینا ناتھ دفتر سے آئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے، تمہیں بھ سنک سوار ہو گئی ہے بل پیش کرنے سے پہلے ہی عملدرآمد شروع کر دیا اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنے کے تیل میں کام نہ چل سکتا تھا؟'' گوری مسکراتی ہوئی بولی'' اسے کبھی غصہ نہ آتا تھا، کام نہ چل سکتا تھا پچھیل سال تو دھیلے کا تیل بھی نہ آیا کیا تب کام نہ چلا؟

میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں؟ یہ ہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا یہ فضول خرچی ہے۔

''میرا دل آج فضول خرچی پر ہی مائل ہے سوچو ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن گھر میں اندھیرا پڑا رہا ایک دن آج ہے کہ ہم ایک ہزار چراغ جلانے کے لائق ہیں کیا جب بھگوان نے ہنسنے کا موقع دیا ہے، تب بھی روئے جائیں، یہ کتنی بڑی نا شکری ہے۔''

''اچھا یہ خیال ہے تو ضرور جلاؤ، تمہارا بل پاس ہو گیا''

ایک دن دینا ناتھ شام کو دفتر سے چلے تو سیٹھ جی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھا کر بولے "تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے؟ سال تو ہو گیا ہوگا" دینا ناتھ نے ادب سے کہا "جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے"

"آرام سے بیٹھو اس وقت گھر جا کر کچھ چائے واے پیتے ہو؟"

"جی نہیں میں چائے کا عادی نہیں ہوں"

"پان وان تو کھاتے ہی ہوگے؟ جوان آدمی ہو کر ابھی سے اتنا پرہیز"

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا حالانکہ دینا ناتھ برابر انکار ہی کرتا رہا، اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے؟ کہاں تو حضرت سلام ہی نہ لیتے تھے کہاں آج مٹھائیاں اور پان سبھی کچھ منگایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میری خدمات سے خوش ہو گئے ہیں اس خیال سے انہیں اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور ایشور کی یاد آ گئی پر ماتما ضرور حاضر و ناظر ہے، ورنہ مجھے کون پوچھتا؟ دفتر میں میرا عہدہ بھی تو اونچا نہیں۔

اردلی پان اور مٹھائیاں لایا دینا ناتھ اصرار سے مجبور ہو کر مٹھائیاں کھانے لگا

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا تم نے مجھے بہت خشک اور بے مروت پایا ہوگا میرے ملازموں کو مجھ سے یہ عام شکایت ہے، مگر میں مجبور ہوں ہمارے یہاں ابھی لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا اتنا کم احساس ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جائے تو لوگ اس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں، اور اپنے کام سے بے توجہی کرنے لگتے ہیں انہیں اپنے کام کی اتنی پروا نہیں رہتی جتنی اپنے افسر

کی خوشامد اور مصاحبت کی کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں ان سے ہنستے بولتے بھی ہیں ان کی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے ہیں، پھر بھی نوکروں کو ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اور بھی تندہی سے اپنا کام کرتے ہیں مالک سے انہیں ہمدردی ہو جاتی ہے میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں مجھ میں وہ فن نہیں ہے، اس لیے میں اپنے آدمیوں سے کھنچے رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں اور اب تک اس طرز عمل سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن آدمیوں سے علیحدہ رہ کر بھی ان کے رنگ ڈھنگ دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی فطرت کا امتحان لیا کرتا ہوں میں نے اب تک تمہارے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ تم وفادار اور با اصول آدمی ہو اور میں تمہارے اوپر اعتبار کر سکتا ہوں، اس لیے میں تمہیں زیادہ ذمہ داری کا کام دینا چاہتا ہوں تمہیں خود بہت کام کرنا پڑے گا صرف نگرانی کرنا پڑے گی تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور اختیارات بڑھ جائیں گے مجھے یقین ہے کہ اب تک جس تندہی سے تم نے کام کیا ہے، آئندہ اس سے بھی زیادہ توجہ اور خلوص سے اپنا کام کرو گے۔

دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی جی میں آیا آقا کے قدموں پر سر رکھ دے اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لیے میری جان حاضر ہے آپ نے جو میری عزت کی ہے اور مجھ پر اعتبار کیا ہے میں اس کے لائق بننے کی کوشش کروں گا! آواز قابو میں نہ تھی جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے صرف احسان مند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا

شاید وفاداری اور تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا۔ تب سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے کہا" میں ایک ایسے کام میں تمہاری مدد چاہتا ہوں جس پر اس کاروبار کا سارا مستقبل اٹکا ہوا ہے اتنے آدمیوں میں میں نے تمھیں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے یہ سال گزشتہ کا لیجر ہے اور اس میں کچھ ایسے اندراجات ہیں جن کے مطابق کمپنی کو کئی لاکھ نفع ہوتا ہے لیکن حقیقت حال سے تم واقف ہو ہم کئی مہینوں سے خسارہ اٹھاتے جا رہے ہیں۔ جس نے یہ لیجر لکھا تھا اس کی تحریر تمہاری تحریر سے بالکل ملتی ہے، اگر دونوں تحریریں آمنے سامنے رکھ دی جائیں تو کسی ماہر فن کو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہے میں چاہتا ہوں کہ تم ان اعداد کے مطابق ایک نیا صفحہ لکھو اور اس صفحہ کو لیجر سے نکال کر نیا ورق چسپاں کر دو میں نے صفحہ کا نمبر چھپوا لیا ہے ایک باہر کا دفتری بھی ٹھیک کر لیا ہے جو راتوں رات شیرازہ بندی کر دے گا کسی کو پتہ نہ چلے گا ضرورت صرف یہ ہے کہ تم وہ نیا صفحہ ان اعداد کے مطابق نقل کر دو"

دینا ناتھ نے اس تجویز کے خطرہ سے متاثر ہو کر کہا" اگر نہیں اعداد کی نقل کرنی ہے تو نیا صفحہ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سیٹھ جی اس کی سادگی پر ہنس کر بولے" تم کیا سمجھتے ہو اس صفحہ کی بجنسہ نقل کرنی ہو گی؟ میں کچھ نئے اعداد دوں گا جنہیں تم نشان کردہ رقموں کی جگہ درج کر دو گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محض اس دفتر کی بہتری کے خیال سے یہ کارروائی کر رہا ہوں اگر یہ ردوبدل نہ کیا گیا تو اس دفتر کے سو آدمیوں کی روزی خطرے میں پڑ جائے گی یہاں کچھ پس وپیش کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ ایک سو

ملازموں اور کم سے کم پانچ سو مزدوروں کی روٹیوں کا معاملہ ہے تم بہت زود نویس ہو اور تمہارے لیے یہ محض آدھ گھنٹہ کا کام ہے۔''

بڑا مشکل مسئلہ تھا یہ ظاہر تھا کہ اسے صریح جعل سازی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے اس کے پاس اس حقیقت کو دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ سیٹھ جی نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں ان کی ذاتی غرض شامل ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے لیکن بہر حال یہ تحریف و تلبیس تو کیا وہ ذاتی نفع کے لیے بھی اپنے ضمیر کا خون کرے گا، نہیں ہر گز نہیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ''آپ مجھے معاف کریں میں یہ خدمت نہ بجا لا سکوں گا میں اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں''

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہیں آیا اسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے ''کیوں؟''

''اس لئے کہ یہ سراسر جعل ہے''

''جعل کسے کہتے ہیں''

''نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے''

''لیکن اگر اس تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے کمپنی کی اصل حالت کچھ ہے کاغذی حالت کچھ ہے اگر تغیر نہ کیا جائے تو فوراً کئی لاکھ روپے کے نفعے دینے پڑ جائیں گے، اور نتیجہ یہ ہو گا کہ کمپنی کا دیوالیہ نکل جائے گا اور یہ سارے آدمی بے کار ہو جائیں گے میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لیے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے غریبوں کی بہتری کے لیے اگر جھوٹ جعل بھی کرنا پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا اگر میرے

جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا میں ہر ایک فعل کو اس کے سامنے تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے۔ جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے"

دینا ناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا اگر سیٹھ جی کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا۔ یہ جعل نہیں ناگوار فرض ہے اگر ضمیر کا خون بھی ہوتا ہے تو اتنے آدمیوں کی بہتری کے لیے اس کا خون بھی کرنا پڑے گا لیکن ضمیر کو سمجھا لینے کے بعد اسے اپنے مواخذہ کا خیال آیا قانون کی نظر میں جعل جعل ہے خواہ کسی نیت سے بھی کیا جائے۔۔۔۔ بولا "لیکن یہ راز کھل گیا تو مجھے چودہ سال کا کالا پانی ہوا رکھا ہے۔"

سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا "اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے میں پھنسوں گا تم صاف انکار کر سکتے ہو"

"تحریر میں کچھ کچھ امتیاز تو رہے گا"

"پتہ ہی کیسے چلے گا کہ کونسا صفحہ بدلا گیا ہے اگر تحریروں میں کچھ امتیاز ہے بھی تو ناقابل احساس۔"

دینا ناتھ لاجواب ہو گیا اسی وقت صفحہ کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا

پھر بھی دینا ناتھ کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا گوری کو اس نے شریک راز نہ کیا۔

ایک مہینہ بعد اس کی ترقی ہو گئی سو روپے ملنے لگے دو سو بونس کے بھی ملے یہ سب کچھ ہوا گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر

ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا جن دلیلوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بند رکھی تھی ان دلیلوں سے گوری کی زبان بند کر سکنے کا یقین اسے نہ تھا۔ اب خود اسے ان دلیلوں کا اصلی پہلو نظر آنے لگا تھا اس کی خدا پرستی، روحانی تقویت کے بدلے اسے پاگل کرتی رہتی تھی قہر الٰہی کا خوف اس کے دل میں سمایا رہتا تھا اس گناہ کی سزا ضرور ملے گی کسی توبہ، کسی کفارہ وے وہ اس سزا سے بچ نہیں سکتا ابھی نہ ملے، سال دو سال نہ ملے، دس پانچ سال نہ ملے، لیکن کتنی ہی دیر میں ملے گی، اتنی ہی خوفناک ہوگی دراصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا وہ اکثر پچھتاتا تھا میں سیٹھ جی کی ترغیب میں کیوں آ گیا کارخانہ ٹوٹتا یا رہتا میری بلا سے، مجھے یہ روحانی خلش نہ ہوتی لیکن اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور سزا ضرور ملے گی اس خوف سے اس کا سکون قلب اس کی طبعی بشاشت اس کی زندہ دلی رخصت ہوگئی وہ اب گہنگار تھا جس کا فرد جرم جعلی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا رہتا تھا، وہ ایک پل بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر سکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہوا تھا، بچے کو بخار آنے لگا، دینا ناتھ کی جان ناخن میں سما گئی کہاں جائے، کیا کرے جیسے عقل سلب ہوگئی ہو

گوری نے کہا ''جا کر کوئی دوا لاؤ کسی ڈاکٹر کو دکھا دو تین دن تو ہو گئے''

دینا ناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا ''ہاں جاتا ہوں لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے۔''

''اندیشہ کی کون بات ہے بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو آج کل کسے بخار نہیں آتا؟''

''ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے؟''

''ایشور بے رحم ہے گنہگاروں کے لیے ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟''

''کیا ایشور گنہگاروں کو بھی معاف نہیں کرتا؟''

''گنہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ رہنے پائے''

''لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے جو ایک خیال سے گناہ ہو سکتے ہیں، دوسرے خیال میں عین ثواب''

''میں نہیں سمجھتی''

''میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ گنا ہے؟''

''میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے''

دینا ناتھ کو تھوڑی دیر کے لیے سکون ہو گیا، ڈاکٹر بلا لایا علاج شروع کیا ایک ہفتہ میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ خود بیمار پڑا۔ اب کے ضرور اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے اور وہ جان بر نہیں ہو سکتا معمولی فصلی بخار تھا، لیکن دینا ناتھ کے خوف سزا نے اسے سرسام کی صورت دے دی بخار میں حالت نشہ کی طرح ہی واہمہ بہت بلند پرواز ہو جایا کرتا ہے پہلے جو محض ایک وہم تھا وہ شکل حقیقت بن بیٹھا تخیل نے موت کے فرشتے بنا کر کھڑے کر دیے۔ ان کے بھالے اور کوہ نما گرز، دوزخ کے اگن دہکا دیے۔ ڈاکٹر کی ایک گھونٹ دوا ایک ایک ہزار من کے گرز کی چوٹ اور آگ کے ابلتے ہوئے سمندر کی جلن پر کیا اثر کرتی؟ دینا ناتھ وہم پرست نہ تھا پرانوں کے دور از قیاس مقولوں پر اسے مطلق ایمان نہ تھا نہ ہی وہ معقولات کا

دلدادہ تھا اور خدا پر بھی اسے اسی وقت یقین آیا جب اس کی عقل نے اس کے وجود کو تسلیم کرلیا لیکن ایشور آیا تو اس کے ساتھ رحم بھی آیا قہر بھی آیا رحم کی بدولت اسے روزی ملی، خدا کا رحم نہ ہوتا تو شاید وہ بھوک میں مر جاتا۔ لیکن رحم کی صورت کتنی کمزور اور حقیر ہے، قہر کی صورت کتنی ہیبت ناک، بھوکوں مر جانا، اگن گنڈہ میں دھکیل دیے جانے کی نسبت کتنا آسان ہے، بالکل کھیل ہے سزا کا تخیل بزرگوں سے منوارث ہوتے ہوتے اتنا راسخ ہوگیا تھا، گویا اس کی روح اور عقل کا ایک جز ہوگیا ہو اس کا استدلال اس کے جمے ہوئے تاثرات پر سمندر کی اونچی لہروں کی طرح آتا تھا اور انہیں ایک لمحے کے لیے غرقاب کر کے پھر لوٹ جاتا اور پہاڑ جوں کا توں کھڑا رہ جاتا تھا۔

زندگی باقی تھی بچ گئی، طاقت آتے ہی دفتر جانے لگا۔

ایک دن گوری بولی جب تم بیمار تھے تو ایک دن تمہاری حالت نازک ہوگئی تھی اور میں نے گھبرا کر بھگوان سے منوتی کی تھی کہ اگر یہ اچھے ہو جائیں تو پچاس براہمنوں کو بھوجن کراؤں گی دوسرے دن ہی تمہاری حالت سنبھلنے لگی ایشور نے میری عرض سن لی آج بازار سے سامان لا دو تو وہ مانتا پوری کردوں پچاس برہمنوں کو نوتہ دو گے تو سو ضرور ہی آجائیں گے پچاس کنگلے بھی سمجھ لو اور دوستوں میں بھی پچیس نکل ہی آئیں گے دوسو آدمیوں کا تخمینہ ہے میں جس کی مقدار لکھے دیتی ہوں۔

دینا ناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا ''تو تمہارا خیال ہے میں ایشور کے رحم سے اچھا ہوگیا؟ ۔''

''اور کیسے اچھے ہوئے؟''

''اچھا ہوا اس لیے کہ زندگی باقی تھی؟''

''ایسی باتیں نہ کرو ماتا پوری کرنی ہو گی''

''ہرگز نہیں میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا''

''اور کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے''

''اس سے زیادہ اور کیا بے رحم اور سنگدل ہستی دنیا میں نہ ہو گی جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو ان کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزا یہ دے کہ انہیں دوزخ کے اگن کنڈ میں دھکیل دے وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا ایسے بھگوان کے تخیل سے ہی میری روح کو لرزہ آتا ہے محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دنیا کی علت قرار دیا ہے برتاؤ میں نہ سہی تخیل ہی میں سہی محبت میں ہماری زندگی کی حقیقت ہے مگر تمہارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا، ایسے ایشور کی عبادت نہیں کرنا چاہتا نہیں کر سکتا جو لوگ جھوٹے ہیں ان کے لیے رحیم ہو گا، کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں ہم جیسوں کو تو ایشور کی یاد کہیں نظر نہیں آتی اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے یہ مت کرو، نہیں ایشور تمہیں سزا دے گا وہ مت کرو نہیں دوزخ میں جاؤ گے ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے ایسے قہار و جبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں اچھا ہے اسے دل سے نکال کر میں اس کے رحم اور اس کے قہر دونوں ہی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں ایک کلمہ

سخت برسوں کے پریم کو خاک میں سلتا ہے میں تمہارے اوپر برابر جان دیتا ہوں لیک کسی دن ایک طعنہ دوں تو میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرو گی ایسی پر عذاب اور پر خوف زندگی کے لیے میں کسی ایشور کا احسان نہیں لینا چاہتا اگر تم نے براہمنوں کے بھوج پر زور دیا تو میں زہر کھا لوں گا۔''

''گوری اس کے چہرے کی طرف خوفزدہ نظروں سے تکتی رہ گئی''

☆☆☆☆☆☆☆

انصاف کی پولیس

پہلی بار: ہندی میں ''خدائی فوجدار'' کے عنوان سے ''چاند'' نومبر 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، فروری 1938ء (واردات)

(1)

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا اور وہی تحریر دیکھی تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہی ہاتھ اور دل کانپنے لگے خط میں کیا لکھا ہے ساتھیوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا اسی لفافہ اور اسی تحریر کے کئی خط یکے بعد دیگرے انہیں مل چکے تھے اس خط کا بھی وہی مضمون ہو گا اس میں مطلق شبہ نہ تھا وہ خط کو کانپتے ہاتھوں میں لیے آسمان کی طرف تاکنے لگے گویا اس میں اپنا نوشتہ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں وہ دل کے مضبوط آدمی تھے مردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں انہیں چھو بھی نہیں گئی تھیں ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے وہ ہر پورن ماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے پچھلے پندرہ سال میں اس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے، روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیو جی کو جل چڑھاتے تھے مہینے میں دو بار برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا، ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے زمین طے کر لی تھی اور کسی اچھی مہورت کے منتظر تھے انہوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا اس کار خیر میں ان

کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہ خرچ ہوگی زمین ایک بیوہ کی تھی جس پر انہوں نے
پہلے اپنی گائے، بھینسوں کے لیے ایک مختصر سا چھپر ڈال لیا تھا اور جب بیوہ ایک نا
بالغ لڑکا چھوڑ کر مر گئی تو وقف زمین اس کے قبضے میں آ گئی لڑکا اپنے ننھیال میں تھا
اور ننھیال والوں کو توفیق نہ تھی، نہ اتنی فرصت کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے
معمار سب ان کے اسامی تھے اور مزدوری کر کے سودا کرنا چاہتے تھے اینٹ والا
بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے گیا تھا اور اصل کی دوچند رقم ادا کر چکنے کے بعد
بھی اس پر ان کے ہزاروں روپے نکلتے تھے اس لیے یہ مرحلہ بھی طے تھا صرف
سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا وہ دس ہزار کی دستاویز لکھا
لے، بس دھرم شالہ تیار ہے ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر ان کا پکا
اعتقاد تھا جن کی دعا اور برکت سے انہیں کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا مگر جب
سے یہ خطوط ملنے لگے تھے انہیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی رات کو ان کے
دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا ہے اگر دس پانچ مسلح آدمی آ جائیں تو وہ اکیلا کیا
کر سکتا ہے شاید انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو، ہم سایوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جو
خطرے کے وقت کام آئے حالاں کہ سب ہی ان کے اسامی تھے یا رہ چکے تھے
لیکن یہ فرقہ احسان فراموشوں کا ہے جس کے دروازے پر ضرورت کے وقت
ناک اور پیشانی رگڑتا ہے، اسی کے روپے آزار ہو جاتا ہے احسان ماننا تو دور رہا الٹا
بدخواہ ہو جاتا ہے انہوں نے سوچا اگر رات کو دس پانچ آدمی آ جائیں تو واقعی بڑی
مشکل کا سامنا ہو بے شک دروازہ مضبوط ہے اور اسے توڑنا آسان نہیں جوڑیاں
بھی جرمن ساخت کی ہیں جن پر کوئی حربہ اثر نہیں کر سکتا اور دیواریں اتنی اونچی ہیں

کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا نقب تو امر محال ہے بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے ایک ایک پتھر دس دس من کا ہے۔

اس خیال سے انہیں قدرے تشفی ہوئی اپنی رائفل نکال کر انہوں نے اس کا خوب معائنہ کیا موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہوگئی کون جانے یہ چوکیدار بھی ان ہی میں مل گیا ہو خدمت گار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کے سانپ ہو سکتے ہیں۔

آخر کئی منٹ کے روحانی انتشار کے بعد انہوں نے خط کھولا اور ان کا چہرہ زرد ہوگیا آنکھیں پھیل گئیں سانس تیز چلنے لگی فوراً دروازہ بند کر دیا اور خط لیے اندر آ کر کیسر سے بولے:

"دیکھتی ہو آج پھر وہی خط آیا ہے آج تو تاریخ بھی مقرر کر دی پرسوں ان کا دھاوا ہوگا لکھا ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد رامیشور کے مندر کے سامنے درخت کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو یہ سب سمجھتے ہوں گے کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈر جاؤں گا"

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی پھر بھی اس نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر بولی:

"میں تو سوچتی ہوں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں سے کہیں چلے چلیں، کاشی پریاگ، ہردوار، کہیں بھی تیرتھ کا تیرتھ ہو جائے گا اور ذرا چین بھی نصیب ہوگا مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی"

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے

’’اس طرح ایک ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا یہ سب میرے ہی اسامی ہیں جن کی جائیدادیں میں نے نیلامی کرائی ہیں رائفل کی ایک آواز جہاں کی، ہرن ہو جائیں گے پولیس کو بھی اطلاع کیے دیتا ہوں میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیں گے اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کر لیں گے اور حفاظت جیسی وہ کریں گے وہ میں جانتا ہوں لیکن اب اطلاع دے دوں گا دو چار سو روپیوں کا منہ نہ دیکھوں گا اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے۔‘‘

کیسر دوہرے بدن کی عورت تھی نخل بے ثمر جو پت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصہ گزار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پر خوف مایوسی طاری رہتی تھی معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں پھر یہ زر و مال کس کے ہاتھ لگے گا۔ سب سے زیادہ خوف اسے بیماری کا تھا اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی اور اس جامۂ ہستی کے اس وقت تک اتارنا چاہتی تھی جب تک ایک تار بھی باقی رہے، بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی اور موت کو بلاتی، لیکن اب تو اس کی زندگی ہی اس کا خاتمہ تھا پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا اسے وہ دواؤں اور دعاؤں سے دور کرتی رہتی تھی اور گویا ایشور پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لیے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تھے اس کا خوف بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا منت آمیز لہجے میں بولی:

’’پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہوگا میری بات مانو، یہاں سے بھاگ

چلو میری بات کیوں نہیں مانتے کیا کرنے پر تلے ہوئے ہو چور کوئی گھر کو تو اٹھا نہ لے جائے گا۔‘‘

سیٹھ جی نے کیسر کی بدحواسی پر ترس کھا کر کہا

’’تم ناحق اتنا ڈرتی ہو کیسر پولیس کو جب ضابطے کے ساتھ اطلاع دی جائے گی تو اس کا فرض ہو جائے گا کہ ہماری حفاظت کرے ہم پانچ ہزار سالانہ ٹیکس دیتے ہیں اگر پولیس نے سماعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہوں گا جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اس کا قانونی فرض ہے۔‘‘

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آتا وہ کسی طرح اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی جو اس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا پولیس کا اسے اب تک جو تجربہ تھا اس سے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی بولی:

’’پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے جب واردات ہو جاتی ہے تب البتہ شان جتانے کے لیے آ پہنچتے ہیں مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہو جانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔‘‘

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی ’’پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں تم کیا جانو‘‘

کیسر نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا ’’اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہو جائے گی لوٹ کے مال میں ان کا ساجھا ہوتا ہے‘‘

جانتا ہوں دیکھ چکا ہوں اور روز دیکھتا ہوں لیکن کیا سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں

دیتے اس پر داروغہ جی کو برابر پاپڑ واچار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے تو میں نے کتنی رسد پہنچائی تھی ایک کنستر گھی، اور ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی یہ سب کھانا پلانا کس دن کام آئے گا ہاں یہ مانتا ہوں کہ آدمی کو بالکل دوسروں کے بھروسے نہ بیٹھے رہنا چاہیے اپنے قوت بازو سے بھی کام لینا چاہیے میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہی ہے آؤ تمہیں بھی بندوق چلانا سکھا دوں۔

''یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی'' کیسر ہنس کر بولی

''ہاں اور کیا اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی تم کو جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے''

سیٹھ جی نے کہا'' اس میں ہنسی کی کیا بات ہے آج کل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں، سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں بندوق چلاتی ہیں''

کیسر نے اعتراض کیا'' ولایت کی عورتیں چلاتی ہوں گی یہاں کی عورتیں کیا چلائیں گی ہاں انگل بھر کی زبان چاہے چلالیں''

سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصیح کی'' اب یہاں کی عورتیں بھی چلاتی ہیں زمانہ بدل رہا ہے ہم تم دونوں بندوق لے کر کھڑے ہو جائیں گے تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کر سکیں گے عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہو جاتی ہے۔''

کیسر نے آخری فیصلہ کیا:'' نا بابا! میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی''

اس وقت چوکیدار نے آ کر کہا: ''داروغہ جی نے کئی کانسٹیبل بھیجے ہیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

(2)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹیبلوں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور ان میں سے ایک نے کہا: ''ہمیں داروغہ جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آ رہی ہیں آج کل باہر سے ڈاکو اس علاقے میں آ گئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔''

سیٹھ جی نے کانسٹیبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا: ''داروغہ جی کو کیسے معلوم ہو گیا میرے پاس تو ایسے کئی خط آ چکے ہیں ایک آج بھی آیا ہے میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آ رہا تھا۔''

ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا: ''حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ کو کیسے معلوم ہو گا علاقے کے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو بھلا کوئی بات ہے حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا موقع نہ دیا جائے حضور پانچ ہزار روپے سالانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں ہمارے ہوتے مجال ہے کہ آپ کا بال بھی بیکا ہو جائے آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں زیادہ ہیں کہ تھانے سے باہر ان سے مقابلہ کرنا دشوار ہے داروغہ جی نے سوچا تھا گارڈ منگا لیں گے مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے

نہیں آج یہاں ہیں تو کل یہاں سے دو کوس پر پہنچ گئے گارڈ منگا کر ہی کیا کر سکتے تھے رعایا کی تو ہمیں فکر نہیں کس کے پاس اتنا مال اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو اور اگر کسی کے پاس دو چار سو روپے نکل ہی آئے تو اس کے لیے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جان ہتھیلی پر لیے نہ پھرے گی ڈاکوؤں پر کوئی ذمہ داری نہیں وہ تو بے دریغ گولی چلاتے ہیں اور اکثر چھپ کر ہمارے لیے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں کوئی بات بگڑ جائے تو الٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے، اس لیے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ کو جس مال و اسباب کے بارے میں خطرہ ہو اسے لا کر تھانے کے خزانے میں جمع کر دیجئے آپ کو رسید دے دی جائے گی آپ کا قفل لگا دیا جائے گا۔ صندوق پر آپ اپنی مہر لگا دیجئے گا جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے تو آپ اپنی چیزیں واپس لے لیجئے گا اس کے لیے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے کہ جو لوگ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے ورنہ سخت جواب طلب کیا جائے گا ورنہ آپ جانتے ہیں پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائے گی اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی ہمارے اوپر بھی جواب دہی آ جائے۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال و اسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے بلکہ خون بھی کر ڈالتے ہیں اس لیے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا کہ آپ آج

ہی خطرے والی چیزیں لے کر تھانے میں تشریف لے آئیں اور انہیں خزانے میں داخل کر کے رسید لے لیں مزید اطمینان کے لیے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی بھی وہاں تعینات کر سکتے ہیں حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے راستے میں کوئی خطرہ نہیں تحقیقی خبر ملی ہے کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں آ گیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح و سادھو بنے ہوئے ہیں دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اوڑھے بیچتے پھرتے ہیں ان دونوں کے ساتھ دو بہنگی بردار بھی ہیں دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھریاں اور تالے بیچتے ہیں اور کہاں تک گناؤں ہمارے یہاں تو ان کا پورا حلیہ آ گیا ہے۔''

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور ایسی باتوں کا بھی یقین کر لیتا ہے جو شاید ہوش و حواس کی حالت میں وہ نہ کرتا یہ تو شبہے کا موقع ہی نہ تھا ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں اس کے لیے سیٹھ جی تیار تھے کہ اگر دو چار سو روپے دینے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں ایسے واقعے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں موجودہ حالت میں اس سے بہتر کوئی انتظام خیال میں نہیں آتا تھا بلکہ اسے امداد غیب سمجھنا چاہیے انہیں کانسٹیبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوا لیں گے دوسروں کا کیا بھروسا کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں تو غضب ہی ہو جائے راستے ہی میں گھیر لیے جائیں بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہو گی۔

پھر بھی اس انداز سے بولے گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی خاص عنایت کی

ہے" یہ تو ان کا فرض ہی تھا اس میں عنایت کے لیے داروغہ جی کا تہ دل سے مشکور ہوں مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اگر ڈاکو یہاں آتے تو ان کے دانت کھٹے کر دیے جاتے سارا محلّہ مقابلے کے لیے تیار تھا سب ہی سے تو اپنا یارانہ ہے مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے، اس سے وہ بھی اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اتر جاتا ہے جیسا آپ نے خود کہا لیکن اندر سے چیزوں کو نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں آپ کی دعا سے آدمی تو کافی ہیں مگر کس کی نیت کیسی ہے یہ کون جانتا ہے آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہو جائے (مسکرا کر) آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے گی۔"

کیسر نے اس تجویز کو لبیک کہا کانسٹیبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی سے پیش کیں ہیڈ کانسٹیبل نے کہا:

" ہم حضور کے تابع دار ہیں اس میں مدد کی کون سے بات ہے تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں مگر دیتے تو حضور ہی ہیں آپ ضرور بتاتے جائیے ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے"

کیسر نے خوش ہو کر کہا

" بھگوان نے مدد کر دی، نہیں تو میں بہت گھبرا رہی تھی جان نکلی جاتی تھی"

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا" اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام! اسی مستعدی کی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تا کہ وہ آئیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں"

کیسر نے جھک کر کہا ''کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال لے جاؤ۔''

دو کانسٹیبلوں نے اندر جا کر صندوق اور پٹارے نکالنے شروع کیے ایک باہر سامان کار پر لاد رہا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل نوٹ بک پر ہر ایک چیز کا اندراج کر رہا تھا زیورات، اشرفیاں، نوٹ، بیش قیمت کپڑے، شال دوشالے نقرئی ظروف سب کار میں رکھ دیے گئے معمولی فرنیچر، برتن فرش فروش اور غلہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لیے بے مصرف ہیں کیسر کا سنگاردان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹیبل کو دے کر بولے

''بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا''

ہیڈ کانسٹیبل نے سنگاردان لے کر کہا

''میرے لیے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے''

سیٹھ جی کے دل میں ایک شبہہ پیدا ہوا کہا

''اس فہرست کی نقل مجھے بھی دے دیجیے''

ہیڈ کانسٹیبل نے کہا: ''وہ آپ کو تھانے میں باضابطہ دی جائے گی''

''کیوں نہ یہیں دے دیجیے؟''

''یہاں لکھنے میں دیر ہو گی اور پھر جب تک داروغہ جی کے دستخط نہ ہوں اس رسید کی وقعت ہی کیا؟ مگر آپ کے دل میں یہ شبہہ کیوں پیدا ہوا؟''

سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا:

''شبہہ نہیں تھا میں نے سمجھا ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا''

ہیڈ کانسٹیبل نے بے رخی سے کہا: ''اگر آپ کے دل میں کسی قسم اک شبہہ ہو تو آپ چیزیں اپنے گھر ہی میں رکھیں ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں مگر ہاں! اس حالت میں ذمہ داری آپ کی رہے گی''

سیٹھ جی اور نادم ہوئے ''نہیں نہیں صاحب! شبہے کی بات نہیں تھی یوں ہی ایک خیال آ گیا آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی، میں بھی مانتا ہوں''

کار پر سارا سامان رکھ دیا گیا محلے کے سینکڑوں آدمی تماشا دیکھ رہے تھے کار بہت بڑی تھی مگر بالکل بھر گئی پانچ آدمیوں کے لیے بڑی مشکل سے جگہ نکلی سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی گویا اس کی لڑکی رخصت ہو رہی ہو۔

(3)

پانچ میل کا سفر تھا قصبے سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموش اور اداس بلندیاں نظر آئیں جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سرخ بجری کی سڑک سیندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل نے سیٹھ جی سے پوچھا:

''یہ کہاں تک صحیح ہے کہ پچیس سال پہلے آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے؟''

نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے:

"بالکل صحیح ہے خاں صاحب! میرے پاس کل تین روپے تھے لٹیا ڈور کندھے پر تھی اور چھڑی ہاتھ میں بس بھگوان کا بھروسا تھا بالکل تقدیر کا کھیل ہے اور بھگوان کی مرضی چاہیے آدمی کے بنگتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

"میں نے سنا ہے آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں"

میرا اصول ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے جب بہت تھوڑی دولت تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا۔

"آخر یہ دولت آپ کو ملی کہاں سے؟"

"آڑھت، لین دین، رہن، بیع سب ہی کچھ تو ہے خاں صاحب! یہ سمجھ لیجئے کہ صبح سے آدمی رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں"

"آپ بجا فرماتے ہیں محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا"

"کچھ نہیں صاحب نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں میں تو بیٹھا نگرانی کرتا ہوں"

"آپ نے کئی لاکھ پیدا کیے ہوں گے"

"دو سوا دو لاکھ کی جائیداد ہے خاں صاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملے"

"لیکن اصل سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے؟"

"سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خاں صاحب! آج چاہوں تو کہیں سے لاکھوں

کا مال منگا سکتا ہوں۔''

''آپ کی زندگی واقعی ہمارے لیے نمونہ ہے''

'' آپ لوگوں کی دعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی ہے آگے بھگوان جانے''

''اب تو اور بھی آرام سے کٹے گی کیوں کہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے''

''اس میں کیا شک ہے خاں صاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے''

''یہ مال و اسباب اور جائداد آپ کے لیے فضول ہے آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں۔''

''بہت اچھی طرح خاں صاحب! یہ سب تو مایا جال ہے جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے اب دھرم شالا بنوانے کا ارادہ ہے سامان کر لیا ہے کوئی اچھی مہورت دیکھ کر ہاتھ لگا دینا ہے ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا ہوں بس پھر بھگوان کا بھجن کروں گا۔''

'' آپ کے کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں؟''

''تقدیر میں نہ تھی خاں صاحب! اور کیا کہوں جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں ان کے ہاں تو گھاس پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں جنہیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے وہ اولاد کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے ہیں''

'' آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، سیٹھ جی! آپ کی باتیں بڑی پر مغز ہوتی ہیں اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسان مند ہوں گے''

سیٹھ جی ہنسے اور بولے: ''بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے خاں صاحب!''

ہیڈ کانسٹیبل نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا: ''بھگوان کیوں چھڑانے لگے آپ خود کیوں نہیں چھوٹ جاتے جس دولت سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں اسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجئے بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب؟''

''بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خاں صاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے؟''

''میں تو توڑنے کو تیار ہوں اسی وقت''

''اسی دولت کے لیے آدمی اپنا خون پسینا ایک کر دیتا ہے خاں صاحب! دغا، فریب، بے ایمانی اور ظلم سب کچھ اسی کے لیے کرتا ہے بغیر اپنا ضمیر بیچے دولت نہیں ملتی ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے۔''

''لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ظہور ہے آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی۔''

''نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خاں صاحب!''

''آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدی پر بیٹھے نگرانی کرنا''

''مگر سب آدمی سب ہی کام تو نہیں کر سکتے''

''آخر یہ روپیا آپ کے پاس آیا کہاں سے؟ آپ نے کسی اسامی کو سو روپے قرض دیے۔ یقیناً اس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہی ہوگا کبھی کبھی تو سو کے دو سو، تین سو، چار سو تک وصول کیے ہوں گے آپ کے روپے نے تو بچے دیے نہیں اسامی کی محنت کے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر

آپ نے پورے خاندان کو اپنا غلام بنالیا ہوگا اور ان کی شبانہ روز کی مشقت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی‘‘

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے خاں صاحب کی طرف دیکھا یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے، خواہ مخواہ بحث کررہا ہے مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت پیدا کی تو پھر؟ جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا کوئی نئی بات نہیں کی بولے:

’’اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سب ہی دولت مند مفت خود ہیں‘‘

خاں صاحب نے اس کی تائید کی ’’بے شک، میں بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتا ہوں یہاں تک کہ سب ہی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں فرق یہی ہے کہ آپ اسامیوں سے روپے وصول کر کے جمع رکھ چھوڑتے ہیں، سرکار اس سے **ملک** کا انتظام کرتی ہے عدالتیں اور پولیس قائم کرتی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بہ اطمینان غربا کا خون چوس سکیں اگر کوئی غریب سرکشی کرے اور آپ کا منہ اپنی رگ سے ہٹا دینا چاہے تو سرکاری پولیس اور عدالت اور فوج آپ کی مدد کرے دراصل آپ نے سود یا نفع یا مال گذاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے وہ غریبوں کی کمائی ہے جو آپ نے ان سے جبراً چھین لیا ہے اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بیکار پڑی ہوئی ہے آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کر کے گھر کی راہ لیجئے ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں، انصاف کی پولیس کے سپاہی ہیں ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا یہاں تک کہا کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دے دیجئے لیکن آپ سرکاری

امداد کے زعم میں بیٹھے رہے مجبوراً ہمیں یہ چال چلنی پڑی''

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا لیکن نہیں یہ پولیس والے مجھے ڈرا رہے ہیں اور اب میری بزدلانہ بدحواسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں بولے:

''خاں صاحب! آپ بڑے دل لگی باز ہیں لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی تو اس وقت میں دھوکے میں آ چکا ہوتا''

''تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ وہ چال چلی ہے اور آپ دھوکے میں آ گئے ہیں اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں''

گاڑی رک گئی سیٹھ جی دھکیل کر نیچے گرا دیے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا موٹر آہستہ آہستہ چلی سیٹھ جی چلاتے ہوئے موٹر کے پیچھے دوڑے۔

''حضور، سرکار، بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا رحیم کیجئے میں خوشی سے آپ کو پچیس ہزار دے دوں گا آپ نے کہا ہے آپ انصاف کی پولیس ہیں یہ بے انصافی نہ کیجئے''

خان صاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا:

''کاش! یہ پچیس ہزار روپے آپ نے پہلے دے دیے ہوتے اب تو میعاد گزر گئی اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے اس کا خیال کیجئے آپ کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتی۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیے یہ دو تین روپے ہیں جو آپ ساتھ لے کر یہاں آئے تھے اب جا کر پھر دولت جمع کیجئے دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکال لیں گے۔''

موٹر تیز ہو گئی اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے

''دوڑو، دوڑو، ڈاکو مجھے لوٹے لیے جا رہے ہیں''

لیکن وہ ساری فریاد فریادِ صحرا تھی۔

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بڑے بھائی صاحب

پہلی بار: ہندی میں ''ہنس'' نومبر 1934ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں، 1936ء (زادِ راہ)

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے تھے انہوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں نے شروع کیا تھا۔۔۔ لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تا کہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے انہیں میری تنبیہہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اس میں تھی ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے تھے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کتاب پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے تھے کبھی کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا نہ کوئی معنی مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی، اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں دراصل بھائی بہن، رادھے شیام، شری جت، رادھے شیام ایک گھنٹے

تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس کے کوئی معنی نکالوں یعنی نا کام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ نویں جماعت میں تھے میں چھٹی جماعت میں تھا ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بار خاطر تھا موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آ جاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی تیلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا؟ کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر نیچے کودر ہے ہیں، کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزہ کر کرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے جلے لہجے میں کہتے ''اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جو چاہے پڑھ لے اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے، یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب جا کے کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ تم اتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے، میں کتنی محبت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا قصور ہے، تمہاری عقل کا قصور ہے اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے

ہیں، میں قریب نہیں پھٹکتا ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں اس پر بھی دو دو تین تین سال تک ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے رہو گے مگر تمہیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کیا۔ دادا کی گاڑھے پسینے کی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو"

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا جواب ہی کیا تھا، بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں جو کام میرے ہونے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا ٹائم ٹیبل بناتا صبح اٹھتا، منہ دھو کر ناشتہ کرتا پھر انگریزی مطالعہ سات آٹھ بجے تک حساب آٹھ سے نو بجے تک تاریخ نو سے ساڑھے نو بجے تک کھانا کھا کر اسکول جاتا ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس آکر آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر آدھ گھنٹہ آرام چھ سے ساڑھے آٹھ تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو بجے تک انگریزی نو سے دس تک اردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنالیتا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات پہلے ہی دن سے

اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی ،میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا،وہ دلاویز ہریالی وہ پرلطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور نصیحت کرنے کا موقع مل جاتا میں اس کے سایہ سے بھاگتا تھا۔ ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہوان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہو جاتی ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیری لٹکتی ہوئی معلوم ہوتی کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(2)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے، میں پاس ہو گیا، اپنے درجہ میں اول آیا۔میرے اور ان کے درمیان دوصرف دو درجوں کا تفاوت ہو گیا جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھ لوں، آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی؟ وہ اس قدر پژمردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑ کنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا، ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی۔۔۔۔صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔دل مضبوط تھا اگر انہوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کونسا تیر مار لیا ہے میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اول آ گیا زبان سے ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں بھائی صاحب

نے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے ''دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ اول میں تو اب تمہارے دماغ ہو گئے مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا تمہاری کیا ہستی ہے'' تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہو گا اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا یوں ہی پڑھ گئے محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا، راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا ایسے راجوں کو چکروتی کہتے ہیں آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکروتی راجہ نہیں کہہ سکتے راون چکروتی راجہ تھے مگر اس کا انجام کیا ہوا، غرور نے اس کا نام ونشان تک مٹا دیا، کوئی اسے ایک چلو پانی دینے والا نہ بچا انسان اور چاہے جو برائی کرے، غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہو گا اسے بھی غرور ہوا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا بھیک مانگ مانگ کر مر گیا تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے پڑھ چکے، یہ سمجھ تو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے اندھے کے ہاتھ میں بٹیر لگ گئی مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے، اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے، میرے فیل ہونے پر مت جاؤ میرے درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آ جائے گا جب الجبرا اور جیومیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان

کی تاریخ پڑھنی پڑے گی بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو ہنری ساتویں کی جگہ آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب ،صفر بھی نہ ملے گا صفر بھی! کس خیال میں ہو، درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے ان کم بختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے اور جیومیٹری تو بس خدا کی پناہ اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو، دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کون سا فرق ہے مگر محققوں کو کیا پرواہ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے چاہتے ہیں سب لڑکے رٹو ہو جائیں اس رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا؟ اس خط پر وہ عمور گرادو تو قاعدے عمود سے دوگنا ہوگا پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے گا آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین میں لکھتے پڑھتے ہیں، کہہ دیا ''وقت کی پابندی'' پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو رو کے کون نہیں جانتا وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھے؟ جو بات ایک جملہ میں کہی جاسکے اس کے لیے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت، میں تو اسے حماقت کہتا ہوں مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے چاہے جیسے لکھئے اور صفحے بھی پورے فلسکیپ سائز کے یہ لڑکوں پر ستم نا روا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو تیز بھی دوڑیئے اور آہستہ آہستہ بھی رہے متضاد ہے یا نہیں، بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی

تمیز نہیں اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں، میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور درجہ میں اول آ گئے ہو تو اتنا اتراتے ہو میرا کہنا مانئے لاکھ فیل ہو گیا لیکن تم سے بڑا ہوں دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے میرا کہنا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا، ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی مجھے آج کا کھانا بالکل بےمزہ معلوم ہوا جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے انہوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا یہی تعجب ہے لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی، کھیل کود کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(3)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بے چارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اول آ گیا مجھے خود جب معلوم ہوا بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی دس بجے رات تک ادھر چار بجے صبح سے، پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک، اسکول

جانے کے قبل چہرہ زرد ہو گیا تھا مگر فیل مجھے ان پر رحم آتا تھا نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر مجھے نصیحت کر سکیں گے لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے مجھے اسی وقت ناگوار لگتا ہے، ضرور مگر شاید ان کی تنبیہہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انہوں نے تحمل سے کام لیا شاید اب انہیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انہیں نہیں رہا یا رہا تو بہت کم، میری بد معاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہی ہو جاؤں گا پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں میں انہیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہوسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ

بھائی صاحب سے میری مڈبھیڑ ہوگئی شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے انہوں نے
وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے ان بازاری
لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لئے دوڑتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں
اس کا کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو بلکہ آٹھویں جماعت میں آ
گئے اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے
ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے میں
کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں
کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں بی اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے
پیروں ہیں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آ کر لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑ
رہے ہو افسوس ہے تمہاری اس ناعقلی پر، تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں لیکن وہ
ذہن کس کام کا جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں محض
ان سے ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انہیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے میں
تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے
آج تم میری جماعت میں آ جاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے
ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں
اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا، میں تم سے
پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس
کے برابر کبھی نہیں آ سکو گے، چاہے تم ایم اے اور ایل ایل بی ہی کیوں نہ ہو جاؤ
عقل کتابیں پڑھ لینے سے ہی نہیں آتی ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور

دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں، اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں یہ باتیں انہیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی باتیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے ہمارے خرچ کے لیے وہ کچھ بھیجتے ہیں، اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور اپنے کنبہ کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کر پاؤ گے میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر چشم نم کہا ہرگز نہیں، آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگالیا اور بولے کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا میرا جی بھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے خود بے راہ چلوں گا تو تمہیں ہدایت کیسے کروں یہ تو فرض میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اس وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گذرا اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لمبے تھے اچھل ک اس کی ڈور پکڑ لی اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

وفا کی دیوی

پہلی بار: 1934ء (مجموعہ آخری تحفہ)

اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

بڈھوں میں جو ایک طرح کی بے شرمی قریب قریب خلوص سے ملتی ہوئی پیدا ہو جاتی ہے وہ ''تلیا'' میں اس وقت تک نہ آئی تھی حالانکہ اس کے سر کے بال چاندی ہو گئے تھے، اور گال لٹک کر ڈاڑھوں کے نیچے آ گئے تھے لوگ اس کی عمر کا اندازہ سو سے اوپر کرتے تھے وہ خود تحقیق سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی، لیکن اب بھی وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتی تھی چلتی تھی تو سر ڈھانک کر، آنکھیں نیچی کیے ہوئے، گویا نویلی بہو ہے ذات کی چمارن تھی، لیکن کیا مجال کہ کسی غیر کے گھر کا پکوان دیکھ کر اس کا جی للچائے گاؤں میں اونچی نیچی ذاتوں کے بہت سے گھر تھے'' تلیا'' کی سب جگہ آمد و رفت تھی سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا اور عورتیں تو دل سے اس کے ساتھ عقیدت رکھتی تھی اسے اصرار کر کے اپنے گھر بلاتیں اس کے سر میں تیل ڈالتیں، مانگ میں سیندور بھرتیں، کوئی اچھی چیز پکائی ہوتی، جیسے پھلوڑیاں، کھیر یا حلوہ، تو اسے کھلانا چاہتیں لیکن بڑھیا کبھی نہ کھاتی تھی اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا چماروں کے ٹولے میں ایک آدمی بھی نہ تھا کچھ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، کچھ پلیگ اور ملیریا کی نذر ہو گئے، ان کے ماتم میں تھوڑے سے کھنڈر کھڑے تھے۔ برہنہ سر، چھاتی سی پیٹتے ہوئے صرف ''تلیا'' کی جھونپڑی

زندہ تھی اور ''تلیا'' حالانکہ ''تلیا'' مسافرت کا وہ حصہ طے کر چکی تھی، جہاں انسان تمام ظاہری اور مذہبی قیود سے نجات پا جاتا ہے اور اب اونچی ذات والوں کو بھی اس کی ذات کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا سب ہی اسے اپنے گھر میں گوشہ دینے کو تیار تھے، مگر وضعدار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے؟ کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت میں بٹہ لگائے؟ جس کی اس نے کبھی صورت نہ دیکھی تھی، صرف نام سنا تھا، ہاں صرف نام سنا تھا جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رو گٹھیلا نوجوان، شادی کے بعد وہ پورب کی طرف کمانے چلا گیا۔ سوچا تھا، ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے، اتنے دنوں کچھ نہ کچھ روپے جمع کر لیں اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں لیکن بیوی بالغ بھی ہوگئی، جوان بھی ہوگئی، بوڑھی بھی ہوگئی، وہ لوٹ کر نہ آیا اس کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا۔ خط کے لفافے کے اندر جواب کے لیے ایک لفافہ خالی بھی رکھا ہوتا تھا، یہی وہ رشتہ تھا جو ان میاں بیوی کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھا۔ خط میں وہ اپنی مجبوریوں اور بدنصیبی کا اظہار کرتا اور لکھتا، کیا کروں ''تو لا'' دل میں یہی ارمان ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا اپنی جھونپڑی آباد کر دیتا مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ ہے، اپنا کوئی بس نہیں ہے جب بھگوان لائیں گے تب آؤں گا تم صبر کرنا میرے جیتے جی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی تمہاری بانہہ پکڑی تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا جب آنکھیں بند ہو جائیں گی، تب کیا ہوگا کون جانے قریب قریب یہی مضمون الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا ہے اور یہ خط ''تلیا''

کے حرز جان تھے ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہو گیا بوسیدہ بے رنگ سیاہی تک اڑ گئی تھی کاغذ کا رنگ بھی اڑ گیا تھا مگر سب کے سب جوں کے توں اس پٹاری میں ایک لال ڈورے سے تہ بتہ بندھے ہوئے رکھے تھے ان خطوط کو پا کر ''تلیا'' کو بے اندازہ مسرت ہوتی اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے بار بار پڑھواتی اور بار بار روتی، اور اس دن ضرور سر میں تیل ڈالتی سیندور سے مانگ بھرواتی، رنگین ساڑی پہنتی اس کا سہاگ جاگ اٹھتا تھا بہوئیں مذاق سے پوچھتیں، کیوں ''تو لابوا'' تم نے پھوپھا کو دیکھا تو ہو گا، ان کی کچھ یاد آتی ہے اور تلیا کے پرشکن چہرے پر جوانی عود کر آتی، آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا، کہتی ''یاد کیوں نہیں آتی بیٹا ان کی صورت تو اب بھی میرے سامنے ہے بڑی بڑی آنکھیں لال لال اونچا ماتھا چوڑی چھاتی، ایسا تو اب یہاں کوئی بیٹھا بھی نہیں ہے موتیوں کے سے دانت تھے بیٹا، لال لال کرتا پہنے ہوئے تھے جب بیاہ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا میرے لیے بہت سے گہنے بنواؤ گے نا! نہیں تو میں تمہارے گھر نہ آؤں گی لڑکپن تھا بیٹا سرم لحاظ کچھ تھوڑے ہی تھا میری بات سن کر بڑے زور سے ہنسے اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر بولے'' میں تجھے گہنوں سے لاد دوں گا، تلیا کتنے گہنے پہنے گی تو، میں پردیس کمانے جاتا ہوں وہاں سے روپے بھیجوں گا تو بہت سے گہنے بنوانا، اور جب میں آؤں گا تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا'' میرا ڈولا گیا تھا بیٹا ماں باپ کی ایسی حیثیت کہاں تھی، انہیں برات کے ساتھ بلاتے انہیں کے گھر میرا ان سے بیاہ ہوا، اور ایک دن وہاں رہی اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسا بھائے کہ جب وہ

چلنے لگے تو ان کے گلے لپٹ کر روتی تھی اور کہتی تھی'' مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، میں تمہارا کھانا پکاؤں گی، تمہاری کھاٹ بچھاؤں گی وہاں انہیں کے عمر کے دو تین آدمی اور بیٹھے تھے انہیں کے سامنے وہ مسکرا کر میرے کان میں بولے اور میرے ساتھ سوئے گی نہیں، بس میں ان کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی اور بولی '' گالی دو گے تو کہے دیتی ہوں ہاں''

لاکھوں ہی بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل چکے تھے، مگر اس کے لیے وہ ہمیشہ تازہ تھے، اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ، جہاں ہوا کا گزر نہ تھا ان میں وہی لطافت تھی، وہی لذت، وہی شیرینی، آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا! کھلا پڑتا تھا گھونگھٹ نکال کر، بھاؤ بنا کر، منہ پھیر کر، اور ایک دل آویز تبسم کے ساتھ دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی وہ اس واقعہ کو بیان کرتی، جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھا شبنم میں کھلے ہوئے پھول کی طرح دل آویز، وہ پھول اب بھی تازہ تھا اس میں وہی خوشنمائی، وہی خوشبو، واقعاتی زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک تمنا ابھی تک تمنا کی سرخوشیوں اور کیفیتوں سے مرصع تھی جسے کشاکش حیات نے بے جان نہ کر پایا تھا۔

(2)

تلیا کسی زمانہ میں حسین تھی، قاتل تھی اور اپنے کشتگان ناز کی دردبھری داستانیں جب وہ بہ چشم پرنم، کہتی تو شاید کشتگوں کی روحیں عالم زیریں، عالم بالا

میں وجد کرتی ہوں گی زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی انہیں پر ہمدردی اور وفا کے پھول نثار کرتی تھی اس کی اٹھتی ہوئی جوانی تھی، ماں باپ رخصت ہو گئے تھے بھائی بھی پردیس چلا گیا، وہ گھر میں اکیلی رہ گئی وہ جدھر سے نکل جاتی تھی نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے تب بنسی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا بڑا چھیلا بڑا رسیا، دن میں سینکڑوں بار اس کے گھر کا چکر لگاتا تالاب کے کنارے کھیت میں، کھلیان، کنویں پر جہاں وہ جاتی، سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا کبھی دودھ لے کر اس کے گھر جاتا، کبھی گھی لے کر، کبھی ساڑیاں لے کر، کہتا ''تلیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا تو میری بھینٹ لے لے تو مجھ سے بولنا نہیں چاہتی، مت بول میری صورت دیکھنا نہیں چاہتی مت دیکھ، لیکن جو کچھ میں لاؤں اسے لے لے بس اسی سے میرا دل بھر جائے گا۔'' بھولی بھالی تلیا ایسی انجان نہ تھی جانتی تھی یہ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی باتیں ہیں۔۔۔لیکن نہ جانے کیسے وہ اس کے دھوکے میں آ گئی نہیں دھوکے میں نہیں آئی اسے اس کی جوانی پر ترس آیا ایک دن وہ پکے ہوئے قلمی آم لایا تلیا نے اپنی زندگی میں قلمی آم نہ کھائے تھے آم اس سے لے لیے پھر تو روزانہ آم کے ٹوکرے آنے لگے اور آم لے کر بنسی سنگھ خود آتا اور چھپ کر رات کو آتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے گاؤں میں شور مچ جائے گا ایک دن جب تلیا آم کی ٹوکری لے کر گھر میں جانے لگی تو بنسی سنگھ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور چٹ اس کے پیروں پر گر پڑا اور رو لا ''تلیا اگر اب بھی تجھے مجھ پر دیا نہیں آتی تو آج مجھے مار ڈال اپنے ہاتھوں سے مار ڈال'' تلیا نے آم کی ٹوکری پٹک دی اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کی

طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی ''اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں نہ رہوں گی آموں میں آگ لگے اور تم کو کیا کہوں میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے، اسی لیے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں؟ وہ مرد ہے چار پیسہ کماتا ہے کیا وہ دوسری نہ رکھ سکتا تھا عورتوں کی سنسار میں کمی ہے، لیکن وہ میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے مرد ہو کر بیٹھا ہوا ہے تم سے کم پٹھا نہیں ہے تمہارے جیسا سندر چاہے نہ ہو، پڑھو گے اس کی چٹھیاں وہ جو میرے نام بھیجتا ہے آپ چاہے جس حال میں ہو، میں کون یہاں بیٹھی دیکھتی ہوں، لیکن ہر تیسرے مہینے میرے لیے روپے بھیج دیتا ہے اسی لیے کہ میں دوسروں سے یہاں بہار کروں؟ وہ ایک پیسہ بھی نہ بھیجے، لیکن جب تک وہ ایسی پریم سے بھری چٹھیاں بھیجتا رہے گا، جب تک وہ مجھ کو اپنی اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا تلیا اس کی رہے گی دل میں بھی دکھاوے میں بھی جب اس سے میرا بیاہ ہوا ہے، تب میں پانچ برس کی الھڑ چھوکری تھی تمہارے دروازے پر جاتی تھی ستم دھتکار دیتے تھے اس نے میرے ساتھ کیا سکھ اٹھایا جو میرے لیے اتنا کر رہا ہے بس ایک بانہہ پکڑنے کی لاج کو نبھا رہا ہے، تو میں عورت ہو کر اس کے ساتھ دغا کروں''

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چٹھیوں کی پٹاری لا کر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی، مگر ٹھاکر کو چٹھیوں کے پڑھنے کا ہوش کہاں تھا آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا ہونٹ پچکے جا رہے تھے، چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا، تولا! میں نے تم کو پہچانا نہ تھا اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو اسی

وقت مار ڈالو، ایسے روسیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا بس اب یہی آرزو ہے کہ تمہارے ہاتھوں قتل ہو جاؤں"

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کیے جاتا ہے جھلا کر بولی "مرنے کو جی چاہتا ہے تو مر جاؤ کیا دنیا میں کنویں تالاب نہیں یا تمہارے پاس تلوار کٹار نہیں ہے میں کسی کو کیوں ماروں"

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا "تو تمہارا یہی حکم ہے؟"

"میرا حکم کیوں ہونے لگا مرنے والے کسی سے حکم نہیں لیتے"

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی کسی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ڈوب گیا یہی خیال آیا ہوگا پاؤں پھسل گیا ہوگا کئی دن تک کیا کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا تلیا نے زبان تک نہ کھولی ٹھاکر کے مرتے ہی بھائی نے جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگا دیورانی طعنے دیتی، دیور عیب لگاتا آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آ کر بچے کو لے کر گھر سے نکل پڑی رات کا وقت تھا تلیا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی لالٹین جلا رہی تھی ارزیانی کے دن تھے سہ ماہی تین روپے میں اس کی بڑی فراغت سے گزر ہوتی تھی جو وہ کھاتی اور پہنتی تھی وہ ٹھکرانیوں کو بھی نصیب نہ تھا گائے پالی تھی، اسی کو روٹی کھلانے نکلی تھی کہ اس نے ٹھکرائن کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا ٹھکرائن سسکتی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی تین سال کا بچہ گود میں تھا۔

تلیا نے پوچھا "اس وقت کہاں جاتی ہو ٹھکرائن، سنو، سنو، کیا بات ہے تم تو رو رہی ہو"

ٹھکرائن جارہی تھی مگر کہاں، یہ اسے خود معلوم نہ تھا وہ یہاں رہنا نہ چاہتی تھی، اور اپنے بچے کی جان کا خوف تھا ان دنوں یہ پولیس کی تحقیقاتیں کہاں تھیں دیور اسے اور اس کے بچے کو مار ڈالتا کسی کو خبر بھی نہ ہوتی مگر اس چمارن سے اپنا دکھڑا کیسے کہے آخر تھی ٹھکرائن، ایک بار تلیا کی طرف دیکھا اور بلا کچھ جواب دیے آگے بڑھی جواب کیسے دیتی گلے میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت نہ جانے کیوں اور زیادہ امنڈ آئے تھے۔

تلیا نے گائے کے سامنے روٹی پھینکی، لوٹے سے ہاتھ دھویا، اور قریب آ کر بولی ''جب تک مجھے نہ بتا دو گی کہاں جارہی ہو میں تمہیں آگے ایک قدم نہ جانے دوں گی''

ٹھکرائن رک گئی، اور آنسو بھری آنکھوں میں غصہ بھر کر بولی ''تو کیا کرے گی پوچھ کر، تجھ سے کیا مطلب؟''

''مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں، میں تمہارے گاؤں میں نہیں رہتی؟ گاؤں والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں نہ ساتھ دیں گے تو کون دے گا''

''اس زمانہ میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے تلیا اپنے جب گھر والوں نے ساتھ نہ دیا اور تیرے بھیا کے مرتے ہی میرے خون کے پیاسے ہو گئے، تو پھر میں کس سے امید رکھوں کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی؟ تجھ سے کیا چھپا ہے، وہاں نائن، کہارن کے لیے روٹیاں ہیں اور میرے لیے نہیں ہیں، اور لاتوں کی ماری روٹیاں کون کھائے میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی اپنا حق مانگتی ہوں، میں رکھیلی نہیں ہوں، اڑھری نہیں ہوں، بیاہتا ہوں دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ میں بیاہ

کے آئی ہوں، اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی آج کوئی نہ دے، میں اناتھ ہوں، لیکن چاہے میری آبرو جائے ان کو مٹا کے چھوڑوں گی، اور اپنا حصہ لے کر رہوں گی''

''تیرے بھیا'' یہ دو لفظ تلیا کو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے لگایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، ''تو بہن میرے گھر میں چل کر رہو کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تلیا مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے گی، میرا گھر تمہارے رہنے کے لائق نہیں ہے، اور میں کتنی ہی غریب ہوں لیکن تمہاری بہن تو ہوں''

ٹھکرائن نے اس کے چہرے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا ''ایسا نہ ہو میرے پیچھے میرا دیور تمہارا دشمن ہو جائے''

تلیا نے دلیرانہ انداز سے کہا ''میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی اور پھر ان سے کہنے ہی کون جاتا ہے اور تم پردہ میں رہتی ہی ہو''

ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آ کر بیٹھ گئی وہاں ایک ہی گھاٹ تھی تلیا نے اس پر بچے کو لٹا دیا، چمارن کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے؟ کیسے پانی پئے؟ تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن بھانڈے لائی اور ٹھکرائن کے لیے ایک کوٹھری الگ کر دی ٹھکرائن مغرور تھی، آرام پسند تھی، مگر دھن کی پوری تلیا اس کے برتن دھوتی، اس کے کپڑے صاف کرتی، اس کا بچہ کھلاتی، ٹھکرائن اس طرح کام لیتی تھی گویا وہ اس کی لونڈی ہے، لیکن تلیا کشتۂ ناعاشق کے ساتھ وفا کا نباہ کر رہی تھی اس کا من کبھی نہ میلا ہوتا، ماتھے پر کبھی نہ بل پڑتا۔

ایک دن ٹھکرائن نے کہا ''تو لاتم بچے کو دیکھتی رہنا میں چار دن کے لیے ذرا باہر جاؤں گی اس طرح تو یہاں زندگی بھر پڑی رہوں گی، مگر دل کی آگ نہ ٹھنڈی

ہو گی اس بے حیا کو شرم کہاں کہ بھاوج کسی غیر کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہے وہ تو اسی کوشش میں ہے کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلوا دے اور ممکن ہو تو بدنام کر دے اتنے دم تو آرام کر چکی، اب کچھ کام بھی کرنا چاہیے۔''

تلیا نے پوچھا ''کہاں جانا چاہتی ہو بہن کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلوں اکیلی کہاں جاؤ گی؟''

''اس سانپ کو کچلنے کے لیے کسی کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا''

''وہ مدد کہاں ملے گی؟''

''میں جانتی ہوں اور پھر تجھ سے کیا چھپاؤں؟ میں اپنے روپ کے جادو سے ان کا گھمنڈ توڑ دوں گی میرے پاس دوسرا کون ہتھیار ہے میں جوان ہوں اور ایسی بری بھی نہیں ہوں میں آج اپنا روپ بیچنے پر آ جاؤں تو جانتی ہوں اس کے دام کیا ہوں گے، اس بھیڑیے کا سر، اور میں نے یہی طے کیا ہے اس پرگنہ کا حاکم جو کوئی بھی ہو اسی پر میرا جادو چلے گا اور ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو کسی خوبصورت عورت کے جادو سے بچ سکے، چاہے وہ اسی سال کا بڈھا ہی کیوں نہ ہو چاہے وہ رشی ہی کیوں نہ ہو دھرم جاتا ہے جائے، مجھے پروا نہیں ہے میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ میں بن بن کی پتیاں توڑوں اور وہ شہدا مونچھوں پر تاؤ دے کر راج کرے، اور یہ کل تین چار دن کا کام ہے تلیا کل تین چار دن کا کام، تو بچے کی دیکھ بھال کرنا بچہ تجھ سے ہلا ہوا بھی ہے، میرے لیے بہت نہ ہرائے گا، کوئی پوچھے کہاں گئی؟ تو کہہ دینا میکے چلی گئی۔''

تلیا کو معلوم ہوا اس خود دار عورت کے دل پر کتنی گہری چوٹ ہے اس جلن کو مٹانے کے لیے وہ جان پر نہیں کھیل رہی ہے دھرم پر کھیل رہی ہے جسے وہ جان

سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے بنسی سنگھ کی وہ صورت التجا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہوگئی وہ طاقتور تھا، اپنے فولادی قویٰ سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کرسکتا تھا اور اس رات کے سناٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا؟ مگر اس کی اس عفت آمیز تنبیہہ نے بنسی سنگھ کو کس طرح رام کرلیا گویا کوئی خونخوار اژدہا سریلا راگ سن کرمست ہوگیا اور اپنی خونی ارادہ ترک کرکے اس کی تالوں پر ناچنے لگا، اسی سچے سورما کی آبرو آج خطرہ میں ہے۔ کیا تلیا اس آبرو کو مٹنے دے گی اور خاموش بیٹھی رہے گی نہیں نہیں نہیں۔

بنسی سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط، وہ مردانہ تحمل، وہ ذوق شہادت، وہ سچا عشق وہ اپنی شمع حیات کو بجھا کو سوز نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا شجاعانہ عمل، وہ اس کے فیصلہ پر جان نثار کردینے کا جذبہ نیاز، نہیں بنسی سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آبرو سے زیادہ عزیز ثابت کردے گی اپنی سحر طرازیوں سے اپنی محبت نوازیوں سے اپنی شیریں اداؤں سے، اپنی عصمت کو گوشہ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے، وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا ''ابھی تم مت جاؤ بہن مت جاو! پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا تمہاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔''

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور مسکرائی، اس نے کہا ''تو یہ فن کیا جانے تلیا۔''

''کون سا فن؟''

''یہی مردوں کو الو بنانے کا''

''یہ فن سبھی عورتوں کو آتا ہے، بہن کہیں سیکھنے جانے کا کام نہیں''

''اچھا تو بتاؤ کیا کرو گی؟''

''وہی جو تم کرنے جا رہی ہو تم حاکم پرگنہ پر اپنا جادو ڈالنا چاہتی ہو میں تمہارے دیو پر جادو ڈالوں گی۔''

''بڑا گھاگھ ہے''

''گھاگھوں کو پھانسنا اور بھی زیادہ آسان ہے''

(3)

تلیا نے آزمودہ کار جنرل کی طرح جارحانہ عمل اور مدافعت اور مراجعت کے نقشے تیار کیے، اور تسخیر کی تیاریاں کرنے لگی عمل کے مدراج اور کامیابی کی منزل جتنی صفائی سے اسے نظر آتی تھی، شاید سکندر یا نوپلین کو بھی نظر نہ آئے گی پیش بندی کے لیے اس نے مدافعت اور مراجت کے پہلو بھی سوچ لیے، مگر اسے اس میں شک نہ تھا کہ یہ ''بڑھے چلو'' والی جنگ ہو گی، غنیم بالکل بے خبر تھے، بالکل غیر مسلح اور اس فن حرب سے بالکل غیر معروف۔

بنسی سنگھ کا چھوٹا بھائی گردھر کندھے پر چھ فٹ کا موٹا ڈنڈا رکھے اکڑتا ہوا چلا آتا تھا کہ تلیا نے پکارا ''ٹھاکر جرا یہ گھاس کا گٹھا اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو مجھ سے نہیں اٹھتا''

اندھیرا ہو گیا تھا کسان اپنے اپنے کھیتوں سے لوٹ کر گھر آ چکے تھے راستے میں سناٹا تھا۔ اس وقت تلیا کا آنچل کھسک گیا اور سرخ چولی کے اندر کا ابھار چھلک پڑا تلیا نے جھٹ آنچل سنبھال لیا، مگر اس کوشش میں اس کا سر کھل گیا اور اس کے جوڑے میں گتھی ہوئی پھولوں کی بنی بجلی کی طرح آنکھوں کوندگئی۔ گردھر پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی اعلیٰ اور ادنیٰ امتیاز مٹ گیا آنکھوں میں ہلکا سا نشہ نمودار ہوا اور چہرہ پر ہلکی سی سرخی اور خفیف سا تبسم رگ رگ میں نغمہ سا گونج گیا۔

اس نے تلیا کو ہزاروں بار دیکھا تھا آرزو اور التجا کی آنکھوں سے، مگر تلیا اپنے حسن اور عصمت کے غرور میں اس کی طرف کبھی مخاطب نہ ہوئی تھی اس کے انداز و بشرے میں کچھ ایسی بے نیازی کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے حوصلے پست ہو جاتے تھے سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا آسمان پر اڑنے والے طائر پر اس کے لاسے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا کہ بھوکا ہے پھر کیوں نہ وہ دانہ اور جال لے کر دوڑے۔

اس نے مخمور ہو کر کہا ''میں پہنچائے دیتا ہوں تلیا تو کیوں سر اٹھائے''

تلیا نے شکار پر وار کیا، ''اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے گا کہ ٹھاکر کو کیا ہو گیا ہے''

''مجھے کتوں کے بھونکنے کی پروا نہیں''

''لیکن مجھے تو ہے''

ٹھاکر نے نہ مانا گٹھا سر پر رکھ لیا اور اس طرح چلا گویا کونین کا خزانہ لیے جاتا ہو۔

(4)

ایک مہینہ گزر گیا تلیا ٹھاکر پر موہنی ڈال رہی تھی، اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی کبھی ڈھیلی کر دیتی کبھی کھینچ لیتی لگاوٹ بازی بھی تھی اور پرہیز بھی اور ٹھاکر کی آتش شوق تیز تر ہوتی جاتی تھی اپنا ایمان اور دھرم سب کچھ فنا کر کے بھی وہ حصول مدعا کے قریب نہ آیا تھا تلیا آج بھی اس سے اتنی دور ہی دور تھی، جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا ”اس طرح کب تک جلائے گی تلیا، چل کہیں بھاگ چلیں“

تلیا نے پھندے کو اور کسا ”ہاں اور کیا جب تم منہ پھیر لو تو کسی کام کی نہ رہوں گی دین سے بھی جاؤں دنیا سے بھی“

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا ”اب بھی تجھے مجھ پر وشواس نہیں آتا“

”بھنورے پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں“

”اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں“

”بتاؤ کیسے؟“

”میں نے تیرا کوئی حکم ٹالا ہے“

تم سمجھتے ہو گے تلیا کو ایک رنگین ساڑی اور دو ایک موٹے گہنے دے کر پھنسا لوں گا، میں ایسی انیلی نہیں ہوں

تلیا نے ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ لی، ٹھاکر حیرت میں آکر اسی کے منہ کی

طرف تکنے لگا۔

تلیا نے پھر کہا ''آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے، تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانہ کر لیتا ہے، ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا، تو چل، میرے گھر میں مالکن بن کر رہ''

تلیا آنکھیں مٹکا کر بولی ''آج مالکن بن کر رہوں اور کل لونڈی بن کر بھی رہنے نہ پاؤں کیوں؟''

''تو جس طرح تیرا دل بھرے وہ کر، میں تیرا غلام ہوں''

''بچن دیتے ہو''

''ہاں دیتا ہوں''

''پھر تو نہ جاؤ گے؟''

''بچن دے کر پھر جانا مردوں کا کام نہیں''

''تو اپنی آدھی جمین جائیداد میرے نام لکھ دو''

ٹھاکر اپنے گھر میں ایک کوٹھری، دس پانچ بیگھے کھیت، گہنے کپڑے اور اپنی عزت کو اس کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا لیکن آدھی جائیداد اس کے نام منتقل کرنے کی اس میں ہمت اس لیے نہ تھی، کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے عورت کا کیا اعتبار اسے یہ گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے اتنا سنگین فیصلہ کرے گی اسے تلیا پر غصہ آیا، یہ چمارن ذات ذرا سندر کیا ہو گئی ہے کہ سمجھتی ہے کہ میں اپسرا ہوں اس کی محبت ایک بے تاب خواہش تھی وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حال سمجھتی ہے، اس میں نہ تھی۔

اس نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا میں جانتا ہوں کہ تجھے میری زمین جائیداد ہی سے محبت ہے تلیا مجھ سے نہیں۔

تلیا نے برجستہ جواب دیا تو کیا میں نہ جانتی تھی کہ تمہیں میرے روپ اور جوانی ہی سے محبت ہے مجھ سے نہیں

''تو محبت کو بازار کا سودا سمجھتی ہے''

''ہاں سمجھتی ہوں'' تمہارے لیے محبت چار دن کا تماشا ہوگی، میں تو کہیں کی نہ رہوں گی میں اپنا سب کچھ تمہیں دے رہی ہوں، تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا چاہتی ہوں تمہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو آدھی کیا ساری جائیداد میرے نام لکھ دیتے لیکن تمہاری نیت معلوم ہوگئی، ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سمے آئے لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے اگر کوئی سمے آیا کہ تمہارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھائے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔

تلیا جھلائی ہوئی وہاں سے چلی گئی، مگر مایوس نہ تھی، نہ بے دل، آگے کیا ہونے والا ہے اس کے متعلق اسے مطلق شبہ نہ تھا۔

ٹھاکر نے جائیداد تو اپنی دانست میں بچالی تھی، مگر بڑے مہنگے داموں اس کا اطمینان قلب رخصت ہو چکا تھا۔ زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا جائیداد آنکھوں کے سامنے تھی، تلیا دل کے اندر، روز سامنے آکر بیٹھنے والی تلیا، اب آرزو تھی جو حقیقت سے کہیں زیادہ دلآویز ہے، نشہ خیز ہے۔

تلیا اسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آجاتی اور خواب کی ہی طرح غائب ہو جاتی گر دھر اس سے اپنا دردِ دل کہنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا لیکن تلیا

اس کے سایہ سے بھی پرہیز کرتی۔ گردھر کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لیے اس کی زمین کے مقابلہ میں تلیا کہیں زیادہ لازمی ہے۔ اسے تنگ ظرفی پر غصہ آتا، زمین اور جائیداد کیا تلیا کے نام رہی کیا اس کے نام اس ذرا سی بات میں کیا رکھا ہے، تلیا تو اس وقت کے لیے پیش بندی کر رہی تھی جب میں اس کے ساتھ بے وفائی کرتا جب میں اس کا بن کوڑی غلام ہوں تو بے وفائی کیسی؟ میں اس کے ساتھ بے وفائی کروں گا، جس کی ایک نگاہ کرم کے لیے ترستا رہتا ہوں، کاش وہ ایک بار مل جاتی اس سے کہہ دیتا تو لا میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے کہو نام لکھ دوں، کہو بیعنامہ لکھ دوں، مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کے لیے نادم ہوں جائیداد سے انسان کو جو ایک رواجی الفت ہے اسی کے زیر اثر میں نے وہ حماقت کی تھی اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں وہی چیز سب سے بیش قیمت ہے، جس سے زندگی میں کیف اور سرور پیدا ہوا اگر فقر اور بے نوائی میں سرور حاصل ہو تو وہی سب سے بیش قیمت ہے جس پر زمین اور ملکیت سب کچھ قربان کر دی جاتی ہے آج بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو دنیا کی نعمتوں پر لات مار کر جنگل بیابان کی سیر کرنے میں مست ہیں اور اس وقت میں اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا ہائے میری کمبختی۔

(5)

ایک دن ٹھاکر کے پاس تلیا نے پیغام بھیجا ''میں بیمار ہوں، آ کر مجھے دیکھ جاؤ

کون جانے بچوں کہ نہ بچوں"

رات کے دس بجے ہوں گے ٹھاکر نے سنا اور دوڑا، اس کی چھاتی دھڑک رہی تھی اور سر اڑا جاتا تھا تلیا بیمار ہے، تلیا اس کی آنکھوں سے دور تھی، لیکن دل میں بسی ہوئی اور دل و جان سے بھی زیادہ عزیز دل تو محض اس کا مکان تھا اور وہ تلیا بیمار ہے کیا ہوگا بھگوان! تم مجھے کیوں نہیں بیمار کر لیتے میں تو اس کی جگہ مرنے کو تیار ہوں تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لمحہ خوفناک ہو جاتی تھی اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے کہا ہے کہ آ کر دیکھ جاؤ کون جانے بچوں کہ نہ بچوں تو اگر نہ بچے گی تلیا میں بھی نہ بچوں گا دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا اور تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں قدم رکھا تلیا اپنی کھاٹ پر ایک چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی اور اس نیم تاریکی میں جاں بلب معلوم ہو رہی تھی گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی، اشک میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا، "تلیا بدنصیب تمہارے قدموں پر پڑا ہوا ہے"

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز سے بولی "تم ہو، گردھو سنگھ تم آ گئے، اب میں آرام سے مروں گی تمہیں ایک بار دیکھنے کے لیے جی بہت بے چین تھا میرا کہا ما پھ کر دینا اور میرے لیے رونا مت اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر یہ تو مٹی میں مل جائے گا لیکن میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی پرچھائیں کی طرح سدا تمہارے ساتھ رہوں گی تم مجھے نہ دیکھ سکو گے، میری باتیں سن نہیں سکو گے لیکن تلیا آٹھوں پہر، سوتے جاگتے تمہارے ساتھ رہے گی، میرے لیے اپنے آپ کو

بدنام مت کرنا گردھر کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔"

گردھر زاروقطار رو رہا تھا ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔

تلیا نے ذرا دم لے کر پھر کہا"میں بچوں گی نہیں گردھر تم سے ایک منتی کرتی ہوں مانو گے گردھو نے چھاتی ٹھونک کر کہا"اب جیوں گا تو اس لیے کہ تیرا حکم پورا کروں نہیں اس جندگی میں کیا رکھا ہے۔

اسے ایسا معلوم ہوا کہ تلیا مسکرائی

"نہے نہیں ایسا مت کہو تمہارے بال بچے ہیں، ان کی پرورش کرنا اور مجھے بھول جانا میری یہی بنتی ہے کہ اپنی بھابی کو اس کے بچے کو اسی طرح رکھنا جیسے وہ بنسی سنگھ کے سامنے رہتی تھیں ان کا آدھا حصہ انھیں دے دینا"

گردھر بولا"لیکن بھاوج تو دو مہینے سے اپنے میکے میں ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ اب کبھی نہ آؤں گی"

"یہ تم نے برا کیا ہے، گردھر بہت برا اب میں سمجھی کہ کیوں مجھے برے برے سپنے آرہے تھے؟ اگر چاہتے ہو کہ میں جی اٹھوں تو جلدی لکھا پڑی کر کے کاغذ میرے پاس رکھ دو تمہاری بے انصافی ہی میری جان کی گاہک ہو رہی ہے اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری بھاوج کیوں بار بار مجھے سپنے میں دکھائی دیتی ہے اور بنسی سنگھ کیوں مجھ سے سپنے میں کہتے تھے، گردھر نے میری مکت بگاڑ دی بس اب جاؤ گردھر اور لکھا پڑی کر کے کاغذ لاؤ دیر کی تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے"

گردھر نے دبی زبان سے کہا"لیکن رات کو کیسے لکھا پڑھی ہو گی، اسٹامپ

کہاں ملے گا؟ لکھے گا کون؟ گواہ کہاں ہیں بتلاؤ؟''

''کل سانجھ تک یہ کام کرلو گے، تو میں بچ جاؤں گی گردھو، بنسی سنگھ مجھے لگے ہوئے ہیں وہی مجھے ستا رہے ہیں وہی میری جان لے رہے ہیں''

''اگر تو نے دیر کی تو تلیا مر جائے گی''

''میں کل سانجھ تک آ جاؤں گا تلیا تیرا حکم سر اور آنکھوں پر لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ۔۔۔''

''نہیں نہیں میں کل سانجھ تک نہیں مروں گی اس کا وشواس رکھو''

گردھرا اسی وقت وہاں سے نکلا راتوں رات پچیس کوس کی منزل طے کرکے صدر پہنچا وکیلوں سے مشورہ کیا، اسٹامپ لیا بھاوج کے نام آدھی جائیداد منتقل کرائی اور چراغ جلتے جلتے حیران و پریشان، تھکن سے چور، امید و بیم سے معمور آکر تلیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا ''تم آ گئے گردھر کام کر آئے''

گردھر نے کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کہا ''ہاں تلیا کر آیا اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمہارے ساتھ گردھر کی بھی جان جائے گی''

تلیا اٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرہانے رکھ کر بولی ''میں بہت اچھی ہوں گردھو، تم جب رات یہاں سے چلے گئے تب ہی سے میری طبیعت سنبھلنے لگی، اور اب میں اچھی ہوں سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی، لیکن ابھی میں سو گئی تھی اور بنسی سنگھ مجھ سپنے میں کہہ رہے تھے'' تلیا تو بیاہتا ہے تیرا آدمی کوسوں دور بیٹھا ہوا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے چاہتا تو دوسری کر لیتا۔

لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے اور جنم بھر بیٹھا رہے گا اگر تو نے اس سے دگا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا تو نے اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا اسی دن میں تیری جان لے لوں گا بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اس وقت ایک روحانی جلال سا چمک رہا تھا اور دفعتاً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور ساری سازش سمجھ میں آ گئی، اس نے سچی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا اور بولا "سمجھ گیا تلیا تو دیوی ہے"

☆☆☆☆☆

قاتل

پہلی بار: کتابی صورت میں 1934ء (آخری تحفہ)

اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کی اطلاع نہیں

جاڑوں کی رات تھی دس بجے ہی سڑکیں بند ہو گئی تھیں اور گلیوں میں سناٹا تھا بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نوجوان بیٹے دھرم ویر کے سامنے تھالی پروستے ہوئے کہا ”تم رات تک کہاں رہتے ہو بیٹا! رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے چاروں طرف سوتا پڑ گیا آگ بھی تو اتنی نہیں رہتی، کہ اتنی رات تک بیٹھی تاپتی رہوں“

دھرم ویر شکیل وتوانا نوجوان تھا تھالی کھینچتا ہوا بولا ابھی تو دس بھی نہیں بجے اماں! یہاں کے مردہ دل آدمی سر شام ہی سو جائیں تو کوئی کیا کرے یورپ میں لوگ بارہ ایک بجے تک سیر وتفریح کرتے رہتے ہیں زندگی کے لطف اٹھانا کوئی ان سے سیکھ لے ایک بجے سے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں۔

ماں نے پوچھا ”تو آٹھ دس بجے سو کر اٹھتے بھی ہوں گے“

دھرم ویر نے پہلو بچا کر کہا ”نہیں اٹھتے وہ چھ بجے ہی اٹھ بیٹھتے ہیں ہم لوگ بہت سونے کے عادی ہیں دس سے چھ بجے تک آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے آدمی سوئے تو کام کیا کرے گا؟ یہ بالکل غلط ہے کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیے انسان جتنا کم سوئے اتنا ہی اچھا ہماری سبھا نے اپنے دستور العمل میں داخل کر لیا ہے کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہیے۔

ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ، یہ نہ پہنو، وہ نہ پہنو، نہ بیاہ کرو نہ شادی کرو نہ نوکری کرو، نہ چاکری کرو یہ سبھا کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑے گی اتنا تیاگ تو سنیاسی ہی کر سکتا ہے تیاگی سنیاسی بھی تو نہیں ملتے ان میں بھی زیادہ تر نفس کے بندے، نام کے تیاگی ہیں۔ آج سونے کی قید بھی لگا دی ابھی تین مہینے کی سیاحت ختم ہوئی ہے جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں اب بارہ بجے کھایئے یا کون جانے رات کو کھانا ہی اڑا دیں اعتراض کے لہجہ میں بولی" جب ہی یہ صورت نکل آئی ہے کہ چاہو تو ایک ہڈی گن لو آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں یا محض آدمیوں پر قیدیں ہی لگایا کرتے ہیں؟

دھرم ویر بولا: "جو کام تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے"

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا تب سے یہ بیوہ عفت آئینہ خلوص و انہماک سے خدمت قوم میں مصروف تھی۔ شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضا کاروں میں شامل ہو گیا تھا مگر ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک ہو گیا اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے مشتبہ انداز سے پوچھا "تو تمہاری سبھا کا بھی کوئی دفتر ہے؟"

"ہاں ہے"

"اس میں کتنے ممبر ہیں؟"

”ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کر سکتے ہیں وہ تمہارے پچیس ہزار بھی نہیں کر سکتے دیکھو اماں! کسی سے مت کہنا ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی مجھے امید نہیں، کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے ایک آدمی نے کہا یوں سوراجیہ مل جائے گا بس آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لیے وہ آدمی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہو لیں کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں مگر مجھے تو یہ طرز عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھولنے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں وہ ان لوگوں کو مل جائے گا اصلی چیز جب ہی ملے گی، جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔“

ماں نے کہا ”اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں؟ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائیدادیں نہیں ضبط کرائیں؟“

دھرم ویر: اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انہیں یقین ہو جائے گا، کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیے جائیں تو آج ہی سوراجیہ مل جائے روس اسی طرح آزاد ہوا نا گالینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا اور کوئی طریقہ نہیں ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے ایک گورے

افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اسے بیوہ ہوئے دس سال ہو گئے تھے یہی ہی لڑکا اس کی زندگی کا سہارا ہے اسی کو سینہ سے لگائے محنت مزدوری رک کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے وہ اس خیال سے خوش تھی، کہ یہ چار پیسے کمائے گا گھر میں بہو آئے گی ایک ٹکڑا کھاؤں گی اور پڑی رہوں گی آرزوؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اس نے ایک کشتی بنائی تھی اور اس پر بیٹھ کر زندگی کے دریا کو پار کر رہی تھی وہ کشتی اب اسے لہروں میں جھولے کھاتی معلوم ہوئی اسے ایسا افسوس ہوا کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جا رہی ہے اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

بیٹا، تم کیسی باتیں کر رہے ہو، کیا تم سمجھتے ہو، انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے؟ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں اگر یہ طرز حکومت ہمارے بندوں ہی کے ہاتھ میں ہو اور اس کا بہت بڑا حصہ ہے بھی تو ہم اس کی بھی اسی طرح مخالفت کریں گے روس میں تو کوئی دوسری قوم راج نہ کرتی تھی پھر بھی روس والوں نے اس حکومت کو اکھاڑ پھینکا تو اس کا سبب یہی ہی تھا، کہ زار رعایا کی پروانہ کرتا تھا، امرا مزے اڑاتے تھے غریبوں کو پیسا جاتا تھا یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو وہی حال ہمارا ہے یہاں ایک ایک عہدے دار ایک ہزار غریبوں کا حصہ کھا جاتا ہے ملک کی دولت ایک نہ ایک بہانے نکلتی چلی جاتی ہے اور ہم غریب ہوتے جاتے ہیں ہم اس غیر آئینہ حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں، اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو خواہ مخواہ آگ میں نہ کودو

میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ۔

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا بولا ''اس کا کوئی خوف نہیں ہم نے اس کے متعلق کافی احتیاط کرلی ہے گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے ہم لوگ ایسی حکمت سے کام کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی گرفتار نہ ہو''

ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی بولی ''یہ تو اس سے بھی بدتر ہے بے گناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں یہ شرمناک حرکت ہے میں اسے کمینہ پن سمجھتی ہوں کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغابازی ہے مگر اپنے بے گناہ بھائیوں کو پھنسا دینا قوم فروشی ہے ان بے گناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہوگا۔''

دھرم ویر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا ''اماں'' تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں تم اپنے دھرنے دیے جاؤ جلوس نکالے جاؤ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں کرنے دو گناہ اور ثواب، پاپ اور پن، دھرم اور ادھرم، یہ بے معنی الفاظ ہیں جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو، اسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے مارنے والا میں ہوں جلانے والا میں ہوں آدمی نہ کسی کو مار سکتا ہے نہ جلا سکتا ہے پھر کہاں رہا تمہارا گناہ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا۔ یہ انفرادی جنگ نہیں انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں، جو آدمی قوم کی زیادہ

خدمت کر سکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا اپنی دلیلوں سے وہ اسے قائل نہ کر سکتی تھی دھرم ویر کھانا کھا کر اٹھ گیا مگر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں، کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو، قتل کرنے جا رہا ہو اس خیال سے اس کے جسم میں رعشہ آ گیا عام آدمیوں کی طرح قتل اور خون کی نفرت اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں بھری ہوئی تھی اس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو اس سے زیادہ شرم، ذلت حقارت اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی وہ قومی خدمت کے اس معیار پر جان دیتی تھی جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے اس کی نگاہ میں قوم کا خادم وہ تھا جو حقیر ترین مخلوق کا دل بھی نہ دکھائے بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے اپنے کو قربان کر دے اہنسا اس کے اخلاق احساسات کا جزو اعظم تھی اگر دھرم ویر کسی غریب کی حمایت میں گولی کا نشانہ بن جاتا تو وہ روتی ضرور مگر گردن اٹھا کر اسے روحانی صدمہ ہوتا شاید اس صدمہ سے جان بر نہ ہوتی مگر اس صدمہ میں غرور شامل ہوتا لیکن وہ کسی کا خون کر آئے یہ خدائی قہر تھا، لعنت تھی لڑکے کو روکے کیسے؟ یہ ہی سوال اس کے سامنے تھا۔ وہ یہ نوبت ہرگز نہ آنے دے گی کہ اس کا فرزند خون کے جرم میں گرفتار ہو نا سے یہ ہی برداشت تھی، کہ اس کے جرم کی سزا بے گناہوں کو ملے اسے تعجب ہو رہا تھا لڑکے میں یہ شوریدہ سری آئی کیونکر؟ وہ کھانا کھانے بیٹھی، مگر لقمہ حلق میں نہ جا سکا کوئی ظالم ہاتھ دھرم ویر کو اس کی گود سے چھینے لیتا ہے وہ اس ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی اپنے لخت جگر کو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ کرے گی سایہ کی طرح اس کے پیچھے

رہے گی کس کی مجال ہے جو اس کے لڑکے کو اس کی گود سے چھینے؟

دھرم ویر باہر کے کمرے میں سویا کرتا تھا اسے گمان ہوا وہ کہیں چلا نہ گیا ہو فوراً اس کے کمرے میں آئی دھرم ویر کے سامنے چراغ دن جل رہا تھا وہ ایک کتاب کھولے پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا کتاب اس کے سینے پر پڑی تھی ماں نے وہیں بیٹھ کر بے کسانہ خلو اور انکسار کے ساتھ پر ماتما سے اس کی تالیف قلب کے لیے دعا کی اس کے چہرے پر اب بھی وہی بھولا پن وہی معصومیت تھی جو پندرہ بیس سال پہلے نظر آتی تھی تندی یا کرختگی کا کوئی نشان نہ تھا ماں کی اصول پروری ایک لمحہ کے لیے ماتا کے دامنے میں چھپ گئی ماں نے دل سے بیٹے کے دلی جذبات کو دیکھا اس نوجوان کے دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے قوم کا کتنا درد ہے، مظلومی سے کتنی ہمدردی ہے اگر اس میں بوڑھوں کی مصلحت اندیشی، صبر، آہستہ روی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے جو شخص جان عزیز چیز کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو، اس کی تڑپ اور جلن کا کون اندازہ کر سکتا ہے کاش! یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔

ماں کی آہٹ پا کر دھرم ویر چونک پڑا اور کتاب سنبھالتا ہوا بولا

''تم کب آ گئیں اماں؟ مجھے تو نہ جانے کب نیند آ گئی''

ماں نے چراغ دان کو دور ہٹا کر کہا چار پائی کے پاس چراغ رکھ کر نہ سویا کرو اس سے کبھی کبھی حادثے ہو جایا کرتے ہیں اور کیا ساری رات پڑھتے ہی رہو گے آدھی رات تو ہوئی آرام سے سو جاؤ میں بھی یہیں لیٹی جاتی ہوں، مجھے اندر نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے۔

دھرم ویر ''میں میں ایک چارپائی لا کر ڈالے دیتا ہوں''

''نہیں میں یہیں زمین رپ لیٹی جاتی ہوں''

''واہ! میں چارپائی پر لیٹوں، اور تم زمین پر پڑا رہے یہ تو نہیں ہو سکتا''

''میں چارپائی لیے آتا ہوں نہیں تو میں بھی اندر ہی لیٹتا ہوں آج آپ ڈریں کیوں؟''

''تمہاری باتوں نے ڈرا دیا تو مجھے بھی کیوں اپنی سبھا میں نہیں شریک کر لیتا''

''دھرم ویر نے کوئی جواب نہ دیا بستر اور چارپائی اٹھا کر اندر والے کمرے میں لے چلا ماں آگے آگے چراغ دکھاتی ہوئی چلی کمرہ میں چارپائی ڈال کر اس پر لیٹتا ہوا بولا'' اگر تم میری سبھا میں شریک ہو جاؤ تو کیا پوچھنا بے چارے کچی پکی روٹیاں کھا کر بیمار ہو رہے تھے انہیں اچھا کھانا ملنے لگے گا پھر ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جنہیں ایک بوڑھی عورت جتنی آسانی سے کر سکتی ہے نوجوان ہرگز نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی معاملہ کا سراغ لگانا، عورتوں میں ہمارے خیالات کی اشاعت کرنا مگر تم مذاق کر رہی ہو۔

ماں نے متانت سے کہا ''نہیں بیٹا، مذاق نہیں کر رہی دل سے کہہ رہی ہوں ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے تمہیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی جب تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا دوسری بات تھی لیکن اب یہ حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتی۔ میں ہمیشہ تمہارے پہلو میں رہوں گی اور اگر کوئی ایسا موقع آیا تو تم سے پہلے میں اپنے تئیں قربان کروں گی مرتے وقت تم میرے سامنے ہو گے میرے لیے یہ ہی سب

سے بڑی خوشی ہے یہ مت سمجھو، کہ میں نازک موقعوں پر ڈر جاؤں گی چیخوں گی، چلاؤں گی، ہرگز نہیں سخت سے سخت خطروں کے سامنے بھی تم میری زبان سے ایک چیخ نہ سنو گے اپنے بچے کی حفاظت کے لیے گائے بھی شیرنی بن جاتی ہے''

دھرم ویر نے عقیدت سے سرشار ہو کر ماں کے قدموں کا بوسہ لے لیا اس کی نگاہوں میں وہ کبھی اتنی تعظیم اور محبت کے قابل نہ تھی۔

(6)

دوسرے ہی دن آزمائش کا موقع در پیش ہوا یہ وہ دن بڑھیا نے ریوالور چلانے کی مشق میں صرف کے پٹاخے کی آواز پر، کانوں پر ہاتھ رکھنے والی، اہنسا اور دھرم کی دیوی، اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی اور اس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے اعلیٰ افسر کے نام موت کا پروانہ نکلا اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی

دونوں گھر پہنچے تو ماں نے پوچھا ''کیوں بیٹا، اس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی پھر سبھا نے کیوں اس کا انتخاب کیا؟''

دھرم ویر ماں کی سادگی پر مسکرا کر بولا ''تم سمجھتی ہو ہمارے کانسٹیبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں اپنی خوشی سے کرتے ہیں؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے ہیں، ان کے لیے یہ ہی شخص ذمہ دار ہے اور پھر ہمارے لیے تو اتنا ہی

کافی ہے، کہ یہ اس مشین کا ایک خاص پرزہ ہے جو ہماری قوم کو انتہائی بے رحمی سے پامال کر رہی ہے لڑائی میں ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں وہاں تو مخالف فریق کا ممبر ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔''

ماں خاموش ہوگئی ایک لمحہ کے بعد ڈرتے ڈرتے بولی ''بیٹا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا اب ایک سوال کرتی ہوں اسے پورا کرو گے؟''

دھرم ویر نے کہا'' یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں اماں تم جانتی ہو، میں تمہارے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا''

ماں :ہاں بیٹا، یہ جانتی ہوں اسی وجہ سے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوئی تم اس سبھا سے الگ ہو جاؤ دیکھو تمہاری بوڑھی ماں ہاتھ باندھ کر تم سے یہ عرض کر رہی ہے۔

اور وہ ہاتھ باندھ کر سائلانہ انداز سے بیٹے کے سامنے کھڑی ہوگئی دھرم ویر نے قہقہہ مار کر کہا۔

''یہ تو تم نے بے ڈھب سوال کیا اماں تم جانتی ہو، اس کا نتیجہ کیا ہوگا زندہ لوٹ کر نہ آؤں گا اگر یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں تو بھی جان نہیں بچ سکتی، سبھا کے سب ممبر ہی میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے اور مجھے ان کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمہارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں لیکن مادر وطن نے تمہیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے اور اس کا حق افضل ہے اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آ جائے کہ مجھے مادر وطن کی حمایت کے لیے تمہیں قتل کرنا پڑے، تو میں اس ناگوار فرض سے منہ نہ موڑ سکوں گا آنکھوں سے آنسو جاری ہوں

گے لیکن تلوار تمہاری گردن پر ہوگی ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلہ میں کسی چیز کی حقیقت نہیں اس لیے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے ہاں تمہیں خوف ہو تو میرے ساتھ نہ جاؤ میں کوئی بہانہ کر دوں گا اور کسی دوسرے کامریڈ کو ساتھ لے لوں گا اگر تمہارے دل میں ضعف ہو تو مجھے فوراً بتلا دو۔''

ماں نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا ''میں نے تمہارے خیال سے کہا تھا، بھیا، ورنہ مجھ کیا خوف؟''

تاریک شب کے پردے میں اس مہم کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا معتوب رات کو کلب سے جس وقت لوٹے وہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے۔ دھرم ویر نے دوپہر ہی کو موقع کا معائنہ کرلیا اس خاص مقام کا انتخاب کرلیا جہاں سے وہ نشانہ مارے گا صاحب کے بنگلہ کے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی وہی اس کی کمین گاہ ہوگی جھاڑی کے بائیں جانب نشیب تھا نشیب میں بیرا اور رامرود کے باغ تھے بھاگ نکلنے کا اچھا موقع تھا۔

صاحب کے کلب جانے کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان تھا لوٹنے کا وقت گیارہ بارہ بجے تھا۔ ان اوقات کی تحقیق کرلی گئی تھی دھرم ویر نے طے کیا کہ نو بجے چل کر اسی کروندے والی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جائیں وہیں ایک موڑ بھی تھا موڑ پر موٹر کی رفتار کچھ سست ہو جائے گی عین اسی وقت اسے ریوالور کا نشانہ بنالیا جائے۔

جوں جوں دن گزرتا جاتا تھا بوڑھی ماں کا دل دہشت سے خشک ہوتا جاتا تھا لیکن دھرم ویر کے معمول میں مطلق فرق نہ تھا وہ عین وقت پر اٹھا ناشتہ کیا سندھیا

کی حسب معمول کچھ دیر پڑھتا رہا دو چار احباب آ گئے ان کے ساتھ دو تین بازیاں شطرنج کی کھیلیں اطمینان سے کھانا کھایا اور معمول سے کچھ زیادہ پھر آرام سے سو گیا گویا اسے کوئی غم نہیں ہے ماں کا دل اچاٹ تھا کھانے پینے کا ذکر ہی کیا وہ من مار کر ایک جگہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی پڑوس کی عورتیں حسب معمول آئیں وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوئی ایک سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی تھی گویا چوہیا بلی کے خوف سے کوئی سوراخ ڈھونڈتی ہو کوئی پہاڑ سا اس کے سر پر گرنا تھا اس سے کہیں نجات نہیں کہیں مفر نہیں وہ رسمی فلسفہ جس سے اب تک اسے تسکین ہوئی تھی تقدیر، پنرجنم، مشیت اس بلائے مہیب کے سامنے بے کار سے معلوم ہوتے تھے زرہ بکتر اور خود تیر اور تفنگ سے حفاظت کر سکتے ہیں لیکن پہاڑ تو اسے ان سارے دفاعی آلات کے ساتھ کچل ڈالے گا اس کے دل و دماغ مفلوج ہوتے جاتے تھے اگر کوئی احساس تھا تو دہشت کا مگر شام ہوتے ہوتے اس کے دل پر ایک سکون کی حالت طاری ہوئی اس کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی جسے مجبوری کی طاقت کہہ سکتے ہیں چڑیا اس وقت تک پھڑ پھڑاتی رہی۔ جب تک اڑ نکلنے کی امید تھی اس کے بعد وہ پنجہ صیاد اور تیغ قاتل کے لیے تیار ہو گی انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔

اس نے دھرم ویر کو پکارا "بیٹا، کچھ آ کر کھا لو"

دھرم ویر اندر آیا آج دن بھر ماں بیٹے میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی اس وقت ماں نے دھرم ویر کو دیکھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا وہ ضبط جس سے آج اس نے دن بھر اپنے اندرونی اضطراب کو چھپا رکھا تھا جواب تک بکھری کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا خطرہ کے قریب آ جانے پر پگھل گیا تھا جیسے کوئی بچہ بھالو کو دور سے دیکھ کر تو

خوشی سے تالیاں بجائے لیکن اس کے قریب آنے پر چیخ اٹھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں رونے لگے

ماں کا دل مسرت سے کھل اٹھا اس نے آنچل سے دھرم ویر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''چلو بیٹا، یہاں سے کہیں بھاگ چلیں''

دھرم ویر خیال میں غرق کھڑا تھا ماں نے پھر کہا ''کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یہاں سے باہر نکل جائیں جس میں کسی کو خبر بھی نہ ہو قوم کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔''

دھرم ویر کی محویت بیدار ہوئی بولا ''یہ نہیں ہوسکتا اماں فرض تو فرض ہے اسے ادا کرنا پڑے گا چاہے رو کر ادا کروں یا ہنس کر ہاں اس خیال سے وحشت ہوتی ہے، کہ انجام نہ جانے کیا ہو ممکن ہے نشانہ خطا کر جائے اور گرفتار ہو جاؤں یا اس کی گولی کا نشانہ بنوں۔ لیکن ہر چہ بادا باد مر بھی جائیں گے تو نام تو چھوڑ جائیں گے''

ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہا

''اس وقت تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا ماں، اب تیاری کرنی چاہیے تمہارا جی نہ چاہتا ہو، تو نہ چلو میں اکیلا چلا جاؤں گا''

ماں نے شکوہ کے انداز سے کہا

''مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں ہے بیٹا، میری جان تو تم تھے تمہیں دیکھ کر جیتی تھی تمہیں چھوڑ کر میری زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے''

دھرم ویر کو اپنا روزنامہ بھرنا تھا وہ روزنامچہ بھرنے بیٹھا تو جذبات کا دریا امنڈ

پڑا یہ روانی، یہ آمد اس کے لیے نئی چیز تھی جیسے دل میں کہیں سوتا کھل گیا ہو انسان لا فانی ہے امر ہے یہی ہی اس روانی کا موضوع تھا آغاز ایک دردناک الوداع سے ہوا۔

"رخصت! اے دنیا کی دلچسپیوں رخصت! اے زندگی کی بہارو رخصت! اے زخم ہائے شیریں رخصت! برداران وطن اپنے اس محروم اور مجروح خادم کے لیے دعائے خیر کرنا! زندگی عزیز ہے اس کا تجربہ ہوا آہ! وہی غم والم کے نشتر! وہی حسرتیں اور مایوسیاں، جنہوں نے زندگی کو تلخ کر رکھا تھا فی الواقع سرمایہ حیات ہیں یہ نور سحر کی سنہری بارش، یہ شام کی رنگین ہوائیں یہ گلی کوچے، یہ درو دیوار دیکھنے پھر نہ نصیب ہوں گے زندگی بندشوں اکا نام ہے بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی ہیں حیات کا شیرازہ بکھرا جا رہا ہے اے دل کی آزادی! آؤ تمہیں گور حسرت میں دفن کر دوں خدا سے یہ ہی دعا ہے کہ اہل وطن پھلیں پھولیں، وطن سرسبز اور شاداب ہو کوئی مضائقہ نہیں ہم کیا اور ہماری حقیقت ہی کیا" مگر گلشن، بلبلوں سے خالی نہ رہے گا میری اپنے بھائیوں سے اتنی ہی التجا ہے کہ جس وقت آپ آزادی کے نغمے گائیں تو اس غریب کا دعائے خیر سے یاد کر لیں۔

روزنامچہ بند کر کے اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور اٹھ کھڑا ہوا کپڑے پہنے ریوالور جیب میں رکھا اور بولا "اب تو وقت ہو گیا اماں"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا گھر سنبھالنے کی کسے پروا تھی جو چیز جہاں پڑی تھی وہیں پڑی رہی یہاں تک کہ چراغ بھی گل نہ کیا گیا دونوں خاموش گھر سے نکلے ایک مردانہ وار قدم اٹھاتا، دوسری متفکر اور مغموم اور بار مجبوری سے جھکی ہوئی،

راستہ میں بھی تبادلہ الفاظ نہ ہوا دونوں نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل خاموش اور سرگرم تھے حصہ نثر پر شکوۂ قومی اور تحریک عمل مستحسن حصہ نظم درد، تاثیر اور التجا سے لرزاں۔

جھاڑی میں پہنچ کر دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد صاحب کا موٹر نکلا دھرم ویر نے غور سے دیکھا موٹر کی رفتار سست تھی صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے تھے نشانہ غیر متوقع تھا دھرم ویر نے جیب سے ریوالور نکالا ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹر آگے نکل گیا۔

دھرم ویر نے کہا ''یہ تم نے کیا کیا اماں؟ ایسا سنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا''

ماں نے کہا ''موٹر میں میم بھی تھی کہیں میم ہی کو گولی لگ جاتی تو؟''

''تو کیا مضائقہ تھا ہمارے مذہب میں ناگ ناگن اور سنپولے میں کوئی بھی فرق نہیں۔''

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا ''تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتا عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں!''

''میں واپسی کے وقت ہرگز نہ چھوڑوں گا''

''میرے جیتے جی تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے''

''میں اس معاملے میں تمہاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا''

ماں نے کچھ جواب نہ دیا اس نامراد ضرب سے اس کی مامتا ریزہ ریزہ ہو گئی مشکل سے بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہی موٹر دوسری جانب سے آتا دکھائی دیا دھرم ویر نے موٹر کو غور سے دیکھا اور اچھل کر بولا:

’’لو اماں، اب کی بار صاحب اکیلا ہے تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا‘‘

ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا اور مجنونہ تندی کے ساتھ اس کا ر لوالور چھیننے لگی دھرم ویر نے اس کا دھکا دے کر گرا دیا اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا ایک سیکنڈ میں ماں اٹھی اسی وقت گولی چلی موڑ آگے نکل گئی مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

دھرم ویر ریوالور پھینک کر ماں کے پاس گیا اور گھبرا کر بولا ’’اماں کیا ہوا؟‘‘

پھر یکایک اس سانحہ کا علم اس کے اندر چمک اٹھا وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے اس کی فطرت کی ساری درشتی اور تیزی اور گرمی بجھ گئی آنسوؤں کی بڑھتی ہوئی گردش کو محسوس کرتا وہ نیچے جھکا اور ماں کے چہرے کی طرف اشک آلود پشیمانی سے دیکھ کر بولا

’’یہ کیا ہو گیا اماں! ہائے تم کچھ بولتی کیوں نہیں یہ کیسے ہو گیا؟ اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آتا کہاں گولی لگی؟ کچھ بتاؤ آہ! اس بدنصیب کے ہاتھوں تمہاری موت لکھی تھی جس کو تم نے گود میں پالا وہی تمہارا قاتل ہوا کس کو بلاؤں کوئی نظر بھی تو نہیں آتا‘‘

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ’’میرا جنم سپھل ہو گیا بیٹا، تمہارے ہاتھوں میری مٹی اٹھے گی تمہاری گود میں مر رہی ہوں سینہ میں زخم ہو گیا ہے جونہی تم نے گولی چلائی میں تمہارے سامنے کھڑی ہو گئی اب نہیں بولا جاتا، پرماتما تمہیں خوش رکھے میری یہ دعا ہے میں اور کیا کرتی بیٹا! ماں کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے میں تو چلی!‘‘

ایک لمحہ کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن نیم جاں کو گود میں لیے گھر چلا تو اس کے ٹھنڈے تلوؤں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ کر روحانی مسرت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
WWW.

سوانگ

پہلی بار: اردو میں ''جامعہ'' میں 1935ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: اردو میں 1938ء (واردات)

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا اور نہ نام کے پیچھے سنگھ کی دم لگا لینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانے میں راجپوت تھے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ادھر تین پستوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کی کوئی علامت نہ تھی گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی راجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے پدر بزرگوار نے کپڑے کی دکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی اور گجندر نے تو لٹیا ہی ڈبو دی قد و قامت میں بھی فرق آتا گیا بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا زیندر سنگھ کا شکم فراخ تھا لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے گورے چٹے، عینک باز نازک بدن فیشن ایبل بابو تھے انہیں علمی مشاغل سے دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہو گی گجندر سنگھ کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اس خاندان میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہیں ہوا تھا۔ ان کے خسر پنشنر صوبے دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آ سکا امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی ملازمت کی تلاش تھی اس لیے اب

کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بلاوا آیا تو اس نے کوئی حیل و حجت نہ کی صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی فوجی افسروں کی حکام کتنی قدرو منزلت کرتے ہیں، یہ اسے خوب معلوم تھا سمجھا ممکن ہے صوبے دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیل داری میں نامزد ہو جاؤں ادھر شیام دلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی ایک نشانے سے دو شکار ہو رہے تھے نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہنچا اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانہ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو پٹخنی دی ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا کہ صوبے دار صاحب دیو کی طرح آ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے: ''ارے سنو! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ بابو جی شہر سے آئے ہیں انہیں لے جا کر سیر کرا لاؤ کچھ شکار وکار کھلاؤ یہاں تھیٹر ویٹر تو ہے نہیں، ان کا جی گھبراتا ہو گا وقت بھی اچھا ہے، شام تک لوٹ آؤ گے''

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی بے چارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا دیہاتی اجڈ لونڈے اسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے ہرن بھی راہ فرار نہ پا کر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔

بولے: ''میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا بہت تھک گیا ہوں''

صوبے دار صاحب نے فرمایا: ''تم گھوڑے پر سوار ہو لینا یہی تو دیہات کی

بہار ہے چنو جا کر بندوق لا میں بھی چلوں گا کئی دن سے باہر نکلا نہیں میری رائفل بھی لیتے آنا''

چنو اور منو خوش خوش بندوق لینے دوڑے ادھر گجندر سنگھ کی جان سوکھنے لگی پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا جانتا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑا رہتا اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کرسکتا سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری تھی دیہاتی گھوڑے یوں ہی تھان پر بندھے بندھے ٹرے ہو جاتے ہیں اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہنچے گھوڑا بھی کھینچ کر آ گیا صوبہ دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے اب گجندر کے لیے کوئی حیلہ نہ رہا اس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا ہنہناتا تھا اٹھی ہوئی گردن، لال لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی، بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا گجندر دل میں سہم اٹھا مگر بہادری دکھانے کے لیے گھوڑے کے پاس جا کر اس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں، گویا پکا شہسوار ہے اور بولا جانور تو جان دار ہے مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں ایسا بھی تھکا نہیں ہوں میں بھی پیدل ہی چلوں گا اس کی مجھے مشق ہے۔

صوبہ دار نے کہا ''بیٹا! جنگل دور ہے، تھک جاؤ گے بڑا سیدھا جانور ہے بچہ

بھی سوار ہو سکتا ہے۔''

گجندر نے کہا ''جی نہیں مجھے یوں ہی چلنے دیجئے گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے سواری میں وہ لطف کہاں آپ بزرگ ہیں سوار ہو جائیں''

چاروں آدمی پیادہ چلے لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دیر بعد پتھریلا راستہ ملا ایک طرف ہرا ابھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ دونوں ہی طرف ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے صوبہ دار صاحب اپنی فوج زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بار بار پچھڑ جاتے تھے، اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا پسینے میں تر، ہانپتا ہوا اپنی حماقت پر پچھتاتا چلا جاتا تھا یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ابھی سے یہ حال ہے شکار نظر آیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی میل دو میل کی وڑ تو ان کے لیے معلوم بات ہے مگر یہاں تو گھوم ہی نکل جائے گا شاید بے ہوش ہو کر گر پڑوں پیر ابھی سے نو نو من کے ہو رہے ہیں۔

یکا یک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا، نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چنو نے پوچھا ''کیا ہے جیجا جی، رک کیسے گئے؟''

گجندر نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا ''کچھ نہیں اس درخت کا حسن دلآویز دیکھ کر دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا اہا کیا بہار ہے، کیا مذاق ہے، کیا شان ہے گویا جنگل کی

دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لیے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو یا رشیوں کی پاک روحیں سفر جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو آپ لوگ شکار کھیلنے چلیے مجھے اس آب حیات سے شاد کام ہونے دیجیے''

دونوں نوجوان فرط حیرت سے گجدھر کا منہ تکنے لگے ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں دیہات کے رہنے والے، سیمن ان کے لیے کوئی انوکھی چیز نہ تھی اسے روز دیکھتے تھے کتنی بار اس پر چڑھے تھے، اس کے نیچے دوڑے تھے اس کے پھولوں کی گیند بنا کر کھیلتے تھے ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی حسن پرستی وہ کیا جانیں۔

صوبے دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھ کر لوٹ آئے اور بولے ''کیوں بیٹا ٹھہر کیوں گئے؟''

گجدھر نے دست بستہ گزارش کی آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے میری روح نغمہ جنت کا مزا لے رہی ہے آہا یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے مجھ میں بھی وہی سرخی ہے، وہی حسن ہے، وہی طاقت ہے، میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں؟ جنگل کے معصوم جانوروں کا! ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں، یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے کیا اپنا ہی خون کریں! نہیں، آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں، مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی

شکار سے باز آئیں زندگی مسرت کا خزانہ ہے اس کا خون نہ کیجئے نظارہ ہائے قدرت سے چشم باطن کومسرور کیجئے قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں، ایک ایک ہستی میں مسرت کی شعاعیں چمک رہی ہیں خون ریزیوں سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجئے۔

اس تصوف آمیز تقریر نے سب ہی کو متاثر کر دیا صوبے دار صاحب نے چنو سے آہستہ سے کہا ''عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے''چنو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا''علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے شکار کھیلنا برا ہے''

صوبے دار نے عارفانہ انداز سے کہا''ہاں برا تو ہے چلو لوٹ چلیں جب ہر ایک چیز میں اسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون، اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا''

پھر وہ جگندر سے بولے''بھیا، تمہارے اپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں، قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے''

جگندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی اسی سرور کے عالم میں بولے''ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کرسکتا ان گنت جنگلی سور، ہرن، تیندوے، نیل گائیں ہلاک کیے ہوں گے ایک بار چیتے کو مار ڈالا تھا، مگر آج مے عرفاں کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہیں رہا۔''

(2)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی آٹھ ہی بجے سے گانو کے عورت، مرد بوڑھے بچے گاتے بجاتے عنبریں اڑاتے ہولی کی طرف چلے صوبے دار صاحب بھی بال بچوں کو لیے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گانو کی ہولی نہ دیکھی تھی اس کے شہر میں تو ہر محلے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کندے جلا دیے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا۔ آتش بازی چھوٹنے لگی چھوٹے بڑے سب ہی پٹاخے، چھچھوندریں، ہوائیاں چھوڑنے لگے گجندر کے سر پر سے کتنی چھچھوندیں سنسناتی ہوئی نکل گئیں ہر ایک پٹاخے پر بیچارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اجڈ دیہاتیوں کو بد دعائیں دیتا تھا یہ کیا بے ہودگی ہے بارود کہیں کپڑے پر لگ جائے، کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں مگر ان دہقانوں کو کیا خبر یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آگ گویا بجلی کڑکی ہو گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فٹ اونچے اچھل گئے اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے دل دھک دھک کرنے لگا گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لیے اور دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔

چنو نے کہا: ''جیجاجی آپ کیا چھوڑیں گے کیا لاؤں؟''

منو بولا: ''ہوائیاں چھوڑیے جیجاجی بہت اچھی ہیں آسمان میں نکل جاتی ہیں''

چنو: ''ہوائیاں بچے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے آپ بم گولہ چھوڑیے بھائی صاحب''

گجندر: ''بھئی ان چیزوں کا شوق نہیں مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔''

منو: ''دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیے''

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں ان کی سرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے ان کے گورے چہرے اور خوب صورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دل فریبی کتنی بڑھ جائے گی کوئی خطرے کی بات نہیں، مزے سے ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں گل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے اور سب کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں ان کا فلسفی دماغ بھی خودنمائی کے شوق سے خالی نہ تھا فوراً ماہتابی لے لی گو ایک شان بے نیازی کے ساتھ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولہ چھوٹا آسمان کانپ اٹھا گجندر کو، ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا، ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور سینے میں اختلاج ہونے لگا ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ تیسرا دھماکہ ہوا، جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو ساری فضا متلاطم ہو گئی چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل کر شور مچاتی ہوئی بھاگیں جانور رسیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پانو رکھ کر بھاگے سرپٹ اور سیدھے گھر پر آ کر دم لیا چنو اور منو دونوں گھبرا گئے صوبےدار صاحب کے ہوش

اڑ گئے تینوں آدمی بگٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے، دوسروں نے جو انہیں بھاگتے دیکھا تو سمجھے کوئی شدید واردات ہوگئی سب کے سب ان کے پیچھے ہو لیے گانو میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی اب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ''مہمان کو ہو کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں ایک لمحے میں سینکڑوں آدمی صوبے دار صاحب کے دروازے پر پرسش حال کے لیے جمع ہو گئے گانو کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابل زیارت اور بد حال ہوتے ہوئے بھی منظور نظر ہوتا ہے۔''

صوبے دار نے سہمی ہوئی آواز سے کہا: ''تم وہاں سے کیوں آ گئے بھیا؟''

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا اور جواب بھی ایسا کہ گانو والوں پر اس کا خدا رسی کا سکہ بٹھا دے بولا: ''کوئی خاص بات نہ تھی دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیے''

''نہیں کوئی بات ضرور تھی''

'' آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔''

'' جب تک بتلا نہ دوے گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی سارا گانو گھبرایا ہوا ہے''

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا، آنکھیں بند کر لیں، جمائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

''بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے

کسی نے اسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا میں نے کبھی آتش بازیاں نہیں چھوڑیں ہمیشہ اس کی مذمت کرتا ہوں آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا بس غضب ہی تو ہو گیا مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفریں کر رہی ہے شرم سے میری گردن خم ہوگئی اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں میں آپ کے جشن میں شریک نہ ہوسکوں گا۔''

صوبے دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا کوئی وہاں اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں ''آتی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں تم بھلا کیا سمجھو گے ہم بھی کچھ ہی کچھ سمجھتے ہیں''

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی مگر آتش بازیاں دریا میں ڈال دی گئیں شریر لڑکوں نے کچھ اس لیے چھپا کر رکھ لیں کہ گجدھر چلے جائیں گے تو مزے سے چھوڑیں گے

شیام دلاری نے تخلیے میں کہا ''تم وہاں سے خوب بھاگے''

گجدھر اکڑ کر بولے: ''بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی''

''میری تو جان نکل گئی کہ نہ معلوم کیا ہو گیا تمہارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی ٹوکری بھر آتش بازی پانی میں پھینک دی گئی''

''یہ تو روپے کو آگ میں پھونکنا ہے''

''ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں تیوہار اسی لیے تو آتے ہیں''

تیوہار میں گاؤ بجاؤ، اچھی اچھی چیزیں پکاؤ خیرات کرو، عزیزوں سے ملو، سب سے محبت سے پیش آؤ بارود اڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔

رات کے بارہ بج گئے تھے کسی نے دروازے پر دھکا مارا

گجندر نے چونک کر پوچھا ''یہ دھکا کس نے مارا؟''

شیاما نے لاپروائی سے کہا ''بلی ولی ہوگی''

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں پھر کواڑ پر دھکا مارا گجندر کو لرزا آ گیا لالٹین لے کر دروازے سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا چار پانچ آدمی کرتے پہنے پگڑیاں باندھے داڑھیاں لگائے شانے پر بندوقیں رکھے کواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے. گجندر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا دونوں سو گئے ہیں کواڑ توڑ ڈالو مال الماری میں ہے۔

''اور اگر دونوں جاگ گئے''

''عورت کیا کر سکتی ہے مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے''

سنتے ہیں. گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے

''کیسا ہی پہلوان ہو چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے''

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں شیام دلاری سے بولے ''یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں اب کیا ہوگا میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں''

چور چور پکارو جاگ ہو جائے گی آپ بھاگ جائیں گے نہیں میں چلاتی ہوں چور کا دل آدھا۔

''نا نا! کہیں ایسا غضب نہ کرنا ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں گانو میں اتنا سناٹا کیوں ہے گھر کے آدمی کیا ہوئے''

''بھیا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے

ان کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے“

”اس کمرے میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہنچے مکان ہیں یا قید خانے؟“ ”میں تو چلاتی ہوں۔

”ارے نہیں بھائی کیوں جان دینے پر آمادہ ہو میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں، جان تو بچے دیکھو کواڑ ہل رہے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں یا ایشور کہاں جاؤں اس مصیبت میں تمہارا ہی بھروسا ہے کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے نہیں تو آتا ہی کیوں بس چپ ہی سادھ لو اگر ہلائیں ولائیں تو بھی سانس مت لینا“

”مجھ سے تو چپ سادھ کر پڑا نہ رہا جائے گا“

”زیور اتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں شیطان زیور ہی تو لیں گے“

”زیور تو نہ اتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے“

”کیوں جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟“

”خوشی سے تو زیور نہ اتاروں گی، زبردستی کی اور بات ہے“

”خاموش سنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں“

باہر سے آواز آئی: ”کواڑ کھول دو نہیں تو ہم کواڑ توڑ کر اندر آ جائیں گے“

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی: ”میری بات مانو تو شیاما زیور اتار کر رکھ دو میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا“

باہر سے آواز آئی ”کیوں شامتیں آئی ہیں بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے

ہیں اگر کواڑ نہ کھلے تو خیریت نہیں''

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا ''کھول دوں؟''

''ہاں بلا لو تمہارے بھائی بند ہیں نا وہ دروازے کو باہر سے دھکیلتے ہیں تم اندر سے باہر کو ٹھیلو''

''اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے پانچ پانچ جوان ہیں''

''وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے، لے کر کھڑے ہو جاؤ''

''تم پاگل ہو گئی ہو!''

چنو دادا ہوتے تو پانچوں کو گرا دیتے

''میں لٹھ باز نہیں ہوں''

''تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ میں ان سب کو سمجھ لوں گی''

تمہیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے ماتھے میرے جائے گی

''میں تو چلائی ہوں''

''تم میری جان لے کر چھوڑو گی''

''مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا میں کواڑ کھولے دیتا ہوں''

اس نے دروازہ کھول دیا پانچوں چور کمرے میں بھڑ بھڑا کر گھس آئے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا ''میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں تم عورت کے سارے گہنے اتار لو''

دوسرا بولا: ''اس نے تو آنکھیں بند کر لیں ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی؟''

تیسرا: ''عورت حسین ہے''

چوتھا: ''سنتی ہے او مہریا: زیور دے نہیں گلا گھونٹ دوں گا''

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اتار دیتی

شیام دلاری نے کہا '' گلا گھونٹ دو چاہے گولی مار دو زیور نہ اتاروں گی''

پہلا: '' اسے اٹھا لے چلو یوں نہ مانے گی مندر خالی ہے''

دوسرا: ''بس یہی مناسب ہے کیوں ری چھوکری ہمارے ساتھ چلے گی''

شیام دلاری: ''تمہارے منہ میں کالک لگا دوں گی''

تیسرا: ''نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جا کر بیچ ڈالیں گے''

شیام دلاری: ''ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوا دوں گی''

چوتھا: '' کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے گزرے ہیں کیا رہ جائے گا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھا لے جائیں گے یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا''

پانچواں: ''یا تو سارے زیور اتار کر دے یا ہمارے ساتھ چل''

شیام دلاری: '' کاکا آ جائیں گے تو ایک ایک کی کھال ادھیڑ ڈالیں گے''

پہلا: '' یہ یوں نہ مانے گی اس لونڈے کو اٹھا لے چلو تب آپ ہی پیروں پر پڑے گی''

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پانو باندھے گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے سانس تک نہ آتی تھی دل میں جھنجھلا رہے تھے '' ہائے!

کتنی بے وفا عورت ہے زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں اچھاہ زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا بات تک تو پوچھوں نہیں۔"

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اٹھالیا اور لے کر آنگن میں جا پہنچے تو شیام دلاری دروازے پر کھڑی ہو کر بولی: "نہیں چھوڑ دو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"

پہلا: "پہلے ہی کیوں نہ راضی ہو گئی چلے گی نا؟"

شیام دلاری: "چلوں گی کہتی تو ہوں"

تیسرا: "اچھا تو چل ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں"

دونوں چوروں نے گجندر کو لا کر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دیے کمرے میں سناٹا چھا گیا گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں کوئی نظر نہ آیا اٹھ کر دروازے سے جھانکا صحن میں بھی کوئی نہ تھا تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا چاہا کہ صوبے دار صاحب کو جگائیں مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کو لے کر کمرے میں آ گئیں۔ گجندر کا وہاں پتا نہ تھا۔

ایک: "کہاں چلے گئے؟"

شیام دلاری: "باہر چلے گئے ہوں گے"

دوسری: "بہت شرمندہ ہوں گے"

تیسری: "مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہو گئی تھی"

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی سمجھے شاید گھر میں جاگ ہو گئی

لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے:

''ذرا دیکھیے، شیاما کہاں ہے میری تو نیند ہی نہیں کھلی جلد کسی کو دوڑائیے''

یکا یک انہیں عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ کر حیرت میں آ گئے

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا

ایک نے کہا: ''واہ جیجا جی! دیکھ لی آپ کی بہادری''

شیام دلاری: ''تم سب کی سب شیطان ہو''

تیسری: ''بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی''

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا مگر زبان کے شیر تھے فوراً بگڑی بات بنا لی بولے''

تو کیا تمہارا سوانگ بگاڑ دیتا میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا اگر سبھوں کو پکڑ کر مونچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔''

سب کی سب گجندر کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

لعنت

پہلی بار: مہندی میں ''جیون کا شاپ'' کے عنوان سے ''ہنس'' جوان 1935ء میں شائع ہوا۔

کتابی صورت میں: اردو میں 1936ء (زادراہ)

کاؤس جی نے اخبار نکالا اور شہرت کمانے لگے شاہ پور جی نے روئی کی دلالی شروع کی اور دولت کمانے لگے کمائی دونوں ہی کر رہے تھے، لیکن شاہ پور جی خوش تھے، کاؤس جی دل گرفتہ شاہ پور جی کو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت خود بخود مل رہی تھی کاؤس جی کو شہرت کے ساتھ دولت دوربین سے بھی نظر نہ آتی تھی، اس لیے شاہ پور کی زندگی میں سکون تھا عافیت تھی، امید تھی، درد تھا چہل پہل تھی کاؤس جی کی زندگی میں تلخی تھی، ناکامی تھی، مایوسی تھی، بیزاری تھی، بے دردی تھی، دولت کا حقیر سمجھنے کی بہت کوشش کرتے تھے، لیکن جو عصیاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا شاہ پور جی کی دولت میں جو فراخدلی اور مہمان نوازی اور شرافت تھی اس کے مقابلہ میں انہیں اپنے گھر کی بے سرو سامانی، تنگ دلی، نزع اور بدنظمی سے نفرت ہوتی تھی شیریں بیاں اور خوش خلق مسز شاہ پور کے سامنے انہیں اپنی گلشن بانو کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی جسے مہمانوں سے گویا کوئی پرخاش ہو، جو سیدھی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنایوں کے ساتھ شاہ پور جی گھر میں آتے تو شیریں بائی تبسم اور گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کرتی کاؤس جی خود

تھکے ماندے پریشان حال گھر آتے تو گلشن اپنا دکھڑا سنانے بیٹھ جاتی، اور ان کو خوب ملامت کرتی تم بھی اپنے کو انسان کہتے ہو میں تمہیں بیل سمجھتی ہوں چار پیروں والا بیل بیل بڑا غریب ہے، سیدھا ہے، محنتی ہے، صابر ہے، مانا لیکن پھر اسے شادی کرنے کا کیا حق تھا کاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کر چکا ہے کہ جب تمہیں اخبار نکال کر اپنی زندگی برباد کرنی تھی تو تم نے شادی کیوں کی اپنے ساتھ مجھے کیوں لے ڈوبے، جب تمہارے گھر میں دو روٹیاں نہ تھیں تو تم مجھے کیوں لائے اس سوال کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت نہ تھی، نہ طاقت اور نہ صلاحیت، انہیں کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا وہ خود اپنی غلطی پر پچھتاتے تھے ایک بار بہت تنگ آ کر انہوں نے کہا تھا " اچھا بھء اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، لیکن میں تمہیں باندھے ہوئے تو نہیں ہوں، تمہیں جو مرد زیادہ آرام سے رکھ سکے اس کے ساتھ جا کر رہو، اب میں کیا کروں؟ دولت نہیں ملتی تو کیا جان دے دوں، اس پر گلشن نے ان کے دونوں کان پکڑ کر زور سے اینٹھے اور رگالوں پر دو طمانچے لگائے اور شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر بولی ' اچھا اب سنبھالو زبان ورنہ برا ہوگا ایسی شرمناک بات کہتے ہوئے شرم نہیں آتی مگر غیرت ہوتی تب تو، تم نے شرم تو جیسے بھون کھائی تب سے بچارے کاؤس کے پاس اس سوال کا جواب نہ رہا کہاں تو یہ بدمزاجی اور سرکشی اور دست درازی، کہاں وہ تپاک اور خلوص اور تہذیب کی دیوی شیریں جو کاؤس جی کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل جاتی میٹھی میٹھی باتیں کرتی اچار مربے اور پھلوں سے خاطر کرتی اور اکثر انہیں اپنی کار پر سیر کرانے لے جاتی کاؤس جی نے کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ہمت نہیں کی، مگر وہ

خیال ایک آرزو کی صورت میں وہاں چھپا ہوا تھا کاش گلشن کی طرح شیریں ان کی رفیق حیات ہوتی تو ان کی زندگی کتنی قابل رشک ہوتی کبھی کبھی گلشن کی بدزبانیوں سے وہ اتنا رنجیدہ ہوتے کہ موت کا دروازہ کھٹکھٹاتے، گھر ان کے لیے۔۔قید خانے سے کم دل فگار نہ تھا اور انہیں جب موقع ملتا سیدھے شیریں کے گھر جا کر اپنے دل کی جلن ٹھنڈی کر آتے۔ایک دن کاوس جی علی الصباح گلشن سے برگشتہ خاطر ہو کر شاہ پور منزل پہنچے تو دیکھا شیریں بانو کی آنکھیں سرخ ہیں اور چہرہ تمتمایا ہوا ہے گویا حرارت ہو، گھبرا کر پوچھا "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ بخار تو نہیں آ گیا" شیریں نے مایوس نظروں سے دیکھ کر دردناک لہجہ میں کہا، نہیں، نہیں، بخار نہیں کم سے کم جسمانی بخار تو نہیں ہے۔

کاوس جی اس معمے کو نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر کہا، "آپ کو میں مہربان سمجھتی ہوں، کاوس جی آپ سے کیا چھپاؤں؟ میں اب زندگی سے عاجز آ گئی ہوں، میں نے اب تک دل کی آگ دل کے اندر رکھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے باہر نہ نکالوں گی تو شاید میری ہڈیاں تک جل جائیں گی اس وقت آٹھ بجے ہیں لیکن میرے رنگیلے پیا کا کہیں پتہ نہیں رات کا کھانا کھا کر وہ ایک دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے ،اور کوئی یہ نئی بات نہیں ہے ادھر کئی مہینوں سے یہ ان کی روزمرہ کی عادت ہے میں نے آج تک کبھی آپ سے درد دل نہیں کہا مگر اس وقت بھی جب میں آپ سے ہنس کر باتیں کرتی تھی، میرا دل روتا رہتا تھا اور میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے پوچھتی ہوں،

میرے لیے اب کونسا راستہ ہے'' اس نے منتظر نگاہوں سے کاؤس کی طرف دیکھا۔

شیریں کی آنکھیں لبریز ہوگئی تھیں مگر چہرے پر ایک جلال سا نمایاں تھا اپنی بیکسی کا یہ اظہار اسے کتنا ناگوار گذر رہا تھا، یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

کاؤس جی نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا ''آپ نے ان سے پوچھا نہیں''

''پوچھنے سے کیا لوگ اپنے دل کی بات بتا دیا کرتے ہیں''

''تم سے انہیں کوئی بات نہ چھپانی چاہیے''

''گھر سے انسان بیزار ہو تو کیا کرے''

''مجھے یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے تم جیسی پاکیزہ صفت خاتون جس گھر میں ہو وہ جنت ہے شاہ پور جی کو تو تمہاری پرستش کرنی چاہیے تھی۔''

شیریں مسکرائی، ستم ظریفانہ انداز سے اس تبسم میں راز دل تھا۔

''آپ کے یہ جذبات اس وقت تک ہیں جب تک آپ کے پاس دولت نہیں ہے آج کہیں سے دو چار لاکھ مل جائیں تو تم یوں نہ رہو گے۔ تمہارے دل کی یہ حالت نہ ہو، دولت کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے سطح کے سکون اور ہریالی فضا کے نیچے کتنی حرارت ہے، یہ تو اس وقت کھلتا ہے، جب زمین میں شگاف ہو جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں گھر میں دولت کا انبار لگا کر انہوں نے سب کچھ کر دیا جوان کا فرض تھا، میرے ساتھ اور اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں میرا زبان کھولنا بھی حق بجانب نہیں وہ نہیں جانتے کہ یہ سارے امارات کے لوازم مصری تہ خانوں میں مدفون تکلفانہ کی طرح ہیں جوان ہونے والی روحوں کے عیش و آرام کے لیے رکھے

جاتے ہیں۔"

کاوس جی آج ایک نئی بات سن رہے تھے انہیں اب تک زندگی کا جو تجربہ تھا وہ یہ تھا کہ عورت طبعاً عشرت پسند اور نفس پرور ہوتی ہے اس پر لاکھ جان نثار کرو اس کے لیے مر ہی کیوں نہ مٹو۔ لیکن جب تمہاری جاں نثاریوں کا کوئی عملی اظہار نہ ہو، مرصع زیورات کے صورت میں، ریشمی ملبوسات کے صورت میں اسے تسکین نہیں ہوتی وہ محض کھریرا نہیں دانہ اور گھاس بھی چاہتی ہے ایک یہ بھی دیوی ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتی ہے اور مرتی ہے مہر و وفا کے لیے، محبت کے لیے، دل سوزی اور دل جوئی کے لیے ان کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

مسز شاہ پور کی آواز تلخ ہوگئی تھی اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے ذرا دم لے کر بولیں، ان کی یہ ہوس پروری میری برداشت سے باہر ہوگئی ہے مسٹر کاوس جی میرے دل میں سوزش ہے ہیجان ہے اور میں دین اور شرع، ننگ و ناموس کسی کی آڑ لے کر بھی اپنے کو پابند نہیں رکھ سکتی۔ عصمت کی حفاظت کس لیے جب کوئی اصلی قدر نہیں کرتا جنگل میں کیوں کوئی گائے جب کوئی سننے والا نہیں دل کو سمجھاتی ہوں کیا دنیا میں لاکھوں بیوائیں نہیں پڑی ہوئی ہیں جوان حسین ناز و نعمت میں پلی، کیا میں انہی کی طرح یاس اور محرومی قسمت کا دامن پکڑ کر زندگی کی منزل طے نہیں کر سکتی دل کی آگ بجھتی اب مجھے یقین آجاتا ہے کہ شاہ پور مجھے پردہ عصمت کو چاک کر ڈالنے کی تحریک کر رہے ہیں دیدہ دانستہ شاید کسی خاص منشا سے میں نے اب تک ان کی چنوتی منظور نہیں کی ہے، لیکن پانی سر کے اوپر چڑھ گیا ہے اور میں کسی تنکے کے سہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی وہ جو چاہتے ہیں وہ ہی ہوگا، نہیں

اس سے کچھ زیادہ ہوگا۔ناموس کی زنجیر سے آزاد ہوکر آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا آپ ان کے دوست ہیں آپ سے بن پڑے تو انہیں سمجھایے میں اس عصمت کی بیڑی کواب اور نہیں پہن سکتی۔مسٹر کاؤس جی آنے والی مسرتوں کی ایک جنت بنا رہے تھے روشن پر فضا رومانی خوشیوں سے پر بولے،ہاں ہاں میں ضرور سمجھاؤں گا،یہ تو میرا فرض ہے،لیکن مجھے امید نہیں کہ میرے سمجھانے سے ان پر کوئی اثر ہو جس کے پاس دولت نہیں اسے ایک صاحب دولت کو سمجھانے کا حق ہی کیا ہے آپ کا خیال درست ہے ضرور انہوں نے کسی منشا سے یہ روش اختیار کی۔

''یوں تو وہ مجھ پر بڑی عنایت رکھتے ہیں،میری خاطر داری میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے ان کی یہی عادت مجھے پسند نہیں''

''تم نے اتنے دنوں تحمل سے کام لیا یہی وجہ تعجب ہے،کوئی دوسری خاتون ایک دن بھی برداشت نہ کرتی۔''

ان کے ساتھ زیادہ سختی نہ کیجئے مسٹر کاؤس جی یہ عادت تو کم وبیش ہر مرد میں ہوتی ہے،لیکن ایسے مردوں کی بیویاں بھی اسی مزاج کی ہوتی ہیں اور عوض معاوضہ گلہ نہ دارو کے اصولوں پر دونوں اپنے اپنے رنگ میں خوش رہتے ہیں عملاً نہ ہوں، دلاً ضرور ہوتی ہیں میں یہ دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری حالت بالکل مختلف ہے،میں نے ہمیشہ اپنا معبود سمجھا ہے۔

''لیکن مرد اس وفادار تسلیم کی قدر ہی نہ کرے تو مجبوری ہے۔مجھے اندیشہ ہے،انہوں نے دل میں کوئی اور تہیہ نہ کرلیا ہو''

''اور کیا تہیہ نہ کرلیا ہو''

''کیا آپ ان کا قیاس نہ کر سکتیں؟''

''اچھا، وہ بات، لیکن میری کوئی خطا؟''

''شیر اور ٹڈے والی کہانی کیا آپ نے نہیں سنی؟''

مسز شاہ پور یکا یک خاموش ہو گئیں، سامنے سے شاہ پور جی کی کار نظر آئی انہوں نے کاؤس جی کو، ممنون اور ملتجی نگاہوں سے دیکھا اور دوسرے دروازے سے نکل کر اندر چلی گئیں مسٹر شاہ پور جی آنکھوں میں خمار کی سرخی اور سستی بھرے ہوئے کار سے اترے اور مسکرا کر کاؤس جی سے ہاتھ ملایا اور اپنا ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا ''معاف کیجئے گا میں رات ایک دوست کے گھر رہ گیا، دعوت تھی، کھانے میں دیر ہوئی کچھ گانے بجانے کا بھی انتظام نہ تھا میں نے سوچا اب کون گھر جائے۔'' کاؤس جی نے طنز آمیز تبسم کے ساتھ پوچھا ''کس کے ہاں دعوت تھی؟ میرے رپورٹر نے اس کی کوئی خبر نہیں دی، ذرا مجھے نوٹ کرا دیجئے گا۔''

انہوں نے جیب سے نوٹ بک نکالی

شاہ پور جی نے سنبھل کر کہا کہ ایسی کوئی بڑی دعوت نہیں تھی دو چار بے تکلف احباب جمع ہو گئے تھے

''پھر بھی اس کی خبر اخباروں میں آنی چاہیے جس بے تکلف دعوت میں آپ جیسے باوقار اصحاب شریک ہوں اسے اخبار والے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں اور عوام کو بھی ایسی خبروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے میز بان کون صاحب تھے؟''

شاہ پور جی نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ پوچھا ''آپ چونکیں گے تو نہیں''

''فرمایئے تو''

"مس گوہر"

"مس گوہر"

"جی ہاں وہی آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے دردسر کے بعد مجھے تازہ ہونے کے لیے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔"

کاؤس جی نے زاہدانہ استحکام کے ساتھ کہا، "میں اسے نہیں مانتا"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی منکوحہ کے ساتھ بے انصافی سمجھتا ہوں شاہ پور جی ہنسے، ایک پر معذرت انداز کے ساتھ بولے" دقیانوسی خیالات

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا،" آپ کو واضح ہونا چاہیے کہ آج کی تہذیب نسل پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرین قیاس ہے اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کیے جاتے اب عورت کو مرد سے باز پرس کرنے کا حق ہے۔"

"بالفاظ دیگر، اب عورتیں مردوں پر حکومت کر سکتی ہیں"

"اس طرح جیسے کہ مرد عورتوں پر حکومت کر سکتے ہیں"

"میں اسے نہیں مانتا، مرد عورت کا محتاج نہیں ہے، عورت مرد کی محتاج ہے"

"آپ کا مطلب یہی تو ہے نا کہ عورت اپنی گزراوقات کے لیے مرد کی دست نگر ہے"

''اگر آپ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اختیار کی عنان سیاست کے طرح مدنیات میں بھی ہمیشہ ثروت کے ہاتھ رہی ہے اور رہے گی۔''

کاؤس جی اس مسئلہ پر بہت لکھ پڑھ چکے تھے اور اس کے ہر پہلو پر غور کیا تھا: بولے، ''اس اعتبار سے تو خدانخواستہ کسب معاش کا بوجھ عورت اٹھا رہی ہو تو اسے بھی اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تفریح کر سکے، آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے''

شاہ پور جی کی زندہ دلی نے متانت کی صورت اختیار کی

''میں عورت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا ہے''

''تو یہ آپ کی سراسر بے انصافی ہے''

''مطلق ہیں، عورت پر فطرت نے ایسی بندشیں عائد کر رکھی ہیں کہ وہ بخدا کوشش کرنے پر بھی مرد کی طرح مطلق العنان نہیں رہ سکتی، اور نہ حیوانی طاقت ہی میں مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے ہاں نسائیت کو ترک کر کے اور غیر فطری زندگی کی حمایت میں جا کر وہ سب کچھ کر سکتی ہے، اور آج بھی لاکھوں کروڑوں عورتیں اس آزادانہ روش پر چل رہی ہیں''

''آپ لوگ اسے مجبور کر رہے ہیں وہ نسائیت ترک کر کے یہ آزادانہ روش اختیار کرے۔''

''میں اس آنے والے زمانہ کا قیاس بھی نہیں کر سکتا جب مردوں کی حکومت اور فضیات کو تسلیم کرنے والی عورتوں کا قحط پڑ جائے قانون اور تہذیب سے بحث

نہیں میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ مردوں نے عورتوں پر ہمیشہ راج کیا ہے اور کریں گے"

دفعتاً کاؤس جی نے پہلو بدلا، اتنی تھوڑی سی دیر میں ترغیب نفس نے ان پر تسخیر کا عمل شروع کر دیا تھا شاہ پور جی کو تحسین کی نظروں سے دیکھ کر بولے "تو اس معاملہ میں میں اور آپ دونوں ہم خیال ہیں میں صرف آپ کی تھاہ لے رہا تھا میں عورت کو بیوی، ماں بہن کی صورت ہی میں دیکھ سکتا ہوں، اسے مطلق العنان نہیں دیکھ سکتا اگر کوئی عورت آزاد رہنا چاہتی ہے تو اسے میرے نظام تمدن میں کوئی جگہ نہیں ہے ابھی مسز شاہ پور کی باتیں سن کر حیرت میں آ گیا مجھے اس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ کوئی عورت اپنے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دے سکتی ہے۔ شاہ پور کی گردن کی رگیں تن گئیں، نتھنے پھول گئے، آنکھیں مشتعل ہو گئیں تنفس تیز ہو گیا کرسی سے اٹھ کر بولے "اچھا تو شیریں نے اب یہ پر نکالے ہیں میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں آپ کے روبرو پوچھتا ہوں ابھی فیصلہ کر ڈالتا ہوں مجھے اس کی پروا نہیں ہے بے وفا عورت، تنگ نظر، کور باطن، جس کے دل میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں جو میری تاریک زندگی میں روشنی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتی جو مجھے زندگی کی جگر کاریوں سے ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دینا چاہتی کیا وہ چاہتی ہے کہ میں ہمیشہ اس کے آنچل سے بندھا بندھا گھوموں،" شاہ پور سے وہ یہ امید رکھتی ہے، بیوقوف بھول جاتی ہے کہ ذرا سا آنکھ کا اشارہ کر دوں تو ایک سو شیریں آ کر ناز برداری کریں گے جی ہاں میرے تلوے سہلائیں میں نے اس کے لیے جو کچھ کیا شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت کے ساتھ کیا ہو گا۔۔۔ میں نے ۔۔۔ میں

نے۔۔۔۔۔۔''

انہیں معاً خیال آیا کہ ضرورت سے زیادہ بہکے جا رہے ہیں شیریں کی وہ محبت آمیز قربانیاں، وہ بے نفس خدمتیں یاد آ گئیں، ضبط کر کے بولے ''لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی سمجھ سے کام لے سکتی ہے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ احباب سے میری شکایت ہے اتنا مجبوری کا اظہار اس سے آگے قدم اٹھانے کی حماقت سر زد نہیں ہو سکتی اس کی غیرت قبول نہ کرے گی میں اسے منالوں گا عورتوں کا منا لینا بہت مشکل ہے کم سے کم مجھے تو یہی تجربہ ہے''

کاؤس جی نے تردید کی ''میرا تجربہ تو کچھ اور ہے''

''ممکن ہے، لیکن آپ کے پاس خالی خولی باتیں ہیں میرے پاس دولت کا تریاق ہے''

''انحراف کا اثر تریاق سے رد نہیں ہو سکتا''

شاہ پور جی نے خطرہ کا صحیح انداز کرنے کی کوشش کر کے کہا ''شاید آپ کا خیال درست ہو'' کئی دنوں کے بعد کاؤس جی کی ملاقات شیریں سے ہوئی، پارک میں وہ اسی موقع کے منتظر تھے، ادھر وہ شیریں کے گھر نہ گئے تھے اندیشہ تھا شاہ پور جی بد گمان نہ ہو جائیں ان کی جنت تعمیر ہو چکی تھی اس میں صرف شیریں کو مسند پر بٹھانے کی کسر تھی، اس روز سعید کے تصور میں وہ پاگل ہو رہے تھے بالکل خبر نہ تھی کہ اس جنت کی بنیادیں بالو پر ہیں یا پانی پر ہیں، امید کا سراب دیکھ کر بڑے دانا بھی شیخ چلی ہو جاتے ہیں گلشن کو انہوں نے میکے بھیج دیا بھیج کیا دیا وہ روٹھ کر چلی گئی

جب شیریں ان کی غربت اور بے سرو سامانی قبول کر رہی ہے تو گلشن کی ناز برداری کیوں کی جائے لپک کر شیریں سے ہاتھ ملایا اور بولے آپ خوب ملیں، میں تو آج آنے والا تھا شیریں نے شکایت کی آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں، شاید آپ بھی زبانی ہمدردی ہی کرنا جانتے ہیں آپ کو کیا خبر ان دنوں میں میری آنکھوں سے کتنے آنسو بہے؟

کاؤس جی نے شیریں کا وہ حسین چہرہ اشتیاق چمکتا ہوا اور رالتجا سے زہد شکن دیکھا تو ان کا دل اندر سے بیٹھتا ہوا معلوم ہوا اور اس طالب علم کی سی حالت ہوگئی جو آج تعلیم کی آخری منزل طے کر چکا ہو اور زندگی کا مسئلہ اپنی خوفناک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو کاش وہ کچھ دن اور امتحانوں کی بھول بھلیوں میں زندگی کے میٹھے سنہرے خوابوں کا لطف اٹھا سکتا اس خواب کے سامنے یہ حقیقت کتنی دلدوز تھی، کتنی ہمت شکن ابھی تک کاؤس جی نے مہا مکھی کا شہد ہی چکھا تھا اس وقت وہ ان کے چہرہ پر منڈلا رہی تھی اور وہ ڈر رہے تھے، کہیں ڈنک نہ مار دے دبی ہوئی آواز سے بولے "مجھے یہ سن کر دلی صدمہ ہوا میں نے تو شاہ پور کو بہت سمجھایا تھا" اب شیریں نے ان کا ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور آنکھوں میں اصرار اور رالتجا بھر کر بولی "ان پر اب سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا اور مجھے ہی کیا غرض پڑی ہے کہ ان کی خوشامد کرتی پھروں آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ لوٹ کر اس گھر میں نہ جاؤں گی، اگر انہیں عدالت میں ذلیل ہونے کا شوق ہے تو مجھ پر حق شوہریت کا دعویٰ کریں، میں تیار ہوں میں جس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اس کے ساتھ رہنے کے لیے خدا بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتا عدالت کیا چیز ہے، اگر

تمہارے دل میں وہ خلوص اور محبت ہے جس کا تم اشاروں میں بارہا اظہار کر چکے ہو اور جسے میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے جسے میں نے پیغام سمجھا ہے تو آج سے میں تمہاری بن کر رہنے کو تیار ہوں جب تک تم میرے رہو گے، میں دولت کی بھوکی نہیں یہ تم جانتے ہو میں صرف وفا اور محبت چاہتی ہوں، لیکن اگر تم میں اتنی اخلاقی ہمت نہیں ہے تو میرے لیے وسیع دنیا ہے میں جیسی کچھ بھی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میرے قدر دانوں کی کمی نہیں ہے صاف صاف بتاؤ کہ کیا وہ ساری ہمدردیاں زبانی تھیں'' کاؤس جی نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔

''نہیں نہیں شیریں خدا جانتا ہے، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں تم میری جنت کی دیوی ہو، میری زندگی کا روشن ستارہ۔۔۔''

''زیادہ لفاظی نہیں گلشن کا کیا کرو گے؟''

''اسے طلاق دے دوں گا''

ہاں میں بھی یہی چاہتی ہوں اور مجھے اس کا افسوس نہیں ہے میں اس کا بنا بنایا آشیانہ برباد نہیں کر رہی ہوں میں صرف اس کا آشیانہ برباد کر رہی ہوں جس کی اس نے کبھی قدر نہیں کی تو تمہارے ساتھ چلوں گی اسی وقت خوب سوچ لیا شاہ پور سے اب میرا کوئی تعلق نہیں، نہ دین کا نہ دنیا کا۔

کاؤس جی کو اپنے دل میں رعشہ کا احساس ہوا گدگدی نہیں تھی رعشہ تھا لرزہ کپکپی بولے، ''لیکن ابھی تو میرے گھر میں کوئی تیاری نہیں ہے''

شیریں نے بنچ سے اٹھ کر گویا دریا میں کودتے ہوئے کہا ''میرے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں تم سب کچھ ہو، ایک ٹیکسی لے لو، میں اسی وقت چلوں گی

تمہارے گھر سے شاہ پور کو ایک رقعہ لکھ دوں گی تم مجھ سے سیر ہو گئے اس لیے میں جاتی ہوں پھر نہ آؤں گی''

کاؤس جی ٹیکسی کی تلاش میں پارک سے نکلے، وہ اس پر غور کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے اس بہانہ سے وہ مہلت مل گئی اب ان پر جوانی کا وہ نشہ تھا جو کبھی کبھی ہمیں گڈھوں میں گرا دیا کرتا ہے ذات کی رسوائی کے، اگر کوئی نشہ ہوا بھی تو ہرن ہو چکا تھا بیشک انہیں پریشانی ہوگی، تباہی کے سامان بھی ہو سکتے ہیں اور رسوائی کے بھی شاہ پور جی ان کے قاتل دشمن ہو جائیں گے اور انہیں خاک میں ملا دینے کے لیے اپنی ثروت اور اختیار کے سارے وسائل کام میں لائیں گے۔ گلشن بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں، وہ گلی گلی کوچے کوچے رسوا کرے گی اخباروں میں کہرام مچ جائے گا حریفوں کی قسمت جاگ اٹھے گی اس واقعہ کو جلی سرخیوں سے شائع کریں گے بالہوا سی کے کرشمے ایک شکاری ایڈیٹر کی رنگین مزاجی، نئی تہذیب کا دیوالیہ وغیرہ مگر یہ سب مصیبتیں جھیلنے کے لیے وہ تیار تھے شاہ پور جی کی زبان بند کرنے کے لیے ان کے پاس کافی دلیلیں تھیں، شہادتیں تھیں۔ گلشن کو بھی طبقہ اناث میں ذلیل کرنے کا ان کے پاس کافی سامان موجود تھا۔

''شیریں جیسی حسینہ کو اپنی حمایت میں لینا عذاب نہیں ہے جناب نہایت خوش گوار فرض ہے اور بہت سعی کے بعد آپ کو یہ موقع ہاتھ آیا ہے، میں تو روٹھنے منانے کے تماشوں میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا اس کا بھی ایک زمانہ تھا مگر مدت ہوئی بزم چراغاں کیے ہوئے۔''

کار چل دی اور کاؤس جی مخمصے کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔ دیر ہو رہی

تھی سوچنے لگے کہیں شیریں یہ نہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے بھی اس کے ساتھ دغا کی لیکن جائیں کیسے اس امیر زادی کو اس اپنی سنسان کٹیا میں لے جانے کا خیال ہی انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوا حیرت یہی تھی کہ پہلے یہ خیال ان کے دل میں کیوں نہ آیا وہ کٹیا تو اسی لیے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے امارت اور نفاست کے لیے وہاں جگہ کہاں؟ بلبل کے لیے گلشن چاہیے ویرانے میں اس کی دلچسپی کے سامان کہاں اس کٹیا کے لیے تو گلشن ہی موزوں ہے کڑھتی ہے کوستی ہے، جلاتی ہے، روتی ہے، لیکن وقت پر کھانا تو دے دیتی ہے پھٹے ہوئے کپڑوں پر رفو کر دیتی ہے کوئی مہمان آجاتا ہے تو خندہ پیشانی سے اس کی خاطر و تعظیم کرتی ہے چھوٹی سی سوغات بھی دے دو تو کتنی خوش ہو جاتی ہے تھوڑی سی تعریف کر کے چاہے اس سے غلامی کروالو، اب انہیں اپنا ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلا پڑنا اس کی سیدھی باتوں کا ٹیڑھا جواب دینا، شیریں کی شرافت کی نظر میں اسے ذلیل کرنا یاد آنے لگا ان کی حق پروری اور عالی نفسی کیا محض تحریر کے لیے وقف ہے محض ان کے لیے جو اس سے دور ہیں بے تعلق ہیں اس دن گلشن نے تو یہی کیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ کے موقع پر کوئی تحفہ بھیجنا چاہیے۔ اس میں برس برس پڑنے کی کون سی بات تھی مانا وہ ادارتی مقالہ لکھنے میں محو تھے لیکن ان کے لیے ادارتی مقالہ جتنا اہم اور ضروری ہے کیا اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضروری اور اہم گلشن کے لیے تحفہ بھیجنا نہیں ہے بیشک ان کے پاس روپے نہیں تھے اس وقت معمولی سوغات سے گلشن کی تسکین نہ ہوتی لیکن میٹھے الفاظ میں وہ یہ نہ کہہ سکتے تھے ڈارلنگ مجھے افسوس ہے اس وقت میں تنگدست

ہوں لیکن دو چار روز میں کوئی انتظام کر دوں گا یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتی ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی ترک موالات تو نہ کر بیٹھتی اپنے مقالات اور مضامین میں بھی وہ کتنی ملاحت وفصاحت اور خوش بیانی سے کام لیتے تھے ایک بھی دل آزار کلمہ ان کے قلم سے نہ نکلتا تھا، دنیائے فصاحت میں ان کا قلم اپنی لطافت کے لیے مشہور تھا کیا اسی خوف سے کہ وہ گورنمنٹ اور پبلک دونوں ہی سے ڈرتے تھے جانتے تھے کہ ذرا بھی سخت کلامی کی تو گردن ناپی گئی ان کے آئین صفات میں غصہ اور ہٹ دھرمی بہت بڑے گناہ تھے پھر وہ گلشن پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے کیا اس لیے کہ وہ ان کی دست نگر ہے اور روٹھ جانے کے سوا انہیں اور کوئی سزا نہیں دے سکتی کتنی کمینہ خود غرضی ہے کہ وہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دم ہلائیں اور جوان کے لیے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہے اور کرتی ہے اسے کاٹنے دوڑیں۔ ان کا دھیان اس تانگہ کی طرف گیا جو یکایک سامنے رک گیا تھا کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ تانگے والے اندھا دھند دوڑا چلا جاتا ہے اچھا اس پر تو کوئی لیڈی صاحبہ سوار ہیں ''خالہ'' آپ کو تانگے پر کار کا لطف اٹھانے کا خبط ہوا ہوگا ارے یہ تو گلشن ہے ہاں وہی، اور میری ہی طرف آ رہی ہے۔ انہوں نے تپاک سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور بولے تم اس وقت یہاں کیسے آئیں، میں ابھی ابھی تمہارا ہی خیال کر رہا تھا۔ گلشن نے رقت آمیز لہجے میں کہا تمہارے ہی پاس آ رہی تھی آج برآمدے میں بیٹھی تمہارا مقالہ پڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کب جھپکی آ گئی اور میں نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ مارے خوف کے آنکھ کھل گئی پاک نفس عورت کے لیے وہ اس سے کہیں سخت آزمائش کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے خوف

تھا تو یہ کہ شیریں کی اس محبت میں قیام بھی ہے ابھی تک شیریں نے انہیں انصاف اور حق کے وکیل کی نظر سے دیکھا ہے صرف ان کے بیدار مغز مضامین پڑھے ہیں صرف ان کی شرافت اور ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں سنی ہیں اس میدان میں تو انہیں شاہ پور سے کسی قسم کا اندیشہ تھا اخلاقی اوصاف میں شاہ پور ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ان کی شرافت ذکاوت کا وہ رنگ ان کی بے سروسامانی اور بد حالی میں کچھ عرصہ تک قائم رہے گا، اس میں انہیں شک تھا حلوے کی جگہ چپڑی روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے روکھی بھی مل جائے تو شاید وہ قناعت کرے لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر تو فرشتے بھی جامے سے باہر ہو جائیں گے شیریں کو ان سے محبت ہے، اس میں شک نہیں لیکن محبت کی قربانی کی بھی کوئی حد ہے دو چار دن یا دو مہینے تو شعریت کے نشے میں وہ خاموشی سے کاٹ لے گی، لیکن شعریت اور کیفیت قائم رہنے والی چیزیں تو نہیں حقیقتوں کی یورش کے مقابلہ میں شعریت کتنے دن کٹے گی'' اس پھُوہڑا لیدر کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھتے، اب تک وہ محل میں رہی ہے اب اسے پھونس کی جھونپڑی ملے گی جس کے فرش پر ایرانی قالینوں کی جگہ ٹاٹ بھی نہیں کہاں وردی پوش ملازموں کی پلٹن، کہاں ایک بڑھیا ماں کی کج بحثیاں، جو بات پر جھنجھناتی ہے، کوستی ہے اور چھوڑ کر چلی جانے کی دھمکی دیتی ہے ان کی آدھی تو موسیقی ماسٹر کی نذر ہو جائے گی جو اسے گانا سکھانے آتا ہے اور کہیں شاہ پور جی نے سفلہ پن سے کام لیا تو انہیں بدمعاشوں سے پٹوا سکتے ہیں قتل کرا سکتے ہیں خیر ان باتوں سے وہ نہیں ڈرتے، یہ تو ان کی فتح ہو گی، لیکن شیریں کی نفاست پسندی اور شوق نمود پر کیسے فتح پائیں بڑھیا ماں جب منہ

پھلائے آکر اس کے سامنے روٹیاں اور سالن رکھ دے گی۔ چاندی کے ظروف میں نہیں چینی کی طشتریوں میں، تب شیریں کے شگفتہ چہرے پر کیسی مظلوم مایوسی طاری ہو جائے گی کہیں وہ اس برانگیختی کے عالم میں ان کو اور اپنی قسمت کو لعنت نہ بھیجنے لگے تمول کی کمی نازبرداریوں سے نہیں پوری کی جاسکتی''

دفعتاً سامنے سے ایک کار نظر آئی، کاؤس جی نے دیکھا، شاہ پور جی رونق افروز تھے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کار کو روک لیا اور پیچھے دوڑتے ہوئے آکر شاہ پور جی سے بولے ''آپ کہاں جارہے ہیں؟''

''یوں ہی ذرا گھومنے نکلا ہوں''

''شیریں بانو پارک میں ہیں انہیں لیتے جائیے''

''وہ تو مجھ سے لڑکر آئی ہیں کہ اب گھر میں قدم نہ رکھوں گی''

''اور آپ سیر کرنے جارہے ہیں''

''تو کیا بیٹھ کر روؤں''

''ہمدردی کرنے کو تو آپ ہی ہیں''

''آپ انہیں منائیں، ذرا ان کے آنسو پونچھیں وہ ضرور آپ کے ساتھ چلی جائیں گی''

''میں امتحان لینا چاہتا ہوں کہ وہ بغیر منائے مانتی ہیں یا نہیں''

''میری جان بڑے عذاب میں ہے آپ مجھ پر رحم کیجئے آپ کے پیروں پڑتا ہوں''

''اور تم سے ملنے چل پڑی دل بے چین ہو رہا تھا تم اس وقت یہاں کیوں

کھڑے ہو کوئی حادثہ تو نہیں وہ گیا؟ میرا سینہ دھک دھک کر رہا ہے ہاتھ رکھ کر دیکھو''

کاؤس جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''میں خدا کے فضل سے بہت اچھی طرح ہوں کیا خواب دیکھا تم نے؟''

''میں نے دیکھا جیسے تم ایک عورت کے پیروں پر سر رکھے ہوئے ہو اور وہ تمہیں پائے حقارت سے ٹھکرا رہی ہے''

''کتنا بیہودہ اور مہمل خواب ہے اور تمہیں اس پر یقین آ گیا میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ خواب محض فکر دل کے اوہام ہیں''

''گلشن نے ان کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا تم مجھ سے چھپا رہے ہو کوئی نہ کوئی بات ہوئی ضرور ہے اچھا تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو یہ تو تمہارے لکھنے کا وقت ہے''

''یونہی ذرا گھومنے چلا آیا تھا''

''جھوٹ بولتے ہو، کھا جاؤ میرے سر کی قسم''

''اب تمہیں اعتبار نہ آئے تو اس کا کیا علاج؟''

''قسم کیوں نہیں کھاتے؟''

''قسم کو میں کذب کی تائید سمجھتا ہوں''

گلشن نے پھر ان کے چہرے پر متجسس نگاہ ڈالی، پھر ایک لمحہ کے بعد بولی۔

''اچھی بات ہے چلو گھر چلیں''

کاؤس جی نے مسکرا کر کہا ''تم مجھ سے پھر لڑائی کرو گی''

گلشن نے برجستہ کہا ''سرکار سے لڑ کر بھی تم سرکار کی عملداری میں رہتے ہو کہ نہیں''

''ہم اسے کب مانتے ہیں کہ سرکاری عملداری ہے''

''یہ تو محض زبان سے کہتے ہو تمہارا رواں رواں اسے تسلیم کر رہا ہے نہیں تو تم اس وقت جیل میں ہوتے''

''اچھا تو تم چلو میں ذرا دیر میں آتا ہوں''

''میں اکیلی نہیں جانے کی، آخر سنو، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کاؤس جی نے بہت کوشش کی کہ گلشن یہاں سے کسی طرح چلی جائے، لیکن وہ جتنا ہی اس پر زور دیتا تھا اتنی ہی گلشن اور ضد پکڑتی تھی آخر مجبور ہو کر کاؤس جی کو شاہ پور اور شیریں کی خانہ جنگیوں کی داستان کہنی پڑی۔ ہاں اس ناٹک میں اس کا اپنا جو حصہ تھا اسے اس نے بڑی ہوشیاری سے چھپانے کی کوشش کی۔

گلشن نے الہامی انداز سے کہا، ''تو تمہیں یہ جنون بھی سوار ہوا''

'' کاؤس جی نے اپنی صفائی دی کیا جنون میری اس میں کیا خطا؟''

''تم کیوں بیچ میں پڑے، آخر شیریں نے تم سے کیوں دادخواہی کی؟''

''اب یہ انسانیت نہیں ہے کہ ایک ایک دوست کی بیوی مجھ سے فریاد کرے اور میں بغلیں جھانکتا پھروں''

گلشن نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا، '' جھوٹ بولنے کے لیے بڑی عقل کی ضرورت ہوتی ہے پیارے! اور وہ عقل تم میں نہیں ہے، سمجھے! تم اپنا اخبار لکھے جاؤ اور حق وانصاف کے نعرے لگائے جاؤ ان خانہ جنگیوں میں پڑ کر تمہاری زندگی تلخ

ہو جائے گی اور تمہارے ساتھ میری بھی چپکے سے جا کر شیریں بانو کو سلام کرو اور کہو کہ جا کر اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں مسرت کامل کا دنیا میں وجود نہیں مشیت اتنی بے انصافی نہیں کرسکتی جس طرح غم میں کچھ خوشی ہوتی ہے اسی طرح خوشی میں کچھ غم بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر مسرت کا لطف اٹھانا ہے تو اس کے کانٹوں اور داغوں اور خامیوں کے ساتھ اٹھانا پڑے گا ابھی سائنس نے کوئی ایسی ایجاد نہیں کی جس سے ہم مسرت کو اس کے کانٹوں سے علیحدہ کرسکیں مفت کا مال اڑانے والوں کو عیاشی کے سوا اور کیا سوجھے گا؟''

دولت اگر ساری دنیا کی لذتوں کو خریدنا چاہے تو وہ دولت ہی کیسی اشتہائیں بس میں نہیں ہوتیں کبھی نہیں کیا شیریں کے لیے بھی وہی دروازے نہیں کھلے ہیں، جو شاہ پور جی کے لیے کھلے ہوئے ہیں اس سے کہو شاہ پور جی کی چھاتی پر مونگ دلے۔ ان کی دولت سے خط اٹھائے اور بھول جائے کہ وہ شاہ پور جی کی بیوی ہے، اسی طرح جیسے شاہ پور بھول گیا ہے، وہ شیریں کا شوہر ہے جلنا اور کڑھنا چھوڑ کر وقت کے مزے لوٹے اس کی دولت ایک سے ایک حسین اور رنگین مزاج نوجوان کو کھینچ لائے گی تم نے ہی کہا تھا کہ ایک زمانہ میں فرانس میں باثروت اور عیاش عورتوں کا سارے سماج پر راج تھا۔ ان کے شوہر سب کچھ دیکھتے تھے اور منہ نہ کھول سکتے تھے اور خود بھی اس دھن میں مست تھے یہی دولت کا فیض ہے آج سے نہیں ازل سے، تم سے نہ بنے تو چلو میں شیریں کو سمجھا دوں عیاش مرد کی بیوی اگر عیاش نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی اور بے شرمی ہے۔

کاؤس جی کے لیے یہ فلسفہ بالکل اچھوتا تھا گلشن کی ذکاوت نے کبھی اتنی

اونچی پرواز نہ کی تھی حیرت میں آ کر بولے ''لیکن تم بھی دولت کے پرستاروں میں ہو''

گلشن نے شرمندہ ہو کر کہا ''یہی تو میری زندگی کی لعنت ہے ہم اسی چیز پر لپکتے ہیں جو ہمیں جہنم کی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے میں پاپا کے ساتھ عرصہ تک دیہات میں رہی ہوں وہاں چاروں طرف مزدور اور کسان رہتے تھے بچارے دن بھر پسینہ بہاتے تھے، شام کو جیسے مر جاتے، عیاشی اور بدمعاشی کا کہیں نام نہ تھا اور یہاں میں شہر میں دیکھتی ہوں کہ سبھی بڑے گھروں میں یہی رونا ہے سبھی لوگ ہتھکنڈے سے پیسے کماتے، بے محنت و مشقت اور غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں انہیں عیاشی نہ سوجھے تو اور کیا سوجھے، اگر آج تمہیں کہیں سے دولت مل جائے تو تم بھی شاہ پور بن جاؤ گے یقیناً''

کاؤس جی نے شرارت سے پوچھا، ''تب شاید تم بھی یہ نیا طرزِ عمل اختیار کرو گی''

گلشن نے متبسم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''شاید نہیں، یقیناً''

☆☆☆☆☆☆

کفن

پہلی بار: ''جامعہ'' دسمبر 1935ء میں شائع ہوا

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے جاڑوں کی رات تھی فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں سارا دن تڑپتے ہو گیا جا و دیکھ تو آ''

مادھو دردناک لہجے میں بولا ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی دیکھ کر کیا آؤں''

''تو بڑا بے درد ہے بے سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔''

''تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹو پھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھ، جب

دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی کاشتکاروں کا گاؤں تھا محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لیے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی عجیب زندگی تھی ان لوگوں کے گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اونکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی پسپائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی جب

سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑ نے بھی لگے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے وہی عورت آج صبح سے دردزہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا ''جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھنساؤ ہوگا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا بولا ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے''

''ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی''

''تو تم ہی جا کر دیکھونا''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں''

''سب کچھ آئے گا بھگوان بچہ دیں تو جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے میرے نو لڑکے ہوئے گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر

بار کام چلا گیا۔‘‘

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے وہاں سے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا اسی لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں

بیس سال پہلے وہ گیا تھا اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی بولا ''وہ بھوج نہیں بھولتا تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی سٹپنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا کوئی روک نہیں تھی جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی کھڑا نہ ہوا جاتا تھا چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔''

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا''

''اب کوئی کیا کھلائے گا وہ جمانا دوسرا تھا اب تو سب کو کھپایت سوجھتی ہے سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو، پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے ہاں کھرچ میں کھپایت سوجھتی ہے''

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی''

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں''

''میں پچاس کھا جاتا''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی اچھا پٹھا تھا تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔''

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے چوری کی علت میں وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں پوچھا کیا ہے بے گھیسوا روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں

رہنا نہیں چاہتے۔

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا ’’سرکار بڑی بپت میں ہوں مادھو کی گھر والی رات گجر گئی دن بھر تڑپتی رہی۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہوسکا سب کیا مگر وہ ہمیں دگا دے گئی اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک تباہ ہو گئے گھر اجڑ گیا آپ کا گلام ہوں اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا سب دوا دارو میں اٹھ گیا سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی آپ کے سوا اور کس کے دارو پر جاؤں؟‘‘

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے حرام خور کہیں کا بدمعاش ’’مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو‘‘

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہوگئی کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر لوگ بانس واس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کے بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟''

مادھو بولا ''ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیے''

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں''

''ہاں اور کیا لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے''

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔''

''کپھن لاش کے ساتھ جل تو جاتا ہے''

''اور کیا رکھا ہے یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی کچھ گزک اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا ''کپھن لگانے سے کیا ملتا جل ہی تو جاتا کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا

ہوں۔

''دنیا کا دستور ہے یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دیتے ہیں کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں''

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے؟''

کھیسو ہنسا'' کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے بہت ڈھونڈا ملے نہیں''

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا

''بڑی اچھی تھی بیچاری مری بھی تو خوب کھلا پلا کر''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی کھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی مادھو لپک کر دو پتلون میں ساری چیزیں لے آیا، پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کرلیا تھا کھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا ہماری آتما پرسن ہورہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا۔

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی ''جرور سے جرور ہوگا بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو اسے بیکھنٹھ لے جاتا ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے

ہیں آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

''کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر''

''پوچھے گی تو جرور''

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے''

مادھو کو یقین نہ آیا بولا ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے''

گھیسو تیز ہو گیا ''میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں''

''کون دے گا بتاتے کیوں نہیں''

''وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پیئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی

رونق بھی بڑھتی جاتی تھی کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا وہاں کی فضا میں سرور تھا ہوا میں نشہ، کتنے تو چلو میں اوہو جاتے ہیں یہاں آئے تھے صرف خودفراموشی کا مزہ لینے کے لیے شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے جاتے زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں کتنے خوش نصیب ہیں دونوں پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''دینے'' کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا ''لے جا کھوب کھا اور اسیر باد دے جس کی کمائی تھی وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا روئیں روئیں سے اسیر باد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ''بیکنٹھ میں جائے گی دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا ''ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا نہیں کسی کو دبایا نہیں مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے

بڑی لالسا پوری کر گئی وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا تلون نشے کی خاصیت ہے یاس اور غم کا دورہ ہوا

مادھو بولا ''مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا''

گھیسو نے سمجھایا کیوں روتا ہے بیٹا کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی جنجال سے چھوٹ گئی بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکا وے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے پھر دونوں ناچنے لگے اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

☆☆☆☆☆☆

دو بہنیں

پہلی بار: ہندی میں، اسی عنوان سے ''مادھوی'' اگست 1936ء میں شائع ہوا

کتابی صورت میں: 1938ء (دودھ کی قیمت)

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی ہے کچھ اس کا رنگ کھل گیا ہے مزاج میں کچھ تمکنت آ گئی ہے اور بات چیت کرنے میں کچھ زیادہ مشاق ہو گئی ہے بیش قیمت ساری اور بیلدار رعنائی مخمل کے جمپر نے اس کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہی رام دلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑسی ادھر ادھر کھیلا کرتی تھی، آخری بات روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا دو سال قبل تک بھی اس کی شکل وصورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا۔ لمبی تو ہو گئی تھی مگر تھی اتنی ہی دبلی اتنی ہی زرد رو اتنی ہی بدتمیز ذرا ذرا سی بات پر روٹھنے والی مگر آج تو کچھ حالت ہی اور تھی جیسے کلی کھل گئی ہو اور حسن اس نے کہاں چھپا رکھا تھا، نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے یہ حسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے۔ ریشم مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا پھر بھی وہ آنکھوں میں سمائی جاتی ہے پچاسوں عورتیں جمع ہیں مگر یہ سحر، یہ کشش اور کسی میں نہیں۔

اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دہک اٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو وہ ذرا اپنی صورت بھی دیکھتی گھر سے چلتے وقت اس نے اپنی صورت دیکھی تھی اسے چمکانے کے لیے جتنا صیقل کر سکتی تھی وہ کیا تھا لیکن اب وہ صورت جیسے یادداشت سے مٹ گئی ہے اس کی محض ایک دھندلی سی پرچھائیں ذہن میں ہے۔ اسے پھر سے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہو رہی ہے یوں تو اس کے ساتھ میک اپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگھار کرنے کی عادی نہیں ہے یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں یہاں کوئی آئینہ تو ہوگا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہوگا وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی اور قد آدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی اس کے خدوخال بے عیب ہیں مگر وہ تازگی وہ شگفتگی وہ نظر فریبی نہیں ہے رام دلاری آج کھلی ہے اور اسے کھلے ہوئے زمانہ ہو گیا لیکن اس خیال سے اسے تسکین نہیں ہوئی وہ رام دلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی یہ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں کسی میں اصلی حسن کی پرکھ نہیں انہیں تو جوانی، شرخی اور نفاست چاہیے آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں میرے کپڑوں میں رام دلاری کو کھڑا کر دو پھر دیکھو، یہ سارا جادو کہاں اڑ گیا ہے چڑیل سی نظر آئے ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے شادی میں جو جوڑے اور زیور آئے تھے وہ بہت ہی دل شکن تھے امارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا اس کے سسر ایک ریاست کے مختار عام تھے۔ اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا اس دو سال میں کیسے ہن برس گیا کون جانے زیور کسی سے مانگ کر لائی ہو کپڑے بھی دو چار

دن کے لیے مانگ لیے ہوں اسے یہ سوانگ مبارک رہے میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں اپنی حیثیت کو بڑھا کر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے گھر میں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں ہے لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے، درزیوں کے اور بزاز کے تقاضے سہیں گی شوہر کی گھڑکیاں کھائیں گی روئیں گی، روٹھیں گی، مگر نمائش کے جنون کو نہیں روک سکیں گھر والے بھی سوچتے ہوں گے کتنی چھچھوری طبیعت ہے اس کی مگر یہاں تو بے حیائی پر کمر باندھ لی۔ کوئی کتنا ہی ہنسے بے حا کی بلا دور بس یہی دھن سوار رہے کہ جدھر سے نکل جائیں ادھر اس کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لیے ہیں۔ بے شرم جو ہے۔ اس کے چہرے پر غرور کی سرخی جھلک پڑی نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں بھگوان انہیں زندہ سلامت رکھے وہ اسی میں خوش ہے خود اچھا پہن لینے اور اچھا کھا لینے ہی سے تو زندگی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا اس کے گھر والے غریب ہیں پر عزت تو ہے کسی کا گلہ تو نہیں دباتے کسی کی بد دعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کر کے وہ پھر برآمدے میں آئی تو رام دلاری نے جیسے رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا

''جیجا جی کی کچھ ترقی ورقی ہوئی کہ نہیں بہن یا ابھی تک وہی پچھتر پر قلم گھس رہے ہیں''

روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی اُفوہ رے دماغ گویا اس کا شوہر

لاٹ ہی تو ہے اکڑ کر بولی ''ترقی کیوں نہیں ہوئی اب سو کے گریڈ میں ہیں آج کل یہ بھی غنیمت ہے میں تو اچھے اچھے ایم اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا تیرا شوہر اب بی اے میں ہوگا۔''

''انہوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا ہے بہن! پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا اور کیا ایک کمپنی کے ایجنٹ ہو گئے ہیں اب ڈھائی سو روپیہ ماہوار کماتے ہیں کمیشن اوپر سے پانچ روپیہ روز سفر خرچ کے بھی ملتے ہیں یہ سمجھ لو پانچ سو کا اوسط پڑ جاتا ہے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے بہن! اونچے عہدہ پر ہیں تو اچھی حیثیت بھی بنائے رکھنی لازمی ہے ساڑھے تین سو روپیہ بے داغ گھر دے دیتے ہیں اس میں سو روپے مجھے ملتے ہیں ڈھائی سو میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے ایم اے پاس کر کے کیا کرتے۔''

روپ کماری اسے شیخ چلی کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں دینا چاہتی تھی مگر رام دلاری کے لہجے میں اتنی صداقت ہے کہ تحت الشعور میں اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خفت شکست کی بدمزگی صاف جھلک رہی ہے مگر اسے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے مٹا دینا پڑے گا اسے جرحوں سے اپنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی سے زیادہ حقیقت نہیں ہے وہاں تک وہ برداشت کرے گی اس سے زیادہ کیسے برداشت کر سکتی ہے اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ اگر یہ روداد سچ نکلی تو وہ کیسے رام دلاری کو منہ دکھا سکے گی اسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں کہاں پچھتر اور کہاں پانچ سو، اتنی بڑی رقم ضمیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے

پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے پانچ سو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا" جب آنجہٹی میں اتنی تنخواہ اور بھتے ملتے ہیں تو کالج بند کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں"

رام دلاری بہن کی خفت کا مزا اٹھاتی ہوئی بولی" بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو ایم اے تو سب ہی پاس ہو سکتے ہیں مگر آنجہٹی کرنی کس کو آتی ہے یہ خداداد ملکہ ہے کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اچھا ایجنٹ ہو جائے روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز ہے اپنے مال کی خوبی کا یقین پیدا کر دینا یا ذہن نشین کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیرپا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی آسان کام نہیں ہے ایک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کی تالیف قلب کرنی پڑتی ہے اوروں کی تو ان راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے شروع شروع میں انہیں بھی جھجک ہوئی تھی مگر اب تو اس دریا کے مگر ہیں۔اگلے سال ترقی ہونے والی ہے"

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوئی جا رہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ بے رحم زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری جو حسین ہے تمیز دار ہے کفایت شعار ہے اپنے شوہر پر جان دیتی ہے، بچوں کو یہ جان سے عزیز سمجھتی ہے اس کی خستہ حالی میں بسر ہو اور یہ بد تمیز،

تن پرور چنچل چھوکری رانی بن جائے مگر اب بھی کچھ امید باقی تھی شاید اس کی تسکین قلب کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اسی تمسخر کے انداز سے بولی ''تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں''

ایک ہزار تو نہیں مگر چھ سو میں شبہہ نہیں

کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہوگا؟

بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے جب تم انہیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں چھ سو ملیں جو ساری دنیا کو چرائے اسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا۔

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر روپ کماری نے تحقیر شروع کی میں تو اس کی بہت معزز پیشہ نہیں سمجھتی سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو یہ ٹھیک بدیا ہے۔

رام دلاری زور سے ہنسی روپ کماری پر اس نے کامل فتح پائی تھی اس طرح تو جتنے وکیل بیرسٹر ہیں سبھی ٹھیک بدیا کرتے ہیں اپنے موکل کے فائدے کے لیے انہیں جھوٹی شہادتیں تک بنانی پڑتی ہیں مگر ان ہی وکیلوں کو ہم اپنا لیڈر کہتے ہیں انہیں اپنی قومی سبھاؤں کا صدر بناتے ہیں ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں ان پر پھولوں کی اور زر و جواہر کی برکھا کرتے ہیں آج کل دنیا پیسہ دیکھتی ہے پیسے کیسے آئیں یہ کوئی نہیں دیکھتا جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے جو بدنصیب ہیں نا قابل ہیں پست ہمت ہیں ضمیر اور اخلاق کی دہائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے۔

روپ کماری خاموش ہوگئی اب یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دلاری اس سے زیادہ خوش نصیب ہے اس سے مفر نہیں تمسخر

یا تحقیر ہے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی اسے کسی بہانے سے رام دلاری کے گھر جا کر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی۔ اگر رام دلاری واقعی ٹاشمی کا برادران پا گئی ہے تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھ لے کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے کہیں ایمانداری کی قدر نہیں ہے مگر کیا سچ مچ اس خیال سے اسے تسکین ہوگی یہاں کون ایماندار ہے وہی جسے بے ایمانی کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اتنی ہمت ہے کہ وہ موقع پیدا کر لے اس کے شوہر پچھتر روپے ماہوار پاتے ہیں مگر کیا دس بیس روپے اور اوپر سے مل جائیں تو وہ خوش ہو کے نہ لیں گے؟ ان کی ایمانداری اور اصول پروری اس وقت تک ہے جب تک موقع نہیں ملتا جس دن موقع ملا ساری اصول پروری دھری رہ جائے گی اور تب تک روپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ناجائز آمدنی سے روک دے۔ روکنا تو درکنار، وہ خوش ہوگی۔ شاید وہ اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے ابھی ان کے دفتر سے واپسی کے وقت من مارے بیٹھی رہتی ہے تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی اور جوں ہی وہ گھر میں آئیں گے ان کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا رام دلاری امنگ کے ساتھ گا رہی تھی اور روپ کماری وہیں برآمدے میں اداس بیٹھی ہوئی تھی نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا کوئی گائے، کوئی ناچے اسے کوئی سروکار نہیں وہ تو بدنصیب ہے رونے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کے مہمان رخصت ہونے لگے روپ کماری بھی اٹھی یکہ منگوانے

جا رہی تھی کہ رام دلاری نے کہا۔

’’یکہ منگوا کر کیا کرو گی بہن مجھے لینے کے لیے ابھی کار آتی ہو گی دو چار دن میرے یہاں رہو پھر چلی جانا میں جیجا جی کو کہلا بھیجوں گی‘‘

روپ کماری کا آخری حربہ بھی بے کار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر دریافت حال کی خواہش یکایک فنا ہو گئی وہ اب اپنے گھر جائے گی اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی ان پھٹے حالوں کیوں کسی کے گھر جائے بولی ’’بہن ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہے پھر کبھی آؤں گی‘‘

’’کیا رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی‘‘

’’نہیں میرے سر میں زور کا درد ہو رہا ہے‘‘

’’اچھا بتاؤ کب آؤ گی، میں سواری بھیج دوں گی‘‘

’’میں خود کہلا بھیجوں گی‘‘

’’تمہیں یاد نہ رہے گی سال بھر ہو گیا بھول کر بھی نہ یاد کیا میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں ایک ہی شہر میں رہتے ہیں پھر بھی اتنی دور کہ سال بھر گزر جائے اور ملاقات نہ ہو‘‘

’’گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں مگر موقع ہی نہ ملا‘‘

اتنے میں رام دلاری کے شوہر مسٹر گرو سیوک نے آ کر بڑی سالی کو سلام کیا بالکل انگریزی وضع تھی کلائی پر سونے کی گھڑی آنکھوں پر سنہری عینک بالکل اپٹوڈیٹ جیسے کوئی تازہ دار رسوئین ہو چہرے سے ذہانت، متانت اور شرافت

برس رہی تھی وہ اتنا خوش رو اور جامہ زیب ہے روپ کماری کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا۔

دعا دے کر بولی ''آج یہاں نہ آتی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی''

گروسیوک ہنس کر بولا ''بجا فرماتی ہے الٹی شکایت کبھی آپ نے بلایا اور میں نے گیا''

''میں نہ جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھے ہو وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے''

''اب مان گیا بھابی صاحب بے شک میری غلطی ہے ان شاء اللہ اس کی تلافی کروں گا مگر آج ہمارے گھر رہیے۔''

''نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے پھر آؤں گی لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے''

رام دلاری بولی ''میں کتنا کہہ کر ہار گئی مانتی ہی نہیں''

دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں گروسیوک ڈرائیو کرتا ہوا چلا ذرا دیر میں اس کا مکان آ گیا رام دلاری نے پھر روپ کماری سے چلنے کے لیے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی لڑکے گھبرا رہے ہوں گے آخر رام دلاری اس سے گلے مل کر اندر چلی گئی گروسیوک نے کار بڑھائی روپ کماری نے اڑتی ہوئی نگاہ سے رام دلاری کا مکان دیکھا! اور ٹھوس حقیقت سلاخ کی طرح اس کے جگر میں چبھ گئی کچھ دور چل کر گروسیوک بولا

''بھابی میں نے اپنے لیے کیسا اچھا راستہ نکال لیا دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا۔''

روپ کماری نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا ''رام دلاری نے مجھ سے کہا بھگوان جہاں رہو خوش رہو، ذرا ہاتھ پیر سنبھال کر رہنا''

میں مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں دولت کا مزہ تو جب ہے کہ ایمان سلامت رہے ایمان کھو کے پیسے ملے تو کیا میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں اور آنکھیں کس کی بچاؤں۔ سب سیاہ سفید تو میرے ہاتھ میں ہے مالک تو کوئی ہے نہیں اس کی بیوہ ہے اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے میں نے اس کا کاروبار سنبھال نہ لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا میرے سامنے تو مالک صرف تین مہینے زندہ رہے مگر بڑا مردم شناس آدمی تھا مجھے سو روپے پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں اڑھائی سو کر دیا۔ آپ لوگوں کی دعا سے میں نے پہلے ہی مہینے میں بارہ ہزار کا کام کیا۔

''کام کیا کرنا پڑتا ہے؟''

''وہی مشینوں کی ایجنسی طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا''

روپ کماری کا منحوس گھر آ گیا دروازے پر ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی اس کے شوہر بابو اما ناتھ دروازے پر ٹہل رہے تھے روپ کماری اتری مگر اس نے گرو سیوک سے آنے کے لیے اصرار نہ کیا بے دلی سے کہا ضرور مگر زور نہ دیا اور اما ناتھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

روپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے پھوٹا ہوا نصیب ہو نہ کہیں فرش نہ فرنیچر نہ گملے دو چار ٹوٹی کرسیاں، ایک لنگڑی میز، چار پانچ پرانی دھرانی کھاٹیں یہی اس کے گھر کی بساط تھی آج صبح تک روپ کماری اس گھر میں

خوش تھی لیکن اب اسے اس گھر سے مطلق دلچسپی نہ رہی لڑکے اماں اماں کر کے دوڑے مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا سر میں درد ہے وہ کسی سے نہ بولے گی ابھی تک کھانا نہیں پکایا پکاتا کون؟ لڑکوں نے دودھ پی لیا ہے مگر اماناتھ نے کچھ نہیں کھایا اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے مجبوراً بازار سے پوریاں لانا پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا ''تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے اور جو رات بھر وہیں رہ جاتی؟ آخر ایک مہراجی کیوں نہیں رکھ لیتے یا زندگی بھر مجھی کو پیستے رہو گے؟''

اماناتھ نے اس کی طرف مظلوم اور سوال حیرت کی نگاہ ڈالی اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کو سمجھ میں نہ آیا روپ کماری سے انہوں نے ہمیشہ بے عذر اطاعت پائی تھی بے عذر ہی نہیں جوش دلانہ بھی انہوں نے کئی بار اس سے مہراجی رکھ لینے کی تجویز اور خواہش ظاہر کی تھی مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی؟ چار پانچ روپے کی خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ یہ رقم تو بچ رہے گی تو بچوں کے لیے مکھن آجائے گا اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے ''مہراجن رکھنے کے لیے میں نے تم سے کئی بار کہا'' تو لا کر کیوں نہ دیا میں اسے نکال دیتی تو کہتے۔

''ہاں یہ غلطی ہوئی''

تم نے کبھی سچے دل سے کہا محض مہراجن لینے کے لیے کہا تمہارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں تم تو خوش تھے کہ اچھی لونڈی مل گئی ہے ایک

روٹی کھاتی ہے اور چپ چاپ پڑی رہتی ہے اتنی سستی لونڈی اور کہاں ملتی محض کھانے اور کپڑے پر وہ بھی جب گھر بھر کی ضرورتوں سے بچے پچھتر روپلیاں لاکر میرے ہاتھ میں رکھ دیتے ہو اور ساری دنیا کا خرچ میرا دل ہی جانتا ہے کہ مجھے کتنی کتر بیونت کرنی پڑتی ہے کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں تمہارے ساتھ زندگی خراب ہوگئی وہ مرد ہی ہوتے ہیں جو بیویوں کے لیے آسمان کے تارے توڑ کر لاتے ہیں گروسیوک ہی کو دیکھ تم سے کم پڑھا ہے عمر میں تم سے کہیں چھوٹا ہے مگر پانچ سو روپیہ مہینہ لاتا ہے اور رام دلاری رانی بنی بیٹھی ہے تمہارے لیے یہ ہی پچھتر بہت ہیں راڑ مانڈ میں ہی خوش تم ناحق مرد ہوئے مگر میں تو تمہارے لیے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہی نہیں تمہیں تو کپڑے بھی اچھے چاہئیں کھانا بھی اچھا چاہیے کیوں کہ تم مرد ہو، باہر سے کما کر لاتے ہو میں چاہے جیسے رہوں تمہاری بلا سے۔۔۔۔ دانست میں انہوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا ان کی تنخواہ کم ہے ضرور مگر یہ ان کے بس کی بات تو ہے نہیں وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے ہیں افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینہ تک بلا ناغہ پڑھایا۔ اسی لیے تو میں خوش ہیں اور اب کیا کریں۔ روپ کماری کی برہمی کا راز تو انہیں معلوم ہوگیا اگر گرو سیوک پانچ سو روپیہ لاتا ہے تو بے شک خوش نصیب ہے لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا اسے یہ موقع مل گیا دوسروں کو یہ موقعے کہاں ملتے ہیں وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی اسے پانچ سو ملتے ہیں یا محض گپ ہے اور بالفرض ملتے ہوں گے تو اس پر کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ انہیں نشہ ملامت

بنائے اگر وہ اسی طرح روپ کماری سے زیادہ حسین، زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اسے کوسنا شروع کر دیں تو کیسا ہو، روپ کماری حسین ہے، شیریں زبان ہے، خوش مذاق ہے، بے شک؟ لیکن اس سے زیادہ حسین زیادہ شیریں زبان، زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے ایک زمانہ تھا جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی۔ لیکن وہ جنون اب باقی نہیں رہا۔ جذبات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے انہیں ایک مدت گزر گئی اب تو انہیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے ایک دوسرے کے عیب وہنر معلوم ہو گئے ہیں اب تو صابر وشاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے روپ کماری اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انہیں روپ کماری سے ہمدردی ہوئی اس کی سخت کلامیوں کا انہوں نے کچھ جواب نہ دیا شربت کی طرح پی گئے اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے روپ کماری کے دل میں ایسے دل شکن، مایوس کن غیر منصفانہ خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے وہ کوئی فلاسفر نہیں، تاریک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنے طبعی سکون کو قائم رکھے اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر اما ناتھ دریافت حال کی مہم کے لیے امادہ ہو گئے۔

ایک ہفتہ تک روپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی بات بات پر جھنجھلاتی۔ لڑکوں کو ڈانٹتی شوہر کو کوستی، اپنی تقدیر کو روتی، گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا ورنہ نئی آفت آ جاتی لیکن اب کسی کام سے اسے دلچسپی نہ تھی گھر کی جن پرانی دھرانی چیزوں سے اسے دلی تعلق ہو گیا تھا جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی

تھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی گھر میں ایک ہی خدمت گار تھا۔اس نے جب دیکھا کہ بہو جی خود گھر کی طرف سے لاپرواہیں تو اسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے اور اماناتھ تو اس کے سایہ سے بھی بھاگتے تھے جو کچھ ان کے سامنے آجاتا زہر مار کر لیتے اور دفتر چلے جاتے، دفتر سے لوٹ کر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر اور کہیں گھومنے نکل جاتے۔ روپ کماری سے کچھ بولتے روح فنا ہوتی تھی وہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن اماناتھ دفتر سے لوٹے تو ان کے ساتھ گروسیوک بھی تھے روپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانہ سے مصالحت کر لی تھی اور اس وقت سے جھاڑن لیے کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گروسیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا روپ کماری دل میں کٹ گئی اماناتھ پر بے حد غصہ آیا انہیں یہاں لا کر کیوں کھڑا کر دیا نہ کہنا نہ سننا بس بلا لائے اسے اس حالت میں دیکھ کر گروسیوک نے دل میں کیا سمجھا ہوگا مگر انہیں عقل آئی ہی کب تھی وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے اور آپ اسے کھولتے پھرتے ہیں ذرا بھی شرم نہیں جیسے بے حیائی کا جامعہ پہن لیا ہے خواہ مخواہ اسے ذلیل کرتے ہیں۔

دعا دے کر عافیت پوچھی اور کرسی رکھ دی گروسیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا آج بھائی صاحب نے میری دعوت کی ہے میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا لیکن انہوں نے کہا کہ تمہاری بھابی کا سخت تقاضہ ہے تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔

روپ کماری نے بات بنائی ’’تم سے اس دن روا روی میں ملاقات ہوئی دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا۔‘‘

گروسیوک نے در و دیوار پر نظر ڈالی اور کہا ''اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی''

روپ کماری کو اب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بد مذاق ہے دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پروا نہیں یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا ہے کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں کہیں ایک ایسا بھاگوان نکلتا ہے کسی قدر ترش ہو کر بولی۔

''پنجرے میں رہنا کٹھگھرے میں رہنے سے اچھا ہے پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں کٹھگھر تو درندوں کا مسکن ہوتا ہے''

گروسیوک کنایہ نہ سمجھ سکا بولا ''مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے دم گھٹ جائے میں آپ کے لیے اپنے گھر کے پاس ایک گھر طے کر دوں گا خوب لمبا چوڑا آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائے گا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے میں بھی تو اسی کے مکان میں رہتا ہوں سینکڑوں مکان ہیں اس کے پاس سینکڑوں سب میرے اختیار میں ہیں جس کو جو مکان چاہوں دے دوں میرے اختیار میں ہے کرایہ لوں یا نہ لوں میں آپ کے لیے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا جو سب سے اچھا ہے میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔۔۔۔۔''

روپ کماری سمجھ گئی حضرت اس وقت نشہ میں ہیں جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں ان کی آنکھیں سکڑ گئیں رخسار کچھ پھول گئے تھے زبان میں ہلکی سی لغزش تھی جو ہر لمحہ نمایاں ہوتی جاتی تھی ایک جوان، خوبصورت، شریف چہرہ اور بے غیرت بن گیا تھا جسے دیکھ کر نفرت ہوتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں آپ کے لیے میری جان حاضر ہے آپ کے لیے مکان کا انتظام کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں میں مسز لوہیا کا مختار ہوں سب کچھ میرے اختیار میں ہے سب کچھ، میں جو کچھ کہتا ہوں وہ آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتی ہیں مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے میں ان کی ساری جائیداد کا مالک ہوں، مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپیہ کا نوکر رکھا تھا بڑا مالدار آدمی تھا مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کی دولت کہاں سے آتی تھی کسی کو معلوم نہیں میرے سوا کوئی جانتا نہیں وہ خفیہ فروش ہے کسی سے کہنا نہیں وہ خفیہ فروش تھا، کوکین بیچتا تھا، لاکھوں کی آمدنی تھی اس کی، میں بھی اب وہی کام کرتا ہوں ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں مجال نہیں کہ مجھے کوئی گرفتار کر لے بڑے بڑے افسروں سے میرا یارانہ ہے ان کے منہ میں نوٹوں کے پلندے ٹھونس کر ان کی آواز بند کر دیتا ہوں کوئی چوں نہیں کر سکتا حساب میں لکھتا ہوں ایک ہزار، دیتا ہوں پانچ سو، باقی یاروں کا ہے بے دریغ روپے آتے ہیں بے دریغ خرچ کرتا ہوں، بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے، سادھو سنتوں کی سیوا میں لگی رہتی ہے اور بندہ چین کرتا ہے جتنا چاہوں خرچ کروں کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں کوئی بولنے والا نہیں (جیب سے ایک نوٹوں کا بنڈل نکال) یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے مجھے دعا دیجیے جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انہیں دولت لات مارتی ہے دولت تو انہیں پکڑتی ہے جو اس کے لیے اپنا دین ایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں مجھے برا نہ کہیے جتنے دولت مند ہیں سب لٹیرے ہیں میں بھی انہیں میں ایک ہوں کل میرے پاس

روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم شالہ بنوا دوں۔ پھر دیکھیے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے کون پوچھتا ہے مجھے یہ دولت کہاں سے ملی، ایک وکیل گھنٹہ بھر بحث کر کے ایک ہزار سیدھا کر لیتا ہے ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچ سو روپیہ مار لیتا ہے اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے۔ جی ہاں جائز ہے ضرورت مندوں کو لوٹ کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے میں بھی وہی کرتا ہوں جو دوسرے کرتے ہیں زندگی کا مقصد ہے عیش کرنا میں بھی لوٹوں گا عیش کروں گا اور خیرات کروں گا ایک دن لیڈر بن جاؤں گا کہیے تو گنوا دوں یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑ پتی ہو گئے کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑ پتی ہو گئے۔

امانا تھ نے آ کر کہا ''مسٹر گروسیوک کیا کر رہے ہو چلو چائے پی لو ٹھنڈی ہو رہی ہے''

گروسیوک اٹھا پیر لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا پھر سنبھل کر اٹھا اور جھومتا جھامتا ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا روپ کماری نے آزادی کا سانس لیا یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا کمرہ کی ہوا جیسے کچھ بھاری ہو گئی تھی جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دل آویز روپ بھر کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج اسے ان کی اصلی مکروہ گھناؤنی صورت نظر آئی جس سادگی، خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گزری تھی اس میں حرام کاری اور آبلہ فریبی کا گزر نہ تھا ان داموں میں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارے عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلہ نہ کرے گی وہ اپنے حال میں خوش ہے رام دلاری پر اسے رحم آیا جو نمود و نمائش کے لئے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے مگر ایک ہی

لمحہ میں گروسیوک کی طرف سے اس کا دل نرم پڑ گیا جس سوسائٹی میں دولت پجتی ہے جہاں انسان کی قیمت اس کے بینک اکاؤنٹ اور شان وشوکت سے ہانکی جاتی ہے جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان کی حد، غضب اور فرومائیگی کے جذبات کو اکساتا رہتا ہے وہاں گرو سیوک اگر رو میں بہہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت اماناتھ نے آ کر کہا ''یہاں بیٹھا بیٹھا کیا بک رہا تھا میں نے تو اسے رخصت کر دیا جی ڈرتا تھا کہیں اس کے پیچھے پولیس نہ لگی ہو کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا نہ جاؤں''

روپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا ''وہی اپنی خفیہ فروشی کا ذکر کر رہا تھا''

مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا ہے شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے۔

جی نہیں آپ کلرکی کیے جائیے اسی میں آپ کی خیریت ہے۔

مگر کلرکی میں عیش کہاں کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں۔

مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی

میں تم سے آ کر یہ قصہ کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا

ہاں یقین تو نہ آتا میں تو قیاس بھی نہ کر سکتی کہ اپنے فائدے کے لیے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے۔

مجھے سارا قصہ معلوم ہو گیا تھا میں نے اسے خوب شراب پلا دی کہ نشے میں

بھکنے لگے اور سب کچھ خود قبول کرے گا۔

للچائی تو تمہاری طبیعت بھی تھی

ہاں للچائی تو ہے مگر عیب کرنے کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا؟

ایشور نہ کرے وہ ہنر تم میں آئے مجھے تو اس بیچارے پر ترس آتا ہے معلوم نہیں راستہ میں اس پر کیا گزری؟

نہیں وہ تو اپنی کار پر تھے

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی

''تم مجھے دلاری کے گھر پہنچادو ابھی شاید میں اس کی مدد کرسکوں جس باغ کی وہ سیر کررہی ہے اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہیں شاید میں اسے بچاسکوں۔''

☆☆☆☆☆☆

مس پدما

پہلی بار: کتابی صورت میں، 1936ء (زادِ راہ)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

پدما کار سے اتر کر اپنی بہن سے گلے ملی تو اسے خوشی کے بجائے روحانی صدمہ ہوا یہ وہ رتنا نہ تھی، جسے اس نے سال بھر پہلے جیجاجی کے ساتھ خوش خوش گھر آتے دیکھا تھا، شگفتہ اور مخمور اور متبسم وہ پھول مرجھا گیا تھا بہن کے خطوں سے پدما کو اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے اور اس کی زندگی تلخ ہوگئی ہے اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے اس کا اسے گمان نہ تھا جیسے تصویر مٹ گئی ہو صرف اس کا خاکہ باقی ہو۔

اس نے پوچھا، یہ تمہاری کیا حالت ہے بہن! کیا تم بیمار ہو؟ اپنی بیماری کی اطلاع تم نے کبھی نہ دی۔" رتنا حسرتناک تبسم کے ساتھ بولی کیا کرتی لکھ کر تقدیر میں جو تھا وہ ہوا اور آئندہ ہوگا تمہیں اور اماں کو اپنی داستان غم سنا کر خوامخواہ کیوں رنجیدہ کرتی؟ تجھ سے ملنے کو دل بہت بے قرار تھا اور تو اتنی شیطان ہے کہ بار بار آنے کا وعدہ کرکے ٹال جاتی تھی ایسا غصہ آتا تھا کہ تجھے پاجاؤں تو خوب پیٹوں، مہینوں کا غبار جمع ہے، چل کر ہاتھ دھو لے کچھ کھا پی کر مضبوط ہو جا۔"

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے دوپہر کو اس نے صرف ایک پیالہ چائے اور ٹوسٹ کھایا تھا، سہ پہر کو ایک سنترا، اور اب شام ہوگئی ہے گاڑی سے اتری تو اس کا

جی کچھ کھانے کو چاہتا تھا لیکن اب جیسے بھوک غائب ہوگئی ہے اب تو رتنا سے اس کے دل باتیں سننے کی بھوک جاگ گئی ہے اس نے کرسی پر لیٹ کر کہا ”جیجا جی تو تم سے بہت محبت کرتے تھے یکا یک کیوں برہم ہوگئے۔“

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا ”اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں؟ شاید میں اتنی حسین نہیں ہوں یا اتنی سلیقہ ور نہیں ہوں یا اتنی غلام نہیں ہوں کیوں اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کا دم بھرنے والے مرد بھی نامردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنی فراخدلی کے معاوضہ میں اور بھی کامل بے زبان اطاعت چاہتے ہیں“

پدما نے حقیقت کو واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا ”لیکن تم ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔“

رتنا تھکی ہوئی سی بولی ”یہی تو رونا ہے، ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے اور خیالات سے خوب واقف تھے، برسوں ہمسائے رہے، ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے مواقع ہمیں ملے بہت کم کسی کو ملتے ہوں گے ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمینان کر لیا تھا ظرف میں کہیں شگاف یا دراز تو نہیں، آواز اس کی سچی تھی، ٹھوس، دھات کی آواز کی طرح ترنم، لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے باہر نکل آئے اور سارا پانی بہہ گیا اور اب گھڑا پھوٹی تقدیر کی طرح خشک پڑا ہوا ہے، مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے، اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے عورت کے لیے ہی کیوں مرد کے لیے

بھی میں شادی کو اتنا مہلک سمجھتی ہوں، اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہوگئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی، ان کی جن اداؤں اور خوش فعلیوں پر فدا تھی اب ان سے مجھے نفرت ہے کیوں دل کی یہ حالت ہے، کہہ نہیں سکتی، لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی، وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بو آتی ہے، باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے، اچکن اور پاجامہ پہنتے ہیں تو میراثیوں سے جیسے لگتے ہیں، کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرشطان ہو ان کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کر کے رہتی ہوں، لیکن ہم دونوں میں فرق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں، میں ان کی مرضی کی غلام ہوں، ان کے لیے میرے جیسی اور مجھ سے بدر جہا حسین دلبستگی کے لئے موجود ہے کوشاں ہیں طالب ہیں، میرے پاؤں میں زنجیر ہے قانون کی بھی، احساسات کی بھی، اور وقار کی بھی، وہ آزاد ہیں، اس لیے خوش ہیں، متحمل ہیں، ظاہر دار ہیں، میں مقید ہوں میرا ایک ایک ذرہ ایک ایک نقطہ نفی ہے ستم یہ ہے کہ میں ظاہر داری کبھی نہیں کرسکتی میں خلوص چاہتی ہوں خلوص کا غصہ میں برداشت کرسکتی ہوں تصنع کی دلجوئی بھی برداشت نہیں کرسکتی اور جب خلوص پائی نہیں تو خلوص دوں کہاں سے؟ تجھے میں یہی صلاح دوں گی کہ کبھی یہ بیڑی اپنے پاؤں میں نہ ڈالنا۔ عورتوں نے شادی کو ذریعہ معاش سمجھ لیا ہے میں نے بھی وہ غلطی کی اپنے کو کسی پیشے کے لیے تیار نہ کیا لیکن تیرے لیے ابھی بہت وسیع موقع ہے تو ذہین ہے زود فہم ہے ذی حوصلہ ہے تو اگر وکالت کرے تو مجھے یقین ہے تھوڑے ہی دنوں میں تیرا رنگ جم جائے گا، مرد حسن پرست ہوتے ہیں حسن ان

کے دل کی ازلی بھوک ہے کیوں نہ ہم ان کی حماقت سے فائدہ اٹھائیں، جس مقدمہ میں مرد وکیل ایک پائے اس میں تو ستم کے سادہ دو پا سکتی ہے یہ پیارا چاند سا مکھڑا کس مرد کی نظر میں نہ بس جائے گا لیکن وہی شخص جو ابھی تیرے قدموں پر سر رکھے اور تیری اداؤں پر قربان ہوگا، تجھ سے شادی ہو جانے پر ستر غمزے کرے گا تجھ پر رعب جتائے گا۔"

بیوقوف رتنا لینا سب کچھ چاہتی تھی، دنیا کچھ نہیں، محض اپنی انسانیت کے بوتے پر اپنے حسن اور انداز کے بل پر وہ حسین ہے، خوش ادا ہے، نازک اندام ہے، اس لیے خلوص پانے کا حق ہے، وفا کا حق ہے، تسلیم کا حق ہے کوڑیاں دے کر جواہر پارے لینا چاہتی ہے۔

مسٹر شیام ناتھ آتے ہوئے نظر آئے پدما نے کمرے سے نکل کر ان سے ہاتھ ملایا۔

(2)

پدما خود انہیں خیالات کی لڑکی تھی، اور بہن کی تاکید نے اس کے خیالات کو بھی مستحکم کر دیا بی اے میں تو تھی ہی، امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا دو سال میں اس نے بھی قانون اول درجہ میں پاس کیا اور وکالت شروع کر دی، اس کی ذہانت اور ذکاوت نے اس کے حسن کے ساتھ مل کر سال بھر تک اسے جونیئر وکیلوں کی صف اول میں بٹھا دیا وہ جس اجلاس میں پہنچ

جاتی ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ نوجوان وکلاء چاروں طرف سے آ آ کر بیٹھ جاتے اور سائلانہ نظروں سے اسے دیکھتے عدالت بھی ان رعنائیوں اور شیریں بیانوں سے بھی بے نیاز نہ رہ سکتی زہد طبیعت جوں کی نظریں بھی مسرور ہو جاتیں، چہروں پر رونق آ جاتی، سبھی اس کے ایک نظر کے متمنی تھے۔ اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوئی، وہ شکستوں سے نا آشنا تھی، ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا اس کے موکل کو الزام ثابت ہو جانے پر بھی بہت نرم سزا ملتی، یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالف کا شدید ترین مواخذہ ہوتا۔ اس کے خلاف ڈگریاں بھی ہوتیں تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا شرح سود بھی معقول ڈگریوں میں فریق ثانی کی شامت ہی آ جاتی۔ اس کے حسن کا جادو نامعلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہتا تھا۔

لیکن اس کی دھاک جمی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر جھالا پر علیحدگی کے لیے دائر کیا، میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہو گئے تھے کہ رتنا کو اب قانون کے سوا چارہ نہ رہا، اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا علیحدگی کے لیے جن قانونی اسباب کی ضرورت ہوتی ان کا یہاں نشان نہ تھا، لیکن پدما نے کچھ ایسی وقت نظری سے کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہو گیا جس وقت پدما اجلاس میں آ کر کھڑی ہوتی اور اپنے موثر لہجہ میں خطب کامل کی روانی اور انہاک اور استدلال کی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ اپنی تقریر شروع کر لی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے، اور آپس میں کہتے یہ قدرت کی دین ہے بلاشک اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غائب ہوتا، لیکن اس میں

نفسیات کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا پختہ رنگ ہوتا کہ عدالت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، رتنا کی ڈگری ہوئی اور پدما کے لیے عروج کے دروازے کھل گئے۔

(3)

دونوں بہنیں اب ایک ساتھ رہنے لگیں اس شہر میں یہ خاندان ممتاز تھا، پدما کے والد پنڈت اماکول کامیاب بیرسٹر تھے، اور اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں دو یتیم لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرما گئے، لیکن اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ بیوہ ماں کو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقت نہ ہوئی امانا تھ خوشوقین، آزاد مشرب رنگین مزاج آدمی تھے لیکن ان کی متاہل زندگی پرسکون تھی، باہر وہ کچھ کریں گے گھر کے اندر ان کی بیوی کا راج تھا، اور وہ خوش تھی، بدمزگیاں ہوتیں لیکن سوال جواب تک رہ جاتیں، سخت زبانیوں کی نوبت نہ آتی، کول صاحب جاہا سپر اندا ختن کے اصول سے واقف تھے انہیں یقین تھا، وہ کتنی ہی بےعنوانیاں کریں بیوی کی وفا خلوص اور اعتماد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور آج ان کے مرے بیس سال ہو گئے مگر وہ دیوی ابھی تک ان کی پرستش کرتی جاتی تھی، وہ صرف ایک بار کھانا کھاتی اور وہ بھی بےنمک، زمین پر سوتی اور مہینے کے آدھے دن برت رکھتی، جیسے کوئی سنیاسی ہو دونوں لڑکیوں کا پورش پر اسے روحانی کوفت ہوتی تھی، مگر انہیں سمجھانے کی اس کے پاس عقل نہ تھی، نہ وہ ہمت، وہ دونوں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتیں، اور اسے

سادہ لوح، بے زباں، فرسودہ خیال سمجھ کر اس پر رحم کرتی تھیں ان میں سے کسی کو ایسا نفس پرور، بے وفا، سرد مہر شوہر ملا ہوتا تو اسے ٹھوکر مارتیں اور اس کی صورت نہ دیکھتیں اور اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کجروی کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں، نہ جانے اماں کیونکر ایسے وحشی، بے درد، ناشناس آدمی کے ساتھ رہ سکتی تھیں، اور اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں، تعلیم نہ پانے کی یہی برکت ہے وہی طوفان نوح کے زمانے کے خیالات ہیں دنیا کتنی دور نکل گئی ہے، اس غریب کو کیا خبر۔

پدما نے وکالت شروع کرتے ہی علیحدہ مکان لے لیا تھا، اماں کے ساتھ اسے بہت سی قیدوں کی پابندی شرما حضوری اس کے پاس خاطر سے کرنا پڑتی، اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی، وہ کسی کے روبرو جوابدہ کیوں ہو، وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے، کسی کو اس کے معامل میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، بیوہ اسی پرانے مکان میں رہتی تھی، تنہا مرحوم کی یاد کی پرستش کرتی ہوئی، رتنا شوہر سے علیحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی۔ لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا پدما نے خود ہی کوشش کر کے مفصل کے ایک شہر میں ایک مدرسہ میں جگہ دلوا دی پدما نے تعلیم سے جو فیض اٹھایا تھا اس میں نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا، پابندیاں روح کی بالیدگی کے لیے زہر تھیں، فروڈ اس کا معبود تھا، اور فروڈ کے نظریے اس کی زندگی کے لیے مشعل ہدایت کسی عضو کو باندھ دو، تھوڑے ہی دنوں میں دوران خون بند ہو جانے کے باعث بیکار ہو جائے گا فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطرہ میں ڈال دے گا۔ یہ جو جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے محض اس لیے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا۔ نفسیات کی

یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔

اور وہ آزادی سے اپنی پرسنالٹی کی تکمیل کر رہی تھی، پیشہ کی ابتدائی کش مکش ختم ہو جانے کے بعد اب اس کی وکالت اس طرح تھی، جیسے مچھلی کے لیے پانی، بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے، صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا، ان کی پیروی کے لیے کسی قسم کی تیاری یا تحقیق کی ضرورت نہ تھی محرر ضابطے کی تکمیل کر دیتا وہ اجلاس میں جا کر کھڑی ہوتی اور وہی ہزار بار کی دہرائی ہوئی دلیلیں اور منجھے ہوئے الفاظ، اس لیے اب اسے فرصت بھی کافی تھی اس کے ہوا خواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے دیدار سے محفوظ ہونے کے لیے نئے نئے مقدمات لاتے رہتے تھے۔ اور وکالت کے مندر کی وہ دیوی تھی ور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبہ سائی رہتے تھے نوجوان ہی کیوں، جہاں دیدہ درتھی پکے ہوئے بال اور پکی ہوئی عقل والے جس پر اس کی نظر کرم ہو جاتی وہ پارس ہو جاتا۔

مگر انسان کوشش کرنے پر بھی بالکل حیوان نہیں ہو سکتا پدما شباب کی پہلی امنگ میں تو دن سے کھیلتی رہی ناز و ادا اور رعنائی و دلربائی کے کرشمے اور لجد انگنی کی گھاس مگر رفتہ رفتہ اسے خرمستیوں سے نفرت ہونے لگی اور دل ایک وجود کی تلاش کرنے لگا جس میں درد ہو، وفا ہو، گہرائی، جس پر وہ تکیہ کر سکے ان شہدوں میں سبھی بھنورے تھے پھول کا رس لے کر اڑ جانے والے، جو اس کے رسوخ و اثر اور کرم کے لیے اس کے عاشق بنے ہوئے تھے، وہ اب ایسا چاہنے والا چاہتی تھی جو اس کے لیے زندگی قربان کر سکے جو اس کی محبت کو اپنی زندگی کی آرزو بنائے اور جس پر

وہ خود اپنے کو مٹا سکے۔

اتفاق سے ایک دن مسٹر جھا نظر آ گئے اس نے اپنی کار روک لی اور بولی آپ تشریف لائیے! رشتہ ٹوٹ جانے پر کج اخلاقی تو نہ کی جا سکتی تھی۔

جھا نے اشتیاق سے کہا، آج ہی آیا تھا اور تم سے ملنا چاہتا تھا جب سے تمہاری وہ بحث سنی ہے، اور تمہارا وہ انداز دیکھا ہے تمہارا مداح ہو گیا ہوں کسی وقت تمہیں فرصت ہو تو آؤں۔

پدما کو ان سے ہمدردی ہوئی، وہ ثابت کرنا چاہتی تھی گویا میں نے اپنی بہن کی حمایت میں تمہارے خلاف بہت سی غلط بیانیاں کیں، غلط الزامات لگائے، لیکن وہ پیشہ کی بات تھی اس میں مجھے تم سے مطلق ملال نہیں ہے بولی "شوق سے آیئے میرے ساتھ ہی چلتے میں گھر چل رہی ہوں۔"

جھا آ کر بیٹھ گئے اور اس مختصر سی ملاقات میں پدما کو معلوم ہوا کہ جھا روشن خیال اور صاف گو آدمی ہیں۔

دونوں چائے پر بیٹھے تو جھا نے شکایت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "آپ نے تو بحث کے دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا"

پدما ہنس کر بولی "اس کا ذکر نہ کیجئے وہ پروفیشنل معاملہ تھا"

"تو کیا میں یہ باور کر لوں کہ آپ فی الواقع مجھے اتنا مکروہ انسان نہیں سمجھتیں؟"

"آپ کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی، مجھے تعجب ہے کہ آپ کی رتنا سے کیوں نہ پٹی"

''اگر آپ انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہوگی''

''شادی کر کے خوش رہنے کے لیے جس بے حسی کی ضرورت ہے اتنی شاید رتنا میں نہ تھی۔''

''اب مجھے یہی تجربہ کرنا ہے آزادرہ کر خوشی مل سکتی ہے یا نہیں، شادی کر کے دیکھ لیا۔''

''میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے''

''انسانی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں''

پدمانے عشوطرازنظروں سے دیکھا

''ایسے بے وفاؤں کی زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے''

''یہ نہ بھول جایئے کہ یہ عدالت نہیں ہے''

''صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے''

''مجھے موقع عطا کیجئے''

دوسرے دن جھلا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔

پدما روزبروز ان کی طرف ملتفت ہوتی جاتی تھی ان میں وہ سارے اوصاف نظر آتے تھے جن کی اسے بھوک تھی۔ ان میں خیالات کی مناسبت تھی نیک نیتی تھی، جذبات تھی اور کوئی ذاتی غرض نہیں تھی ایک دن جھلا نے کہا ''میرا جی چاہتا ہے کہ یہیں آکر پریکٹس کروں مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا''

پدما خوش ہو کر بولی ''ضرور آ جایئے، میری بھی یہی تمنا ہے اور اسی مکان میں ٹھہریئے''

''یعنی آپ کے سایہ میں، غیر ممکن؟''

''آپ کی آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتا''

''یوں کہئے کہ آپ کو میری جانب سے اپنی آزادی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔''

''میں تو تائب ہو چکا''

''دل سے''

''تو مجھ سے معاہدہ کر لیجئے''

''دل سے''

''ہاں دل سے''

(4)

رتنا نے پدمہ کو غصہ اور تنبیہہ سے بھرا ہوا خط لکھا ''تو نے یہ کہاوت نہیں سنی، آزمودن را آزمودن جہل است، مجھے حیرت ہوتی ہے تو اس شخص کے ساتھ کیوں ملتفت ہوئی یہ شخص دغا دیگا، مکار ہے، نفسانیت سے بھرا ہوا'' لیکن پدما پر کوئی اثر نہ ہوا جھلا کو خط دکھا دیا جھلا بولے ''تم لکھ دو، میں ان سے شادی نہیں کر رہی ہوں، طلاق کی نوبت نہ آئے گی'' پدما نے شوخی کے ساتھ کہا، ''میں تو لکھ دوں گی میں ان

سے شادی کر رہی ہوں اور کبھی طلاق نہ لوں گی‘‘

جھلا کی ڈاکٹری پریکٹس برائے نام تھی ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص تھا دروازہ پر اپنا سائن بورڈ لگا دیا تھا اور صبح کو دو تین گھنٹے اپنے کمرہ میں بیٹھے ناول پڑھا کرتے تھے جس کا انہیں بے حد شوق تھا مریض عنقا تھے پدما ان پر ایسی فریفتہ ہوگئی تھی کہ وہ جتنا چاہیں خرچ کریں اور جس طرح چاہیں خرچ کریں، وہ مطلق معترض نہ ہوتی ان کے لیے ایک نہ ایک تحفہ روز ہی لاتی رہتی تھی ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے بڑے رئیس کے پاس نہ ہوگی، ان کے لیے ایک علیحدہ کار تھی، دوسرے الگ، نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو، ذرا سی شکایت ہوئی اور تم گئے روز ان کے لیے اچھی اچھی شرابیں آتیں اور پدما کو بھی شراب کا چسکا پڑ گیا تھا، جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے اور اتنا ہی نہیں، پدما جھلا کی رضا کی چیری تھی جھلا کا نام ہی جھلا نہ تھا مزاج کے بھی جھلے تھے، ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے اور پدما ان کا مناؤ کرتی ان کا عتاب اس کے لیے ناقابل برداشت تھا جھلا کو اپنی طاقت کا علم تھا اور اس کا اظہار کرتے تھے پدما کو اپنی کمزوری کا علم نہ تھا، وہ اسے دلجوئی سمجھتی تھی، محبت میں جبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے اور صبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے جھلا جبر کرتے تھے، پدما صبر کرتی تھی، جھلا کا تبسم شکریہ کا ایک لفظ محض مسرت خاموش اسے باغ باغ کرنے کے لیے کافی تھی سیاسیات کی طرح آئین محبت میں حاکم ہوتا ہے، دوسرا محکوم، محکوم پسینہ نکالتا ہے، مرتا ہے، سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا حاکم سزائیں دیتا ہے رعب جماتا ہے، رلاتا ہے اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کرسکتا جو دیکھنے والے دیکھتے تھے اور

حیرت میں آ جاتے تھے یہ وہی پدما ہے، وہی غرور کی پتلی وہی نازک مزاج ،نسواں طراز، مگر کتنی متحمل ہوگئی ہے، اس طرح تو کوئی بوالہواس مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا کوئی بوٹی سنگھا دی ہے اس ڈاکٹر نے دل جلے حاسد پدما پر آوازتیں کستے پدما ہنس کر رہ جاتی اس کے راندرے ہوئے جو عاشق تھے، انہیں اس کی بے زبان حلقہ بگوشی دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہتے تھے جیسے کو تیسا۔

ایک دن جھلا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا جھلا نے غضب ناک ہو کر پوچھا

''میرا خط کس نے کھولا؟''

''پدما اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرسکی''

''شاید محرر کی غلطی ہوگی''

''میں تمہیں اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اور تمہیں اس کا جرمانہ دینا ہوگا''

''حاضر ہوں سر جھکائے ہوئے''

جھلا نے اسے آغوش میں لے لیا اور پدما پر گھڑوں نشہ چڑھ گیا دنیا اس کی نظروں میں حقیر تھی۔

(5)

دو سال گزر گئے اور پھول مرجھانے لگا، اس میں پھل آ رہا تھا نازک پدما لاغر ہوگئی، زرد رخسار، بے رنگ آنکھوں میں تکان، جسم میں ڈھیلا پن ،فکر مغموم اس پر

ایک ہیبت سی طاری رہتی متوحش خواب دیکھتی، آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور آہ سرد کھینچ کر رہ جاتی۔ ساری دنیا کے رنگ و روغن اور بہترین مقویات اور ممات فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے آنکھوں کے گرد حلقے، غذا کی اشتہا غائب، مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز، اب وہ ناز برداری چاہتی تھی کوئی اسے پان کی طرح پھیرے، اسے سینے سے لگائے، کبھی علیحدہ نہ کرے اپنے اوپر جو اعتماد تھا وہ رخصت ہوگیا۔

مگر جھلا اس تغیر سے بے خبر اور بے اثر اپنی روش پر چلے جا رہے تھے، وہی طنطنہ تھا وہی دماغ، پدما کیوں انہیں ڈنر کے لیے بلانے نہیں آئی، انہیں بھوک نہیں ہے وہ کیوں خود پان لے کر ان کے پاس نہیں آتی یہ مزاج حسن تو غائب ہوگیا وہ ادائیں ہیں نہ وہ شوخی وہ ملامت اور دماغ آسمان پر ہے وہ چاہتے تھے، پدما ظاہر کی ان پامالیوں کو مزید التفات سے پورا کرے ان پر قربان ہو، بلائیں لے، اس طرح دونوں میں کشیدگی بڑھنے لگی، پدما سوچتی کتنا بے درد آدمی ہے اور جھلا سوچتا کتنی بے اعتنائی ہے انہیں اب اس سے گریز ہوتا تھا، ان کے لیے اب یہاں دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا، جانتے تھے ہی کہ پدما ان کی لونڈی ہے پھر کیوں نہ لطف زندگی اٹھائیں، کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

پدما اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہتی، وہ سیر کو نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے، وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اس نے شکایت کی ”تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو، تمہیں خیال بھی نہیں ہوتا، مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے“

جھلا نے منہ بنایا، ''اچھا اب آپ کو ذرا سا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے بے اعتنائی سے بولے'' تو کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے آنچل سے بندھا رات دن بیٹھا رہوں

''کچھ ہمدردی تو چاہتی ہوں''

''میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کرسکتا''

پدما خاموش ہوگی بدمزگی ہو جانے کا اندیشہ تھا وہ اپنے تئیں اب اور بھی ان کی محتاج پاتی تھی کہیں ناراض نہ ہو جائیں کہیں چلے نہ جائیں اس خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی رتنا کا خوف تھا وہ آج بھی وقیلا نہ نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے، جھلا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دے گی وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی تو جہاں ناکام ہوئی میں وہاں کامیاب ہوں تو نے جھلا کو حسن سے باندھنا چاہا ناکام ہوئی، میں نے انہیں اپنی محبت سے باندھا اور باوجود کسی رسمی یا قانونی یا روحانی معاہدہ نہ ہونے کے اب تک باندھے ہوئے ہوں، وہ سب کچھ جھیل کر بھی محبت کی فتح دکھانا چاہتی، اسے اپنے سے زیادہ اس نظریئے کی فتح تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی، لیڈی ڈاکٹر آئی، نرس آئی، دایہ آئی، جھلا کا کہیں پتہ نہ تھا بار بار جی ڈوب جاتا کرب سے بے ہوش ہو جاتی، روتی تھی، تڑپتی تھی، بدن پسینے میں تر معلوم ہوتا تھا، جان نکل جائے گی جھلا کو بار بار پوچھتی، جیسے انہی کے پاس اس درد کا علاج ہے ہاں اگر وہ آکر کھڑے ہو جاتے، اس کا سر سہلاتے، اسے پیار کرتے تو وہ اس سے بھی جانگزا درد جھیل لیتی، لیکن وہ کہاں ہیں؟ اب تک نہیں آئے، اب تو بارہ بجے ہوں گے لیڈی ڈاکٹر نے کہا ساڑھے بارہ ہیں۔

''اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں، کوئی ذرا جا کر انہیں بلا لائے''

''کہاں گئے کچھ آپ کو معلوم ہے؟''

''نہیں مجھے معلوم نہیں، مگر کسی کو بھیج دو تلاش کر لائے''

لیڈی ڈاکٹر نے کہا ''آپ اپنے کو اس طرح پریشان نہ کریں، اس سے درد بڑھتا ہے''

پدما چپ ہوگئی پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہوگئی جب ہوش آیا تو بولی ''میں اب نہ بچوں گی، یہ درد میری جان لے کر رہے گا شیام بابو آئیں تو کہہ دینا میں نے انہیں معاف کیا، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، بچہ آپ انہیں دے دیجئے گا اور میری طرف سے کہنا اسے پالو، یہ تمہاری بدنصیب پدما کی نشانی ہے''

اور اسے معلوم ہوا کہ جیسے تاریک نزع کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا

اس کی آنکھیں کھلی تو کہاں کہاں، کہاں! کی خوش آیند پیاری جاں بخش ضیابار صدا کانوں میں آئی لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک آگئی اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل جگر تک پہنچ گئی اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو گود میں لے لیا، اور بولی ''شیام بابو آگئے ہیں، ابھی تک نہیں آئے''

اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا، جیسے چراغ بجھ جائے، زندگی کی سب سے بڑی مسرت جس کے سامنے اور سب کچھ ناچیز تھا، نازو ادا، بناؤ سنگار، بوس و کنار، کہیں یہ لطف نہیں وہ اس سے محروم ہوگئی، وہ نوزائدہ فرشتہ گود میں اٹھا کر آنکھوں میں غرور اور تشکر بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اسے جھلا کی گود میں نہ دے سکی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

(2)

صبح ہوئی جھلا نہیں آئے، شام ہوئی، رات ہوئی، پھر صبح ہوئی پھر شام ہوئی، یہاں تک کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں جھلا نہ آئے نہ کچھ کہہ گئے نہ کوئی خط دے گئے، پدما مارے فکر اور خوف کے سوکھی جاتی تھی

ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا، کچھ روپے نکالنے تھے منشی جی بینک سے ناکام لوٹے، بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھلا نکال لے گئے، پدما نے انہیں بینک سے لین دین کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔

اس نے تعجب سے پوچھا ''مگر میرے بیس ہزار جمع تھے''

''جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے''

''اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے؟''

''جی وہاں تو کسی کو کچھ خبر نہیں''

پدما اسی طیش سے جھلا کے کمرے میں گئی اور اس کی قد آدم تصویر کو جو ایک ہزار میں بنوائی تھی، اٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ شیشہ چور چور ہو گیا، پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑ ڈالا اور اسے پیروں سے کچلا اور دیا سلائی لگا دی، پھر جھلا کے کپڑے، کتابیں، صندوق، جوتے، سگریٹ کیس، اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے سب کو ایک جگہ کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی اور بلند آواز میں بولی ''شہدا، بدمعاش، حرام خور، خر دماغ، خر نفس۔۔۔۔ اے جھلا! تم تم''

ہاں ڈاکٹر جھلا جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے اور دلچسپ اور غیر فانی نظروں سے

پدما حیرت اور خفت اور غصہ میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہوگئی اور پوچھا ''تم اب تک کہاں تھے، اور تم نے میرے روپے کیوں اڑا لیے شہدا بے ایمان''

جھلا نے ظرافت آمیز انداز سے کہا ''دل کا بخار اتر گیا یا باقی ہے؟''

پدما جھلا کر بولی ''تم نے میرے روپے چرا لیے، احسان فراموش میں تمہیں جیل کی سیر کرا کے چھوڑوں گی، دغاباز۔''

جھلا نے نوٹوں کا ایک پلندا اس کی طرف حقارت سے پھینک دیا اور بولے ''یہ لو اپنے روپے اور میرا اسلام قبول کرو، یہ تھی تمہاری محبت جس کا اس شدت سے اظہار کیا جا رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے بلڈاگ کے ساتھ کرتی ہو اسے گود میں کھلاتی ہو، چومتی ہو، ساتھ لے کر سیر کو جاتی ہو، اپنی بغل میں بٹھا کر خوش ہوتی ہو، اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی ہو ڈارلنگ اور خدا جانے کیا کیا کہتی ہو، لیکن کتا ذرا دانت دکھا دے تو اس پر ہنٹروں کی بارش کر دو گی اور شاید گولی مار دو میں بھی تمہارا بلڈاگ تھا اتنا ہی عزیز اور اتنا ہی حقیر میں دیکھتا تھا اور امتحان لینا چاہتا تھا اور اب مجھے اطمینان ہوگیا کہ یہ میرا خیال صحیح تھا ایک ہفتہ تک غائب رہنا اتنا بڑا جرم نہ تھا نہ بیس ہزار روپیوں کی کوئی حقیقت ہے مگر تمہاری محبت دیکھ لی، رتنا مجھ سے علیحدہ ہے، مگر محض قانوناً اس کا مجھ سے روحانی رشتہ ہے اور وہ ٹوٹ نہیں سکتا، کیونکہ وہ آج بھی مسز جھلا ہے اور میں جانتا ہوں جس وقت میں نادم ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا وہ پھر میری بیوی ہو گی اور میں اس کا غلام شوہر، تمہاری آزادی تمہیں

مبارک، دیکھنا چاہتی ہو، رتنا کے خطوط، یہ لو دیکھو اور شرماؤ وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے، اور تم کل، ہاں کل کوئی دوسرا طائر پھانسو گی اور پھر اس پر اپنی محبتوں کی بارش کرو گی اور بدمزاج اور غصہ ور اور سخت گیر رتنا یوں ہی مجھ سے جلتی رہے گی اور میری رہے گی۔''

پدمابت کی طرح کھڑی تھی جھلا چلے جا رہے تھے جیسے قید سے چھوٹ گئے ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

CyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

حقیقت

پہلی بار: کتابی صورت میں 1936ء (زادِ راہ)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

وہ راز امرت کے دل میں سربستہ ہی رہا پورنما کو اس کی نظروں سے باتوں سے یا قیافے سے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ امرت کو اس سے معمولی ہمسائیگی اور بچپن کی دوستی کے سوا اور کوئی تعلق نہیں ہے یا ہوسکتا ہے بے شک جب وہ گھڑا لے کر کنویں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے آ جاتا اور گھڑا اس کے ہاتھ سے بزور لے کر پانی کھینچ دیتا جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے لگتی تو وہ اس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکری لیتا اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا ہے بنئے کی دکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت اکثر مل جاتا اور اس کا کام کر دیتا۔

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ماں پردے میں رہتی تھی امرت پڑھنے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے اس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی، گائے بھینس تھیں، باغ بغیچے تھے، گھر والوں کی نظر بچا کر وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے آتا مگر پورنما ان خاطرداریوں کو اس کی شرافت اور سیر چشمی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھے ایک گاؤں میں رہنے والے چاہے خونی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر گاؤں کے رشتے سے بہن بھائی تو ہوتے ہی ہیں ان خاطر

داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

ایک دن پورنما نے اس سے کہا بھی، ''تم دن بھر مدرسے میں رہتے ہو میرا جی گھبراتا ہے'' امرت نے سادگی سے کہا'' کیا کروں امتحان قریب ہے''

''میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمھیں کیسے دیکھوں گی اور تم کیوں میرے گھر آؤ گے؟''

امرت نے گھبرا کر پوچھا'' کہاں چلی جاؤ گی تم؟''

پورنما لجا گئی، پھر بولی'' جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں، جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں''

امرت نے حیرت کے ساتھ کہا، ''اچھا وہ بات'' اور خاموش ہو گیا، اس وقت تک یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ پورنما کہیں چلی جائے گی اتنی دور تک سوچنے کی اسے مہلت نہ تھی، مسرت تو حال میں ہی مست رہتی ہے، آئندہ سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔

اور یہ سانحہ اتنی جلد رونما ہو گیا جس کا امرت کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا پورنما کے لیے ایک پیغام آ گیا متمول خاندان تھا اور ذی عزت پورنما کی ماں نے اسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا عسرت کی اس حالت میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کے لیے فارغ البال زندگی کے لیے سارے سامان موجود تھے اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی فکروں سے گھلی جا رہی تھی لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی اختلاج قلب ہونے لگتا تھا گویا غیب نے ابرو کی ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

امرت نے سنا تو دیوانہ ہو گیا بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا، مگر پھر لوٹ پڑا، جوش نے پاؤں روک دیے کیا فائدہ، اس کی کیا خطا؟ اپنے گھر آیا، اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا، پورنما چلی جائے گی پھر وہ کیسے رہے گا، ہیجان سا ہونے لگا وہ زندہ ہی کیوں رہے؟ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے؟ مگر یہ ہیجان بھی فرو ہو گیا اور اس کی جگہ سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے وہ بے نیاز ہو گیا جب پورنما جاتی ہے تو وہ اب اس سے کیوں کوئی تعلق رکھے، کیوں ملے جلے، اور اب پورنما کو اس کی پرواہی کیوں ہونے لگی اور پرواتھی ہی کب؟ وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو؟ ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جارہی ہے، شوق سے بنے امرت بھی زندہ رہے گا مرے گا نہیں۔ یہی اس زمانے کا رسم وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کے اندر تھی، بے عمل، اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جا کر پورنما کی ماں سے کہہ دے ''پورنما میری ہے اور میری رہے گی'' غضب ہو جائے گا گاؤں میں کہرام مچ جائے گا ایسا واقعہ گاؤں کی روایتوں نے کبھی سنا ہے اور نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا ہے۔

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اس کو دیکھا کرتی وہ کیوں اس کے دروازے سے ہو کر نکل جاتا ہے اور اندر نہیں آتا؟ کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو جیسے اس کے سائے سے بھاگتا ہے وہ کلیسا لے کر کنویں پر کھڑی رہتی ہے کہ وہ آتا ہو گا، مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اس کے گھر گئی اور اس کے پاس جا کر جواب طلب کیا، ''تم آج

کل آتے کیوں نہیں؟ اور اس کا گلا بھر گیا اسے یاد آیا کہ اب وہ گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے''

مگر امرت بے حس بیٹھا رہا، بے اعتنائی سے صرف اتنا بولا'' امتحان قریب ہے فرصت نہیں ملتی۔''

''سوچتا ہوں جب تم جا رہی ہو'' ــــــ

وہ کہنا چاہتا تھا'' تو اب محبت کیوں بڑھاؤں'' مگر خیال آ گیا کتنی احمقانہ گفتگو ہے کوئی مریض مرنے جا رہا ہو اس خیال سے اس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس کے برعکس جوں جوں اس کی حالت دگرگوں ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ انہماک کے ساتھ دوا دوش کرتے ہیں اور نزع کی حالت میں تو دوجہد کی انتہا ہی نہیں رہتی گفتگو کا پہلو بدل کر بولا'' شاید وہ لوگ بھی بڑے مالدار ہیں''

پورنما نے یہ کٹری الفاظ شاید سنے ہی نہیں یا ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی اس کے کانوں میں تو جواب کا پہلا حصہ ہی گونج رہا تھا۔

دردناک لہجہ میں بولی'' اس میں میری کیا خطا ہے، میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں، جانا پڑتا ہے اس لیے جا رہی ہوں''

یہ کہتے کہتے شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا، جتنا اسے کہنا چاہیے تھا شاید اس سے زیادہ کہہ گئی محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے ان لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں کاش ان آنکھوں میں آر پار دیکھنے کی طاقت ہوتی اس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں گویا شادی ہوتے ہی ان کی جان پر بن

جائے گی، مگر کبھی ایک دن اچھے اچھے کپڑے پہن کر پالکی میں چلی جاتی ہیں ان الفاظ سے ان کی کچھ تشفی نہ ہوئی ڈرتے ڈرتے بولا، ''تب تمہیں میری یاد کیوں آئے گی''

اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا، ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرے سے باہر بھاگ جائے پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی کہیں وہ یہ نہ سمجھ گئی ہو۔

پورنما نے سر جھکا کر جیسے اپنے دل سے کہا، ''تم مجھے اتنی زرموتی سمجھتے ہو تم جو مجھ سے بے قصور روٹھے ہو، تمہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنا چاہیے مجھے تشفی دینی چاہیے اور مجھ سے تنے بیٹھے ہو تمہیں بتاؤ، میرے لیے دوسرا کون سا راستہ ہے اپنے مجھے غیروں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں وہاں مجھ پر کیا گزرے گی میری کیا حالت ہوگی یہ غم میری جان لینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ تم اس میں اپنا حصہ بھی حل کر دو۔''

اس کا گلا پھر بھر آیا آج امرت کو اس ملامت میں پورنما کے سوز نہاں کا یقین ہوا اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرے پر چمکنے لگی پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت تھی اور کتنی سرزنش اور کتنا اپنا پن غیروں سے کوئی کیوں شکوہ کرے بے شک اس حالت میں پورنما کی دلجوئی کرنی چاہیے تھی اس کا فرض تھا اور اسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہیے تھا پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ پر لنک محبت ایک بے نفس قربانی ہے طویل اور جگر دوز اس نے پشیمان ہو کر کہا ''مجھے معاف کرو پورنما میری غلطی تھی، بلکہ حماقت''

(3)

پورنما کی شادی ہو گئی امرت جان دل سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا دولہا ادھیڑ تھا تو ندکر، اور اس کے ساتھ ہی بڑا مغرور اور بد مزاج لیکن امرت سے انہماک سے اس کی خاطر داری کر رہا تھا گویا وہ کوئی دیوتا ہے اور اس کا ایک تبسم اسے جنت میں پہنچا دے گا پورنما سے بات چیت کرنے کا امرت کو موقع نہ ملا اور نہ اس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی وہ پورنما کو جب دیکھتا رو تے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبان خاموش سے جتنی دلجوئی اور ہمدردی تشفی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پورنما رو دھو کر رخصت ہو گئی امرت نے اس دن شیو مندر جا کر سچی عبودیت سے بھرے ہوئے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے غم کی تازگی میں فاسد خیالات کا کہاں گذر، غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے مگر دل کے اندر اسے ایک ہمہ گیر سونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا، گویا اب زندگی ویران ہے اس کا کوئی مقصد اور مدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پورنما پھر میکے آئی اس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی کا جوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا مگر ایک موہوم سی تمنا جس کی کوئی واضح صورت وہ نہ بتا سکتا تھا، تھرمامیٹر کے پاس کی طرح اس کے اندر محفوظ تھی پورنما نے آ کر اس میں حرارت ڈال دی اور پارہ چڑھ کر سام کی حد تک جا پہنچا اس کی گود میں دو سال کا پیارا بچہ تھا امرت اس بچے کو سارے دن گلے میں باندھے رہتا صبح و شام اسے گود میں لے کر ٹہلانے لے جاتا اور اس کے لیے بازار

سے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا۔ صبح ہوتے ہی اس کے ناشتے کے لیے حلوا، اور دودھ لے کر پہنچ جاتا اسے نہلاتا دھلاتا، اس کے بال صاف کرتا اس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا مرہم رکھتا، یہ ساری خدمات اس نے اپنے سر پر لی بچہ بھی اس سے ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا گھر نہ چھوڑتا، یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سو جاتا اور پورنما کے بلانے پر بھی اس کے ساتھ نہ جاتا۔

امرت پوچھتا، ''تم کس کے بیٹے ہو؟''

بچہ کہتا ''شالے''

اور امرت مسرت سے خوش ہو کر اسے جگر سے چمٹا لیتا

پورنما کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا کلی کھل کر پھول ہو گئی تھی اب اس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی اور شنگار سے عشق، طلائی زیوروں سے سج کر اور ریشمی ساڑی پہن کر اب وہ پہلے سے کہیں جاذب نظر ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا، امرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے بلا کسی خاص ضرورت کے اس سے بہت کم بولتی اور وہ بھی اس انداز سے گویا اس پر کوئی احسان کر رہی ہو امرت اس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کتنی تندہی سے تعمیل کرتا ہے بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی، وقعت نہ تھی، گویا یہ امرت کا فرض ہے اور اسے ادا کرنا چاہیے اس کے لیے وہ کسی شکریے اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا ہے تو وہ دھمکا دیتی ہے، ''خبردار رونا نہیں، ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے'' اور بچہ خاموش ہو جاتا۔

اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز سے کہہ

دیتی ہے اور امرت فوراً تعمیل کرتا ہے، گویا اس کا غلام ہو وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اس نے امرت سے غلام لکھائی ہے۔

چھ مہینے میکے رہ کر پورنما سسرال چلی گئی امرت اسے پہنچانے اسٹیشن تک آیا جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تب امرت نے بچہ کو اس کی گود میں دے دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی بوند ٹپک پڑی اس نے منہ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر آنسو پونچھ ڈالے پورنما کو اپنے آنسو کیسے دکھائے؟ کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل نہ مانتا تھا نہ جانے پھر ملاقات کب ہو؟

پورنما نے تمکنت کے ساتھ کہا، ''بچہ کئی دن تک تمہارے لیے بہت ہڑکے گا''

امرت نے بھرے ہوئے گلے سے کہا، ''مجھے تو عمر بھر اس کی صورت نہ بھولے گی''

''کبھی کبھی ایک آدھ خط تو بھیج دیا کرو''

''بھیجوں گا''

''مگر میں جواب نہ دوں گی، یہ سمجھ لو''

''مت دینا میں مانگتا تو نہیں، مگر یاد رکھنا''

گاڑی روانہ ہو گیا اور امرت اس کی طرف تاکتا رہا، ایک فرلانگ کے بعد اس نے دیکھا کہ پورنما نے کھڑکی سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا پھر بچہ کو گود میں لے کر کھڑکی سے ذرا دکھا دیا۔

امرت کا دل اس وقت اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا وہ اتنا خوش ہے کہ جیسے اپنی منزل مقصود پہ پہنچ گیا ہو۔

(4)

اسی سال پورنما کی ماں کا انتقال ہوگیا پورنما اس وقت زچہ خانے میں تھی ماں کا آخری دیدار نہ کرسکی امرت نے علاج معالجہ میں کتنی دوا دوش ہوسکی کی، کریا کرم کیا، براہمنوں کو کھلایا، برادری کی دعوت کی، جیسے اس کی اپنی ماں مرگئی ہو اس کے باپ انتقال کر چکے تھے وہ اپنے گھر کا مالک تھا کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔

پورنما اب کس ناتے سے میکے آتی، اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی؟ اپنے گھر کی مالکن تھی کس پر گھر چھوڑ کر آتی؟ اس کے دو بچے اور بھی ہوئے، بڑا لڑکا بڑا ہوا اور اسکول میں پڑھنے لگا چھوٹا دیہات کے مدرسہ میں پڑھتا تھا امرت سال میں ایک بار نائی کو بھیج کر خیر سلا منگالیا کرتا تھا پورنما فارغ البال ہے خوش ہے، اس کی تشفی کے لیے اتنا کافی تھا امرت کے لڑکے بھی اب سیانے ہو گئے تھے خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا اور عمر بھی چالیس سال سے آگے نکل گئی تھی مگر پورنما کی یاد ابھی تک اس کے جگر کے عمیق ترین حصہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن امرت نے سنا کہ پورنما کے شوہر نے دنیا عدم کی راہ لی مگر تعجب یہ تھا کہ اسے رنج نہ ہوا وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا کہ اس خبیث شوہر کے ساتھ پورنما کی زندہ قابل رشک نہیں ہوسکتی فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے اپنے سوز جگر کا اظہار نہ کیا مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البالی کے باوجود اسے مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نا اہلوں کے گلے باندھ دی جاتی

ہیں، ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہو جاتے اس کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہو جاتیں اب اس میں وہ پہلے کی جھجک نہیں ہے اس کی زبان پر نہ وہ مہر خموشی ہے اور پورنما بھی اب آزاد ہے تقاضا سن نے یقیناً اسے زیادہ مہر پرور بنا دیا ہوگا وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہو گی اس دوشیزگی کی جگہ اب آزردہ کار نسائیت ہو گی جو محبت کی قدر کرتی ہے اور اس کی طلب گار رہتی ہے وہ پورنما کے گھر ماتم پرستی کرنے جائے گا اور اسے اپنے ساتھ لائے گا اور اس کے مکان میں اس کی جو خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا اب اسے پورنما کے محض قرب سے تشفی ہو جائے گی وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تشفی پائے گا کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے بیس سال پہلے اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی، وہ بھرا ہوا جسم وہ رخساروں کی سرخی، وہ ملاحت، وہ اس کی کچھی ہوئی ٹھنڈی، جس میں امرت سے بھرا ہوا حوض تھا۔ وہ اس کی نشہ خیز مسکراہٹ وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھی اور وہ تغیر تخیل کی آنکھوں میں اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا ضرور زمانہ کی بیداریوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا جس سے اس کی دلفریبی میں فرق آ جائے اب وہ ظاہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا جتنا اس کی سخن ہائے شیریں کا اس کی نگاہ محبت کا، اس کے اعتماد کا، وہ مردانہ خود پروری کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے نا آسودہ ذوق محبت کو اپنی ناز برداریوں اور گرمجوشیوں سے محظوظ کرے گا اور اپنی پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی

کرے گا۔

حسن اتفاق سے ایک دن پورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر آ گئی اس کی ماں ایک بیوہ موسی جو اس کی ماں کے ساتھ اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی ابھی موجود تھی وہ سونا گھر آباد ہو گیا۔

امرت نے اس کی خبر سنی تو اشتیاق سے مخمور ہو کر دوڑا بچپن اور شباب کی شیریں اور پرمسرت اور پرشوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا، جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے لے کر دوڑے۔

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی اس کا اشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا، سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا پورنما اس کے سامنے آ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی، سفید ساڑی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا، مگر کمر جھک گئی تھی بانہیں سوت سے پتلی، پشت پا کی رگیں ابھری ہوئی آنکھوں سے آنسو جاری اور رخسارے زرد، جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

پورنما کی موسیٰ نے آ کر کہا بیٹھو بیٹا دیکھتے ہو اس کی حالت، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے چھن کو بھی آنسو نہیں تھمتے صرف ایک وقت سوکھی روٹیاں کھائی ہے، اور کسی چیز سے مطلب نہیں نمک چھوڑ دیا ہے، گھی دودھ سب تیاگ دیا بس روکھی روٹیوں سے کام، اس پر آئے دن برت رکھتی ہے کبھی ایکادشی، کبھی اتوار، کبھی منگل، زمین پر سوتی ہے، ایک چٹائی بچھا کر، گھڑی رات سے پوجا پاٹ کرنے لگتی ہے، لڑکے سمجھاتے ہیں مگر کسی کی نہیں سنتی، کہتی ہے جب بھگوان نے سہاگ اٹھا لیا سب کچھ متھیا (باطل) ہے۔

جی بہلانے کے لیے یہاں آئی تھی مگر یہاں بھی رونے کے سوا دوسرا کام نہیں، کتنا سمجھاتی ہوں، بیٹی بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا۔۔۔اب صبر سے کام لو، بھگوان نے تمہیں بال بچے دیے ہیں، ان کو پالو، گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو من پوتر چاہیے بدن کو دکھ دینے سے کیا فائدہ مگر سنتی ہی نہیں تم سمجھاؤ شاید مانے۔

اور امرت بظاہر بے حس اور باطن میں روح فرسا درد چھپائے کھڑا تھا گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی تھی وہ ہل گئی ہو آج اسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض سراب تھا محض خواب نفس کی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس زاہدانہ اجتہاد میں اس کی وہ پر ارمان محبت فنا ہوگئی اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے پورنما اسی مکروہ انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے پورنما اسی مکروہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اس نے احترام کے لہجہ میں کہا تپسونی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھا سکتے ہیں موسی ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے سمجھانا نہیں۔

اور پورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا، تمہارا بچہ تمہیں ابھی تک پوچھا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ہولی کی چھٹی

پہلی بار: کتابی صورت میں، 1936ء (زادِ راہ)

ورنیکلور فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی جو میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا۔ رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسے آجاتے اور ہیڈ ماسٹر چارپائی پر لیٹ کر اپنے خراٹوں سے انہیں پڑھایا کرتے۔ جب لڑکوں میں دھول دھپا شروع ہو جاتا اور شور و غل مچنے لگتا تب وہ یکا یک خواب خرگوش سے چونک پڑتے اور لڑکوں کو دو طمانچے لگا کر پھر خواب نوشی کے مزے لینے لگتے۔ گیارہ بارہ بجے رات تک یہی ڈراما ہوتا رہتا۔ یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بے قرار ہو کر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا، اس لیے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی۔ نائٹ مدرسوں پر اتنی رعایت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انہیں طلب نہ کیا جاتا تھا مگر تعطیل بالکل نہ ملتی تھی سومہوتی اماوس آیا اور نکل گیا، بسنت آیا چلا گیا ــــــــــ شیواتری آئی اور گزر گئی اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک دن کے لیے کون اتنا بڑا سفر کرتا، اس لیے کئی مہینوں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا مگر اب کے میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا، چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دے دیا، کہ 20 مارچ کو ہولی تعطیل شروع ہو گی اور

بندہ 19 مارچ کی شام کو رخصت ہو جائے گا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو تمہیں کیا معلوم کہ نوکری کتنی مشکلوں سے ملتی ہے، اور کتنی مشکلوں سے نبھتی ہے نوکری پانا مشکل نہیں جتنا کہ اس کو نبھانا اپریل میں امتحان ہونے والا ہے تین چار دن مدرسہ بند رہا تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے؟ سال بھر کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا کہ نہیں میرا کہنا مانو تو اس تعطیل میں نہ جاؤ۔

امتحان کے بعد جو تعطیل پڑے اس میں جانا ایسٹر کی چار دن کی تعطیل ہو گی میں ایک دن کے لیے بھی نہ روکوں گا میں اپنے مورچہ پر قائم رہا فہمائش اور تخویف اور جواب طلبی کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا 19 کو جوں ہی مدرسہ بند ہوا، میں نے ہیڈ ماسٹر کو سلام بھی نہ کیا اور چپکے سے اپنے جائے مقام پر چلا آیا انہیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے رجسٹریشن فیس کی میزان لگاتے جاؤ، اوسط حاضری نکالتے جاؤ، لڑکوں کی مشقی کاپیاں جمع کر کے ان پر اصلاح او رتاریخ سب مکمل کر دو گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہیے۔

مکان پر آ کر ہم نے جھٹ پٹ اپنی کتابوں کا بقچہ اٹھایا، اپنا ہلکا سا لحاف کندھے پر رکھا اور اسٹیشن پر چل پڑے گاڑی پانچ بج کر پانچ منٹ پر جاتی تھی مدرسہ کی گھڑی حاضری کے وقت ہمیشہ آدھ گھنٹہ تیز اور روانگی کے وقت آدھ گھنٹہ سست رہتی تھی چار بجے مدرسہ بند ہوا تھا میرے خیال میں اسٹیشن پر پہنچنے کا کافی وقت تھا، پھر بھی مسافروں کو گاڑی کی طرف سے عام طور پر جو اندیشہ لگا رہتا ہے، اور جو گھڑی ہاتھ میں ہونے پر بھی او رگاڑی کا صحیح وقت معلوم ہونے پر دور سے کسی

گاڑی کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی سن کر قدموں کو تیز اور دل منتشر کر دیا کرتا ہے وہ مجھے بھی لگا ہوا تھا کتابوں کا بقچہ وزنی تھا، اس پر کندھے پر لحاف بار بار ہاتھ۔۔۔۔ بدلتا تھا اور لپکا چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسٹیشن کوئی دو فرلانگ سے نظر آیا سگنل ڈاؤن تھا میری ہمت بھی اس سگنل کی طرح پست ہو گئی تقاضا عمر سے ایک سو قدم دوڑا ضرور مگر یہ یاس کی ہمت تھی میرے دیکھتے دیکھتے گاڑی آئی ایک منٹ ٹھہری اور روانہ ہو گئی مدرسہ کی گھڑی یقیناً آج معمول سے زیادہ سست تھی۔

اب اسٹیشن پر جانا بے سود تھا دوسری گاڑی گیارہ بجے رات کو آئے گی میرے گھر والے اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے پہنچے گی، اور وہاں سے مکان پر جاتے ہی ایک بج جائے گا اس سناٹے میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی جی میں تو آیا کہ چل کر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں، مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے کو تیار ہو گیا کل بارہ میل ہی تو ہیں اگر دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی چلوں، تو چھ گھنٹہ میں گھر پہنچ سکتا ہوں، ابھی پانچ بجے ہیں ذرا قدم بڑھاتا ہوں تو دس بجے یقیناً پہنچ جاؤں گا، اماں اور منوہر میرا انتظار کر رہے ہوں گے پہنچتے ہی گرم گرم کھانا ملے گا کولھواڑے میں گڑ پک رہا ہو گا وہاں سے گرم گرم رس پینے کو آ جائے گا، اور جب سنیں گے کہ میں اتنی دور سے پیدل چلا آیا ہوں، تو انہیں کتنا تعجب ہو گا میں نے فوراً گنگا کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی مجھے اس راستے سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے تردد کی کوئی بات نہیں تھی دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا بارہ میل

کہنے کو تو ہوتے ہیں، ہیں توکل چھکوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے میں کود کر جا بیٹھا کھیوے کے پیسے بھی نکال کر دے دیئے، لیکن ناؤ ہے کہ وہیں قطب بنی ہوئی ہے مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے، کیسے کھلے لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے یں اور بیٹھتے جاتے ہیں اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر بھنا جاتا ہوں سورج نیچے دوڑا جا رہا ہے، گویا مجھ سے بازی لگائے ہے ابھی سفید تھا پھر زرد ہونا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گیا دریا کے اس پار افق پر لٹکا ہوا تھا، گویا کوئی ڈول کنوئیں میں لٹک رہا ہو، ہوا میں خنکی آ گئی اور بھوک بھی معلوم ہونے لگی میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور ولولے میں روٹیاں نہ پکائیں تھیں۔ سوچا تھا کہ شام کو گھر پہنچ جاؤں گا ایک پیسہ کے چنے لے کر کھا لیے ان چنوں نے اتنی دیر تک رفاقت کی اب پیٹ کی پیچیدگیوں میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے، مگر کیا غم ہے راستے میں کیا دکانیں نہ ہوں گی دو چار پیسے کی مٹھائیاں لے کر کھا لوں گا۔

جب ناؤ اس کنارے پہنچی تو سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی، حالانکہ ندی کا پاٹ بالکل پیندے میں چمٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے بقچہ اٹھایا اور تیزی سے چلا دونوں طرف چنے کے کھیت تھے، جن کے اودے پھولوں پر شبنم تھی میں بر ملا اور بے ایثار ایک کھیت میں گھس گیا اور بوٹے اکھاڑ لیے اور ٹونگتا ہوا بھاگا۔

سامنے بارہ میل کی منزل ہے، کچا سنسان راستہ شام ہوگئی ہے مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن جوش طفلی نے کہا، کیا مضائقہ ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں بارہ کو دل میں 1860 سے ضراب دیا۔ بیس ہزار گز ہی تو ہوتے ہیں بارہ میل کے مقابلہ میں بیس ہزار گز کچھ ہلکے اور آسان معلوم ہوئے، اور جب دو تین میل رہ جائے گا تو ایک طرح سے اپنے گاؤں ہی میں ہوگا۔ اس کا کیا شمار ہمت بندھ گئی اکے دکے مسافر بھی پیچھے چلے آرہے تھے اور بھی اطمینان ہوا۔

اندھیرا ہو گیا ہے میں لپکا جا رہا ہوں سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی نظر آتی ہے ایک کپی جل رہی ہے ضرور کسی بنئے کی دکان ہوگی اور کچھ نہ ہوگا تو گڑ اور چنے تو مل ہی جائیں گے قدم اور تیز کرتا ہوں جھونپڑی آتی ہے اس کے سامنے ایک لمحہ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں چار پانچ آدمی اکڑوں بیٹھے ہوئے ہیں بیچ میں ایک بوتل ہے، ہر ایک کے سامنے ایک ایک کھڑا دیوار سے ملی ہوئی اونچی گدی ہے، اس پر ساہو جی بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں ذرا اور پیچھے ہٹ کر ایک آدمی کڑھائی میں سوکھے مٹر بھون رہا ہے اس کی رغبت اور اس کی سوندھی خوشبو میرے جسم میں برق رفتار سے دوڑی جاتی ہے اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں، اور ایک پیسہ نکال کر اس کی طرف چلتا ہوں لیکن آپ ہی قدم رک جاتے ہیں یہ کلوریا ہے خوانچہ والا پوچھتا ہے، ”کیا لو گے؟“

میں کہتا ہوں، ”کچھ نہیں“

اور آگے بڑھ جاتا ہوں، دکان بھی ملی تو شراب کی گویا دنیا میں انسان کے لیے

شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہوں گے دوسرا کون شراب پیتا ہے دیہات میں مگر وہ مٹر کا دلآویز سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے، اور میں بھاگا جا رہا ہوں کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا ہے ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اسے کہیں سڑک پر پٹک دوں، اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہوگا، مگر اس وقت من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے پورنماشی کا چاند درختوں کے اوپر بیٹھا ہے، اور پتیوں سے زمین کی طرف جھانک رہا ہے میں بالکل اکیلا چلا جا رہا ہوں، مگر خوف بالکل نہیں ہے بھوک نے ساری حیات کو دبا رکھا ہے اور خود ان پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی، کہیں تازہ گڑ پک رہا ہے کوئی گاؤں کے قریب ہوں گا وہ آموں کے جھرمٹ میں روشنی نظر آ رہی ہے، لیکن وہاں پیسے دو پیسے کا گڑ کون بیچے گا اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائے گا۔ معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں، آگے بڑھتا ہوں، مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے۔ گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے، جب کبھی کسی دوسری چیز کی دکان کھولنے کی سوچتا تھا تو وہ حلوائی کی دکان ہوتی تھی بکری ہو یا نہ ہو، مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی حلوائیوں کو دیکھو مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے، لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں آرام طلبی کے باعث توند نکال لیتے ہیں میں ورزش کرتا رہوں گا، مگر گڑ کی صبر آزما اور اشتہا انگیز خوشبو برابر آ رہی ہے۔ مجھے واقعہ یاد آتا ہے جب اماں تین ماہ کے لیے اپنے میکہ یا میری ننھیال گئی تھیں، اور میں نے تین مہینے میں ایک من گڑ کا صفایا کر دیا تھا۔ اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکا منو کو وہ لیتی گئیں جاتے وقت انہوں نے ایک من گڑ ایک مٹکے میں رکھا اور

اس کے منہ پر ایک سکورا رکھ کر مٹی سے بند کر دیا مجھے سخت تاکید کر دی کہ مٹکا نہ کھولنا میرے لئے تھوڑا سا گڑ ایک ہانڈی میں رکھ دیا تھا، وہ ہانڈی ایک ہفتہ میں صفا چٹ کر دی صبح کو دودھ کے ساتھ گڑ، دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گڑ، تیسرے پہر دانوں کے ساتھ گڑ، رات کو پھر دودھ کے ساتھ گڑ یہاں تک جائز خرچ تھا جس پر اماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا مگر مدرسہ سے بار بار پانی پینے کے بہانے گھر میں آتا اور ایک دو پنڈیاں نکال کر کھالیتا اس کی بجٹ میں کہاں گنجائش تھی اور مجھے گڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا۔ میرا گھر میں آنا گڑ کے سر شامت آنا تھا ایک ہفتہ میں ہانڈی نے جواب دے دیا مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی، اور اماں کے گھر آنے میں ابھی پونے تین مہینے باقی تھے ایک دن تو میں نے طوعاً و کرہاً صبر کیا، لیکن دوسرے دن ایک آہ کے ساتھ صبر جاتا رہا اور مٹکے کے ایک نگاہ شیریں کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا میں نے کسی گناہ کبیرہ کے احساس کے ساتھ مٹکا کھول کر ہانڈی بھر گڑ نکال کر اسی طرح مٹکے کو بند کر دیا، اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین مہینے چلاؤں گا چلے یا نہ چلے میں چلائے جاؤں گا۔ مٹکے کو منزل ہفت خواں سمجھوں گا جسے رستم بھی نہ کھول سکا تھا۔ میں نے مٹکے کے پنڈیوں کو کچھ اس طرح قینچی لگا کر رکھا ہے جیسے بعض دکان دار دیا سلائی کی ڈبیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں ایک ہانڈی گڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا۔ اماں کو پتہ نہ چلے گا، مواخذہ کی نوبت کیسے آئے گی مگر دل اور زبان میں وہ کشمکش شروع ہوئی کہ کیا کہوں، اور ہر بار فتح زبان ہی کے ہاتھ رہت۔ یہ دو انگل زبان، دل جیسے شہزور پہلوان کو نچا رہی تھی جیسے مداری بندر کو نچائے اس کو جو آسمان میں اڑتا

ہے فلک الافلاک کے منصوبے باندھتا ہے اور اپنے زعم میں فرعون کو بھی کچھ نہیں سمجھتا بار بار ارادہ کرتا دن بھر میں پانچ پنڈیوں سے زیادہ نہ کھاؤں گا لیکن یہ ارادہ شرابیوں کی توبہ سے زیادہ دیرپا نہ ہوتا تھا گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹکتا اپنے کو کوستا رہتا نفریں کرتا، گڑ تو کھا رہے ہو مگر برسات میں سارا جسم سڑ جائے گا گندھک کا مرہم لگا کر گھومو گے، کوئی تمہارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہ کرے گا قسمیں کھاتا، علم کی، ماں کی، مرحوم باپ کی، گئو کی، ایشور کی، مگر ان کا وہی حشر ہوتا دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے ہانڈی ختم ہوگئی اس دن میں خشوع وخضوع کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی، بھگوان یہ میرا چنچل لو بھی من مجھے پریشان کر رہا ہے مجھے شکتی دو کہ میں اس کو قابو میں رکھ سکوں مجھے ہشت دھات کا لگام دو جو اس کے منہ میں ڈال دوں یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھڑکیاں سنوانے پر تلا ہوا ہے تم ہی میری رکشا کرو تو بچ سکتا ہوں میری آنکھوں میں اس ذوق عبودیت میں دو چار بوندیں آنسوؤں کی بھی گریں، لیکن ایشور نے بھی کچھ ساعت نہ کی اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی، یہاں تک کہ دوسری ہانڈی کی مرثیہ خوانی کی نوبت آ پہنچی۔ حسن اتفاق کہ انہیں دنوں تین دن کی تعطیل ہوئی اور میں اماں سے ملنے ننھیال گیا۔ اماں نے پوچھا کہ گڑ کا مٹکا دیکھا ہے چیونٹے تو نہیں لگے بیل تو نہیں پہنچی میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا اماں نے مجھے غرور کی نظروں سے دیکھا، اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی نکال لینے کی اجازت دے دی، ہاں تاکید بھی کر دی کہ منہ اچھی طرح بند کر دینا اب تو مجھے ایک دن ایک جگ معلوم ہونے لگا چوتھے دن گھر آتے ہی میں نے جو پہلا کام کیا وہ مٹکے کو کھول

کر ہانڈی بھر گڑ نکالنا تھا یکبارگی پانچ پنڈیاں اڑا گیا پھر وہی گڑ بازی شروع ہوئی اب کیا غم ہے اماں کی اجازت مل گئی تھی سیاں بھئے کوتوال، اور آٹھ دن میں ہانڈی غائب آخر میں اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھری کے دروازے پر قفل ڈالا اور اس کی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی اب دیکھیں کیسے گڑ کھاتے ہو، اس شگاف میں سے کنجی نکالنے کے یہ معنی کے کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی، مگر تین دن میں ہی صبر کا پیانہ چھلک اٹھا، اور ان تین دنوں میں بھی دل کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے حجرہ شیریں کی طرف بار بار گرتا اور بے صبر نگاہوں سے دیکھتا اور ہاتھ مل کر رہ جاتا کئی بار قفل کھٹکھٹایا، کھینچا، جھٹکے دیے مگر ظالم ذرا بھی نہ ہلا کئی بار اس شگاف کا جائزہ لیا اس میں جھانک کر دیکھا ایک لکڑی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، مگر اس کی تہہ نہ ملی، طبیعت کھوئی ہوئی سی رہتی نہ کھانے پینے میں کچھ مزا تھا، نہ کھیلنے کودنے میں، نفس بار بار منطق کے زور سے دل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا آخر گڑ اور کس مرض کی دوا ہے میں اسے پھینک تو دیتا نہیں کھاتا ہی تو ہوں، کیا آج کھایا اور کیا ایک ماہ بعد، اس میں کیا فرق ہے اماں جان نے ممانعت کی ہے بیشک لیکن انہیں مجھے ایک جائز کام سے باز رکھنے کا کیا حق ہے، اگر وہ آج کہیں کہ کھیلنے مت جاؤ، یا درختوں پر مت چڑھو، یا تالاب میں تیرنے مت جاؤ، یا چڑیوں کے لیے کپا مت لگاؤ، تتلیاں نہ پکڑو تو کیا میں مانے لیتا ہوں آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں تو پھر اس معاملہ میں کیوں اماں کی ممانعت پر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو قربان کردوں۔ آخر چوتھے دن نفس نے فتح پائی میں نے علی الصباح ایک کدال

لے کر دیوار کھودنا شروع کیا۔ شگاف تھا کھودنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی آدھ گھنٹہ کی محنت شاقہ کے بعد دیوار سے کوئی گز لمبا۔۔۔۔۔اور تین انچ موٹا چپر چھوٹ کر نیچے گر پڑا، اور شگاف کی تہہ میں وہ کلیدی کامیابی پڑی ہوئی تھی، جیسے سمندر کی تہہ میں موتی کی سیپ پڑی ہو۔ میں جھٹ پٹ اسے نکالا اور فوراً دروازہ کھولا مٹکا سے گڑ نکال کر ہانڈی میں بھرا اور دروازہ بند کر دیا مٹکے میں اس دست برد سے قابل احساس کمی واقع ہوگئی تھی ہزار ترکیبیں آزمانے پر بھی اس کا خلا پر نہ ہوا، مگر اب کی بار میں نے اس چٹورے پن کا اماں جان کی واپسی تک خاتمہ کر دینے کے لیے کنجی کو کنوئیں میں ڈال دیا قصہ طویل ہے میں نے کیسے قفل توڑا، کیسے گڑ نکالا، اور مٹکا خالی ہو جانے پر کیسے اسے پھوڑا اور اس کے ٹکڑے رات کو کنوئیں میں پھینکے، اور اماں آئیں تو میں نے کیسے رو رو کر ان سے مٹکے کے چوری جانے کی داستان کہی، یہ بیان کرنے لگا تو یہ واقعہ جو آج میں لکھنے بیٹھا ہوں نا تمام رہ جائے گا۔

چنانچہ اس وقت اس گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا مگر صبر کر کے آگے بڑھا۔

جوں جوں رات گذرتی تھی، جسم تکان سے چور ہوتا تھا یہاں تک کہ پاؤں میں لغزش ہونے لگی کچی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی جب کبھی لیک میں پاؤں چلا جاتا تو معلوم ہوتا کہ کسی گہرے گڈھے میں گر پڑا ہوں بار بار جی میں آتا یہیں سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں کتابوں کا مختصر سا بقچہ من بھر کا لگتا تھا اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لے کر کیوں چلا دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا مگر چھٹیوں میں ایک دن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے

گی۔۔۔۔خواہ مخواہ یہ پشتارہ اٹھائے چلا آیا ہوں ایسا جی جھنجھلاتا تھا کہ اس بار حماقت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا ایک بار میں گر پڑا اور سنبھل کر اٹھا تو پاؤں تھرتھرا رہے تھے اب بغیر چڑھائے قدم اٹھانا دشوار تھا، مگر یہاں کیا کھاؤں؟ بار بار رونے کو جی چاہتا تھا اتفاق سے ایک ایکھ کا کھیت نظر آیا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ ایکھ توڑلوں اور مزے سے رس چوستا ہوا چلوں ''راستہ بھی کٹ جائے گا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائے گا مگر مینڈ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں الجھ گیا کسان نے شاید مینڈ پر کانٹے بکھیر دیے تھے شاید بیر کی جھاڑی تھی، دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی، کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ گئی بھوک تو غائب ہو گئی فکر ہوئی کہ اس نئی مصیبت سے کیوں کر نجات ہو، کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسرے چمٹ جاتے۔ جھکتا تو جسم میں چبھتے کسی کو پکاروں تو چوری کھلی جاتی ہے عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا اس وقت مجھے اپنی حالت پر رونا آ گیا۔ کوئی صحرانورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہو گا۔ بڑی مشکل سے آدھ گھنٹہ میں پنڈ چھوٹا، مگر دھوتی اور کرتے کے ماتھے گئی، ہاتھ اور پاؤں چھلنی ہو گئے، وہ گھاٹے میں اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا، معلوم نہیں کتنا راستہ طے ہوا، کتنا باقی ہے، نہ کوئی آدم نہ آدم زاد کس سے پوچھوں، اپنی حالت پر روتا ہوا جا رہا تھا ایک بڑا گاؤں نظر آیا بڑی خوشی ہوئی، کوئی نہ کوئی دکان مل ہی جائے گی کچھ کھالوں گا اور کسی کے سائبان میں پڑا رہوں گا۔ صبح

دیکھی جائے گی۔''

مگر دیہاتوں میں لوگ سرشام سونے کے عادی ہوتے ہیں ایک آدمی کنوئیں پر پانی بھر رہا تھا۔اس سے پوچھا تو اس نے نہایت ہی یاس انگیز جواب دیا اب یہاں کچھ نہ ملے گا بنیے نمک تیل رکھتے ہیں حلوائی کی ایک دکان ایک بھی نہیں کوئی شہر تھوڑا ہی ہے اتنی دیر تک دکان کھولے کون بیٹھا رہے۔

میں نے اس سے نہایت منت آمیز لہجہ میں کہا ''کہیں سونے کو جگہ مل جائے گی؟''

اس نے پوچھا، ''کون ہوتم؟''

''تمہاری جان پہچان کا یہاں کوئی ہے؟''

''جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے سوال کرتا''

''تو بھئی انجان آدمی کو یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے،اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا تھا،رات میں ایک گھر میں سیند پڑ گئی،صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا''

''تو کیا سمجھتے ہو،میں چور ہوں''

''کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا اندر کا حال کون جانے''

''نہیں ٹھہرانا چاہتے نہ سہی مگر چور نہ بناؤ،میں جانتا یہ اتنا منحوس گاؤں ہے،تو ادھر آتا ہی کیوں؟''

میں نے زیادہ خوشامد نہ کی جی جل گیا سڑک پر آکر پھر آگے بڑھا اس وقت میرے ہوش بجا نہ تھے کچھ خبر نہیں کس راستے سے گاؤں سے آیا تھا اور کدھر چلا جا رہا تھا اب مجھے اپنے گھر پہنچنے کی امید نہ تھی رات یوں ہی بھٹکتے ہوئے گزرے گی،

پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی، دفعتاً ایک کھیت میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی، گویا شمع امید، ہو نہ ہو ضرور وہاں کوئی آدمی ہو گا شاید رات کاٹنے کو جگہ مل جائے قدم تیز کر دیے اور قریب پہنچا کر یکا یک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اٹھا ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آ گیا اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچہ کے سوا اور کیا تھا، نہ کوئی لکڑی نہ کوئی پتھر، کیسے بھگاؤں کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے تو کیا کروں، تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا میں جتنا ہی دھت دھت کرتا تھا اتنا ہی وہ گرجتا تھا میں خاموش کھڑا ہو گیا اور بقچہ زمین پر رکھ کر پاؤں سے جوتے نکال لیے اپنی حفاظت کے لیے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو، اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اس کے سر پر اتنے زور سے نعلدار جوتا ماروں کہ یاد ہی تو کرے، لیکن شاید اس نے میری نیت تاڑ لی اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آ گیا اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور اسی وقت میں ہیبت زدہ آواز میں پکارا ”ارے کھیت میں کوئی ہے دیکھ یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے“

”او مہتو دیکھو! تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے“

جواب ملا ”کون ہے؟“

”میں ہوں راہ گیر، تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے“

”نہیں، کاٹے گا نہیں ڈرو مت کہاں جانا ہے؟“

”محمود نگر“

''محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے، آگے تو ندی ہے''

میرا کلیجہ بیٹھ گیا، رونا سا ہو کر بولا ''محمود نگر کا راستہ کتنی دور چھوٹ گیا ہوگا''

''یہی کوئی تین میل''

اور ایک قد آور انسان ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا سر پر ہیٹ تھا ایک موٹا فوجی اور کوٹ پہنے ہوئے، نیچے نکر، پاؤں میں فل بوٹ بڑا قوی ہیکل بڑی مونچھیں، گورا رنگ، مردانہ وجاہت کا مجسمہ

بولا: ''تم تو کوئی اسکول کے لڑکے معلوم ہوتے ہو''

''لڑکا نہیں ہوں، لڑکوں کا مدرس ہوں گھر جا رہا ہوں آج سے تین دن کی تعطیل ہے''

''تو ریل سے کیوں نہیں گئے؟''

''ریل چھوٹ گئی اور دوسری ایک بجے چھوٹتی ہے''

''وہ ابھی تمھیں مل جائے گی، بارہ کا عمل ہے، چلو میں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں گا''

''کون سے اسٹیشن کا''

''بھگونت پور کا''

''بھگونت پور ہی سے تو میں چلا ہوں، وہ تو بہت پیچھے چھوٹ گیا ہوگا''

''بالکل نہیں، تم بھگونت پور اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو چلو میں تمھیں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں، ابھی گاڑی مل جائے گی لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں لیٹ رہو، کل چلے جانا''

اپنے اوپر غصہ آیا کہ سر پیٹ لوں، پانچ بجے سے تیلی کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں اور ابھی بھگونت پور سے کل ایک میل آیا ہوں، راستہ بھول گیا، یہ واقعہ بھی یاد رہے گا کہ چلا چھ گھنٹے اور طے کیا ایک میل، گھر پہنچنے کی دھن جیسے اور بھی دہک اٹھی۔

بولا، ''نہیں، کل تو ہولی ہے مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیے''

''مگر راستہ پہاڑی ہے ایسا نہ ہو کوئی جانور مل جائے، اچھا چلو میں پہنچائے دیتا ہوں، مگر تم نے بڑی غلطی کی، انجان راستے میں رات کو پیدل چلنا کتنا خطرناک ہے خیر یہیں کھڑے رہو میں ابھی آتا ہوں''

کتا دم ہلانے لگا اور مجھ سے دوستی کرنے کا خواہشمند معلوم ہوا دم ہلاتا ہوا سر جھکائے عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا میں نے بھی اس کا قصور فیاضی سے معاف کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا ایک لمحہ میں وہ شخص بندوق کندھے پر رکھے ہوئے آ گیا اور بولا ''چلو مگر اب ایسی نادانی نہ کرنا خیریت ہوئی کہ میں تمہیں مل گیا ندی پر پہنچ جاتے تو ضرور کسی جانور سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔''

میں نے پوچھا، ''آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں، مگر آپ کا لہجہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔''

اس نے ہنس کر کہا ''ہاں میرا باپ انگریز تھا، فوجی افسر، میری عمر یہیں گذری ہے میری ماں اس کا کھانا پکاتی تھی میں فوج میں رہ چکا ہوں یورپ کی لڑائی میں گیا تھا، اب پنشن پاتا ہوں لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد

تک خون کرنا پڑا ان سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہوگئی اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں یہ گنگا کی گھاٹی ہے۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جنگلی جانور ہیں، سور، نیل گائے، ہرن ساری کھیتی برباد کردیتے ہیں میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلہ مل جاتا ہے وہ میرے گذر بسر کے لیے کافی ہوتا ہے میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے جس طرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو، میں تمہیں کسرت سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤ گے" میں نے پوچھا "آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں"

وہ بولا، "ہاں دو گھنٹے روزانہ کسرت کرتا ہے مگدر اور لیزم کا مجھے بہت شوق ہے میرا اپچاسواں سال ہے، مگر ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں رہوں گا کیسے؟ میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں اپنی رجمنٹ میں خوب مضبوط آدمی تھا، مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ کتنے ہی آدمی بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوئے میرا انہوں نے کیا نقصان کیا تھا؟ میری ان سے کون سی عداوت تھی؟ مجھے تو جرمن اور آسٹریلین سپاہی بھی ویسے ہی خلیق، ویسے ہی خوش مزاج، ویسے ہی ہمدرد معلوم ہوئے، جیسے فرانس یا انگلینڈ کے ہماری ان سے خوب بے تکلفی ہوگئی تھی ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ بیٹھتے تھے، خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے اپنے نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، کس

لیے؟ اس لیے کہ بڑے بڑے انگریزوں، سوداگروں کی اس وقت ہماری ایسی خاطر ہوتی تھی، ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی، گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں ہمارے اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی ہمیں گارڈن پارٹیاں دی جاتی تھیں ہمارے جانبازیوں کی داستانیں روزانہ اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں ۔ نازک بدن لیڈیاں اور شہزادیاں ہمارے لئے کپڑے سیتی تھیں طرح طرح کے مربے، اور اچار بنا بنا کر بھیجتی تھیں لیکن جب صلح ہوگئی تو انہیں جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا کتنوں ہی کے انگ بھنگ ہو گئے تھے کوئی لولا ہو گیا تھا کوئی لنگڑا، کوئی اندھا، انہیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا میں نے کتنوں کو ہی سڑک پر بھیک مانگتے دیکھا، تب سے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہوگئی میں نے یہاں آ کر یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور خوش ہوں سپہ گری کا یہی منشا ہے کہ اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو، یہ نہیں کہ کروڑوں پیشوں کی بے شمار دولت میں اضافہ ہو یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں، لیکن اس کام میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہ ہوگا، کیونکہ مجھے تسکین ہوگی کہ میری زندگی غریبوں کے کام آئی اور یہ بیچارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ میں ان کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا تو وہ بے دریغ اپنا خون دیدیں گے پہلے میں بہت شراب پیتا تھا میری برادری کو تو تم جانتے ہوگے، ہم میں بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیے میں بھی ایک بوتل شراب روز پی جاتا ہوں باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے، اگر کفایت سے رہنا جانتا تو زندگی بھر آرام سے

پڑا رہتا مگر شراب نے ستیاناس کر دیا ان دنوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہا کرتا تھا کالر، ٹائی لگائے چھیلا بنا ہوا نوجوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا، شراب پینا کلب میں تاش کھیلنا اورعورتوں سے دل بہلانا یہی زندگی کا مشغلہ تھا۔ تین چار سال میں میں نے پچیس تیس ہزار روپے اڑا دیے۔ کوڑی کفن کو نہ رکھی جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی فوج میں بھرتی ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا، یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے''

یورپ سے آ کر ایک دن میں شکار کھیلتے کھیلتے ادھر آ گیا دیکھا کئی کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اداس کھڑے ہیں میں نے پوچھا، کیا بات ہے، تم لوگ کیوں اس طرح اداس ہو؟

ایک آدمی نے کہا ''کیا کریں زندگی سے تنگ ہیں، نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے سارے جانور آ کر کھیت چر جاتے ہیں کس کے گھر سے لگان چکائیں، کیا مہاجن کو دیں، کیا عملوں کو دیں اور کیا خود کھائیں، کل انہیں کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا آج انہیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں جانوروں نے صفایا کر دیا''

معلوم نہیں اس وقت میرے دل پر کس دیوتا یا نبی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آ گیا میں نے کہا ''آج سے میں تمہارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا کیا مجال کہ کوئی جانور بھٹک سکے ایک دانہ جو جائے تو جرمانہ دوں بس اس دن سے آج تک میرا یہی کام ہے، آج دس سال ہو گئے میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا، اپنا گزر بھی ہوتا ہے

اور احسان مفت ملتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کام سے دل کو خوشی ہوتی ہے۔''

ندی آ گئی، میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے جہاں شام کو کشتی پر بیٹھا تھا اس چاندنی میں ندی مرصع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو۔

میں نے پوچھا ''آپ کا نام کیا ہے، کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا۔''

اس نے لالٹین اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور بولا ''جیکسن ہے ضرور آنا اسٹیشن کے پاس جس سے میرا نام پوچھوگے، میرا پتہ بتلا دے گا''

یہ کہہ کر وہ پیچھے کی طرف مڑا، مگر یکا یک لوٹ پڑا اور بولا ''مگر تمہیں یہاں ساری رات بیٹھنا پڑے گا اور تمہاری اماں گھبرا رہی ہوں گی تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ تو میں تمہیں اس پار پہنچا دوں آج کل پانی بہت کم ہے، میں تو اکثر تیر کر آتا ہوں''

میں نے احسان سے دب کر کہا'' آپ نے یہی کیا کم عنایت کی ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا، ورنہ شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا میں یہاں بیٹھا رہوں گا اور صبح کو کشتی سے پار اتر جاؤں گا۔''

''واہ! اور تمہاری ماں روتی ہوں گی کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گذری''

یہ کہہ کر مسٹر جیکسن نے مجھے جھٹ اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور اس طرح بے خوف پانی میں گھسے، گویا سوکھی زمین ہے میں دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن پکڑے ہوں اور کچھ ہنس بھی رہا ہوں پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے اور رگوں میں سنسنی بھی ہے مگر جیکسن صاحب اطمینان سے چلے جا رہے ہیں پانی گھٹنے تک آیا

پھر کمر تک پہنچا، افوہ سینہ تک پہنچ گیا اب صاحب کو ایک ایک قدم مشکل ہو رہا ہے میری جان نکل رہی ہے لہریں بھی ان کے گلے لپٹ رہی ہیں میرے پاؤں چومنے لگیں میرا جی چاہتا ہے ان سے کہوں، خدارا واپس چلیے مگر زبان نہیں کھلتی، حواس نے جیسے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سب دروازے بند کر لیے ہیں ڈرتا ہوں کہیں جیکسن صاحب پھسلے تو اپنا کام تمام ہے یہ تو تیراک ہیں نکل جائیں گے۔ میں لہروں کی خوراک بن جاؤں گا۔ افسوس آتا ہے کہ اپنی حماقت پر کہ تیرنا کیوں نہ سیکھ لیا جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے اوپر اٹھالیا، ہم دھار میں پہنچ گئے تھے بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک ایک قدم آگے رکھنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا دن وک اسی ندی میں بار ہا آ چکا تھا لیکن رات کو اور اس منجدھار میں، وہ مرگ رواں معلوم ہوتی تھی دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہا پھر پانی اترنے لگا میں دیکھ نہ سکا مگر شاید پانی جیکسن کے سر کے اوپر تک آ گیا تھا، اسی لیے انہوں نے مجھے ہاتھوں پر اٹھالیا تھا جب ان کی گردن باہر نکل آئی تو زور سے ہنس کر بولے ''لو اب پہنچ گئے''

میں نے کہا، ''آپ کو آج میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی''

جیکسن نے مجھے ہاتھوں سے اتار کر پھر کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا، ''اور آج مجھے جتنی مسرت ہوئی اتنی آج تک کبھی نہ ہوئی تھی جرمن کپتان کو قتل کر کے بھی، اپنی ماں سے کہنا مجھے دعا دیں۔''

گھاٹ پر پہنچ کر میں جیکسن سے رخصت ہوا، شرافت، بے غرض خدمت اور جانبازانہ سرفروشی کا نہ مٹنے والا نقش دل پر لیے ہوئے، میرے جی میں آیا کاش میں

بھی اسی طرح لوگوں کے کام آ سکتا۔

تین بجے رات کو جب میں گھر پہنچا تو ہولی میں آگ لگ رہی تھی، میں اسٹیشن سے دو میل سرپٹ دوڑتا ہوا گیا۔ معلوم نہیں بھوکے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

اماں میری آواز سنتے ہی آنگن میں نکل آئیں اور مجھے سینہ سے لگا لیا اور بولیں، ''اتنی رات کہاں کر دی؟ میں تو سانجھ سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی چلو کھانا کھا لو کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں''

وہ اب جنت میں ہیں لیکن ان کا وہ محبت بھرا چہرہ میری نظروں میں ہے اور وہ پیار بھری آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے میں اسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

زادِ راہ

پہلی بار: کتابی صورت میں، 1936ء (زادِ راہ)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

سیٹھ رام ناتھ نے بستر علالت پر پڑے ہوئے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سوشیلا کی طرف دیکھ کر کہا ''میں بڑا بدقسمت ہوں، سوشیلا، میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ تکلیف اٹھانی پڑی جب گھر میں کچھ نہ تھا تو شب و روز دنیا داری کے بکھیڑوں اور بچوں کے لیے مرتی رہتی تھی۔ جب معاملہ ذرا کچھ سنبھلا اور آرام کرنے کے دن آئے تو تمہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں آج تک مجھے زندگی کی امید تھی وہ امید جاتی رہی دیکھو سوشیلا روؤ مت، دنیا میں سبھی مرتے ہیں، کوئی دو سال آگے، کوئی دو سال پیچھے اب عیال داری کا بوجھ تمہارے سر پر ہے میں نے نقد روپیہ نہیں چھوڑا، لیکن جو کچھ اثاثہ ہے تمہاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائے گی یہ موہن کیوں رو رہا ہے؟''

سوشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا، ''ضدی ہو گیا ہے، اور کیا، آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے ہے کہ موٹروں کا پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر؟''

سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہو گئی تھی بولے ''تو منگا دو، ایک بچارے کو، کب سے رو رہا ہے کیا ارمان دل میں تھے سب خاک میں مل گئے رانی کے لیے ولایتی گڑیا منگوائی دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے جس

دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا، وہ آخر کار ڈاکٹروں نے کھائی بچے مجھے کیا یاد کریں گے کوئی باپ تھا، آہ بدقسمت باپ نے تو مال و زر کو لڑکے لڑکی سے پیارا سمجھا ایک پیسہ کی چیز لا کر بھی نہیں دی افسوس!''

آخری وقت جب دنیا کی ناپائیداری حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جو کچھ نہ کیا اس کا افسوس اور جو کچھ کیا اس کا پچھتاوا دل کو فراخ اور دردمند بنا دیتا ہے سوشیلا نے راجہ کو بلایا اور اسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی، وہ ممتا جو شوہر کی کنجوس طبیعت کے سبب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی تھی اس وقت جیسے ابل پڑی، لیکن موٹر کے لیے روپے کہاں تھے؟

سیٹھ جی نے پوچھا ''موٹر لے لو بیٹا، اپنی ماں سے روپیہ لے کر، بہن کے ساتھ چلے جاؤ خوب عمدہ لانا''

موہن نے ماں کے آنسو اور باپ کا پیار دیکھا تو اس کی ضد پگھل گئی بولا ''ابھی نہیں لوں گا'' سیٹھ جی نے پوچھا، کیوں؟

''جب آپ اچھے ہو جائیں گے تب لوں گا''

سیٹھ جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

(2)

تیسرے روز سیٹھ رام ناتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دولت مند کے زندہ رہنے سے دکھ بہتوں کو ہوتا ہے اور سکھ تھوڑوں کو، ان کے

مرنے سے دکھ چند کو ہوتا ہے اور سکھ زیادہ کو اب مہا برہمنوں کا گروہ الگ خوش ہے پنڈت جی الگ بشاش ہیں، اور شاید برادری کے لوگ بھی خوش ہیں اس لیے ایک برابر کا آدمی کم ہو گیا دل سے ایک کانٹا نکل گیا اور پٹی داروں کا تو پوچھنا ہی کیا اب وہ پرانی کسر نکالیں گے دل کو ٹھنڈا کرنے کا ایسا موقع بہت دنوں کے بعد ملا ہے۔

آج پانچواں دن ہے وہ عالی شان مکان سونا پڑا ہے، بچے نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں من مارے ماں کے پاس بیٹھی ہیں، گھر میں جو روپے بچ رہے تھے وہ تجہیز و تکفین کی نذر ہو گئے اور ابھی سارے رسوم باقی ہیں خدا کیسے بیڑا پار لگائے گا۔

کسی نے دروازہ پر آواز دی مہرانے آ کر سیٹھ دھنی رام کے آنے کی خبر دی دونوں بچے باہر دوڑے سوشیلا کا دکھ بھی ایک لمحہ کے لیے تازہ ہو گیا سیٹھ دھنی رام برادری کے چودھری تھے بیکس بیوہ کا دل سیٹھ کی اس دلجوئی سے خوش ہو گیا آخری برادری کے سرپنچ ہیں وہ لوگ بیکس، بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر نہ لیں تو اور کون لے آفریں ہے ایسے نیک بندوں پر جو مصیبت کے وقت بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں سوشیال گھونگھٹ نکال کر برآمدہ میں آ کر کھڑی ہو گئی دیکھا تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی بھلے آدمی کھڑے ہیں۔

دھنی رام بولے ''بھو جی! بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو رنج ہوا ہے وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی لیکن پرماتما کی مرضی اب تو ہمارا یہی فرض ہے کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کے لیے کوئی راستہ نکالیں کام ایسا کرنا چاہیے کہ گھر کی عزت بھی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی روح کو تسکین ہو''

کبیر داس نے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا ''عزت کے سوا دنیا میں اور ہے کیا، اس کو نبھانا، اس کی حفاظت کرنا ہمارا دھرم ہے لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے کتنے روپے تمہارے پاس ہیں بہو؟''

سوشیلا: ''گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی، جو تھوڑے بہت تھے، بیماری میں اٹھ گئے''

دھنی رام: ''تو یہ نئی الجھن پیدا ہوگئی ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

کبیر چند: ''جو کچھ بھی دعوت تو دینی ہی ہوگی ہاں اپنی بساط دیکھ کر کام کرنا چاہیے میں قرض لینے کی صلاح نہ دوں گا گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہو سکے اس میں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے، مرنے والے کے ساتھ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے، اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا اس سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹ رہا ہے اس لیے سب کچھ حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے، برہمنوں کو تو وہی مٹھائیاں دی جائیں گی لیکن برادری کی دعوت اس اعتبار سے کرنی چاہیے کہ عزت میں فرق نہ آئے۔''

دھنی رام ''تو کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے تم نے تو ایک بڑی عجیب بات کہہ دی بہو جی! دو چار ہزار بھی نہیں''

سوشیلا: ''میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی''

دھنی رام نے کبیر چند کی طرف دیکھ کر کہا ''تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا''

کبیر چند: ''اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے رام ناتھ کا کتنا نام تھا برادری کے ستون تھے یہی اس وقت ایک علاج ہے بیس ہزار میرے

نکلتے ہیں سود بٹہ لگا کر کوئی پینتیس ہزار ہوں گے باقی روٹی میں خرچ ہو جائیں گے اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آ جائے گا۔''

دھنی رام: ''آپ کے پاس یہ گھر کتنے میں رہن ہے؟''

کبیر چند: ''بیس ہزار روپیہ سیکڑہ سود''

دھنی رام: ''میں نے تو کم سنا ہے''

کبیر چند: ''اس کا تو رہن نامہ رکھا ہے زبانی بات چیت تھوڑی ہے میں دو چار ہزار کے لیے جھوٹ نہ بولوں گا''

دھنی: ''نہیں نہیں، یہ میں کب کہتا ہوں، تو تو نے سن لیا بائی پنچوں کی صلاح ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔''

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اس وقت آ پہنچا یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے وہ بول اٹھا ''کس لیے مکان بیچ دیا جائے برادری کی روٹی کے لیے، برادری تو کھا پی کر راستہ لے گی ان یتیموں کو کون پرورش کرے گا یہ بھی سوچنا چاہیے''

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا'' آپ کو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں صرف آئندہ کی فکر کرنے سے کام نہ چلے گا مرحوم کا پیچھا بھی کسی طرح سدھارنا پڑے گا ہنسی تو ہماری ہو گی دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں وقار کے لیے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں جب وقار ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا۔ اگر ہماری صلاح پوچھو گے تو ہم تو یہی کہیں گے، آگے بائی کو اختیار ہے، جیسا چاہے کرے پر ہم سے سروکار نہ ہو گا چلیے کبیر چند جی چلیں۔''

سوشیلا نے خوفزدہ ہو کر کہا ”بھیا کی باتوں کا خیال نہ کیجئے سیٹھ جی! ان کی تو یہ عادت ہے میں نے تو آپ کی بات نہیں ٹالی آپ میرے بزرگ ہیں گھر کا حال آپ کو معلوم ہی ہے میں اپنے مالک کی روح کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی لیکن جب ان کے بال بچے ٹھوکریں کھائیں گے تو، ان کی روح رنجیدہ نہ ہوگی؟ بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہوگا، لڑکے کو لکھانا پڑھانا پڑے گا ہی، برہمنوں کو کھلا دیجئے لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔“

دونوں اصحاب کو گویا تھپڑ لگ گیا بھلا ایسی بات کبھی زبان سے نکالی جاتی ہے پنچ لوگ اپنے منہ پر سیاہی نہ لگنے دیں گے دنیا بیوہ عورت پر نہیں ہنسے گی ہنسی ہوگی پنچوں کی یہ جگ ہنسائی وہ کیسے سہہ سکتے ہیں ایسے گھر کا دروازہ پر جھانکنا بھی گنا ہے۔

سوشیلا رو کر بولی ”میں غریب ہوں، نادان ہوں، مجھ پر غصہ نہ کیجئے آپ لوگ ہی مجھے چھوڑ دیں گے تو میرا گزارہ کیسے ہوگا“

اتنے میں دو اصحاب اور آ گئے ایک بہت موٹے، دوسرے بہت دبلے، نام بھی اسم با مسمی بھیم چند اور دربلی داس، دھنی رام نے چند لفظوں میں ساری کیفیت انہیں سمجھا دی اور دربل داس نے بہت ہمدردی سے کہا ”تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپے دیں اس کا لڑکا سیانا ہو جائے گا تو روپے مل ہی جائیں گے اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست کے لیے کچھ بل کھا جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے“

سنت لال نے خوش ہو کر کہا ”اتنی مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا“

کبیر چند تیوری چڑھا کر بولے ”تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگے دربل داس

جی، اس وقت بازار میں کسی کے پاس فالتو روپے رکھے ہوئے ہیں جو دے دے گا زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے''

بھیم چند: ''یہ تو ٹھیک ہے ایسا مندا بازار تو کبھی دیکھا ہی نہیں مگر نبھاؤ تو کرنا چاہیے۔''

کبیر چند اکڑ گئے وہ سوشیلا کے مکان پر دانت لگائے ہوئے تھے ایسی باتوں سے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا، وہ اپنے روپے وصول کر کے چھوڑیں گے عورتوں کے جھمیلے میں پڑ کر اپنا نقصان کیوں کریں بھیم چند نے بہت اچھا کیا انہیں ہوشیار کر دیا لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔

سوشیلا نے دربل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا ان کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھ کر بولی: ''میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں آپ لوگ مالک ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔''

دربل داس نے پوچھا ''تیرے پاس کچھ تھوڑے بہت زیور تو ہوں گے؟''

سوشیلا نے قبول کیا ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہیں، بیماری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دیے۔

دھنی رام بولے ''مگر یہ تو مشکل سے تین ہزار میں اٹھیں گے''

دربل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا ''تین ہزار کیسے، میں ساڑھے تین ہزار دلا دوں گا بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا میری بولی تین ہزار کی ہے۔''

کبیر چند کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا پھر موقع ملا، بولے''

چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے برادری کا کھانا ہے یا کوئی بلا ٹالنا ہے کم سے کم دس ہزار کا خرچ ہے مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔''

سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا ''میں کہتا ہوں آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا کیا انہیں بھکاری بنا کر چھوڑیں گے''

لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا بلا مکان فروخت کیے کسی طرح کام نہیں چل سکتا بازار آج کل مندا ہے تیس ہزار روپے سے زائد نہیں مل سکتے پچیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں پانچ ہزار بچیں گے اس طرح نو ہزار میں بڑی کفایت سے ہم برہم بھوج بھی ہو جائے گا اور برادری کی دعوت بھی ہو جائے گی پنچوں کو آخر بال بچوں کا خیال بھی تو کرنا چاہیے۔

سوشیلا نے دونوں کو سامنے کر کے ہاتھ جوڑ کر کہا ''پنچو میرے بچوں کا منہ دیکھو، میرے گھر میں جو کچھ ہے سب لے لیجئے لیکن مکان چھوڑ دیجئے مجھے ٹھکانہ ملے گا میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، مکان اس وقت نہ بچیں''

اس بے وقوفی کا کیا جواب دیا جائے پنچ لوگ تو چاہتے تھے کہ مکان نہ بیچنا پڑے انہیں یتیم بچوں سے کچھ دشمنی نہیں لیکن برادری کا کھانا اور کس طریقے سے کیا جائے۔ اگر بیوہ پانچ ہزار کا انتظام اور کر دے تو مکان فی الحال بچ سکتا ہے جب وہ ایسا نہیں کر سکتی تو مکان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

کبیر داس نے کہا ''دیکھ بائی، بازار کی حالت آج خراب ہے، روپیہ کسی سے ادھار نہیں مل سکتا، بال بچوں کے بھاگ میں لکھا ہو گا تو بھگوان اور کسی حیلے سے دے دیں گے، حیلہ روزی بہانہ موت، بھگوان جس کو پیدا کرتے ہیں اس کے

رزق کا انتظام بھی کر دیتے ہیں ہم تجھے سمجھا کر ہار گئے اگر تو اپنی ہٹ نہیں چھوڑے گی تو ہم بات بھی نہ کریں گے پھر یہاں تیرا رہنا مشکل ہو جائے گا شہر والے تیرے پیچھے پڑ جائیں گے''

بیوہ سوشیلا اور کیا کرتی، پنچوں سے لڑ کر وہ کیسے رہ سکتی تھی۔ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے کون دشمنی کر سکتا ہے اندر جانے کے لیے اٹھی مگر وہیں بے ہوش ہو کر پڑی ابھی تک کچھ امید قائم تھی بچوں کی پرورش میں وہ اپنی بیوگی کو بھول سکتی تھی مگر اب تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔

(3)

سیٹھ رام ناتھ کے دوستوں کا ان کے گھر پر پورا حق تھا، دوستوں کا حق نہ ہو تو کس کا ہو، عورت کون ہوتی ہے جب وہ اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھتی کہ برادری کو روٹی دینا اور دھوم دھام دینا لازمی ہے اس کا زیادہ سمجھانا فضول ہے اب زیورات کون خریدے بھیم چند تین ہزار گنا چکے تھے لیکن اب ان کو معلوم ہوا ان سے بھول ہو گئی تھی دربل نے ساڑھے تین ہزار لگائے تھے اس لیے سودا انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ اس بات پر بھیم چند اور دربل داس ہو گئی لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانی پڑی اور انصاف دربل کی طرف تھا۔

دھنی رام نے ذرا چٹکی لی، دیکھو دربل داس مال تو لے جاتے ہو مگر ساڑھے تین ہزار سے زائد کا ہے میں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔

کبیر داس بولے ''اجی تو گھر میں ہی تو ہے کہیں باہر تو نہیں گیا ایک دن دوستوں کی دعوت ہو جائے گی اس پر چاروں اصحاب ہنس پڑے اس کام سے فرصت پا کر اب مکان کا سوال اٹھا کبیر داس تیس ہزار دینے پر تیار تھے لیکن قانونی کارروائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا۔ یہ خامی کیوں رکھی جائے فوراً ایک دلال بلایا گیا پستہ قد آدمی، پوپلا منہ، کوئی ستر سال کی عمر، نام تھا چوکھے لال''

کبیر داس نے کہا ''چوکھے لال سے ہماری تیس سال کی دوستی ہے آدمی کیا ہے ہیرا ہے۔''

بھیم چند، دیکھو چوکھے لال یہ مکان بیچنا ہے اس کے لیے کوئی اچھا خریدار لاؤ تمہاری دلالی پکی۔

کبیر داس ''بازار کا حال اچھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ کے بچوں کو خسارہ نہ رہے (چوکھے لال کے کان میں) تیس ہزار سے آگے نہ بڑھنا''

بھیم چند ''دیکھیے کبیر داس یہ اچھی بات نہیں ہے''

کبیر داس ''تو میں کہہ کیا رہا ہوں میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اچھے دام لگانا''

چوکھے لال '' آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں رام ناتھ میرے بھی دوست ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں ایک لاکھ سے ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئی لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے اس وقت اس کے پچیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے بھیتے سے کوئی گاہک مل جائے تو دس پانچ ہزار اور مل جائیں گے لیکن اس وقت

پچیس ہزار بھی بہت ہیں''

دھنی رام: ''پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی اور نہ ہی تو تیس ہزار تو کرادو''

چوکھے لال ''تیس کیا میں چالیس کر دوں، کوئی گاہک تو ہو، آپ لوگ کہتے ہیں تو میں تیس ہزار کی بات چیت کروں گا''

دھنی رام ''جب تیس ہزار میں دینا ہے تو کبیر داس ہی کیوں نہ لے لیں اتنا سستا مال دوسروں کو کیوں دیا جائے''

کبیر داس'' آپ سب لوگوں کی جیسی رائے ہو میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بائی کے ساتھ جہاں تک ہو سکے رعایت کی جائے''

دھنی رام جی نے ہاں ہاں کہہ کر منظوری دے دی بھیم چند من میں اینٹھ کر رہ گیا۔

یہ سودا بھی پکا ہو گیا اسی دن وکیل نے بیعنامہ لکھا۔ جھٹ رجسٹری ہو گئی سوشیلا کے سامنے بیعانہ لایا گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس پر دستخط کر دیے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا بیوفا دوست کی طرح یہ گھر بھی سکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ دے کر دکھ میں ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

پنچ لوگ سوشیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کو رقعے لکھ رہے ہیں اور لاوارث بیوہ جھروکے میں اپنی قسمت کو رو رہی ہے ادھر رقعہ تیار ہوا ادھر بیکس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رقعے پر گر پڑے۔

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا ''پانی کی چھینٹ کہاں سے آئی''

سنت رام ''بائی بیٹھی رو رہی ہے اس نے رقعے پر اپنے خون کی آنسوؤں کی مہر لگا دی ہے۔''

دھنی رام (اونچی آواز میں) ''ارے تو کیوں رو رہی ہے بائی یہ رونے کا وقت نہیں تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آج نیک کام کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس خاوند کے ساتھ تو اتنے عیش و آرام سے رہی اس کی آتما کے لیے کچھ ''زادراہ'' دے گی اس کی مکتی کی طرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں؟''

برادری میں رقعہ پھرا، اور پھر تین چار دن پنچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کیے گھی دھنی رام جی کی آڑھت سے آیا میدے اور چینی کی آڑھت بھی انہیں کی تھی، پانچویں دن صبح کے وقت برہمنوں کو کھانا ہوا شام کی برادری کی روٹی ہوئی سوشیلا کے دروازے پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں صحن، بیٹھک، دالان، برآمدہ اوپر کی چھت سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے لوگ کھانا کھاتے اور پنچوں کی تعریفیں کر رہے تھے۔

''سیٹھ چمپا رام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی''

''امرتیاں کیسی خستہ ہیں''

''رس گلے میوے سے بھرے ہیں''

''سارا انتظام پنچوں کا ہے''

دھنی رام نے انکساری سے کہا ''رام ناتھ سے بھائی چارہ تھا ہم نہ کرتے تو کون کرتا یہ سمجھ لو کہ چار دن سے سونا نصیب نہیں ہوا''

''آفریں دوست ہوں تو ایسے ہوں''

"کیا بات ہے، آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا برادری یہی کھانا کھلانا دیکھتی ہے رسم کو دیکھنے نہیں آتی"

مہمان لوگ تعریفیں کر کے تر مال اڑاتے تھے اور ادھر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی دنیا میں ایسے خود غرض لوگ بھی ہیں ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر کر کھانا کھا رہے ہیں کوئی اتنا بھی نہیں سوچتا کہ غریب یتیموں کے لیے کچھ بچا، یا نہیں۔

ایک مہینہ گذر گیا۔

سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی نقد تھا ہی نہیں، زیور نکل گئے تھے۔ اب صرف تھوڑے سے برتن بچ رہے تھے ادھر بہت سے چھوٹے چھوٹے بل چکانے تھے کچھ روپے ڈاکٹر کو دینے تھے۔ کچھ بنیے کو، کچھ درزی کو، سوشیلا کو رفتیں گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر چکانا پڑیں اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا بیچارہ سنت لال ایک دکان میں منیم تھا کبھی کبھی دو چار روپے دے دیتا اور خرچ کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ بچے صورت حال کو سمجھتے تھے ماں کو دق نہ کرتے تھے لیکن مکان کے سامنے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں دوسرے بچوں کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو ان کے منہ میں چاہے پانی نہ آئے، آنکھوں میں ضرور آجاتا تھا ایسی للچائی نظروں سے دیکھتے کہ رحم آجاتا وہی بچے جو چند روز پہلے میوے اور مٹھائی کی طرف تاکتے بھی نہ تھے اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے وہی حضرات جنہوں نے برادری کو دعوت کروائی تھی، مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے پر کوئی جھانکتا نہ تھا۔

شام ہوگئی تھی سوشیلا چولہا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی اور دونوں بچے چولہے کے پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے دال پکنے کا انتظار تھا لڑکی گیارہ سال کی تھی ،لڑکا آٹھ سال کا۔

موہن بے صبر ہوکر بولا ''اماں مجھے روکھی روٹیاں ہی دے دو بڑی بھوک لگی ہے''

سوشیلا نے محبت آمیز لہجہ میں کہا ''ذرا اور صبر کرو بیٹا، ابھی دال پکی جاتی ہے''

ریوتی کو بھائی پر رحم آ گیا، بولی ''میرے پاس ایک پیسہ ہے میں وہی لے آتی ہوں''

سوشیلا نے پوچھا ''تو نے پیسہ کہاں سے پایا''

ریوتی نے معصومانہ انداز میں کہا، ''مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری میں ملا تھا''

سوشیلا مطمئن ہوکر بولی ''اچھا جا، مگر جلدی آئیو''

ریوتی دوڑی ہوئی باہر گئی اور ایک پتے پر ذرا سی دہی لے آئی ماں نے روٹی دے دی

موہن دہی سے روٹی کھانے لگا عام لڑکوں کی طرح وہ بھی خودغرض تھا بہن سے پوچھا بھی نہیں۔

سوشیلا نے تیوریاں چڑھا کہ کہا ''اکیلا ہی کھا جائے گا یا بہن کو بھی دے گا''

موہن شرمندہ ہوگیا اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں

ریوتی بولی ''نہیں اماں کتنا ملا ہے تم کھا لو موہن تمہیں جلد نیند آ جاتی ہے میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی''

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی، ریوتی نے باہر جا کر پوچھا معلوم ہوا سیٹھ کبیر داس کے آدمی ہیں مکان خالی کرانے آئے ہیں سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔

برو ٹھے میں آ کر بولی ''ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی سے مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہو گئی میرا پچاس ہزار کا مکان تیس ہزار میں لے لیا، اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کیے پھر بھی پیٹ نہیں بھرا کہہ دو، میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی''

منیم نے ملامت سے کہا ''بائی جی، میں تو نوکر ہوں میرا کیا اختیار ہے جب ملکیت دوسرے کی ہو گئی تب آپ کو مجبوراً چھوڑنی ہی پڑے گی قانون تو کسی کی حالت کو نہیں دیکھتا''

سوشیلا سمجھ گئی منیم کیا کہتا ہے رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گزارہ وہ گا زم ہو کر بولی ''اتنا میں بھی جانتی ہوں منیم جی، تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا، دس دن کی مہلت اور دے دیں لیکن کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کیوں دس دن کے لیے کسی کا احسان لوں میری تقدیر میں اس گھر میں رہنا لکھا ہوتا تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا''

منیم نے پوچھا ''تو کل سویرے تک خالی ہو جائے گا''

سوشیلا بولی ''ہاں ہاں کہتی تو ہوں کہ کل سویرے تک کیوں، میں ابھی خالی کیے دیتی ہوں میرے پاس اپنا اثاثہ ہی کیا ہے، تمہارے سیٹھ جی کے رات بھر کے کرایہ کا کیوں نقصان ہو، جا کر قفل لا دیا لائے ہو؟''

''ایسی کیا جلدی ہے بائی جی، کل اطمینان سے خالی کر دیجیے گا''

''جب خالی ہی کرنا ہے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں منیم جی آپ جایے اور تالا لا کر ڈال دیجیے۔''

یہ کہتی ہوئی سوشیلا اندر گئی بچوں کو کھانا کھلایا ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ نگلی، برتن مانجھے پر ایک یکہ منگوا کر اس پر مختصر سامان لادا اور دل میں درد لیے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی جسے اس نے اتنے ارمانوں سے کئی پشتوں کے لیے بنوایا تھا۔ اس وقت دل میں کتنی امنگیں تھیں، اینٹ اول درجہ کی ہو۔ چونا خالص کنکر کا لکڑ پختہ سیٹھ جی مرحوم تو دن بھر اپنی آڑھت میں رہتے تھے، مزدوروں کی نگرانی اور دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی۔ جس دن مکان تیار ہو گیا اور آبادی کی رسم ادا ہوئی اس دن کئی ہزار برہمن کا بھوج ہوا تھا سوشیلا کو اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی کہ وہ ایک مہینہ تک بیمار رہی ''اس گھر سے اتنے ہی دنوں میں کتنی یادیں وابستہ ہو گئی تھیں اسی گھر میں اس کے دولڑکے مرے تھے یہیں اس کے شوہر نے دنیا کو خیر باد کہا مرنے والوں کی روحیں گویا اس درو دیوار پر منڈلا رہی ہوں اس کا ایک ایک کونہ گو اس کے دکھ سے دکھی اور اس کے سکھ سے سکھی ہوتا ہوا معلوم ہوا تھا وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہے۔''

اس نے رات ایک ہمسائے کے گھر کاٹی اور دوسرے ان دس روپیہ ماہوار پر ایک گلی میں دوسرا مکان لے لیا۔

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس عذاب میں کاٹے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں جو ہوادار، پر فضا، وسیع اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو، اس کے لیے یہ نیا مکان تنگ و تاریک زندان خانہ سے کم تکلیف دہ نہ تھا مگر بھلا ہو بچارے سنت لال کا وہ اپنی قلیل آمدنی میں بھی ان غریبوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا۔ اگر سوشیلا شروع ہی سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی یا کسی کا کھانا پکا کر گزارا کرتی مگر خوشحال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور خوشحال شوہر کی بیوی، یہ کام اسے ذلیل معلوم ہوتے تھے، پھر اپنے مرحوم شوہر کے وقار کا بھی تو خیال تھا حیثیت سے گر کر رہنے میں کتنی سبکی تھی لوگ یہی کہتے یہ سیٹھ رامناتھ کی بیوی ہے کل کیا تھے آج کیا ہو گئے اس نام کی لاج رکھنی ہی تھی سماج کی سخت گیریوں سے کسی طرح بھی نجات نہیں لڑکی کے دو ایک زیور بچ گئے تھے وہ بھی بک گئے جب روٹیوں ہی کے لالے تھے تو گھر کا کرایہ ماہوار کہاں سے آتا۔ تین مہینے تک تو مالک مکان نے کسی طرح صبر کیا وہ بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا جس نے ضیافت میں خوب بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارے تھے اور سوشیلا کی زبوں حالی سے واقف تھا مگر بیچارہ کہاں تک صبر کرتا تیس روپے کا معاملہ تھا روپیہ آٹھ آنے کی بات، نہ تھی، اتنی بڑی رقم تو نہیں چھوڑی جاسکتی۔

آخر جب چوتھا مہینہ لگ گیا تو ایک دن سیٹھ جی بہ نفس نفیس وارد ہوئے اور سانڈ کی طرح ڈکارتے ہوئے بولے اگر تو کرایہ نہیں دے سکتی تو گھر خالی کر دے میں نے برادری کے ناطے اتنی مروت کی لیکن تو پروا نہیں کرتی کھاتی ہے پیتی ہے، کپڑے پہنتی ہے پھر گھر کا کرایہ دیتے ہوئے کیوں نانی مرتی ہے بچارے رام

ناتھ کی آتما کو بدنام کر رہی ہے۔

سوشیلا دردناک لہجہ میں بولی ''میرے پاس روپے ہوتے تو آپ کا کرایہ ادا کر کے تب پانی پیتی آپ نے اتنی مروت کی، اسی لیے میرا سر آپ کے قدموں پر ہے لیکن ابھی میں بالکل تنگدست ہوں یہ سمجھ لیجئے کہ بس ایک بھائی میرے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں اور کیا کہوں۔''

سیٹھ جی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے، پورنماشی کو ہمیشہ ست نرائن کی کتھا سنتے تھے اب اور کہاں تک دھرم کے نام کو روتے غضب ناک ہو کر بولے ''چل چل اس طرح کے بہانے بہت سن چکا ہوں میں برادری کا آدمی ہوں نہ اس لیے چاہتی ہے کہ مجھے چوس لے، اگر کوئی اور ہوتا اس چپکے سے مہینے مہینے کرایہ دیتی، نہیں تو اس نے نکال باہر کیا ہوتا میں برادری کا ہوں مجھے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں مجھے مانگنا ہی نہ چاہیے۔ کیوں برادری کے ساتھ یہی سلوک، اسی کے سایہ میں رہتی ہے اسی کی جڑ کھودتی ہے''

ریوتی بھی کہیں سے کھیلتی ہوئی آ کر کھڑی ہو گئی سیٹھ جی نے اسے سر سے پاؤں تک مبصرانہ انداز سے دیکھا اور تب ذرا رقیق ہو کر بولے ''اچھا تو یہ لڑکی سیانی ہو گئی کہیں اس کی سگائی کی بات چیت نہیں کی۔''

ریوتی شرما کر بھاگ گئی سوشیلا نے ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک پا کر پر اعتماد لہجہ میں کہا ''ابھی تو کہیں بات چیت نہیں ہوئی سیٹھ جی، گھر کا کرایہ تک تو ادا نہیں کر سکتی۔ سگائی کہاں سے کروں، پھر ابھی چھوٹی بھی تو ہے''

سیٹھ جی نے فوراً شاستروں کا حوالہ دیا ''لڑکیوں کی شادی بارہ سال کے اندر

کر دینی چاہیے شاستروں کی یہی منشا ہے، دھرم سب کے لیے ایک ہے کیا غریب، کیا امیر، اس کا نیر اور نہ کرنا چاہیے کرایہ کی کوئی بات نہیں ہے، پھر دے دینا مجھے معلوم نہ تھا کہ سیٹھ رام ناتھ کی کنیا ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔''

سوشیلا کو جیسے آنکھیں مل گئیں بولی ''تو آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہے یہ تو آپ جانتے ہیں میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ہے''

سیٹھ جھابر مل جی (آپ کا یہی مبارک نام تھا) کی مردانہ حمیت جوش میں آ گئی آواز میں قند و شکر گھول کر بولے ''لینے دینے کی کوئی بات نہیں بائی جی سیٹھ رام ناتھ بھائی تھے ان کی کنیا کنواری بیٹھی رہے یہ میں نہیں دیکھ سکتا ایسا گھر ہے کہ لڑکی زندگی بھر آرام سے رہے گی تمہارا لڑکا بھی وہیں رہے گا اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا بس یہی سمجھ لو کہ تمہارے نصیب کھل جائیں گے گھرانہ بہت ہی شریف اور اونچا ہے ہاں لڑکا دوہاجو ہے۔''

''عمر اچھی ہونی چاہیے، دوہاجو ہونے سے کیا ہوتا ہے''

''عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ابھی چالیسواں سال ہے دیکھنے میں تیس ہی کا لگتا ہے ہٹا کٹا مضبوط آدمی ہے اور مرد کی عمر تو اس کی غذا ہے اچھی غذا ملتی جائے تو عمر کی پروا نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا بیڑا پار لگ جائے گا''

سوشیلا تشویشناک لہجہ میں بولی، ''اچھا یہ سوچ کر جواب دوں گی ایک بار مجھے دکھا دینا''

سیٹھ جھابر مل جی مسکرا کر بولے ''دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی! وہ تیرے سامنے ہی کھڑا ہے۔''

سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا یہ پچاس سال کا بوڑھا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس، سینہ کا گوشت لٹک کر ناک تک آ پہنچا ہے ٹھوری سینے کا بوسہ لے رہی ہے، دانت کے ستون جیسے کوئٹہ کے زلزلے میں منہدم ہو گئے ہیں اور اس پر یہ بڑھبیس، یہ احمق سمجھتا ہے کہ میں لالچ میں آکر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں گی، میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی پر اس مرد کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد کروں گی، مگر اس نے ضبط کیا یہ زمانہ کی خوبی ہے کہ ایسے گھسٹوں کو اس کی بے کسی کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

بولی ''آپ کی اس عنایت کے لیے آپ کی مشکور رہوں سیٹھ جی، مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کر سکتی''

جھابرمل تند ہو کر بولے ''تو اور تو کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کے لیے برادری میں کنوارا لڑکا مل جائے گا''

''تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی''

''سیٹھ رام ناتھ کے نام کو داغ لگائے گی''

''نام کے لیے اپنی ساری جائیداد کھوئی، زیور کھوئے، مکان کھویا، لیکن لڑکی کو کنوئیں میں نہیں ڈال سکتی، نام رہے یا جائے''

''تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دے دے''

''ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں''

جھابرمل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے اور خانہ داری کی ایک

ایک چیز نکال کر گلی میں پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا، مٹکے چور چور ہو گئے، برتن ٹوٹ گئے۔ صندوق کے کپڑے بکھر گئے، چیتھڑوں کو جوڑ کر ریوتی نے کھیلنے کے لیے خوب صورت سی گڑیا بنا رکھی تھی اس کے اعضاء منتشر ہو گئے اور اس کے ریزے ریزے ہوا میں اڑ گئے سوشیلا ایک بے حسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی تباہی کا یہ جگر دوز نظارہ دیکھتی رہی گھر کو خاک میں ملا کر جھابر مل نے مکان میں قفل ڈال دیا اور عدالت سے روپے وصول کرنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

(6)

بڑوں کے پاس دولت ہے چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے دولت سے عالیشان محل بنتے ہیں عیاشیاں ہوتی ہیں، مقدمہ بازیاں کی جاتی ہیں رعب جتایا جاتا ہے اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے دل سے ہمدردی ہوتی ہے، زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں۔

اسی مکان سے ملی ہوئی ایک سبزی والی کنجڑن کی دکان تھی، بوڑھی، بیوہ، ضعیف بے اولاد تھی ظاہر میں آگ باطن میں پانی جھابر مل کو خوب صلوتیں سنائیں اور سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں لے گئی اور پیار سے بولی ”تم چل کر میرے گھر میں رہو۔ بہو ملاحظہ میں آ گئی نہیں نگوڑے کی مونچھیں اکھاڑ لیتی، موت سر پر ناچ رہی ہے آگے ناتھ نہ پیچھے پکھا موا پیسے کے لیے مرا جاتا ہے جانے چھاتی پر لاد کر لے جائے گا چار دن میں گنگا میں جائیں گے

انہیں بیاہ کی دھن سوار ہے پیسہ پا کر آدمی کی آنکھیں بھی اندھی ہو جاتی ہیں کیا؟ تم آرام سے گھر میں رہو میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں بس میں اکیلی ہوں، ایک ٹکڑا مجھے بھی دے دینا''

سوشیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا'' ماتا جی میرے پاس ان ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے سوا اور کچھ نہیں کرایہ کہاں سے دوں گی؟''

بڑھیا مادرانہ شفقت سے بولی'' میں جھابر مل نہیں ہوں بیٹی، نہ کبیر داس ہوں میں تو دیکھتی ہوں اچھے برے دن سب کے آتے ہیں سکھ میں اترا و مت، دکھ میں گھبراو مت، تمہیں اس دن بھی دیکھا تھا جب تم محل میں رہتی تھیں، اور آج بھی دیکھ رہی ہوں جب تم انا تھ ہو جو مزاج جب و ہی اب ہے، میرے دھن بھاگ کہ تم میرے گھر میں آ و میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں کہ میں تم سے کرایہ مانگنے جاؤں گی۔''

ان تشفی سے بھرے ہوئے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا اس نے آج دیکھا سچی انسانیت اور محبت غریبوں، رذیلوں ہی میں رہتی ہے، بڑوں کا دل بھی بڑا برا ہوتا ہے تکبر اور خودنمائی سے پر۔

اس کنجڑن کے ہاں رہتے سوشیلا کو چھ مہینے ہو گئے تھے اس کی مادرانہ الفت میں سوشیلا کا اپنا رنج و غم بہت کچھ بھول گیا تھا ہو جو کچھ پانی لا کر سوشیلا کے ہات پر رکھ دیتی دونوں بچے اس کی دو آنکھیں تھیں مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انہیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ سکے، بڑھیا آسمان سر پر اٹھا لیتی سنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لایا کرتا تھا اس سے فراغت کے ساتھ گزر ہو جاتی تھی سوشیلا گھر کی مالکن تھی۔

کاتک کا مہینہ تھا فصلی بخار پھیلا ہوا تھا موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا اور تین دن تک بے ہوش رہا بخار اتنی شدت کا تھا کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ سی لگتی تھی سوشیلا کو ٹائیفائڈ کا اندیشہ تھا اس کی جان سوکھی جاتی تھی، کیا کرے، کس سے کہے۔

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا ''بیٹی تو نے پنچ جی کا گھر دیکھا ہے، جا کر ان سے میرا پرانام کہنا اور کہنا کہ بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے، چھن بھر کو بھی نہیں اترتا کوئی ڈاکٹر بھیج دیجیے۔''

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی، کبیر داس نے حال سنا اپنے منیم سے بولے ''ایسا حکم بھیجتی ہے جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں کھانے کوٹھکانا نہیں، انہیں ڈاکٹر چاہیے چڑیل''

ریوتی سے بولے ''جا کر کہہ دے، ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہوگی راضی ہو تو بھیج دوں''

ریوتی نے دل شکستہ ہو کر کہا ''اماں کے پاس روپے کہاں ہیں سیٹھ جی!''

کبیر داس جھڑک کر بولے ''تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر بھیجنے کو کہتی ہے تیرا ماموں کہاں ہے اس سے جا کر کہہ، سیوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلا لے جایا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لڑکے کو لے جاتی یا ابھی وہی پرانی بو سمائی ہے کتنی بے سمجھ عورت ہے گھر میں ٹکا نہیں، ڈاکٹر کی فرمائش کر دی۔ فیس پنچ جی دیں گے، پنچ جی کیوں فیس دیں پنچایت کا مال دھرم کاج کے لیے ہے یوں اڑانے کے لیے نہیں شہر کے لاکھوں آدمی ہسپتال میں اچھے ہو جاتے ہیں پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں ابھی

بھاگوت کی کتھا بیٹھنے والی ہے کئی ہزار کا خرچ ہے اس طرح ہر ایک کے لیے ڈاکٹر بھیجنے لگوں تو ثواب کا کوئی کام ہی نہ ہو''

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی، مگر جو کچھ سنا تھا وہ کہہ کر ماں کے زخم پر نمک نہ چھڑکنا چاہتی تھی بہانہ کر دیا سیٹھ جی ملے نہیں، کہیں باہر گئے ہیں۔

سوشیلا نے ڈانٹ کر کہا''تو میں نے منیم جی سے کیوں نہیں کہا یہاں کوئی مٹھائی رکھی تھی جو دوڑی ہوئی آ گئی۔''

اسی وقت سنت لال ایک وید کو لے کر آئے۔

(7)

مگر وید جی ایک دن آ کر دوسرے دن نہ لوٹے۔ جب پوری فیس کی جگہ آدھی بھی نہ ملے اور نہ اس تعلق سے کسی موٹے مریض کے پھنسنے کی امید ہی ہو تو پھر وہ کس تحریک سے روز آئیں۔ سیوا سمتی کے ڈاکٹر صاحب بھی دو دن بڑی منتوں سے آئے پھر انہیں بھی فرصت نہ رہی جھابر مل کو بخار آنے لگا تھا اور جھابر مل برادری کے ذی اثر آدمی تھے ان کے معالجے میں ہر طرح کا فائدہ تھا۔

ادھر موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی ایک مہینہ یوں ہی گزر گیا مگر بخار نے اترنے کا نام نہ لیا پیر تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار ہو گیا تھا کہ ہلتا تک نہ تھا، موہن کا چہرہ اتنا زرد اور افسردہ ہو گیا تھا گویا خون کا ایک قطرہ جسم میں نہ ہو، اسے دیکھ کر رحم آتا تھا لمبا سا چہرہ نکل آیا تھا جس سے طفلانہ بیکسی روتی ہوئی معلوم

ہوتی تھی نہ کچھ بولتا نہ کہتا یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا پڑا پڑا بے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا پڑے پڑے جلد میں خراش ہو گیا تھا سر کے بال گر گئے تھے ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے، چارپائی پر ایسا سمٹا ہوا تھا گویا ہے ہی نہیں، تصویر مٹ گئی صرف اس کا عکس باقی تھی ماں رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

ایک دن شام کے وقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے سوشیلا تو پہلے ہی سے ٹھونک رہی تھی، یہ حالت دیکھی تو چھاتی پیٹنے لگی، اسے بے بسی میں کچھ اور نہ سوجھا، کھڑی ہو گئی اور موہن کے کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہو کر بولی" بھگوان یہی میری اس جنم کی کمائی ہے اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی یہ چوٹ نہ سہی جائے گی تم اسے اچھا کر دو اس کے بدلے مجھے اٹھا لو بس میں تمہاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں"

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے، کیا ہم میں سے بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے کوئی رقم اڑا دی اسی دن ہمیں اس رقم کا دو گنا نقصان اٹھانا پڑے اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر، اسی رات کو موہن کا بخار اتر گیا اور سوشیلا کو بخار آ گیا۔ بچے کی تیمارداری میں آدھی تو یوں ہی ہو رہی تھی بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بستر مرگ پر سلا دیا۔ معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا اس کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی تیسرے دن موہن چارپائی سے اٹھا اور ماں کے پاس جا کر اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگا طویل بیماری کے بعد ہم میں ایک روشن ضمیری آ جاتی ہے اس سے اسے آنے والے سانحہ کا الہام سا ہو گیا تھا ماں نے

اسے چھاتی سے لگالیا اور بولی ''کیوں روتے ہو بیٹا میں اچھی ہو جاؤں گی جب تم کو بھگوان نے اچھا کردیا تو میری کیا فکر وہی تمہاری پرورش کریں گے اب مجھے کوئی فکر نہیں، بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی''

موہن سسکیاں بھر کر بولا ''جیا کہتی ہے اماں اچھی نہ ہوں گی''

سوشیلا نے بچہ کا بوسہ لے کر کہا ''جیا پگلی ہے اسے کہنے دو، میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ رہوں گی ہاں جس دن تم کسی کو ستاؤ گے، کسی کا دل دکھاؤ گے، اپنی نیت خراب کرو گے، کسی کی کوئی چیز چرالو گے اسی دن میں مر جاؤں گی''

موہن خوش ہو کر بولا ''میں کبھی کسی کی چیز نہ چراؤں گا اماں کبھی کسی کو گالی نہ دوں گا تم میرے ساتھ ہمیشہ رہو گی نا؟''

''ہاں بیٹا ہمیشہ''

اسی رات کو مصیبت کی ستائی ہوئی وہ غم نصیب بیوہ دونوں یتیم بچوں کو خدا کے سائے میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔

(8)

اسی سانحہ کو تین سال ہو گئے موہن اور ریوتی ابھی تک اس پاک نفس کنجڑن کے پاس رہتے ہیں بڑھیا ماں تو نہیں ہے مگر ماں سے بڑھ کر ہے روز علی الصباح موہن کو باسی روٹیاں مکھن کے ساتھ کھلا کر گورجی کی پاٹھ شالہ میں پہنچا آتی ہے

چھٹی کے وقت خود جا کر لے آتی ہے، ریوتی کا چودھواں سال ہے، وہ گھر کا سارا کام پیسنا، کوٹنا، چوکا، برتن، جھاڑو کرتی ہے اور اس کا من ذرا بھی میلا نہیں ہوتا جب بڑھیا سودا لے کر بازار چلی جاتی ہے تو وہ دکان پر آ کر بیٹھتی ہے۔

ایک دن بڑے پنچ سیٹھ کبیر داس نے اسے بلوا بھیجا اور بولے ”کیوں ری تو اتنی سیانی ہو گئی، تجھے کنجڑن کی دکان پر بیٹھتے شرم نہیں، ساری برادری کی ناک کٹوا دی ہے۔ خبردار جو کل سے دکان پر بیٹھی میں نے تیری شادی کے لیے سیٹھ جھابر مل کا پکا کر لیا ہے رانی بن جائے گی رانی۔“

سیٹھانی نے تائے دی، تو اب سیانی ہو گئی بیٹی، تیرا اب اس طرح دو کان پر بیٹھنا اچھا نہیں، لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، تہمت لگاتے کتنی دیر لگتی ہے بڑی مشکل سے جھابر مل جی کو راضی کیا ہے کہتے تھے ایسی للتی چھوکری سے شادی کر کے کون بدنامی مول لے مگر ہم نے بہت سمجھا بجھا کر انہیں سیدھا کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہ بھاگ جاگ جائیں گے لاکھوں کی جائیداد ہے، لاکھوں کی، تیرے دھن بھاگ کہ ایسا بر ملا، تیرا چھوٹا بھائی ہے اسے بھی پڑھا لکھا کر دکان کرا دی جائے گی۔

سیٹھ نے پیشانی کو اوپر چڑھا کر کہا ”برادری کی کتنی ہنسی ہو رہی ہے“

سیٹھانی نے تصدیق کی ”ہے ہی“

ریوتی نے لجا کر کہا ”میں کیا جانوں، یہ سب آپ ماما سے کہیں“

کبیر داس بگڑ کر بولے ”ماما کون ہوتا ہے، ٹکے کا آدمی، اس سے کیا پوچھوں، میں برادری کا پنچ ہوں مجھے اختیار ہے کہ جس کام میں برادری کی بہتری

دیکھوں وہ کروں میں نے اور پنچوں سے رائے لے لی ہے سب راضی ہیں اگر یوں نہ مانے گی تو ہم عدالتی کارروائی کریں گے تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں خرچ برچ کے لیے کچھ درکار ہو تو یہ ہیں''

یہ کہہ کر انہوں نے پچاس روپے کا نوٹ صندوق سے نکال کر ریوتی کی طرف پھینک دیا ریوتی نے اٹھا کر وہیں پرزے پرزے کر ڈالا اور تمتماتے ہوئے منہ سے بولی ''برادری نے اس وقت ہماری بات نہ پوچھی جب ہم روٹیوں سے محتاج تھے میری بدنصیب ماں مرگئی برادری کا کوئی آدمی جھانکنے تک نہ آیا، میرا بھائی بیمار ہے۔کسی نے خبر تک نہ لی، ایسی برادری کی مجھے پروا نہیں۔''

ریوتی چلی گئی تو جھابرمل پاس کی کوٹھری سے نکل آئے جہاں وہ پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے چہرے پر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔

مسز کبیر داس بولے ''لڑکی کتنی گھمنڈی ہے آنکھ کا پانی مرگیا''

جھابرمل نے نوٹ کے پرزے چنتے ہوئے رونا منہ بنا کر کہا ''پچاس روپیوں پر پانی پھیر گیا سسری نے ایسا پھاڑا ہے کہ جڑ بھی نہیں سکتے''

کبیر داس نے ان کے آنسو پونچھے، ''تم گھبراؤ نہیں جھابرمل جی اسے عدالت سے ٹھیک کروں گا جاتی کہاں ہے''

جھابرمل نے دانت نکال کر کہا ''جب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے''

برادری کے بڑے پنچ نے یہ الفاظ محض عتاب میں نہ کہے تھے انہوں نے جلدی ہی عملی کارروائی شروع کر دی اور قانون نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا ریوتی نابالغ تھی اور یتیم ایسی حالت میں پنچوں کو اس کی نگرانی اور حفاظت کا استحاق

تھا وہ برادری کی لونڈی بن کر نہیں رہنا چاہتی نہ چاہے، اس کی سنتا کون ہے قانون برادری کے حقوق کو کیونکر پامال کر سکتا ہے۔

سنت لال نے یہ ماجرا سنا تو غصہ ضعیف کے عالم میں دانت پیس کر بولے ''یہ برادری نہ جانے کب جہنم میں جائے گی ریوتی نے تیوریاں چڑھا کر کہا'' تو برادری مجھے جبراً اپنی حمایت میں لے سکتی ہے۔

''ہاں بیٹی جس کے ہاتھ میں روپے ہیں اسی کے ہاتھ میں قانون بھی ہے''

''میں صاف کہہ دوں گی میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی''

''تیرے کہنے سے کچھ نہ ہوگا تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے تو اس کا کیا علاج ایسی برادری میں پیدا ہونے کی یہی سزا ہے'' ایک لمحہ کے بعد وہ کھڑا ہو کر بولا

''میں جاتا ہوں سیٹھ کبیر داس کے پاس''

''نہیں ماما جی! تم کہیں نہ جاؤ جب بھاگ کا یہی بھروسہ ہے تو جو کچھ بھاگ میں ہوگا''

رات کو ریوتی نے کروٹیں بدل کر اور رو رو کر کاٹی بار بار نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے پیارے بھائی کو گلے لگاتی اور روتی، یہ اناتھ اکیلے کیسے رہے گا یہ سوچ کر اس کا دل کمزور ہو جاتا مگر جھابرمل کی وہ منحوس صورت دیکھ کر اس کا عزم پھر قوی ہو جاتا

علی الصباح ریوتی گنگا اشنان کرنے گئی۔ ادھر کئی مہینوں سے اس کا یہ روز کا معمول تھا۔

آج ذرا اندھیرا تھا، یہ کوئی کھٹکے والی بات نہ تھی، شبہ تو جب ہوا جب آٹھ بج

گئے اور وہ لوٹ کر نہ آئی، تیسرے پہر تک ساری برادری میں خبر پھیل گئی، سیٹھ رام ناتھ کی کنیا گنگا میں ڈوب گئی اس کی لاش معائنہ کے لیے پولیس اٹھا لے گئی۔

کبیر داس بولے ''چلو جھگڑا پاک ہوا، برادری کی بدنامی تو نہ ہو گی''

جھابر مل نے مایوسانہ انداز سے کہا ''میں تو لٹ گیا سیٹھ جی، میرے لیے اب کوئی اور راستہ نکالیے''

ادھر موہن سر پیٹ پیٹ کر رو رہا تھا اور بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی ''بیٹا اس دیوی کے لیے کیوں روتے ہو زندگی میں اس کے لیے کون سا سکھ تھا اب وہ اپنی ماں کی گود میں آرام کر رہی ہے اور پنچوں کا ستیاناس جائے میری لاڈلی کی جان ہی لے کر چھوڑی''

''موہن معصومانہ سادگی سے بولا'' یہ لوگ جیا کو کیوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے ہاں میری خبر کیوں نہیں لیتے میری پڑھائی کا کیوں نہیں انتظام کرتے۔

بڑھیا نے اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بولی ''تم میری آنکھوں کے تارے ہو بیٹا''

☆☆☆☆☆☆

قاتل کی ماں

پہلی بار: کتابی صورت میں فروری 1938ء (واردات)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کی اطلاع نہیں ہے

رات کو رامیشوری سوئی تو کیا خواب دیکھتی ہے کہ ونود نے کسی آفیسر کو مار ڈالا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدوکوب کر رہی ہے اور تمام شہر میں شوروشر بپا ہے اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی دیکھا تو ونود سو رہا تھا اٹھ کر ونود کے اس گئی پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی میں نے کیا بے سرپیر کا خواب دیکھا اس کے ساتھ کچھ متفکر بھی ہو گئی پھر لیٹی مگر نیند نہ آئی دل میں ایک خوف سا گیا تھا۔

صبح کو ونود نے ماں کو متفکر دیکھ کر سوچا ''اماں آج اداس کیوں ہو''

ماں ونود کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی ''بیٹا! تم سے کیا کہوں رات کو میں نے ایک بہت برا خوب دیکھا ہے، جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہوں۔''

ونود نے ہنس کر کہا ''کیا تم چاہتی تھیں کہ میں پکڑ لیا جاتا؟''

ماں نے کہا: ''میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اٹھے ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں دوسروں کو مار کر خود جینا میرے دھرم کے خلاف ہے''

ونود: ''دھرم اور نیتی کا زمانہ ہے''

ماں: ''دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی اور آئندہ بھی ہوگی سوراجیہ قتل، خون سے نہیں ملتا، تیاگ، تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے لالچ چھوڑتے نہیں بری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں اس پر دعویٰ ہے سوراجیہ لینے لگا، یہ سمجھ لو جو سوراجیہ قتل وخون سے ملے گا، وہ ملک کی چیز ہوگی افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظار کرے گا ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں، قتل وخون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں''

ونود نے کہا: ''تم تو اسٹیج پر کھڑی ہو کر بولتی ہو، یہاں کون سننے والا ہے''

ماں نے کہا ''بیٹا! تم ہنستے ہو اور میرا جی دکھی ہے کئی دن سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے''

ونود نے کہا: ''میں مصیبت سے نہیں ڈرتا ابھی کون سا سکھ بھوگ رہے ہیں، جو مصیبتوں سے ڈریں''

یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(2)

آج صبح ہی سے ونود کا پتا نہ تھا معلوم نہیں کہاں گیا رامیشوری نے پہلے تو سمجھا کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اسے فکر ہوئی دس بجے کے بعد وہ کہیں نہ رکتا تھا پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو رات کا

خواب اسے بے چین و پریشان کرنے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی جب شام ہوگئی تو اس سے نہ رہا گیا کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہیں آیا۔

رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہو گیا اور وہ خواب مجسم بن کر اسے ڈرانے لگا کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چپ چاپ کھڑی رہی پھر خیال آیا شاید گھر گیا ہو فوراً گھر لوٹی لیکن یہاں ونود کا اب تک پتا نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا تھا اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی اس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی خیالات اور بھی خوف ناک صورت اختیار کرنے لگے کوئی دیوی یا دیوتا نہ بچا جس کی اس نے منت نہ مانی ہو کبھی صحن میں آ کر بیٹھ جاتی کبھی دروازے پر جا کر کھڑی ہوتی اس کا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند کبھی نشیمن میں آ بیٹھتا اور کبھی شاخ پر کھانا پکانے کا خیال کسے تھا بار بار یہی سوچتی ''بھگوان میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا دے رہے ہو اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کرو میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے''

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے کس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اس کا ساتھ دیتی ہوں۔

(3)

نصف شب گزر چکی تھی رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی اتنے میں کوئی شخص نہایت تیزی سے دوڑا ہوا آیا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا جسے اس نے اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ منہ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

رامیشوری نے ڈر کر پوچھا ''کون ہے''

وہ ونود تھا جلدی سے اندر داخل ہو کر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا، پھر آنگن میں آ کر کمبل کو رکھ دیا اور کھانے کو مانگا

رامیشوری نے خائف ہو کر پوچھا ''تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمہیں ڈھونڈتی رہی۔''

ونود نے قریب آ کر کہا'' میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے یہاں نہ رہ سکوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں میں نے وہی کیا جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا حفاظت جان کی خاطر مجھے یہاں سے بھاگ جانا ضروری ہے۔''

رامیشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا بولی: ''کیوں بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا ایشور نے تمہاری بدھی کیوں ہر لی؟''

ونود نے کہا'' نہ ایشور نے میری بدھی ہری ہے، نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے میں نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے ایسا نشانہ مارا ایک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا ہلا تک نہیں''

''کیا وہاں کوئی اور نہ تھا؟''

''کوئی نہیں، بالکل سناٹا تھا''

''پولیس کو خبر تو ہوگئی ہوگی''

''ہاں کئی شخص پکڑے گئے ہیں میں تو صاف بچ نکلا''

رامیشوری کی حالت بدل گئی بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں بولی ''میں اسے بچنا نہیں کہتی مجرم تو منہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے تم خونی ہو مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہوگا ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کرلے ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہوگا۔''

یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آگیا بولا ''تمہارے کہنے سے میں خونی نہیں ہوا جاتا اور لوگ یہی کام کرتے ہیں تو لیڈر ہو جاتے ہیں ان کی جے جے کار ہوتی ہے لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں میں نے کیا تو ہتیارا ہوگیا۔''

رامیشوری: ''ہتیارا تو تو ہے ہی اور جو دوسروں کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہیں تیری ماں ہو کر میں بھی پاپ کی حصے دار ہوگئی میرے منہ میں بھی سیاہی لگ گئی لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسرے کے لیے مرتے ہیں جو دوسروں کی حفاظت کرے وہی بہادر اور سورما ہے انہیں کا جنم مبارک ہے انہیں کی مائیں خوش نصیب ہیں، تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کر کے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔''

ونود نے پھر کمبل اٹھالیا اور بولا: ''تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت لگے ہاتھ تمہارا کام بھی تمام کر دیتا جیتے جی پھر تمہارا منہ نہ دیکھوں گا''

یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا

(4)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اس جوش میں گھر سے نکلی ''بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ نا انصافی نہیں گوارا کرسکتی وہ اسی وقت کوتوالی میں جا کر اس خون کی خبر دے دے گی ونود کا پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہوں کو پھانسی ہو''

لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہو گیا وہ لوٹ پڑی اور گھر آ کر خوب روئی جس بیٹے کو اس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا، کیا اسے پھانسی دلا دے گی۔

لیکن پھر خیال آیا ان بیچاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی جو بے گناہ پھانسی پائیں گے انہیں بھی اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے نہیں نہیں وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی اسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہو گا۔

رامیشوری اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی، جب کوئی راستہ نہ نظر آتا تو وہ رونے لگ جاتی تھی پھر سوچتی، کیوں نہ خودکشی کرلوں کہ تمام دکھوں سے نجات مل جائے لیکن اس کی موت سے ان بے گناہوں کی جان تو نہ بچے گی ان ماتاؤں کا کلیجہ تو نہ ٹھنڈا ہو گا وہ اس پاپ سے تو نہ آزاد ہوں گے وہ اپنے آپ ہی بول اٹھی خواہ کچھ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی اجلاس میں جا کر صاف صاف کہہ دوں گی کہ گنہگار میں ہوں کیوں کہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے ہم دونوں ہی قصور وار ہیں دونوں کو پھانسی دیجئے میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ونود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے ہاں! میں اپنی

آنکھوں سے اس کو پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی کیوں کہ میں نے اس کو جنم دیا ہے بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں میں کمزور ہوں پاپن ہوں ہتیاری ہوں

رامیشوری بے ہوش ہوکر گر پڑی

(5)

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی کیا اسی لیے بیٹے کو جنم دیا تھا، اسی لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن اسے پھانسی پر چڑھتے دیکھوں گی ونو داس کی زندگی کا سہارا تھا آج اسی ونود سے اس کا ناتا ٹوٹ رہا ہے ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ایک دن وہ تھا کہ وہ اسے چھاتی سے لگائے پھرتی تھی، بڑے دکھ جھیل کر بھی خوش تھی ایک دن یہ ہے کہ اسے پھانسی دلانے جا رہی ہے ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے اس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا آہ! فرض کا راستہ کس قدر دشوار گزار ہے ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اس کا آخری بوسہ لینے کے لیے اس کا دل بے چین ہو گیا کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟

رامیشوری ونود کو سزا دینے جا رہی تھی جوش محبت سے بھری ہوئی۔

(6)

ایک ہفتہ گزر گیا پولیس نے سازش کا پتا لگا لیا شہر کے دس جوان گرفتار کر لئے گئے انہیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہو گیا۔

ونود کا اسی دن سے پتا نہ تھا رامیشوری فرض اور محبت کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانوا ڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر! کبھی فرض کلیجے کو مضبوط کر دیتا کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے فرض پسپا ہوتا جاتا تھا نئی دلیلیں اس کے احساس فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہو گی یہی سب سے زبردست دلیل تھی ان سات دنوں میں اس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے تھے اور وہ پانی بھی آنکھوں کے راستے نکل جاتا تھا ایسی ہو گئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ

دس بجے کا وقت تھا وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی اسی وقت روزانہ ایک بار ونود کا پتا لینے کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔

ناگہاں اس نے تو دس جوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے ایک درجن مسلح پولیس کے سپاہیوں کے پنجے میں گرفتار دیکھا پیچھے تھوڑی دور پر کچھ مرد عورت سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا ’’کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟‘‘

سپاہی نے کہا: ’’کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟‘‘

’’کون مارا گیا؟‘‘

''ایک پولیس سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا آج آٹھواں دن ہے''

''کانگریس کے آدمی ہتیا نہیں کرتے''

''قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے''

رامیشوری دن بھر وہیں کھڑی رہی پھر انہیں لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی فرض یہ نئی طاقت پا کر سنبھل گیا نہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منہ میں نہ جانے دے گی اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا ''کیا صاحب آ گئے''

اس نے جواب دیا ''ابھی نہیں آئے آتے ہی ہوں گے''

''بہت دیر سے آتے ہیں، بارہ تو بجے ہوں گے''

اردلی نے جھنجھلا کر کہا ''تو کیا وہ تمہارے نوکر ہیں کہ جب تمہاری مرضی ہو آ کر بیٹھ جائیں بادشاہ ہیں جب مرضی ہوگی آئیں گے''

رامیشوری چپ ہوگئی

اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں ایک نے پوچھا ''کیوں بہن! تمہارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟''

رامیشوری اپنی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی کچھ نہ بولی

اس عورت نے پھر کہا ''کیا کہوں نہ جانے کس پاپی نے خون کیا آپ تو منہ میں سیاہی لگا کر چھپ رہا اور رہم لوگوں کے متھے گئی''

کئی عورتیں رو رہی تھیں رامیشوری بھی رونے لگی

ایک ضعیف عورت اسے سمجھانے لگی ''بہن چپ ہو جاؤ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہی ہو گا میرا بیٹا بالکل بے قصور پکڑا گیا ہے کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمہارا کون گرفتار ہے؟''

رامیشوری نے اسے بھی کچھ جواب نہ دیا بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی'' صاحب کب تک آئیں گے؟''

دو بجے صاحب کی موٹر آئی اجلاس میں ہل چل مچ گئی جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا پولیس کے افسر آ گئے ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔

عین اسی وقت رامیشوری نے اجلاس کے روبرو آ کر سلام کیا اور صاف لفظوں میں بولی: ''حضور! اس مقدمے کے پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں''

سب کے سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

صاحب نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''کیا بات ہے''

رامیشوری: ''میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمے کا سچا حال بیان کروں سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں''

صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا: ''تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟''

رامیشوری نے کہا: ''میں اپنے ہوش میں ہوں اور بالکل سچ کہتی ہوں سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے اس کا نام ونود بہاری ہے میرے گھر میں اس

کا فوٹو رکھا ہوا ہے وہ اسی دن سے لاپتا ہو گیا ہے میں اپنے ہوش میں ہوں اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے میں اسے اس طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک ہفتے پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے انہیں بے اولاد بنا کر میں اولاد والی نہیں رہنا چاہتی میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

کمرے میں ہل چل مچ گئی مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی نہ کچھ سوجھتا تھا نہ کچھ سنائی دیتا تھا بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکایک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: ''ارے تو ہے ونود!''

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

غم نداری بزبجز

پہلی بار: کتابی صورت میں، فروری 1938ء (واردات)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کی اطلاع نہیں ہے

ان دنوں دودھ کی تکلیف تھی کئی ڈیری فارموں کی آزمائش کی، اہیروں کا امتحان لیا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، دو چار دن تو دودھ اچھا ملتا پھر آمیزش شروع ہو جاتا کبھی شکایت ہوتی دودھ پھٹ گیا کبھی اس میں سے ناگوار بو آنے لگتی، کبھی مکھن کے ریزے نکلتے آخر ایک دن ایک دوست سے کہا بھئی، آؤ ساجھے میں ایک گائے لے لیں تمہیں بھی دودھ کا آرام ہو جائے گا، مجھے بھی، لاگت آدھی آدھی، خرچ آدھا آدھا، دودھ بھی آدھا آدھا، دوست صاحب راضی ہو گئے۔ میرے گھر میں جگہ نہ تھی اور گوبر وغیرہ سے مجھے نفرت ہے ان کے مکان میں کافی جگہ تھی اس لیے تجویز ہوئی کہ گائے انہیں کے گھر رہے اس کے عوض انہیں گوبر پر بلا شرکت غیرے اختیار ہے وہ اسے کامل آزادی سے تھاپیں، اپلے بنائیں، گھر لیپیں، پڑوسیوں کو دیں یا اسے کسی طبی مصرف میں لائیں منمقر کو اس میں کسی قسم کا اعتراض، احتجاج یا قیل وقال نہ ہوگا اور منمقر بہ صحت ہوش وحواس و برا صابت عقل اقرار کرتا ہے کہ وہ گوبر پر کبھی دست تصرف دراز نہ کرے گا اور نہ کسی کو تصرف کے لیے آمادہ کرے گا۔

دودھ آنے لگا روز روز کی ضیق سے نجات ملی ایک ہفتہ تک کسی قسم کی شکایت نہ

پیدا ہوئی گرم گرم دودھ پیتا تھا اور خوش ہو کر گاتا تھا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
تازہ دودھ پلایا اس نے
لطف حیات چکھایا اس نے
دودھ میں بھیگی روٹی میری
اس کے کرم نے بخشی سیری
خدا کی رحمت کی ہے مورت
کیسی بھولی بھالی صورت

مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی پرانی شکایتیں پیدا ہونے لگیں یہاں تک نوبت پہنچی کہ دودھ صرف نام کا دودھ رہ گیا کتنا ہی ابالو، کہیں ملائی کا پتہ نہ مٹھاس کا پہلے تو شکایت کر لیا کرتا تھا اس سے دل کا بخار نکل جاتا تھا شکایت سے اصلاح نہ ہوئی تو دودھ بند کر دیتا تھا اس تو شکایت کا بھی موقع نہ تھا بند کر دینے کا ذکر ہی کیا قہر درویش بر جان درویش پیو یا نالی میں ڈال دو۔ آٹھ روز کا نسخہ نوشتہ قسمت تھا۔ بچہ دودھ کو منہ نہ لگاتا، پینا تو دور رہا، آدھوں آدھ شکر ڈال کر کچھ دنوں دودھ پلایا تو پھوڑے نکلنے شروع ہوئے اور میرے گھر میں روز بم چخ مچی رہتی تھی بیوی نوکر سے فرماتیں ”دودھ لے جا انہیں کے سر پٹک آ“ میں نوکر کو منع کرتا وہ کہتیں ”اچھے دوست ہیں تمہارے، اسے شرم نہیں آتی کیا اتنا احمق ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ دودھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ گائے کو اپنے گھر منگوا لو، بلا سے بدبو آئے گی۔

مچھر ہوں گے دودھ تو اچھا ملے گا، روپے خرچ ہیں تو اس کی لذت تو ملے گی چڑھا صاحب میرے پرانے مہربان ہیں، خاصی بے تکلفی ہے ان سے یہ حرکت ان کے علم میں ہوتی ہو اسے قیاس باور نہیں کرتا یا تو ان کی بیوی کی شرارت ہے، یا نوکر کی لیکن ذکر کیسے کروں اور پھر ان کی بیوی سے بھی تو راہ و رسم ہے کئی بار میرے گھر آ چکی ہیں میری دیوی جی بھی ان کے ہاں کئی بار مہمان جا چکی ہیں کیا وہ یکا یک اتنی بے وقوف ہو جائیں گی صریح آنکھوں میں دھول جھونکیں گی اور پھر چاہے کسی کی شرارت ہو، میرے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ ان سے دودھ کی خرابی کی شکایت کرتا خیریت یہ ہوئی کہ تیسرے مہینے چڑھا کا تبادلہ ہو گا میں تنہا گائے نہ رکھ سکتا تھا ساجھا ٹوٹ گیا گائے آدھے داموں میں بیچ دی گئی میں نے اس دن اطمینان کا سانس لیا۔''

آخر یہ صلاح ہوئی کہ ایک بکری رکھ لی جائے وہ بیچ آنگن میں ایک گوشے میں پڑی رہ سکتی ہے۔ اسے رکھنے کے لیے نہ گوالے کی ضرورت ہے، نہ اس کا گوبر اٹھانے، ناند دھونے، چارہ بھوسا ڈالنے کے لیے کسی اہیرن کی ضرورت بکری تو میرا ملازم بھی آسانی سے دوہ لے گا۔ تھوڑی سی چوکر ڈال دی، چلیے قصہ تمام ہوا پھر بکری کا دودھ مفید بھی زیادہ ہے بچوں کے لیے خاص طور پر زود ہضم، معتدل، صحت بخش، حسن اتفاق سے میرے یہاں جو پنڈت جی میرے مسودے نقل کرنے آیا کرتے تھے ان معاملات میں کافی تجربہ کار تھے، ان سے ذکر آیا تو انہوں نے ایک بکری کی ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا پچھائیں نسل کی بکری ہے، اونچے قد کی، بڑے بڑے تھن، جو زمین سے لگے چلتے

ہیں بے حد کم خور لیکن بے حد دودھ بار ایک وقت میں دو ڈھائی سیر دودھ لے لیجئے ابھی پہلی مرتبہ ہی بیاہی ہے 25 روپے میں آ جائے گی مجھے دام کچھ زیادہ معلوم ہوئے لیکن پنڈت جی پر مجھے اعتبار تھا فرمائش کر دی گئی اور تیسرے دن بکری آ پہنچی میں دیکھ کر اچھل پڑا جو اوصاف بیان کئے گئے تھے ان سے کچھ زیادہ ہی نکلے۔ ایک چھوٹی سی مٹی کی ناند منگوائی گئی چوکر کا بھی انتظام ہو گیا شام کو میرے خدمت گار نے دودھ نکالا تو سچ مچ ڈھائی سیر میری چھوٹی پتیلی لبریز ہو گئی تھی اب موسلوں ڈھول بجائیں گے یہ مسئلہ اتنے دنوں کے بعد جا کے کہیں حل ہوا ہے پہلے ہی یہ بات سوجھتی تو کیوں اتنی پریشانی ہوتی پنڈت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا مجھے علی الصبح اور شام کو سینگ پکڑنے پڑتے تھے تب آدمی دودھ نکالتا تھا لیکن یہ تکلیف اس دودھ کے مقابلے میں کچھ نہ تھی بکری کیا ہے کام دھین ہے بیوی نے سوچا اسے کہیں نظر نہ لگ جائے اس لیے اس کے تھن کے لیے غلاف تیار ہوا اس کی گردن میں نیلے چینی کے دانوں کی ایک مالا پہنائی گئی گھر میں جو کچھ جھوٹا بچتا دیوی خود جا کر اسے کھلا آتی تھیں۔

لیکن ایک ہفتے میں دودھ کی مقدار کم ہونے لگی ضرور نظر لگ گئی، بات کیا ہے پنڈت جی سے حال کہا تو انہوں نے کہا ''صاحب دیہات کی بکری ہے زمین دار کی! بے دریغ اناج کھاتی تھی اور سارے دن باغ میں گھوما چرا کرتی تھی یہاں بندھے بندھے دودھ کم ہو جائے تو تعجب نہیں اسے ذرا ٹہلا دیا کیجئے''

لیکن شہر میں بکری کو ٹہلائے کون اور کہاں؟ اس لیے یہ طے ہوا کہ مضافات میں مکان لیا جائے وہاں بستی سے ذرا دور نکل کر کھیت اور باغ ہوں گے کہار گھنٹے

دو گھنٹے ٹہلایا کرے گا جھٹ پٹ مکان تبدیل کیا اور ہر چند مجھے دفتر آنے جانے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا لیکن اچھا دودھ ملے تو میں اس کا دوگنا فاصلہ طے کرنے کو تیار یہاں مکان کشادہ تھا مکان کے سامنے صحن تھا ذرا اور بڑھ کر آم اور مہوے وغیرہ کا باغ باغ سے نکلیے تو کاچھیوں کے کھیت تھے۔ کسی میں آلو، کسی میں گوبھی، ایک کاچھی سے طے کرلیا کہ روزانہ بکری کے لیے ہریالی دے جایا کرے مگر اتنی کوشش کرنے پر بھی دودھ کی مقدار میں کوئی خاصی بیشی نہ ہوئی ڈھائی سیر کی جگہ مشکل سے سیر بھر دودھ نکلتا تھا لیکن یہ تسکین بھی کہ دودھ خالص ہے یہی کیا کم ہے۔

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدمت گاری کے مقابلے میں بکری چرانا زیادہ ذلیل کام ہے ہمارے دیوتاؤں اور نبیوں کا نہایت معزز طبقہ گلہ بانی کیا کرتا تھا کرشن جی گائے چراتے تھے کون کہہ سکتا ہے کہ اس گلے میں بکریاں نہ رہی ہوں گی حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ دونوں ہی بھیڑیں چراتے تھے۔ لیکن انسان روایات کا غلام ہے جو بزرگوں نے نہیں کیا اسے وہ کیسے کرے۔ نئے راستے پر چلنے کے لیے جس عزم اور پختہ یقین کی ضرورت ہے وہ ہر ایک میں تو ہوتا نہیں دھوبی آپ کے غلیظ کپڑے دھولے گا لیکن آپ کے دروازے پر جھاڑو لگانے میں ہتک سمجھتا ہے جرائم پیشہ اقوام کے فرد بازار سے قیمتاً کوئی چیز خریدنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں میرے خدمت گار کو بکری لے کر باغ میں جانا برا معلوم ہوتا تھا گھر سے تو لے جاتا لیکن باغ میں اسے چھوڑ کر خود کسی درخت کے نیچے سو جاتا بکری پتیاں چر لیتی تھی مگر ایک دن اس کے جی میں آیا کہ ذرا باغ سے نکل کر کھیتوں کی

سیر کرے یوں وہ بہت ہی شستہ مزاج اور وضع دار بکری تھی اس کی صورت سے متانت اور تحمل جھلکتا تھا لیکن باغ اور کھیت میں اسے یکساں آزادی نہیں ہے اسے وہ شاید نہ سمجھ سکی ایک روز کسی کھیت میں گھس گئی اور گوبھی کی کئی کیاریاں صاف کر گئی، کاچھی نے دیکھا تو اس کے کان پکڑ لیے اور میرے پاس آ کر بولا: ''بابو جی اس طرح آپ کی بکرے ہمارے کھیت میں چرے گی تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے آپ کو بکری رکھنے کا شوق ہے تو اسے باندھ کر رکھیے آج تو ہم تمہارا لحاظ رکھ لیا لیکن پھر ہمارے کھیت میں گئی تو ہم یا تو اس کی ٹانگ توڑ دیں گے یا کانجی ہاؤس میں بھیج دیں گے'' ابھی وہ اپنی تقریر ختم نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی آ پہنچی اور اس نے اسی خیال کو زیادہ پرزور الفاظ میں ادا کیا: ''ہاں ہاں کرتی رہی مگر رانڈ کھیت میں گھس گئی اور سارا کھیت چوپٹ کر دیا اس کے پیٹ میں بھوانی بیٹھیں، یہاں کوئی تمہارا دبیل نہیں ہے حاکم ہو گے اپنے گھر کے ہو گے بکری رکھنا ہے تو باندھ کر رکھو نہیں گلا اینٹھ دوں گی'' میں بھیگی بلی بنا ہوا کھڑا تھا جتنی پھٹکار آج سہنی پڑی، اتنی زندگی میں کبھی نہ سہی تھی اور جس تحمل سے آج کام لیا اگر اس سے دوسرے موقعوں پر کام لیا ہوتا تو آج آدمی ہوتا کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا بس یہی جی چاہتا تھا کہ بکری کا گلا گھونٹ دوں اور خدمت گار کے ڈیڑھ سو ہنٹر جماؤں میری خموشی سے وہ خاتون اور بھی شیر ہوتی جاتی تھی آج مجھے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر خاموشی مضر ثابت ہوتی ہے بارے میری اہلیہ نے گھر میں یہ غل غپاڑہ سنا تو دروازے پر آ گئیں اور ہیکڑی سے بولیں:

''تو کانجی ہاؤس پہنچا دے اور کیا کرے گی ناحق بڑ بڑ کر رہی ہے گھنٹے بھر سے

جانور ہی ہے ایک دن کھل گئی تو کیا اس کی جان لے گی خبر دار جو ایک بات بھی منہ سے نکالی ہو گی کیوں نہیں، کھیت کے چاروں طرف جھاڑ لگا دیتی کانٹوں سے روند دے اپنی غلطی تو مانتی نہیں اوپر سے لڑنے آتی ہے ابھی پولیس کو اطلاع کر دیں تو بندھے بندھے پھرو!''

اس تحکمانہ انداز بیان نے ان دونوں کو ٹھنڈا کر دیا لیکن ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوی جی کی خوب خبر لی: ''غریبوں کا نقصان بھی کرتے ہو اوپر سے رعب جماتی ہو اسی کا نام انصاف ہے؟'' دیوی جی نے انداز تفاخر سے جواب دیا ''میرا احسان تو نہ مانو گے کہ شیطان کو کتنی آسانی سے دفع کر دیا لگے الٹے ڈانٹنے گنواروں کی راہ پر لانے کا سختی کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں شرافت یا فیاضی ان کی سمجھ میں نہیں آتی اسے یہ لوگ کمزوری سمجھتے ہیں اور کمزور کو کون نہیں دبانا چاہتا؟''

خدمت گار سے جواب طلب کیا تو اس نے صاف کہہ دیا ''صاحب بکری چرانا میرا کام نہیں ہے''

میں نے کہا: ''تم سے بکری چرانے کو کون کہتا ہے ذرا اسے دیکھتے رہا کرو کہ کسی کھیت میں نہ جائے اتنا بھی تم سے نہیں ہو سکتا''

''میں بکری نہیں چرا سکتا صاحب! کوئی دوسرا آدمی رکھ لیجئے''

آخر میں نے خود شام کو اسے باغ میں چرانے کا فیصلہ کیا ہے اتنے ذرا سے کام کے لیے ایک نیا آدمی رکھنا میری حیثیت سے باہر تھا اور اپنے خدمت گار کو بھی جواب دینا نہیں چاہتا تھا جس نے کئی سال تک وفاداری سے میری خدمت کی تھی

اور ایمان دار تھا دوسرے دن میں دفتر سے ذرا جلد چلا آیا اور چٹ پٹ بکری کو لے کر باغ میں جا پہنچا۔ جاڑوں کے دن تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھی پتیاں گری ہوئی تھیں۔ بکری پتیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی گویا مہینوں کی بھوکی ہو ابھی اس درخت کے نیچے تھی ایک پل میں وہ جا پہنچی میری ذلیل ہو رہی تھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا دفتر سے لوٹ کر ذرا آرام کیا کرتا تھا آج یہ قواعد کرنا پڑی، تھک گیا مگر محنت سپھل ہو گئی آج بکری نے کچھ زیادہ دودھ دیا۔

یہ خیال آیا اگر سوکھی پتیاں کھانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی تو یقیناً ہری پتیاں کھلائی جائیں تو اس سے کہیں بہتر نتیجہ نکلے لیکن ہری پتیاں آئیں کہاں سے؟ درختوں سے توڑوں تو باغ کا مالک ضرور اعتراض کرے گا قیمتاً ہری پتیاں مل نہ سکتی تھیں سوچا کیوں نہ ایک بار بانس کے لگے سے پتیاں توڑیں مالک نے شور مچایا تو اس سے منتیں کرلیں گے راضی ہو گیا تو خیر نہیں دیکھی جائے گی تھوڑی سی پتیاں توڑ لینے سے درخت کا کیا بگڑا جاتا تھا چنانچہ ایک پڑوسی سے ایک پتلا لمبا بانس مانگ لایا اس میں ایک انکس باندھا اور شام کو بکری کے ساتھ لے کر پتیاں توڑنے لگا، چور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا کہیں مالک تو نہیں آرہا ہے دفعتاً وہی کاچھی ایک طرف سے آنکلا مجھے پتیاں توڑتے دیکھ کر بولا: ''یہ کیا کرتے ہو بابو جی؟ آپ کے ہاتھ میں یہ لگا اچھا نہیں لگتا بکری پالنا ہم گریبوں کا کام ہے کہ آپ جیسے سریفوں کا''میں کٹ گیا کچھ جواب نہ سوجھا اس میں کیا برائی ہے اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں کیا شرم، وغیرہ جوابات ہلکے، بے حقیقت، مصنوعی معلوم ہوئے سفید پوشانہ خودداری نے زبان بند کر دی کاچھی نے قریب آکر میرے

ہاتھ سے لگا لے لیا اور آن واحد میں ہری پتیوں کا ڈھیر لگا دیا پوچھا ’’پتیاں کہاں رکھ آؤں؟‘‘

میں نے جھینپتے ہوئے کہا ’’تم رہنے دو میں اٹھا لے جاؤں گا‘‘

اس نے تھوڑی سے پتیاں بغل میں اٹھالیں اور بولا: ’’آپ کیا پتیاں رکھنے جائیں گے چلیے میں رکھ آؤں‘‘

میں نے برآمدے میں پتیاں رکھوا دیں اسی درخت کے نیچے اس کی چوگنی پتیاں پڑی ہوئی تھیں کاچھی نے ان کا ایک گٹھا بنایا اور سر پر لاد کر چلا گیا اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دہقان کتنے چالاک ہوتے ہیں کوئی بات مطلب سے خالی نہیں۔

مگر دوسرے دن بکری کو باغ میں لے جانا میرے لئے دشوار ہو گیا کاچھی پھر دیکھے گا اور نہ جانے کیا کیا فقرے چست کرے اس کی نظروں میں گر جانا، روسیاہ ہو جانے سے کم شرمسار نہ تھا ہماری عزت اور توقیر کا جو معیار عوام نے قائم کر رکھا ہے ہم کو اس کا احترام کرنا پڑے گا نکو بن کر رہے تو کیا رہے۔

لیکن بکری اتنی آسانی سے آزادانہ چہل قدمی سے دست بردار ہونا نہ چاہتی تھی جسے اس نے اپنا معلوم سمجھنا شروع کر دیا تھا شام ہوتے ہی اس نے اتنے زور وشور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا گنگری دار میں میں کی پیہم آوازیں آ آ کر کان کے پردوں کو مجروح کرنے لگیں کہاں بھاگ جاؤں؟ بیوی نے اسے گالیاں دینا شروع کیں میں نے غصے میں آ کر کئی ڈنڈے رسید کیے مگر اس نے ستیا گرہ ملتوی کرنا تھا نہ کیا عجیب عذاب میں جان تھی۔

آخر مجبور ہو گیا ’’خود کو وہ راعلاجے نیست، آٹھ بجے رات جاڑوں کے دن،

گھر سے منہ نکالنا مشکل اور میں بکری کو باغ میں ٹہلا رہا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا اندھیرے میں پانو رکھتے میری روح کانپتی ہے ایک بار میرے سامنے سے ایک سانپ نکل گیا تھا اگر اس کے اوپر پیر پڑ جاتا تو ضرور کاٹ لیتا تب سے میں اندھیرے میں کبھی نہ نکلتا تھا مگر آج اس بکری کے کارن مجھے اس خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا ذرا بھی ہوا چلتی اور پتے کھڑ کتے تو میری آنتیں سکڑ جاتیں اور پنڈلیاں کانپنے لگتیں۔شاید اس جنم میں میں بکری رہا ہوں گا اور یہ بکری میری آقا رہی ہوگی وہی کنارہ اس زندگی میں ادا کر رہا تھا۔ برا ہو اس پنڈت کا جس نے یہ بلا میرے سر منڈھی گرہستی ہی جنجال ہے بچہ نہ ہوتا تو کیوں اس موذی جانور کو اتنی خوشامد کرنی پڑتی اور یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو بات نہ سنے گا آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے،کون سی جائیداد چھوٹی ہے یہ سزا بھگت کر نو بجے رات کو لوٹا اگر رات کو بکری مر جاتی تو مجھے مطلق غم نہ تھا۔''

دوسرے دن صبح ہی سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح رات کی بیگار سے چھٹی ملے آج دفتر میں تعطیل تھی میں نے ایک لمبی سی رسی منگوائی اور شام کو بکری کے گلے میں رسی ڈالی ایک درخت کی جڑ سے باندھ کر چھوڑ دیا اب چرے جتنا چاہے اب چراغ جلتے جلتے کھول لاؤں گا تعطیل تھی ہی شام کو سینما دیکھنے کی ٹھہری ایک اچھا سا کھیل آیا ہوا تھا۔نوکر کو بھی ساتھ لیا ورنہ بچے کو کون سنبھالتا۔ جب نو بجے رات کو گھر لوٹے اور میں لالٹین لے کر بکری لینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے رسی کو دو تین درختوں میں لپیٹ کر ایسا الجھا ڈالا ہے کہ سلجھنا مشکل ہے اتنی رسی بھی نہ بچی کہ وہ ایک قدم بھی چل سکتی ،لاحول ولاقوۃ جی میں آیا کمبخت کو

یہیں چھوڑ دوں مرتی ہے تو مر جائے۔ اب اتنی رات کو لالٹین کی روشنی سے کون رسی سلجھانے بیٹھے لیکن دل نہ مانا پہلے اس کی گردن سے رسی کھولی پھر اس کے پیچ در پیچ اینٹھن چھڑائی، ایک گھنٹہ وقت صرف ہو گیا مارے سردی کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے اور جی جل رہا تھا وہ الگ یہ ترکیب اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

اب کیا کروں! کچھ عقل کام نہ کرتی تھی دودھ کا خیال نہ ہوتا تو کسی کو مفت دے دیتا شام ہوتے ہی چڑیل اپنی صدائے بے ہنگام شروع کر دے گی اور گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور آواز بھی کتنی کریہہ اور منحوس ہوتی ہے شاستروں میں لکھا ہے جتنی دور اس کی آواز جاتی ہے اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ سورگ کی بسنے والی ہستیاں جو اپسراؤں کے نغمے سننے کے عادی ہیں اس کی مکروہ آواز سے نفرت کریں تو کیا تعجب! مجھ پر اس کی سمع خراش صداؤں کی ایسی ہیبت سوار تھی کہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہی گھر سے نکل بھاگا لیکن ایک میل نکل جانے پر بھی ایسا گمان ہو رہا تھا کہ اس کی آواز میرا پیچھا کیے چلی آتی ہے۔ اپنی تنگ ظرفی پر شرم بھی آ رہی تھی، جسے ایک بکری رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو۔ وہ اتنا نازک دماغ کیوں بنے اور پھر تم ساری رات تو گھر سے باہر رہو گے نہیں۔ آٹھ بجے پہنچو گے تو کیا وہ گوسفندانہ نغمہ تمہارا خیر مقدم نہ کرے گا۔

دفعتاً ایک نیچی شاخوں والا درخت دیکھ کر مجھے بے اختیار اس پر چڑھنے کی تحریک ہوئی۔ سپاٹ تنوں پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے، یہاں تو 2، 7 فٹ کی اونچائی پر شاخیں پھوٹ گئیں تھیں، ہری ہری پتیوں سے درخت لدا کھڑا تھا اور درخت بھی تھا گولر کا جس کی پتیوں سے بکریوں کو خاص رغبت ہے میں ادھر تیس سال سے کسی

روکھ پر نہیں چڑھا، وہ عادت جاتی رہی اس لیے آسان چڑھائی کے باوجود میرے پانو کانپ رہے تھے، پر میں نے ہمت نہ ہاری اور پتیاں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا یہاں اکیلے میں کون مجھے دیکھتا ہے کہ پتیاں توڑ رہا ہوں ابھی اندھیرا ہوا جاتا ہے پتیوں کا ایک گٹھر بغل میں دباؤں گا اور گھر جا پہنچوں گا اگر اتنے پر بھی بکری نے کچھ چیں چپڑ کی تو اس کی شامت ہی آ جائے گی۔

میں ابھی اوپر ہی تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک غول نہ جانے کدھر سے آ نکلا اور پتیوں پر پل پڑا میں اوپر سے چیخ رہا ہوں، مگر کون سنتا ہے چرواہے کا کہیں پتا نہیں کہیں دبک رہا ہوگا کہ دیکھ لیا جاؤں گا تو گالیاں پڑیں گی، جھلا کر نیچے اترنے لگا ایک ایک پل میں پتیاں غائب ہوتی جاتی تھیں اتر کر ایک ایک کی ٹانگ توڑ دوں گا۔

یکا یک پانو پھسلا اور میں دس فٹ کی اونچائی سے نیچے آ رہا کمر میں ایسی چوٹ آئی کہ پانچ منٹ تک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خیریت ہوئی کہ اور اوپر سے نہیں گرا، نہیں تو یہیں شہید ہو جاتا۔ بارے میرے گرنے کے دھماکے سے بکریاں بھاگیں اور تھوڑی سی پتیاں بچ رہیں جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں نے ان پتیوں کو جمع کر کے ایک گٹھا بنایا اور مجبوروں کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر شرم کی طرح چھپائے گھر چلا۔ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہوا جب مکان کوئی چار فرلانگ رہ گیا اور میں نے قدم تیز کیے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو وہ کاچھی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت ہوگی راستے کے دونوں طرف کھیتوں کی اونچی مینڈیں تھیں جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے لگے ہوئے تھے اگر رستے

رستے جاتا ہوں تو وہ ظالم میری بغل سے ہو کر گزرے گا اور خدا معلوم کیا ستم ڈھائے کہیں مڑنے کا راستہ نہیں اور وہ مردود بلائے بے درماں کی طرح چلا آتا تھا۔ میں نے دھوتی اوپر سرکائی، چال بدل لی اور سر جھکا کر اس طرح نکل جانا چاہتا تھا کہ کوئی مزدور ہے تلے کی سانس تلے تھی، اوپر کی اوپر جیسے وہ کاچھی کوئی خوں خوار شیر ہو بار بار خدا کو یاد کر رہا تھا "یا الٰہی تو ہی آفت زدوں کا والی و مددگار ہے اس مردود کی زبان بند کر دے ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں کا نور غائب کر دے۔۔۔۔۔" آہ وہ جاں گسل لمحہ جب میں اس کے برابر ایک گز کے فاصلے سے نکلا ایک ایک قدم تلوار کی دھار پر تھا کہ شیطانی آواز کان میں آئی: "کون ہے رے، کہاں سے پتیاں توڑے لاتا ہے؟"

مجھے معلوم ہوا کہ نیچے کی زمین نکل گئی ہے اور میں اس کے گہرے شکم میں جا پہنچا ہوں روئیں برچھیاں بنے ہوئے تھے، دماغ میں ابال سا آ رہا تھا، اعضا مفلوج ہو رہے تھے۔ جواب دینے کا ہوش نہ رہا۔ تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا مگر وہ ارادی فعل نہ تھا حفظ جان کا اضطراری عمل تھا ایک ظالم ہاتھ گٹھے پر پڑا اور گٹھا نیچے گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے دروازے پر پسینے میں تر کھڑا تھا۔ گویا مرگی کے دورے کے بعد اٹھا ہوں اس وقفے میں روح پر شعور ثانی کی حکومت تھی اور بکری کی وہ مکروہ آواز، وہ دلخراش آواز، وہ ہمت شکن آواز، وہ ساری دنیا کی نحوستوں کا خلاصہ و دنیا کی ساری لعنتوں کی روح، کان میں چیخی جا رہی تھی۔

بیوی نے پوچھا: "آج کہاں چلے گئے تھے اس چڑیل کو ذرا باغ میں بھی نہ

لے گئے جینا محال کیے دیتی ہے گھر سے نکل کر کہاں چلی جاؤں؟''

میں نے تشفی دی: ''آج چلا لینے دو کل سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے گھر سے نکال باہر کروں چاہے قصاب ہی کو دینا پڑے''

''اور لوگ نہ جانے کیسے بکریاں پالتے ہیں''

''بکری پالنے کے لیے کتے کا دماغ چاہیے''

صبح کو بستر سے اٹھ کر اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ اس کالی بلا سے کیوں کر نجات حاصل کروں کہ دفعتاً ایک گڈریا بکریوں کا ایک گلہ چراتا ہوا آ نکلا میں نے اسے پکارا اور اس سے اپنی بکری کو چرانے کی تجویز پیش کی گڈریا راضی ہو گیا یہی اس کا کام تھا۔

میں نے پوچھا: ''کیا لو گے؟''

''آٹھ آنے بکری ملتے ہیں حضور''

''میں ایک روپیا دوں گا لیکن بکری میرے سامنے نہ آئے''

گڈریا حیرت میں پڑ گیا: ''مرکھنی ہے کیا، بابو جی؟''

''نہیں نہیں بہت سیدھی ہے بکری کیا مارے گی لیکن میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا''

''ابھی دودھ تو دیتی ہے''

''ہاں سیر سوا سیر دودھ دیتی ہے''

''دودھ آپ کے گھر میں پہنچ جایا کرے گا''

''تمہاری مہربانی''

جس وقت بکری گھر سے نکلی ہے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری نحوست نکلی جا رہی ہے بکری بھی خوش تھی گویا قید سے چھوٹی ہو۔

گڈریے نے اسی وقت دودھ نکالا اور گھر میں رکھ کر بکری کو لیے چلا گیا۔ ایسا بے غرض گاہک اسے زندگی میں شاید پہلی ہی بار ملا ہوگا۔

ایک ہفتے تک تو دودھ تھوڑا بہت آتا رہا پھر اس کی مقدار کم ہونے لگی یہاں تک کہ ایک مہینہ ختم ہوتے ہوتے دودھ بالکل ختم ہوگیا معلوم ہوا کہ بکری گابھن ہوگئی ہے میں نے ذرا بھی اعتراض نہ کیا کاچھی کے پاس گائے تھی اس سے دودھ لینے لگا میرا نوکر خود جا کر دوہا لاتا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے گڈریا مہینے میں ایک بار آکر اپنا روپیا لے جاتا میں نے کبھی اس سے بکری کا ذکر نہ کیا۔ اس کے خیال ہی سے میری روح کو وحشت ہوتی ہے؟ اگر قیافہ شناس ہوتا تو بڑی آسانی سے اپنا حق الخدمت دوگنا کرسکتا تھا۔

ایک دن میں دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ گڈریا اپنی بکریوں کا گلہ لیے آنکلا۔ میں اس کا روپیا لانے اندر گیا کہ کیا دیکھتا ہوں میری بکری دو بچوں کے ساتھ مکان میں آپہنچی وہ پہلے سیدھی اس جگہ گئی جہاں بندھا کرتی تھی پھر وہاں سے آنگن میں آئی اور شاید تعارف کے اظہار کے لیے میری طرف تاکنے لگی۔ انہوں نے دوڑ کر ایک بچے کو گود میں لے لیا اور کوٹھری میں جا کر مہینوں کا جمع چوکر لائیں اور ایسی محبت سے بکری کو کھلانے لگیں گویا بہت دنوں کی بچھڑی ہوئی سہیلی آگئی ہو نہ وہ پرانی تلخی تھی، نہ وہ کدورت کبھی بچے کو چمکارتی تھیں۔ کبھی بکری کو سہلاتی تھیں اور بکری ڈاک کی رفتار سے چوکر اڑا رہی تھی۔

تب مجھ سے بولیں ’’کتنے خوب صورت بچے ہیں‘‘

’’ہاں بہت خوب صورت‘‘

’’جی چاہتا ہے ایک پال لوں‘‘

’’ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی‘‘

’’تم بڑے نرموہے ہو‘‘

’’چوکر ختم ہو گیا بکری اطمینان سے رخصت ہو گئی دونوں بچے بھی اس کے پیچھے پھدکتے ہوئے چلے گئے۔ دیوی جی آنکھوں میں آنسو بھرے یہ تماشا دیکھتی رہیں‘‘

گڈریے نے چلم بھری اور گھر میں آگ مانگنے آیا چلتے وقت بولا: ’’کل سے دودھ پہنچادیا کروں گا، مالک‘‘

دیوی نے کہا ’’اور دونوں بچے کیا پئیں گے؟‘‘

’’بچے کہاں تک پییں گے بہو جی! دو سیر دودھ دیتی ہے اجی دودھ اچھا نہ ہوتا تھا اس مارے نہیں لایا‘‘

مجھے رات کا وہ روح شکن واقعہ یاد آ گیا۔

’’میں نے کہا دودھ لاؤ یا نہ لاؤ تمہاری خوشی، لیکن بکری کو ادھر نہ لانا‘‘ اس دن سے نہ وہ گڈریا نظر آیا اور نہ وہ بکری اور نہ میں نے سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن دیوی جی اس کے بچوں کو یاد کر کے کبھی کبھی آنسو بہا لیتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

روشنی

پہلی بار: کتابی صورت میں فروری 1938ء (واردات)

اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

آئی سی ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی میری دلی مراد بر آئی ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی اس لیے سیر و شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا پھاگن کا مہینہ، میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی مگر منظر نہایت سہانا دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا کیوں کہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا چلو بیٹا چلا

ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیے گئے تھے۔

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی ذرا ذرا سے مزرعے تھے وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی، اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے، گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں ڈائریکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے ننھا سا انگلینڈ نصف کرہ زمین پر حاوی ہے اپنی صنعت و حرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے جہاں آج بھی زندگی

کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انہیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا، افق گرد وغبار کے پردے میں چھپ گیا تھا، آندھی کی علامت تھی میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لحہ بہ لحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا گویا میں یکہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا ہوا تیز ہوگئی، وہ پردہ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا وہ سرسراہٹ، اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الامان گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا اف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے، جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط ہوگئی کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں، کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں کوئی ایسا تو وہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ملنے کی بھی تو گنجائش نہیں پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں ایک

قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں عجیب ہیجان میں مبتلا تھا کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دے گا دل پر بے اختیار وقت کا غلبہ ہوا موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس ارراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آ رہی ہو سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر ادھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں کوئی زمین دار ہوگا مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آ گئی پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جا رہی ہے نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا ''اس عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز نہ پہنچی عورت نے کوئی جواب نہ

دیا شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا ''اس عورت! ذرا ٹھہر جا، گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی اس نے میرے قریب آ کر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا'' کہاں جاؤ گے؟''

گجن پور کتنی دور ہے؟

''چلے آؤ آگے ہمارا گانو ہے اس کے بعد گجن پور ہے''

''تمہارا گانو کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے''

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں کیسے رک جاتی مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔ آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔'' گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا فلسفے نے کہا اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہو گا، دو تین فاقہ کش بچے بیکسی میں موت کا کیا غم موت تو اسے باعث نجات ہو گی میری حالت اور ہے زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے حوصلے ہیں، ارادے ہیں، میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا، شتر مرغ کی طرح جو خطرے

سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالو میں سر چھپا لیتا ہے۔

(2)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا نہ گرد و غبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے سامنے ایک پہاڑی تھی اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا میں جوں ہی اس گانو میں پہنچا وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو تمہیں ڈھونڈنے جا رہی تھی''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا ''میں اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا میں وہیں کھڑا ہو گیا یہی تمہارا گانو ہے؟ یہاں سے جگن پور کتنی دور ہو گا؟''

بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو راستہ بالکل سیدھا ہے کہیں داہنے بائیں مڑیو نہیں سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔

''یہی تمہارا بچہ ہے''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے جب آندھی آئی تو دونوں نمبر دار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑا کہیں اڑ نہ جائے جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے

نہیں اتر تا کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی بڑا شیطان ہے لڑکوں میں کھیل رہا ہے محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں گھاس لے کر بیچنے گئی تھی کہیں جاتی ہوں من ان بچوں میں لگا رہتا ہے''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذبہ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی پوچھا ''تمہیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہوگئے''

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:

''ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابو جی'' بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، تے ہوئی بس آنکھیں بند ہوگئیں نہ کچھ کہا نہ سنا میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے لگی تو بدن ٹھنڈا تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں کھیتی میرے مان کی نہ تھی بیل بدھیے بیچ کر انہیں کے کریا کرم میں لگا دیے بھگوان تمہارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے میرے لیے یہی بہت ہیں۔

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہوگیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو، مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا'' یہ کہہ کر میں نے

بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجئے میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں''

''یہ بھیک نہیں ہے بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہیں''

''نہیں بابو جی''

''مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو''

''نہیں بابو جی جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے بھگوان تمہارا بھلا کریں اب چلے جاؤ نہیں دیر ہو جائے گی''

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا جنہیں میں جاہل، کورباطن، بے خبر سمجھتا تھا اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا ''تمہیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی ''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا آج وہ ہوتا تو تم اس طرح جگن پورا کیلئے نہ جا پاتے جا کر تمہیں پہنچا آتا تھوڑی خدمت کرتا''

گھوڑا اڑا میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اڑ رہا تھا جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی اس

دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے اڑا چلا جاتا تھا بس یہی فکر تھی کہ اس پارہ کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(3)

جگن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا راستہ نہایت پیچیدہ بیہڑ بے وگ و بار گھوڑے کو روکنا پڑا تیزی میں جان کا خطرہ تھا آہستہ آہستہ سنبھلتا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی اس نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی میں سمجھ گیا اولے ہیں پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑ گڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی یکا یک سامنے ایک کف دست میدان آ گیا جس کے پرلے سرے پر جگن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی، لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے، جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا وہ بار بار ہنہناتا تھا، اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے لگام ڈھیلی کر دی گھوڑا اڑا میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں کہ ایک رپٹ آ پڑی پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا میں نے چلا کر کہا بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا داہنے تو نہیں ہو ا بائیں کی طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا کہ اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے میں پانی میں کود پڑا ہاتھی ڈباو پانی تھا رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی مگر

کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا میں بھی ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیرنا جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا جسم بے جان ہو رہا تھا میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے اس نیم جاں لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے کبھی سر پر کبھی شانے پر کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی میں تلملا اٹھا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی وہ فاتحانہ مسرت تھی میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں میں کبھی پانی میں نہ گھستا ہر خطرہ تھا کہ کوئی بڑا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے مگر میں خوش تھا کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا مجھے اپنی فکر نہ تھی ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی وہ اس وقت کام آئی میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی اولے نکل گئے تھے میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا بے خوف، بے

خطر، دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا اسی وقت اندھے نے پوچھا ’’تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو‘‘

میں نے کہا ’’تمہارا خادم ہوں‘‘

’’تمہاری سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے‘‘

’’ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے‘‘

’’وہ کون دیوی ہے؟‘‘

’’وہ دیوی پیچھے کے گانو میں رہتی ہے‘‘

’’تو کیا، وہ عورت ہے؟‘‘

’’نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے‘‘

☆☆☆☆☆☆

شانتی

پہلی بار: کتابی صورت میں فروری 1938ء (واردات)
اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں ہے

مرحوم دیوناتھ میرے دوستوں میں تھے آج بھی ان کی یاد آ جاتی ہے تو وہ رنگ رلیاں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور کہیں تنہائی میں جا کر ذرا دیر رو لیتا ہوں میرے اور ان کے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا میں لکھنو میں تھا اور وہ دہلی میں لیکن شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا کہ ہم آپس میں نہ مل لیتے ہوں وہ نہایت شریف، محبت نواز اور دوستوں پر جان دینے والے آدمی تھے جنہوں نے اپنے پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا دنیا کیا ہے اور یہاں شرافت و محبت کا صلہ کیا ملتا ہے، یہ انہوں نے کبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی ان کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب انہیں آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا دوستوں نے ان کی صاف دلی سے نامناسب فائدہ اٹھایا اور کئی مرتبہ انہیں شرمندہ بھی ہونا پڑا لیکن اس بھلے آدمی نے زندگی سے سبق لینے کی قسم کھا لی تھی ان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی جیسے بھولا ناتھ جیسے ویسے ہی بھولا ناتھ مرے۔

جس دنیا میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی جس میں بدگمانی و چالاکی اور بغض و حسد کے لیے گنجائش نہ تھی سب اپنے تھے، کوئی غیر نہ تھا، میں نے بار بار انہیں متنبہ کرنا چاہا لیکن اس کا نتیجہ امید کے خلاف برآمد ہوا زندگی کے خوابوں کو پریشان

کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا مجھے کبھی فکر ہوتی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بند نہ کیا تو نتیجہ ہو گا؟ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گویا بھی کچھ اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ہماری دیویوں میں جو ایک مال اندیشی ہوتی ہے اور جو اڑا و مردوں کی غیر مال اندیشیوں کے لیے بینک کا کام کرتی ہے اس سے گویا محروم تھی یہاں تک کہ اسے کپڑوں اور زیوروں کا بھی شوق نہ تھا۔

---------صفحہ نمبر ۱۰۵۶ تک ---

جب مجھے دیوناتھ کے انتقال کی خبر ملی۔ اور میں بھاگا ہوا وہی گیا تو گھر میں برتن بھانڈے کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا۔ ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی جو زیادہ فکر کرتے پورے چالیس کے بھی تو نہ ہوئے تھے۔ یوں تو لڑکپن ان کی سرشت میں داخل تھا۔ لیکن اس عمر میں سب ہی بے فکرے ہوتے ہیں۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی ،اس کے بعد دو لڑکے ،لڑکے تو بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ لڑکی بچ رہی تھی۔

جس طرز معاشرت کے وہ عادی تھے اسے دیکھتے ہوئے اس مختصر کنبے کے لئے دوسو روپے ماہوار کی ضرورت تھی۔ دو تین سال میں لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہوگا۔ کیسے کیا ہوگا۔ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔

اس موقع پر مجھے یہ بیش قیمت تجربہ ہوا کہ جو لوگ خدمت خلق کرتے ہیں اور ذاتی مفاد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے ،ان کے پس ماندوں کو آڑ دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ،کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے ،جنہوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ اچھے سلوک کیے لیکن ان کے بال بچوں

کی کسی نے بات نہیں پوچھی۔لیکن چاہے کچھ ہو دیوناتھ کے دوستوں نے شرافت سے کام کیا اور گوپا کی بسر اوقات کے لئے روپیا جمع کرنے کی تجویز کی۔ایک صاحب جو رنڈوے تھے اس سے بیاہ کرنے کو بھی تیار تھے۔لیکن گوپا نے بھیا سجذبے کا اظہار کیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے۔اور تجویز کو مسترد کر دیا۔مکان بہت بڑا تھا اس کا ایک حصہ کرایے پر اٹھا دیا۔اس طرح اس کو پچاس روپے ماہوار ملنے لگے۔وہ اتنے میں ہی اپنا نباہ کر لے گی جو کچھ خرچ تھا وہ سنی کی ذات سے تھا۔

اس کے ایک مہینے بعد ہی مجھے کاروبار کے سلسلے میں غیر ممالک جانا پڑا اور وہاں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دو سال لگ گئے۔گوپا کے خطوط برابر جاتے رہتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ہے۔کوئی فکر کی بات نہی ہے۔بعد میں مجھے پتا چلا کہ گوپا نے مجھے غیر سمجھا اور صحیح حالت چھپاتی رہی۔

پردیس سے لوٹ کر میں سیدھا دہلی پہنچا۔دروازے پر پہنچتے ہی مجھے رونا آ گیا۔موت کی افسردگی سی طاری تھی۔جس کمرے میں دوستوں کے جھمگٹ رہتے تھے۔اس کے دروازے بند تھے،مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔پہلی نظر میں تو شبہ ہوا کہ دیوناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے ہیں۔میں تو ہم پرست نہیں ہوں اور اجسام روحانی کا بھی قائل نہیں لیکن اس وقت میں ایک بار ضرور چونک پڑا۔دل میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی۔لیکن دوسری نظر میں یہ خیالی تصویر مٹ چکی تھی،دروازہ کھلا۔گوپا کے سوا دروازہ کھولنے والا تھا ہی کون؟۔

میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا تھا۔اسے میرے آنے کی اطلاع تھی اور اس

نے میرے استقبال کے لئے نئ ساڑھی پہن لی تھی۔اور شاید بال بھی گوندھ لیے تھے پر اس دو برسوں میں وقت نے اس پر جو مظالم کیے تھے انھیں وہ کیا کرتی۔عورتوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہے جب حسن وشباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔جب اس میں الھڑپن، بے اعتنائی اور شرم کی جگہ لگاوٹ، خوش ادائی اور دل آویزی آجاتی ہے۔لیکن گوپا کی جوانی ختم ہو چکی تھی۔اس کے چہرے پر جھریاں تھیں، بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔

میں نے پوچھا ''کیاتم بیمار تھیں گوپا؟''۔

اس نے آنسو پی کر کہا نہیں تو میرے تو کبھی سر میں بھی درد نہیں ہوا۔

''تو تمہاری کیا حالت ہے بالکل بوڑھی ہوگئیں

''

''تو اب جوانی لے کر کرنا ہی کیا ہے؟ میری عمر بھی تو بتیس سے اوپر ہوگئی ہے۔''

''یہ عمر تو زیادہ نہیں ہوتی۔''

ہاں ان کے لئے جو بہت دن جینا چاہتے ہوں۔میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔بس سنی کے بیاہ کی فکر ہے۔اس سے چھٹی پا جاؤں پھر مجھے زندگی کی پرواہ نہ رہے گی۔

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس مکان میں کرایہ دار تھے۔اور تب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا تھا۔میرے دل میں برچھی سے چبھ گئی۔اتنے دنوں ان بے چاروں نے کس طرح بسر کی۔یہ خیال ہی دردناک تھا۔

میں نے متاسف ہو کر کہا لیکن تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی کیا میں بالکل ہی غیر ہوں۔

گوپا نے شرمندہ ہو کر کہا۔نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔تمہیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی۔میں نے سوچا پردیس میں تم اپنی جھمیلے میں پڑے ہو گے تمہیں کیا سناؤں کسی نہ کسی طرح دن کٹ ہی گئے۔گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے گہنے تھے ہی۔اب سنیتا کے بیاہ کی فکر ہے، پہلے میں نیسوچا تھا کہ اس مکان کو الگ کردوں گی۔بیس بائیس ہزار مل جائیں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے۔اور سود ملا کر اس پر بیس ہزار ہو گئے ہیں۔مہاجن نے اتنا ہی دیا کیا کم کی کہ مجھے گھر سے نکال نہیں دیا۔ادھر سے تو اب کوئی امید نہیں۔بہت ہاتھ پاؤں جوڑنے پر شاید مہاجن سے دو ڈھائی ہزار روپے اور مل جائیں، اتنے میں کیا ہو گا، اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔لیکن میں بھی کتنی مطلبی ہوں۔نہ تمھیں ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا نہ کچھ ناشتا لائی اور اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔اب آپ کپڑے اتاریے اور آرام سے بیٹھیے۔کچھ کھانے کو لاؤں کھا لیجیے۔تب باتیں ہوں، گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔

میں نے کہا میں بمبئی سے سیدھا یہاں آرہا ہوں گھر کہاں گیا؟۔

گوپا نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔اس وقت اسکی نگاہوں میں شباب کی جھلک تھی ۔مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کی جھریاں مٹ گئی ہوں۔چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اس نے کہا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہاری دیوی جی تمہیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔

میں کسی کا غلام نہیں ہوں؟۔

''کسی کو اپنا غلام بنانے کے لئے پہلے خود بھی اس کا غلام بنا پڑتا ہے۔''

شام ہو رہی تھی، سنیتا لالٹین لے کر کمرے میں آئی۔ دو سال پیشتر کی معصوم لڑکی اب منزل شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کیا کرتا تھا۔ اس کی طرف آج آنکھیں اٹھا کر نہ دے سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی، آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے۔ اور جیسے میں اسے اس چیز کے چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا ''سنی اب تم کس درجے میں پڑھتی ہو''

اس نے سر جھکائے جواب دیا ''دسویں میں ہوں''

''گھر کا بھی کچھ کام کرتی ہو''

''اماں جب کرنے بھی دیں''

گوپا نے کہا ''میں نہیں کرنے دیتی یا خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔''

سنیتا منھ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دلاری لڑکی تھی۔ جس دن گرہستی کا کام کرتی، اس دن گوپا شاید رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی یہ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی ایک کرشمہ تھا۔

میں نے کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے پھر سنیتا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی؟۔ لڑکے تو بہت ملتے ہیں لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقع کیوں ملے کہ دادا ہوتے تو میرے لئے شاید اس

سے اچھا بر ڈھونڈ تے ۔پھر گوپا نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔

میں نے متغیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔لالہ مداری لال پہلے انجینئر تھے ۔اب پنشن پاتے تھے۔لاکھوں جمع کر لیے تھے۔پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا تھا جہاں تک اس کی رسائی دشوار تھی۔

میں نے کہا مداری لال تو بہت ہی بڑا آدمی ہے۔

گوپا نے دانت تلے زبان دبا کر کہا۔ارے نہیں بھیا تم نے انہیں پہچانا نہ ہوگا۔میرے اوپر بڑے دیالو ہیں۔کبھی کبھی آکر خیریت بھی پوچھ جاتے ہیں ۔لڑکا بھی ایسا ہونہار کہ میں تم سے کیا کہوں؟ ۔پھر ان کے ہاں کمی کس بات کی ہے؟۔یہ ٹھیک ہے کہ وہ پہلے خوب رشوت لیتے تھے ۔لیکن یہاں دھرماتما کون ہے؟۔کون موقع پا کر چھوڑ دیتا ہے۔مداری لال نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے جہیز نہیں چاہتے ۔صرف لڑکی چاہتے ہیں ۔سنیاان کے من میں بیٹھ گئی ہے۔

میں نے متفق ہو کر کہا ’’مگر یہ تو سوچو کہ تم میں اور ان میں کس قدر فرق ہے۔تم شاید اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ سیدھا نہ کر سکو۔‘‘

لیکن گوپا کے من میں یہ بات جم گئی تھی ۔کہ وہ سنی کو ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

دوسرے دن میں مداری لال کے پاس گیا اور ان سے جو میری بات چیت ہوئی ۔اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔کسی زمانے میں وہ لالچی رہے ہوں گے،لیکن اس وقت تو انھیں بہت ہی بلند اور پاک دل پایا۔

بولے۔بھائی صاحب میں دیوناتھ جی سے خوب واقف ہوں۔وہ آدمیوں میں رتن تھے۔ان کی لڑکی میرے گھر آئے یہ میری خوش قسمتی ہے۔آپ اسکی ماں سے کہہ دیجیے کہ مداری لال ان سے کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔خدا کا دیا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔میں انہیں زیر بار نہیں کرنا چاہتا''۔

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ہم سنی سنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کیسے غلط خیالات قائم کر لیتے ہیں۔میں نے آکر گوپا کو مبارک باد دی ۔۔یہ طے ہوا کہ گرمیوں میں بیاہ کر دیا جائے گا۔

چار مہینے گوپا نے بیاہ کی تیاریوں میں کاٹے۔میں مہینے میں ایک مرتبہ اس سے ضرور مل جاتا تھا۔لیکن ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹتا۔گوپا نے اپنے خاندان کی عزت کا نہ جانے کتنا بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھا تھا۔دیوانی اس بھرم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی یہ اولوالعزمی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں۔اور آئے دن بھلا دیے جاتے ہیں۔شاید وہ دنیا سے یہ کہلوانا چاہتی تھی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی لٹا ہوا ہاتھی نولاکھ کا ہے۔قدم قدم پر اسے دیوناتھ کی یاد آتی۔وہ ہوتے تو یہ کام یوں نہ ہوتا۔یوں ہوتا اور تب وہ روتی۔مداری لال نیک آدمی ہیں۔سچ ہے،لیکن گوپا کا اپنی بیٹی کے متعلق اپنا بھی کوئی فرض ہے۔اس کے دس پانچ لڑکیاں تھوڑی ہی ہیں۔وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔سنیتا کے لئے اس نے جتنے گہنے اور جوڑے بنوائے تھے۔انھیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔جب دیکھو کچھ نہ کچھ سی رہی ہے،کبھی ستاروں کی دکان پر بیٹھی ہے۔کبھی مہمانوں کی مدارات کا انتظام کر رہی

ہوتی۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی پر دینے والے دان سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلّہ اس کا مددگار تھا۔ سنیتا اب محلے کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزت سب کی عزت ہے۔ اور گوپا کے لئے تو نیند اور آرام سب حرام تھا۔ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا۔ آدھی رات ہوگئی ہے، مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہوتی۔

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان۔ کیا کیا کرے؟۔ جو کام دوسروں پر چھوڑ دیتی ہے اسی میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو جاتی۔ لیکن اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں مانتی۔

پچھلی مرتبہ اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا ’’گوپا دیوی، اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی کے بعد مر جانا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں شادی سے پہلے ہی نہ چل دو۔

گوپا نے جواب دیا۔ بھیا اس کی فکر نہ کرو۔ بیوہ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ رانڈ مرے نہ کھنڈر ڈھے۔ لیکن میری تمنا یہ ہے کہ سنیتا کا ٹھکانہ بنا کر میں بھی چل دوں۔ اب زندہ رہ کر کیا کروں گی، سوچو کیا کروں گی۔ اگر کسی طرح کارخنہ پڑ گیا تو کس کی بدنامی ہوگی۔ ان چار مہینوں میں مشکل سے گھنٹہ بھر سوتی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی، لیکن میرا دل خوش ہے کہ میں مروں یا جیوں، مجھے تسکین تو ہوگی کہ سنیتا کے لئے جو کچھ اس کا باپ کر سکتا تھا۔ وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے اپنی شرافت دکھائی تو مجھے بھی اپنی ناک رکھنی ہے۔

ایک دیوی نے آ کر کہا ’’بہن ذرا چل کر دیکھ لو چاشنی ٹھیک ہوگئی ہے یا نہیں‘‘ گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا امتحان کرنے گئی اور ایک لمحہ بعد آ کر بولی ’’جی چاہتا

ہے کہ سر پیٹ لوں،تم سے ذرا باتیں کرنے لگی ادھر چاشنی اتنی کڑی ہوگئی کہ لڈو دانتوں سے لڑیں گے۔کسی سے کیا کہوں؟۔

میں نے چڑ کر کہا''تم بیکار کی جھنجھٹ کر رہی ہو۔کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں۔پھر تمہارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے،جن کے لئے یہ طومار باندھ رہی ہو۔دس پانچ کی مٹھائی ان کے لئے بہت ہوگی۔میری یہ بات شاید گوپا کو ناگوار ہوئی ہو۔ان دنوں اسے بات بات پر غصہ آجاتا تھا۔

بولی،بھیا تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔تمہیں نہ ماں بننے کا موقع ملا نہ بیوی بننے کا۔سنیتا کے باپ کا کتنا نام تھا،کتنے آدمی ان کے دم سے پلتے تھے۔کیا تم نہیں جانتے یہ پگڑی میرے ہی سر تو بندھی ہے۔تمہیں یقین نہ آئے گا ناستک ہی جو ٹھہرے!پر میں تو انہیں سدا اپنے اندر ٹھہرا ہوا پاتی ہوں۔جو کچھ کر رہے ہیں،وہی کر رہے ہیں۔میں بھلا ناقص العقل اکیلی کیا کر لیتی؟۔وہی مرے مددگار ہیں،وہی میرے رہبر ہیں۔یہ سمجھ لو کہ جسم میرا ہے،لیکن اس کے اندر جو آتما ہے وہ ان کی ہے۔تم ان کے دوست ہو،تم نے اپنے سینکڑوں روپے خرچ کیے،اور اتنے حیران ہو رہے ہو۔میں تو ان کی شریک زندگی ہوں''لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی۔''

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جون میں شادی ہوگئی۔گوپا نے بہت کچھ دیا اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا۔لیکن پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔اگر آج سنیتا کے باپ ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے؟۔برابر روتی رہی۔

جاڑوں میں میں پھر دہلی گیا کہ گویا اب خوش ہوگئی۔لڑکی کا گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔گویا کو اس کے سوا اور کیا چاہیئے۔لیکن سکھ اس کے مقدر میں ہی نہ تھا۔

میں ابھی کپڑے بھی اتارنے نہ پایا تھا کہ اس نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا۔بھیا گھر دوار سب کچھ اچھا ہے۔ساس سسر بھی اچھے ہیں،لیکن داماد نکما نکلا۔سنیتا بے چاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے۔تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔بس اس کا سایہ ہی رہ گیا ہے۔ابھی چند دن ہوئے آئی تھی۔اس کی صورت دیکھ کر چھاتی پھٹتی ہے۔نہ تن بدن کی سدھ ہے۔نہ کپڑے لتے کی۔میری سنیتا کی یہ درگت ہوگی یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔بالکل گم سم ہی ہوگئی ہے۔کتنا پوچھا ''بیٹا وہ تم سے کیوں نہیں بولتا۔بس آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔میری سنی تو کنوئیں میں گر گئی۔

میں نے کہا تم نے اس کے گھر والوں سے پتا نہ لگایا۔

لگایا کیوں نہیں بھیا۔سب حال معلوم کیا۔لڑکا چاہتا ہے کہ میں چاہے جس راہ جاؤں سنیا میری پوجا کرتی رہے۔سنیا بھلا اسے کیوں سہنے لگی۔اسے تم جانتے ہو کہ کتنی خوددار ہے،وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں۔اس نے ہمیشہ پیار دلار پایا ہے۔باپ بھی اس پر جان دیتا تھا۔میں بھی آنکھ کی پتلی سمجھتی تھی۔شوہر ملا چھیلا جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔دونوں میں کیا بات ہوئی یہ کون جان سکتا ہے۔لیکن دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔نہ وہ سنیا کی پرواہ کرتا ہے۔نہ سنیا اس کی پرواہ کرتی ہے۔مگر وہ تو اپنے رنگ میں مست ہے۔سنی جان دیے دیتی ہے۔

میں نے کہا ''لیکن تم نے سنی کو سمجھایا نہیں اس لونڈے کا کیا بگڑے گا۔اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔

تو گوپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔بولی۔بھیا کس دل سے سمجھاؤں۔سنی کو دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹتی ہے۔بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی کڑی آنکھ سے بھی نہ دیکھ سکے۔سنی پھوہڑ ہوتی، آرام طلب ہوتی تو سمجھاتی بھی کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی منہ کالا کرتا پھرے اور تو اس کی پوجا کر۔میں تو خود یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔مرد اور عورت میں بیاہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں سولہ آنے ایک دوسرے کے ہو جائیں ایسے مرد کم ہیں جو عورت کی کج نگاہی بھی برداشت کر سکیں۔لیکن ایسی عورتیں بہت ہیں جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔سنی ان عورتوں میں نہیں۔اگر وہ محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی بھی ہے۔اگر شوہر میں یہ بات نہ ہوگی تو اس سے واسطہ بھی نہ رکھے گی۔چاہے اس کی ساری زندگی روتے کٹ جائے۔

یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک سنگھار دان لا کر بولی ''سنی اسے اب کے یہیں چھوڑ گئی۔اس لئے آئی تھی۔یہ وہ گہنے ہیں جنھیں میں نے نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے بنوائے تھے۔ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔یوں کہو کہ بھیک مانگ کر جمع کیے تھے۔سنی اب ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔پہنے تو کس کے لئے؟ سنگھار کرے تو کس پر؟۔پانچ صندوق کپڑوں کے دیے تھے۔کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔وہ سب کپڑے اٹھا لائی۔ان چیزوں سے اسے اب نفرت سی ہو گئی ہے۔بس کلائی میں دو کانچ کی

چوڑیاں اور ایک اجلی سی ساری اس کا سنگھار ہے۔

میں نے گوپا کو دلاسا دیا کہ میں جا کر ذرا کیدار ناتھ سے ملوں گا۔ دیکھوں تو وہ کس رنگ ڈھنگ کا آدمی ہے۔

گوپا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھیا بھول کر بھی نہ جانا، سنی سنتے ہی جان دے دے گی۔ غیرت کی پتلی ہی سمجھو اسے۔ رسی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتے۔ جن پیروں نے اسے ٹھکرا دیا اسے وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر چاہے تو کوئی لونڈی بنا لے لیکن حکومت تو اس نے میری نہ سہی دوسروں کی کیا سہے گی۔

میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا لیکن موقع پاتے ہی لالہ مداری لال سے ملا۔ میں راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے دونوں باپ بیٹا ایک ہی جگہ مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار ناتھ نے اس طرح چرن چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی سے متاثر ہوا۔ جلدی سے اندر گیا اور چائے مربہ اور مٹھائیاں لایا۔ اتنا شائستہ اتنا خلیق اور اتنا شریف نوجوان میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اندر اور باہر میں کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ جب تک رہا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے مداری لال سے کہا:

کیدار بابو تو بہت ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں اتنی کشیدگی کیوں ہے؟۔

مداری لال نے ایک لمحہ غور کر کے جواب دیا۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا بتاؤں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار لڑکوں کو اپنے من کا بنا دیتا

ہے۔میری ساری عمر محنت میں کٹی اب جا کر ذرا راحت ملی، رنگ رلیوں کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ دن بھر محنت کرتا اور شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔صحت بھی اچھی نہ تھی۔اس لیے برابر یہی فکر سوار رہتی کہ کچھ جمع بھی کر لوں۔ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے بال بچے بھیک مانگتے پھریں۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان مہاشے کو مفت کی دولت ملی، سنک سوار ہو گئی۔شراب اڑنے لگی، پھر ڈراما کھیلنے کا شوق ہوا۔روپے کی کمی تھی نہیں اس پر ماں باپ کے اکیلے بیٹے، ان کی خوشی ہی ہماری زندگی کی بہشت تھی۔ پڑھنا لکھنا تو دور رہا۔آوارگی کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔رنگ اور گہرا ہوا اور اپنی زندگی کا ڈراما کھیلنے لگے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے فکر ہوئی۔سوچا بیاہ کر دوں ٹھیک ہو جائے گا۔ گوپا دیوی کا پیغام آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ میں سنی کو دیکھ چکا تھا۔سوچا ایسی خوبصورت بیوی کو پا کر اس کی اصلاح ہو جائے گی۔لیکن اتفاق سے وہ بھی لاڈلی تھی، ضدی، ہٹیلی،۔مفاہمت کا زندگی میں کیا درجہ ہے اس کی اسے خبر ہی نہیں، لوہا لوہے سے لڑ گیا۔یہ ہے سارا بھید اور صاحب میں تو بہو ہی کو زیادہ خطا وار سمجھتا ہوں لڑکے تو سب ہی من چلے ہوتے ہیں۔لڑکیاں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ان کی سیوا، قربانی اور محبت یہی ان کے دو ہتھیار ہیں۔جن سے وہ اپنے شوہر پر فتح حاصل کر لیتی ہیں۔۔بہو میں یہ گن نہیں ہیں۔ناؤ کیسے پار ہو گی۔خدا ہی جانے۔

اتنے میں سنیتا اندر سے آ گئی، اپنی تصویر کا بالکل مٹا ہوا خاکہ تھی۔کندن تپ کے بھسم ہو گیا تھا۔مٹی ہوئی تمناؤں کی اس سے اچھی تصویر نہیں ہو سکتی۔مجھ پر طعن کرتے ہوئے بولی، آپ جانے کب سے بیٹھے ہوئے ہیں مجھے خبر تک نہیں۔آپ

شاید باہر ہی باہر چلے بھی جاتے۔

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا ''نہیں سنی یہ کیسے ہوسکتا تھا تمہارے پاس آہی رہا تھا کہ تم خود آگئیں'' لالہ مداری لال کمرے سے باہر اپنی موٹر کی صفائی کرنے لگے۔شاید مجھے سنی سے بات چیت کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔

سنی نے پوچھا اماں تو اچھی ہیں''

میں نے کہا''وہ تو اچھی ہیں لیکن تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے''

یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں کیا ان بن ہے۔گویا دیوی جان دیے ڈالتی ہیں،تم خود مرنے کی تیاری کر رہی ہو، کچھ تو عقل سے کام لو۔

سنی کے ماتھے پر بل پڑ گئے،وہ بولی آپ نے ناحق یہ گفتگو چھیڑ دی میں نے تو یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ میں بدنصیب ہوں،بس ان باتوں کا علاج میرے قابو سے باہر ہے۔میں اس زندگی سے موت کو کہیں بہتر سمجھتی ہوں۔جہاں اپنی قدر نہ ہو۔زندگی کی کوئی دوسری شکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔اس معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتا کرنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔نتیجے کی میں پرواہ نہیں کرتی''

''لیکن''

''نہیں چاچا''اس معاملے میں آپ کچھ نہ کہیے۔نہیں تو میں چلی جاؤنگی۔

''آخر سوچو تو''

''میں سب سوچ چکی ہوں اور طے کر چکی ہوں۔حیوان کو انسان بنانے میرے بس سے باہر ہے۔

مئی کا مہینا تھا۔ میں مسوری گیا تھا کہ گوپا کا تار پہنچا ''فوراً آؤ بہت ضروری کام ہے''

میں گھبرا کر دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گوپا دق کی مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا

''سنی تو اچھی ہے''

''اس نے جواب دیا ہاں''

''اور کیدار ناتھ؟''

وہ بھی اچھی طرح ہے

''تو ماجرا کیا ہے''

''کچھ نہیں''

''تم نے مجھے تار دے کر بلایا اور پھر کہتی ہو کوئی بات نہیں ہے''

''دل گھبرا رہا تھا اس لئے تم کو بلا لیا۔ سنی کو کسی طرح سمجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی۔

''کیا ادھر کوئی نئی بات ہوئی ہے''

''نئی تو نہیں لیکن ایک طرح سے نئی ہی سمجھو۔ کیدار ایک ایکٹرس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے۔ ایک ہفتے سے کچھ پتا نہیں ہنی سے کہہ کر گیا ہے کہ جب تک تم رہوں گی میں گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سنا ہے کیدا اپنے باپ کے جعلی دستخط بنا کر کئی ہزار روپے بھی بینک سے لے گیا۔

''تم سنی سے ملی تھیں''

''ہاں تین دن سے برابر جا رہی ہوں''

''اگر سنی نہیں آنا چاہتی تو رہنے کیوں نہیں دیتیں؟''

وہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔

میں اسی وقت مداری لال کے پاس گیا۔وہ میری صورت دیکھتے ہی بولے ،بھائی صاحب میں تو لٹ گیا۔لڑکا بھی گیا اور بہو بھی۔

معلوم ہوا جب سے کیدار غائب تھا سنی اور بھی اداس رہنے لگی۔اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔کسی سے بات نہ کرتی تھی۔آج صبح جب وہ جمنا اشنان کرنے گئی۔اندھیرا تھا سارا گھر سو رہا تھا۔کسی کو نہیں جگایا۔جب دن چڑھ گیا اور بہو نہ ملی تو اس کی تلاش ہونے لگی۔دوپہر کو پتا چلا کہ جمنا گئی ہے۔لوگ ادھر بھاگے ،وہاں اس کی لاش ملی۔پولیس آئی۔لاش کا معائنہ ہوا۔اب اس کی لاش ملی ہے۔میں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ارتھی کے ساتھ گیا،اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے۔میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔معلوم نہیں یہ خبر پا کر گوپا کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔اس ابھاگن کے باغ تمنا میں یہی ایک پودا تھا اسے اپنے خون جگر سے سینچ کر پال رہی تھی۔اس کے بسنت کا سنہرا خواب ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔اس میں کونپلیں کھلیں گی۔پھول کھلیں گے،پھل آئیں گے۔چڑیاں اس کی ڈالیوں میں بیٹھ کر اپنے سہانے راگ گائیں گی۔لیکن آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔اس کی زندگی اب بے کار تھی۔وہ نقطہ ہی مٹ گیا تھا جس پر زندگی کے تمام خطوط آ کر ملتے تھے۔دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹا

ئی۔ گوپا ایک لالٹین لیے نکلی ۔میں نے گوپا کے چہرے پر سکون کی ایک نئی جھلک دیکھی ۔اس نے مجھے غمگین دیکھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔اور بولی آج تو تمہارا سارا دن روتے ہی کٹا۔لاش کے ساتھ تو بہت آدمی ہوں گے ۔میرے جی میں بھی آیا تھا کہ جا کر سنی کے آخری درشن کرلوں ۔لیکن میں نے سوچا کہ جب سنی ہی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے ۔نہ گئی"

میں حیرت سے گوپا کا منہ دیکھنے لگا۔۔۔اسے اس افسوس ناک حادثے کی اطلاع مل گئی تھی ۔لیکن وہ کس قدر صابر و پر سکون ہے ۔میں نے کہا اچھا کیا تم نہ گئیں ۔رونا ہی تو تھا۔"

گوپا نے کہا "ہاں اور کیا؟" "روئی تو یہاں بھی تھی ،لیکن تم سے سچ کہتی ہوں دل سے نہیں روئی ۔نہ جانے آنسو کس طرح نکل آئے ۔مجھے تو درحقیقت سنی کی موت سے خوشی ہوئی ۔بدنصیب اپنی عزت و خودداری کے لئے دنیا سے رخصت ہوگئی ۔نہیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑتا ۔اس لئے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھا دی ۔عورت کو زندگی میں محبت نہ ملے تو اس کا مر جانا ہی اچھا ہے ۔تم نے سنی کی لاش دیکھی تھی ۔لوگ کہتے ہیں ایسا جان پڑتا تھا کہ مسکرا رہی ہے ۔میری سنی سچ مچ دیوی تھی ۔ بھیا! انسان اس لئے تھوڑا ہی جینا چاہتا ہے کہ وہ روتا ہی رہے ۔جب معلوم ہوگیا کہ زندگی میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تو آدمی جی کر کیا کرے؟ ۔کس کے لئے جیے؟ ۔کھانے سونے اور مر جانے کے لئے؟ ۔میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے سنی کی یاد نہیں آئے گی ۔یا میں اسے یاد کر کے روؤں گی نہیں ۔لیکن وہ غم کے آنسو نہ ہونگے ۔خوشی کے آنسو ہوں گے ۔ بہادر بیٹے کی ماں اس کی

بہادری سے خوش ہوتی ہے۔سنی کی موت کیا کم باعث فخر ہے۔میں آنسو بہا کر اس فخر کو کیوں برباد کروں۔وہ جانتی ہے کہ ساری دنیا اس کی مذمت کرے گی،لیکن اس کی ماں اس کی تعریف ہی کرے گی۔اس کی روح سے یہ مسرت بھی چھین لوں؟۔لیکن اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔اوپر جا کر سو رہو۔میں نے تمہاری چار پائی بچھا دی ہے۔مگر دیکھو اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔سنی نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا۔اس کے پتا ہوتے تو آج سنی کی مورت بنا کر اسے پوجتے۔

The End--------------------ختم شد

All rights reserved.
©2002-2006